جلد ۹۳ - ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۶۴ء - عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اسلامی علوم، دینی تعلیم اور دین وملت کی خدمت کے کچھ اصول اور طریقے تو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جو ہمیشہ یکساں رہیں گے اور کچھ طریقے زمانہ کے حالات اور تقاضوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں، اس کے بغیر دین کی صحیح خدمت نہیں ہو سکتی، اسی اعتبار سے مسلمانوں کا نظام تعلیم ہر زمانہ میں بدلتا رہا اور اس کی ضرورت تھی، مگر مسلمانوں کے دور زوال میں ان کی دوسری چیزوں کی طرح ان کا نظام تعلیم بھی بے روح اور جامد ہو کر رہ گیا تھا اور اس میں حالات کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی، جس زمانہ میں مغربی علوم اور مغربی تہذیب کی یلغار شروع ہوئی جس نے مسلمانوں کے مذہب ان کی تاریخ، ان کی تہذیب اور ان کی روایات وغیرہ پر مختلف سمتوں اور ایسے ایسے گوشوں سے حملہ شروع کر دیا جن کے جواب سے ہمارے علما قاصر تھے، اس سے نہ صرف دوسری قوموں بلکہ خود مسلمانوں کی نئی نسل میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلنے لگیں اور امت اسلامیہ کی پوری عمارت خطرہ میں پڑ گئی، اس صورت حال کے مقابلہ کے لیے ایسے نظام تعلیم کی ضرورت تھی جو قدیم وجدید دونوں ضروریات کا جامع ہو اور ایسے علما پیدا کر سکے جو دینی علوم میں مہارت اور دین میں رسوخ و پختگی، نئے خیالات و رجحانات اور مغرب کے حملوں کی کمین گاہوں سے پوری طرح واقف ہوں، تاکہ انہی کے اسلحہ سے انکا جواب دے سکیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد یہی تھا، اور اس کی حیثیت محض ایک درسگاہ کی نہیں بلکہ ایک مستقل تحریک کی تھی، یہ وقت کی ایسی ضرورت تھی کہ ہندوستان کے تمام عربی مدارس اس سے متاثر ہوئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اسکے علمی ثمر دارالمصنفین نے ہندوستان میں علم اور تعلیم کی راہ سے دین کی خدمت کا ایک نیا مکتب فکر قائم کر دیا، اور آج مسلمانوں کے بہت سے علمی اور تعلیمی ادارے اسی راہ پر گامزن ہیں۔

یہ ضرورت جس قدر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے زمانہ میں تھی اسی قدر آج بھی ہے، بلکہ نئے پیدا شدہ مسائل نئی مادی اور ملحدانہ تحریکوں اور ہندوستان کے موجودہ حالات نے اس ضرورت کو اور بڑھا دیا ہے، ندوہ آج بھی ان فرائض کو ادا کر رہا ہے، اس کی تعلیمی شہرت اتنی پھیل گئی ہے کہ یورپ کی بعض یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ کے داخلہ کے لیے اس کی سند کو تسلیم کر لیا ہے، اسلامی بلکہ خالص عرب ملکوں کے بہت سے طلبہ اس وقت ندوہ میں

زیر تعلیم ہیں، دار العلوم سے ایک پندرہ روزہ عربی اخبار "الرائد" اور ایک ماہانہ عربی رسالہ "البعث الاسلامی" نکل رہا ہے، جس کے علمی اور ادبی معیار کو عرب او باتک مانتے ہیں، یہ دونوں اخبار اور رسالے ہندوستانی مسلمانوں اور عرب ملکوں کے درمیان ربط و تعلق کا بڑا ذریعہ ہیں، علمی حیثیت سے دین کی خدمت کے لیے "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے، جو بڑی مفید خدمات انجام دے رہا ہے، اس کی بعض کتابوں کے عربی اور انگریزی ترجمے بھی ہو چکے ہیں، موجودہ زمانہ کے ان مسائل کے حل کے لیے جن کا زندگی کے کاروبار میں روزانہ سابقہ پڑتا ہے اور جن کا وجود پرانی فقہ میں نہیں ہے، "مجلس تحقیقات شرعیہ" کے نام سے حال میں ایک ادارہ قائم ہوا ہے، جو اس ضروری اور اہم کام کو ہندوستان کے اصحاب فقہ و فتاویٰ علماء کے مشورے سے انجام دے رہا ہے، دینی حیثیت سے ندوہ تبلیغی جماعت کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے، اس کے ناظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دینی اور تبلیغی خدمات سے پورا ملک واقف ہے، غرض ندوہ ہر میدان میں علم و دین کی خدمت کا پورا فرض انجام دے رہا ہے، ابھی حال میں دار العلوم نے "تعمیر حیات" کے نام سے اردو کا بھی ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا ہے، جو ندوے کے مقاصد کی اشاعت اور اس کی ترجمانی کے ساتھ مفید علمی و دینی مضامین بھی پیش کرتا ہے، اس کی خریداری ہم خرما و ہم ثواب ہے، اس لیے ہم کو امید ہے کہ دینی ذوق خصوصاً دار العلوم ندوۃ العلماء سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس کی خریداری اور توسیع اشاعت کی کوشش کریں گے، اس کی قیمت پانچ روپے ۵۰ نئے پیسے ہے۔

ہندوستان کی تمام زبانوں کے رسم الخط میں وحدت پیدا کرنے خصوصاً اردو کے لیے دیوناگری رسم الخط اختیار کر لینے کی اب تک جتنی آوازیں اٹھیں وہ چنداں قابل توجہ نہ تھیں، لیکن اب دو بڑی شخصیتوں پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر چھاگلا نے بھی اسی قسم کا مشورہ دیا ہے، پنڈت جی کا مشورہ تو سب زبانوں کے لیے یکساں ہے لیکن مسٹر چھاگلا نے خاص طور سے اردو کے رسم الخط کو دیوناگری بنا دینے کا مشورہ دیا ہے، ہم کو ان کے مشورے پر کوئی تعجب نہیں ہے، وہ اپنی سیکولرزم کے ثبوت میں اختلافی معاملات و مسائل میں ہمیشہ اسی قسم کے مشورے دیا کرتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کو اردو سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، وہ مسلمانوں کے ماحول میں رہنے کا بھی کم اتفاق ہوتا ہے، اور ملت ... ان کی واقفیت کا تو کوئی سوال ہی نہیں، اور وہ جس تہذیب اور جس ماحول کے آدمی ہیں، اس میں اردو کی اہمیت کا احساس ہی

نہیں ہو سکتا، اردو کی دو حیثیتیں ہیں، ایک لسانی و ادبی، دوسری تہذیبی، لسانی حیثیت سے وہ ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے، لیکن تہذیبی حیثیت سے مسلمانوں کو اس سے ایک خاص لگاؤ بھی ہے، اس لیے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں تنہا اردو ہی ایسی زبان ہے، جس میں مسلمانوں کے تہذیبی اثرات بھی ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور علمی لٹریچر کا بہت بڑا ذخیرہ اردو میں ہے، اور ان کے لیے اس کی وہی حیثیت ہے، جو اسلامی ملکوں کے مسلمانوں کے لیے عربی کی ہے، اگر اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے تو یہ سارا ذخیرہ جو صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے، برباد ہو جائے گا اور مسلمان اس سے بالکل محروم ہو جائیں گے، کیونکہ پورے ذخیرہ کا دیوناگری رسم الخط میں منتقل کرنا ناممکن ہے، اس لیے وہ کسی حال میں بھی رسم الخط کی تبدیلی پر آمادہ نہیں ہو سکتے، بلکہ اردو کا کوئی ہوا خواہ بھی آمادہ نہ ہوگا، اگر مسٹر چھاگلا اردو رسم الخط کی اس اہمیت کو نہیں سمجھتے،

رسم الخط کی تبدیلی درحقیقت اردو زبان کی موت ہے، گو اب اردو اور ہندی دو مستقل زبانیں ہو گئی ہیں، اور ان کا اپنا لٹریچر ہے، لیکن درحقیقت ان دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، اور رسم الخط اور الفاظ کے تھوڑے ردوبدل سے آسانی کے ساتھ وہ ایک دوسرے کا قالب اختیار کر سکتی ہیں، ان کی مستقل حیثیت زیادہ تر ان کے رسم الخط کی وجہ سے قائم ہے، اگر اردو کا رسم الخط دیوناگری کر دیا جائے تو ہندی کے اس بحران میں وہ بہت جلد ہندی کی شکل اختیار کر لے گی، اور اس کا وجود چند دنوں میں ختم ہو جائے گا، اس لیے اردو والوں کو اس نئی چال سے ہوشیار رہنا چاہیے، اردو رسم الخط کی سیاسی حیثیت بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے، وہ وسط ایشیا کے متعدد اسلامی ملکوں کا رسم الخط ہے، اس میں اور عربی رسم الخط میں برائے نام فرق ہے، بلکہ یہ دونوں ایک ہی رسم الخط کی مختلف شکلیں ہیں، ایک کا نام نسخ اور دوسرے کا نستعلیق ہے، اس لیے اردو رسم الخط تمام اسلامی ملکوں سے ربط و تعلق کا ذریعہ ہے، ان حالات میں کم سے کم اردو کی حد تک پنڈت جواہر لال نہرو کا مشورہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔

مقالات

انیس الحجاج

ہندوستان کا فارسی زبان کا پہلا نایاب سفر نامہ

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

تمام تیموری شاہزادیاں تعلیم کے زیور سے آراستہ تھیں اور علم و ادب کا نہایت پاکیزہ مذاق رکھتی تھیں، ان میں زیب النسا خصوصیت کے ساتھ نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور علما، و اہل کمال کی بڑی قدردان و سرپرست تھی، اور بقول علامہ شبلی "زیب النسا، کا دربار حقیقت میں ایک اکیڈمی (بیت العلوم) تھی، ہر فن کے علما، و فضلا، نوکر تھے، جو ہمیشہ تالیف و تصنیف میں مشغول رہتے تھے، یہ کتابیں عموماً اس کے نام سے موسوم ہوتی تھیں یعنی ان کے نام کا پہلا جز زیب ہوتا ہے"۔ مآثر عالمگیری کا مصنف لکھتا ہے:-

"و از تحصیل علوم عربی و فارسی بہرۂ تمام براندوختہ و از اقسام خطوط نستعلیق و نسخ و شکستہ نصیبۂ وافی حاصل کردہ و از بسکہ ہمت قدسی نہمت آں قدر شناس رتبۂ علم و ہنر بجمع کتب و تصنیف و تالیف مصروف بود و عنان توجہ بترفیۂ حال ارباب فضل و کمال معطوف در سرکار علیہ کتاب خانہ گرد آمدہ بود کہ بنظر ہیچ یکے در نیامدہ باشد و بسیارے از علما، و فضلا، و علما و شعراء

وفشان بلاغت دثار، خوشنویسان سحرنگار بایں ذریعہ کامیاب انفصال آں صد آراے

عزت وجلال بودند[۱]

انہی علما میں ایک عالم ملا صفی الدین اردبیلی تھے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیب النساء کے استاد بھی تھے، لیکن کسی معتبر سند سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، مگر اتنا مسلم ہے کہ وہ شاہزادی کے درباری متوسلین میں تھے، افسوس ہے کہ ان کے حالات تلاش کرنے کے باوجود کسی تاریخ و تذکرہ میں نہیں ملے، مآثر عالمگیری سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاہزادی کے حکم سے کشمیر میں رہتے تھے، اور اس کے ایما پر انھوں نے امام رازی کی تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ زیب التفاسیر کے نام سے کیا تھا[۲]، بعض اور کتابیں بھی لکھی تھیں[۳]، زیب التفاسیر کئی جلدوں میں تھی، لیکن اب اسکے صرف چھٹے حصہ کا پتہ بعض کتب خانوں میں چلتا ہے،

ملا صفی الدین حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کے شرف سے بھی مشرف ہوئے تھے، اس کا سفرنامہ انھوں نے انیس الحجاج کے نام سے لکھا تھا، یہ سفرنامہ اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ ہندوستان میں فارسی زبان کا پہلا سفرنامہ ہے، اور اس میں وہ تمام معلومات ہیں جن سے واقفیت اس زمانے کے بحری مسافروں کے لیے ضروری تھی، یہ سفرنامہ بہت نایاب ہے، ہندوستان کے کسی کتب خانہ میں اس کا سراغ نہیں ملتا، برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں اس کا نسخہ موجود ہے، ریو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے شاہی توپ خانہ کے کتب خانے میں اس کا ایک نسخہ تھا جس کو الیٹ نے دیکھا تھا[۳]، اس کا ایک نہایت قدیم خوشخط اور مصور نسخہ دار المصنفین میں موجود ہے، قیاس ہے کہ یہ تصنیف کے قریب ہی زمانہ کا نسخہ ہے،

یہ نسخہ ۲ × ۳ کے پچپن صفحات پر مشتمل ہے، درمیان اور آخر کے چند صفحات غائب ہیں لیکن الواب

---

[۱] مآثر عالمگیری ص ۵۳۸ [۲] ایضاً [۳] فہرست کتب خانہ برٹش میوزیم ج ۳ ص ۹۸۰

کی فہرست اور سفرنامہ کے مندرجہ ابواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف چند ہی صفحات نہیں ہیں، کاغذ دبیز بادامی، جدول طلائی اور خط نستعلیق ہے، ہر صفحہ میں ۲۳ سطریں، اور سفر کے مختلف مقامات و مناظر کی نفیس تصویریں ہیں، بعض پورے صفحہ کی ہیں اور بعض نصف صفحہ کی، اور سب تصویریں بالکل تر و تازہ اور تیموری دور کی مصوری کا اچھا نمونہ ہیں، ان کے رنگ و روغن میں ابتک فرق نہیں آیا ہے، اسکی تفصیل مضمون کے آخر میں آئے گی،[19]

سفرنامہ حسب ذیل ابواب پر مشتمل ہے:-

مقدمہ ۔ در ذکر مجملے از کیفیت سلوک فقیر و رفقا، از بندر سورت بجدہ براہ دریا و ادراک موسم بلطف خدا،

طریق اول ۔ در بیان مراعات لوازم سفر بحر و متممات آن، مسلک اول در مقدمات رکوب سفینہ، مسلک دوم در تدبیر ماکول، مسلک سوم در تدبیر مشروبات، مسلک چہارم در تذکرۂ آداب سلوک با رفقا و کلی بمکارم اخلاق با بیگانہ و آشنا، تتمہ در مطائبۂ چند، بسوق کلام و شکر بر نجات از مخاطرہ بحفظ حفیظ علام،

طریق دوم ۔ در ذکر آداب عمرہ و حج اسلام و طوف بیت الحرام و مشاعر عظام و کیفیت و کمیت بقاع متبرکۂ حرم خدا و خصوصیات داخلہ و خارجہ کعبہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً، مسلک اول در آداب حج و فوائد مہمۂ آں، مسلک دوم در نقل بعضے از اوضاع کعبہ شرفہ و مسجد الحرام وغیرہ بروجہے کہ فقیر خود دیدہ، مسلک سیوم در ذکر انچہ دریں باب از تاریخ مکہ مبارکہ تالیف قطب الدین حیدر حنفی مکی انتخاب و ترجمہ نمودہ، مسلک چہارم در شرح انچہ از مفرحۃ الانام دریں مقام انتخاب و ترجمہ نمودہ، تتمہ در مجملے از خصوصیات مشاعر متبرکہ و احوال قوافل بلاد اسلام و فرق مجتمعہ در بلد الحرام و شوکت حجاج و شکوہ قافلہ سالاران مصر و شام۔

طریق سوم در ذکر آداب زیارت مدینہ مشرفہ علی مشرفہا السلام و متمات آں مسلک اول در کیفیت حصول این شرف برائے ایں حقیر با موانع کثیرہ و موجبات تاخیر و ذکر بعضی از بقاع متبرکہ طیبہ مسلک دوم آداب دخول مدینہ مشرفہ و زیارت حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم و زیارت صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ عنہما مسلک سوم در مجملے از اوضاع حرم و بلدہ کرم رسول محترم علیہ من السلام ما ہو اتم مسلک چہارم در اسامی و خصوصیات منازل واقع فی ما بین الحرمین، تتمہ در نخبۂ از مشاہدات بندر جدہ و بندر مخا و تذکرۂ حمد و شکر لطف حق عز و علا بر نجات از مخاطرات دریا خاتمہ در اشارہ بہ نبذۂ از سوانح بعد از نزول از سفینہ و ترغیب بر اعزاز و اکرام فقراء واردین از مکہ و مدینہ کہ در نظر سالکان طریق بحر اتم خیرات و اہم مبرات است۔"

ان ابواب میں جو بحثیں اور معلومات مناسک حج، حج و زیارت کے احکام، اس کے آداب اور مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ کے آثار و مشاہد وغیرہ سے متعلق ہیں، وہ ہر زمانہ میں یکساں رہے ہیں اور ان کے متعلق تفصیلی حالات و معلومات کتابوں میں موجود ہیں، جن سے اہل علم پوری طرح واقف ہیں، اس لیے ان کے تذکرے کی ضرورت نہیں، لیکن اس زمانہ کے بحری سفر کے متعلق جو دلچسپ معلومات، مفید ہدایات، مختلف ملکوں کے حاجیوں کی خصوصیات، مصر و شام کے قافلہ سالاروں، محمل مصری، اور شریف مکہ کے جلوسوں کے شکوہ و تجمل کے حالات اور اس قسم کے دوسرے دلچسپ واقعات و معلومات ہیں، وہ اس زمانہ کے لوگوں کے لیے بھی دلچسپ ہیں، اس لیے ان کا خلاصہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جاتا ہے۔

دلی سے روانگی | مصنف شاہزادی زیب النساء سے اجازت لینے کے بعد ۱۲ رجب ۱۰۸۰ھ کو دلی سے نکلے اور ۱۳ شعبان کو احمد آباد اور ۲۲ کو یہاں سے چل کر ۳ رمضان کو سورت پہنچے، رمضان کا مہینہ یہاں گذار کر ۵ شوال ۱۰۸۰ھ کو ایک جہاز پر جس کا نام "سلامت رس" تھا۔

سوار ہوئے۔ اس جہاز میں ۷،۲ مسافر تھے، جن کا نام درج رجسٹر تھا، اور ۵۰ نا معلوم الاسم مسافروں نے خفیہ سفر کیا تھا۔[1]

بندرگاہ سورت | اس زمانہ میں بندرگاہ سورت جس قدر معمور تھی، اس کا اندازہ اس بیان سے ہوگا۔

"و در بندرگاہ مذکور در روز مزبور راز سفائن تجار و معازت و سہ جہاز دیگر (دو بوٹ کہ عبارت از غراب کلاں) و جہاز خرد راست ہمہ مملو از زوار و تجار و مشحون با متعہ و اقمشۂ بیشمار و بضاعات بنایت بسیار بعزم بندر جدہ مجتمع و تیاری نمودند"[2]

سورت سے روانگی | یہ سب جہاز ایک دو دن کے فرق سے آگے پیچھے جدہ روانہ ہوئے، دو شبانہ یوم چلنے کے بعد باد مخالف چلنے لگی، جس سے معلم کو جہاز سیدھے رخ چلانے میں بڑی دشواری پیش آئی اور اس کی رفتار سست رہی، پانچ دن کے بعد تین دن تک سمندر میں سخت طوفان برپا رہا، چوتھے دن صبح کو خدا خدا کرکے ختم ہوا اور مسافروں کی جان میں جان آئی، راستہ میں جو مختلف قسم کے بری و بحری مناظر اور جزیرے اور پہاڑ آتے رہے، مصنف نے ان سب کا ذکر کیا ہے،

اس کے بعد سفرنامہ کا ایک ورق غائب ہے، جس سے بعد کے حالات کا پتہ نہیں چلتا، اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کتنے دنوں میں سفر ختم ہوا، اور جہاز کس بندرگاہ پر ٹھہرا، بعد کے ورق سے اندازہ ہوتا ہے کہ جدہ کے علاوہ کسی دوسری بندرگاہ میں ٹھہرا تھا،[3] چنانچہ مصنف لکھتے ہیں:۔

مکہ کا ورود | الغرض فقیر ایک جماعت کی رفاقت میں جو ستر آدمیوں پر مشتمل تھی، سعدیہ روانہ ہوا، یہاں سے کچھ لوگ جدہ روانہ ہوگئے، اور فقیر نے سعدیہ میں احرام باندھ کر مکہ کا رخ کیا، کچھ دور چل کر ذی الحجہ کا چاند دکھائی دیا، اور تین ذی الحجہ کو مکہ پہنچا، آٹھویں ترویہ کے دن عرفات روانہ ہوا، اور ۹ کو بخیر و خوبی حج سے فراغت ملی،

---

[1] انیس الحجاج ص ۲ [2] ایضاً [3] اس زمانہ میں مکہ کی بندرگاہ مخا تھی، غالباً یہیں جہاز ٹھہرا ہوگا۔

یہ توجہ کی مختصر روداد تھی، اب اس کی تفصیل اور اس سفر کے دلچسپ واقعات ملاحظہ ہوں، مصنف نے بحری سفر کرنے والوں کے لیے بڑی مفید ہدایات تحریر کی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:۔

بحری سفر کے لیے ضروری ہدایات اور مفید مشورے

مسافر کو چاہیے کہ بندرگاہ جاکر خود جہاز کا معائنہ کرے، دوسرے کے بیان پر اعتماد نہ کرنا چاہیے، جو جہاز چھوٹا اور پرانا نہ ہو، اور اس کا رخ مرغ کے سینہ کے مشابہ ہو، اس کا طول اس کے عرض سے زیادہ ہو، اس کا عملہ مستعد اور کارپرداز ہو، اس کے آلات و اسلحہ مضبوط و مستحکم ہوں، اس کو سفر کے لیے انتخاب کرنا چاہیے، جہاں تک ممکن ہو عرشہ پر قیام نہ کیا جائے، اس لیے کہ اس میں حرکت کی زیادتی کی وجہ سے صفراوی مزاج والوں کو دوران سر، متلی، ضعف اور تغیر مزاج کی شکایت ہو جاتی ہے، جہاز کے درمیانی حصہ میں سب سے کم حرکت ہوتی ہے، اس لیے قیام کی سب سے مناسب جگہ یہی ہے، دوسری ضروری چیز جائے ضرور کا انتخاب ہے، اس کو قیام گاہ کے متصل ہونا چاہیے، جہاز کے لیے کم سے کم دو معلم استاد، چند سکانچی، جہاز ڈھونے والے اور ماہر و تجربہ کار اور چست و چالاک خلاصیوں کا ہونا ضروری ہے، اسی طریقہ سے جہاز کا ناخدا ہوشمند خلیق، مہربان اور ایسا منتظم ہونا چاہیے کہ جہاز کے عملہ کو قابو میں رکھ سکے، اور مسافر ان کی ایذا رسانی سے محفوظ رہیں۔

باربرداری وغیرہ کے متعلق ہدایات

ناخدا کو جہاز کی باربرداری میں پوری ہوشیاری اور مہارت سے کام لینا چاہیے، بھاری سامان کو نیچے بار کرنا چاہیے، اور ہلکے اور مسافروں کے ضروری سامان کو اوپر رکھنا چاہیے تاکہ جہاز دائیں بائیں زیادہ حرکت نہ کرے اور طوفان کے وقت خطرے سے کسی حد تک محفوظ رہے۔ اگر جہاز میں ایک معلم فرنگی اور ایک غیر معلم فرنگی ہو تو خدا کے کرم سے امید ہے کہ ضروری امور کی مراعات اور جہاز کی رفتار اچھی رہے گی، کیونکہ فرنگیوں کو

دریا نوردی اور جہاز کے نظم ونسق میں بڑی مہارت ہوتی ہے۔ جن مسافروں کے پاس ساز وسامان ہو ان کو اس کے لیے ایسی محفوظ جگہ انتخاب کرنا چاہیے کہ اٹھانے اور رکھنے میں خلاصیوں کی بے احتیاطی اور نمی پہنچنے کے نقصان سے محفوظ رہے،

ایسے جہاز میں سفر کرنا چاہیے جس کا ناخدا دنی الطبع، لالچی اور حریص نہ ہو اور اپنے فائدے کے لیے حد سے زیادہ سامان جہاز پر بار نہ کرے، اس سے مسافر خطرے میں پڑجاتے ہیں۔ جہاز میں ناخدا کا اپنے اہل وعیال کو ساتھ رکھنا بہت بڑی غلطی ہے جس کی تلافی نہیں ہوسکتی، ایسی صورت میں اگر جہاز کسی خطرہ میں گھر جائے تو ناخدا اتنا سراسیمہ اور بدحواس ہو جاتا ہے کہ تدارک کی صحیح تدبیر نہیں کرسکتا۔

متفرق ضروری مشورے | جہاز میں مناسب جگہ حاصل کرلینے کے بعد مسافر کو حتی الامکان کم حرکت کرنا چاہیے تاکہ ضعف اور دوران سر میں زیادتی نہ ہو۔ اگر صفرا کی وجہ سے دوران سر اور استفراغ ہو تو ترش چیزیں مثلاً رب انار، زرشک، لیمو، سرکہ اور انار دانہ وغیرہ استعمال کرنا چاہیے، اور خلوے معدہ اور شکم سیری دونوں سے بچنا چاہیے، ان سے شکایت اور بڑھتی ہے، اور اگر بلغمی اخلاط کی وجہ سے دوران سر اور استفراغ ہو تو میٹھی چیزیں، شہد، نبات، قند اور خرما وغیرہ استعمال کرنا چاہیے، سوداوی اور دموی مزاج کے لوگ عموماً ان شکایتوں سے محفوظ رہتے ہیں،

جہاز میں آگ سے احتیاط اور ادنی درجہ کے لوگوں کو تمباکو نوشی سے روکنا ضروری ہے،

جہاز کے سفر میں مختلف طبیعتوں اور مختلف مزاج کے مسافر ہوتے ہیں، اور جدہ دنخا جانے والے جہازوں میں عموماً جگہ کی تنگی رہتی ہے، لوگوں میں ضبط وتحمل کا مادہ کم ہوتا ہے، اس لیے لڑائی جھگڑے کے اسباب کو روکنا اور ان کو خوش اسلوبی سے طے کرنا ضروری ہے، جہاں تک ممکن ہو کھانے پینے کی چیزوں سے رفقائے سفر کی تواضع کی جائے، ہر سفر خصوصاً مکہ کے بحری سفر میں آرام د

سہولت اسی میں ہے کہ کم سے کم سامان ساتھ رکھا جائے اور کھانے پینے کی چیزوں میں فیاضی سے کام لیا جائے، مکہ کے سفر میں جس قدر بھی فیاضی کی جائے اسراف میں داخل نہیں ہے خصوصاً فقرا و مساکین اور ناتوانوں کو اپنی ذات پر ترجیح دینا چاہیے، سفرِ حج میں مختلف قسم کی دواؤں کا ساتھ رکھنا، جہاز میں طبیب، فصاد، بڑھئی، لوہار، بندوقچی اور توپچی کا ہونا ضروری ہے، تقویت دماغ اور دفع عفونت کے لیے عطریات خصوصاً گلاب، عرق بیدمشک کا ساتھ رکھنا مفید ہے، اس سے نہ صرف صحت کا تحفظ بلکہ بہت امراض کا علاج بھی ہو جاتا ہے۔

خورد و نوش کا ضروری سامان کھانے کی چیزوں میں آٹا، چاول، چنا، ماش اور مسور کی دال، شکر ساتھ لیجانا ضروری ہے جو واپسی تک کے لیے کافی ہو سکے، کیونکہ حج کے موسم میں آدمیوں کی کثرت کی وجہ سے مکہ اور مدینہ میں عموماً غلہ گراں ہو جاتا ہے، اگر جہاز میں مرغ کا گوشت اور بکری وغیرہ ساتھ لیجائے تو اس کی نگہداشت خود کرنا چاہیے، یا کسی معتبر ملازم کے حوالہ کر دینا چاہیے، جو پوری دیکھ بھال کر سکے، اگر انڈا ساتھ لیجائے تو اس کو پسے ہوئے نمک میں رکھنا چاہیے، اس سے خراب نہ ہوں گے، قورمہ اور قیمہ ایسا ساتھ لیجانا چاہیے جو خوب مرغن اور بھنا ہوا ہو، تاکہ کچھ دنوں تک خراب نہ ہو سکے، اسی طریقہ سے اگر مختلف قسم کی روٹیاں ساتھ لے جانا چاہے تو نان تنک، نان دو آتشہ، آبی، روغنی، زنجبیلی، شکری، روغنی، خطائی، تنلمہ، شکر میں پرورہ، قلچے، ساق عروس اور سنبوسے لیجانا بہتر ہے، ان سے کھانے پینے کی لذت بھی دوبالا ہو جائے گی اور کچھ دنوں تک ٹھہر بھی سکیں گے، یہ شہرت غلط ہے کہ بحری ہوا میں مٹھائی اور روغن مرغوب نہیں ہوتا، بلکہ صفراوی مزاج والے کو بحری سفر میں مٹھائی مفید ہوتی ہے، اس لیے مٹھائیوں میں شکرپارے، نیم شکری، بادام، پستے، اور دوسرے مغزیات کا حلوا، سیب، بہی، اناناس، لیموں، زرشک اور صندل کا مربہ جہاں تک ممکن ہو ساتھ لیجانا چاہیے، یہ چیزیں صحت اور قوت کے لیے بھی مفید ہیں اور ان سے آرام بھی ملے گا،

جو لوگ یہ چیزیں نہ لیجا سکیں، ان کو کم سے کم کشمش، بادام، منقی خرما وغیرہ خشک میوے ضرور ساتھ لیجانا چاہئے، یہ ماکولات کی مختصر فہرست ہے، ورنہ مصنف نے پورے دو صفحوں میں ان کے انواع واقسام لکھے ہیں، اس سے اس زمانہ کے تکلفات کا اندازہ ہوتا ہے،

آج بھی جبکہ سفر میں ہر طرح کی سہولتیں مہیا ہیں سفر کی تکلیفوں، طبیعت کے چڑچڑے پن، مختلف طبقوں اور مختلف مزاج کے انسانوں کے اجتماع اور جگہ کی تنگی کی وجہ سے حاجیوں میں بڑے جھگڑے اور اختلافات پیش آتے ہیں، اور بڑی پرانی پرانی دوستیاں ختم ہو جاتی ہیں، اس زمانہ میں جبکہ سفر کی یہ آسانیاں نہ تھیں اور بھی اختلافات اور جھگڑے پیش آتے رہے ہوں گے اس لیے مصنف نے رفع نزاع پر ایک مستقل باب لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے،

جھگڑے اور اختلافات سے بچنے کی ہدایات اور حسن اخلاق کی تعلیم	فضائل اخلاق سے آراستگی، رذائل کا ترک، حسن اخلاق، خوش خلقی نفس کشی، غیظ وغضب کا ضبط، ناپسندیدہ باتوں سے چشم پوشی

ناخوشگوار امور پر صبر، تکلیف دہ باتوں کا تحمل، ہر حالت میں حسن معاشرت، بقائے محبت اور راحت و سکون کا ذریعہ، سرور و شادمانی کا سرمایہ اور زندگی بسر کرنے کا سب سے بہتر طریقہ ہے، لیکن جہاز کے سفر میں طبیعت کے چڑچڑے پن، سفر کے شدائد اور دوسرے مکروہات کی بنا پر مذکورۂ بالا اصولوں کی رعایت میں کوتاہی ہو جاتی ہے، عرصہ تک مسافروں کے ساتھ یکجائی، ہر وقت کے ساتھ، ان کے اقوال وافعال کے مشاہدہ اور تجربے، مختلف طبقوں، مختلف مزاج، اور مختلف مرتبہ کے لوگوں کے ساتھ سابقہ اور میل جول کی بنا پر ان سے بحث وتکرار اور سوال وجواب کے مواقع زیادہ پیش آتے ہیں، اور کتابوں اور تاریخ کے مطالعے اور عمدہ اور اخلاقی حکایتوں کے سننے کا موقع نہیں ملتا جس سے آدمی کم حوصلہ، تندخو اور نازک مزاج ہو جاتا ہے، اس لیے عقلمند آدمی کو چاہیے کہ مختلف فیہ امور، اختلافی معاملات اور نزاعی مسائل میں اپنے ہی کو حق پر نہ سمجھے،

بلکہ خطا کا رشمار کرے، تحمل و بردباری اور وقار و کم آزاری کو شعار بنائے، بشاشت اور شگفتہ مزاجی کے ساتھ رفقاء کی دلجوئی کرے، اور کھانے پینے کی چیزوں خصوصاً پانی کے معاملہ میں ایثار اور فیاضی سے کام لے، جہانتک ممکن ہو ہرکس وناکس خصوصاً غمزدوں کی غمخواری و دلداری کرتا رہے، اگر کوئی حادثہ یا خطرہ پیش آجائے تو دل مضبوط رکھے، پست ہمتوں کی طرح خوفزدہ کرنے والی باتیں زبان پہ نہ آئے، لوگوں کو تسکین و تسلی دینے کی کوشش کرے، اگر دشمنوں کا مقابلہ ہو جائے یا جہاز میں رخنہ پڑ جائے، اس میں پانی بھرنے لگے یا اس قسم کے اور جو خطرات پیش آئیں ان کے مقابلہ اور تدارک کی پوری کوشش کرے، اس سے لوگوں میں یقین و اعتماد اور استقلال پیدا ہوگا، اگر اس کے بعد بھی تدارک میں ناکامی ہو تو کم سے کم ضمیر مطمئن رہے گا کہ اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں ہوئی،

مذہبی اور اخلاقی کتابوں کا مطالعہ | جہاز میں جہاں تک ممکن ہو، دماغی قوت قائم رکھنے کے لیے ضعف و کمزوری پیدا کرنے والی حرکات سے اجتناب اور مقویات کا استعمال کرتا اور لطف و تفریح کی حکایات سے رفقائے سفر کا دل بہلاتا رہے، منہیات و معاصی اور ان تمام چیزوں سے جو لطف الہٰی سے دوری کا سبب ہیں، احتراز ضروری ہے، ہمیشہ خدا کے فضل و کرم سے متوسل رہے، تاکہ اسکی توفیق سے حصول مقصد میں کامیابی ہو، دوران سفر میں اخلاقی کتابوں خصوصاً احیاء العلوم، سیرۃ النبی، تواریخ اور اخلاق کے مشہور رسائل، جامع الحکایات میبذی اور فرج بعد الشدۃ قاضی تنوخی اور اس قبیل کی دوسری کتابوں کا پڑھنا اور سننا بہت مفید ہے،

اس سفرنامہ کا ایک دلچسپ حصہ مختلف اسلامی ملکوں کے باشندوں کے اوصاف و خصوصیات ہیں جو دوسرے سفرناموں میں بہت کم ملتے ہیں، اس لیے ناظرین اس کو دلچسپی سے پڑھیں گے،

مختلف ملکوں کے حاجیوں کے اوصاف و خصوصیات | حاجیوں میں ایک بڑی جماعت ایسی تھی جس کی وضع قطع خاص قسم کی تھی، اور بڑی شکستہ عربی بولتی تھی، یہ سب بڑے جھگڑالو، غصہ ور اور مراسم انسانیت

سے عاری تھے۔ ان کے اوقات کا بیشتر حصہ دنیاوی امور کی مشغولیت اور سازوسامان کی خریداری میں گذرتا تھا۔ ان کے بیشتر افعال مکر وفریب پر مبنی تھے۔ یہ مغاربہ کہلاتے تھے لیکن ان کو جسم ولباس کی صفائی، چہرے مہرے کی خوشنمائی وغیرہ میں مغربی ملکوں کی خصوصیات سے بہت کم حصہ ملا تھا۔ بلکہ مغاربہ کے اوصاف ومحاسن کے برعکس باتیں نظر آتی تھیں۔

مصر کے قافلہ میں بیس ہزار آدمی نظر آتے تھے جن کی بڑی تعداد فوجیوں اور افسروں پر مشتمل تھی، وہ آپس میں تو ایک دوسرے کی ہمدردی اور امداد واعانت سے کام لیتے تھے، لیکن عربوں کے مقابلہ میں اپنا تفوق دکھاتے اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی سختی و درشتی اور شہ زوری سے کام لیتے تھے۔ ترکی اور مصری عربی، یعنی غلط سلط عامیانہ زبان بولتے تھے، جو تہامہ اور حجاز کے اعلیٰ طبقہ کی زبان سے بالکل مختلف اور بڑی ناہموار، پست اور ادنیٰ درجہ کی زبان تھی، لیکن انکے اونچے طبقے خصوصاً اس کے طلبہ کی زبان اور ان کے محاورے اہل حجاز کی زبان سے قریب تر تھے، حقیر کو آفندیان مصر میں دو آدمیوں سے باتیں کرنے کا اتفاق ہوا، ان کی زبان عربیت اور نحو کے اعتبار سے حرمین کے باشندوں سے بھی زیادہ صحیح تھی، اہل تہامہ کی فصاحت وبلاغت کے متعلق کتابوں میں بہت پڑھا تھا، اور اس کے شواہد بھی موجود ہیں، لیکن جہانتک الفاظ کی صحت، حروف کے صحت مخارج اور عربی اسلوب کا تعلق ہے، مصر کے طلبہ بہت صحیح عربی بولتے ہیں، لیکن مصریوں میں مکر وفریب، جھوٹ، فتنہ وفساد ابتذال وسفاہت اور نفاق اتنا عام ہے جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی۔

مصر کے قافلہ میں زیادہ تر ترک منش اور تاجیک روش فوجی، عام رعیت اور ادنی طبقہ کے لوگ تھے، جو اپنے عادات وخصائل میں ہندوستان کے کشمیریوں سے بھی بازی لے گئے تھے،

شام کے حجاج خواہ وہ فوجی ہوں یا عام رعیت، شام کی آب وہوا کی طرح جسکی خوبی ولطافت

مشہور ہے، خوبصورت، خوش وضع اور خوش اخلاق ہیں، اور دوسرے اوصاف و محاسن میں اگر وہ "مکان سائرا عادات" سے بڑھکر نہیں تو کسی سے کم بھی نہیں ہیں، اور عقل و دانش، وضع قطع اور اخلاق و عادات میں دوسرے ملکوں کے قافلہ کے لوگوں میں جو فرق نظر آتا ہے وہ ان میں کم ہو، ان کے رنگ کی صباحت، بیان کی ملاحت و اعضاء کے تناسب اور وضع و ہیئت کی خوبی ولقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کا نمونہ اور ان کے پسندیدہ عادات و خصائل میں قد افلح من زکٰھا کا منظر نظر آتا ہے، اور قد خاب من دسّٰھا کا مصداق مصری ہیں جس کے بہت سے شواہد پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ایک معتبر اور قابل اعتماد شخص سے سننے میں آیا کہ اب سے چند سال پیشتر ایک دن مصر کے ایک ممتاز شیخ جو بڑے صاحب اقتدار تھے اور جن کے پیرووں کی بڑی تعداد تھی مسعیٰ سے گذر رہے تھے کہ ان کی نظر مسجد حرام کے پھاٹک سے حرم کے صحن پر پڑی، اس کی وسعت، کشادگی اور روح افزا منظر کو دیکھکر اپنے رفقاء سے کہنے لگے کہ اندرون شہر ایسی وسیع اور ہموار جگہ کو چھوڑ کر جو اونٹ باندھنے کے لیے نہایت موزوں ہے، تم لوگ اپنے اونٹ ایک تنگ اور گنجان جگہ میں باندھ کر خوا مخواہ کی پریشانی اٹھا رہے ہو، یہ سنکر ایک شخص نے کہا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، یہ تو مسجد حرام اور اہل اسلام کی عبادت گاہ ہے، اس کے وسط میں کعبہ معظمہ، خانہ خدا اور مسلمانوں کا مطاف ہے، یہ کیسی لغو بات آپ نے زبان سے نکالی، کیا آپ کو اس کا علم نہیں ہے،" صاحب معرفت شیخ نے غصہ میں جواب دیا :-

واللہ جئت اثنتین وعشرین	خدا کی قسم میں بائیس مرتبہ اس شہر میں آیا اور حج بھی
مرۃ الی ھذا البلد وحججت ،	کیا مگر یہ جگہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی،
وما رأیت ھذا المکان وما عرفت ما تقول	اس لیے تمھارا کہنا میری سمجھ میں نہیں آیا،

اسی طرح ایک اور واقعہ ایک متقی بزرگ سے سننے میں آیا۔ ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک مصری سے جو کئی مرتبہ حج اور تجارت کے لیے مکہ آچکا تھا، واپسی میں کسی نے پوچھا کہ آپ کئی حج کر چکے ہیں، آپ کو حرم کے کون کون سے مقام یاد ہیں، اس" واہی واقف کار" نے چند نام بتلائے سائل نے عربی میں پوچھا کہ آپ نے زمزم کو بھی دیکھا، اس نے جواب دیا،

(اہی وا) کان رجل یبیعن الکحل فی باب السلام — ہاں یہ شخص باب السلام پر سرمہ بیچا کرتا تھا۔

حاضرین نے کہا کیا خوب، زمزم تو ایک کنواں ہے جس کا پانی پیا جاتا ہے،" عارف کامل" نے جواب دیا

واللہ حکیت (حججت) خمسۃ وعشرین	خدا کی قسم میں نے پچیس مرتبہ حج کیا اور
مرتبۃ وما شفت البیر لعلہ	کنواں میں نے نہیں دیکھا، غالباً اس کے
فحر (حضر) ما خرجت	بعد کھودا گیا۔

اعراب بادیہ کا قافلہ دس ہزار نفوس پر مشتمل تھا جو ایک خاص امتیازی لباس میں نظر آتا تھا، اس کی ہر چیز کو دیکھکر سخت تعجب ہوتا تھا کہ ان کو لوگ کیا سمجھتے ہیں اور کیا نکلے،

ہندی قافلہ، ہندی، تورانی، ایرانی مختلف رنگ و نسل کے لوگوں پر مشتمل تھا، اور اپنے اوضاع و اطوار میں نمایاں اور ممتاز تھا، اور حاجی نما خلاصیوں کی کثرت، نتی مغز زائروں کے اژدحام اور فقراء کے ہجوم میں اس کے مختصر معتدل آدمی اور بھی ممتاز نظر آتے تھے،

ایران کا قافلہ جس کا بڑا حصہ دریائے گنگ اور دریائے کنار کے راستہ سے اور کچھ لوگ بغداد اور نجف کی راہ سے آئے تھے، اپنے لباس، وضع قطع اور معاشرت میں انتہائی افلاس زدہ تھے، لیکن عربوں اور ترکوں کی ایذا رسانی کے خوف سے اس حالت میں رہنے پر مجبور تھے، اگر ایسا نہ کریں تو ان کا آنا ناممکن ہے، اور ان کی جان خطرہ میں پڑ جائے۔

یمن کے قافلہ میں چند فلاکت زدہ مدینہ منورہ کے زائرں کے ہجوم کے ہم کاب تھے اور دوسرے قافلے والوں کے مقابلہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں معلوم ہوتی تھی۔

شریف برکات کی سواری کا جلوس غرۂ ذی الحجہ کے بعد اور یوم ترویہ سے قبل ۶ ذی الحجہ کو بڑے شکوہ و تجمل کے ساتھ شریف برکات کی سواری نکلی، ان کے جلوس میں سات سو پیادہ اور پانسو سوار، عرب حبشی اور ترکی فوج تھی، مختلف قسم کے ترکی باجے آگے آگے بجتے جاتے تھے، ایک چتر بردار شریف کے سر پر ایک مکلف چتر لگائے ہوئے تھا، ایک لونڈی خوشبو کے لیے عود کی انگیٹھی اور دوسری عود کی سینی سر پر رکھے آگے آگے چل رہی تھی، یہ جلوس تنعیم کی راہ سے مکہ کے باہر مصر کے ایک بڑے عہدہ دار اور امیر الحاج عبدی پاشا کی فرودگاہ پر پہنچا جو مصر سے شریف مکہ کے لیے خلعت لائے تھے، شریف برکات یہ خلعت پہنکر دو گھنٹے کے بعد اسی راہ سے مکہ واپس آئے۔ یہ خلعت زربفت کے عربی چغے اور زری کی خفتان پر مشتمل تھی، شریف کے گھر واپس آنے کے بعد سات سو بندوقوں کی سلامی دی گئی، ۷ ذی الحجہ کو اسی شان اور اسی راستہ سے شریف کا دوسرا جلوس نکلا، اور اسی جگہ شام کے امیر الحاج احمد پاشا کا خلعت پہنکر واپس آیا۔

امیر الحاج مصر اور محمل مصری کا جلوس ۲۶ چھبیسویں ذی الحجہ کو مصر کا قافلہ مکہ سے باہر چلا گیا، اور اس کے امیر الحاج ... خوش جمال اور سفید ریش بزرگ تھے، شریف مکہ سے رخصت ہو کر اور ان کا خلعت پہنکر مصری فوج و سپاہ کے ساتھ اسی راہ سے گذرے، محمل مصری جو سیاہ اطلس سے ڈھکا ہوا اور سنہرے قبوں سے آراستہ تھا، رنگارنگ علموں کے جھرمٹ میں بڑے شکوہ و تجمل کے ساتھ تنعیم کے راستہ سے مدینہ منورہ روانہ ہوا، امیر الحاج فوجی دستہ کے ساتھ اس کے عقب میں تھے، ان کے پیچھے علم بیرقین اور مختلف قسم کے باجے اور ساز تھے، تقریباً دو ہزار سوار اور تین ہزار پیادہ سپاہ پر یہ جلوس مشتمل تھا، اور بے شمار اونٹوں پر مختلف قسم کا

ساز وسامان بار تھا، اور دو دو آراستہ اور پیراستہ اونٹوں کے درمیان پرتکلف تخت رواں تھا،

امیر الحاج شام کی سواری کا جلوس | ۱۶ محرم کو امیر الحاج شام اسی طریقہ سے شریف مکہ سے رخصت ہوکر پورے شکوہ و تجمل کے ساتھ اسی راستہ سے مدینہ منورہ روانہ ہوئے، ان کا جلوس شان وشوکت، شکوہ و تجمل، جھنڈوں، بیرقوں، سوار و پیادہ، مسلح فوج، اونٹوں کی قطار اور تخت رواں کی کثرت کے لحاظ سے امیر الحاج مصر کے جلوس سے بھی زیادہ شاندار تھا، ان کو رخصت کرنے کے لیے خود شریف مکہ کے لڑکے سوار و پیادہ فوج اور اشراف و عمائد مکہ کے ساتھ آئے تھے، اور مکہ سے باہر تک انکی مشایعت کی۔

منیٰ اور مکہ کے چراغاں | مکہ سے ان قافلوں کی روانگی ایک بڑی تقریب معلوم ہوتی تھی لیکن ان دونوں قافلوں نے گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کی شب کو منیٰ میں جو چراغاں کیے تھے اور ربیع الاول میں مولد مبارک کی شب کو مکہ کے عظماء و اکابر نے جو روشنی کی تھی وہ اس حقیر اور ان لوگوں کی نگاہ میں جنھوں نے اعلیٰ حضرت صاحبقران ثانی (شاہجہاں) اور اماثل جلوس حضرت ظل سبحانی (اورنگ زیب) کے جشن جلوس کا چراغاں اور جمنا میں کشتیوں کی آرائش اور ان کا اجتماع دیکھا ہے نہیں جچی،

چھیانوے مثقال کا الماس | ۱۰۸۶ھ کا ایک قابل ذکر واقعہ معتبر آدمیوں سے یہ سننے میں آیا کہ ولایت سنار (زنجبار) کے بادشاہ سلطان باری بن سلطان رباط نے جو ایک دیندار بادشاہ ہے، اپنے پڑوس کے ایک کافر بادشاہ پر حملہ کرکے اس کو شکست دی، مال غنیمت میں منجملہ اور چیزوں کے چھیانوے مثقال کا ایک سالم اور بے عیب الماس بھی ہاتھ آیا، اس کو اس نے روضۂ نبوی کی نذر کردیا،

اندرون خانۂ کعبہ کی زیارت | عاشورہ کے دن خانۂ کعبہ کا دروازہ کھولا گیا اور لوگوں کو بار عام کی

اجازت دی گئی، اس وقت ہندوستان اور ایران کے جو حاجی رہ گئے تھے وہ من دخلہ آمنا کے شرف سے مشرف ہوئے۔ اس حقیر کو بھی یہ شرف حاصل ہوا۔ اور چند رکعت نماز تو وہ پڑھکر اندرون کعبہ کی ان خصوصیات کا آنکھوں سے مشاہدہ کیا جن کو رسالہ مفرح القلوب[1] میں پڑھا تھا۔ الحمد للّٰہ کثیرا کما ھو اھلہ ومستحقہ علی نیل السعادات الکاملۃ فی ھذا السنۃ سیما ھذہ المنحۃ الکبریٰ والعطیۃ العظمیٰ حسن اتفاق سے اس سال عرفہ جمعہ کو پڑا تھا اس لیے بقول اکثر خصوصاً بلد الحرام کے باشندوں کی اصطلاح میں حج اکبر کی سعادت حاصل ہوئی۔

زیارت مدینہ طیبہ ۲۳ محرم کو مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ روانہ ہوئے، اور آٹھویں صفر کو مدینہ پہنچے، اور روضہ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے بعد آسودگان جنۃ البقیع کے مزارات اور دوسرے آثار و مشاہد مقدسہ کی زیارت کے شرف سے مشرف ہوئے، مدینہ میں بہت کم قیام کا موقع ملا، آٹھویں ماہ صفر کو مدینہ پہنچے تھے اور [illegible] ویں صفر کو پھر مکہ واپس آگئے، اس لیے یہاں کے واقعات میں آداب زیارت وغیرہ کے علاوہ اور کوئی واقعہ قابل ذکر نہیں ہے۔

مکہ اور مدینہ کی درمیانی منزلیں اس زمانہ میں مکہ اور مدینہ کے درمیان حسب ذیل منزلیں تھیں، وادی فاطمہؓ، یہ ایک نہایت دلکشا مقام ہے۔ اس میں شیریں اور خوش ذائقہ پانی کی قناتی نہر جاری ہے، اور سرسبز و شاداب نخلستان ہیں، قعرہؓ یہ ایک بے آب وگیاہ میدان ہے، یہاں پانی وادی سے لاتے ہیں، اور قافلہ کی فرودگاہ پر ایک سبیل بھی رہتی ہے، جو شریف محسن کی سبیل کے نام سے موسوم ہے، عسفانؓ یہاں دو کنوئیں ہیں، ایک کنوئیں کا پانی بہت شیریں اور لطیف ہے، خلیصؓ یہاں پانی کی ایک نہر ہے، اور قریب ہی ایک تالاب و نخلستان بھی ہے، خبط مجنوںؓ یہ ایک بے آب وگیاہ دشت ہے، لیکن بڑا دلکشا مقام ہے، رابغؓ یہاں بازار، نخلستان اور دو کنوئیں ہیں مستورہؓ

---

[1] تالیف سید زین العابدین کاشی مجاور مکہ معظمہ

یہ بھی بے آب وگیاہ دشت ہے، اور یہاں صرف کھاری پانی کا ایک کنواں ہے، اس کے متصل ایک قبہ نامور سید سید یحییٰ کا مزار ہے، بیر حسن یہاں ایک کنواں ہے جس کا پانی عربوں کے لیے اونٹ کے دودھ سے زیادہ لذیذ اور نفع بخش ہے۔ صفراء، یہاں آب جاری کی دو نہریں ہیں اور نخلستان بھی ہیں، بڑا دلکش اور فرحت افزا مقام ہے، یہاں کی کھجوریں، لیموں اور نارنج بہت مشہور ہیں، یہیں مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ کا مزار ہے، روحاء، یہاں پانی کا ایک کنواں اور چند تالاب ہیں، حضرت ابو عبیدہؓ[1] ابن عم رسولؐ کا مزار بھی یہیں ہے۔

اس کے علاوہ بدر کی راہ سے مدینہ منورہ کا ایک اور راستہ بھی ہے، یہ راستہ مستورہ کی منزل سے جدا ہو جاتا ہے، اور یہاں سے داہنی جانب سمندر کی سمت سے ہو کر جاتا ہے، اس کے مغربی جانب سمندر کا فاصلہ دو شبانہ یوم کا ہے، اس راستہ میں مدینہ سے ینبع جاتے ہیں، پھر بدر کے راستہ سے صفرا ہوتے ہوئے سفر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا ایک عجیب واقعہ اس مقدس سفر میں اس حقیر اور اس کے رفقاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے جو الطاف وعنایات ظاہر ہوئے ان میں سے ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ مدینہ منورہ کی زیارت سے شرف اندوزی اور مکہ مکرمہ سے واپسی کے بعد جب وطن کی مراجعت کا وقت آیا تو اس بارہ میں بڑا تذبذب پیدا ہوا کہ اسی جہاز پر سفر کیا جائے جس پر آنا ہوا تھا یا دوسرے جہاز پر جس کا نام فتحی تھا، اور اسکا مالک ایک بغدادی محمد چلپی تھا، یہ جہاز پہلے جہاز "سلامت رس" سے ہر حیثیت سے بہتر تھا، اس لیے یہ اسی پر جانا چاہتا تھا، چنانچہ ایک عزیز کے ذریعہ اس کے حالات کی تحقیقات کی، انھوں نے بھی تائید کی، اسی دوران میں معلوم ہوا کہ جہاز کے مالک محمد چلپی نے جہاز ایک افغانی کے ہاتھ بیچ دیا ہے، اس نے بھی اس حقیر کو خط لکھا اور اپنے جہاز پر سفر کرنے کی ترغیب دی لیکن اس سے پھر طبیعت میں تذبذب پیدا ہو گیا،

---

[1] مصنف سے حسب ذیل مہو ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی چچازاد بھائی کا نام ابو عبیدہ نہیں تھا اور مشہور صحابی ابو عبیدہ بن جراح کی وفات طاعون عمواس میں ہوئی تھی اور ان کا مزار شام میں ہے۔

اتفاق سے اسی درمیان میں ایک شخص تفسیر جلالین کا ایک نسخہ ہدیہ کرنے کے لیے لایا، اور مجھکو دیکھنے کے لیے دیا، میں نے بغیر کسی اہتمام کے جہاز سلامت رس پر سفر کرنے کے لیے فال نکالی، تو یہ آیت نکلی اولٰئک الذین هدی الله فبهداهم اقتده" اس فال پر میں نے اس جہاز پر سفر کرنے کا فیصلہ کرلیا، مگر فتحی پر سفر کے لیے بھی دوبارہ تفاول کیا، تو یہ آیت نکلی" فکان من المغرقین" اس جہاز پر آٹھ سو سے زیادہ حاجی سفر کرنے والے تھے، اس لیے اس فال سے بڑی پریشانی ہوئی لیکن اس کے اظہار سے مسافروں میں پریشانی اور ان کے سفر میں خلل پڑنے کا اندیشہ تھا، اس لیے دوسرے تفاول کو سفر کے شدائد اور تکلیفوں پر محمول اور خدا کے لطف و کرم پر بھروسہ کرکے اس کو کسی پر ظاہر نہیں کیا لیکن بعض لوگوں کو معلوم ہوگیا، ان سے فتحی جہاز کے مسافروں کو بھی اس کی خبر پہنچ گئی، مگر اس کو انھوں نے فتحی جہاز سے میری ناراضگی پر محمول کیا اور اپنا ارادہ فسخ نہیں کیا، اور میں نے سلامت رس کا سفر اختیار کیا، اور ۲۵ دن میں بخیریت سورت پہنچ گیا، اس کے بعد دوسرے جہازوں کی آمد شروع ہوئی، فتحی جہاز کو بھی راستہ میں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا، لیکن بندرسورت پہنچنے کے بدنگرگاہ کے قریب کسی حادثہ سے ٹوٹ گیا، مسافروں کا سارا سامان تلف ہوگیا لیکن مسافر کسی نہ کسی طرح بہزار وقت بچ گئے اور کوئی جان ضائع نہیں ہوئی۔

تصویریں | سفرنامے کی تصویروں کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

پہلی تصویر۔ " نمونہ بندرسورت وجہاز ہوری" پورے صفحہ کی ہے،

دوسری تصویر۔ "بحر عمان وجہازات" اس میں جہاز کو سمندر میں چلتے ہوئے دکھایا گیا ہے، پورے صفحہ کی ہے،

تیسری تصویر۔ "نمونہ مشعر الحرام والتقاط حصبات جمرات" اس میں احرام پوش حاجیوں کو کنکریاں چنتے اور عبادت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، پورے صفحہ کی ہے،

چوتھی تصویر۔ "نمونہ قریہ منی ومناسک آں از حلق ونحر وذبح ورمی جمرات" اس میں حاجیوں

کو شیطان کو کنکریاں ارتے، حجامت بنواتے اور قربانی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، پورے صفحہ کی ہے،

پانچویں تصویر "نمونہ عمارت مولد النبی صلی اللہ علیہ وسلم" اس میں حسب ذیل آثار کی تصویریں ہیں قبہ مولد شریف، مصلی، مولد شریف فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا، مدرسہ سلطانیہ، نمونۂ مولد صدیق اکبرؓ تکیہ کمباشی، ان آثار میں حاجی فاتحہ اور دعا میں مصروف ہیں۔

چھٹی تصویر "نمونہ بنیان کو نہاے مسجد الحرام نسبت بہ سموت اربع"۔ یہ چاروں سمتوں کے لحاظ سے خانہ کعبہ کی ایک چھوٹی سی تصویر ہے،

ساتویں تصویر "نمونۂ حاجیان ولایت مغرب"۔ اس میں شمالی افریقہ کے اسلامی ملکوں کے حجاج کے قافلہ اور ان کی فرودگاہ کا منظر دکھایا گیا ہے، پورے صفحہ کی ہے،

آٹھویں تصویر۔ "نمونہ قافلہ حاجیان مصر"۔ یہ مصر کے قافلہ کے حاجیوں کی نصف صفحہ کی تصویر ہے

نویں تصویر "نمونہ قافلہ حاج شام" یہ شام کے حاجیوں کے قافلہ کی تقریباً پورے صفحہ کی تصویر ہے

دسویں تصویر "نمونہ قافلہ عرباں صحرا نشین و اہل نجد" یہ بدوی عربوں اور اہل نجد کے قافلہ کی تصویر ہے،

گیارہویں تصویر "نمونہ قافلۂ ہند"۔ چوتھائی صفحہ کی ہندوستانی قافلہ کی تصویر ہے،

بارہویں تصویر۔ "نمونہ قافلہ ایران" نصف صفحہ کی ہے،

تیرہویں تصویر "نمونہ سواری شریف برکات حاکم حرمین شریفین بجہت استقبال و پوشیدن تشریف سلطان محمد خوندکار روم" یہ پورے صفحہ کی نہایت عمدہ تصویر ہے، اس میں خلیفۃ المسلمین سلطان محمد کے فرستادہ خلعت کے استقبال کے لیے شریف برکات کی سواری کا جلوس دکھایا گیا ہے۔

چودہویں تصویر۔ سواری عبدی پاشا امیر حاج مصر بوقت رفتن از مکہ معظمہ بسوے مدینہ مشرفہ" اس میں محمل مصری کا جلوس دکھایا گیا ہے، پورے صفحہ کی تصویر ہے،

پندرھویں تصویر۔ "نمونہ بندر مخا" اس میں مخا کی بندرگاہ، یہاں کے حاکم سید حسن ان کی اقامت گاہ اور سواری کی نصف صفحہ کی تصویر ہے۔

سولھویں تصویر۔ "نمونہ شیر ربودن جوان"۔ اس میں ایک شیر کے ایک نوجوان کو پکڑ لینے کی چھوٹی سی تصویر ہے۔

سترھویں تصویر۔ "نمونہ سوار غیبی کہ جوان را رہا نید"۔ اس میں ایک غیبی سوار کے نوجوان کو شیر کے منہ سے چھڑانے کی تصویر ہے۔

اٹھارھویں تصویر۔ "نمونہ مواصلت جوان و مادر"۔ اس میں جوان کے اپنی ماں سے ملنے اور اس کی مسرت میں دعوت کی تصویر ہے۔

انیسویں تصویر۔ "نمونہ بندر جدہ"۔ اس میں جدہ کی بندرگاہ، اس کے مکانات، جامع مسجد اور حاکم جدہ کی تصویر ہے۔

اسلام اور عربی تمدن

شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیۃ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور پھر یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

(از شاہ معین الدین احمد ندوی)

ضخامت ۳۲۴ صفحے قیمت :- ؏

منیجر

اسلامی رصد خانے

(از جناب شبیر احمد خانصاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش)

آج سے چوّن سال پیشتر اس موضوع پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا، جو "الندوہ" (مارچ و مئی ۱۹۰۹ء) میں شائع ہوا۔ اس کے افتتاحیہ میں سید صاحب نے فرمایا تھا:۔

"اسلامی رصد خانوں کی تاریخ ایسی سخت تاریکی میں ہے کہ غیروں (دائرۃ المعارف) کو چھوڑ کر خود اپنوں (ابن خلدون) کو ان کی واقفیت نہیں ہے، اس لیے ان پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔"

چوبیس سال بعد "خیام" میں اس کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے پھر لکھا:۔

"میں نے الندوہ کے ماہ مارچ اور ماہ مئی ۱۹۰۹ء میں اسلامی رصد خانوں پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے جس سے زیادہ مکمل مضمون اس باب میں اب تک میری نظر سے نہیں گذرا۔"

اور یہ واقعہ ہے کہ یہ صرف ۱۹۳۳ء تک بلکہ غالباً آج کے دن (۱۹۶۳ء) تک اس موضوع پر کسی محقق نے زحمت تحقیق گوارا نہیں کی ہے اور سید صاحب کا یہ مفید مقالہ اپنے موضوع پر یہ واحد پیش کش ہے۔ لیکن گذشتہ پچاس سال میں مسلم ریاضی و ہیئت کے بہت سے شاہکار جو اس وقت مخطوطات کی شکل

میں بھی کمیاب تھے، شائع ہوکر آج اس موضوع کے طالب علموں کی دسترس تک آگئے ہیں، لہذا ان نئے ماٰخذ و مصادر کی روشنی میں اس "نقش اول" کی تجدید کی جارہی ہے۔ ع

گاہ گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

خلاصۂ مقالہ | سید صاحب نے اسلامی رصد خانوں کی تفصیل سے پیشتر غیر اسلامی رصد خانوں کی مختصر تاریخ دی تھی، پھر رصدگاہ مامونی کو شرف اولیت دینے کے بعد آلات رصدیہ کا اجمالی بیان کیا تھا، آخر میں اسلامی رصد خانوں کا تذکرہ کیا تھا۔

جہاں تک غیر اسلامی رصد خانوں کی تاریخ کا تعلق ہے، اور لوگوں نے بھی اس پر لکھا ہے، اس لیے اس کا اعادہ چنداں ضروری نہیں ہے، آلات رصدیہ کا تعارف ایک مستقل بحث ہے اور مستقل مقالہ کی متقاضی ہے، مقالہ کا مقصد اسلامی رصد خانوں کا تذکرہ ہے، سید صاحب نے اس ضمن میں حسب ذیل رصد خانوں کا ذکر کیا ہے:۔

(۱) رصد مامونی بغداد، (۲) رصد مامونی دمشق (۳) رصد دینوری (۴) رصد بتانی
(۵) رصد بوزجانی، (۶) رصد ابن اعلم (۷) رصد شرف الدولہ (۸) رصد حاکمی
(۹) رصد ملکشاہی، (۱۰) رصد بیرونی، (۱۱) رصد علاء الدین (۱۲) رصد کوشیار
(۱۳) رصد ابن زرقالی، (۱۴) رصد مامونی (۱۵) رصد مسترشد باللہ (۱۶) رصد فہاد شروانی
۱۷۔ رصد مراغہ، (۱۸) رصد ابن لکماد (ابن الکماد) ۱۹ رصد ابن شاطر (۲۰) رصد تقی الدین بن معروف شامی
۲۱۔ رصد شمس الدین محمد کیلی خواجہ ۲۲۔ رصد الغ بیگ، ۲۳۔ رصد فیروزشاہی، ۲۴۔ تیموری سلاطین اور علم ہیئت (ہمایوں، شاہجہاں)
(۲۵) رصد محمد شاہی

سید صاحب نے اسلامی رصد خانوں کا آغاز "رصد مامونی بغداد" سے بتایا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"... ان رصد خانوں کی بنیاد تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے، جب مامون سریر آرائے خلافت تھا۔

آگے چل فرماتے ہیں :۔

"سب سے پہلا اسلامی رصد خانہ جیسا کہ عام طور سے معلوم ہے رصد مامونی ہے"۔

۱۹۳۳ء میں سید صاحب کے اس مفید مقالہ کا انگریزی ترجمہ اسلامک کلچر میں شائع ہوا اس کا

آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے :۔

The begining of Muslim observatories is Tra-
-ced back to Al-Mamun's days in The Third
century A.D

لیکن بعد میں مترجم نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے بیان پر اعتماد کرکے ترصد " (فلکی مشاہدات)

کا شرف اولیت احمد النہاوندی کے جندی سابور میں کیے ہوئے مشاہدات کو دیدیا، اس میں نہاوندی

کی زیچ کا نام المشتمل بتایا گیا ہے، لیکن چونکہ حاجی خلیفہ نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، اس لیے مترجم

کو اس کی صحت میں تردد ہے، (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

اگر اس مفید مقالے میں دو چیزیں اور بھی ہوتیں تو بڑا اچھا ہوتا : آخذ و مصادر کا حوالہ اور تاریخی

تسلسل (مثلاً رصد بوزجانی کو رصد ابن اعلم پر اور رصد ملک شاہی کو جو عہد سلاجقہ کا کارنامہ ہے، رصد

بیرونی اور رصد علاء الدولہ سے پہلے بیان کیا ہے، جو تقریباً نصف صدی پیشتر ظہور میں آچکی تھیں)

انسانی معاشرہ کی دیگر مساعی کی طرح علمی تحریکات بھی سلسلۂ علل و معلولات کی پابند ہیں،

اور ان کا آغاز و ارتقاء اور اسراع و ابطاء تاریخی عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کے پیش نظر مختصراً تو

پیش کیا جارہا ہے، اس کے ساتھ اس اصول کے تحت کہ انسانی مساعی کی تاریخ نہائی نہیں بلکہ مدیجی

و تسلسلی ہوا کرتی ہے، رصد گاہ مامونی کا پس منظر بھی ایک طائرانہ نگاہ کا مستحق ہے، اس لیے اس کا آغاز

اسی سے کیا جارہا ہے، و باللہ التوفیق]

(۱) رصدگاہ مامونی سے پہلے

سرکاری سرپرستی میں پہلی رصدگاہ بعہد مامون الرشید تعمیر ہوئی مگر علم الہیئت کے ساتھ اعتناء اور باقاعدہ ارصاد اور فلکیاتی مشاہدات کا آغاز اس سے پہلے ہو چکا تھا، خود اسلام ہیئتی سرگرمیوں کی ہمت افزائی کرتا ہے، اس لیے مسلم علم الہیئت کا نقطۂ آغاز بجا طور پر عہد نبوت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۔ عہد نبوی اور خلافت راشدہ۔ ہیئتی سرگرمیاں اور فلکیاتی مشاہدات ملت اسلامیہ کا مقدس ترین ورثہ ہے۔ اسی نے ہمارے جد امجد سیدنا ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی چشم جہاں بیں پر توحید کا سرمہ لگایا، بقول اقبال

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب — جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل

اسلام مظاہر کائنات کے مشاہدات کی (جو تمام طبیعی علوم کی اصل ہے) عموماً تحریص و ترغیب کرتا ہے، قرآن کہتا ہے:

أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ مِن شَيْءٍ

اور خاص طور سے فلکی مشاہدات کی، کیونکہ یہ مطالعہ انسان ہی کے فائدے کے لیے ہے

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً	وہی ہے جس نے سورج کو جگمگاتا بنایا اور
وَالْقَمَرَ نُورًا وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ	چاند چمکتا اور اس کے لیے منزلیں ٹھہرا دیں تاکہ
لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ	تم برسوں کی گنتی اور (مہینوں، دنوں وغیرہ کا)
مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ	حساب جانو، اللہ نے یہ نہیں بنایا مگر حق کے ساتھ (تاکہ اس کی قدرت اور اس کی وحدانیت کے دلائل ظاہر ہوں)

چنانچہ جب آیۂ کریمہ اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ الآیہ کا نزول

ہوا تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

ویل لمن لاکھا بین لحییہ ولم	تباہی ہے اس کے لیے جو اپنے جبڑوں سے اس
یتفکر فیہا"	آیۂ کریمہ کی تلاوت کرتا ہو مگر اس کے معانی پر غور نہیں کرتا،

اور یہ رجحان دیندار طبقے میں آخر تک برقرار رہا، چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں :-

من لم یعرف الھیئۃ والتشریح	جو شخص ہیئت اور علم التشریح نہیں جانتا وہ
فھو غنین فی معرفۃ اللہ تعالیٰ	معرفت باری تعالیٰ میں ناقص ہے۔

اسی کے ساتھ اسلام نے نجوم اور جوتش کے ڈھکوسلوں کی بڑی سختی سے بیخ کنی کی، چنانچہ پیغمبر اسلام

صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :

من اتی منجما فلیس منا[1]	جو نجومی کی بات کا اعتبار کرتا ہو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے،

بعد میں نجوم کی ممانعت میں خلفائے راشدین نے بھی اسی تشدید پر عمل کیا، حضرت علیؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا :-

ایھا الناس ایاکم وتعلم النجوم الا	اے لوگو خبردار جوتش نہ سیکھنا سوائے اتنے علم نجوم کے
ما یھتدی بہ فی بر او بحر فانہا	جس سے خشکی اور سمندر میں راستہ تلاش ہو سکے، کیونکہ
تدعو الی الکھانۃ المنجم	جوتش کہانت کا متقاضی ہے، منجم کاہن کے مانند ہے اور
کالکاھن والکاھن کالساحر	کاہن جادوگر کی طرح اور جادوگر کافر کی طرح،
والساحر کالکافر والکافر	اور کافر دوزخ میں جائیگا۔
فی النار	

---

[1] ابن قتیبہ نے کتاب الانواء (ص ۱۳) پر حدیث نبوی بیان کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ثلث من امر الجاھلیۃ الطعن فی الانساب والنیاحۃ والانواء"

اس تہدید نے جوتش کو ہمیشہ کے لیے ممنوع کر دیا، اس طرح اسلام نے علم الہیت کو پہلی
ہم کے ڈھکوسلوں سے آزاد کر کے خالص سائنٹفک بنیادوں پر قائم کر دیا،

اموی دور اموی ملوکیت جس نے زمانۂ جاہلیت کی بعض باتوں کا احیاء کیا، اس کے توہمات اور
سلوں کو بھی سر اٹھانے کی اجازت دیدی، چنانچہ عبدالملک بن مروان کے زمانہ سے نجوم کا ذکر
یں آتا ہے، وہ قدیم نجوم میں "علم ہباب الریاح" (ہواؤں کا رخ پہچاننے کا علم) سے واقف
حجاج بن یوسف والی عراق کے پاس ایک خارجی "سبرہ بن الجعد" لایا گیا، جس سے حجاج
سری باتوں کے علاوہ دریافت کیا:-

هل تعرف النجوم قال انی لاعرف	حجاج نے پوچھا کیا تم نجوم جانتے ہو؟ اس نے
منازل القمر وما اهتدی به	جواب دیا میں چاند کی منزلیں پہچانتا ہوں نیز
فی السفر[1]	ستاروں سے سفر میں رہنمائی کرنا جانتا ہوں،

عبدالملک اپنے تفقہ کے باوجود نجومیوں پر اعتماد کرتا تھا، چنانچہ اس نے اپنے منجم کے مشورہ سے
ہو کر اپنے بھائی کو جسے دشمن سے لڑنے کیلئے بھیجا تھا اس دن لڑائی موقوف کرنے کے لیے کہلا بھیجا،

قد كان مع عبد الملك منجم مقدم	عبدالملک کے ساتھ ایک نجومی تھا جو اس کا
وقد اشار على عبد الملك ان لا يحارب	بڑا مقرب تھا، اس نے عبدالملک کو مشورہ
له خیل فی ذلك اليوم فانه نحوس	دیا تھا کہ اس دن سوار جنگ نہ کریں کیونکہ و
ولیکن حربه بعد ثلاث فانه ینصر[2]	منحوس دن ہے، اور جنگ تین دن بعد ہو، کیونکہ اس میں اس کی فتح ہوگی۔

نے نہیں مانا اور کہلا بھیجا کہ

لا التفت الی زخاریف منجمک[3]	میں آپکے منجم کی خرافات کی طرف توجہ نہیں کرتا،

---

[1] الذہب برحاشیہ کامل ابن اثیر جلد سابع ص ۴ [2] ایضاً ص ۲۲ [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۵۵

باایں ہمہ علم نجوم حکماء واطباء کے ذریعے امراء کے دربار میں مقبول ہوتا رہا، ان میں سب سے زیادہ خالد بن یزید بن معاویہ اس سے متاثر ہوا، چنانچہ جب وہ حصول خلافت سے مایوس ہوگیا تو کیمیا اور ہوس کی ہوس میں پڑ گیا[۱]۔ اس غرض سے اس نے کیمیا کے علاوہ طب اور نجوم کی کتابیں بھی عربی میں ترجمہ کرائیں، ابن ندیم لکھتا ہے:-

الذی عنی باخراج کتب القدماء	پہلا شخص جس نے علم کیمیا کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرائیں
فی الصنعة خالد بن یزید بن معاویہ	خالد بن یزید بن معاویہ ہے ..... وہ پہلا شخص ہے جس کے
.... وھو اول من ترجم له کتب	لیے طب، نجوم اور کیمیا کی کتابیں ترجمہ
الطب والنجوم وکتب الکیمیاء[۲]	کی گئیں۔

جوتش کے علاوہ خالد کو سائنٹفک علم الہیئت سے بھی دلچسپی تھی، چنانچہ بطلیموس کا کرہ بھی اس نے کسی طرح حاصل کیا تھا، بعد میں یہ کرہ فاطمیہ مصر کے پاس پہنچا، جہاں ۴۳۵ھ میں اسے ابن السنبدی نے دیکھا تھا، ابن القفطی اس سے نقل کرتا ہے:-

فرأیت من کتب النجوم والهندسة	میں نے وہاں نجوم، ہندسہ اور فلسفہ کی خاص طور
والفلسفة خاصة ستة آلاف	سے ساڑھے چھ ہزار کتابیں دیکھیں، ان کے ساتھ
وخمس مائة جزء وکرة نحاس	ایک تانبے کا کرہ بھی دیکھا جو بطلیموس کے ہاتھ
من عمل بطلیموس وعلیها مکتوب	کا بنا ہوا تھا، اور جس پر لکھا تھا کہ یہ کرہ امیر
حملت هذه الکرة من الامیر	خالد بن یزید بن معاویہ کے یہاں سے
خالد بن یزید بن معاویة[۳]	لایا گیا ہے۔

اور امویوں کے عہد زوال میں توہیش پرستی کے ساتھ یہ توہم پرستی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی

---

[۱] الفہرست لابن ندیم ص ۳۵۴ [۲] ایضاً ص ۳۵۴ [۳] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۲۸۷

چنانچہ سیوطی نے حماد الراویہ سے روایت کی ہے کہ ولید بن یزید (۸۸ھ - ۱۲۶ھ) نے دو نجومیوں سے اپنی جنم کنڈلی بنوائی تھی،

وقال حماد الراویۃ کنت یوماً عند	حماد الراویہ نے کہا ہے کہ میں ایک دن ولید
الولید فدخل علیہ منجمان	کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ دو نجومی اس کی خدمت
فقالا نظرنا فیما امرتنا فوجدناک	میں آئے اور کہا جس جنم تیرے کا اپنے حکم دیا تھا
تملک سبع سنین[1]	ہم نے بنا کر دیکھا تو معلوم ہوا آپ سات سال حکومت کرینگے۔

اس لیے اس فن میں کتابوں کا لکھا جانا فطری تھا، چنانچہ نجوم کی ایک کتاب کا مخطوطہ جس کا سال کتابت ۱۲۵ھ ہے، حسب تصریح نلینو میلان کے کتب خانہ (Biblioteca Ambrosiana, Milan) میں موجود ہے، اس سے اموی خلافت کے عہد زوال میں نجوم کے فروغ اور اس کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

۳- عباسی خلافت کا آغاز ۱۳۲ھ میں امویوں کے بجائے عباسی خلافت کا آغاز ہوا، اسی زمانہ سے حکومت کی سرپرستی میں علم و حکمت کے ساتھ اعتناء و اہتمام شروع ہوا، پہلے عباسی خلیفہ سفاح کا زمانہ اپنے اموی حریفوں کے قتل اور خونریزی میں گزرا،

سفاح کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر منصور (۱۳۶ھ - ۱۵۸ھ) خلیفہ ہوا، اس کی حکومت کے پہلے نو سال ابو مسلم خراسانی کے قتل اور تخت خلافت کے علوی دعویداروں کے استیصال میں گذرے، اس سے فارغ ہو کر اس نے بغداد کی بنیاد ڈالی، جو عرصہ تک دنیائے علم و ادب کا مرکز رہا،

منصور کو خود علم و ادب کی سرپرستی سے دلچسپی تھی، قاضی صاعد نے لکھا ہے:-

[1] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۱، [2] طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۵۰،

"پس جب اللہ تعالیٰ نے اموی خلافت کی جگہ ہاشمی (عباسی) خلافت قائم کی اور انھیں حکمرانی کا موقع دیا تو ہمتوں میں استواری بخشی اور طاقتیں بیدار ہوگئیں، اس خاندان میں پہلا شخص جس نے علوم و فنون کی طرف توجہ کی خلیفہ ثانی ابوجعفر منصور تھا، جو فقہ میں دستگاہ عالی اور علم فلسفہ بالخصوص فن نجوم میں کمال رکھنے کے ساتھ ساتھ ان علوم کا شوقین اور اسکے ماہرین کا قدر دان تھا۔"[1]

منصور نے علوم عقلیہ کی کتابیں باہر سے ترجمہ کرواکر منگائیں، ابن خلدون لکھتا ہے:-

"پس خلیفہ ابوجعفر نے بادشاہ روم کو ریاضیات کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرا کے بھیجنے کے لیے لکھا۔ اس نے اقلیدس کی اصول ہندسہ اور طبیعیات کی کچھ کتابیں اسے بھیجیں جنھیں مسلمانوں نے پڑھا اور ان کے مضامین سے واقف ہوئے، اس سے ان کتابوں کے لیے جو روم میں باقی رہ گئی تھیں، انکا شوق اور بڑھ گیا۔"[2]

علوم عقلیہ میں سے نجوم کے ساتھ منصور کو خصوصیت سے دلچسپی تھی، وہ بالطبع نجوم کا دلدادہ تھا، قاضی صاعد اندلسی کی تصریح اوپر مذکور ہوئی، سیوطی نے بھی محمد بن علی خراسانی سے نقل کیا ہے:

المنصور اول خليفة قرب المنجمين وعمل باحكام النجوم[3]	منصور پہلا خلیفہ ہے جس نے نجومیوں کو تقرب بخشا اور احکام نجوم پر عمل کیا،

چنانچہ جب اس نے ابراہیم بن عبد اللہ کے مقابلے پر عیسیٰ بن موسیٰ کو بھیجا تو حسب تصریح ابن الاثیر اس کی ہمت افزائی کے لیے کہا کہ یہ خبیث یعنی منجمین کہتے ہیں کہ انجام کار فتح تمھاری ہی ہوگی۔[4] اسی طرح جب نوبخت منجم اسے فتح کی خوشخبری سنانے آیا تو اس نے اس کو انعام میں ایک بڑی جاگیر دی۔[5]

منصور کا منجم خاص نوبخت تھا، جب وہ بوڑھا ہوگیا تو اس کا بیٹا ابوسہل بن نوبخت منجم ہاشمی ہوا، اس زمانہ کا دوسرا مشہور منجم ماشاء اللہ یہودی تھا، جس نے نوبخت کے ساتھ مل کر

[1] طبقات الامم قاضی صاعد اندلسی ص ۷۵، [2] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۸۱، [3] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۸۳
[4] کامل ابن الاثیر جلد خامس ص ۲۱۰ [5] ایضاً ص ۲۱۲

بغداد کی بنیاد ڈالنے کی صورت نکالی تھی،[۱] نوبخت اور ابراہیم الفزاری ہی کی نگرانی میں مہندسین (انجینیروں) نے بغداد کو تعمیر کیا تھا، شہر کے چار ربع چار مشہور مہندسین عمران بن الوضاح، عبداللہ ابن محرز، حجاج بن یوسف اور شہاب بن کثیر نے تعمیر کیے،[۲] مشہور ہیئت دانوں کے نام آگے آرہے ہیں:۔

غالباً اس وقت بغداد میں عرب نظام فلکیات متداول تھا، جسے "علم الانواء" بھی کہتے تھے، کیونکہ اسی انداز پر ابراہیم بن حبیب الفزاری نے اپنی زیج "کتاب الزیج علی سنی العرب" مرتب کی تھی،[۳] اور اسی انداز پر اس کے بیٹے محمد بن ابراہیم الفزاری سے منصور نے برہم سدھانت کا ترجمہ کرایا،[۴] دوسرا ہیئتی نظام ایرانیوں کا تھا جس کی بنیاد "زیج شہریار" (زیک شتریار) پر تھی، اسی پر نوبخت اور اس کی اولاد کا عمل تھا۔

اسی زمانہ میں ایک تیسرا نظام ہیئت بغداد کے علمی حلقوں میں داخل ہوا، یہ ہندوستان کا ہیئتی نظام (السند ہند) تھا، چنانچہ قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے:۔

"اور حسین بن محمد بن حمید المعروف بابن الآدمی نے اپنی بڑی زیج معروف بہ "نظم العقد" میں لکھا ہے کہ ۱۵۶ھ میں خلیفہ ابو منصور کے دربار میں ایک شخص ہندوستان سے پہنچا، جو وہاں کے مخصوص ہیئتی حساب سدھانت میں ماہر تھا...... اس کے ہمراہ ایک کتاب (برہم سدھانت) بھی تھی جس میں بارہ ابواب تھے .... منصور نے اس کتاب کے عربی میں ترجمہ کرنے، نیز اس کے اصول پر علم ہیئت کی ایک کتاب لکھنے کا حکم دیا جسے عرب حرکات کواکب کے حساب میں اصل و معتمد علیہ بنائیں، پس محمد بن ابراہیم الفزاری نے اس کام کو انجام دیا، اور اس کی مدد سے ایک کتاب تیار کی، جسے ماہرین فلکیات السند ہند الکبیر کہتے ہیں۔ اس زمانہ کے لوگ خلیفہ مامون الرشید کے عہد تک اسی پر عمل کرتے تھے، تا آنکہ ابو جعفر محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے مامون کے ایما سے اسے مختصر کیا"[۵]

---

[۱] و [۲] کتاب البلدان لابن الواضح الیعقوبی ص ۲۳۸، ۲۴۱ [۳] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۲۰۴ [۴] ایضاً ص ۱۷۷ [۵] طبقات الامم ص ۴۸

برہم سدھانت ہی کے ذریعے مسلمان مہندسین "جیب" کے تصور سے واقف ہوئے، ورنہ یونانی اور ایرانی علم الہیئت میں "اوتار" (Chord) ہی کے ذریعے "مثلثاتی حسابات" کیے جاتے تھے، علم المثلثات کی ترقی میں یہ مسلمانوں کا پہلا قدم تھا۔ اس زمانہ کے مشہور ہیئت داں حسب ذیل تھے:۔

ابراہیم بن حبیب الفزاری :۔ سمرہ بن جندب فزاری کی اولاد میں سے تھا، نجوم و ہیئت میں دستگاہ عالی رکھتا تھا، اور اس فن کی کئی کتابوں کا مصنف ہے۔ مثلاً قصیدہ فی علم النجوم، کتاب مقیاس الزوال، کتاب الزیج علی سنی العرب، کتاب العمل بالاصطرلابات ذوات الحلق، کتاب العمل بالاصطرلاب المسطح[1]

محمد بن ابراہیم الفزاری :۔ علم ہیئت اور حرکات کواکب کا فاضل اور نجومی پیشین گوئی کا ماہر تھا، حسب تصریح ابن القفطی وہ پہلا شخص ہے جس نے تاریخ اسلام میں عموماً اور عباسی دور میں خصوصاً اس علم میں تبحر حاصل کیا، اسی نے برہم سدھانت کا ترجمہ کیا جو السند ہند کے نام سے عرصہ تک مسلمانوں میں متداول رہا[2]، اور اس کے انداز پر اپنی زیج تیار کی، جو البیرونی کے زمانہ تک موجود تھی،

یعقوب بن طارق :۔ سدھانت کو عربی میں منتقل کرنے میں محمد بن ابراہیم الفزاری کا شریک تھا، ہندی عالم سدھانت کی مدد سے اس نے ہندوستانی ہیئت کے "ادوار اربعہ" (چترگیک) کو عربی میں منتقل کیا تھا[3]، علم ہیئت میں اس کی خاص تصنیف کتاب ترکیب الافلاک" ہے، اس کے علاوہ اس کی تصانیف میں کتاب تقطیع کردجات الجیب، کتاب ما ارتفع من قوس نصف النہار، کتاب الزیج محلول فی السند ہند، مشہور ہیں[4]،

الطبری :۔ حسب تصریح ابن واضح الیعقوبی ان لوگوں میں تھا جن کی نگرانی میں انجینیروں نے بغداد کو تعمیر کیا تھا[5]، غالباً اس کا پورا نام عمر بن فرخان الطبری ہے جو تاریخ اسلام کے چار حاذق مترجمین

---

[1] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۵، [2] طبقات الامم ص ۴۹، [3] کتاب الہند بیرونی ص ۲۰۸، [4] الفہرست ص ۳۷۸، [5] کتاب البلدان یعقوبی ص ۲۴۱

میں محسوب ہوتا ہے[1]۔ اس نے بطلیموس کی "کتاب الاربعہ" کی شرح لکھی تھی، (جسے ابو یحییٰ البطریق نے ترجمہ کیا تھا)[2]

نوبخت :۔ منصور کا منجم خصوصی تھا، اسی نے ماشاء اللہ کے ساتھ مل کر بغداد کا سنگ بنیاد رکھنے کی صورت نکالی تھی[3]۔

ماشاء اللہ :۔ منصور کے زمانہ کا بہت بڑا جوتشی تھا، نجوم اور جوتش کی متعدد کتابوں کے علاوہ ابن الندیم نے اصطرلاب پر اس کی تصانیف میں "کتاب صنعۃ الاصطرلابات والعمل بہا" اور "کتاب ذات الحلق" کے نام لکھے ہیں[4]۔

ان منجمین اور ہیئت دانوں میں حسب تصریح ابن القفطی ابراہیم بن حبیب الفزاری کو شرف اولیت حاصل ہے۔ وہی عہد اسلام میں پہلا فاضل ہے جس نے اصطرلاب بنایا، اس کی کتاب تسطیح الکرہ بعد کے تمام مسلمان ہیئت دانوں کا اصطرلاب کا ماخذ تھی،

"وھو اول من عمل فی الاسلام اصطرلابا ولہ کتاب فی تسطیح الکرۃ منہ اخذ کل الاسلامیین"[5]

منصور نے ۱۵۸ھ میں وفات پائی اور مہدی اس کا جانشین ہوا، اس کا سارا وقت زنادقہ کے استیصال میں گذرا، بااینہمہ اس نے علمی سرپرستی کو بھی جاری رکھا، چنانچہ زنادقہ کی اصلاح کے لیے متکلمین سے الحاد و زندقہ کے رد میں کتابیں لکھوائیں، اس کے ایما سے اس کے نصرانی کاتب ابو نوح نے جاثلیق طیماتاؤس کی مدد سے ارسطو کی "کتاب الجدل" (طوبیقا) کا سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ ارسطاطالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں (قاطیغوریاس، باری ارمنیاس اور انالوطیقا) نیز فرفوریوس کی ایساغوجی کا عربی میں دوسرا ترجمہ کیا۔ پہلا ترجمہ عبداللہ بن المقفع

---

[1] طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ ج ۱ ص ۲۰۰ [2] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۱۶۲ [3] کتاب البلدان یعقوبی ص ۲۳۸
[4] الفہرست ص ۳۸۲ [5] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۴۲

نے کیا تھا،

اس علمی سرپرستی کے ساتھ ساتھ اس نے نجوم کی سرپرستی بھی جاری رکھی، اس کے دربار میں متعدد نجومی تھے، جن کا صدر و رئیس توفیل (Theophilus) بن توما الرہاوی تھا، جو نجوم اور جوتش کا بڑا زبردست ماہر تھا، ابن القفطی لکھتا ہے :-

"توفیل بن توما النصرانی المنجم الرهاوی وکان هذا المنجم بغدادی وهو رئیس منجمی المهدی وکان خبیراً بجوادث النجوم وله فی احکام النجوم اصابات عجیبة"[1]

مہدی نے ۱۶۹ھ میں وفات پائی، اس کے بعد ہادی تخت نشین ہوا، مگر سال بھر بعد مرگیا، ہادی کے بعد ہارون الرشید خلیفہ ہوا،

ہارون کا عہد حکومت برامکہ کے عروج و زوال کی داستان ہے، برامکہ کے مورث اعلیٰ بلخ کے مشہور بدھ مٹھ "نوبہار" کے متولی "برموک" رہے تھے، اسی لیے یہ خاندان برمکی کہلاتا ہے، علم دوستی وعلم نوازی اس خاندان نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پائی تھی، ان کی سرپرستی نے بغداد کو دانش کدۂ مشرق بنا دیا تھا، انھیں نے ہندوستانی علوم بالخصوص ہندی طب کو بغداد میں متعارف کرایا،

انھیں کے ایما سے سلم الحرانی نے ارسطاطالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں اور ایساغوجی کا تیسری مرتبہ عربی میں ترجمہ کیا،

برامکہ کی علمی سرپرستی اسلام کی علمی و ثقافتی تاریخ کا ایک مستقل باب ہے، لیکن ریاضی و ہیئت کی تاریخ میں ان کے دو کارنامے مشہور ہیں،

اولاً : اصول اقلیدس کا ترجمہ - ابن خلدون کہتا ہے کہ اس کتاب کا پہلا ترجمہ منصور کے زمانہ میں ہوا تھا، لیکن بعد میں یہ غیر معروف ہوگیا، برامکہ کی سرپرستی میں اس کا از سر نو ترجمہ ہوا، نیا ترجمہ

---

[1] اخبار العلماء باخبار الحکماء، ص ۷۷،

حجاج بن یوسف بن مطر تھا، ابن الندیم کہتا ہے:

"حجاج بن یوسف بن مطر نے اصول اقلیدس کے دو ترجمے کیے، ایک نقل ہارونی کے نام سے مشہور ہے اور وہ پہلا ترجمہ ہے، دوسرا نقل مامونی کے نام سے موسوم ہے"[1]

مؤخر الذکر کے مقدمہ میں مترجم لکھتا ہے:-

"ہارون الرشید کے عہد خلافت میں یحییٰ بن خالد بن برمک کے ایما سے حجاج اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرنے پر مامور ہوا"

ثانیاً:- المجسطی کا ترجمہ جو یونانی ہیئت کا آخری شاہکار ہے یحییٰ بن خالد برمکی نے سلما اور ابو حسان سے اس کا عربی میں ترجمہ کرایا۔

اول من عنی بتفسیرہ واخراجہ الی العربیۃ یحیی بن خالد بن برمک ففسرہ جماعۃ فلم یتقنوہ ولم یرض ذلک، فندب لتفسیرہ اباحسان وسلم صاحب بیت الحکمۃ فاتقناہ واجتہدا فی تصحیحہ بعد ان احضر النقلۃ المجودین فاختبر نقلہم واخذا بافصحہ واصحہ وقد قیل ان الحجاج بن مطر نقلہ ایضاً[2]

سب سے پہلے جس نے المجسطی کو عربی میں ترجمہ کرانے اور اس کی شرح و تفسیر کرانے پر توجہ کی، وہ یحییٰ بن خالد برمکی تھا، بہت سے لوگوں نے اسکی تفسیر کرکے اسے پیش کی مگر وہ ان کی شرح سے مطمئن نہ ہوا، آخر کار اس نے ابا حسان اور سلما صاحب بیت الحکمۃ کے سپرد یہ کام کیا جسے انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا، انھوں نے ماہر مترجمین کو بلا کر ترجمے کرائے اور ان میں سے جو سب سے زیادہ صحیح اور فصیح تھا اسے یحییٰ کے حضور میں پیش کیا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حجاج بن مطر نے بھی اس کا ترجمہ کیا تھا۔

---

[1] الفہرست ص ۳۷۱ [2] ایضاً ص ۳۷۴

برامکہ کشمیری نژاد تھے، بعض لوگوں کے خیال میں ایرانی تھے، بہرحال وہ عجمیوں کی طرح نجوم اور جوتش کے قائل تھے۔ ان کی سرکار میں نجومیوں کی ایک کثیر جماعت رہتی تھی، جن میں عمر بن فرخان الطبری خاص طور سے مشہور ہے۔ اسی نے یحییٰ بن خالد کا زائچہ بنایا تھا[۱]، اور بھی نجومی تھے، یحییٰ بن خالد خود بھی دیگر علوم کے علاوہ نجوم اور ہیئت کا ماہر تھا۔

علم ہیئت کی تاریخ میں برامکہ کا نام اس لیے بھی مشہور ہے کہ ان کے زمانہ میں عہد اسلام کی پہلی ترصید (فلکیاتی مشاہدہ) ظہور میں آئی جس کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے، یہ جندی سابور کی قدیم رصدگاہ کے فلکی مشاہدات تھے جنھیں یحییٰ بن خالد کے عہد وزارت میں احمد بن محمد النہاوندی نے اپنی زیج مسمی بہ "المشتمل" میں قلمبند کیا تھا۔ ابن یونس کا تو یہ خیال ہے کہ دنیا میں بطلیموس کی ارصاد کے بعد عہد مامون تک احمد بن محمد النہاوندی کے علاوہ کسی اور شخص نے فلکی مشاہدات ہی نہیں کیے، چنانچہ وہ اپنی زیج میں لکھتا ہے:-

ولا اعلم بین رصد بطلیموس	اور میں بطلیموس کے ہیئتی مشاہدات اور "اصحاب
وبین رصد اصحاب الممتحن رصدا	ممتحن" کے ہیئتی مشاہدات کے درمیانی وقفہ میں
الارصد احمد بن محمد النہاوندی	سوائے احمد بن محمد النہاوندی الحاسب کی
الحاسب بمدینۃ جندی سابور	ترصید کے کسی اور ترصید سے واقف نہیں ہوں
فی ایام یحیی بن خالد بن برمک فانہ	نہاوندی نے یہ ترصید شہر جندی سابور میں
رصد ارصادا اثبتھا فی زیجہ	یحییٰ بن خالد بن برمک کے زمانہ میں کی تھی،
سماہ المشتمل۔ (زیج ابن یونس ص ۱۱۱)	اس نے جن ہیئتی مشاہدات کی ترصید کی تھی انھیں

٭ [illegible] "الممتحن" تھا

سید صاحب نے اس رصدگاہ کا ذکر نہیں کیا، بلکہ رصدگاہ مامونی ہی کو عہد اسلام کی پہلی رصدگاہ

---

[۱] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۱۶۱

قرار دیا ہے۔

"سب سے پہلا اسلامی رصد خانہ جیسا کہ عام طور سے معلوم ہے، رصد مامونی ہے"

اس مضمون کے انگریزی مترجم نے بھی اسی قول پر اعتماد کر کے اپنے ترجمہ کا آغاز کیا ہے:

"The beginning of Muslim observatories is Traced back to 1-Mamun in The Third century A.D"

اور اگرچہ آگے چل کر احمد بن محمد النہاوندی کے مشاہدات فلکیہ کو شرف اولیت دیا ہے اور لکھا ہے:

The first series of regular observations with the aid of fairly accurate instruments appears to have been made at Jundi-Shahpur (a Town in Khuzistan, S.W. Iran) in the first years of the nineth century A.D. by Ahmad an Nehawandi, who prepared an almanac entitled Zij-al-Mushtamil."

مگر انھیں اس کی تصریح کسی اصل عربی ماخذ میں نہیں ملی بلکہ اس باب میں ان کا (مترجم کا) اعتماد انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پر تھا لیکن چونکہ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں احمد النہاوندی کی "زیج مشتمل" کا ذکر نہیں کیا اس لیے انھیں اس کی صحت میں تردد ہے۔

The Translator has Taken The liberty to supplement This information from The Encyclopaedia of Islam (article Astronomy)

"although Zij-al-Mushtamil is not referred to in Kashf-uz-Zunun."

حالانکہ یہ ترجمہ بے بنیاد ہے، کیونکہ کشف الظنون "کتابیات" (Bibliography) کی کتاب ہے اور علوم و فنون کی تاریخ کے باب میں اس پر غیر مشروط اعتماد نہیں کیا جا سکتا، بالخصوص جہاں وہ خاموش ہے، ان مقامات کے ذکر کو مشکوک نہیں کہا جا سکتا، بشرطیکہ وہ قابلِ اعتماد آخذ و مصادر میں مذکور ہوں۔

بہرحال ابن یونس کی تحقیق کے مطابق جندی ساپور کی یہ رصدگاہ اور احمد النہاوندی کے مشاہدات فلکیہ اسلام کی تاریخ میں پہلی ہیئتی و رصدی کاوش ہیں، اور اس کی زیج "مشتمل" ابن یونس کے زیر مطالعہ رہی تھی، "زیج مشتمل" کی رو سے "فارسی سال" کے اندر "وسط شمس" کی مقدار "یا کطمہ م م" تھی (یا ۱۱ - ۲۹ - ۴۵ - ۴۰ - ۴۰) تھی جو مبسوط ہو کر "شنط مہ م م" آتی ہے (= ۳۵۹ - ۴۵ - ۴۰ - ۴۰)

ابن یونس کا یہ بھی خیال ہے کہ احمد النہاوندی نے اپنی اور ابرخس (Hipparcus) کے رصدوں کے تفاوت کو درمیانی عرصہ سے تقسیم کر کے نکالا تھا۔ "وارادہ استعمل القسمۃ فیما بین رصدہ ورصد ابرخس۔"

بہرحال عہد ہارونی میں نجوم و ہیئت کی ترقی بلکہ رصدگاہ اور ارصاد کی ابتدا برامکہ کے اعتنا و اہتمام کا نتیجہ تھی، لیکن ۱۸۷ھ میں یہ علم دوست خاندان ہارون کے شکوک و شبہات کا شکار ہو کر برباد ہو گیا، ان کے ساتھ علمی سرپرستی کا وہ ماحول بھی جس نے ہارون کے بغداد کو روکشِ یونان و اسکندریہ بنا دیا تھا، درہم برہم ہو گیا۔ اہلِ کمال جو برامکہ کی نوازشوں سے فیضیاب ہو کر علم و حکمت کی ترقی میں ایک دوسرے سے گوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے،

بے دل ہوکر خانہ نشین ہوگئے،

۱۹۳ھ میں ہارون نے بھی وفات پائی اور اس کی وصیت کے مطابق امین جو اس کی ملکہ زبیدہ کے بطن سے تھا تخت نشین ہوا، مگر جلد ہی درباریوں کے کہنے میں آکر دوسرے بھائی مامون سے لڑ بیٹھا، امین و مامون کی لڑائی محض برادرانہ خانہ جنگی نہ ثابت ہوئی بلکہ عرب کے "سوز دروں" اور "عجم کے حسن طبیعت" کا مقابلہ ہوگئی جس میں مؤخر الذکر کی فتح ہوئی۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ

کی

ایک ایک جھلک

یہ تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کے دور کی سیاسی، تمدنی اور معاشرتی تاریخ ہے، جس میں مسلمانوں کی تاریخ کے روشن پہلو ہندو نامور مورخوں کی زبان سے اور ہندوؤں کے علمی کارنامے مسلمان مورخوں کے قلم سے نقل کیے گئے ہیں، یہ دارالمصنفین کے سلسلۂ تصنیفات کی دوسری کتاب ہے، جس پر یو، پی گورنمنٹ کی طرف سے مصنف کو ایک ہزار کا گراں قدر انعام ملا ہے۔

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم، اے

ضخامت ۸۰۰ صفحے ۔ قیمت :- ۳۰/-

منیجر

کرامت علی خاں شہیدی

از جناب ڈاکٹر لطیف حسین صاحب. ادیب

نام کرامت علی خاں، تخلص شہیدی، موضع ہڑیاپوری ضلع اناؤ کے رہنے والے تھے، بعض تذکرہ نویسوں نے آپ کو لکھنؤ[1] اور بعض نے موضع دائرہ پور کا باشندہ لکھا ہے، ایک فاضل محقق کی رائے ہے کہ وہ بریلی کے باشندے تھے،[2]

دیوان شہیدی مطبوعہ تقریباً ۱۲۶۸ھ ۱۸۵۱ء میں درج ہے "منشی کرامت علی خاں ہڑیاپوری اناوی متخلص بہ شہیدی متوفی ۱۲۶۵ھ....." اس لیے ہمارے خیال میں شہیدی کا منشا و مولد موضع ہڑیاپور ضلع اناؤ تھا، ملازم لکھنؤ میں رہے اور عمر کا آخری حصہ بریلی میں گزرا۔

شہیدی کے والد کا نام عبدالرسول خاں تھا، وہ بھی شیریں کلام شاعر اور علم عروض میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ وہ بکمیث راے کے فارسی کلام پر اصلاح دیتے اور معلم گیری کے ذریعے بسر اوقات کرتے تھے، شہیدی کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے متعلق تذکرہ نویس خاموش ہیں، قیاس ہے کہ انھوں نے حسب دستور مکتب میں مروجہ درسی کتابیں پڑھی ہوں گی، پھر اپنے والد کی نگرانی میں دوسرے علوم کی تکمیل کی ہوگی۔

تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ حساب و عروض کے ماہر تھے، شہیدی اٹھارہ سال کی عمر میں لکھنؤ گئے۔ ایک روایت کے مطابق وہ لکھنؤ کسر میٹ میں ملازم ہوئے، اور دوسری روایت کے بموجب منشی گیری کے عہدہ پر مقرر ہو کر ایک انگریز کے ساتھ دہلی گئے، شہیدی کے متعلق چند دلچسپ باتیں مشہور ہیں،

---

[1] بزم سخن ص ۸۸ از سید علی حسن خاں [2] انتخاب زریں از سرور اس مسعود ص ۲۰۷ [3] تاریخ ادب اردو ۱۹۵۳ء ص ۲۰۹ ڈاکٹر محی الدین قادری زور

کریم الدین پانی پتی نے لکھا ہے[1] "ابتدا میں ایک لڑکے مسمی گنگا پرشاد پر عاشق تھا، اس واسطے بجائے یا فتاح کے ہر ایک کتاب پر جو شہیدی کی ملک سے تھی، یا گنگا پرشاد لکھ دیا تھا" اس روایت کو گارساں دتاسی اور سری رام دونوں ہی نے نقل کیا ہے[2]، مولف مہر جہاں تاب نے لکھا ہے کہ شہیدی کمسریٹ لکھنؤ میں ملازم تھے، اور انھیں خیانت مجرمانہ کے جرم میں ماخوذ ہونے کا خوف تھا، اس لیے انھوں نے اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کیا، اور ہندوستان سے حجاز کی طرف سفر کیا اور مدح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنا مشہور قصیدہ لکھا، مولانا عبد السلام ندوی نے بھی مہر جہاں تاب کے حوالے سے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے[3]، واقعات کچھ بھی رہے ہوں ہمیں ان کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے بقول شخصے ایک پارسا اور ایک گنہگار میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ پارسا کا ایک ماضی ہوتا ہے اور گنہگار کا ایک مستقبل۔ شہیدی کا بھی ایک ماضی تھا، ان میں عشق کا مادہ زیادہ تھا، اور عشق پسند طبیعتوں کی خودداری و نامرادی، بیزاری و فراخدلی ان میں بھی تھی، شیفتہ کا یہ بیان کہ شہیدی مرد بے تکلف، وارستہ مزاج، وسیع المشرب اور آزادانہ زندگی بسر کرنے والا تھا[4]، ان کی عشق پسند طبیعت کی ایک قوی شہادت ہے، کیونکہ یہ خصوصیات راہ عشق کے منزل رسوں میں ہی پائی جاتی ہیں،

شہیدی جہاں گشت قسم کے انسان تھے، وہ پنجاب اور گجرات تک گئے، کبھی کبھی دہلی بھی جانا ہوا، جہاں شیفتہ سے ملاقات رہی، مولانا طور کلیم[5] نے لکھا ہے کہ وہ بھوپال بھی گئے تھے، آخر عمر میں شہیدی کا قیام بریلی میں رہا، یہاں وہ نواب محمد عطا حسین عطا[6] کے مہمان ہوئے، شہیدی نے

---

[1] طبقات الشعرائے ہند (قلمی) ص ۳۰۶ - نسخہ رامپور [2] خمخانۂ جاوید ج ۵ ص ۲۱۷ [3] شعر الہند ج ۲ ص ۱۹۰
[4] گلشن بیخار (قلمی) ص ۱۰۳ نسخہ رامپور [5] ص ۹۹ [6] آپ ایک سخن فہم و سخن سنج رئیس تھے، شہیدی کے علاوہ امیر الدین آزاد اور محسن علی خاں جوش بھی آپ کے دربار سے وابستہ تھے، میرے پاس ایک قلمی بیاض [illegible] جس میں شہیدی، آزاد اور جوش کے علاوہ عطا کا مختصر کلام بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ [illegible]
(باقی حاشیہ [illegible])

نواب صاحب کی مدح میں اکیس[۲] شعر لکھے جو کلیات شہیدی میں سلسلۂ تاریخ مثنوی محمود عطا حسین طبع ہو چکے ہیں

ہزاروں گنج لعل و دُر لٹایا — عطا جب نام اس حاتم نے پایا

شہیدی تو بھی اس در کا گدا ہے — کہہ آمین دل سے یہ وقتِ دعا ہے

زمین و آسماں جب تک ہو قائم — خداوندا ہو اس کا عیش دائم

ستارہ بخت کا بیت الشرف میں — ہمیشہ دامنِ مقصود کف میں

شہیدی ان چند خوش نصیب شاعروں میں ہیں جن کا دیوان بار بار چھپا جو اس کی مقبولیت کا ثبوت ہے، شہیدی کے جتنے دیوان میری نظر سے گذرے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) کلیات شہیدی۔ یہ عبد الغنی سوداگر بریلی کی فرمایش اور شیخ محمد علی کے زیر اہتمام ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۶ء میں مطبع آئینہ سکندر، میرٹھ میں چھپا تھا، تعداد صفحات ۶۸ اور مروجہ دیوانوں کے بقدر کلام پر مشتمل ہے، البتہ اس کے آخر میں قطعات تاریخ درج ہیں، جو دوسرے دواوین میں نہیں ملتے۔

(۲) دیوان شہیدی۔ (رضا لائبریری رامپور) اس کا سائز چھوٹا اور تعداد صفحات ۲۱۲ ہے، چونکہ شروع اور آخر کے صفحات نہیں ہیں، اس لیے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کب اور کہاں چھپا۔

(۳) دیوان شہیدی (نولکشور پریس لکھنؤ) اس کے صفحات ۹۰ اور سال طباعت ۱۸۸۵ء ہے، یہ پہلا اڈیشن ہے۔ اس کے بعد تین اڈیشن اور نکلے، آخری اڈیشن ۱۹۱۳ء کا ہے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴) میں طبع آزمائی کرتے اور غزل، ہجو، قصیدہ، مثنوی ان کی خاص فتوحات میں شامل تھیں، نواب صاحب کا بریلی میں مکان محلہ قلعہ نزد جامع مسجد تھا، بعد وفات آپ جامع مسجد میں دفن ہوئے۔

[۲] تذکرہ یا بیاض ۱۲۴۲ھ میں شہیدی کی کئی غزلیں درج ہیں، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ نواب عطا حسین نے خود یا کسی دوسرے شخص سے بیاض میں یہ غزلیں نقل کرائی ہیں جو ان کے دربار سے وابستہ شعرا کا کلام تھا تو شہیدی کا ۱۲۴۲ھ میں بریلی میں موجود ہونا قرین قیاس ہے، نواب عطا حسین صاحب کی اولادوں میں سے ایک بزرگ نواب کبیر حسین نے مجھے بتایا کہ خاندانی روایات کے بموجب شہیدی کا بریلی میں قیام مدت تک رہا اور ان کے جد امجد نواب عطا حسین نے شہیدی کو ایک مکان بغرض رہایش عطا کر دیا تھا، یہ مکان ایک کھنڈر کی صورت میں ہنوز موجود ہے، لہذا میرا خیال تو یہی ہے کہ شہیدی کی بریلی میں کم سے کم مدت قیام بارہ سال یعنی ۱۲۳۲ھ تا ۱۲۴۴ھ ہے۔

اس طرح دیوان شہیدی میرے علم میں چھ بار طبع ہوا، کریم الدین پانی پتی نے طبقات الشعرائے ہند میں لکھا ہے "شہیدی کا ایک دیوان بہت بڑا ہے، میں نے وہ دیوان اس کے ایک قریبی رشتہ دار کے پاس دیکھا تھا، اس کا ارادہ لکھنؤ میں چھپوانے کا تھا، یقین ہے کہ لکھنؤ میں چھپا ہوگا، شہیدی نے بہت قصیدے اور ہر ایک قسم کے شعر کہے ہیں[۱]" مذکورۂ بالا دواوین میں بہت قصیدے نہیں ہیں، اور اگر ہر ایک قسم کے شعر سے مراد مختلف اصناف سخن ہیں تو وہ بھی دواوین میں نہیں ہیں، رضا لائبریری رامپور میں دیوان شہیدی کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے (تقریباً ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء) جس کی تعداد صفحات صرف ۸۰ ہے۔

فن شاعری میں شہیدی پہلے مصحفی، پھر نصیر دہلوی کے شاگرد ہوئے، اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مصحفی نے ریاض الفصحا[۲] میں شہیدی کا ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ فروجیسے نوعمر اور حقیقت ع "بے حقیقت مصحفی کا چور ہے" کو بھی شامل کرلیا ہے، میرا خیال ہے کہ شہیدی نے مصحفی کی شاگردی اس وقت اختیار کی جب تذکرے میں ان کی شمولیت ممکن نہیں تھی، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۶ء اور ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء کے وقفے میں جو تذکرے کی تکمیل اور مصحفی کی موت کا درمیانی زمانہ ہے، وہ مصحفی کے شاگرد ہوئے ہوں اور اس وجہ سے شامل تذکرہ نہ ہو سکے، بہرحال وہ مصحفی کے تلامذہ میں ہیں، دہلی کی آمد و رفت کے ایام میں جب کہ شاہ نصیر دکن سے واپس آچکے تھے، انھوں نے اپنا کلام نصیر کو بھی دکھایا تھا، انکی شاعری میں نصیر کا طرز غزل گوئی بعض مقامات پر نمایاں ہے،

شہیدی بندۂ عشق تھے، ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت تو نہیں ہے کہ قطعیت کے ساتھ یہ کہہ دیں کہ کسی متعین ذات سے ان کو عشق تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ عشق ان کی زندگی تھا، ان کے ہی الفاظ میں عشق نے ان کی عقل کو اس طرح گھبرالیا تھا جیسے مست کسی ہشیار سے چمٹ جاتا ہے ؎

عشق نے یوں عقل کو گھبرا لیا
مست چمٹے جس طرح ہشیار سے

اور

عشق میں سب سے ہر شہیدی دو چند
خلق کو آدھا گنو سارا مجھے

۱؎ نسخۂ رامپور ص ۲۰۴ — ۲۰۰ ۲؎ مطبوعہ ۱۹۳۴ء باہتمام انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

اس دعویٰ کے ساتھ انھوں نے اپنی شاعری کے متعلق بھی کہا ؎

میرے دیوان کو تماشا کر نگاہِ غور سے — ہر ورق ہے اک مرقع یار کی تصویر کا

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہیدی ناآسودہ عاشق نہیں تھے۔ ان کے کتنے ہی اشعار کا محاکاتی پہلو اور تصویر آفرینی، واقعات نگاری و لذت کشی بتاتے ہیں کہ وہ کسی محفل نشیں سے وابستہ رہے ہیں۔ مثلاً

سرو سے قد پہ اٹھا ہاتھ جو انگڑائی کو — مستزاد اس نے کیا مصرعۂ رعنائی کو

یاد آتا ہے شب عشرت میں اپنا روٹھنا — اس کا جھنجھلا کر وہ کہنا تو بھی اس قابل ہوا

غیر کے کہنے پہ ناداں مجھ سے بدظن ہو گیا — جھوٹ کو بھی کیا اثر ہے دوست دشمن ہو گیا

ہو جائے گا چپ سن کے مرا حرف تمنا — ناداں ہے اسے اور بھی مغرور کروں کیا

شرم آتی ہے وگرنہ ان بتوں کی ضد سے میں — جیتے جی اللہ سے اک حور جنت مانگتا

لیکن یہ لطف زندگی عارضی تھا، ان میں ایسا انقلاب ہوا کہ عاشق وہ اب بھی تھے مگر تبدیلی کے ساتھ ؎

فقر میں شاہ پرستی کب شہیدی سے نبھی — شاہ ہندستان کا ان کاموں میں گھر جاتا رہا

وہ کمل پوش فقیر ہو گئے ؎

کشتہ بہروپ کا اسکے ہوں شہیدی کہ وہ شوخ — جلوہ فرما ہے میری چشم میں ہر آن نیا

تیرے خرقے نے چھپایا ہے شہیدی تجھ سے — یار بے عیب کو پردہ نہیں عریانوں سے

جب زندگی میں اچانک کوئی تبدیلی پیدا ہوتی ہے تو عام لوگ اس سے فوراً مانوس نہیں ہوتے کوئی اچھا کہتا ہے کوئی برا۔ شہیدی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا، بعض لوگ اس تبدیلی کے قائل نہیں ہوئے اور علانیہ کہا ؎

شہیدی کو نہ پا یا لیش داروں کی محافل میں — رہے مشغول اکثر سادہ رویوں کے کلا ہوں سے

شہیدی نے اس کے جواب میں کہا ؎

دلیل اتقا ہے مجھ سے ہم بزمی فرشتوں کی ۔ اگر فاسق ہوں البتہ ہو صحبت رو سیاہوں کی

مختصر یہ کہ ان کی تمام زندگی عشق کے سانچے میں ڈھل گئی، غم مہجوری اور غم حیات کا ایسا ساتھ رہا کہ وہ غم کو مایۂ حیات سمجھنے لگے، اہل جہاں سے بیزاری کا مادہ پیدا ہو گیا، مگر اس عالم میں وہ خود سے کبھی بیزار نہ ہوئے اور نہ کبھی اپنے وجود کو کم مایہ سمجھا، غم عشق کی کیفیات نے کمل پوشی کے باوجود صوفیانہ پیرایہ اظہار اختیار نہیں کیا، وہ عملاً فقیرانہ زندگی کرتے، اگر تصوف میں رچے بسے ہوئے شعر کہتے تو اس کی بڑی پذیرائی ہوتی، تاہم لوگ ان کی کرامت کے قائل ہونے لگے، مگر شہیدی نے تصورات کے بجائے غم عشق کی مختلف کیفیات کو اپنایا، یہ ان کے دل کا اُبال تھا، اور یہی انکی شاعری کا بہترین نمونہ ہے، ؎

دل کے جانے کا شہیدی حادثہ ایسا نہیں ۔ کچھ نہ روئے آہ اگر ہم عمر بھر رو یا کیے

سینے پر چھینٹے لگائے جیسے بیٹھا ہو کوئی ۔ وہ مری صورت دل مرحوم کے ماتم نے کی

ہم نے آنکھیں موند لیں دنیا کا پردہ کھل گیا ۔ بیٹھے ارباب بصیرت جام جم دیکھا کریں

تغیر حال میں اپنے رہیگا شام محشر تک ۔ ابھی سے پوچھنا بیجا ہے انجام اس کہانی کا

دل نے رسوا جا بجا ہم کو کیا ۔ در بدر اور کو بکو ہم کو کیا

خود بخود آتا ہے گریہ ہر گھڑی ۔ عاشقی نے طفل خو ہم کو کیا

اے شہیدی شوق وصل یار نے ۔ جسم و جاں سب آرزو ہم کو کیا

عیدیں بھی ہوتی رہیں نوروز بھی ہوتے رہے ۔ ہے وہی عالم ہمارے نالۂ ناشاد کا

اندوہ دائمی میں کٹے کس خوشی سے عمر ۔ گر مجھکو غم نہ ہو طرب کا دھیان رکھا

برباد ہو گیا میں شہیدی بقول میر ۔ خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

اوروں کو فکر ہے نہ ہوا اسے مال جمع ۔ ہم کو یہ غم رہا کہ قلندر نہ ہو سکے

سائے کو افتادگی میں بخشش ہے ۔ میرے ویران خانے کی دیوار ہے

ناکامیِ جاوید کی ہم مانتے منت — افسوس شہیدی تری تربت نہیں ملتی

شمعِ مردہ کو جو محفل سے نکلتے دیکھا — بوئے بد آئی مجھے عیش کے سامانوں سے

کہتے ہیں اشکِ ندامت سے ہو تخفیفِ گناہ — ہم جو روئے اور بھی تر اپنا دامن ہو گیا

ایک حسرت و امید مرے مذہب میں — جب سے طالب ہوں ترا کچھ مجھے مطلب نہیں

منزلِ کفر و دین ہے ایک گو ہیں جدا جدا طریق — راہ نہ اس دوراہے میں پوچھ کہ کون سی ہے یا کدھر

گر شرح کروں اپنی شبِ غم کی اذیت — تقریر کو محشر کے ہوں درکار کئی دن

احباب سے دیکھی نہ وفا ہم نے شہیدی — شرمندہ رہے شفقتِ اعدا کے ہمیشہ

ایامِ مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے — دن عیش کی گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے

کیوں دل سے نہ مٹ جائیگا اندیشۂ حرماں — جب ہم نے یہ ٹھانی کہ تمنا نہ کریں گے

شہیدی اتنی گماں پرستی نشہ میں سب بھول بیٹھے ہستی — ہوئی ہے اس مئے سے تم کو مستی جو تا گلو بھی نہیں گئی ہے

شہیدی کے متعلق یہ تصور قائم کر لینا کہ وہ آورد و تکلف سے دور تھے، صحیح نہیں ہے، یہ ضرور ہے کہ انھوں نے آورد و تکلف کو مشغلۂ شاعری نہیں بنایا، حالانکہ ان کے ذہنی بلوغ کے زمانے میں مرصع سازی کمالِ فن سے تعبیر کی جاتی تھی، دربارداری، حریفانہ چشمکیں، مشاعروں میں مسابقت کی کوشش شاعری کے پیشے کے لیے ناگزیر ہو گئے تھے، شہیدی کو ایک جوہرِ قابل کی طرح اپنی اہمیت کا احساس تھا، اور انھوں نے اپنی استادی جتانے کے لیے سنگلاخ زمینوں میں غزلیں لکھیں جن میں زباں دانی کی جولانیاں بھی تھیں، ایسی غزلیں بھی لکھیں اور ایسے تخیلات کو بھی جگہ دی جو بے اثر اور دور از کار تھے مثلاً

گلِ انار کی ٹکتا ہے آرسی پہ کب — ابھی کھلے گا ترا موسمِ جوانی رنگ

ہر ایک رنگ میں ہے رنگ کی ہر بود نہاں — چڑھے نہ رنگ زروں سے بغیر پانی رنگ

[illegible] ایک شب کے دو — قول ہے مشہور یہ مطلب کے سو مطلب کے دو

ں دو پہ دو اچھی دو بھی شتابی دو کہیں خال کے دو خط کے دو رخسار کے دو زلف کے دو

جیسی تصویر میں شنجرف کی مہوتی ہے غنچۂ لب جائے دہن سرخی پان رکھتے ہیں

ذوق پرواز ہو کیا طوطی خط کی مانند آشیاں باغ میں ہم فصل خزاں رکھتے ہیں

جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں شہیدی کی یہ غزلیں عصری حالات کا نتیجہ تھیں، ورنہ انکا
ں رنگ وہ سرا تھا، جو ان کی شاعرانہ عظمت کا شاہد ہے۔ مثلاً ؎

عمر بھر عشق کے آزار نے سونے نہ دیا ہائے ہائے دل بیمار نے سونے نہ دیا

ناکہش ایک رہا ایک کراہا تا صبح جان ریش و دل افگار نے سونے نہ دیا

رت جگے ہوتے رہے ہیں کہ بڑھے غم کی عمر ایک شب درد دل زار نے سونے نہ دیا

نیش غم نے رگ مژگاں سے نکالا یہ لہو مجکو راتوں مرے غمخوار نے سونے نہ دیا

لیکن شہیدی کی شہرت اور شاعرانہ عظمت ان کی نعتوں کی وجہ سے ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔
و ادب میں نعت و منقبت اردو شاعری کی طرح قدیم ہیں، چنانچہ اردو نعتیہ شاعری کے ابتدائی
نے دبستان دکن میں ملتے ہیں، شمالی ہندوستان میں بھی نعت و منقبت کا آغاز ہوا مگر تبرکاً۔ ان میں
ں نعت کے مقابلے میں منقبت پر زیادہ زور دیا گیا، جو لکھنؤ کے شیعہ ماحول کے زیر اثر تھا، میر اور سودا
یہاں نعت کم اور منقبت زیادہ ہے۔ یہی حال انشاء کا ہے، انھوں نے بھی منقبت ہی پر زیادہ
قلم صرف کیا۔ اس زمانہ میں نظیر اکبر آبادی، شہیدی، لطف علی خاں لطف[1]، کفایت علی کافی[2]،

---

[1] آپ کا وطن بریلی تھا، ایک نعتیہ دیوان آپ کی یادگار ہے، زندگی بھر نعت ہی لکھی اور دنیاوی مال و متاع رکھنے کے باوجود
دنیاوی جاہ و حشمت سے بے نیاز رہے، آپ کا بمر ۹۰ سال [illegible] میں انتقال ہوا، اور تکیہ کالے شاہ بریلی میں دفن ہوئے،
نعتیہ ہنوز محفوظ ہے۔ [2] ساکن مراد آباد، شاگرد ذکی مراد آبادی، مشہور نعت گو اور جنگ آزادی [illegible] کے ایک سپاہی تھے
انگریزوں نے آپ کو باغی قرار دیا اور [illegible] میں مراد آباد میں ہی مجمع عام کے سامنے پھانسی دے دی گئی۔ وہ پھانسی کے وقت اپنی ایک غزل

اور غلام امام شہید علی الترتیب نعت و منقبت کے شاعر مانے جاتے ہیں، نظیر اکبرآبادی نے منقبت کے علاوہ نعت بھی لکھی مگر اس میں ان کی کوئی امتیازی شان نہیں ہے، لطف نے نعت گوئی کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا اور دو دیوان مرتب کیے، ایک دیوان ان کی زندگی میں ہی ضائع ہو گیا، اور دوسرا ۱۲۷۰ھ میں طبع ہوا، انکی نعتیں غزل کے فارم میں ہیں، کافی کی شخصیت زیادہ ہمہ گیر تھی، انھوں نے نہ صرف ایک نعتیہ دیوان یادگار چھوڑا بلکہ احادیث کی منظوم شرح، ستون حنانہ کا منظوم واقعہ، مولود بہاریہ، شمائل ترمذی کا منظوم ترجمہ، اور مثنوی تجمل دربار رحمت بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ بھی یادگار چھوڑیں، وہ شمالی ہند کے پہلے نعت گو ہیں جنھوں نے نعت گوئی کے مقدس فریضے کو زیادہ وسعت اور زیادہ فکر کے ساتھ ادا کیا،

غلام امام شہید کے مولود شریف شہید میں زیادہ نعتیں فارسی میں اور چند اردو میں ہیں، البتہ روایت استن حنانہ، قصہ حضرت حلیمہ سعدیہ اور قصہ حضرت بلالؓ تین مثنویوں کی شکل میں ہیں، اور ایک سلام اور ایک ترجیع بند بھی اردو میں ہے، وہ دراصل فارسی کے شاعر تھے، اس لیے اپنی شاعری کا بڑا سرمایہ فارسی ہی میں چھوڑا، محسن کاکوروی، رضوان[۱] مرادآبادی، مذاق[۲] بدایونی، حسن بریلوی، امیر مینائی اور ناصر[۳] سہارنپوری متذکرۂ بالا اساتذہ کے بعد شمار کیے جاتے ہیں، اور حق تو یہ ہے کہ فن نعت گوئی

(بقیہ حاشیہ ص ۵۰) پڑھ رہے تھے جس کے دو شعر یہ ہیں :-

کوئی گل باقی رہے گا نے چمن رہ جائیگا		پر رسول اللہ کا دین حسن رہ جائے گا

سب فنا ہو جائیں گے کافی ولیکن حشر تک		نعت حضرت کا زبانوں پر سخن رہ جائیگا

۱؎ محمد رضوان علی خاں، شاگرد غالب، نعت کے مشہور شاعر تھے، آپ کا کلیات "تصویر خوبی" ۱۹۰۷ء میں چھپ چکا ہے، ۱۹۱۱ء میں وفات پائی،
۲؎ بدایوں کے مشہور صاحب طرز نگار تھے، ۱۲۳۸ھ میں ذوق کے شاگرد ہوئے، تیرہ کتابوں کے مصنف ہیں، آپ کا مجموعۂ کلام ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء میں بدایوں میں طبع ہو کر مشہور ہوا، انتقال بدایوں میں ہوا اور ساخوتال سے کچھ پیچھے آنولہ ڈپو جانب شرق دفن ہوئے۔
۳؎ سلطان علی بیگ مشہور نعت گو اور نعت منقبت کے شاعر ہیں، تقریباً ۲۰ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں آپ کی یادگار ہیں جن میں نعت و منقبت کے کلیات اردو و کلیات فارسی شامل ہیں، آپ کا مولد و منشا سہارنپور تھا، انتقال دہلی میں ہوا اور مسجد نو محلہ میں دفن ہوئے،

میں یہ سب افضل و ممتاز ہیں ۔

نعت کے لیے کسی فارم کے تعین کی ضرورت نہ تھی ، نعت غزل کے فارم میں بھی لکھی گئی اور قصیدے کے بھی ، نعتیہ خمسہ جات بھی لکھے گئے اور مسدس بھی ، البتہ اتنا فرق واضح رہا کہ نعتیہ قصیدہ میں قصیدے کی شان و شوکت اور نعتیہ غزل میں غزل کی سادگی اور مٹھاس برقرار رہی ، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نعت میں نہ صرف غزل کی سادگی اور مٹھاس برقرار رہی بلکہ بعض شاعروں کے یہاں آورد بھی ہے ، جو ایک فطری عمل تھا ، نعت جس صنف سخن میں لکھی گئی اس کے اثرات نعت پر مرتسم ہوئے ، جب وہ غزل کے فارم میں لکھی گئی تو اس میں آمد کے علاوہ آورد و میناکاری کے نقش بھی تھے ، اگر ایک طرف نعتیہ غزل میں جذبات کی گرمی ، خلوص کا نکھار اور والہانہ محبت کا بیساختہ پن تھا ، تو دوسری طرف عارض و گیسو اور چشم و گردن کی توصیف بھی تھی ، اس لحاظ سے اول الذکر نعت تھی اور آخر الذکر محض شاعری ، مگر اس کے باوجود ہم نعت گو کی نیت پر شبہہ نہیں کرسکتے ۔ محبوب العالمین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہر مسلمان کا ایمان ہے ، اور آپ کے عارض و گیسو کی توصیف محض شاعری ہی سہی لیکن اس میں محبت کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہوتا ہے ۔ اس لیے وہ محض شاعری ہوتے ہوئے بھی نعت کے قریب ہے ، ورنہ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی " اگر نقد و گرفت شروع ہو جائے تو سلف سے ابتک بڑے بڑے نامور نعت گو شاعر کیا فارسی کے اور کیا اردو کے مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے نظر آئیں گے ۔ پھر شاعری آخر شاعری ہے ، کتاب العقائد تو بہرحال نہیں "[1]

شہیدی نے نعتیہ قصیدے ، نعتیہ غزلیں اور نعتیہ خمسے لکھے ، ان نعتوں میں قصیدے کی شان غزل کی آمد اور آورد اور خمسے کی برجستگی ہے ، ان کے نعتیہ قصیدے فن قصیدہ کے معیار پر پورے اترتے ہیں ، ان کی نعتیہ غزلوں میں جذبات نگاری بھی ہے اور عارض و گیسو کی توصیف بھی ہے ، کیونکہ وہ نعت گو ہی نہیں ہیں بلکہ ایک شاعر بھی تھے ، اور ان کی شاعری ان کے ماحول کے زیر اثر تھی ، ان کی

---

[1] پیش لفظ آہنگ حجاز

نعت کا مختصر انتخاب یہ ہے:

بادشاہی سے تو بہتر ہے مجھے دریوزہ کشی ۔۔۔ شہد بہشت بھی شیریں ہے مجھے تلخ چشی

عقل کل کی ہے تمنا مری دیوانہ وشی ۔۔۔ ہے جیب عربی مدنی قرشی

کہ بود درد و غمش مایۂ صد عیش و خوشی

حق سے سائل ہوں دو عالم کے ہو یوں محتشمی ۔۔۔ مدعا اس کی غلامی میں ہو ثابت قدمی

اس سے بہرہ چلنے میں ہو اپنی فراست کی کمی ۔۔۔ فہم رازش چہ کنم او عربی من عجمی

لاف مہرش چہ زنم او قرشی من حبشی

جب عدم خانے میں ہستی کا کھلا دبستان ۔۔۔ نور اول سے ہویدا ہوئے افراد جہاں

اپنے مرکز کی طرف ہوتی ہے ہر چیز رواں ۔۔۔ ذرہ وار ہم ہوا داری او رقص کناں

تا شد او شہرۂ آفاق بہ خورشید وشی

جائے جادہ ہو شہیدی دم خنجر ہر چند ۔۔۔ رگ گردن سے چل اور ریش صفت لب پر خند

مولوی نے تجھے دی نام سے اپنے یہ پند ۔۔۔ جامی ارباب وفا جز رہ عشقش نروند

شرم بادت گر ازیں راہ قدم باز کشی

ان کے رخ صبیح پر زلفیں ہیں مشک فام دو ۔۔۔ قدرت حق کو دیکھئے ایک سحر ہے شام دو

ایک نبی کے ہاتھ سے ایک علی کے ہاتھ سے ۔۔۔ کوثر و سلسبیل کے ہم کو ملیں گے جام دو

حق نے اسے کیا سلام اس نے ہمیں دیا سلام ۔۔۔ ہم نے بھی لیلیا سلام شوق سے یہ سلام دو

ہے سورۂ والشمس گر روئے محمد ۔۔۔ واللیل کی تفسیر ہوئی موئے محمد

جب روئے محمد کی نظر آئی تجلی ۔۔۔ سمجھا کہ شب قدر ہے گیسوئے محمد

کس وضع و لطافت سے بچھے ہیں یہ دو عالم ۔۔۔ ظاہر ہیں تو نازک سے ہیں بازوئے محمد

گلگشت گلستاں میں پڑھو صلِ علیٰ تم — ہر پھول کی بو میں ہے رچی بوئے محمد

رضواں کے لیے لے چلوں سوغات شہیدی

گر ہاتھ لگے خار و خسِ کوئے محمدؐ

شہیدی کو حیات جاویدان کے مشہور نعتیہ قصیدے نے بخشی جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

رقم پیدا کیا کیا طرفہ بسم اللہ کی مد کا — سرِ دیوان لکھا ہے میں نے مطلع نعتِ احمد کا

طلوع روشنی جیسے نشاں ہو شہ کی آمد کا — ظہورِ حق کی حجت ہے جہاں میں لانا احمد کا

شرف حاصل ہوا آدم اور ابراہیم کو اس سے — نہ تنہا فخر عالم فخر تھا اپنے اب و جد کا

ادھر اللہ سے واصل اُدھر مخلوق سے شامل — خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدّد کا

ترے پابوس سے ہفتم فلک پر منزل کیواں — ترے سجدے سے ہشتم آسماں پر فوق فرقد کا

ہوئی ہر ہمتِ عالی مری معراج کی طالب — میسر ہو طواف اے کاش مجھکو تیرے مرقد کا

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے — قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

خدا منہ چوم لیتا ہے شہیدی کس محبت سے

زباں پر میری جس دم نام آتا ہے محمدؐ کا

اس قصیدے کے متعلق حضرت عزیز صفی پوری نے لکھا ہے[1] "مولوی فضل رسول بدایونی[2] اور شہیدی سے راہ و رسم تھی ۔ ایک دن مولوی فضل رسول کو انھوں نے ایک غزل سنائی اسکا مطلع پورا پورا مجھکو یاد نہیں رہا[3] ایک مصرع یاد ہے ۔ ع ابھی تو نام خدا ہے غنچہ نسیم چھو بھی نہیں گئی ہے ۔ یہ مصرعہ دوشیزگی کی صفت میں ہے ۔ مولوی فضل رسول علیہ الرحمہ نے غزل سنکر کہا تم نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سوانح اسلاف قلمی ص ۱۰۹ ۔ مملوکہ جناب خصلت حسین صابری کراچی [2] سلسلۂ قادریہ کے ایک بزرگ اور جید عالم [3] کے مصنف المتوفی ۱۲۸۹ھ [3] مصرع اولیٰ یہ ہے ع شام لبل میں رشکِ گل کی ہنوز بو بھی نہیں گئی ہے

کی شان میں کچھ کہا ہے، یہ سنکر آہ سرد کھینچی کہ ہاں آپ کی تعریف میں کیا کہہ سکتا ہوں، مولوی فضل رسول صاحب نے پڑھکر کہا۔ یہ وہاں سے اٹھکر اپنی قیام گاہ پر گئے اور دوسرے وقت قصیدہ کہکر لے آئے، اس کا مطلع یہ ہے:

ظہور حق کی حجت ہے جہاں میں نور احمد کا
طلوع روشنی جیسے نشاں ہو شہ کی آمد کا

اس میں شک نہیں کہ یہ قصیدہ صنفی و معنوی اعتبار سے فن قصیدہ نگاری کا اعجاز ہے، یہ قصیدہ اس قدر مشہور اور مقبول ہوا کہ کتنے ہی اساتذہ نے اس زمین میں قصیدے لکھے، جن میں امیر مینائی، محسن کاکوروی، عزیز صفی پوری ناصر الدین احمد ناصر[1] اور دلدار علی مذاق[2] بدایونی کے قصائد اور خمسے میری نظر سے گذر چکے ہیں، ان تمام قصائد کا تقابلی جائزہ خود اپنی جگہ ایک دلچسپ ادبی مشغلہ ہے، شہیدی کے مذکورہ قصیدے اور دیگر نعتوں کی مقبولیت نے نعت گوئی کا ماحول پیدا کر دیا، محسن و امیر، مذاق و ناصر اور دیگر نعت گویان اردو ایک سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں جس میں اولیت شہیدی کو حاصل ہے، شہیدی کے دم سے اردو نعت گوئی میں ایک رفتار پیدا ہوگئی، اور اس وقت اردو نعت کا خاصہ سرمایہ دعوت مطالعہ دے رہا ہے۔

شہیدی کی وفات چہارم صفر ۱۲۵۶ھ کو مدینہ منورہ میں ہوئی، حضرت عزیز صفی پوری نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے، جب جہاز پر سوار ہوئے، شہیدی کو بخار آنے لگا اور دست بھی آنے لگے، جب مکہ معظمہ چھٹکر مدینہ منورہ کے قریب پہنچے، تب مولوی صاحب سے کہا کہ جب گنبد شریف سامنے آئے تب مجھے ہشیار کر دیجئے گا، چنانچہ مولوی صاحب نے آگاہ کیا، گھبرا کر کہا مجھے جلدی نیچے اتار دیجئے، مولوی صاحب نے اتار کر سامنے کھڑا کیا، روضہ شریف کی طرف دیکھکر انتقال کر گئے، جنازہ مدینہ منورہ پہنچا، اور جنت البقیع میں دفن ہوا، انکی آرزو پوری ہوگئی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

---

[1] آپ سلسلہ صابریہ کے مشہور بزرگ اور نعت و منقبت کے شاعر تھے، تقریباً دو کتابیں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ یادگار چھوڑیں جن میں نعت و منقبت کے مجموعے کلیات وغیرہ شامل ہیں، آپ کا وطن سہارنپور تھا، انتقال ۱۳۲۹ھ میں بریلی میں ہوا، اور مسجد ... میں دفن ہوئے۔ [2] مدینۃ العلما بدایوں کے مشہور بزرگ ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، آپ کا کلیات ... میں بدایوں سے چھپ چکا ہے، بدایوں ہی میں ۱۳۰۵ھ میں انتقال ہوا، سالار گاہ سے کچھ پیچھے آدلہ روڈ پر جانب مغرب دفن ہوئے۔

امام بخاریؒ

اور

اُن کی جامع صحیح کی خصوصیات

از جناب مولوی تقی الدین صاحب ندوی استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلما

نام و نسب سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ محمد بن اسمٰعیل ابن ابراہیم ابن مغیرہ بن بردزویہ، بردزویہ مجوسی تھے اور اسی مجوسیت پر ان کا انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادہ مغیرہ پہلے شخص ہیں جو امیر بخارا یمان جعفی کے ہاتھوں پر مشرف باسلام ہوئے، اسی نسبت سے امام موصوف جعفی مشہور ہو گئے، ورنہ جعفی خاندان سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ (تہذیب التہذیب ص ۱۵۰)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام موصوف کے دادا ابراہیم کی زندگی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے (مقدمہ فتح الباری ص)۔ البتہ امام بخاری کے والد اسمٰعیل اپنے زمانہ میں طبقۂ رابعہ کے مشہور محدث شمار کیے گئے ہیں، ان کے شیوخ میں امام مالک، حماد بن زید وغیرہ ہیں لیکن عبد اللہ بن مبارک کی خدمت میں رہنے کا زیادہ موقع ملا تھا۔

امام بخاری فرماتے ہیں کہ میرے والد ابراہیم نے حماد بن زید کو دیکھا اور انھوں نے عبد اللہ بن مبارک سے دونوں ہاتھ سے مصافحہ کیا، اور انھیں امام مالک سے بھی سماع حاصل ہے، اور عبد اللہ ابن مبارک امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سے ہیں، لیکن تعجب ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ (ثقات ص ۴۰)

پیدائش اور ابتدائی حالات | امام بخاری ۱۳ شوال نماز جمعہ کے بعد ۱۹۴ھ میں بخارا ہی میں پیدا ہوئے، بچپن میں نابینا تھے لیکن والدہ کی دعا کی برکت سے آنکھیں روشن ہوگئیں، امام صاحب کی والدہ نے جب ان کے لیے دعا کرنا شروع کی تو خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا، آپ نے فرمایا کہ تمھاری کثرت دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے تمھارے لڑکے کی بینائی واپس کر دی، اس خواب کی صبح کو وہ واقعی بینا ہو گئے، (مقدمہ فتح الباری ص ۵۰۴)

امام صاحب کے والد اسماعیل کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا، اور انھوں نے اپنی والدہ کے آغوش شفقت میں نشو ونما پائی، سولہ سال کی عمر میں امام موصوف نے عبد اللہ بن مبارک اور امام وکیع کی کتابوں کو حفظ کر لیا تھا، پھر اپنے بڑے بھائی اور والدہ کے ساتھ حج کے لیے گئے، بھائی تو بخارا واپس آگئے، اور امام موصوف نے حج سے فراغت کے بعد دو سال مکہ معظمہ میں قیام فرمایا، پھر اٹھارہ سال کی عمر میں مدینہ منورہ کا رخ کیا، اور وہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس چاندنی راتوں میں قضایا الصحابہؓ والتابعین اور التاریخ الکبیر کی تصنیف کی، (مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۹)

سماع حدیث کے لیے سفر | حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے سفر کا آغاز ۲۱۰ھ سے ہوا، انھوں نے سماع حدیث کے لیے دور دراز مقامات کا سفر کیا، شام، مصر اور جزیرہ میں دو بار تشریف لے گئے، اور حجاز مقدس میں چھ سال قیام فرمایا، کوفہ و بغداد جو علما کا مرکز تھا، بار بار گئے، اور بصرہ میں چار مرتبہ جانا ہوا، اور بعض دفعہ پانچ پانچ سال تک قیام کیا، ایام حج میں مکہ معظمہ چلے جایا کرتے تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام موصوف آٹھ مرتبہ بغداد آئے اور ہر مرتبہ امام احمد ابن حنبل بغداد کے قیام پر اصرار کرتے تھے (ارشاد الساری)[1]

---

[1] اس کے خلاف جملہ شروح حدیث پاک کتابیں میں ہے وہ غلط ہے، ناسخ کی غلطی ہے یا مؤلف سے فروگذاشت ہوگئی ہے
لامع ص ۶

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کے باوجود امام صاحب نے امام احمد سے بہت کم روایت کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کو خود امام احمد کے مشائخ سے استفادہ کا موقع ملا تھا، اس لیے اخیر سفر میں امام احمد سے روایت کرنا بہت کم کر دیا تھا (کذا فی الہدی ص ۷) علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے سب سے پہلے سماع حدیث ۲۰۵ھ میں شروع کیا اور اپنے شہر کے شیوخ سے استفادہ کرنے کے بعد ۲۱۰ھ سے انھوں نے سفر کا آغاز کیا، اس سلسلے میں حجاز کا بھی سفر کیا تھا اور وہاں بھی کچھ دنوں مقیم رہے تھے، (تذکرہ)

اساتذہ و شیوخ امام بخاریؒ کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان کا خود بیان ہے:-

کتبت عن ألف و ثمانين نفساً — میں نے ایک ہزار اسی آدمیوں سے حدیثیں
ليس فيهم إلا صاحب حديث[1] — لکھیں، ان میں سب کے سب محدث تھے

(مقدمۃ فتح الباری)

لیکن یہ مسلم ہے کہ ان کو اسحٰق بن راہویہ اور علی بن المدینی سے زیادہ فیض پہنچا تھا، حافظ ابن حجر نے ان کے شیوخ کے پانچ طبقات قائم کیے ہیں،

۱- تبع تابعین۔ مثلاً محمد عبد اللہ الانصاری، ابو عاصم النبیل

۲- تبع تابعین کے وہ معاصر جنھوں نے کسی ثقہ تابعی سے حدیث کی روایت نہیں کی۔ جیسے آدم بن ایاس،

۳- امام صاحب کے اساتذہ کا یہ درمیانی طبقہ ہے، اس میں ان لوگوں کا شمار ہے جن کو کبار تبع تابعین سے اخذ حدیث کا موقع ملا، جیسے قتیبہ بن سعید، احمد بن حنبل اسحاق بن راہویہ،

۴- معاصرین یا وہم درس رفقاء، جیسے محمد بن یحییٰ ذہلی، ابو حاتم رازی،

...وہ معاصرین جو امام صاحب کے تلامذہ کے صف کے تھے، لیکن ان سے بھی بعض مرتبہ
...نھوں نے روایت کی ہے، جیسے عبد اللہ بن حماد آملی وغیرہ،

ان محدثین سے استفادہ میں امام صاحب نے امام وکیع کے اس مقولہ پر عمل فرمایا ہے کہ
آدمی اس وقت تک محدث نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے بڑوں، معاصرین اور چھوٹوں سے
...ستفادہ نہ کرے (مقدمہ فتح ص ۴۸۰) اسی لیے امام موصوف نے اپنے معاصرین و تلامذہ سے
...ں روایت کی ہے (تہذیب التہذیب ص ۵۰، ج ۹)

...ذہ | امام صاحب کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ بھی نہایت وسیع تھا، فربری لکھتے ہیں
...ہ امام صاحب سے براہ راست نوے ہزار آدمیوں نے جامع صحیح کو سنا تھا، (ارشاد الساری)
...م صاحب کا حلقۂ درس نہایت وسیع تھا، دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمی اس میں
...ریک ہوتے تھے، ان کی مجلس درس کبھی مسجد میں اور کبھی ان کے مکان میں منعقد ہوتی تھی،
...ن کے شاگردوں میں بڑے پایہ کے علماء و محدثین تھے، مثلاً حافظ ابو عیسیٰ ترمذی، ابو عبد الرحمن
...سائی، مسلم بن حجاج وغیرہ، جو حدیث کے ارکان ستہ کے جلیل القدر رکن ہیں (تہذیب الاسماء و
...للغات نووی ص ۶۸)، ابو زرعہ، ابو حاتم، ابن خزیمہ، محمد بن نصر مروزی، ابو عبد اللہ الفربری، وغیرہم
...ا امام صاحب کے تلامذہ میں ہیں، جو آگے چل کر خود بڑے پایہ کے محدث ہوئے، اور ان سے
...اروں لاکھوں کو نفع پہنچا (تذکرۃ الحفاظ)

...معمولی قوت حافظہ | امام موصوف نہایت قوی الحافظہ تھے، استاد سے جو حدیث بھی سنتے فوراً
...انی یاد ہو جاتی، کہا جاتا ہے کہ بچپن ہی میں ان کو ستر ہزار حدیثیں یاد تھیں، جس کتاب پر ایک
...ڈال لیتے تھے، وہ حافظہ میں محفوظ ہو جاتی تھی،

...بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں محمد بن اسلام بیکندی کے پاس تھا، انھوں نے

فرمایا کہ اگر تم کچھ دیر پہلے آگئے ہوتے تو میں تمہیں ایک ایسا بچہ دکھاتا جس کو ستر ہزار حدیثیں زبانی یاد ہیں، (مقدمہ فتح ص ۴۸۴)

امام صاحب خود فرماتے تھے کہ "مجھے ایک لاکھ صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح حدیثیں یاد ہیں، اور اس جامع صحیح کو میں نے چھ لاکھ احادیث سے منتخب کیا ہے"۔ (مقدمہ ارشاد الساری ص ۲۹۰)

امام صاحب کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ آپ جس وقت بغداد تشریف لائے تو وہاں کے محدثین نے آپ کا امتحان لینا چاہا چنانچہ سو احادیث کے متن اور سندوں میں الٹ پھیر کرکے دس آدمیوں کے حوالہ کیا کہ ہر شخص ان میں سے دس دس حدیثیں اسی طرح امام صاحب کے سامنے پیش کرے، شہر کے بہت سے لوگ اس کو دیکھنے کے لیے جمع ہوئے، پھر ان محدثین نے حدیثیں پیش کیں، ہر مرتبہ امام موصوف "لاأدری" ہی فرماتے رہے، جب سب لوگ حدیثیں پیش کر چکے تو امام صاحب نے ہر متن کو اس کی اصلی سند اور ہر سند کو اس کے اصلی متن کے ساتھ ملحق کرکے ترتیب وار سنا دیا، لوگ سن کر دنگ رہ گئے، اور آپ کے علم و فضل کا ان کو لوہا ماننا پڑا،

"فأقر الناس له بالحفظ وأذعنوا له بالفضل"۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تعجب اس پر نہیں ہے کہ صحیح و غلط میں امتیاز کر دیا، کمال یہ ہے کہ ان لوگوں نے جس ترتیب سے روایات کو غلط شکل میں پیش کیا تھا، اس کو بھی بیان کر دیا۔ (مقدمہ فتح الباری ص ۵۰۳، فتح المغیث ص ۱۱۶)

انسائیکلو پیڈیا کے مصنفین نے بھی امام بخاری کے کمال حفظ کے متعلق لکھا ہے "امام بخاری کا حافظہ و استحضار اس غضب کا تھا کہ معاصرین ائمہ تک کو وہ ایک کرامت نظر آتا تھا"۔ (جلد چہارم ص ۷۰۵)

امام بخاری کا زہد و تقویٰ | علامہ کرمانی کہتے ہیں کہ امام صاحب کو اللہ تعالیٰ نے دنیاکی دولت بھی

عطا فرمائی تھی، انھوں نے اپنے والد سے ترکہ میں بہت سامال پایا تھا، اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے رہتے تھے، اور بسا اوقات آپ کو دو یا تین بادام پر دن گذارنا پڑا شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

کان قلیل الأکل جداً مفرداً فی الجود وقال کان یقنع کل یوم بلوزتین وثلثہ

(فیما یجب حفظہ للناظر ص)

امام صاحب نے کسی امیر یا بادشاہ کی فیاضی سے کبھی فائدہ نہیں اٹھایا، حالانکہ بارہا اس کے مواقع آئے۔ ان کے شاگرد امام موصوف کے واسطہ سے بیان کرتے ہیں کہ جس وقت میں آدم ابن ایاس کی خدمت میں حاضر ہوا، تو خرچ کے آنے میں بڑی تاخیر ہوئی، یہانتک کہ مجھکو گھاس کھاکر دو دن گذارنے پڑے، تیسرے دن ایک صاحب نے آکر مجھے دینار کی تھیلی پیش کی، جن کو میں پہچانتا بھی نہ تھا،

اسی طرح ان کے ایک اور شاگرد کا امام صاحب کے واسطہ سے بیان ہے، کہ جس وقت سے مجھے غیبت کی حرمت معلوم ہوئی، اس وقت سے میں نے کسی کی غیبت نہیں کی، اور اللہ تعالیٰ سے مجھے امید ہے کہ وہ اس بارے میں میرا محاسبہ نہیں فرمائے گا،

امام موصوف ایک مرتبہ بیمار ہوئے، ان کا قارورہ اطبا کو دکھایا گیا، انھوں نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سالن استعمال نہیں کرتے۔ امام موصوف نے فرمایا کہ چالیس سال سے سالن استعمال کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، نماز میں امام صاحبؒ کے استغراق کا یہ واقعہ حافظ ابن حجرؒ نے نقل کیا ہے، کہ ایک بار ظہر کی نماز سے فراغت کے بعد نفل میں مشغول ہو گئے، اس سے فارغ ہونے کے بعد اپنی قمیص کا دامن اٹھا کر اپنے بعض ساتھیوں سے فرمایا کہ دیکھو قمیص کے اندر کچھ ہے تو نہیں، انھوں نے دیکھا تو بھڑ نکلی جس کے ڈنک سے سترہ نشانات تھے، اور جسم کا وہ حصہ متورم ہو گیا تھا، ایک صاحب نے عرض کیا کہ آپ نے نماز کیوں نہیں توڑ دی، فرمایا میں ایک ایسی سورہ پڑھ رہا تھا کہ دل چاہتا تھا کہ اس کو ختم کر لوں۔ (مقدمہ قسطلانی ص ۳۱، لامع ص ۸)

شیوخ و معاصرین کا اعتراف | حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام صاحب کی مدح میں اگر متاخرین کے اقوال نقل کیے جائیں تو کاغذ اور روشنائی ختم ہو جائے۔ "فہذا بحر لا ساحل لہ"

ع سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

ان کے شیوخ و معاصرین سب ان کے کمالات کے معترف تھے۔ ایک مرتبہ عمرو بن زرارہ اور محمد بن رافع امام بخاری سے علل حدیث کے متعلق مختلف سوالات کے جواب حاصل کرنے کے بعد جب رخصت ہونے لگے، تو حاضرین مجلس سے مخاطب ہو کر کہا کہ "ابو عبد اللہ افقہ منا و اعلم و ابصر" امام اسحاق بن راہویہ نے فرمایا "ھو ابصر منی" حالانکہ اس وقت امام صاحب سبزہ آغاز تھے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ اسانید و علل میں امام بخاری سے بڑھ کر میں نے کسی کو نہیں پایا، امام مسلم نے امام بخاری کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ شہادت دی "اشھد انہ لیس فی الدنیا مثلک" (مقدمہ فتح ص ۴۸۵) ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اس آسمان کے نیچے امام بخاری سے بڑھکر میں نے کسی کو عالم حدیث نہیں دیکھا۔ (تہذیب الاسماء واللغات نووی ج ۱ ص ۷۰)

امام صاحب پر دور ابتلاء و آزمائش | حدیث میں ہے کہ اشد الناس بلاءً الانبیاء الامثل فالامثل۔ چنانچہ امام موصوف کو بھی اللہ تبارک و تعالیٰ نے بڑے بڑے امتحان میں ڈالا، امام موصوف ۲۵۰ھ میں جب نیشاپور تشریف لائے تو محمد بن یحییٰ ذہلی نے لوگوں سے کہا کہ ان صالح عالم کی خدمت میں جاکر ان سے حدیثیں سنو، ان کے کہنے پر لوگ اس کثرت سے امام موصوف کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ خود محمد بن یحییٰ کی مجلس درس ماند پڑ گئی، پھر امام صاحب جس شان سے نیشاپور میں داخل ہوئے اس کی تصویر امام مسلم نے ان لفظوں میں کھینچی ہے کہ اہل نیشاپور نے اس سے پہلے کسی والی اور کسی عالم کا ایسا استقبال نہیں کیا تھا، ان کے استقبال کے لیے نیشاپور سے دو تین منزل باہر نکل آئے تھے، امام صاحب نیشاپور پہنچکر

درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، امام ذہلی نے اعلان کر دیا تھا کہ کسی اختلافی مسئلہ میں امام صاحب سے گفتگو کی جائے، ورنہ اگر کوئی جواب ہمارے خلاف ہوا تو خراسان کے لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے، لیکن امام صاحب کے آنے کے دو ہی چار دن کے بعد جب آپ کے اشتیاق میں مکانوں اور چھتوں پر لوگوں کا ہجوم تھا، ایک شخص نے قرآن کے الفاظ کے متعلق بار بار سوال کیا، اس لیے مجبوراً امام صاحب کو اس کا جواب دینا پڑا، آپ نے فرمایا:-

القرآن کلام اللہ غیر مخلوق	قرآن کلام الٰہی غیر مخلوق ہے، الفاظ ہمارے
الفاظنا من افعالنا وافعالنا	زبان کا فعل ہیں، اور ہمارے تمام افعال
مخلوقة والامتحان عنه بدعة	مخلوق ہیں، اور اس مسئلہ میں امتحان لینا بدعت ہے

عوام اس دقیق جواب کو نہ سمجھ سکے اور امام ذہلی نے شدت سے امام صاحب کی مخالفت شروع کر دی، اور اپنی مجلس میں اعلان کرا دیا کہ جو شخص لفظی بالقرآن غیر مخلوق کا قائل ہو وہ ہماری مجلس درس میں نہ آئے، اس پر امام مسلم، احمد بن سلمہ جو حلقۂ درس کے ممتاز طالب علم تھے، امام ذہلی کی ساری تقریروں کو واپس کر دیا اور ان کا حلقہ چھوڑ دیا، (مقدمہ فتح ص ۴۹۲)

مسئلۂ خلق قرآن میں امام صاحب کا نقطۂ نظر خلق قرآن کے بارہ میں اوپر امام بخاری کا جو قول نقل کیا گیا ہے، اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں امام احمد کے خلاف ہیں، حالانکہ اگر غور کیا جائے تو فی الواقع دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ معتزلہ نے جب یہ مسئلہ اٹھایا، کہ جس طرح خدا نے دنیا کو کُن فیکون کے ذریعہ پیدا کیا ہے، اسی طرح قرآن کو بھی پیدا کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مخلوق ہے لیکن یہ عقیدہ جمہور اہل سنت کے خلاف ہے۔

امام بیہقی فرماتے ہیں کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک اس مسئلہ میں اتفاق ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے، اور باری تعالیٰ کی صفت ہے، کیونکہ متلو اور تلاوت کے درمیان فرق ہے،

متلو تو قدیم ہے اور تلاوت ہمارا فعل ہے اس لیے وہ حادث ہے، (کتاب الاسماء والصفات ص ۱۹۸ ج ۲)
بعض لوگ اس تفریق کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن امام بخاری متلو اور تلاوت کے درمیان تفریق
کرتے تھے، اور امام ذہلی کو اس پر اعتراض تھا (کتاب الاسماء والصفات بیہقی ج ۱ ص ۱۹۹)
امام احمد نے ان لوگوں پر جنھوں نے کلام اللہ کو مخلوق یا غیر مخلوق کہا یا اس بارہ میں توقف
اختیار کیا ہے، اسلیے سخت تنقید کی ہے، اور پوری قوت سے ان کا رد کیا، تاکہ آیندہ کے لیے اس
مسئلہ پر گفتگو کا دروازہ بند ہو جائے، بعد میں حنابلہ نے یہاں تک غلو کیا کہ کلام مجید کے روشنائی
اور اوراق سب قدیم ہیں، بعض نے قلم تک کو جس سے قرآن مجید لکھا گیا ہے، قدیم کہہ دیا،
امام بخاری کو اس غلو سے اختلاف تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا، جیسا کہ بخاری جلد ثانی باب
خلق افعال العباد میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، اس بنا پر امام بخاری اور حنابلہ میں
کشمکش پیدا ہو گئی، اور امام صاحب کو قید و بند کی تکلیفیں بھی برداشت کرنا پڑیں، کیونکہ
حکومت پر حنابلہ کا اثر تھا، غرض نیشاپور میں لوگوں نے محض فتنہ انگیزی کے لیے اس قسم کے
سوال وجواب پر امام صاحب کو مجبور کیا، جس کے نتیجہ میں ان کو نیشاپور چھوڑ کر اپنے وطن
مالوف بخارا واپس آنا پڑا، لیکن وہاں بھی مخالفین نے سکون سے رہنے نہ دیا، (لامع الدراری ص ۳۲
وافادات حضرة الاستاذ مدظلہ)

وفات | چنانچہ امام صاحب کے بخارا واپس آنے کے بعد لوگوں نے والی بخارا کو آپ کے خلاف
بھڑکانے کے لیے مختلف مقامات سے اس کے پاس خطوط لکھے، امام ذہلی نے بھی اس میں حصہ لیا،
ان خطوط پر والی بخارا امام صاحب سے ناراض ہو گیا، (لامع ص ۱۲) کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ
والی بخارا کی خواہش تھی کہ امام صاحب اس کے گھر پر جا کر اس کے بچوں کو الجامع الصحیح اور
التاریخ الکبیر پڑھا دیں، امام صاحب نے اس بنا پر اس سے انکار کیا کہ اس میں علم کی توہین تھی،

تو والی بخارا نے کہا کہ لڑکے خود امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جایا کریں گے، لیکن اس وقت وہاں کوئی دوسرا طالب علم نہ ہو، اس کو بھی امام صاحبؒ نے منظور نہیں کیا، اس پر والی بخارا آپ سے برہم ہو گیا، اور آپ کو بخارا سے نکل جانے کا حکم دیا، جب سمرقند والوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، لیکن وہاں کے لوگوں میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا، مجبوراً اپنے ننہال خرتنگ چلے گئے، جو بخارا سے تھوڑے فاصلے پر تھا، پھر رمضان المبارک کا مہینہ گذار کر شوال میں سمرقند جا رہے تھے کہ راستہ میں دفعۃً پیام اجل آگیا، اور ۲۵۶ھ میں باسٹھ سال کی عمر میں حدیث رسول کا یہ آفتاب تاباں غروب ہو گیا، (مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۴)

امام بخاری کا مسلک | امام صاحب کے مسلک کے بارہ میں علماء میں اختلاف ہے، کبار محدثین کے ساتھ ہمیشہ سے یہ معاملہ رہا ہے کہ مختلف مسلک والوں نے انکو اپنے اپنے مسلک کا پیرو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یہی معاملہ امام بخاری کے ساتھ بھی ہوا۔ تقی الدین السبکی نے طبقات الشافعیہ میں اور نواب صدیق حسن خاں صاحب نے ابجد العلوم میں شافعی ان کو لکھا ہے، (ابجد ص ۸۱۰) حافظ ابن حجر کے نزدیک امام بخاری کے مباحث فقہیہ کا غالب حصہ امام شافعی کے مسلک سے ماخوذ ہے (فتح ج اول ص ۲۱۳) علامہ ابن قیم کی تحقیق میں امام موصوف حنبلی تھے، (اعلام الموقعین ج ا ص ۲۲۶) لیکن علامہ طاہر جزائری کی نظر میں مجتہد مطلق ہیں، (توجیہ النظر ص ۱۸۵) مگر ان کی جامع صحیح کے مطالعہ سے جیسا کہ علامہ انور شاہؒ فرماتے ہیں، واضح ہوتا ہے کہ آپ بلاشک وشبہ مجتہد مطلق تھے، اور یہ شہرت کہ آپ شافعی تھے اور آپ نے مسائل مشہورہ میں امام شافعی

کے مسلک کی پیروی کی ہے، صحیح نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی موافقت بھی امام شافعیؒ سے کم نہیں ہے۔ (فیض الباری ج ا ص ۵۸) حضرۃ الاستاذ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے شافعیہ کے مسائل پر جتنی جگہوں پر رد کیا ہے، اس کی تعداد حنفیہ کے رد سے کم نہیں ہے، البتہ حنفیہ کی زیادہ قوت سے تردید کی ہے، اور اس کے وجوہ ہیں، (لامع ص ۵۱) اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر امام موصوف مجتہد مطلق ہیں تو ان کے خاص شاگرد امام ترمذیؒ جنھوں نے اپنی کتاب میں مذاہب کی طویل فہرست نقل فرمائی ہے، اس میں امام موصوف کا مسلک پوری کتاب میں ایک جگہ باب الاقتداء بالامام میں نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری مجتہد مطلق نہیں تھے، اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ان کا مذہب رائج نہیں ہوا تھا، اور نہ ان کے مقلد ہوئے، اس لیے ان کے مذہب کو بیان نہیں فرمایا۔ (افادات)

باقی

جمع و تدوین قرآن

از

جناب سید صدیق حسن صاحب مرحوم

(۴)

علامہ بحر العلوم عبد العلی ابو العیاش لکھتے ہیں :- " جن روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان صحابہ کی ترتیب اس قرآن کے خلاف تھی، وہ تمام وہمی اور خیالی ہیں، کسی معتبر کتاب میں ایسی روایت نہیں[۱]"

حافظ اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں۔" جو روایت ترتیب مصاحف ابیؓ بن کعب و عبداللہ ابن مسعودؓ میں ہے وہ کسی طرح قابل اعتماد نہیں، کیونکہ یہ روایت حدیث کے طبقۂ چہارم سے بھی ادنیٰ درجہ کی کتابوں میں ہے، کسی مستند حدیث کی کتاب میں نہیں[۲]"

ابن حزم لکھتے ہیں :- " معوذتین کے متعلق وہ روایتیں جن سے ابن مسعودؓ کا انکار ثابت ہوتا ہے، محض افترا اور جعل ہیں، کیونکہ ابن مسعودؓ سے عاصم کی روایت میں جو نہایت صحیح ہے، معوذتین ہیں، اور یہ بات کہ ابن مسعودؓ کا قرآن ہمارے موجودہ قرآن سے مختلف ہے، محض بہتان، افترا اور جھوٹ ہے، اور یہی رائے تمام ائمۂ دین کی ہے، ان میں قاضی ابوبکر، امام فخر الدین رازی اور محی الدین نوذی وغیرہ سب شامل ہیں"۔

---

[۱] رحمانی ص ۱۰۱ [۲] تاریخ القرآن ص ۷۰، ۷۸

ایک روایت اس سلسلہ میں حسب ذیل ہے:۔

قال قلت لعثمان ماحملكم	میں نے حضرت عثمانؓ سے عرض کیا کہ آپکو
علی ان عمدتم الی الانفال	کس بات نے اس چیز پر آمادہ کیا کہ انفال
وهو من المثانی وبرأة وهی	جو کہ مثانی میں سے ہے اور برأۃ جو مئین
من المئین فقد قرنتم بینهما	میں سے ہے، ان دونوں کے درمیان ختم
ولم تکتبوا بینهما سطر بسم الله	ہو جاتا ہے، آپ نے فصل کے طور پر
الرحمن الرحیم ووضعتموها فی	بسم اللہ کیوں نہیں لکھی، اور اسے
سبع طوال	آپ نے سبع طوال میں رکھدیا؟
فقال عثمان. کان رسول الله	حضرت عثمانؓ نے جواب میں فرمایا کہ جب
ینزل علیه السور ذوات	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر متعدد
العدد فکان اذا استنزل علیه	سورتیں نازل ہوتیں تو آپؐ کاتبان وحی
الشئ دعا بعض من کان یکتب	میں سے کسی کو طلب فرما کر حکم دیتے تھے کہ
فیقول ضعوا هولاء الآیات	ان آیتوں کو اس سورہ میں رکھو جیسا کہ
فی السورة التی یذکر فیها	آپ تذکرہ فرماتے، انفال ان سورتوں
کذا وکذا ــ وکانت الانفال	میں سے ہے جو مدینہ کے اوائل میں نازل
من اوائل ما نزل بالمدینة	ہوئی، نزول کے اعتبار سے قرآن مجید
وکانت البرأة من اخر القرآن	کی آخری سورہ برأۃ تھی، چنانچہ اس کا
نزولا وکانت قصتها شبیهة	شان نزول بھی انفال کے مشابہ ہے،
بقصتها فظننت انها منها فقبض	اس بنا پر میں نے یہ خیال کیا کہ برأۃ بھی

رسول اللہ ﷺ ولم یبین لنا انھا
فمن اجل ذٰلک قرنت بینھما
ولم اکتب بینھما سطر بسم اللہ
ووضعتھا فی السبع الطوال

انفال ہی کا جزو ہے، اور اس درمیان میں
نبی کریم ﷺ کی وفات ہوگئی، اور یہ مسئلہ آپ نے
واضح نہیں فرمایا کہ وہ سورہ اسی کا جزو ہے
چنانچہ اس وجہ سے میں نے اس کو آپس میں ملا دیا
اور اس کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی اور
اور اسے سبع طوال میں رکھا،

اس حدیث کو امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان، حاکم نے روایت کی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب صحابہ کی رائے سے ہوئی،

ترمذی نے اس حدیث کو نقل کرکے لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے اور صرف عوف نے یزید سے روایت کی ہے، عوف اگرچہ محدثین کے نزدیک معتبر ہیں، مگر تہذیب التہذیب میں انھیں دو وجہوں سے ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے، اس کے علاوہ یزید فارسی مجہول شخص ہے اور امام مسلم اور بخاری نے اس سے روایت نہیں کی ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ حدیث ان متواتر حدیثوں کے خلاف ہے جن میں براۃ کو مستقل سورہ شمار کیا گیا ہے۔ اس روایت میں درایتاً بھی یہ بات قابل توجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ نے انفال کو براۃ کے ساتھ ملا کر کیوں لکھا اور بیچ میں بسم اللہ کیوں نہیں لکھی، اور یہ سوال وجواب ۲۵ھ کے بعد ہوا، جب حضرت عثمانؓ کے حکم سے قرآن کے مستند نسخے شائع ہو چکے تھے، اس لیے غور طلب یہ ہے کہ ۱۲ھ اور ۲۵ھ یعنی تیرہ چودہ برس کے عرصہ میں جب حضرت زیدؓ قرآن کا مستند نسخہ لکھ کر خلیفۂ وقت کو دے چکے تھے، تو اس لمبے عرصہ میں کیا لوگوں نے مختلف الترتیب نسخے جمع کیے تھے، اور وہ تمام نسخے اس نسخہ کے سامنے

کالعدم قرار دیے گئے۔ اور ایسے نیست و نابود کیے گئے کہ ان کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا، اور یہ حضرت ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی زندگی اور ان کے علم میں ہوا، مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی،

ایک طرف تو صحابۂ کرام کی یہ ذہنیت تھی کہ جب حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے زید سے کہا کہ "قرآن کو بین الدفتین جمع کر دو" تو زید نے جواب دیا کہ آپ مجھے ایسا کام کرنے کے لیے کیسے کہہ سکتے ہیں، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا تھا، دوسری طرف یہ ذہنیت ہے کہ جب یہ آمرانہ حکم خلیفہ کی طرف سے صادر ہوتا ہے کہ جو میرا مصحف اور میری بیاض ہے بس وہی اصل اور درست مصحف ہے، اس کے خلاف جو بھی صحیفہ ہو اسے ضائع کر دیا جائے تو کسی اللہ کے بندے کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ وہ یہ کہہ سکے کہ تم اس کام کا کیسے حکم دے سکتے ہو جو رسول خدا نے نہیں کیا تھا،

پھر ذرا اس ستم ظریفی کو ملاحظہ فرمائیے، کہ وصال نبوی کے چودہ پندرہ سال بعد جب "بیاض عثمانی" مرتب کی جاتی ہے تو ہر سادہ لوح خلیفہ انفال اور برأت کو ایک ساتھ ملا دیتا ہے، کہ ان دونوں کا مضمون مشابہ ہے، اسی لیے دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھا، مگر ان کو دو مستقل سورتوں کی حیثیت سے قائم رہنے دیتا ہے، اس "اجتہاد" سے پہلے اسے خیال بھی نہیں ہوتا کہ زیدؓ کا مصحف یا ابن مسعودؓ کا مصحف منگا کے دیکھ لے، کہ ان میں ترتیب کیا ہے، اور یہ دونوں علٰحدہ علٰحدہ سورتیں ہیں یا نہیں۔

اس سے پہلے زیادہ مزیدار روایت وہ ہے جو حضرت انسؓ کی جانب منسوب ہے، اس میں کہا جاتا ہے کہ حضرت حذیفہؓ جب آذربیجان کے معرکہ سے واپس آئے تو انھوں نے خلیفۂ وقت حضرت عثمانؓ کو شام اور عراق والوں کے "اختلافھم فی القرآن" کی طرف توجہ دلائی اور کہا

یا امیر المومنین ادرک هذه الامة	اے امیر المومنین اس وقت کا معاملہ سنبھالیے
قبل ان یختلفوا فی الکتاب کما	قبل اس کے کہ کتاب اللہ کے بارہ میں ان میں
اختلف الیهود والنصاریٰ	اسی قسم کا اختلاف شروع ہو جائے جس طرح
	سے یہود و نصاریٰ نے اختلاف کیا،

تو حضرت عثمانؓ نے ام المومنین حضرت حفصہؓ کے یہاں سے حضرت زیدؓ کا مرتب کیا ہوا نسخہ منگایا اور زید بن ثابت، سعید بن العاص، عبد الرحمٰن الحارث بن ہشام اور عبد اللہ بن زبیرؓ کو متعین کیا کہ

انسخوا الصحف فی المصاحف وقال لرهط القرشیین الثلاثة اختلفتم انتم و زید بن ثابت فاکتبوا بلسان قریش فانها نزل بلسانهم

یعنی حضرت زیدؓ کا لکھا ہوا جو مستند نسخہ ام المومنین کے پاس تھا، اس کو منگا کے ان حضرات کو دیا گیا کہ اس کی نقلیں تیار کرو اور یہ ہدایت کی گئی کہ اگر تم لوگوں کو زید کے نسخہ کی کسی چیز سے خلاف ہو تو اس کو قریش کی زبان کے مطابق لکھو، کیونکہ قرآن انکی زبان میں نازل ہوا،

غور فرمائیے، یہاں صرف سوال کتابت کا ہے، مثلاً زید نے "ملک یوم الدین" لکھا، خلاف اگر نقل کرنے والے کو ہو سکتا ہے تو صرف رسم الخط سے ہو سکتا ہے، یعنی اسے "مالک یوم الدین" لکھنا چاہیے، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ بجائے "مالک" کے کوئی دوسرا لفظ قریش کی لغت کا یہاں رکھ دیا جائے، یہ تو ممکن نہیں تھا، کہ ام المومنین کے نسخہ میں ایک لفظ ہو اور نقل کرنے والے اس کے بجائے دوسرا لفظ لکھ دیں، تحریف قرآن کا جارح تو آج تک کسی پہلو سے نہیں نکالا،

اس روایت میں حیرت انگیز ٹکڑا حسب ذیل ہے۔

قال الزهری حدثنی خارجه	زہری نے کہا کہ مجھ سے خارجہ بن زید نے

عن زید ان زید بن ثابت فقد
آیۃ من سورۃ الاحزاب کنت
اسمع رسول اللہ یقرءھا "من
المومنین رجال صدقوا ما
عاھدوا اللہ علیہ فمنھم
من قضی نحبہ ومنھم من ینتظر"
فالتمستھا فوجدتھا مع خزیمہ
بن ثابت والی خزیمہ فالحقتھا
فی سورتھا۔

بیان کیا کہ زید بن ثابت سے سورہ احزاب
کی ایک آیت گم ہوگئی، میں نے اسے نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا تھا "و
آیۃ من المومنین الخ" تھی، چنانچہ میں نے
اس کی جستجو کی تو اسے خزیمہ بن ثابت
اور ابو خزیمہ کے پاس پایا، اور اس کو
احزاب میں لحق کر دیا۔

کوئی تیرہ چودہ برس بعد جب قرآن کا تیسرا اڈیشن شائع ہونے لگا اور حضرت زیدؓ کو ان کا لکھا ہوا کلام مجید جو اس وقت تک خلیفہ اول و دوم اور پھر ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس جزدان میں رکھا تھا، قرآن کے دوسرے نسخے تیار کرنے کے لیے جب نکالا گیا، اس وقت زیدؓ اپنے رفقاء کار یا اور جلیل القدر صحابی سے نہیں بلکہ اپنے بیٹے سے اس راز سربستہ کا انکشاف کیا کہ اس نسخہ میں ایک آیت سورہ احزاب کی نہیں ہے، اور اس آیت کو ڈھونڈنے لگے، حالانکہ اس وقت ہزاروں نسخے کلام مجید کے دیار عرب میں مستقل تھے، مگر کسی میں یہ آیت نہ ملی، اور بڑی تلاش و جستجو کے بعد خزیمہ بن ثابتؓ انصاری کے پاس ملی، خزیمہ ایسے محتاط جامع قرآن تھے جنھوں نے قرآن کے دوسرے اڈیشن کی ترتیب کے وقت سورہ برأت کی ایک گم شدہ "لقد جاءکم رسول الخ" بھی زید کو فراہم کی تھی، لیکن جب زید نے خود دوسرا اڈیشن مرتب کیا تھا تب بھی ان کو یاد نہ آیا کہ سورہ احزاب کی بھی ایک آیت گم ہوئی ہے، اور ۱۴ برس بعد جب اپنا مرتب کیا ہوا قرآن کھولا اس وقت انکے حافظے نے کام دیا اور وہ آیت دفعۃً یاد آ گئی

یعنی جو آیت ایک سال بعد یاد نہ آئی تھی وہ تیرہ سال بعد یاد آ گئی، اسی لیے علماء نے ایسی روایتوں پر تنقید کی ہے۔ چنانچہ زہری کی زید بن ثابت والی روایت جو پہلے پیش کیجا چکی ہے، اس کی سند کے بارہ میں مولانا رحمانی لکھتے ہیں کہ "یہ خبر احاد میں سے ہے، اور زہری اگرچہ محدثین کے نزدیک نہایت معتبر، قابل وثوق، راستباز اور امین ہیں اور تمام کتب صحاح میں ان کی روایتیں ہیں لیکن لیکن اسی کے ساتھ وہ مدرج تھے، یعنی اپنے کلام کو حدیث میں اس طرح ملا کر بیان کر دیتے تھے کہ سننے والے کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی حدیث ہی ہے،

چنانچہ المختصر میں ہے:-

فانه کان یخلط کلامه بالحدیث ولذلك قال له موسی بن عقبة افصل کلام رسول الله من کلامك

امام زہری اپنے کلام کو حدیث میں خلط ملط کر دیا کرتے تھے، اسی بنا پر موسیٰ بن عقبہ نے ان سے کہا کہ اپنے کلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے الگ کر لیا کرو۔

آگے چل مولانا رحمانی لکھتے ہیں کہ اس روایت اور امام بخاری نے کتاب الاحکام میں ابن شہاب زہری سے ابراہیم بن سعد کی جو روایت نقل کی ہے، ان دونوں میں حسب ذیل اختلافات ہیں۔ اختلافات خط کشیدہ ہیں:

زہری سے شعیب کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :-

(۱) قد استحر یوم الیمامة بالناس

(۲) من الرقاع والاکتاف والعسب

(۳) حتی وجدت من سورة التوبة ۔ آیتین

(۴) مع خزیمة الانصاری

(۵) لم اجدھا مع احد غیرہ

زہری سے ابراہیم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں :-

قد استحر یوم الیمامۃ لقراء القرآن۔

من العسیب والرقاع واللخاف

فوجدت آخر سورۃ توبۃ

مع خزیمۃ اور ابی خزیمۃ

یہ الفاظ نہیں ہیں

فالحقتھا فی سورتھا۔

ان اختلافات کے باوجود اگر یہ حدیث صحیح مان بھی لیجائے تو جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے، اُس میں جمع قرآن سے کتابت قرآن نہیں بلکہ ایک مستند قرآنی نسخہ تیار کرنا مقصود کتاب اللہ پر لکھنے والوں کی کمی نہیں، بے شمار لوگوں نے اپنی پوری کی پوری زندگی اس سعادت کو حاصل کرنے میں صرف کر دی ہے، اس کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر سیر حاصل بحث نہ ہو چکی ہو، اور اب کوئی نئی بات کہنا ناممکن ہے، پھر بھی اس سلسلۃ الذہب میں شامل ہونا تابع محمل کی حیثیت سے ہی سہی، باعث صد افتخار ہے، یہی جذبہ اس مقالہ کا محرک ہوا۔

ع بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

ادبیات

غزل

از

جناب محسن رضا جونپوری

ترکِ معیتِ دلِ رسوا کبھی کبھی — یوں بھی تلاشِ منزلِ لیلیٰ کبھی کبھی

اللہ رے جاں نوازیٔ غمہائے معتبر — رشکِ ارم بنی یہی دنیا کبھی کبھی

سمجھا تھا جس کو شعلۂ لرزاں سرِ مژہ — طوفاں بدوش تھا وہی قطرا کبھی کبھی

کرتا میں ان کے سامنے افشائے رازِ دل — آئی ہے لب پہ یہ بھی تمنا کبھی کبھی

لطف و کرم کہاں کا کہاں کی عنایتیں — ان کو ستم بھی تھا نہ گوارا کبھی کبھی

قلب و نظر کو ہو نہ سکی ہم نشیں خبر — یوں بھی ہوا ہے ان کا اشارا کبھی کبھی

غیروں کا ذکر کیا کہ سرِ جادۂ وفا — کام آ سکا نہ ان کا سہارا کبھی کبھی

دل شکوہ سنجِ طرزِ تغافل رہا مگر — راس آ گیا ہے وعدۂ فردا کبھی کبھی

ہر چند دل تھا محوِ طوافِ حرم مگر — یاد آ گئے ہیں دیر و کلیسا کبھی کبھی

آنکھوں کو دیکے دعوتِ محرومیٔ نظر — اٹھا حریمِ ناز کا پردا کبھی کبھی

اُس موجِ اضطراب کو کیا کہئے اے رضاؔ
دل کے سکوں نے جس کو پکارا کبھی کبھی

غزل

از

جناب مولانا زین الدین احمد صاحب نیّر اصلاحی

تیر جب کوئی خطا ہوتا ہوا پاتا ہوں میں
ناوکِ مژگاں کی زد پر خود چلا جاتا ہوں میں

تیری یادِ جانفزا سے دل کو بہلاتا ہوں میں
ہجر کی راتوں میں جلوت کے مزے پاتا ہوں میں

ذوقِ عصیاں پر جو اپنے یوں مٹا جاتا ہوں میں
چشمِ رحمت کی برابر شہ پہ شہ پاتا ہوں میں

لالہ و گل کیا، شفق کیا، یہ مہ و خورشید کیا
چھپنے والے تیرا جلوہ ہر جگہ پاتا ہوں میں

رقصِ بسمل میں مرے قاتل کے سب انداز ہیں
خود تڑپ کر اہلِ محفل کو بھی تڑپاتا ہوں میں

اس رخِ رنگیں پہ چھایا ہے مرا کیفِ نظر
اپنے ہی کیفِ نظر پہ خود مٹا جاتا ہوں میں

کیف برسے گا ابھی اٹھنے کو ہے اک طرفہ گھٹا
جام مے کو گنبدِ مینا سے ٹکراتا ہوں میں

ان کا حسن جانفزا ہے یا مرا ذوقِ نظر
جلوہ گاہِ حسن میں اک کشمکش پاتا ہوں میں

میں جو سمٹوں تو رہی اک ذرۂ ناچیز ہوں
اور پھیلوں تو محیطِ دہر بن جاتا ہوں میں

رقص کرتا ہوں "انا الحق" کہہ کے خود منصور وار
شاہدِ فطرت کو جب آغوش میں لاتا ہوں میں

دیدۂ حیراں سے نیّر بارگاہِ حسن میں
اک بہارِ ناز کو آئینہ دکھلاتا ہوں میں

مطبوعات جدیدہ

جانیاں جہاں گشت ۔ از محمد ایوب صاحب قادری، صفحات ۳۰۴، کتابت وطباعت بہتر، ناشر ادارۂ تحقیق وتصنیف ۱۲۲/۱ حیدرآباد کراچی ۱۸ قیمت مجلد [illegible]

حضرت مخدوم جلال الدین جانیاں جہاں گشت آٹھویں صدی ہجری کے ان ممتاز بزرگوں میں ہیں جنھوں نے بتکدۂ ہند میں کلمۂ اسلام کی آواز بلند کی اور اپنے صوفیانہ طرز تبلیغ کے ذریعہ اسلام کی روشنی گھر گھر پھیلائی، مغربی پاکستان میں دعوت وتبلیغ کے دو اہم مرکز تھے، ایک اوچ دوسرے ملتان، مخدوم صاحب کا مولد و مدفن دونوں اوچ ہے، مگر ان کے فیض کی ہمہ گیری اور سیر وسیاحت کی کثرت کی وجہ سے وہ اوچی سے زیادہ جانیاں جہاں گشت مشہور ہوئے۔

اردو میں مخدوم صاحب پر متعدد مضامین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن یہ کتاب اپنے تحقیقی مواد اور شگفتہ علمی انداز تحریر کی وجہ سے ان سب میں ممتاز ہے، پہلے باب میں اسلام کے داخلہ اور علماء وصلحاء کی تبلیغی کوششوں پر جو کچھ لکھا ہے اس نے کتاب کی قیمت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے، گویا یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ دعوت وتبلیغ کا ایک ہلکا سا تعارف ہے، کتاب میں کل آٹھ ابواب ہیں، دوسرا باب بار بار مطالعہ کے لائق ہے، صوفیائے کرام کے سوانح و حالات سے ہندو پاک میں ادھر چند برسوں سے جو اعتنا پیدا ہوا ہے، وہ اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے فال نیک ہے، وہ یہاں لحاظ سے بھی مفید ہے کہ ہندستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ

صوفیا کے سوانح حیات کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، اور یہ کتاب اس کے لیے دلیل راہ ہے،

معارف النفس ۔ از خواجہ عبدالرشید صاحب، صفحات ۱۰۰، کتابت و طباعت متوسط، ناشر مجلس اخوان الصفا کراچی، قیمت عہ

معرفت نفس خدا کی معرفت کا زینہ ہے۔ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" صوفیا کا مشہور مقولہ ہے، معرفت نفس پر علم نفسیات میں بھی بحث ہوتی ہے اور تصوف میں بھی، مگر تصوف کی عملی راہ نفسیات سے جدا ہے، نفسیات انسانی ذہن کی پیداوار ہے، اور تصوف کا رشتہ انسانی تجربات کے ساتھ شریعت خداوندی سے بھی جڑا ہوا ہے، اس لیے اس کے ذریعہ زندگی میں تبدیلی ہوتی ہے، خواجہ صاحب جدید نفسیات اور مغربی رجحانات کے ساتھ تصوف کے بھی لذت آشنا معلوم ہوتے ہیں، اس لیے جدید نفسیات کی روشنی میں تصوف اور اس کی تعلیمات کو بڑے فلسفیانہ اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے، موجودہ دور کا ذہن تصوف کو ناقابل التفات چیز سمجھتا ہے، مگر خواجہ صاحب نے ایسے موثر اور علمی انداز میں اس کو پیش کیا ہے کہ وہ زندگی کی واقعی ایک اہم ترین ضرورت معلوم ہونے لگتا ہے، امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی کہ تصوف عملی زندگی سے کوئی جدا چیز ہے۔

آفتاب ہجویر ۔ از پیام شاہجہان پوری، صفحات ۱۵۲، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر ملک سراج الدین اینڈ سنز، کشمیری بازار، لاہور،

شیخ ابوالحسن علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے قدیم ترین صوفیا میں ہیں، پانچویں صدی ہجری کی ابتدا میں ہندوستان تشریف لائے اور اپنی تبلیغی کوششوں سے اس وقت اسلام کی روشنی پھیلائی، جب یہاں مسلمانوں کی حکومت مستحکم نہیں ہوئی تھی، ان کی آمد سے پہلے مسلمانوں کی آبادیاں یا تو جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں میں تھیں یا سندھ میں، مگر قلب ہندوستان میں ابھی اسلام کی روشنی نہیں پھیلی تھی، حضرت شیخ ہجویری دوسرے تیسرے بزرگ ہیں جنھوں نے لاہور کو

اپنی دعوت و تبلیغ کا مرکز بنایا، شیخ کی کتاب کشف المحجوب احسان و تصوف کی ان بنیادی کتابوں میں ہے جو ابتدائے تصنیف سے آج تک مستند اصل اور مقبول خواص ہے۔

آفتاب ہجویری میں شیخ کے حالات زندگی، ان کے علم و فضل اور ان کی تعلیمات پر بڑی مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، امید ہے کہ یہ کتاب مقبول ہوگی، اور اس کے ذریعہ صرف بزرگوں کے حالات اور کارناموں سے واقفیت حاصل ہوگی بلکہ موجودہ دور میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے اس سے رہنمائی بھی حاصل ہوگی۔

قومی کتابیات (شعبۂ اردو) — از بی، ایس کیشون و سید جمیل احمد، صفحات ۹۸، ٹائپ، ناشر بھاشا دیبھاگ، اترپردیش سرکار، لکھنؤ، قیمت ۶ ر

قومی کتابیات ان اردو مطبوعات کی فہرست ہے، جو ۱۹۶۱ء میں ہندوستان میں شائع ہوئیں، اور جن کی کاپیاں نیشنل لائبریری میں بھیجی گئیں، اس میں ہر فن کی کتابوں کی الگ الگ تفصیل دی گئی ہے، اس کی اشاعت سے ملک میں ہونے والے علمی و ادبی کاموں سے بڑی تفصیلی آگاہی ہو جاتی ہے، جو تحقیقی کام کرنے والوں اور لائبریریوں کے لیے بڑی مفید چیز ہے، اس کتاب کی اشاعت کے لیے مرتب اور اترپردیش سرکار دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

صوبۂ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات — از محمد عتیق صاحب صدیقی، صفحات ۲۳۰، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، قیمت لعصہ

آج سے سو برس پہلے صوبۂ شمالی و مغربی یعنی اترپردیش، دہلی اور پنجاب میں جو اردو اخبارات و رسائل نکلتے تھے، یا جو مطابع طباعت کا کام انجام دیتے تھے، آج کی طرح اس وقت بھی ان کی سالانہ رپورٹ حکومت تک پہنچتی تھی، وہ رپورٹیں بہت ہی مکمل اور معلومات افزا ہوتی تھیں، مثلاً اخبار کی پالیسی، زبان، طرز نگارش، خبر کی نوعیت اور خریداروں کی تعداد وغیرہ سبھی کا

ان میں درج ہوتی تھیں، پھر ان رپورٹوں پر سکریٹری کا ایک تبصرہ ہوتا تھا، انہی رپورٹوں کی روشنی میں انیسویں صدی کے نصف اول کے بعض برسوں میں یعنی ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۳ء تک جو اخبارات ان صوبوں سے نکلے تھے یا جو کتابیں چھپی تھیں عتیق صاحب نے ان کو مرتب کرکے شائع کردیا ہے، سرکاری رپورٹوں کے ساتھ مرتب نے اس میں دوسرے ذرائع سے بھی اچھا خاصا اضافہ کیا ہے، اس رپورٹ کی اشاعت سے اردو صحافت کی ابتدائی تاریخ مرتب کرنے میں بڑی مدد ملے گی امید ہے کہ ان رپورٹوں کی اشاعت کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔

سہل تجوید۔ از قاری سید کلیم اللہ صاحب حسینی، صفحات ۸۰، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر دارالقرآن والدینیات الکلیمیہ، حیدرآباد دکن، قیمت عہ

فن تجوید پر اردو میں جو کتابیں اور رسالے لکھے جاچکے ہیں انہی میں سہل تجوید بھی ہے، جو پانچویں بار شائع ہوئی ہے اس کے مصنف محض قاری نہیں ہیں، بلکہ لندن سے پی ایچ ڈی ہیں اور جامعہ عثمانیہ میں فارسی کے پروفیسر رہ چکے ہیں، یہ رسالہ واقعی اسم بامسمی ہے، اس فن سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے، بلکہ ابتدائی درجات میں یہ داخل نصاب کرنے کے لائق ہے۔

ہماری نعت۔ از شفیع الدین صاحب نیر، صفحات ۳۲، کتابت و طباعت اعلیٰ، ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، دہلی ۶، قیمت تیس نئے پیسے

نیر صاحب کی متعدد کتابوں کا تعارف معارف میں ہوچکا ہے، یہ کتاب محض نعت نبوی پر مشتمل ہے جو انھوں نے چھوٹے بچوں کے لیے لکھی ہیں، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی تمہید میں لکھتے ہیں کہ ... نے دل کے ساتھ عقل کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کی ہے، امید ہے کہ اسلامی مکتبوں کے طلبہ ... ہوگی، اس میں نعتیہ نظمیں اس ترتیب سے لکھی گئی ہیں کہ اس سے سیرت نبوی کا ... ہے۔

م - ص

جلد ۹۳ - ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ مطابق فروری ۱۹۶۴ء عدد ۲

فہرست مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ

ادبیات

شذرات

آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات جن کو انسانی وحشت و درندگی کہنا زیادہ صحیح ہے، زندگی کا ایسا معمول بن گئے ہیں کہ ہی سے کوئی سال ان سے خالی جاتا ہے۔ ابھی جبلپور، علی گڑھ اور میرٹھ کے فسادات کے زخم مندمل بھی ہوئے تھے کہ کلکتہ کے فساد نے ان سب کو بھلا دیا، اس فساد میں مسلمانوں پر جو تباہی آئی ہے، اس کی تلافی بظاہر کوئی امید نہیں، اور آیندہ کلکتہ کے مسلمانوں کا پنپنا بہت دشوار ہے۔ اگر حکومت ہند کے وزیر داخلہ ری گلزاری لال نندا نے پوری مستعدی سے اپنا فرض ادا نہ کیا ہوتا تو معلوم نہیں مسلمانوں پر اور کیا قیامت گذر جاتی، س کے لیے وہ تحسین اور شکریہ کے مستحق ہیں، اگر صوبائی حکومتیں پہلے سے اسی مستعدی کا ثبوت دیا کریں تو فساد کی نوبت نہ آئے، یا کم سے کم وہ سنگین صورت اختیار نہ کرنے پائے، مگر ان کو تو اس وقت ہوش آتا ہے جب معاملہ ہاتھ سے باہر ہو جاتا ہے اور فسادی اپنا کام ختم کر چکتے ہیں۔

گو پاکستان میں مدتوں کے بعد فساد ہوا ہے لیکن اس سے اس کا جرم ہلکا نہیں ہوتا، اس بارہ میں اس پر ہندوستان سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، وہ اسلامی حکومت کا مدعی ہے، اور اسلام نے اپنی غیر مسلم اقلیت بلکہ اکثریت دونوں کی جان، مال اور عزت و آبرو مسلمانوں کے برابر قرار دی ہے، اور اسلامی حکومت پر اس کی ویسی ہی ذمہ داری ہے جیسی مسلمانوں کی حفاظت کی ہے، دوسرے اسلام کسی ناکردہ گناہ سے بدلہ لینے کی اجازت نہیں دیتا، اور ہندوستان کے فساد کا پاکستان کے ہندوؤں سے بدلہ لینا سراسر اسلامی تعلیم کے خلاف ہے، اور اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو فائدہ کے بجائے الٹا نقصان پہنچتا ہے، پاکستان کو اس کا صحیح اندازہ نہیں کہ اس کی ایک غلطی سے ہندوستانی مسلمانوں پر کیا گذر جاتی ہے، کیونکہ ہندوستان میں جمہوریت اور سیکولرزم کے دعوی کے باوجود یہاں کے مسلمانوں کو پاکستان کا یرغمال سمجھا جاتا ہے، گو حکومت کا یہ نقطۂ نظر نہیں ہے لیکن اکثریت کے مقابلہ میں وہ بھی بے بس ہے۔

اس مرتبہ ڈھاکہ اور [illegible] کے فسادات کے بعد مختلف سمتوں سے تبادلۂ آبادی کی آوازیں بلند ہوئی ہیں مگر حکومت نے اس قسم کا کوئی خیال ظاہر نہیں کیا ہے لیکن وہ بھی پاکستان کے ان ہندوؤں کے لیے جو ہندوستان منتقل ہونا چاہیں سہولتیں فراہم کرنے پر آمادہ ہے، اس سے انکو ترک وطن کی ترغیب ہوگی اور نقل آبادی کی ترغیب درحقیقت دو قومی نظریہ کی تصدیق ہے اسلئے کسی شکل میں بھی اسکی حوصلہ افزائی نہ ہونی چاہیے، جن لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پاکستان کے ہندوؤں کو نکالنے کے بعد ہندستان کے مسلمانوں کو بھی نکال دیا جائیگا یا انکو اچھوت بناکر رکھا جائیگا۔ وہ سخت غلطی پر ہیں، ہندوستان یہاں کے مسلمانوں کا بھی ویسا ہی وطن ہے اور اس پر ان کے بھی وہی حقوق ہیں جیسے ہندوؤں کے ہیں جس کو ہندوستان کا دستور بھی مانتا ہے، اسلیے کوئی قوت بھی مسلمانوں کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتی، وہ ہندستان یا پاکستان کی جائداد منقولہ نہیں ہیں کہ جہاں چاہا ان کو منتقل کر دیا، مسلمان کبھی اس ننگ کو گوارا نہیں کر سکتے، وہ من حیث القوم ترک وطن کو تصور میں نہیں لا سکتے۔ ان کو ہندوستان ہی میں رہنا اور یہیں جینا اور مرنا ہے۔

پانچ کروڑ مسلمانوں کو ختم کر دینے یا ان کو اچھوت بناکر رکھنے کا تصور ایسا احمقانہ اور مضحکہ خیز ہے جس کو فرقہ پرستوں کے علاوہ کوئی سنجیدہ جماعت سوچ ہی نہیں سکتی، جو لوگ تبادلۂ آبادی کو سوچتے ہیں وہ درحقیقت پھر ہندوستان کی تقسیم اور ۴۷ء کے واقعات کا اعادہ چاہتے ہیں جس کو کوئی ہوشمند گوارا نہیں کر سکتا، اس کا حل اسکے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ دونوں ملکوں کی حکومتیں اور اکثریت اپنی اپنی اقلیتوں کے بارہ میں اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور انکو اجنبی سمجھنے کے بجائے اپنی قوم اور ملکی حقوق میں برابر کا شریک سمجھیں، اس کے علاوہ اور جو شکل بھی اختیار کیجائے گی وہ تباہی کی طرف لیجائے گی۔

مسٹر چھاگلا جب سے وزارت میں آئے ہیں، بیشتر اختلافی مسائل خصوصاً مسلمانوں کے معاملات میں ہمیشہ غلط مشورے دیتے ہیں، ابھی گذشتہ اکتوبر میں مسلم یونیورسٹی کی ایک تقریر میں انہی کے الفاظ ہیں انھوں نے مسلمانوں کو اکثریت کی تہذیب کے دھارے میں بہ جانے کا مشورہ دیا، پھر اردو کے رسم الخط کو دیوناگری بنا دینے کی صلاح دی، اب انھوں نے مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کا حق پارلیمنٹ کو سونپ دیا، یعنی جس

معاملہ میں مداخلت سے خود حکومت برأت ظاہر کر چکی ہے، مسٹر چھاگلا اصرار کرکے اس کو اس پر آمادہ
کرنا چاہتے ہیں، مذہبی عقائد سے قطع نظر جس سے مسٹر چھاگلا کو برائے نام ہی تعلق ہو گا، وہ ایک قانون داں
اور سابق جج کی حیثیت سے وہ اتنا تو واقف ہی ہوں گے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کا تعلق دنیاوی قانون ساز
جماعتوں سے نہیں بلکہ اسلامی شریعت سے ہے جس کے خلاف ترمیم کا حق خود مسلمان حکومتوں کو بھی نہیں
ہے، اور جو مسلمان حکومت ایسا کرتی ہے وہ مذہب کے سراسر خلاف ہے، اس لیے اس کا عمل دلیل
نہیں بن سکتا، اگر مسٹر چھاگلا کو اپنی وفاداری اور سیکولرزم ہی کا ثبوت دینا ہے تو اس کے لیے اور میدان
بھی ہیں، انھوں نے مذہب کو اس کے لیے کیوں منتخب کیا ہے۔

سید ظہیر الدین علوی مرحوم رجسٹرار جامعہ اردو علی گڈھ کی وفات دنیائے اردو کا افسوسناک
سانحہ ہے، جامعہ اردو ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے، اس کے ذریعہ اردو کی تعلیم کی جس قدر اشاعت
ہوئی اس کی مثال کوئی ادارہ پیش نہیں کر سکتا، جامعہ اردو کے امتحان دینے والوں کی تعداد
ہزاروں سے متجاوز ہو گئی ہے، اس کی سند کو ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں نے تسلیم کر لیا ہے،
اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سیکڑوں آدمیوں نے جامعہ اردو کے امتحانات کے ذریعہ محض انگریزی زبان و ادب
کا امتحان دے کر انگریزی کی پوری تعلیم حاصل کر لی، اس سے لڑکیوں کی تعلیم میں خصوصیت کے ساتھ
بڑی سہولت پیدا ہو گئی ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ ان کے بعد جامعہ کی رجسٹراری
کے لیے مولوی نور الرحمٰن صاحب کا انتخاب عمل میں آیا ہے، جو اپنی قابلیت اور تجربہ کے لحاظ سے
اس جگہ کے لیے موزوں ترین شخص ہیں، اور ہم کو یقین ہے کہ وہ اپنے پیشرو کے صحیح جانشین اور
ان کا نعم البدل ثابت ہوں گے۔

مقالات

اسلامی رصد خانے

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۲)

مامون الرشید کا عہد خلافت

۱۹۸ھ میں امین کے بجائے مامون خلیفہ ہوا، اس کی تخت نشینی گویا تخت کیانی پر خسرو نوشیرواں کا احیاء تھا، خلیفہ ہونے کے بعد مامون نے اس ثقافتی تحریک کو زندہ کیا جس کی بنیاد منصور نے ڈالی تھی، جو ہارون کے عہد میں برامکہ کے زیر سرپرستی پروان چڑھی اور برمکیوں کی نکبت و زوال سے قدرتی طور پر رک گئی تھی،

عقلیت و یونان پسندی مامون الرشید عباسی خلفاء میں اپنی "عقلیت نوازی" اور "یونان پسندی" کے لیے مشہور ہے، ابن شاکر الکتبی نے لکھا ہے:-

"امیر المومنین ابو العباس المامون (عبداللہ بن ہارون) .... جب بڑے ہوئے تو انھیں یونانی علوم کا شوق دامنگیر ہوا اور فلسفہ میں مہارت حاصل کی، اسی وجہ سے قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہو گئے" (فوات الوفیات جلد ثانی ص ۲۳۹)

یونانی فلسفہ سے اس درجہ شیفتگی تھی کہ وہ اس کے دل و دماغ پر مستولی ہو گیا تھا، اور سوتے جاگتے اسے یونانی حکمت اور یونانی حکماء ہی نظر آتے تھے، ابن الندیم کہتا ہے:-

"مامون نے خواب میں دیکھا کہ ایک سفید فام .... نیکو مرد اپنے تخت پر بیٹھا ہے۔ مامون کہتا ہے

ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کے سامنے میرے اوپر رعب اور ہیبت طاری ہو گئی ہے، میں نے اس سے پوچھا

آپ کون ہیں؟ جواب دیا، ارسطا طالیس۔ اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی، اور کہا اے حکیم! کیا میں کچھ

دریافت کروں۔ جواب دیا، پوچھو۔ میں نے کہا خوب کیا ہے؟ کہا جسے عقل اچھا کہے۔ میں نے کہا پھر؟ کہا جسے

شریعت اچھا کہے۔ میں نے کہا پھر؟ کہا: جسے لوگ اچھا کہیں۔ میں نے کہا پھر؟ کہا: پھر کوئی پھر پھر نہیں

.... اور تم توحید کو لازم پکڑو۔" (الفہرست ص ۳۳۹)

غالباً اسی عقلیت نوازی اور علوم الاوائل کی جانب میلان مفرط کی وجہ سے وہ زندقہ کے ساتھ متہم تھا۔[1]

یونانی علوم کا داخلہ — مسلمانوں میں یونانی علوم کا آغاز یوں تو خالد بن یزید بن معاویہ کے زمانے سے ہو گیا تھا مگر

اس کی باقاعدہ ابتدا منصور عباسی کے عہد حکومت سے ہوئی، اس کی تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے، اور اس کی معراج کمال

مامون الرشید کا عہد خلافت ہے، ابن الندیم مذکورۃ الصدر خواب نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:۔

"یہ خواب مامون کے لیے یونانی علوم کی کتابیں ترجمہ کرانے میں سب سے مؤکد سبب بن گیا، اس نے بادشاہ روم

کے ساتھ خط و کتابت کر کے اسے آخرکار اس بات کے لیے راضی کر لیا کہ اس کے ملک میں قدیم علم و حکمت

کے جو منتخب نسخے موجود تھے، انھیں بلاد اسلام بھیجنے کی اجازت دے دی۔ قیصر روم بڑی مشکل سے اس پر

راضی ہوا۔ پس مامون نے کتابیں منتخب کر کے لانے کے لیے ایک جماعت بھیجی جن میں حجاج بن مطر، ابن البطریق

اور سلما صاحب بیت الحکمۃ تھے، پس جب لوگ انتخاب کر کے یونانی علوم کے ذخائر کو مامون کے پاس

[1] چنانچہ ابن الندیم کتاب الفہرست (ص ۴۷۳) میں "ذکر من کان یرمی بالزندقۃ من الملوک والرؤساء"

کے زیر عنوان لکھتا ہے:۔

قرأت بخط بعض اهل المذهب	میں نے بعض اہل مذاہب کی تحریر میں پڑھا ہے کہ
ان المامون كان منهم كذب في ذلك	مامون بھی انھی میں تھا، مگر یہ جھوٹ ہے۔

تو اس نے ان کے ترجمہ کا حکم دیا، اس طرح یہ کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔[1] (الفہرست ص ۳۳۹)

علمی سرپرستی | علم و حکمت کی سرپرستی میں مامون اسلام کی ثقافتی تاریخ میں نمایاں شہرت کا مالک ہے۔

قاضی صاعد اندلسی نے طبقات الامم میں لکھا ہے:-

"جب بنو عباس میں سے ساتویں خلیفہ عبداللہ المامون کو خلافت پہنچی ...... تو جس تحریک کا اس کے پردادا منصور نے آغاز کیا تھا، انھوں نے اسے تکمیل کو پہنچایا، جہاں سے علم مل سکتا تھا، ادھر متوجہ ہوئے اور اپنی ہمت عالی اور عزم راسخ سے علوم کو ان کے معادن سے نکالا، روم کے بادشاہوں سے خط و کتابت کی، انھیں بیش قیمت ہدیے اور تحفے بھیجے، اور ان کے بدلے میں ان کے یہاں جو فلسفہ کی کتابیں تھیں ان کی خواہش کی، پس انھوں نے افلاطون، ارسطاطالیس، بقراط، جالینوس، اقلیدس، بطلیموس وغیرہ فلاسفہ کی جو کتابیں ان کے یہاں موجود تھیں، مامون کو بھیجیں، مامون نے ان کے ترجمے کے لیے ماہرین کو منتخب کیا، اور انھیں بہترین طور پر ان کا ترجمہ کرنے پر مامور کیا، اس طرح باحسن وجوہ ان کتابوں کا ترجمہ ہوا، اس کے بعد مامون نے لوگوں کو ان کے پڑھنے پر برانگیختہ کیا اور ان کی تعلیم کی ترغیب دلائی، اس طرح ان کے زمانہ میں علم کا بازار گرم ہو گیا، اور حکمت کی سلطنت قائم ہوئی ..... پس اہل علم کی ایک جماعت نے مختلف علوم میں کمال حاصل کیا" (طبقات الامم ص ۷۵-۷۶)

اس کام کے لیے اس نے بعد اوّلی کے خزانۃ الحکمۃ کی بیت الحکمۃ کے نام سے تجدید کی اور سہل بن ہارون کو اس کا منتظم اعلیٰ اور اس کے بھائی سعید نیز سابق لائبریرین سلمؔ حرانی کو اس کا شریک کار مقرر کیا[2]، ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ حنین جن اوراق پر ترجمہ کیا کرتا تھا مامون اسے ان کے ہم وزن سونا دیتا تھا۔[3]

خلیفۂ وقت کا یہ علمی میلان اور خبر پروری کا یہ شوق ملک کے عام مذاق کو متاثر کیے بغیر کس طرح چھوڑ سکتا تھا چنانچہ کچھ ہی عرصہ میں قلمروئے خلافت علم و حکمت کی روشنی سے بقعۂ نور بن گیا۔

---

[1] الفہرست ص ۳۳۹، [2] نیز ص ۲۰۲، [3] عیون الانباء فی طبقات الاطباء، لابن ابی اصیبعہ ج ۱ ص ۱۸۷

نجوم پسندی | علوم حکمیہ میں سے مامون کو ہندسہ اور نجوم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی، ان سے اسکی دلچسپی کا یہ عالم تھا[1] کہ جو شخص پوری اصول اقلیدس (تیرہ مقالے) پڑھے ہوئے نہ ہو تو وہ اسے مہندس ہی نہیں سمجھتا تھا، اس کی قبا کی آستین پر مقالۂ اولیٰ کی شکل نجم کا طغرا بنا ہوا تھا، اسی وجہ سے یہ شکل "مامونی" کہلاتی ہے،

اس کی اس نجوم پسندی میں اس کی ابتدائی تربیت کو بھی دخل تھا، جو "ایرانی اخوال" کے درمیان ہوئی تھی، نجوم پسندی ایرانیوں کے قومی مزاج میں رچی ہوئی تھی اور انھیں سے یہ اثر مامون میں آیا، پھر خلیفہ ہونے کے بعد بھی وہ فضل بن سہل وغیرہ ایرانی وزراء و امراء کے زیر اثر رہا، فضل بن سہل کا خاندان نجوم و ہیئت میں شغف کے لیے مشہور تھا، عوفی نے جوامع الحکایات میں فضل کے بھائی حسن ابن سہل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سفر میں بھی ہمیشہ اصطرلاب ساتھ رکھتا تھا، ان لوگوں کے اثر سے نجوم پسندی مامون کے مزاج میں بھی راسخ ہوگئی تھی، مسعودی لکھتا ہے:-

فكان في بدء امره لما غلب الفضل	ابتدا میں جبکہ وہ فضل بن سہل وغیرہ کے اثر میں
بن سهل وغيره يستعمل النظر	تھا، تو احکام نجوم میں غور و فکر کرتا تھا، اور
في احكام النجوم وقضاياها وينقاد	ان کی پیشین گوئیوں کا تبع اور اس
الى موجباتها ويذهب مذاهب	باب میں قدیم ساسانی بادشاہوں کا
من سلف من ملوك ساسان[2]	پیرو تھا۔

چنانچہ عمر بن الفرخان الطبری جو یحییٰ بن خالد برمکی کے متوسلین میں سے تھا، اور اس کے زوال کے بعد فضل بن سہل کی سرکار سے وابستہ ہوگیا تھا، اس لئے اس کو مامون کے یہاں باریاب کرایا اور اس نے خلیفہ کے لیے نجوم وغیرہ میں بہت سی کتابیں تالیف کیں[3]۔

---

[1] اخبار العلماء باخبار الحکماء، ص ۲۸۸ [2] مروج الذہب ومعادن الجواہر برحاشیہ کامل ابن الاثیر ج ۱۰ ص ۱۴۷، [3] اخبار العلماء باخبار الحکماء، ص ۱۶۲

رصد گاہ کا قیام | نجوم سے اس غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ یہ تھا کہ اس نے یونانی حکماء (بطلیموس وغیرہ) کی رصد گاہوں کے طرز پر رصد گاہ قائم کرائی۔ قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے :۔

عربی	اردو
ولما افضت الخلافة الى عبد الله	جب خلافت ابو عبد اللہ المامون کو پہنچی تو.....
المامون..... ووقفت علماء زمنه	اور اس کے زمانہ کے علماء کتاب المجسطی پر مطلع ہوئے
على كتاب المجسطى وفهموا صورة الآلات	اور اس میں مذکور آلات رصد کی کیفیت سے
الرصد الموصوفة فيه......	واقف ہوئے..... تو اس نے علمائے عصر کو جمع کیا
جمع علماء عصره..... وامرهم	..... اور انھیں حکم دیا کہ وہ بھی ایسے ہی آلات
ان يصنعوا مثل تلك الادوات	تیار کریں اور ان سے اجرام فلکی کی سیر و گردش
ان يقيسوا بها الكواكب ويتعرفوا	کا حال دریافت کریں جس طرح بطلیموس اور
احوالها كما صنعه بطليموس ومن كان	اس کے پیشروؤں نے کیا تھا۔ انھوں نے اس
قبله ففعلوا ذلك۔ وتولوا الرصد	حکم کی تعمیل کی اور ۲۱۴ھ میں شماسیہ دمشق
بمدينة الشماسية من بلاد دمشق	(شام) میں رصد گاہ قائم کی اور سال شمسی کی
من ارض الشام سنة اربع عشرة	کی مدت، آفتاب کے میل کلی اور (Eclepticity)
ومائتين۔ فوقفوا على زمن سنة	اور اس کے خروج مرکز (Eccentricity)
الشمس الرصدية ومقدار ميلها	اور اس کے نقطۂ اوج (Apogee)
وخروج مركزها وموضع اوجها	کو متعین کیا، نیز سیارات و ثوابت کے دیگر احوال
وعرفوا مع ذلك بعض احوال باقى	دریافت کیے لیکن ۲۱۸ھ میں خلیفہ مامون الرشید
الكواكب من السيارة والثابتة	کی وفات نے ان کے مقصد کی تکمیل میں خلل ڈالا
ثم قطع بهم عن استيفاء غرضهم	اور جن دریافتوں تک ان کی رسائی ہوئی تھی

موت الخلیفة المامون فی سنة ثمان	اس کو انھوں نے مکمل کرلیا، اور اس کا
عشرة ومائتین۔ فقیدوا ما انتھوا الیہ	نام رصد ماموں (زیچ ماموں)
وسمّوہ الرصد المامونی[1]	رکھا۔

اسی طرح ابن القفطی یحییٰ بن ابی منصور کے تذکرے میں لکھتا ہے :-

ولما عزم المامون علی رصد الکواکب	جب مامون الرشید نے ارصاد کواکب (فلکیاتی
تقدم الی یحیی ھذا والی جماعة ترد	مشاہدات) کرانے کا ارادہ کیا تو یحییٰ بن ابی منصور
اسمائھم فی حروفھم وامرھم بالرصد	اور دوسرے لوگوں کو جن کے نام انکے حروف میں
واصلاح آلاتہ نفعلوا ذالک	آئیں گے، بلایا، اور انھیں رصدبندی نیز آلات مشاہدہ
بالشماسیة ببغداد وجبل قاسیون	کی اصلاح کا حکم دیا، انھوں نے یہ کام دو جگہ انجام دیا
بدمشق وذلک فی سنة خمس عشرة	شماسیۂ بغداد اور دمشق کے جبل قاسیون پر
وست عشرة وسبع عشرة ومائتین	یہ ۲۱۵ھ، ۲۱۶ھ اور ۲۱۷ھ کا واقعہ ہے، مگر
وبطل الامر بموت المامون فی شھور	رصد و ارصاد کا سارا کام ۲۱۸ھ میں مامون
سنة ثمانی عشرة ومائتین[2]	کی وفات سے درہم برہم ہوگیا۔

ابن القفطی اور قاضی صاعد نے رصدگاہ ماموں کو عہد اسلام کی پہلی رصدگاہ بتایا ہے، مگر ابن یونس نے "زیج حاکمی" میں تصریح کی ہے کہ اس سے پہلے جندی سابور میں ہارون الرشید کے عہد میں احمد بن محمد النہاوندی نے فلکی مشاہدات کیے تھے[3]، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ سرکاری سرپرستی میں پہلی رصدگاہ، رصدگاہ ماموں تھی،

آلات رصدگاہ کی اصلاح | اگرچہ رصدگاہ ماموں کے آلات، جیسا کہ قاضی صاعد نے لکھا ہے، اسی قسم کے تھے جیسے کہ بطلیموس وغیرہ یونانی ہیئت دانوں نے استعمال کیے تھے، مگر صحت و عمدگی میں ان سے بدرجہا

---

[1] طبقات الامم ص ۷۹، ۰۰ [2] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۷۹، ۰۰ [3] زیج ابن یونس ص ۱۰۱،

فائق تھے، چنانچہ ابن الندیم "الکلام علی الآلات وصناعها" کے عنوان سے لکھتا ہے:-

كانت الآلات تعمل بمدينة حران	آلات رصد شہر حران میں تیار ہوتے تھے، وہیں سے
ومن ثم تشتت وظهرت وكثرت	دوسرے مقامات میں پھیلے اور مشہور ہوئے، لیکن عباسی
واتسع للصناع العمل في الدولة	حکومت میں مامون کے زمانہ سے وہ زیادہ تیار ہونے
العباسية منذ ايام المامون الى	لگے اور کاریگروں نے ان میں نئی نئی اختراعیں کیں،
وقتنا هذا۔ فان المامون لما اراد	کیونکہ جب مامون نے رصدگاہ قائم کرنے کا ارادہ
الرصد تقدم الى ابن خلف	کیا تو خلف المروروذی کو بلایا، اس نے اسکے
المروروذی فعمل له ذات الحلق	(مامون کے) واسطے ذات الحلق تیار کیا اور وہ ہمارے
وهی عندنا عند بعض علماء بلدنا	شہر کے بعض علماء کے پاس ہے، مروروذی
هذا وقد عمل المروروذی الاصطرلاب	نے اصطرلاب بھی بنایا تھا۔

ایک یورپین مورخ علم الہیئت رصدگاہ مامون کے آلات کی خوبی و نفاست کے بارے میں لکھتا ہے:-

"Another (observatory) on a more magnificent scale was built at Baghad in 829 by the Caliph Al-Mamun. The instruments used were superior both in size and workmanship to those of the Greeks, though substantially of the same type." (Berry. A short History of Astronomy, P. 78).

ایک دوسرا شاندار رصد خانہ بغداد میں ۸۲۹ء میں خلیفہ المامون نے بنوایا، اس میں جو آلات استعمال کیے گئے،

۱؎ الفہرست ص ۳۹۴

وہ اپنے حجم اور صناعی کے اعتبار سے یونانیوں کے آلات سے بہتر تھے، اگرچہ ان کی نوعیت ایک تھی"

آلات رصد کی تیاری میں خلف المروروذی کا شاگرد رشید علی بن عیسیٰ الاصطرلابی تھا، غالباً پیرانہ سالی کی وجہ سے خود رصدگاہ کے قیام میں حصہ نہیں لے سکتا تھا، اس لیے اس نے اپنے شاگرد رشید (علی بن عیسیٰ الاصطرلابی) کی اس کام کے لیے سفارش کی تھی، مورخ الذکر نے محیط ارضی کی پیمائش میں بھی حصہ لیا تھا،

مشہور منجین | رصدگاہ مامونی کے متولیوں میں چار شخص مشہور ہیں: یحییٰ بن ابی منصور، خالد بن عبدالملک المروزی، سند بن علی اور عباس بن سعید الجوہری، ان میں سے ہر شخص نے ایک زیچ مرتب کی تھی، جو اس کے نام سے مشہور ہے قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے،

والذی تولی ذلک (الرصد) یحییٰ بن ابی منصور کبیر المنجمین فی عصرہ وخالد بن عبد الملک المروزی وسند بن علی والعباس بن سعید الجوہری ولِف کل واحد منھم فی ذلک زیجاً منسوباً الیہ موجوداً فی ایدی الناس الی الیوم"[1]

اسی طرح رصدگاہ بغداد (رصد مامونی) کے ان کارکنوں میں جنھوں نے آفتاب کے میل کلی کو دریافت کیا تھا، ابن یونس یحییٰ بن ابی منصور، سند بن علی اور الجوہر کا ذکر خاص طور سے کرتا ہے:-

وجدوا المیل ببغداد کج لج (۲۳ - ۳۳) وقد حضر ھذا الرصد جماعۃ منھم یحییٰ بن ابی منصور والعباس بن سعید الجوہری وسند بن علی وغیرھم"[2]

یحییٰ بن ابی منصور مرو کے ایک علمی خاندان کا فرد فرید تھا جس میں علم و فضل کا چرچا کئی پشت تک جاری رہا، ثعالبی نے یتیمۃ الدہر میں اس خاندان کے علماء فضلاء کے لیے ایک مستقل باب قائم کیا ہے، ابن خلکان لکھتا ہے،

وھم اھل بیت فیھم جماعۃ من الفضلاء | یہ ایک بڑا خاندان تھا جس میں فضلا اور ادباء

---

[1] طبقات الامم ص ۰۸ [2] زیچ ابن یونس

والادباء والشعراء وجالسوا الخلفاء وهم ونادموهم وقد ذكرهم الثعالبي في كتاب اليتيمة بابا مستقلا وذكر فيه جماعة منهم[1]

شعراء کی بڑی تعداد پیدا ہوئی تھی، وہ خلفاء کے جلیس و ندیم رہے تھے، چنانچہ ثعالبی نے یتیمۃ الدہر میں ایک مستقل باب اس خاندان کے فضلاء پر باندھا ہے۔

اس کا باپ ابی منصور مجوسی ہونے کے باوجود ابوجعفر منصور کے یہاں منجم تھا، خود یحییٰ مرو کے ہیئت دانوں میں نمایاں شخصیت رکھتا تھا، اور وہاں کی حرامی رصدگاہ کا متولی رہا تھا، جہاں اس کی سرکردگی میں انھوں نے آفتاب کے میل کلی کو دریافت کیا تھا، البیرونی "قانون مسعودی" میں لکھتا ہے:۔

"فرصد یحییٰ بن ابی منصور ..... وانقهار صد حکته المرو ا و نزه. یمکن ان یکون یحییٰ تولاه اذکان من هناك" (جلد اول ص ۳۶۳)

مرو میں عرصہ تک یحییٰ فضل بن سہل ذی الریاستین کا مقرب بارگاہ اور معتمد علیہ نجومی رہا، اس کی نکبت و زوال کے بعد مامون کا منجم خاص بن گیا، اور اس کی ترغیب سے اس کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہوا،[2] جب مامون نے بغداد میں رصدگاہ قائم کی تو یہ کام اس کے سپرد کیا، اسی لیے رصدگاہ مامونی کی کارگذاریاں اس کی طرف منسوب ہیں۔ بیہقی اس کے بارے میں لکھتا ہے: صاحب الرصد فی ایام المامون[3]۔ اسی طرح ابن القفطی لکھتا ہے:۔

یحییٰ بن ابی منصور المنجم المامونی رجل فاضل فی هذا الشان کبیر القدر اخذ الله مکین المکان نعل بالمامون امیر المومنین وتقدم عنده بصناعة النجوم وتسییر

یحییٰ بن ابی منصور عہد مامونی کا ہیئت داں تھا، وہ اس فن میں بڑا قابل اور مشہور و معروف تھا، صاحب عزت و وجاہت تھا، مامون الرشید کے یہاں باریاب ہوا، اور گردش کواکب کے حساب میں سرآمد فضلائے روزگار شمار کیا جاتا تھا، جب

---

[1] وفیات الاعیان جلد ثانی ص ۴۰۹ ترجمہ مروان ابن الحکیم

الکواکب ولما عزم المامون علی رصد	جب مامون الرشید نے رصد کواکب کا
الکواکب تقدم الی یحییٰ ھذا	ارادہ کیا تو اسی یحییٰ کو اس کام کا
(اخبار العلماء، ص ۲۳۴)	متولی بنایا۔

جس سال مامون الرشید طرطوس گیا تھا ([illegible]) یحییٰ بھی اس کے ہمراہ تھا، مگر حلب میں اس کی وفات ہو گئی، اور اپنی جلالت شان کی وجہ سے قریش کے قبرستان میں دفن ہوا[1]۔

یحییٰ بن ابی منصور کی تصانیف میں ابن الندیم نے "الزیج الممتحن" (جس کے دو نسخے تھے) کے علاوہ "مقالۃ فی عمل ارتفاع سدس ساعۃ لعرض مدینۃ السلام" اور ایک دوسری کتاب جو اس کے فلکیاتی مشاہدات پر مشتمل تھی بتایا ہے۔ ان کے علاوہ اس نے مختلف لوگوں کو فلکیاتی مشاہدات پر رسائل بھی لکھے تھے[2]۔

یحییٰ بن ابی منصور کی ہیئتی کارگزاریوں کا ذکر رصدگاہ مامونی کی دریافتوں کے سلسلے میں آگے آئے گا۔

خالد بن عبد الملک المروزی۔ یہ دمشق کی رصدگاہ مامونی کا جو جبل قاسیون پر قائم کی گئی تھی، متولی تھا[3]۔ اور اس نے [illegible] یزدجرد (مطابق [illegible]) میں سند بن علی کی نگرانی میں اعتدال خریفی کا وقت دریافت کیا تھا[4]، اسی طرح اس نے سند بن علی اور عباس بن سعید الجوہری کی معیت میں "قلب الاسد" ستارے کا طول و عرض بھی دریافت کیا تھا[5]، جو حسب روایت ابن یونس "برج اسد ۱۳۵ - ۴۲ - ۱۰" اور ۰ شمالی تھا[6]۔

البیرونی کا بیان ہے کہ خالد بن عبد الملک اس جماعت میں بھی تھا جس نے مامون الرشید کے حکم سے مضافات موصل کے صحرائے سنجار میں محیط ارضی کی پیمائش کی تھی[7]۔ خالد بن عبد الملک نے رصدگاہ دمشق میں [illegible] میں سند بن علی اور علی بن عیسیٰ الاصطرلابی کے ہمراہ میل کلی، تعدیل شمس، اوج آفتاب اور اسکی سالانہ حرکت بھی دریافت کی تھی[8]۔

عباس بن سعید الجوہری۔ یہ اپنے وقت میں منجمین بغداد کا رئیس و پیشوا تھا، جب سند بن علی ماہرین ہیئت کی تلاش میں نکلا تو اسے بتایا گیا کہ ان کا اجتماع عباس بن سعید الجوہری کے مکان پر ہوا کرتا ہے۔

---

[1] وفیات الاعیان جلد ثانی ص ۲۳۰ [2] الفہرست ص ۳۷۵ [3] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۱۲۸ [4] زیج ابن یونس
[5] ایضاً ص ۱۰۱ [6] تمہید مقالات الاماکن نیز کتاب التفہیم (فارسی) ص ۱۲۰ [7] زیج ابن یونس ص ۱۰۲

چنانچہ ابن الدایہ نے خود سند بن علی سے یہ روایت کی ہے کہ

وسألت هل للمهندسين وأهل الحساب موضع يجتمعون فيه؟ فقيل لي لهم مجلس في دار العباس بن سعيد الجوهري ترب المأمون يجتمع فيه وجوه العلماء بالهيئة والهندسة فحضرته فرأيت جميع من حضر مشائخ ولم يكن فيهم حدث غيري لأني كنت في العشرين سنة[1]

میں نے پوچھا کیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں مہندسین اور حساب داں جمع ہوتے ہوں تو مجھے بتایا گیا کہ ان کا اجتماع عباس بن سعید الجوہری کے مکان پر ہوتا ہے جس میں ہیئت وہندسہ کے مشاہیر فضلا شریک ہوتے ہیں، بس میں وہاں حاضر ہوا تو میں نے تمام حاضرین مجلس کو عمر رسیدہ اور بوڑھا پایا، ان میں میرے سوا کوئی نو عمر نہ تھا، کیونکہ اس وقت میں بیسویں برس میں تھا،

ابن الندیم نے بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے وقت کے "اصحاب ارصاد" (فلکیاتی مشاہدات کرنے والوں میں تھا)[2]

ابن القفطی لکھتا ہے:-

العباس بن سعيد الجوهري المنجم خبير بصناعة التسيير وحساب الفلك وعمل الآلات الارصادية ندبه المأمون الى مباشرة الرصد في جملة الجماعة المتولين لذلك بالشماسية

عباس بن سعید جوہری ہیئت داں تھا، اور کواکب کی سیر وگردش کے فن سے واقف، نیز فلکیات کے حساب میں ماہر، آلات رصدیہ کے بنانے میں کمال رکھتا تھا، مامون کا ملازم بارگاہ تھا، اس نے اسے دیگر ماہرین فن کے ساتھ شماسیہ بغداد کی رصد گاہ میں حصہ

---

۱ حسن العقبی لابن الدایہ ص ۲۰۰ ۲ الفہرست ص ۳۷۹

بعد اد و حقق مواضع بعض	یعنی پر مامور کیا تھا. چنانچہ اس نے (عباس بن
الکواکب السیارۃ والنیرین و	سعید الجوہری نے) وہاں کواکب سیارہ اور
عمل علی ذالک زیجاً مشہوراً	آفتاب و ماہتاب کے مواضع کی تحقیق کی اور اس
مذکوراً عند اھل ھذا الشان[۱]	سلسلے میں اپنی مشہور زیچ تیار کی جو اس
	فن کے ماہرین میں متداول ہے.

الجوہری ہیئت سے زیادہ ہندسہ میں کمال رکھتا تھا. اصول اقلیدس کی شرح و اصلاح کے علاوہ اس نے خطوط متوازی کے مصادرہ کا ثبوت بھی دیا تھا.

سند بن علی. یہ ان عباقرۂ روزگار میں سے تھا جنھوں نے کسی استاد کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیے ہوئے بغیر المجسطی کو خود سے حل کیا تھا، چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اصول اقلیدس سے فارغ ہونے کے بعد میں نے المجسطی پڑھنا چاہی اور اپنے باپ سے اس کی فرمائش کی مگر وہ ٹالتا رہا. ایک دن میں نے اس کا خچر بازار میں لیجا کر چپکے سے بیچ دیا. اور اس سے جو قیمت حاصل ہوئی اس میں سے بیس دینار میں کتاب المجسطی خرید کر اپنے کمرہ میں بند ہوگیا، جہاں میری ماں مجھے کھانا پانی پہنچا دیا کرتی تھی. پھر کہتا ہے

قال سند وا قمت ثلاث سنین	سند بن علی کہتا ہے کہ مجھے اس حجرے میں تین سال
کیوم واحد لا یری لی ابی صورۃ	ایک دن کی طرح گزارے. اس عرصہ میں میرے
و جہ وقد حلت اشکالاً مستصعبات	باپ نے میری صورت تک نہیں دیکھی. اور میں نے
و وضعتھا فی کمی[۲]	مجسطی کی بعض بڑی مشکل اشکال کو حل کیا.
	اور اسے اپنے آستین میں رکھ کر باہر نکلا،

اس کے بعد میں عباس بن سعید الجوہری کے پاس پہنچا، اس نے ان مشکل مسائل میں میرا امتحان لیا،

[۱] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۱۵۰، [۲] حسن التقاضی ص ۱۴۲

اور میرے جوابات سے مطمئن ہو کر اس نے پوچھا، تم نے کس سے پڑھا ہے، میں نے کہا، میں نے خود اپنی طبیعت سے انھیں حل کیا ہے۔ اور آستین سے وہ اوراق نکال کر دکھائے۔ انھیں دیکھکر اس کو شبہ ہوا کہ میں نے اس کی دریافتوں کا سرقہ کیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب المجسطی کا بستہ منگا کر دیکھا تو وہ اسی طرح سربمہر تھا۔ اس سے اس کو اطمینان ہو گیا۔ اور اس نے اپنی دریافتوں سے میرے حلوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا تو سوائے زبان کی خوبی کے نفس فنی مسائل میں کوئی فرق نہ پایا۔ یہ دیکھکر وہ مجھ سے اس قدر خوش ہوا کہ مجھکو نیا لباس پہنا کر مامون الرشید کے یہاں لے گیا اور اس کی خدمت میں باریاب کرایا۔[۱]

سند بن علی کے فضل و کمال کے بارے میں ابن القفطی لکھتا ہے:۔

منجم فاضل خبیر بتسییر النجوم	کواکب کی سیر و گردش کے علم اور آلات رصد
وعمل آلات الارصاد والاصطر (لاب)	اور اصطرلاب کی تیاری سے خوب واقف تھے،
.... ندبه المامون الی اصلاح	مامون الرشید نے اس کو آلات رصدیہ کی اصلاح
آلات الرصد وان یرصد بالشماسیہ	اور بغداد کی رصدگاہ شماسیہ میں مشاہدات
ببغداد ففعل ذالك وامتحن مواضع	فلکی کرنے کے واسطے بلایا، چنانچہ اس نے کام
الکواکب.... وجعله المامون	انجام دیا اور مواضع کواکب کی جانچ کی....
ممتحنا للارصاد لما تحقق بعلمها	اس کی حذاقت فنی پر اعتماد کی بنا پر مامون نے
ثقته بصره۔	پچھلے مشاہدات کی جانچ اور امتحان کے لیے
(اخبار العلماء ص ۱۳۰-۱۳۱)	اسے مقرر کیا۔

سند بن علی کی زیج ابن القفطی کے بقول بہت عمدہ تھی، وہ فن کے فضلاء میں متداول تھی، اس نے آفتاب کے میل کلی کا استدلال بھی صحیح کیا تھا، جو قول البیرونی کے حساب سے ۲۳ - ۳۳ - ۵۲ تھا۔ ۲۱۲ھ میں جدید

---

[۱] حوالہ القفطی ص ۱۳۰ [illegible] ص ۳۴۳

(مطابق [illegible]) میں اس نے خالد المروزی اور علی بن عیسیٰ الاصطرلابی کے ساتھ مل کر فصل ربیع اور فصل گرما کی مدت بھی دریافت کی تھی جو بالترتیب ۹۴ دن ۵۲ گھڑی ۳۰ دقیقہ اور ۹۳ دن ۹ گھڑی اور ۲۰ دقیقہ تھی[1]۔

اس عہد کے دوسرے ہیئت دانوں میں علی بن عیسیٰ الاصطرلابی، احمد بن بحتری اور حبش الحاسب زیادہ مشہور ہیں، پہلے دو محیط ارضی کی پیمائش میں شریک تھے، حبش الحاسب کا ذکر آگے آئے گا، لیکن ان سب سے زیادہ مشہور محمد بن موسیٰ الخوارزمی ہے، جو "الجبر والمقابلہ" کا موجد ہے، اس کے علاوہ اس مستقل ہیئتی نظام کا بانی ہے جو "السند ہند الصغیر" کے نام سے موسوم اور اسلامی ہیئت کی اصل ہے، قاضی صاعد اندلسی نے بہم سند انت کے ترجمہ کے بعد لکھا ہے:-

فکان اھل ذالک الزمان یعملون به (السند هند الکبیر) الی ایام الخلیفة (المامون) فاختصره له ابو جعفر بن موسیٰ الخوارزمی وعمل منه زیجه المشهور ببلاد الاسلام وعول فیه علی اوساط السند هند وخالفه فی التعادیل والمیل فجعل تعادیله علی مذاهب الفرس ومیل الشمس فیه علی مذاهب بطلیموس واخترع فیه من انواع التقریب ابوابا حسنة

اس زمانہ کے لوگ خلیفہ مامون الرشید کے عہد خلافت تک اسی (السند ہند الکبیر) کے مطابق عمل کرتے تھے، اس کے بعد ابو جعفر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے اسے مامون الرشید کے لیے مختصر کیا اور اپنی زیچ تیار کی جو عالم اسلام میں مشہور ہے، جہاں تک اوساط کواکب کا تعلق ہے اس نے اس میں "سدھانت" پر اعتماد کیا ہے، مگر تعدیل اور میل کلی کے باب میں اختلاف کیا ہے، اس نے اس کی "تعدیلات" تو ایرانیوں کے مذاہب (زیچ شہریار) کے مطابق رکھیں، اور میل کلی کے باب میں بطلیموس کا اتباع کیا، اس کے علاوہ

---

[1] مروج الذہب مسعودی جلد ثانی ص ۳۰۲ [2] طبقات الامم ص ۴۹-۵۰

ابن القفطی لکھتا ہے :-

فاستحسنه اهل ذالك الزمان من اصحاب السند هند وطاروا به في الآفاق وما زال نافعاً عند اهل العناية بالتعديل الى زماننا هذا[1]

اس زمانہ میں جو لوگ سدھانت کے رسمیتہ نظام کے پیرو تھے، انھوں نے اسے (خوارزمی کی زیچ کو) بہت زیادہ پسند کیا اور اقصائے عالم میں اس کو شہرت دی۔ عمل تعدیل کے ساتھ اعتنا کرنے والوں میں یہ زیچ ہمارے زمانہ تک مفید ثابت رہی ہے۔

الخوارزمی نے اپنی زیچ کے دو نسخے مرتب کیے تھے، (زیچ اول اور زیچ ثانی)۔ "زیچ خوارزمی" کی شہرت قبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بعد کے ہیئت دانوں نے اس کی شرحیں لکھیں، چنانچہ البیرونی نے العباس فرغانی کی "تعلیل زیچ خوارزمی" اور محمد بن عبدالعزیز الہاشمی کی "تعلیل لزیچ الخوارزمی" کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ اس نے اس کتاب کی شرح و تفسیر میں خود بھی تین کتابیں لکھی تھیں،

(۱) المسائل المفیدہ :- زیچ خوارزمی کے مسائل کے دلائل۔

(۲) ابطال البہتان بایراد البرہان :- ابو طلحہ نے زیچ خوارزمی پر جو اعتراضات کیے تھے، ان کا جواب۔

(۳) ابو الحسن الاہوازی نے خوارزمی پر جو اعتراضات کیے تھے، ان پر محاکمہ۔

"زیچ خوارزمی" مشرق کے علاوہ مغرب میں بھی مقبول ہوئی، اور ایڈی لارڈ آف باتھ نے اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔

زیچ کے علاوہ خوارزمی نے اور کتابیں بھی تصنیف کی تھیں، جیسے کتاب الاصطرلاب، کتاب الرخامہ، "الجبر والمقابلہ" کے علاوہ جس کا ذکر ہو چکا ہے، اس نے جغرافیہ پر بھی ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام "صورۃ الارض" تھا۔

---

[1] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص [illegible]

غالباً اسی کا دوسرا نام "رسم الربع المعمور" تھا، ایک مختصر رسالہ یہودیوں کے تیوہاروں کا وقت دریافت کرنے پر لکھا تھا، جسے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے "رسالہ فی استخراج تاریخ الیہود" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

علم الانواء عربوں کے دیسی نجوم "علم الانواء" کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے، مگر اسلام کی توحید میں ستارہ پرستانہ انداز فکر کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی نیز دوسری اقوام (ہندی و یونانی) کے ہیئتی حسابات کے داخلہ کے بعد جو اس سے کہیں زیادہ منظم اور سائنٹفک تھے، اس کی افادیت بھی گھٹتے گھٹتے بمنزلہ صفر رہ گئی تھی، اس لیے علم الانواء اب ایک ایجابی علم و فن کے بجائے محض عہد ماضی (عرب جاہلیۃ) کی ایک یادگار بن کر رہ گیا تھا، اور اس حیثیت سے ادبائے وقت کی لسانیاتی تحقیقات کا ایک موضوع تھا۔

اس موضوع پر لکھنے والوں میں سے جن کا تذکرہ تاریخ نے محفوظ رکھا ہے، قدیم ترین مؤرخ السدوسی (المتوفی ۱۹۵ھ) نضر بن شمیل (المتوفی ۲۰۳ھ) قطرب النحوی (المتوفی ۲۰۶ھ) ہیں جو قبل مامونی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

زیر نظر دور میں بھی "علم الانواء" پر متعدد کتابیں لکھی گئیں مگر عہد سابق کی طرح ان کی نوعیت بھی ادبی تھی فنی نہ تھی، اور ان کے لکھنے والے بھی طبقۂ ادباء سے تعلق رکھتے تھے، مشاہیر انواء نویسوں میں ابن الندیم نے ابن کناسہ (المتوفی ۲۰۷ھ) الاصمعی (المتوفی ۲۱۳ھ) اور ابن الاعرابی (المتوفی ۲۳۱ھ) کے نام لکھے ہیں۔ (باقی)

ابوحیان توحیدی

از جناب مولوی شاہ محمد شبیر عطا صاحب ندوی

ابوحیان توحیدی تاریخ اسلام کا ایک نامور دانشور تھا، یاقوت حموی لکھتا ہے :-

شیخ الصوفیۃ وفیلسوف الادباء
وادیب الفلاسفۃ ومحقق اہل
الکلام ومتکلم المحققین وامام
البلغاء فرد الدنیا الذی لا
نظیر لہ ذکاء وفطنۃ وفصاحۃ
ومکانۃ ...... [۱]

بزم صوفیہ کا صدر نشین، طبقۂ ادباء کا فلسفی
اور گروہ فلاسفہ کا ادیب، فرقۂ معتزلہ کا دانشور
اور نکتہ رسوں کا گل سرسبد، اہل زبان کا پیشوا،
یگانۂ روزگار جس کی ذہانت اور فطانت،
زبان دانی اور قادر الکلامی میں کسی کو
کلام نہیں ......

وطن | ابوحیان توحیدی کے وطن کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں، یاقوت کا خیال ہے کہ وہ شیراز کا رہنے والا تھا، طاش کبریٰ زادہ بھی اسے شیرازی سمجھتا ہے، اور امام ابن حجر عسقلانی کی بھی یہی رائے ہے، لیکن خود انصاری کا بیان ہے کہ وہ نیشاپور یا واسط کا باشندہ تھا، امام ذہبی اسے فارس کے نواح کا بتلاتے ہیں [۲] لیکن یاقوت چونکہ سب سے پہلا مورخ ہے جس نے ابوحیان توحیدی کا پر لکھا ہے اس لیے اسی کا بیان قابل ترجیح ہے۔

---

[۱] معجم الادباء ج ۵ ص ، [۲] ایضاً ص ۵ ، مفتاح السعادہ ج ۱ ص ۲۰۸ ، لسان المیزان ج ۶ ص ۳۶۹
روضات الجنات ج ۸ ص ۲۰۵ ، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۵۵

سنہ ولادت | ابوحیان توحیدی ۳۱۰ھ میں پیدا ہوا، اس کے دو ثبوت ہیں:۔

سنہ ۴۰۰ھ میں ابوحیان توحیدی نے قاضی ابوسہل محمد کو ایک خط لکھا ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ اس کی عمر اب نوّے سال ہے۔[1]

کتاب المقابسات کا سنہ تالیف ۳۶۰ھ ہے، اس وقت ابوحیان توحیدی کی عمر پچاس سال ضرور رہی ہوگی، کیونکہ وہ خود اپنے بارہ میں لکھ رہا ہے: "وما یرجو المرء بعد الالتفات الی خمسین حجة وقد اضاع اکثرها وقصر فی باقیها"۔[2]

اساتذہ | ابوحیان کی تعلیمی زندگی کا آغاز بغداد میں ہوا، اس نے اپنے دور کے جن نامور فضلاء اور اصحاب کمال سے اکتساب علم کیا، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

ابوسعید سیرافی۔ سیرافی ایک وسیع النظر عالم تھا، وہ بیک وقت فلسفی، ادیب، فقیہ، صوفی اور متکلم کہے جانے کا مستحق ہے، اس کے علم کی شہرت سارے عالم اسلام میں تھی، اس کے اکثر فرمانروا اپنے خطوط میں اسے بڑے ادب سے یاد کرتے تھے، یاقوت حموی اس کے بارے میں لکھتا ہے:

افتی فی جامع الرصافة خمسین	وہ پچاس سال جامع رصافۂ بغداد
سنة علی مذهب ابی حنیفة	کی مسند افتاء پر فائز رہا لیکن اس طویل
فما وجد له خطأ ولا عثر له	عرصہ میں اس کا کوئی فتویٰ مسترد
علی زلة[3]	نہیں ہوا۔

نحو کا وہ سب سے بڑا ماہر تھا، اسی نے سیبویہ کی الکتاب کی شرح لکھی ہے، اس شرح میں نحو کے دقیق مسائل بڑے دلنشین انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔[4] سیرافی زہد و تقویٰ میں بھی یگانۂ روزگار تھا، اس کے محبوب شاگرد ابوحیان کا بیان ہے:۔

---

[1] معجم الادباء، ج ۱۵ ص ۲۰ [2] المقابسات ص ۱۳ [3] معجم الادباء، ج ۸ ص ۱۵۰ [4] بغیۃ الوعاۃ ص ۲۲۲

کان عابداً خاشعاً له دأب	وہ بڑا عابد و زاہد تھا، اس کا دن قرآن
بالنهار من القرأة والخشوع	کی تلاوت اور خشوع میں گذرتا اور رات
ووسد بالليل من القيام	نمازوں اور خضوع میں بسر ہوتی تھی، چالیس سال
والخضوع صام اربعين سنة	مسلسل روزے رکھے،
الدهر كله[1]	

ابوسعید مدائنی کا بیان ہے: "سیرانی کی محفل میں جب حشر و نشر کا تذکرہ ہوتا تو میں نے دیکھا ہے کہ اس پر ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ روتے روتے صبح کر دیتا[2]۔ سیرانی معتزلہ کا امام بھی تھا[3]، ابوحیان توحیدی نے فلسفہ اور تصوف کے رموز سیرانی ہی سے سیکھے تھے، وہ اپنے استاد کو روے زمین کا سب سے بڑا عالم بتاتا ہے[4]، سیرانی کا انتقال ۳۶۷ھ میں ہوا۔

(۲) **علی بن عیسیٰ الرمانی** ۔ ابوحیان توحیدی کی شخصیت کی تعمیر میں الرمانی کا بڑا حصہ ہے، الرمانی معتزلی طریق فکر کا سب سے بڑا نمایندہ تھا، اسی لیے توحیدی نے خاص طور سے اس سے علم کلام پڑھا تھا، علم کلام کے ساتھ ساتھ عربیت میں بھی وہ فرد تھا، ابن خلکان کا بیان ہے: جمع بین علم الکلام والعربیة[5]"

اس کو دوسرے علوم و فنون میں بھی پوری دست رس حاصل تھی، نحو اور منطق سے خاص شغف تھا، وہ اکثر نحوی مسائل استقرائی طریقہ سے حل کیا کرتا تھا، امام سیوطی لکھتے ہیں "کان یمزج النحو بالمنطق[6]" لیکن نحو میں منطق کی آمیزش سے مسائل اسقدر پیچیدہ ہو جاتے کہ ابوعلی فارسی جیسے

---

[1] معجم الادباء ج ۸ ص ۲۲۷، [2] ایضاً ص ۲۲۳، [3] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۳۰، [4] المقابسات ص ۲۳ [5] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۳۰، [6] بغیة الوعاة ص ۲۲۲،

امام فن سے بھی حل ہو سکتے تھے، چنانچہ وہ اکثر کہا کرتا تھا:۔

ان کان النحو ما یقول الرمانی	اگر نحو وہی ہے جو رمانی کہتے ہیں تو ہم اس سے
فلیس معنا منہ شیٔ وان کان	بالکل ناواقف ہیں، اور اگر نحو وہ ہے جس کو
النحو ما نقولہ فلیس معہ منہ شیٔ[1]	ہم کہتے ہیں تو رمانی اس سے ناواقف ہے،

بہرحال نحو میں الرمانی کا مرتبہ ابو علی فارسی اور ابوسعید سیرافی سے کم نہیں ہے، خود یاقوت کو اس کا اعتراف ہے[2] الرمانی کس پایہ کا عالم تھا، اس کو ابن خلکان کی زبان سے سنیے، وہ لکھتا ہے:۔

لم یر قط مثلہ علما بالنحو وغزارۃ	ایسا عالم بغداد کی سرزمین پھر نہ پیدا کر سکی
فی الکلام وبصرا بالمقالات	جو بیک وقت فن نحو کا امام بھی تھا علم کلام
وایضاحا للمشکل مع تالہ و	پر اسے عبور بھی تھا، مخالفین اسلام کی کتابوں
تنزہ ودین ویقین وفصاحۃ	پر بھی اس کی نظر تھی، جو دقیق علمی مسئلوں کو حل
وفقاھۃ وعفافۃ ونظافۃ[3]	کرنے پر غیر معمولی قدرت رکھتا تھا، اسی کے ساتھ
	دینی بصیرت، عقیدہ کی پختگی اور فقہی تبحر اور

عفت و پاکبازی میں بھی ممتاز تھا،

اس نے ۳۸۴ھ میں انتقال کیا،

(۳) **قاضی ابو حامد المروروزی**۔ ابو حامد مروروزی کا شمار چوتھی صدی کے مشاہیر فقہاء میں ہے، ابن خلکان ان کے فقہی تبحر کے بارے میں لکھتے ہیں: "لا یشق غبارہ فیہ[4]"،

ابوحیان توحیدی قاضی صاحب کا مایۂ ناز شاگرد تھا، اس کی کتاب "البصائر والذخائر" زیادہ تر قاضی صاحب ہی کے افادات پر مشتمل ہے، وہ اپنے استاذ کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے:

انہ انبل من شاھدتہ فی عمری	میں اپنی زندگی میں اس سے زیادہ وضع دار

---

[1] معجم الادباء ج ۱۴ ص ۵ ، [2] ایضاً ص ۷ ، [3] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۱۸ [4] ایضاً

وکان بحرا یتدفق حفظا للسیر	اور شریف آدمی نہیں دیکھا، وہ علم کا ایک
وقیاما بالاخبار واستنباطا	مواج دریا تھا، سیر اور تاریخ کا ماہر اور
للمعانی	معانی آفرینی میں کامل تھا،

۳۶۲ھ میں المروروزی کا انتقال ہوا،

(۴) **ابوبکر محمد بن علی القفال الشاشی**۔ چوتھی صدی کے شافعی فقہا میں قفال امتیازی حیثیت کے مالک ہیں، ابوحیان توحیدی نے فقہ شافعی کا درس انہی سے لیا تھا، نواب صدیق حسن خاں قفال کے بارے میں لکھتے ہیں: کان فقیھا محدثاً اصولیاً لغویاً شاعراً[1]، ۳۶۵ھ میں ان کا انتقال ہوا،

(۵) **قاضی ابوالفرج معافی بن زکریا النہروانی**۔ امام ابن جریر طبری کے مسلک کے سب سے بڑے علم بردار اور اس کے شارح تھے، ان سے ان کو والہانہ تعلق تھا، اسی لیے علما ان کو جریری کے لقب سے یاد کرتے ہیں، ابوحیان توحیدی نے آپ سے بھی استفادہ کیا تھا، جریری وسیع النظر عالم تھے، ابن خلکان لکھتے ہیں" لہ الستة بسائر العلوم[2]"۔ حافظہ غضب کا پایا تھا، لوگ انھیں زندہ کتب خانہ کہا کرتے تھے[3]۔ ۳۹۰ھ میں ان کا انتقال ہوا،

(۶) **ابوزکریا یحییٰ بن عدی**۔ چوتھی صدی کا مشہور عیسائی فلسفی ہے، وہ فلسفہ میں فارابی اور متی بن یونس کا شاگرد تھا، منطق میں بھی اس کو غیر معمولی کمال حاصل تھا، قفطی کا بیان ہے "انتھت الیہ ریاستہ اھل المنطق فی زمانہ[4]" اس کا وقت زیادہ تر ارسطو کی کتابوں کے ترجمہ میں صرف ہوتا تھا، (جسے وہ سریانی سے عربی میں منتقل کرتا تھا) اپنے نامور استاد فارابی کی اکثر کتابوں کی تلخیص بھی اسی نے کی تھی، ابوحیان توحیدی اکثر و بیشتر اسی سے فلسفہ کے دقیق مسائل حل کرتا تھا، ۳۶۴ھ میں اس نے انتقال کیا،

---

[1] ابجد العلوم ج ۳ ص ۹۰۰ [2] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۰۰ [3] الفہرست ص ۳۲۹ [4] تاریخ الحکماء ص ۳۶۱

(۷) **ابو سلیمان محمد بن طاہر بن بہرام المنطقی السجستانی** } ابو حیان توحیدی کے اساتذہ میں ابوسعید سیرافی کے بعد سجستانی کی شخصیت سب سے نمایاں[۴]

اس نے ابو بشر متی بن یونس اور یحییٰ بن عدی جیسے اساتذۂ فن سے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی تھی صوان الحکمۃ اس کی مشہور تصنیف ہے، اس مجلس میں عوام کا گذر مشکل سے ہو پاتا تھا، بغداد کے بڑے بڑے امراء اور شاہزادے اس کے سامنے زانوے ادب تہ کرتے تھے، یا صرف وہ طلبہ باریاب ہوتے جو واقعی فلسفہ کے دلدادہ ہوتے، ابو حیان توحیدی کا شمار بھی انہی طلبہ میں تھا، سجستانی کو ادب اور شاعری سے بھی دلچسپی تھی،[۵] ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ سجستانی کا گھر بغداد کی سب سے بڑی اکیڈمی کہلے جانے کا مستحق تھا،[۶] ابو حیان توحیدی نے اپنی مشہور کتاب المقابسات میں سجستانی کے ملفوظات کا معتدبہ حصہ جمع کر دیا ہے، سجستانی کی جانشینی کا شرف بھی ابو حیان توحیدی کو حاصل ہے، ابو حیان توحیدی کا محسن اور صمصام الدولہ کا وزیر اعظم ابن سعدان بھی ابو حیان توحیدی ہی کو سجستانی کا جانشین تسلیم کرتا ہے، ۳۹۱ھ میں سجستانی نے وفات پائی۔

(۸) **ابو الحسن محمد بن احمد بن اسمٰعیل بن سمعون** ۔ابن سمعون بہت بڑے عالم تھے، ابن خلکان کا بیان ہے "کان وحید عصرہ فی الکلام علی الخواطر وحسن الوعظ وحلاوۃ الاشارۃ ولطف العبارۃ[۳]" امام ابن جوزی نے انھیں الناطق بالحکمۃ کے لقب سے یاد کیا ہے[۴]، ابو حیان توحیدی نے ان سے بھی استفادہ کیا تھا، ان کا انتقال ۳۸۷ھ میں ہوا،

مندرجۂ بالا اساتذہ کے علاوہ بعض اور علماء سے بھی ابو حیان نے تعلیم حاصل کی تھی، مثلاً ابو محمد جعفر الخلدی جن کے بارے میں ابن ندیم نے لکھا ہے " وہ صوفیاء کے پیشوا اور زہد و تقویٰ میں فرد تھے۔"

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ابو حیان توحیدی نے تصنیف و تالیف کو اپنا مشغلہ قرار دیا۔

---

[۱] تاریخ الحکماء ص ۲۸۲ [۲] تاریخ الاطباء ج ۱ ص ۳۲۱ [۳] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۶۰۹ [۴] المنتظم ج ۷ ص ۱۹۸

ابوحیان مہلبی کے دربار میں بنی بویہ کے وزراء میں مہلبی بڑا اہل علم دوست وزیر تھا، اس کی کنیت ابو محمد اور حسن نام تھا، مشہور اموی جنرل مہلب بن ابی صفرہ کی نسل میں ہونے کی وجہ سے مہلبی کے نام سے مشہور ہوا، ۲۹۱ھ میں پیدا ہوا اور ۳۵۲ھ میں وفات پائی،[1] مہلبی نے ادب کا بڑا استھرا مذاق پایا تھا، فارسی پر بھی عبور تھا، ابن مسکویہ کا بیان ہے کان یفعو بالفارسیۃ،[2] یاقوت حمابی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مہلبی کے دربار میں ادباء و شعراء کی بڑی قدر تھی، اس نے اپنی وزارت کے چند سالہ دور میں برامکہ کی یاد تازہ کر دی تھی،[3] انتظامی قابلیت بھی اس میں اعلیٰ درجہ کی تھی، اس کا عہد وزارت یادگار شمار کیا جاتا ہے، ابن مسکویہ کو بھی اس کا اعتراف ہے،[4] لیکن مہلبی کی قدردانی صرف ادباء و شعراء تک محدود تھی، فلاسفہ اور متکلمین سے اس کو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، مزاج میں تعصب بھی تھا، چنانچہ اکثر و بیشتر عباسی امراء کو سخت سزائیں دیں، وہ اپنے آقا معز الدولہ سے زیادہ شیعیت نوازی میں بدنام تھا،[5]

ابوحیان توحیدی کی تصنیفات بہت جلد علمی دنیا میں پھیل گئیں اور اس کا شمار عرب کے بلند پایہ ادیبوں میں ہونے لگا، ابوحیان کو توقع تھی کہ مہلبی کے دربار میں اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا، لیکن علم و ادب کی یہ بدقسمتی تھی کہ اس کی یہ امید پوری نہ ہوئی، اور مہلبی کے دربار میں اسکی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی، مہلبی اگرچہ ابوحیان کے مرتبہ سے خوب واقف تھا، لیکن محض تعصب کی بنا پر ابوحیان توحیدی کو فوراً بغداد چھوڑ دینے کا حکم دیا، امام شمس الدین ذہبی اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ابوحیان توحیدی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ "ملحد" اور "زندیق" ہے، اس لیے مسلم معاشرہ میں اس کا وجود مضر تھا،[6] لیکن امام صاحب کی یہ توجیہ محل نظر ہے، اصل وجہ یہ تھی کہ ابوحیان توحیدی شیعیت کا مخالف اور مہلبی اپنی شیعیت نوازی میں بدنام تھا،[7]

ابوحیان توحیدی ابوالعمید کے حضور میں مہلبی سے مایوس ہو کر ابوحیان نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی، اور ایک

---

۱ تجارب الامم ج ۲ ص ۱۳۰، ۲ معجم الادباء ج ۹ ص ۱۳۳، ۳ تجارب الامم ج ۲ ص ۱۹۸، ۴ ایضاً ص ۱۳۲، ۵ شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۲۲، ۶ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۰۵، ۷ دیکھئے الامتاع والمؤانسۃ

طویل عرصہ تک گمنامی کی زندگی بسر کرتا رہا، اس زمانہ میں وزیر ابن العمید کا طوطی بول رہا تھا، اور عجم کی سرزمین کو اس پر ناز تھا، وہ عربی کا اتنا بڑا اور صاحب طرز ادیب تھا کہ اس کا اسلوب نگارش دو سو سال تک باقی رہا، فلسفہ کا بھی وہ قدر دان تھا، علم کلام سے بھی اسے دلچسپی تھی، عقیدۃً مذہب اعتزال کا پیرو تھا، فنون لطیفہ، مصوری اور موسیقی کا بھی دلدادہ تھا، اس لیے اس کا دربار اہل کمال سے معمور تھا، کتابوں سے اسے عشق تھا، مشہور مورخ اور فلسفی ابن مسکویہ اس کے عظیم الشان کتبخانہ کا ناظم تھا، وہ اس کے حالات میں لکھتا ہے:-

اوتی من الفضائل والمحاسن	اس میں اتنے فضائل و محاسن جمع تھے کہ
ما بہر بہ اھل زمانہ[1]	ان کو دیکھکر اس کے اہل زمانہ متحیر تھے۔

عجمی شان و شوکت کا جو سماں اس کے دربار میں نظر آتا تھا، اس کی نظیر نہیں ملتی، ایرانی تہذیب کا وہ بہت بڑا نمایندہ تھا[2]، اس کی ہیبت اور دبدبہ کا یہ حال تھا کہ جس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا اس پر لرزہ طاری ہوجاتا[3]،

ابوحیان توحیدی سفر کے دشوار گذار مراحل طے کرتا ہوا ابن العمید کے پایۂ تخت رے پہنچا اور دربار تک رسائی حاصل کی، اگرچہ اس کے جسم پر قلندرانہ لباس تھا، مگر مزاج میں علم کی تمکنت تھی خود داری کا اس کو بڑا خیال تھا، ابن العمید جیسے وزیر اعظم کو اس کی کہاں برداشت، اس نے ابوحیان کو دیکھتے ہی غرور سے اپنے کندھے جھٹکے[4]، اور بڑی حقارت سے پیش آیا، اور ابوحیان کو بے نیل مرام واپس آنا پڑا، خود ابوحیان توحیدی نے اپنے دوست ابن سعدان سے اس ملاقات کا واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ مجھ پر ابن العمید نے یہ ریمارک کیا تھا:-

لا ھیئۃ فی لقاء الکبراء	اس کو امراء سے ملاقات کا سلیقہ اور وزراء
ومحاورۃ الوزراء[5]	سے ملنے کے آداب نہیں معلوم

---

۱ تجارب الامم ج ۲ ص ۲۷۵ ۲ الامتاع والموانسہ ج ۱ ص ۵ ۳ تجارب الامم ج ۲ ص ۲۷۵ ۴ معجم الادبا ج ۱۵ ص ۵
۵ الامتاع ج ۱ ص ۶

ابوحیان توحیدی صاحب ابن عباد کے در دولت پر

اسلام کی تاریخ میں جن وزراء کے کارنامے آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں، ان میں برامکہ کے بعد صاحب ابن عباد اور نظام الملک طوسی کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں، برامکہ اور نظام الملک کا انجام سب کو معلوم ہے، لیکن صاحب ابن عباد کے دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ مرنے کے بعد بھی وہ اپنے مخدوم سے اپنی تعظیم کرا گیا، ابن خلکان کا بیان ہے،

رأيت في اخباره انه لم يسعد	عام طور سے انسان کی اقبال مندی اسکی
احد بعد وفاته كما كان في	موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے، لیکن صاحب بن عباد
حياته غير الصاحب فانه	کی عظمت اور اقبال مندی اس کی موت کے
لما توفي اغلقت له مدينة	بعد بھی قائم رہی، اس کے انتقال کی خبر
الري واجتمع الناس على باب	ملتے ہی پایہ تخت کے بازار بند ہو گئے، لوگوں
قصره ينتظرون خروج جنازته	کا مجمع اس کے محل کے پھاٹک پر جنازے
وحضر مخدومه فخر الدولة	کے انتظار میں جمع ہو گیا، خود بادشاہ وقت
والقواد وقد غيروا	اور ممتاز فوجی افسران ماتمی لباس میں
لباسهم فلما خرج من الباب	محل کے باہر جنازہ کے منتظر تھے، جیسے ہی
صاح الناس باجمعهم صيحة	جنازہ محل سے نکلا تو سارے مجمع میں نالہ و ماتم
واحدة وقبلوا الارض و	کا ایک شور بلند ہوا، جنازے کے احترام
خرقوا عنده الثيابهم	میں لوگ زمین بوس ہو گئے، سوگواروں نے
ولطموا وجوههم وبلغوا في	شدت غم میں کپڑے تار تار کر ڈالے، گریہ
البكاء والنحيب عليه جهدهم	و زاری کا شور انتہا کو پہنچ گیا، فخر الدولہ

ومشی نحو الله ولله امام الجنازة	جنازہ کے جلوس میں آگے آگے تھا، اور
مع الناس وقعد للعزاء ایاماً	کئی دن تک سوگ منایا،

صاحب بن عباد ابتدا میں ابن العمید کے کاتب کی حیثیت سے منظر عام پر آیا، پھر ترقی کرکے مؤید الدولہ کا وزیر اعظم بن گیا، اور مؤید الدولہ کے انتقال کے بعد جب فخر الدولہ اس کا جانشین ہوا تو صاحب ابن عباد اس کی سلطنت کے سیاہ و سپید کا مالک بن گیا، اسی نے معتزلہ کے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ قائم کیا، اور حکومت کے سارے وسائل اعتزال کی نشأت ثانیہ کے لیے استعمال کیے، یاقوت نے صاحب بن عباد کے بارے میں لکھا ہے،

ان اکابر القواد کانوا یحضرون	اعلیٰ فوجی افسران صاحب بن عباد کے
باب دارہ فیقعفون علی دوا بھم	در دولت پر حاضری دیتے تو اس کے رعب سے
مطرقین لا ینکلم واحد منھم	اتنی جرأت نہیں تھی کہ آپس میں گفتگو کر سکیں،
ھیبۃ واعظاما لموضعہ الی	اپنی سواریوں پر نظریں جھکائے کھڑے
ان یخرج احد خلفاء حجابہ	رہتے تھے جب محل سے صاحب کا حاجب
فیأذن لبعض اکابرھم د	برآمد ہوتا اور جس افسر کی قسمت یاوری
یصرفھم فکان من یوذن لہ	کرتی اسے محل میں باریاب ہونے کی اجازت
فی الدخول یظن انہ قد بلغ	مل جاتی، اور وہ سمجھتا کہ اس کی ساری امیدیں
الآمال ونال الفوز بالدنیا	پوری ہوگئیں اور اس کو دنیا و آخرت
والآخرۃ [۲]	کی دولت مل گئی۔

صاحب ابن عباد کے دربار میں جس قدر اہل کمال جمع ہوئے شاید ہی کسی دربار میں جمع ہوئے ہوں [۳]

---

۱ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۵۵، [۲] معجم الادبا ۵ ص ۲۸۴، [۳] صاحب پر میرا ایک مستقل مقالہ ہے اس لیے تفصیلات نہیں دے رہا ہوں،

ابوحیان توحیدی اگرچہ ادبار اور وزیروں کی بے توجہی کا مزا چکھ چکا تھا، مگر صاحب ابن عباد کے اوصاف و محاسن سنکر اسے ایک گونہ عقیدت پیدا ہوگئی، اور وہ ایک بار پھر رے جانے کی تیاریاں کرنے لگا، اب اس کا عہد پیری شروع ہوچکا تھا، قویٰ مضمحل ہوگئے تھے، لیکن جوانی کی امنگ ابھی باقی تھی،[1] چنانچہ وہ کشاں کشاں رے پہنچا، لیکن صاحب ابن عباد کی نگاہ میں نہ جچا، اس لیے یہاں بھی اس کی پذیرائی نہ ہوئی، اس ناکامی کی ایک لمبی داستان ہے،[2]

ابن حیان توحیدی ابن سعدان کے دامن میں

رے سے واپس آکر ابوحیان توحیدی نے بغداد میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، گو صاحب ابن عباد کی سرد مہری سے وہ دل شکستہ ہوچکا تھا، لیکن اسی زمانہ میں اس کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوگئی جس نے اسے زندہ رہنے کی ترغیب دی اور اسکی دلجوئی کا کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا، یہ فرشتۂ رحمت ابوالوفاء المہندس تھا، وہ ریاضیات کا ماہر تھا، قفطی نے اس کے بارے میں لکھا ہے: بلغ المحل الاعلیٰ فی الریاضیات[3]

ابن خلکان کا بیان ہے:-

کان احد المشاھیر فی الھندسۃ والحسابیات ولہ فیہ استخراجات غریبۃ لم یسبق الیھا[4]	ریاضی اور ہندسہ کا ماہر تھا، اس کا شمار اس فن کے ممتاز لوگوں میں ہوتا ہے، اس کے بعض استخراجات بالکل اچھوتے ہیں۔

ابن ندیم کہتا ہے:-

ولہ عدۃ کتب فی العددیات والحسابیات والفلک	علم الاعداد حساب اور ہیئت میں اسکی تصانیف ہیں[5]

ابوالوفاء سے ابوحیان توحیدی کی پہلی ملاقات ارجان کے سفر میں ہوچکی تھی، اسی زمانہ سے

---

[1] معجم الادباء ج ۵ ص ۳۸۰ [2] الامتاع ج ۱ ص [illegible] [3] تاریخ الحکماء ص ۲۸۷ [4] وفیات الاعیان ج ۲ ص [illegible]
[5] الفہرست ص ۳۹۴ [illegible] ابوالوفاء کی تصانیف میں اسکی زیج الشامل کے نام سے مشہور ہے، کتب خانہ [illegible] میں موجود ہے

ن میں مراسم ہو گئے تھے۔ دوسری ملاقات میں ابوالوفا نے محسوس کیا کہ ابوحیان توحیدی کچھ بجھا بجھا ہے، جب اس کو معلوم ہوا کہ وہ الصاحب ابن عباد کی بے مہری کا شکار ہو چکا ہے، تو اس نے اسے دی اور ہر ممکن طریقہ سے اس کی امداد کا وعدہ کیا، بغداد کا عظیم شفاخانہ البیمارستان العضدی زمانہ میں انتہائی رونق پر تھا، ابوالوفا نے ابوحیان توحیدی کو اس میں ایک اچھا سا عہدہ دلوا دیا۔

صمصام الدولہ کے وزیر ابن سعدان سے ابوالوفا کے بڑے مراسم تھے، ایک دن کسی تقریب سے اس نے حیان کو بھی اس کے دربار میں باریاب کرا دیا، ابن سعدان کے دربار میں فلاسفہ کا بڑا عروج تھا، ابن سعدان کو اپنے درباری علما پر فخر تھا، وہ کہتا تھا:

واللہ ما لھذہ الجماعۃ بالعراق	خدا کی قسم مملکت عراق میں اس جماعت
شکل ولا نظیر وانھم لاعیان	کی نظیر نہیں، یہ اہل فضل کے اعیان اور
اھل الفضل وسادۃ ذوی العقل[1]	دانشوروں کے سردار ہیں،

ابن سعدان نے ابوحیان توحیدی کی بھی قدر دانی کی اور اس کو اس کی توقع سے زیادہ نوازا، ابوحیان توحیدی بھی ابن سعدان کا ہمیشہ مداح رہا، یہ ابوحیان کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو ابن سعدان جیسا قدر دان اور ہم مشرب دوست مل گیا، اس کی زندگی کا سب سے بہتر دور یہی تھا، اسی زمانہ میں ابوحیان توحیدی نے شہرۂ آفاق کتاب الامتاع والموانسہ مرتب کی جسے اس نے ابوالوفا کے نام معنون کیا ہے، وفا کی دوستی کا صلہ وہ اس سے بہتر کیا دے سکتا تھا؟

ابوحیان توحیدی کی وفات | حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابوحیان توحیدی کی وفات کا تذکرہ لسان المیزان میں کیا ہے، اس کی وفات کا یہ واقعہ بھی عجیب ہے، ابوسعید المطرز، فارس بن بکران شیرازی کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ

---

[1] الصداقۃ والصدیق ص ۳۰ [2] الامتاع ج ۳ ص ۲۲۳

ما احتضر ابو حیان کان بین یدیه جماعة فقال اذکروا الله فان هذا مقام خوف وکل یسعی لهذا الساعة وجعلوا یذکرونه ویعظونه فرفع رأسه الیهم وقال کانی اقدم علی جندی او شرطی؟ انما اقدم علی رب غفور وقضی۔[1]

ابو حیان پر جب سکرات کا عالم طاری ہوا تو حاضرین نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا کہ اللہ کا ذکر کرو، کیونکہ یہ وقت خدا سے ڈرنے کا ہے، یہی وہ گھڑی ہے جس کے لیے انسان تیاری کرتا ہے، اور ابو حیان کے سامنے ذکر اور تلقین کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر اس نے سر اٹھا کر ان لوگوں کی طرف دیکھا اور کہا معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی فوجی یا پولیس کے آدمی کے پاس جا رہا ہوں، میں رب غفور کے حضور میں جا رہا ہوں،

سنہ وفات اور مدفن | ابو حیان توحیدی کا انتقال ۴۱۴ھ میں ہوا، آخر عمر میں وہ شیراز چلا گیا تھا، وہیں اس کا مدفن بھی ہے، شیراز کے مشہور مورخ معین الدین ابو القاسم جنید العمری کا بیان اس بارے میں حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ہزار مزار (شد الازار) میں ابو حیان کا سال وفات ۴۱۴ھ لکھا ہے۔[2]

ہزار مزار میں ابو حیان توحیدی کی وفات کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:-

کان بین ابی حیان وبین فیخ الشیوخ ابی الحسین[3] شیء فلما مات ابو حیان

ابو حیان توحیدی اور شیخ المشائخ ابو الحسین کے درمیان کچھ اختلاف تھا، ابو حیان توحیدی

---

[1] لسان المیزان ج ۷ ص ۳۹ — [2] ہزار مزار میں شیراز کے ان مشاہیر کے حالات درج ہیں جو مزارات شیراز میں [illegible] اس کا ایک حصہ ۱۹۱۹ء میں لندن سے ڈینی سن راس نے شائع کیا ہے۔ [3] ان کا پورا نام ابو الحسن احمد الصوفی [illegible] ابن سالبہ کے نام سے مشہور ہیں، ۳۹۱ھ میں وفات پائی۔

قال شیخ الشیوخ ابوالحسین رأیته
فی المنام فقلت ما فعل الله بک
قال غفرلی علی رغمک فلما اصبح
امر شیخ الشیوخ اصحابہ فحمل
فی محفة الی قبرہ لیصلی علیہ
فزارہ وامر بلوح کتب علیہ
"ھذا قبر ابی حیان التوحیدی"
فوضع علی قبرہ۔ توفی سنة اربعة
عشرة واربع مأسة ودفن فی
المقبرة المحاذیة للشیخ

کی وفات کے بعد شیخ الشائخ نے انکو خواب
میں دیکھا، پوچھا، تمکو کیا گذری، خدا نے
تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا؟ انھوں نے جواب دیا!
آپکے ترغیب کے خلاف پروردگار نے مجھے
بخش دیا، صبح کو شیخ الشائخ نے مریدوں
سے یہ خواب بیان کیا، اور ہوادار پر سوار
ہوکر قبرستان پہنچے اور اسکی قبر پر فاتحہ پڑھا
اور ایک کتبہ لگانے کا حکم دیا جس پر مرقوم
تھا کہ "یہ ابوحیان توحیدی کا مزار ہے" انھوں نے
۴۱۴ھ میں وفات پائی اور شیخ کے محاذی
مقبرے میں دفن کیے گئے۔

ابوحیان توحیدی کا ایک شاگرد ابوسعد عبدالرحمن بن محمد الاصفہانی تھا، جس نے ۴۰۰ھ
میں ابوحیان سے شیراز میں پڑھا تھا،[1]
ایک دوسرے شاگرد ابواسحاق بن یوسف شیرازی نے بھی ۴۰۰ھ میں شیراز میں ابوحیان
سے استفادہ کیا تھا،[2]

ان دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابوحیان توحیدی کا سن وفات ۴۱۴ھ ہے، اور اسکی آخری
آرامگاہ شیراز ہے۔ (باقی)

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۳ ص ۲ [2] لسان المیزان ج ۶ ص ۳۶۹

پیغمبر اسلامؐ
اور
ہندستان کے باشندے

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری ایڈیٹر البلاغ بمبئی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ ہندستان اور ہندستان کے لوگوں اور یہاں کی چیزوں سے اچھی طرح واقف تھے، اور متعدد مواقع پر آپ کی زبان مبارک پر اس کا ذکر آیا ہے، امام ابن ابی حاتم رازی امام ابوعبد اللہ حاکم، امام ابن جریر طبری اور امام سیوطی نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے:-

ان اول ما اهبط الله آدم الی ارض الهند، وفی لفظ بدجنی ارض الهند ؎	حضرت آدم سب سے پہلے سرزمین ہند میں اتارے گئے اور ایک روایت میں ہے کہ سرزمین ہند کے دکھن میں اتارے گئے

علما کا قول ہے کہ یہاں پر دجنی دکھن یا دکھنا کا معرب ہے، اور اس سے مراد سرزمین دکن ہے،

حضرت ابن عباسؓ سے ایک دوسری روایت منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حضرت آدم پہلے مکہ میں بیت اللہ کی جگہ پر اتارے گئے تھے پھر یہاں سے ہندوستان گئے،

فحل نالذاهبا من الهند فمکث ما شاء الله ان یمکث ثم استوحش الی البیت الخ ؎	آدم مکہ سے چل کر ہندوستان پہنچے اور جب تک اللہ نے چاہا وہاں رہے پھر بیت اللہ کی الفت و شوق آئی۔

بحوالہ الرجال فی ذکر ما بالہندوستان من الاعلام للآزاد ص ۱۰ طبع بمبئی ؎ القری لقاصد ام القری، محب الدین طبری ص ۲۲ طبع مصر

مشہور تابعی عالم حضرت عطا ابن ابی رباح نے حضرت آدمؑ کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے:۔

ان آدم ھبط بارض الھند ومعہ	آدم سرزمین ہند میں اتارے گئے اور ان کے
اربعۃ اعواد من الجنۃ فھی ھذہ	ساتھ جنت کی چار شاخیں بھی تھیں جن سے لوگ
التی یتطیب الناس بھا وانہ حج	خوشبو حاصل کرتے ہیں، انھوں نے یہاں سے
ھذا البیت[1]	بیت اللہ کا حج بھی کیا۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد رسالت میں ہندوستان جانا پہچانا ملک تھا، بلکہ اس کے متعلق حضرت آدم کی وجہ سے ایک گونہ احترام کا جذبہ پایا جاتا تھا، اس سے بڑھ کر اہم روایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہندوستان میں جہاد کرنے کی پیشین گوئی فرماتے ہوئے اس میں شریک ہونے والوں کو جہنم سے مامون و محفوظ ہونے کی بشارت دی ہے، امام نسائی نے اپنی سنن میں اس حدیث کے لیے غزوۃ الہند کا مستقل عنوان قائم کیا ہے، اور امام طبرانی نے معجم میں اس کی سند کو جید بتایا ہے۔ ثوبانؓ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرہ
عصابتان من امتی احرزھما	امت کے دو گروہوں کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کی
اللہ من النار، عصابۃ تغزو الھند	آگ سے محفوظ رکھا ہے، ایک وہ گروہ جو
وعصابۃ تکون مع عیسیٰ بن مریم	ہندستان میں جہاد کریگا اور دوسرا وہ گروہ
علیھما السلام[2]	جو حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کا ساتھ دے گا۔

اسی بشارت نبوی پر حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ عنہ نے ہندوستان کے جہاد میں شرکت کی آرزو اور جان قربان کرنے کی پیش کش کی، چنانچہ مسند احمد اور سنن نسائی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ

---

[1] القریٰ لقاصد ام القریٰ محب الدین طبری مکی ص ۱۲۰ طبع مصر [2] سنن نسائی باب غزوۃ الہند

وعدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے
غزوۃ الہند، فان ادرکتھا	غزوۂ ہند کا وعدہ فرمایا ہے، اگر میں اس میں شریک
انفق فیہا نفسی و مالی، فان اقتل	ہو سکا تو اپنا جان و مال اس میں قربان کرونگا
کنت افضل الشہداء، وان ارجع	اور اگر مارا گیا تو بہترین شہید ہونگا اور اگر زندہ
فانا ابو ہریرۃ المحرر	واپس ہوا تو میں نارِ جہنم سے آزاد ابوہریرہ ہونگا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ہندوستان کے لوگوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے بخاری میں مذکور ہے کہ حدیث معراج میں آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جاٹوں سے تشبیہ دی ترمذی میں ہے کہ ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جنات کو جاٹوں سے تشبیہ دی، اسی طرح سیرابن ہشام میں ہے کہ جب نجران سے بنی کعب کے لوگ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہندوستان کے آدمیوں سے تشبیہ دی اور دریافت فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں، عہد رسالت میں ہندوستان کی جن اشیاء کا استعمال عام تھا، ان کے نام اور خواص سے لوگ واقف تھے، کافور، زنجبیل، عود ہندی، مشک، قرنفل، فلفل، ہندی کا نیزے، ہندی تلوار، ہندی کپڑے وغیرہ روزمرہ کی زندگی میں استعمال کیے جاتے تھے، اور قرآن و حدیث میں ان کے نام موجود ہیں، غرض ہندوستان، یہاں کے باشندے اور یہاں کی چیزیں اس وقت عام طور سے مشہور و متعارف تھیں، اور پڑوسی ملک ہونے کی حیثیت سے دونوں ملکوں میں مختلف قسم کے تعلقات تھے، اور اسی تعلق و تعارف نے ہندوستان میں اسلام کو بہت جلد متعارف کرایا، اور جانبین سے دینی و روحانی تعلقات بہت استوار ہو گئے،

ہندوستان کے باشندوں کی اسلام اور پیغمبر اسلام سے واقفیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب کے مختلف علاقوں میں ہندوستان کے لوگ آتے جاتے تھے اور وہاں مستقل آباد بھی تھے ...

لہ ... تفصیل کے ساتھ ہمارا ... ص ۲۰ پر موجود ہیں۔

زمانہ میں بہت بڑا مذہبی اور تجارتی مرکز تھا، اور قریشی تاجروں کی وجہ سے یمن اور شام کے درمیان
کاروبار کی منڈی تھا، ہندوستان کے تاجر اور صناع موجود تھے، چنانچہ ابوطالب کے ایک شعر
ہندوستانی عورت کا نشان ملتا ہے، اور ابن مسعودؓ کی روایت میں جاٹوں کا ذکر ہے، اور بعض روایات
سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں ہندوستانی کاریگر تلواریں بناتے تھے، اور عرب کے باشندے مشرق میں
ان اور چین کا تجارتی سفر کرتے تھے، اسی طرح ہندوستان کے تاجر وصناع عرب میں آتے جاتے تھے،
ت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ونبوت کا چرچا ہندوستان تک ہونا یقینی تھا، خصوصاً
رت میں جبکہ آپ کی بعثت نے مکہ کے قریشی تاجروں میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا، اور وہ بازاروں
یں اور حج کے موقع میں آپ کے خلاف پروپگنڈا کرتے تھے، ان مخالفانہ سرگرمیوں نے بہت سے
یں آپ کی خبر پہنچائی، چنانچہ جب ایرانیوں کے بادشاہ کسریٰ کو آپ کے دعوائے نبوت کی خبر ملی تو
پنے یمن کے حاکم باذان کو آپ کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا، روم میں جب اس کی خبر پہنچی تو
قریشی تاجر ابوسفیان سے آپ کے بارے میں تحقیقات کی، اس طرح جب مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے
تو نجاشی کو اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں معلومات ہوئیں، غرض کی زندگی ہی میں رسول اللہ
علیہ وسلم کی شہرت پڑوسی ممالک میں عام ہوگئی تھی اسلئے یقین ہے کہ اس زمانہ میں ہندستان میں بھی آپ کے
خبر بھی پہنچ چکی ہوگی، مگر مستند تاریخوں سے اس کا ثبوت نہیں ملتا ہے کہ مکی زندگی ہی میں آپ کا چرچا
ان میں بھی ہوا ہو، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں ظاہر ہونے والے معجزۂ شق القمر کا
ہندوستان میں ہوا، اور اس کے نتائج بھی ظاہر ہوئے، مگر تاریخی اعتبار سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت
پہنچتی ہے،

لبتہ مکہ سے مدینہ کی ہجرت کے بعد جب کفار ومشرکین سے باقاعدہ جنگ شروع ہوئی اور مسلمان
ت اسلام کو عام کرنے لگے تو وہ دور دراز ممالک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا ہو گیا، اس کے بعد ہی

ہندستان کے بعض مذہبی طبقوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا وفد بھیجا اور بعض راجوں اور مہاراجوں نے آپ کی خدمت میں ہدیے بھیجے۔ اس سلسلہ میں دو واقعات زیادہ مشہور اور مستند ہیں، ایک سرندیپ کے جوگیوں اور سنیاسیوں کا اس غرض سے آپ کی خدمت میں مدینہ منورہ میں اپنا وفد روانہ کرنا کہ آپ سے براہ راست اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرے، اور دوسرا ہندوستان کے ایک راجہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زنجبیل کا ہدیہ بھیجنا، جسے آپ نے خود بھی تناول فرمایا اور صحابہ کرام کو بھی کھلایا۔

سرندیپ کا وفد | بزرگ بن شہریار ناخدا رامہرمزی چوتھی صدی ہجری کا مشہور جہازراں اور سیاح ہے وہ عرب سے ہندوستان اور [illegible] تک جہاز رانی کرتا تھا، اس نے اپنی کتاب عجائب الہند میں یہاں کے ساحلی مقامات کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں، اس نے سرندیپ کے جوگیوں اور سنیاسیوں کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تحقیقاتی وفد جانے اور اس کے اثرات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وکان اهل سرندیب ماوالاها لما بلغهم خروج النبی صلی اللہ علیہ وسلم فارسلوا رجلاً فهماً منهم وامرہ ان یسیر الیه فیعرف امرہ وما یدعوا الیه فعاقت الرجل عوائق ووصل الی المدینة بعد ان قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتوفی ابوبکر، ووجد القائم بالامر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنه

سرندیپ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے ایک سمجھدار آدمی کو مدینہ بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ آپ کے پاس جا کر آپ کے حالات کی اور آپ کی دینی دعوت کی تحقیق کرے، مگر اس آدمی کے سامنے کچھ مشکلات آگئیں اور وہ اس وقت مدینہ منورہ پہنچا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصال فرما چکے تھے، بلکہ حضرت ابوبکرؓ بھی وفات پا چکے تھے، اور حضرت عمرؓ بن الخطاب

فسأله عن أمر النبي صلی اللہ علیہ وسلم — [illegible] سرندیپ [illegible]
فشرح له وبين — صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میں جو حالات گزرے تھے
اسے شرح و بسط کے ساتھ تمام باتیں بیان کیں۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ یہ نمایندہ سرندیپ کے لیے بحری راستہ سے روانہ ہوا، مگر مکران کے قریب اس کی موت واقع ہوگئی، اس کے ساتھ ایک ہندوستانی نوکر تھا۔ وہ تنہا سرندیپ پہنچا، اس نے لوگوں سے پورا ماجرا بیان کیا اور بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو چکا ہے، ان کے پہلے خلیفہ ابوبکرؓ کا بھی انتقال ہو چکا ہے، اور اس وقت ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی عمرؓ بن الخطاب کو صاحب حکم و امر پایا، اس نے اہل سرندیپ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تواضع اور خاکساری کا حال بیان کیا اور بتایا کہ وہ پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں، اور مسجد میں بلا تکلف سو جاتے ہیں، اس کا اثر اہل سرندیپ پر بہت اچھا پڑا،

فتواضعهم لأجل ما حكاه لهم ذلك — سرندیپ کے لوگوں کی تواضع اور فروتنی کا سبب
الغلام، ولبسهم الثياب المرقعة — وہی باتیں ہیں جن کو اس خادم نے بیان کیا تھا۔
لما ذكره من لبس عمر رضي الله عنه — اور ان کا پیوند لگے کپڑے پہننا اس وجہ سے
المرقعة ومحبتهم للمسلمين — ہے کہ اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں
وميلهم إليهم لما في قلوبهم — بیان کیا تھا کہ انھوں نے ایسا کپڑا پہنا تھا،
مما حكاه ذلك الغلام عن — اور ان کا مسلمانوں سے میل محبت رکھنا بھی
عمر رضي الله عنه — اسی لیے ہے کہ خادم نے حضرت عمرؓ کی تواضع کا ذکر کیا تھا۔

اس وقت سے لیکر چوتھی صدی ہجری تک اہل سرندیپ اسلام اور مسلمانوں سے پیار محبت و تعلق رکھتے تھے، چنانچہ اس واقعہ کے آخر میں بزرگ بن شہریار اپنے زمانہ کی بابت لکھتا ہے

وهم يحبون المسلمين ويميلون ... وہ لوگ مسلمانوں سے محبت رکھتے ہیں اور
اليهم ميلاً شديداً[1] ... ان کی طرف بہت ہی زیادہ مائل ہیں۔

ان واقعات سے نہ صرف سرندیپ بلکہ اس کے آس پاس کے تمام علاقوں میں اسلام اور رسول اللہ
آ علیہ وسلم کی نبوت کا پھیلنا قرین قیاس ہو جاتا ہے، ہندوستان اور چین میں عربوں کی تجارت عام تھی،
ہاں ان کے بحری سفر برابر ہوا کرتے تھے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ
م کی شہرت ہندوستان سے گذر کر چین تک پہنچ چکی تھی،

غالب گمان ہے کہ سرندیپ کا مذکورۂ بالا وفد یہاں کے بکورہ، یا کبر نتیہ، یا کبر جین نامی فرقہ
رت سے مدینہ منورہ بھیجا گیا ہوگا، یہ لوگ عام طور سے ننگے رہتے تھے، اور آگے پیچھے معمولی سا کپڑا
لیتے تھے، جاڑے میں بدن پر چٹائی لپیٹ لیتے تھے، بعض رنگ برنگ کے کپڑوں کی جوڑ دار دھوتی
تے، شمشان کی راکھ بدن پر ملتے تھے، سر اور داڑھی کے بال نہیں رکھتے تھے، مردوں کی کھوپری
ا کھاتے تھے، تاکہ دنیا کی بے ثباتی کا احساس ہو، جب عرب کے تاجروں یا دوسرے ذرائع سے
نیاسیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر معلوم ہوئی تو انھوں نے تحقیق حال کے لیے اپنی
ت کے ایک آدمی کو بھیجا، ان کے مسلمان ہونے کی روایت تو نہیں ملتی لیکن وہ اسلام کے بعض
ت سے پوری طرح متاثر ہوئے، اگر ان کا آدمی صحیح و سلامت واپس جاتا اور وہ اس کے ذریعہ سے
تعلیمات کو تفصیل کے ساتھ سنتے تو آج سرندیپ اور جنوبی ہند کا دینی نقشہ غالباً کچھ اور ہی ہوتا،
ان کی اسلام سے اس عقیدت کے نتیجہ میں عرب کے مسلمان تاجر سرندیپ میں مستقل آباد ہو کر حیات
بسر کرنے لگے تھے، انہی عربوں کی عورتوں اور بچوں کو وہاں کے راجہ نے ایک جہاز میں عرب بھیجا
یا کہ سندھ کے دیبل کے میدینی سمندری ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تھا، اور عرب عورتوں

---

[1] [illegible]

گرفتار کر لیا تھا جس کے انتقام میں محمد بن قاسم ثقفیؒ نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا۔

ہندوستانی راجہ کا ہدیہ | ہندوستان کے بڑے بڑے راجہ اپنے پڑوسی بادشاہوں کے پاس ہدیے بھیجکر ان سے تعلقات قائم کرتے تھے، کسریٰ کے پاس راجہ دہمی وغیرہ کے ہدایا و تحائف بھیجنے کا تذکرہ قاضی رشید بن زبیر نے کتاب الذخائر والتحف میں کیا ہے، ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہرت اور آپ کے دعوت عرب کے اطراف وجوانب میں ہوئی، تو ہندوستان کے مذہبی طبقہ کی طرح یہاں کے حکمران طبقہ نے بھی ہدیہ اور تحفہ بھیجکر آپ سے عقیدت ومحبت کا اظہار کیا، اور آپ سے تعلقات پیدا کرنے کی صورت نکالی، چنانچہ مشہور محدث امام ابوعبد اللہ حاکم نے مستدرک میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کی ہے:۔

اھدی ملک الھند الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جرۃ فیھا زنجبیل فاطعم اصحابہ قطعۃ قطعۃ واطعمنی منھا قطعۃ	ہندوستان کے راجہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زنجبیل (سونٹھ) کا ایک گھڑا بھیجا، آپ نے صحابہ کو اس کا ایک ایک ٹکڑا کھلایا، اور مجھے بھی اس کا ایک ٹکڑا کھلایا۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس میں سے تناول فرمایا، چنانچہ اس روایت کے آخر میں امام حاکم نے لکھا ہے:۔

قال الحاکم، لم اخرج من اول ھذا الکتاب الی ھنا لعلی بن زید بن جدعان حرفاً واحداً ولم احفظ فی اکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الزنجبیل سواہ فخرجتہ[1]	میں نے اس کتاب کے شروع سے لیکر یہاں تک حدیث کے سوا علی بن زید بن جدعان سے ایک حرف بھی روایت نہیں کیا ہے اور اس حدیث کے علاوہ کوئی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زنجبیل تناول فرمانے کے سلسلے میں مجھے یاد نہیں

[1] المستدرک ج ۴ ص ۳۵، طبع حیدرآباد

امام ذہبی نے مستدرک کی تلخیص میں اس حدیث کے راوی عمرو بن حکام لیثی امام شعبہ پر کلام کیا ہے۔[93]

رجال واسناد پر کلام کرنا محدثانہ بحث ہے، تاریخی اعتبار سے یہ روایت معتبر اور مستند ہے،
اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان کے کسی راجہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں
زنجبیل کا ہدیہ روانہ کیا تھا، ظاہر ہے کہ یہ ہدیہ راجہ کے کسی خاص قاصد کے ذریعہ بھیجا گیا ہوگا، جس نے مدینہ منورہ
خدمتِ نبوی میں پیش کیا ہوگا، راجہ کی طرف سے محبت وعقیدت کا پیغام پہنچایا ہوگا، اس کے جواب
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے راجہ اور اس کے قاصد کے ساتھ نیک سلوک فرمایا ہوگا جیسا کہ عام
ور ہے، غالباً ہجرت کے بعد خدمتِ نبوی میں ہندوستان کے راجہ کا یہ ہدیہ پہنچا ہے، جب آپ کی
ت اور اسلام کی شہرت عام ہو چکی تھی، اور پاس پڑوس کے ممالک میں آپ کا چرچا ہو چکا تھا۔

باقی رہا یہ سوال کہ یہ ہدیہ کس راجہ نے بھیجا تھا، اور وہ کس علاقہ کا حکمران تھا، تو اس کی تعیین
ں ہو سکی، حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں قنوج کے راجہ سرباتک کی زبانی یہ روایت نقل کی ہے کہ
ل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پاس حذیفہ، اسامہ اور صہیب رضی اللہ عنہم کو اسلام کا دعوت نامہ
بھیجا تھا، اور اس نے اسلام کی دعوت قبول بھی کر لی تھی، مگر یہ روایت خود حافظ ابن حجر اور حافظ
کی تصریحات کے مطابق قابلِ اعتماد نہیں ہے، ورنہ یہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ راجہ سرباتک ہی نے
م قبول کرنے کے بعد خدمتِ نبوی میں زنجبیل کا نذرانہ پیش کیا، ممکن ہے کہ سرندیپ کے راجہ نے وہاں
نیاسیوں کی طرح آپ سے تعلق پیدا کرنے کے لیے یہ شکل اختیار کی ہو، بنگال کے راجگان رہمی،
ت ایران کے پاس قدیم زمانہ سے گراں قدر ہدایا وتحائف بھیجا کرتے تھے، ہو سکتا ہے کہ اسی خاندان
راجہ نے خدمتِ نبوی میں بھی ہدیہ بھیجا ہو،

ابن قیم نے زاد المعاد میں اس واقعہ کو ابونعیم کی کتاب الطب النبوی کے حوالے سے نقل کیا ہے مگر
ملک الہند کے بجائے ملک الروم ہے اور بعض الفاظ میں بھی معمولی سا فرق ہے،[1]

مستدرک ج ۴ ص ۳۵ طبع حیدرآباد،

ابوعبد اللہ حاکم اور ان کی کتاب المستدرک میں اور ابونعیم اصفہانی اور ان کی کتاب الطب النبوی میں بڑا فرق ہے، مستدرک کا درجہ الطب النبوی سے بدرجہا بلند ہے، پھر زنجبیل خاص ہندوستانی چیز ہے، اور قدیم زمانے سے یہاں کے راجے مہاراجے اطراف کے بادشاہوں کے پاس اس کا ہدیہ بھیجا کرتے تھے، اسلیے کسی ہندی بادشاہ کا زنجبیل کا ہدیہ بھیجنا بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے،

سرباتک راجہ قنوج اور رتن ہندی کی حقیقت

پہلی صدی ہجری کے خاتمہ تک صحابہ کرام کے وجود باجود سے دنیا خالی ہوگئی تھی، جس پر تاریخ شاہد ہے، اس کے باوجود بعد میں چند ایسے افراد پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہونے کا دعوی کیا ہے۔ اس قسم کے دو شخص ہندوستان میں بھی گذرے ہیں، ایک سرباتک راجہ قنوج، اور دوسرے بابا رتن ہندی، ان دونوں نے اپنے زمانہ میں صحابی رسول ہونے کا دعوی کیا ہے، اور آپ سے ملاقات کے واقعات بیان کیے ہیں، بلکہ رتن ہندی کی کچھ بیان کردہ روایتیں بھی ہیں، جن کا مجموعہ رتنیات کے نام سے ایک زمانہ میں صوفیہ کے ایک طبقہ میں مقبول ومتداول تھا۔

ابن اثیر نے اسد الغابہ میں اور ابن حجر نے اصابہ میں سرباتک کا تذکرہ کیا ہے، ابن حجر نے سرباتک کے دعوئ صحابیت کا شد ومد سے رد کیا ہے، پہلے ابوموسی کے ذیل کے حوالہ سے اسحٰق بن ابراہیم طوسی کی زبانی نقل کیا ہے کہ میں نے ہندوستان کے راجہ سرباتک کو قنوج نامی شہر میں دیکھا ہے، میں نے اس سے دریافت کیا کہ اس وقت تمھاری عمر کیا ہے، تو اس نے بتایا کہ میری عمر سوا سات سو سال کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پاس حذیفہؓ، اسامہؓ اور صہیبؓ کو بھیجا، اور انھوں نے مجھے اسلام کی دعوت دی، میں نے اسلام قبول کرلیا،

پھر ابوحاتم احمد بن محمد بن حامد بلوی کے واسطے سے ابوسعید مظفر بن اسد حنفی جیب کا بیان نقل کیا ہے:

سمعت سرباتك الهندی يقول | میں نے سرباتک ہندی کو کہتے ہوئے سنا کہ

---

۱ زاد المعاد ج ۳ ص ۲۲۵ مطبوعہ محمد علی صبیح مصر

رأيت محمدا صلى الله عليه وسلم مرتين بمكة وبالمدينة مرة، وكان احسن الناس وجها، ربعة من الرجال

میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دو مرتبہ مکہ میں اور ایک مرتبہ مدینہ میں دیکھا ہے، آپ تمام لوگوں سے زیادہ خوبصورت اور میانہ قد کے تھے۔

اس کے بعد حافظ ابن حجر نے حافظ ذہبی کا قول نقل کرکے اس کو جھوٹ قرار دیا ہے،

قال الذهبي في التجريد هذا كذب واضح وقد عذر ابن الاثير ابن منده في تركه اخراجه

ذہبی نے تجرید اسماء الصحابہ میں کہا ہے کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے اور ابن اثیر نے ابن مندہ کو اس کا تذکرہ نہ کرنے پر معذور قرار دیا ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ ۶۳۳ھ میں سرباتک کا انتقال ہوا، اس وقت اس کی عمر ۷۰۰ برس کی تھی،

علامہ محمد طاہر گجراتی نے تذکرۃ الموضوعات میں سرباتک کو معمرین کذابین کی فہرست میں داخل کرکے اصابہ کی عبارت نقل کی ہے، اسی طرح صاحب نزہۃ الخواطر نے اصابہ کی عبارت نقل کر دی ہے، میں نے بھی رجال السند والہند میں اسی کو نقل کرکے لکھا ہے کہ سرباتک نامی شخص کے وجود میں شبہ نہیں جس طرح اس کے دعوائے صحابیت کے کذب میں کوئی شبہ نہیں۔

حافظ ابن حجر نے اصابہ میں رتن ہندی کا تذکرہ کرکے اس کے دعوی صحابیت کے خلاف علمائے رجال وتواریخ کی تصریحات نقل کی ہیں اور تفصیل سے اس کا رد کیا ہے،[۱]

نزہۃ الخواطر میں مجمع النوادر کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابو الرضا رتن پنجاب کے شہر بھٹنڈہ میں پیدا ہوئے جب سن رشد کو پہنچے تو مرشد کامل کی تلاش ہوئی، اسی اثنا میں ان کو معلوم ہوا کہ ملک عرب میں ایک شخص نے اللہ کی طرف سے نبی ہونے کا دعوی کیا ہے، یہ سنکر مکہ گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قیام اور آپ سے فیض حاصل کرکے ہندوستان واپس آئے، اس کے بعد چھ سو سال سے زیادہ زندہ رہے، انھوں نے الرسالۃ الرتنیہ نامی کتاب بھی لکھی ہے، جس میں پیغمبر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] [illegible]

[illegible] ہے جو سات سو جعلی احادیث [illegible] ہے، رتن ہندی کی تصدیق شیخ علاء الدین سمنانی، خواجہ محمد پارسا، شیخ رضی الدین لالا جیسے مشائخ نے کی ہے، چھٹی صدی کے بعد ان کا انتقال ہوا، اور بھٹنڈا میں ان کی قبر ہے[1]،

شیخ صلاح الدین صفدی اور شیخ مجد الدین فیروزآبادی صاحب قاموس نے بھی، رتن ہندی کے وجود کی تصدیق کی ہے، صفدی نے اسے عقلاً جائز قرار دیا، علامہ ذہبی کے انکار کی مخالفت کی ہے اور فیروزآبادی نے لکھا ہے کہ میں رتن ہندی کے وطن میں جا چکا ہوں، بے شمار لوگوں میں نسلاً بعد نسل ان کا تذکرہ نقل ہوتا چلا آتا ہے، رتن ہندی نے اپنی کتاب میں تین سو زائد احادیث بیان کی ہیں جن کا اکثر حصہ واہی تباہی باتوں پر مشتمل ہے[2]،

محدثین اور علماء رجال کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حضرت ابو الطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ سب سے آخری صحابی ہیں جو ایک روایت کے مطابق ۱۱۰ھ میں دنیا سے تشریف لے گئے، ان کے بعد دنیا کی آنکھ کسی صحابیٔ رسول کو نہیں دیکھ سکی، صحیحین میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصال سے تقریباً ایک ماہ قبل صحابہ سے ارشاد فرمایا تھا۔

فانه على رأس مائة سنة	تم میں سے جو لوگ آج روئے زمین پر موجود ہیں
منها لا يبقى على وجه الارض	ایک صدی گذرتے گذرتے ان میں ایک بھی
ممن هو اليوم عليها احد	باقی نہیں رہے گا۔

شرعی اور تاریخی نقطۂ نظر سے رتن ہندی کی صحابیت ثابت نہیں ہے، اور ان کا شمار ان لوگوں میں بھی نہیں ہو سکتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر یا مدرک تھے، محض اس کا عقلی جواز اور مشائخ کی باطنی شہادت اس کے تاریخی ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، ج ۱، ص ۱۲۰، [2] رتن ہندی کی پوری تفصیل کے لیے الاصابہ [illegible] ملاحظہ ہو۔

امام بخاری

اور

انکی جامع صحیح کی خصوصیات

از جناب مولوی تقی الدین صاحب ندوی استاد حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

(۲)

تصنیفات امام صاحب نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، ان کی مجمل فہرست یہ ہے:-

الجامع الصحیح، الادب المفرد، التاریخ الکبیر، التاریخ الاوسط، التاریخ الصغیر، خلق افعال العباد، جزو رفع الیدین، قراءۃ خلف الامام، بر الوالدین، کتاب الضعفاء، الجامع الکبیر، التفسیر الکبیر، کتاب الاشربۃ، کتاب الہبۃ، کتاب المبسوط، کتاب الکنیٰ، کتاب العلل، کتاب الفوائد، کتاب المناقب، اسامی الصحابہ، کتاب الوحدان، قضایا الصحابۃ۔

الجامع الصحیح ان میں سب سے اہم بالشان "الجامع الصحیح" ہے، جس پر ہمیں آیندہ صفحات میں گفتگو کرنی ہے۔

تعیین طور سے تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ امام موصوف نے اس کتاب کی تصنیف کا آغاز کس سنہ میں کیا، اور کب اس سے فارغ ہوئے، لیکن اتنا معلوم ہے کہ تصنیف کرنے کے بعد اس کو اپنے شیوخ امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ، ابن المدینی ۲۳۴ھ، اور ابن معین ۲۳۳ھ کے سامنے پیش کیا تھا۔

ابن معین کا سنہ وفات ۲۳۳ھ ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس سنہ میں بخاری تصنیف سے فارغ ہو چکے تھے، بعد اس میں کچھ بھی اضافے کرتے رہے [?]۔ یہ کتاب امام موصوف نے سولہ سال میں مکمل کی۔

[illegible]

خود فرماتے ہیں : "صنفت کتابی الصحیح فی ست عشرۃ سنۃ"[1] اس لیے اس کا آغاز ۲۱۷ھ میں ہوگا، جبکہ آپ کی عمر شریف ۲۳ سال کی تھی[2]،

وجہ تالیف | دور صحابہ میں کتابت حدیث کا عام رواج نہیں ہوا تھا، اگرچہ احادیث کے متعدد مجموعے تحریری شکل میں آگئے تھے، اس کے مختلف اسباب تھے،

(۱) ابتدا میں صحابہ کرام کو کتابت حدیث سے روک دیا گیا تھا، جب قرآن مجید سے اشتباہ کا اندیشہ جاتا رہا تو اس کی اجازت دے دی گئی،

(۲) ان کے حافظے نہایت قوی تھے، اس لیے کتابت کی چنداں ضرورت نہ تھی[3]،

(۳) تیسری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ صحابۂ کرام کی جماعت نہایت مختصر تھی، اور انکو سارے عالم میں دین پہنچانا تھا، اور تصنیف و تالیف کے لیے سکون و اطمینان کی ضرورت ہے[4]،

لیکن تابعین کے دور آخر میں جب روافض و خوارج اور قدریہ وغیرہ نیز دیگر فرق ضالہ کا شور اٹھا تو حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کے حکم سے آثار و احادیث کی جمع و تدوین کا باقاعدہ کام شروع ہوا، اس کے بعد اس فن میں مزید ترقی ہوئی، اور علماء نے احکام پر مستقل کتابیں لکھیں، امام مالک نے موطا تصنیف کی، اور اس میں اہل حجاز کی قوی روایات کو جمع کرنے کا اہتمام فرمایا، اور اس کے ساتھ صحابہ، تابعین اور بعد کے لوگوں کے اقوال کو بھی شامل کر دیا، دوسری صدی کے آخر تک یہی طریقۂ تصنیف رائج رہا، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو چھانٹ کر اس پر مستقل کام کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور مسانید کے لکھنے کا رواج ہوا، اور امام بخاری کے عہد تک احادیث کے بہت سے مجموعے تیار ہو گئے، جب انھوں نے ان مجموعوں کو دیکھا اور پرکھا تو اس میں صحیح و ضعیف ہر طرح کی روایات نظر آئیں، اس لیے انھوں نے احادیث صحیحہ کا ایک ایسا مجموعہ تیار کرنے کا ارادہ کیا جس میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہو،

---

[1] وفیات الاعیان ج ۳ ص ۳۳۰ [2] لامع ص ۳۰ [3] تدریب ص ۲۸۹ [4] لامع ص ۲۲

ان کے استاد امیر المومنین فی الحدیث اسحٰق بن راہویہ نے ان کے ارادہ کو اور زیادہ قوی کر دیا۔

امام بخاری فرماتے ہیں: ایک مرتبہ ہم ان کی خدمت میں حاضر تھے، انھوں نے فرمایا: "کاش! احادیث صحیحہ کے عنوان پر ایک کتاب تم جمع کر دیتے" امام بخاری فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی، دوسری غیبی تائید یہ ہوئی کہ انھوں نے خواب دیکھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہیں، ان کے ہاتھ میں ایک پنکھا ہے جس کے ذریعہ آپ کے اوپر سے دفع کر رہے ہیں۔

بیدار ہو کر بعض معبرین سے تعبیر دریافت کی، انھوں نے کہا تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے کذب کو دفع کروگے۔ اس خواب نے ان کے شوق وہمت کو اور بلند کر دیا، اور الجامع الصحیح کی تالیف میں ہمہ تن مشغول ہوگئے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مولف نے پوری کتاب میں صحت کا التزام رکھا ہے جو اس کے نام سے ظاہر ہے۔[1]

وجہ تسمیہ

اس کتاب کا پورا نام ہے "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وأیامہ"

الجامع: جس میں فن حدیث کے آٹھوں ابواب ہوں، اس کو جامع کہتے ہیں، اور اس میں سب ابواب موجود ہیں۔ الصحیح: اس کی تمام حدیثیں صحیح ہوں، اگر کوئی معلل یا شاذ روایت آگئی ہے تو اس کا ضمناً ذکر ہے۔ المسند: بطور تاکید کے ہے۔ سننہ: یعنی آپ کے اقوال افعال احوال پر مشتمل ہے۔ أیامہ: امام بخاری نے دور جاہلیت کے بعض ایسے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے جس سے آپ کی زندگی کا تعلق ہے۔[2]

اس تصنیف میں اہتمام

اس تصنیف میں امام بخاری نے سولہ سال صرف کیے، اور اس کو تین بار تصنیف کیا، فرماتے ہیں، قد صنفت کتبی ثلاث مرات۔ ملا علی قاری فرماتے ہیں:

---

[1] مقدمہ فتح الباری ص ۵ [2] افادات حضرت الاستاذ شیخ الحدیث محمد زکریا کاندھلوی مدظلہ

وکانہ اسماء بالتکریر والتیقن[۱] یعنی تنقیح و تہذیب تین بار فرمائی ہے۔ علامہ عینی فرماتے ہیں: "ابن طاہر نے کہا کہ امام بخاری نے صحیح بخاری کو بخارا میں تصنیف کیا"۔ ابو بجیر فرماتے ہیں کہ مکہ معظمہ میں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بصرہ میں، اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں تصنیف ہوئی[۲]۔

لیکن خود امام بخاری کا بیان ہے کہ میں نے "الجامع الصحیح" کو مسجد حرام میں تصنیف کیا، اور ہر حدیث کو درج کرنے سے پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ سے استخارہ کرکے دو رکعت نماز پڑھتا تھا، اور جب اس کی صحت پر پوری طرح انشراح ہو جاتا تھا، اس وقت حدیث کو کتاب میں جگہ دیتا تھا۔ اس اہتمام کی وجہ سے لوگوں کا قول ہے کہ امام بخاری نے گویا براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا

کان البخاری فی جمعہ تلقی من المصطفیٰ ما اکتتب[۳]

بخاری کے تراجم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک اور منبر شریف کے درمیان مسودہ سے مبیضہ میں منتقل کیا تھا، اور ہر ترجمہ کے لیے دو رکعت نماز پڑھتے تھے[۴]۔

مقام تصنیف کے بارہ میں جو متعدد مقامات بیان کیے جاتے ہیں، ان میں حافظ ابن حجر نے یہ تطبیق دی ہے کہ تصنیف کا ابتدائی خاکہ اور ترتیب و ابواب تو مسجد حرام لکھ لیے تھے اور مختلف مقامات پر احادیث کی تخریج فرماتے رہے، تراجم الابواب کے مسودہ کو مزار مبارک اور منبر شریف کے درمیان مبیضہ میں تبدیل فرمایا[۵]۔

الجامع الصحیح کی مقبولیت | بخاری شریف کے محاسن و فضائل بے شمار ہیں جن کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا

حافظ ابن صلاح بخاری و مسلم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کتابا ہما اصح الکتب بعد کتاب اللہ العزیز ثم ان کتاب البخاری اصح الکتابین صحیحا واکثرھا فوائد[۶] یعنی کتاب اللہ کے بعد ان دونوں کتابوں کا درجہ ہے، پھر صحیح بخاری کا مرتبہ صحت اور کثرت فوائد کے لحاظ سے ممتاز و مقدم ہے۔

---

[۱] مرقاۃ ج ۱ ص ۱۳ [۲] عمدۃ القاری ج ۱ ص ۵ [۳] ارشاد الساری ص ۲۰ [۴] مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۰ [۵] ایضاً ص ۴۹ [۶] مقدمہ ابن صلاح

امام نسائی فرماتے ہیں: "اجود ھذہ الکتب کتاب البخاری[1]"

ابوزید مروزی فرماتے ہیں کہ میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان سویا ہوا تھا کہ خواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آپ نے فرمایا اے ابوزید! امام شافعی کی کتاب کا درس کب تک دو گے، میری کتاب کا درس آخر کب دو گے؟ انھوں نے عرض کیا حضور آپ کی کونسی کتاب ہے؟ فرمایا محمد بن اسمعیل البخاری کی "الجامع الصحیح[2]"۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اس کتاب کی تعظیم نہ کرے وہ مبتدع اور مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے[3]، شاہ صاحب قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ صحیح بخاری کو جو شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا[4]۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: "بخاری شریف کے پڑھنے سے قحط سالی دور ہوجاتی ہے، اور قحط کے زمانے میں اس کے ختم کی برکت سے بارش کا نزول ہوتا ہے[5]۔"

ایک محدث نے اس کو ایک سو بیس مرتبہ مختلف مقاصد کے لیے پڑھا اور ہر مرتبہ کامیابی ہوئی[6]۔

جامع صحیح کا مقصد و مقصود اعظم | حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ مصنف نے پوری کتاب میں صحت کا التزام رکھا ہے، اور اس میں صرف احادیث صحیحہ ہی لائے ہیں جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے۔ اس کے ساتھ انھوں نے فقہی مسائل اور حکیمانہ نکتوں کا بھی لحاظ رکھا ہے، چنانچہ متون احادیث سے بہت سے معانی استنباط فرماتے ہیں، جو مناسب طریقے سے پوری کتاب میں موجود ہیں۔ اسی طرح آیات احکام کی طرف بھی پوری توجہ رکھی ہے، اور اس سے عجیب و غریب معانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ: "امام بخاری کی اصل غرض احادیث کے ذخیرہ سے صحیح مستفیض متصل کا انتخاب ہے، اور ان سے فقہ و سیرت اور تفسیر کو بھی استنباط کیا ہے،

---

[1] تہذیب الاسماء [illegible] [2] مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۹ [3] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۴ [4] [illegible] ص ۵۰ [5] ارشاد الساری ج ۱ ص ۲۹ [6] اتحاف النبلاء ص ۱۰۲ [7] [illegible] ص ۲۳

۲۔ اخذ حدیث میں جو شرط انھوں نے مقرر کی تھی، وہ بدرجۂ کمال پوری کی ہے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ امام موصوف کا مقصود عظم اپنی الجامع الصحیح میں طرق استنباط میں اسی لیے فقہ البخاری فی تراجمہ کہا گیا ہے، بخاری کا سارا کمال ان کے تراجم ابواب میں ہے۔[2]

امام بخاری کے تخریج کے شرائط | شروط الائمہ پر علما نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، محمد ابن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ ان ائمہ یعنی بخاری و مسلم اور سنن اربعہ کے مصنفین میں سے کسی سے بھی تخریج روایات میں ان کے شرائط منقول نہیں، بلکہ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔[3] بخاری کی شرط یہ ہے کہ وہ ایسی روایت کی تخریج کرتے ہیں جس کے سارے رواۃ صحابی مشہور تک ثقہ ہوں، اور ان کی ثقاہت پر کبار محدثین کا اتفاق ہو، اس کی سند متصل ہو، منقطع نہ ہو، جس روایت کے صحابی سے دو یا اس سے زیادہ راوی ہوں، وہ نہایت ہی اعلیٰ وارفع ہوگی، اور اگر ایک ہی راوی ہو اور اس کی سند صحیح ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں، امام مسلم نے ایسے لوگوں سے حدیث کی تخریج کی ہے جن کی حدیث کو کسی شبہ کی بنا پر امام بخاری نے ترک کر دیا تھا، جن کی مثال امام زہری کے تلامذہ ہیں جو اوصاف کی کمی اور زیادتی کے لحاظ سے پانچ طبقوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔ امام بخاری نے ان میں سے طبقۂ اولیٰ سے اصالۃً اور طبقۂ ثانیہ سے جن کی احادیث پر ان کو اعتماد ہے، ان کو بخاری میں روایت کیا ہے، لیکن بالاستیعاب ایسا نہیں کیا ہے اور امام مسلم نے دونوں طبقوں کی حدیث کو بالاستیعاب لیا ہے، اسی طرح طبقۂ ثالثہ کی روایات کو امام بخاری نے بالکل قبول نہیں کیا ہے، لیکن امام مسلم ان سے بھی کبھی کبھی روایت کرتے ہیں۔[4]

اسی طرح ابو عبداللہ حاکم نے حدیث صحیح کی تعریف یہ کی ہے کہ اس کو کوئی ...

[1] حجۃ ج ۱ ص ۱۵ [2] ایضاً ص ۱۳۴ [3] شروط الائمہ ص ۱ [4] تدریب الراوی ص ...

سے روایت کرے، پھر اس صحابی سے وہ ثقہ راوی روایت کرتے ہوں، لیکن صحیحین سے ان کا وجود ہی ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ شیخین نے بہت سے ایسے صحابہ کی روایات کو نقل کیا ہے جن سے صرف ایک ہی راوی نے روایت کی ہے[1]، علامہ حازمی فرماتے ہیں:-

"شرط الصحیح ان یکون اسنادہ متصلاً وان یکون راویہ مسلماً صادقاً غیر مدلس ولا مختلط متصفاً بصفات العدالۃ ضابطاً متحفظاً سلیم الذہن قلیل الوہم سلیم الاعتقاد"[2]

کتب احادیث میں جامع بخاری کا مقام | مذکورہ بالا شرائط اور دیگر وجوہ کی بنا پر امت کا اتفاق ہے کہ صحیح بخاری کو صحاح اور تمام کتب حدیث پر ترجیح حاصل ہے، علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ علمائے اسلام کا اتفاق ہے کہ صحیح بخاری صحت اور دیگر فوائد کے لحاظ سے صحیح مسلم پر فائق ہے[3]، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

لا یوازیہ فیہ غیرہ لا صحیح مسلم ولا غیرہ[4]	بخاری کا صحیح مسلم اور کوئی کتاب مقابلہ نہیں کرسکتی،

البتہ امام شافعی سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ

انہ قال ما اعلم فی الارض کتابا اکثر صوابا من کتاب مالک وفی لفظ عنہ ما بعد کتاب اللہ اصح من موطا مالک	روئے زمین پر امام مالک کی کتاب پڑھ کر صحیح تر نزدیک کوئی کتاب نہیں ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ کتاب اللہ کے بعد موطا امام مالک سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے۔

لیکن علامہ نووی فرماتے ہیں کہ امام شافعی کا یہ فیصلہ ان دونوں کتابوں کے وجود میں آنے سے پیشتر تھا، امام شافعی کی وفات ۲۰۴ھ میں ہوئی جبکہ امام بخاری کی عمر دس سال کی تھی، اور اسی سال امام مسلم

---

[1] تدریب ص ۴۳ [2] شروط الائمہ [3] مقدمہ شرح مسلم ص ۱۴ [4] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۲۵

پیدا ہوا ہے۔[۱]

حضرت شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں:۔ بخاری، مسلم و موطا کی حدیثیں نہایت صحیح ہیں، اور موطا کی اکثر روایات مرفوعہ صحیح بخاری میں موجود ہیں[۲]،

لیکن حاکم کے شیخ ابو علی نیشاپوری اور بعض مغاربہ نے صحیح مسلم کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ العزیز کہا ہے،

حافظ ابن حجر نے اس قول کی یہ توجیہ کی ہے کہ ممکن ہے ان لوگوں نے حسن ترتیب کے لحاظ سے مسلم کو ترجیح دی ہو، کیونکہ امام مسلم نے اپنے شہر میں بیٹھ کر نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ اپنی کتاب کی تصنیف کی۔ اور امام بخاری نے مختلف مقامات میں رہ کر روایات کی تخریج کی ہے۔ حضرت الاستاذ مدظلہ (شیخ الحدیث حضرت مولانا ذکریا صاحب) فرماتے ہیں کہ "اگر ان کے قول کی یہ توجیہ نہ کی جائے تو بھی جمہور کے مقابلہ میں ان کا قول شاذ و ناقابل اعتبار ہے۔" (افادات)

صحیح بخاری کے صحیح مسلم پر ترجیح کی ایک قوی دلیل یہ بھی ہے کہ بخاری کی روایات کے مقابلہ میں مسلم کی روایات پر زیادہ کلام کیا گیا ہے،

امام دارقطنی فرماتے ہیں:۔

لولا البخاری لما جاء مسلم (مقدمہ فتح الملہم)، اگر بخاری نہ ہوتے تو مسلم کا وجود نہ ہوتا،

تعداد روایات | علامہ نووی و شیخ ابن صلاح کے نزدیک تکرار کے ساتھ بخاری کی روایات کی تعداد ۷۲۷۵ ہے، اور عدم تکرار کے ساتھ ۴۰۰۰ (تدریب ص ۳۰) لیکن حافظ ابن حجر نے پوری احتیاط سے شمار کیا تو روایات مرفوعہ کی تعداد ۷۳۹۷، اور تکرار کے ساتھ متابعات و تعلیقات کی تعداد ۱۳۴۱ ہے، جن میں اکثر کو امام بخاری نے مسنداً بیان کر دیا ہے، اور موقوفات صحابہ و مقطوعات تابعین کی تعداد ۱۳۶۳ ہے، اس طرح مجموعی تعداد ۹۰۸۲ ہے، غیر مکرر روایات مرفوعہ ۲۳۵۳ اور غیر مکرر متابعات و تعلیق ۱۶۰ ہیں،

---

[۱] لامع ص ۱۴ [۲] عجالۂ نافعہ ص ۲

اس طرح غیر مکرر مجموعہ ۲۶۰۲ ہے، اس تعداد میں آثار صحابہ و تابعین جن کا تراجم ابواب میں تذکرہ ہے شامل نہیں ہیں۔[1]

جامع صحیح کی خصوصیات (۱) امام بخاری کو دوران تالیف میں جب کبھی تالیف کا سلسلہ چھوڑنا پڑا تو دوبارہ جب پھر شروع کیا تو اسکی ابتدا بسم اللہ سے کی، اس لیے درمیان میں متعدد جگہوں پر بسم اللہ مذکور ہے،

(۲) عام طور پر مشہور ہے کہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں صیغۂ تمریض سے روایات کے ضعف کی طرف اشارہ کیا ہے، علامہ نووی فرماتے ہیں کہ جن معلق روایات کو امام موصوف نے صیغۂ جزم سے بیان کیا ہے ان کی صحت کا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن جب صیغۂ تمریض سے بیان کرتے ہیں تو ان کی صحت کا حکم تو نہیں لگایا جاتا لیکن صحیح بخاری میں آجانے کی وجہ سے ناقابل اعتبار بھی نہیں سمجھا جائیگا، حافظ ابن حجر نے علامہ نووی کے کلام پر تعقب کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں صحیح رائے ہمارے شیخ کی ہے کہ امام بخاری صیغۂ تمریض کو ضعف اسناد کے ساتھ خاص نہیں کرتے، بلکہ جب کبھی متن کو بالمعنی اختصار کے ساتھ بیان کرنا مقصود ہوتا ہے تو صیغۂ تمریض سے اس اختلاف کی طرف اشارہ فرماتے ہیں،

(۳) صحیح بخاری کا امراض و مصائب، دشمنوں کے خوف وغلا کی گرانی وغیرہ میں پڑھنا تریاق مجرب ہے،

(۴) عام طور پر مشہور ہے کہ امام بخاری جب قال فلاں کہتے ہیں تو یہ مذاکرہ پر محمول ہوتا ہے، علامہ عینی فرماتے ہیں کہ اس کا رتبہ تحدیث سے کم ہے، اور یہ صیغہ وہاں استعمال کرتے ہیں جہاں روایت انکی شرط پر نہیں ہوتی لیکن یہ کلیہ نہیں ہے، کیونکہ کبھی اس کو صیغۂ تحدیث سے بھی بیان کر دیتے ہیں،

(۵) امام بخاری کا معمول ہے کہ جب حدیث میں کوئی ایسا غریب لفظ آجاتا ہے جس کی نظیر کتاب اللہ میں موجود ہے تو اس کی وضاحت میں مفسرین کے اقوال نقل کر دیتے ہیں، اسی طرح کبھی باب کی مناسبت سے آیات قرآنی کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، اور اکثر آیات کے بجائے صرف اسکے چند الفاظ نقل کر دیتے ہیں، کتاب التفسیر و کتاب بدء الخلق میں بکثرت اس کی مثالیں ہیں،

---

[1] مقدمہ فتح ص ۴۶۵ و ۴۷۰ ج ۱ص ۳۴

(۷) محدثین کرام کے نزدیک سند عالی کی بڑی خصوصیت رہی ہے، بخاری کا یہ خاص امتیاز ہے کہ اس میں بائیس ۲۲ روایات ثلاثی ہیں، جن کا تذکرہ حاشیہ پر نہایت جلی قلم سے کیا گیا ہے۔ ان میں سے بیس ثلاثیات کے شیوخ حنفی ہیں اور دو کے متعلق تحقیق نہیں۔ (کذا فی اللامع ص ۳۰)

(۸) شروع میں بیان کیا جا چکا ہے کہ امام بخاری کے پیش نظر طرق استنباط ہے، اس لیے ایک حدیث کو استنباط مسائل یا کسی دوسرے مقصد سے متعدد مقامات پر بیان کرتے ہیں، مثلاً انما الاعمال بالنیات والی روایت کو تیرہ ۱۳ مقام پر ذکر کیا ہے، حالانکہ امام موصوف نے خود فرمایا ہے کہ میں مکرر روایت کو اس کتاب میں داخل نہ کروں گا۔[۱] حافظ ابن حجر نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ بالارادہ اپنی کتاب میں ایک ہی سند و متن کو مکرر نہیں لاتے، اگر کہیں مکرر ہے تو محض اتفاقی ہے۔[۲] پوری کتاب میں ۲۲ روایات مکرر ہیں جو اتنی ضخیم کتاب کے لیے زیادہ نہیں کہی جا سکتیں۔

(۹) تاریخ پر بھی امام بخاری کی مجتہدانہ نظر ہے، حضرت الاستاذ مدفیوضہم کی تحقیق میں امام بخاری ہر کتاب کے شروع میں اسکے زمانۂ نزول اور مشروعیت کی ابتدا کی طرف بھی کبھی کبھی اشارہ کر دیتے ہیں، خصوصاً جبکہ اس میں کوئی اختلاف ہو، اور کبھی صراحت بھی کر دیتے ہیں۔

(۱۰) حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام موصوف ہر کتاب کے اختتام پر کوئی نہ کوئی ایسا لفظ لاتے ہیں جس سے ختم کتاب کی طرف اشارہ ہوتا ہے، مثلاً بدء الوحی کے آخر میں فکان ذلک آخر شان ھرقل اور کتاب الحج کے ختم پر اجعل موتی ببلد رسولک۔ حضرت الاستاذ کی رائے ہے کہ امام بخاری ہر کتاب کے ختم پر کوئی ایسا لفظ لاتے ہیں جس سے ختم زندگی کی طرف اشارہ ہوتا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کتاب کو موت کے استحضار کے ساتھ پڑھنا چاہیے۔

(۱۱) کتاب کی ابتدا اور انتہا میں گہرا ربط ہے، حافظ ابن حجر نے اپنے استاذ کا قول نقل کیا ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کو کتاب التوحید پر ختم کیا کیونکہ توحید ہی آخرت میں کامیابی اور نامہ اعمال کی اصل میزان ہوگا اور اس کی ابتدا انما الاعمال بالنیات کی حدیث سے فرمائی، کیونکہ اعمال کی عند اللہ مقبولیت کے لیے اخلاص نیت ضروری ہے، اور آخرت میں صرف وہی اعمال وزنی ہوں گے جو خالص

---

[۱] بخاری شریف ج ۱ ص ۲۰ [۲] مقدمہ فتح ص ۱۲

کے ساتھ مختصاً انہی کے لیے بیان، یہ چند خصوصیات آیات کے مقدمہ سے باختصار نقل کی گئی ہیں۔

صحیح بخاری کے تراجم ابواب | شروع میں کہا جا چکا ہے کہ امام بخاری کے پیش نظر جس طرح احادیث صحیحہ کی تخریج تھی اسی طرح وہ ان سے بہت سے مسائل کا استنباط و استخراج بھی فرماتے ہیں، اسی لیے کبھی کبھی ایک روایت متعدد جگہوں پر نقل کرتے ہیں، جیسے حضرت عائشہؓ کی وہ حدیث جو حضرت بریرہؓ کے واقعہ سے متعلق ہے، اس کو بیس مرتبہ سے زائد نقل کیا ہے، علماء کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ فقه البخاری فی تراجمه بخاری کا سارا کمال ان کے تراجم میں ہے، علامہ کرمانی فرماتے ہیں، امام صاحب نے اپنے تراجم ابواب میں جس دقت نظر کا مظاہرہ فرمایا ہے اس کو سمجھنے سے بڑے بڑے اہل علم قاصر رہے، اس کی اسی اہمیت کی بنا پر متقدمین اور متاخرین نے تراجم ابواب پر مستقل رسالے لکھے ہیں، حضرت الاستاذ نے لامع الدراری میں چھ کتابوں کا تذکرہ فرمایا ہے، مگر آج ہمارے سامنے صرف دو رسالے موجود ہیں، (۱) ایک حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا رسالہ شرح تراجم البخاری (۲) دوسرا حضرت شیخ الہند کا الابواب والتراجم جو اردو میں ہے، پہلے رسالے میں چودہ اور دوسرے میں پندرہ اصول بیان کیے گئے ہیں، شراح بخاری میں حافظ ابن حجر اور عینی نے بھی تراجم ابواب کی طرف توجہ فرمائی ہے، اول الذکر نے بعض اصولوں کی نشاندہی بھی کی ہے، فرماتے ہیں کہ امام موصوف نے بہت سے فقہی فوائد اور حکیمانہ نکتے اپنی کتاب میں بکھیرے ہیں، اور غور و فکر کرنے والوں کو اس میں بہت سی نادر چیزیں ملتی ہیں، من جد وجد، حضرت الاستاذ نے ان حضرات کے بیان کردہ اصولوں کی تفصیل فرمائی ہے، اور اس پر اضافے بھی کیے ہیں، اس طرح ان اصولوں کی تعداد ستر تک پہنچ جاتی ہے، اگر ان کو پیش نظر رکھا جائے تو ہر جگہ حدیث اور ترجمہ میں مناسبت نظر آئے گی۔[1]

امام دارقطنی وغیرہ کے شبہات | صحیح بخاری کی جن روایات پر دارقطنی وغیرہ نے نقد کیا ہے ان کی تعداد مجموعی طور پر

---

[1] مقدمہ فتح ص ۱۰، لامع ص ۹

ایک سو دس ہے۔ حافظ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ وغیرہ نے اس کا مفصل جواب دیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ جواب دے کر یہ فرماتے ہیں کہ بحمد للہ اکثر اعتراضات کا جواب کافی و شافی ہو گیا ہے، بعض جوابات محتمل ہیں، البتہ چند جگہوں پر تکلف سے کام لینا پڑا ہے، جب کوئی منصف مزاج ان جوابات پر غور کرے گا تو مصنف کی جلالت شان اور کتاب کی عظمت اس کی نظر میں دوبالا ہو جائے گی، اور اس پر واضح ہو جائے گا کہ علما میں جو اس کو حسن قبول حاصل ہوا اور تمام کتب حدیث پر جو انھوں نے اس کو ترجیح دی، وہ سراسر مبنی بر حقیقت ہے، ناقدین کے اصول نقد چند کمزور اصولوں پر مبنی ہیں، جو جمہور ائمہ کے خلاف ہیں، اس لیے معارضہ کے وقت شیخین کی تصحیح کو فوقیت حاصل ہو گی۔[1] اسی طرح بخاری کے تقریباً اسی اور مسلم کے ایک سو ساٹھ رواۃ پر کسی نوع کا نقد کیا گیا ہے،[2] حافظ ابن حجرؒ نے اس کا اجمالی جواب یہ دیا ہے کہ ینبغی لکل منصف ان یعلم ان تخریج صاحب الصحیح لای راو کان مقتض بعدالتہ عندہ وصحۃ حفظہ وعدم غفلتہ یعنی ہر منصف مزاج کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ امام بخاریؒ اپنی کتاب میں جس راوی سے تخریج کریں ان کے نزدیک اس راوی کے عادل اور صحیح الحافظہ ہونے کی دلیل ہے، اس لیے جمہور ائمہ نے ان دونوں کتابوں کو صحیحین کے نام سے یاد کیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ متابعات وشواہد میں بھی عدالت و حفظ کا وصف امام بخاریؒ کے نزدیک ضروری ہے۔[3]

تاہم اتنی ضخیم کتاب میں معمولی فروگذاشتوں اور تسامح کا ہونا نہ بعید ہے اور نہ اس کی عظمت کے منافی ہے، چند مقامات پر امام موصوف سے تسامح ہو گیا ہے جس سے واقفیت ایک طالب بخاری کے لیے ضروری ہے تفصیل کے لیے لامع الدراری کا مقدمہ ملاحظہ ہو۔

(باقی)

---

[1] مقدمہ فتح ص ۳۴۶ و لامع ص ۱۰، [2] لامع ص ۴۸، [3] مقدمہ فتح ص ۳۸۴ و ارشاد الساری ص ۴۰

مستشرقین کی بین الاقوامی کانگرس

کا

چھبیسواں جلسہ

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم اے

اس سال مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس کا چھبیسواں جلسہ ۴ جنوری ۱۹۶۴ء سے ۱۰ جنوری ۱۹۶۴ء

ء دہلی میں منعقد ہوا، اب تک اس کے جلسے برابر یورپ میں ہوتے رہے، ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہوا کہ

شیا میں اس کا جو اجلاس پہلی دفعہ کیا گیا، اس کے لیے نظر انتخاب ہندوستان کے دار السلطنت پر پڑی،

حکومت ہند میزبان تھی، اور اس کانگریس کے صدر حکومت ہند کے لائق اور فاضل وزیر پروفیسر

یون کبیر تھے، جنھوں نے اس کانگریس میں نہ صرف اپنی قابلیت اور لیاقت کا سکہ جمایا بلکہ ہندوستان

علمی وقار کو بھی بلند کیا،

کانگریس میں امریکہ، کینیڈا، میکسیکو، برطانیہ، روس، فرانس، رومانیہ، پولینڈ، ہالینڈ، اسٹریا،

اسٹریلیا، ہنگاڈ، یکا، مصر، عراق، شام، لبنان، اسرائیل، کوریا، جاپان، ایران، پاکستان اور

ہندوستان کے بارہ سو نمائندے شریک تھے، اکثریت ہندوستان کے نمائندوں کی تھی جنھوں نے مختلف

انجمنوں اور اداروں کی نمائندگی کی،

کانگریس کے جلسہ کا انتظام ہر لحاظ سے قابل تعریف تھا، اور اس کے لیے حکومت ہند مبارکباد

کی مستحق ہے، نمائندوں کو ہر طرح کی سہولت پہنچائی گئی، ان کے اعزاز میں چائے اور کھانے کی بڑی بڑی

ہوتی ہوئیں، بیرونی مہمانوں کے لیے ہندوستان کے تاریخی مقامات کی سیر و سیاحت کا بھی انتظام تھا، علمی ضیافت کا بھی پورا سامان تھا، کانگریس کا اجلاس دہلی کی مشہور عمارت وگیان بھون میں ہوا، اس کے افتتاح سے پہلے ہر نمایندہ کے ہاتھ میں حسب ذیل کتابیں تھیں جو منتظمین کی طرف سے مفت تقسیم ہوئیں:

(۱) ہندوستان میں مشرقی علوم (Oriental Studies in India) (۲) ہندوستان کے آثار قدیمہ، تاریخی یادگاریں، اور میوزیم حصہ اول و دوم (۳) دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقے، (۴) ہندوستان کے اہم مخطوطات (۵) کانگریس میں پڑھے جانے والے مقالات کے خلاصے دو جلد (۶) "ہندوستان میں مشرقی علوم" اس میں اسلامی علوم و فنون کے باب میں دار المصنفین کی علمی سرگرمیوں کا بھی ذکر تھا جس کا خلاصہ یہ ہے:

"دار المصنفین شبلی اکیڈمی ہندوستان کے اہم ترین اداروں میں سے ہے، یہاں سے ابتک اردو زبان میں تقریباً سو کتابیں سیرت، خلفاے راشدین، اسلامی ممالک کی تاریخ، عرب و ہند کے تعلقات، ہندوستان میں تصوف، اور ہندوستان کی تمدنی تاریخ وغیرہ پر شائع ہو چکی ہیں، اس علمی ادارہ کی بنیاد مولانا شبلی اور ان کے لائق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی نے ڈالی، اور انھوں نے جو علمی روایت بنائی اس کو استوار کر کے ان کے جانشین مولانا مسعود علی ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبد الرحمن اور دوسرے نوجوان اہل علم کی جماعت قائم کیے ہوئے ہے، فی الحال اس کی اہم علمی سرگرمیوں میں ۲۵ جلدوں میں ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ بھی شائع کرنا ہے، جن میں اس عہد کے ہندوستان کے معاشرتی، مذہبی اور تہذیبی پہلوؤں پر تحقیقات ہونگی، حال ہی میں مولانا ابو الحسن ندوی کی تاریخ دعوت و عزیمت دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، بزم صوفیہ، اقبال کامل، اسلام اور عربی تمدن، حکماے اسلام، تبع تابعین، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے، گجرات کی تمدنی

تاریخ بھی تفصیل سے ذکر ہے۔ معارف اسلامی علوم و فنون کا بڑا معیاری ماہنامہ رسالہ ہے، اسلامی ملک میں جتنی کتابیں شائع ہوتی ہیں، ان پر اس میں تنقیدیں اور تبصرے بھی شائع ہوا کرتے ہیں، اس میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر جو ناقدانہ مضامین ہوتے ہیں، ان کے اعلیٰ معیار کو شاہ معین الدین احمد ندوی اور ان کے رفقاء کار قائم رکھے ہوئے ہیں، اس کے لیے وہ تعریف و ستائش کے مستحق ہیں۔"

اسی کتاب میں عربی اور فارسی علوم کے باب میں بھی دارالمصنفین کا ذکر ان الفاظ میں ہے:-

"دارالمصنفین جو شبلی اکیڈمی کے نام سے بھی مشہور ہے ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی کے علمی مشن کو پورا کرنے کے لیے قائم ہوا، اس کی مطبوعات کے ترجمے مصر، ترکی، ایران اور افغانستان میں ہوئے ہیں، یہاں سے معارف شائع ہوتا ہے، جو اردو کا قدیم ترین معیاری ماہنامہ رسالہ ہے، عربی اور فارسی ماخذوں سے جو کتابیں یہاں لکھی گئی ہیں ان میں کچھ یہ ہیں: تاریخ سندھ از سید ابوظفر ندوی، بزم تیموریہ از سید صباح الدین عبدالرحمن، تاریخ اسلام از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، تاریخ اندلس از سید ریاست علی ندوی، حکمائے اسلام از مولانا عبدالسلام ندوی، اور بزم مملوکیہ از سید صباح الدین عبدالرحمن۔"

کانگریس کے اجلاس کا آغاز ہوا تو سب سے پہلے اس کے گذشتہ اجلاس کے صدر روسی مستشرق ڈاکٹر بی گیفورف نے اپنا الوداعی خطبہ پڑھا، انھوں نے تین سال پہلے کانگریس کے اجلاس کی صدارت ماسکو میں کی تھی، اس خطبہ میں روس میں مشرقی علوم کے متعلق جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا بھی ذکر تھا، جس سے معلوم ہوا کہ منو شاستر، وید، اُپنشد، جاتکا کے علاوہ کلام پاک، فردوسی کے شاہنامہ، سعدی کی گلستاں، نظامی کے خمسہ، عمر خیام کی رباعیات، امیر خسرو کی شیریں خسرو کے ترجمے روسی زبان میں ہوئے ہیں، پھر ہندوستانی فلسفیوں میں [illegible] رادھا کرشنن، [illegible]، [illegible]، [illegible] معاشیات میں [illegible] دادا بھائی نوروجی، [illegible] بنگال [illegible] سوامی [illegible] [illegible]

میں کامتا پرشاد گرو اور دوسرے مصنفوں کی تصانیف روس کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوئیں، وہاں ہندوستان کی تاریخ بھی چار جلدوں میں لکھی جارہی ہے، جن میں موجودہ دور کی تاریخ دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، آخر میں روسی مستشرق نے امن، آشتی، مساوات اور انسداد ظلم پر زور دیتے ہوئے اپنا خطبہ حافظ کے اس شعر پر ختم کیا

درخت دوستی بنشاں کہ کام دل بہ بار آرد نہال دشمنی برکن کہ رنج بے شمار آرد

اس کے بعد جناب ہمایوں کبیر کا خطبہ ہوا جو بڑی خاموشی اور توجہ سے سنا گیا، یہ طویل ہونے کے بجائے مختصر تھا، لیکن اس کے ایجاز میں بھی اطناب، اور اجمال میں بھی تفصیل تھی، جو ان کے انداز تحریر اور طرز ادا کی پختگی کی دلیل ہے، اس میں مستشرقین کے کارناموں پر پُرمغز تبصرہ تھا، اور ہندوستان پر بیرونی اثرات کے ذکر میں صدر محترم نے بڑی فراخدلی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ عہد وسطیٰ سے اسلام اور گذشتہ تین سو برس سے یورپ کی وجہ سے ہندوستان کی زندگی اور طرز فکر میں ایسی بنیادی تبدیلیاں ہوئی ہیں جن کے نتائج دور رس ہو چکے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ علوم مشرقی ہی کے مطالعہ سے مغربی ممالک میں تاریخ نویسی کا ایک نیا انداز پیدا ہوا، انگریز ہندوستان آئے تو ان کو تاریخ نویسی کے اسلامی طرز سے سابقہ پڑا، جو عیسائیوں کے مذہبی اور کراماتی انداز بیان سے بالکل پاک تھا، یہ صحیح ہے کہ مسلمان مورخوں نے معاشرہ کے ارتقا، یا تاریخی محرکات سے بحث نہیں کی ہے، لیکن انھوں نے صحیح واقعات قلمبند اور ان کے لیے دیانتداری کے ساتھ ماخذوں اور شہادتوں کو فراہم کرنے میں بڑا اونچا معیار قائم کیا، مسلمانوں کی تاریخ میں شخصیات، حربی تفصیلات اور درباری سازشوں کے واقعات ضرورت سے زیادہ ہیں، لیکن مارکس سے پہلے یورپ کے مورخین بھی انہی واقعات پر زور دیتے تھے، جو بادشاہوں، فوجی سرداروں اور سیاسی مدبروں کی سازشوں اور سرگرمیوں سے ظہور پذیر ہوتے تھے، مرزا ابوطالب (المتوفی ۱۸۰۶ء) پہلے ہندوستانی اہل قلم ہیں جنھوں نے تاریخی واقعات کے ظہور پذیری میں معاشرتی اور اقتصادی رجحانات کی اہمیت

کا اندازہ لگایا۔

اس کے بعد جمہوریۂ ہند کے صدر ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کا افتتاحیہ خطبہ پڑھا گیا جو اپنی علالت کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے تھے، اس لیے ان کا خطبہ بھی جناب ہمایوں کبیر صاحب ہی نے پڑھا جس میں ان کی عام تحریروں کی طرح مذہبی اور فلسفیانہ رنگ غالب تھا، مشرقی فضا پیدا کرنے کے خاطر سنسکرت کے اشعار بھی نقل کیے گئے تھے۔

اسی روز ساڑھے چار بجے شام کو راشٹرپتی بھون میں تمام مندوبین صدر جمہوریہ کی طرف سے چائے پر مدعو تھے، صدر کے بجائے نائب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے مہمانوں کا استقبال کیا، اور مہمان نوازی کے پورے مشرقی آداب کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے مہمانوں سے ملتے رہے۔

اسی دن ساڑھے چھ بجے شام کو وگیان بھون میں پنڈت جواہر لال نے مندوبین کو مخاطب کیا، اس میں انھوں نے بتایا کہ قدیم و جدید رنگ میں کیسے ہم آہنگی ہوسکتی ہے۔

۵ جنوری کو نو بجے سے ۱۲ بجے دوپہر اور پھر ڈھائی بجے سے ۵ بجے شام تک مختلف شعبوں کے جلسے مختلف صدارتوں کے ماتحت علٰحدہ علٰحدہ کمروں میں شروع ہوئے، شعبوں کی تقسیم یہ تھی:۔

(۱) مصریات (Egyptology) صدر پروفیسر اے ابوبکر (۲) سامیات (Semitic studies) صدر ڈاکٹر اے فالکنسٹین (۳) ہتیات اور کوکیشین اسٹڈیز (Hittite & Caucasian studies) صدر پروفیسر بوڈس پی اوٹ روڈسکی، (۴) التیک اسٹڈیز اور ترکولوجی (Altaic studies Turcology) صدر پروفیسر ذکی ولی توگان

(۵) ایرانیات (Iranian studies) صدر پروفیسر ڈیوڈ داؤد،

(۶) انڈولوجی اینڈ انڈس سویلیزیشن۔

(۱) ویدک اسٹڈیز ۔ صدر پروفیسر پال تھیمے (۲) کلاسیکل سنسکرت۔ صدر پروفیسر ال (؟) رینو

(۳) مذہب اور فلسفہ۔ صدر۔ پروفیسر ڈبلیو کی ولاکوب۔ (۴) تاریخ اور کلچر۔ صدر پروفیسر اے ال بشام (۵) جدید ہندوستانی زبانیں۔ صدر۔ پروفیسر ہرمن برجر

(۶) ساؤتھ ویسٹ ایشین اسٹڈیز۔ صدر۔ پروفیسر بی۔ جے زویٹ ملڈر (۷) مشرقی ایشیائی مطالعات۔ صدر۔ پروفیسر کے اینوکی (۹) اسلامیات۔ صدر۔ ولفرڈ کینٹویل اسمتھ (۱۰) افریقیات۔ (افریکن اسٹڈیز) صدر پروفیسر ار، ڈبلیو، بی جے

سب سے زیادہ مقالات انڈولوجی کے شعبے میں تھے، اس کے بعد اسلامیات کا نمبر تھا، اس میں جو مقالات پیش ہوئے اور پڑھے گئے ان کی فہرست حسب ذیل ہے :-

(۱) جمہرۃ الاسلام شانیزاری مختار الدین احمد علی گڑھ (۲) اسلام کے تہتر فرقے : عبدالعلیم علی گڑھ (۳) عربی زبان کے کچھ مسائل : لے ال۔ الهندی الہ آباد (۴) مرزا ابوطالب خاں انگلستان کا ایک ہندوستانی سیاح (۱۷۹۹ء - ۱۸۰۳ء) ثروت علی، نئی دہلی (۵) ذو القرنین ایس۔ لے علی، دہلی (۶) مسلمانوں کے فلسفہ میں مسرت کا تخیل - عبد الحق انصاری، علی گڑھ (۷) موسوی خاں فطرت - محمد اظہر انصاری، الہ آباد (۸) سلاطین دہلی کے عہد کے مشائخ کے ملفوظات کی تاریخی اہمیت - سید حسن عسکری، پٹنہ (۹) خلیفہ المعتصم کی فوجی اصلاحیں۔ ڈی ایالون، اسرائیل (۱۰) عیسائیوں کی تصانیف کے ذریعہ وسطی عربی زبان کا مطالعہ - جے۔ بلاؤ، اسرائیل (۱۱) عہد وسطی میں جلد سازی۔ گلنار کے بوش، امریکہ (۱۲) لاہور میں مسلمانوں کی قدیم ترین اثری یادگاریں۔ عبد اللہ چغتائی، لاہور (۱۳) عرب و ہند کے تمدنی تعلقات۔ پی، این چوپڑا، نئی دہلی (۱۴) مالوہ کی ایک معاصر تاریخ مآثر محمود شاہی۔ یو۔ ان۔ ڈے، دہلی (۱۵) عقیدۂ درویش : ڈی، ام، ڈنلوپ، امریکہ (۱۶) جنگ صلیبی کے عہد کے عربی دینار۔ انڈریو ایس۔ اہرین کروئیز امریکہ (۱۷) ہندوستان اور بحر روم کے درمیان تجارتی تعلقات کی عربی دستاویزات۔ ایس، ڈی، گوئٹین، امریکہ

(۱۸) عربی کیمیا کی ہندوستانی اصل۔ محمد یحییٰ ہاشمی، شام (۱۹) معرفت الٰہی اور خواجہ بندہ نواز۔ احمد حسین خاں
حیدرآباد (۲۰) حفظ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق غلط فہمیاں۔ محمد اجمل خاں، دہلی (۲۱) کتاب التاجی
مولفہ ابو اسحٰق ابراہیم الصابی۔ محمد صابر خاں، مجاز گرام (۲۲) شاہ محب اللہ الٰہ آبادی اور تصوف۔
یوسف حسین خان، علی گڑھ (۲۳) حافظ احمد خاں۔ محمد یوسف کوکن، مدراس (۲۴) کیرالا اور عربی
زبان کی خدمت۔ اے۔ پی ابراہیم کنجو، فروک (۲۵) ابو علی الہجری اور اس کی تصنیف کتاب التعلیقات
والنوادر۔ ابو محفوظ الکریم معصومی، کلکتہ (۲۶) سیرت کے ماخذ کی حیثیت سے عہد نبوی کی شاعری کا ناقدانہ مطالعہ،
م۔ لے۔ سعید خاں، حیدرآباد (۲۷) مغل حکمرانوں کی سیاست پر نقشبندی اثرات۔ خلیق احمد نظامی
علی گڑھ (۲۸) سلمان اور ابصال کا قصہ۔ ایس پائنز، اسرائیل (۲۹) مسلمانوں اور مغرب کی
لڑائیوں کے جغرافیائی اور سیاسی اثرات۔ از ابراہیم ان۔ پالی اک، اسرائیل (۳۰) حضرت خواجہ
معین الدین چشتی اجمیری کی ولادت اور وفات کی تاریخ کا ناقدانہ مطالعہ۔ سید صباح الدین عبد الرحمن
اعظم گڑھ (۳۱) عزۃ الکمال۔ غلام دستگیر حیدرآباد (۳۲) شاہ ولی اللہ اور مذہبی خیالات کی نئی تشکیل۔
غلام دستگیر رشید، حیدرآباد (۳۳) سولھویں اور سترھویں صدی کے ہندوستانی مسلمانوں کی تحریک تجدید،
ایم۔ اے۔ رضوی الٰہ آباد (۳۴) سندھ میں عربوں کے کارنامے۔ ایس۔ پی۔ صمدی، لکھنؤ۔
(۳۵) مرہٹوں کے نظام عدل پر اسلام کے اثرات۔ ڈی۔ ان۔ ساٹھے پونہ (۳۶) مرزا سلیمان کے سیاسی قتل
اہمیت۔ اے۔ ایم۔ ساودری، کمپنڈا (۳۷) عربی زبان کے ضرب الامثال۔ سلیم۔ ذکی کشور رشٹ
(۳۸) صحاح ستہ اور المزی۔ عبد الصمد شرف الدین بھیونڈی (۳۹) مولانا آزاد کی تفسیر کی
روشنی میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات۔ ایم۔ ایم صدیقی حیدرآباد (۴۰) حی بن یقظان کی تالیف
ابن طفیل کا مقصد۔ ذوالفقار علی صدیقی علی گڑھ (۴۱) عربی زبان کی اہم کتابوں میں اقتصادی نظریے
[illegible] سرسوتی، کیمبرج (۴۲) جدید عربی ادب میں [illegible] کے متعلق [illegible]۔

لے۔ ال طباوی۔ المشر، انگلستان (۳۳) حسن قزوینی کے سفرنامہ کا ایک نادر مصور قلمی نسخہ۔ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی بمبئی (۳۴) قرآن میں اسلام اور ایمان کا تخیل۔ ام۔ اے رؤف کوالالمپور ملایا (۳۵) مرزا ابوطالب۔ ام۔ اے صدیقی علی گڑھ (۳۶) عرب اور راس امید۔ مقبول احمد علی گڑھ (۳۷) ملایا میں اسلام۔ ام۔ اے رؤف، کوالالمپور، ملایا۔

معارف کے ناظرین کی دلچسپی کے لیے اور دوسرے مقالے جو مختلف شعبوں میں پیش کیے گئے، ان کا سے کچھ یہ ہیں:

الف۔ (۱) مصر کی قومی پارٹی میں محمد فرید کی قیادت کا جائزہ، مصطفیٰ کامل، ہنولولو، ہوائی۔

(۲) مشرق قریب میں اطالوی فن تعمیرات: سباتینو موسکاتی، اٹلی۔

ب۔ ٹرکولوجی۔ (۱) ترک اور منگول سلاطین کے عہد کی نمائندگی، ایمل اسین، استنبول۔

(۲) عبد الکریم پاسنبس کی ایک تصنیف: فورمن اٹز کوویز، امریکہ (۳) اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز کا ایک عثمانی قانون نامہ: مصطفیٰ محمد، رومانیہ (۴) سترہویں صدی کی ترکی شاعری میں حافظ کے اثرات: نعیم الدین، ناگپور

ج۔ ایرانیات۔ ایرانیات کے مطالعہ میں تبدیلی کی ضرورت: سہراب ہاٹی والا، بمبئی۔

(۲) فارسی کی لوک کہانیوں میں درویش کا حصہ: ال، ای ایل ویل سٹن، اڈنبرا۔ (۳) اسلام سے پہلے کا ایران ابن خلدون کی نظر میں: والٹر جے فشل، برکلے، امریکہ (۴) بلوچی زبان کے جدید رجحانات علی اکبر جعفری طہران (۵) ہمایوں ایران میں: معصوم رضا کاظمی، پٹنہ (۶) ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۷ء کے درمیان ایران میں برطانیہ کی پالیسی: نکی آر کڈی کیمبرج (۷) تاجک اور فارسی زبانوں کی امتیازی خصوصیات: مینفرڈ لورنز، برلن (۸) اردو شاعری پر رومی کے اثرات: نعیم الدین ناگپور (۹) جدید فارسی میں افعال: ہربرٹ ایچ پیپر، امریکہ (۱۰) عمر خیام ایک فلسفی اور ماہر ریاضیات

کی حیثیت سے: ایچ. سی. پول اکر. شن نگر (۱۱) فارسی ادب میں شعر و شاعری کی تنقیدات: ضیاء الرحمٰن
علی گڑھ (۱۲) مشرقی روح کی بلندی: ایران کا ایک مطالعہ. میگل النزو روحبرد بیکیسکو
(۱۳) ہرات کے سوال پر برطانیہ اور ایران کے تعلقات: بی. ان. سنڈن، لکھنو (۱۴) کملان پر کچھ تاریخی روشنی
نذیر احمد. علی گڑھ (۱۵) ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے عہد کا ایک فارسی شاعر: سید حسن. پٹنہ.
(۱۶) فارسی زبان میں ہندوستان کا ادب العالیہ: ہیرالال چوپڑا، کلکتہ (۱۷) شیخ عراقی. ایک
صوفی شاعر کی حیثیت سے: دائی ڈی اہوجہ دہلی (۱۸) شمس تبریزی: بی. زیڈ. فاروسنفر، ایران
(۱۹) فارسی لغت: ام. میناوی، ایران (۲۰) ایرانی کھانے. لے. اچ زرین کوب ایران.

د. انڈولوجی (ہندوستانیات) (۱) دسویں صدی کے ایک ایرانی جغرافیہ نویس کی نظر میں
ہندوستان: بودھ پرکاش، چنڈی گڑھ (۲) پتانجلی یوگ سوتر اور البیرونی کا ترجمہ: لی گپ لم
اور اس پائنز. اسرائیل (۳) گجرات کے عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی کا پس منظر: سید اکبر علی ترمذی
نئی دہلی (۴) ماسٹر رام چندر: خواجہ احمد فاروقی، دہلی.

۵ جنوری کو ساڑھے چھ بجے شام کو مندوبین کی تفریح کے لیے ایک سنسکرت ڈرامہ اور رقص و سرود کا بھی سامان کیا گیا تھا، جن لوگوں کو اس سے دلچسپی تھی، وہ اس میں شریک ہوئے، ۸ جنوری کو چھ بجے شام کو "انسانیت کی فلاح میں علوم شرقی کا حصہ" کے عنوان پر ایک مذاکرہ تھا، ۹ جنوری کو "مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلیاں" پر بھی ایک مباحثہ تھا، جس میں (۱) مولانا سید احمد اکبر آبادی، علی گڑھ (۲) جناب سیف اللہ امین سفیر ترکی (۳) جناب احمد حسن الیکی سفیر متحدہ عرب جمہوریہ (۴) پروفیسر سید حسین نصر، ایران (۵) پروفیسر جے. ان. ڈی اینڈرسن (۶) میر اقبال حسین (۷) مولانا فضل الرحمٰن (۸) پروفیسر محمد جمیل خاں (۹) اور خواجہ محمد احمد نے حصہ لیا، مذاکرہ کی بحث سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں قرآن اور حدیث کی روشنی میں علماء ہی کے ذریعہ تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔

۱۰ جنوری کو ساڑھے ۱۲ بجے جناب ہمایوں کبیر صاحب کی طرف سے ایٹ ہوم کی دعوت تھی، پھر ڈھائی بجے سے پانچ بجے تک مختلف کمیٹیوں کی روداد یں پیش کی گئیں۔

کانگریس کی طرف سے اہم اور نادر مخطوطات کی نمائش بھی تھی، عربی میں حسب ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں:

(۱) کلام پاک کا آٹھویں صدی عیسوی کا ایک نسخہ، مخزونہ نیشنل میوزیم نئی دہلی (۲) مختصر الکافی الفقہ حنفی، مصنف ابو الفضل محمد بن محمد، کاتب احمد بن محمد بن احمد الدامغانی الانصاری ۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) مخزونہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدر آباد (۳) النکت والعیون (تفسیر) مصنف ابو الحسن علی ابن محمد بن حبیب البصری (۴۵۰ھ = ۱۰۵۸ء) کاتب جعفر بن علی بن ابی محمد۔ مخزونہ رضا لائبریری رامپور، (۴) معونۃ المعین المختصر من سیاست الدنیا والدین (سیاست اسلامی) مصنف یوسف بن محمد بن اسحٰق الخراسانی، مخزونہ سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد، اس پر شاہ یمن اور مغل امراء کی مہریں بھی ہیں (۵) کتاب الفصول (طب یونانی) مصنف موسیٰ عبد اللہ ۶۰۱ھ (۱۲۰۴ء) کاتب یوسف بن عبد اللہ مخزونہ رضا لائبریری، رامپور (۶) کتاب المختصر فی فنون من الصنائع (صنعت) مصنف محمد بن قوام بن صفی بن محمد ضیا ترک ناگوری عرف قاضی خان (۸۶۷ھ = ۱۴۶۳ء) مخزونہ اسٹیٹ سنٹرل لائبریری، حیدر آباد، (۷) فتاوی السیرانیہ (فتاوی) مصنف عبد الوہاب بن یزید بن ابی سعید السیرانی، مخزونہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد (۸) الاختصار والتجرید (حدیث) مصنف ابو عبد اللہ محمد بن عثمان بن عمر الشافعی، مخزونہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ۔

فارسی مخطوطات میں دیوان حافظ، گلستان، بوستان، دیوان شمس تبریزی، دول رانی خضر خاں (از امیر خسرو) آئین اکبری، شاہجہاں نامہ، بادشاہ نامہ، طب شفا محمود شاہی کے نادر نسخے تھے، مصور نسخوں میں انوار سہیلی، بابر نامہ اور تاریخ خاندان تیموریہ قابل ذکر ہیں، جن میں اکبری عہد اور جہانگیری عہد کے مصوروں کی تصویریں تھیں، ان مخطوطات میں تزک جہانگیری کا

وہ قلمی نسخہ بھی تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ خود جہانگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

دہلی میں انڈین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا ایک اہم ادارہ قائم ہوا ہے جس کے سرپرست اور روح رواں حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ ہیں، اس کی طرف سے بھی ایک نمائش تھی جس میں ان عمارتوں کا خاکہ دکھایا گیا تھا، جو اس ادارہ کے لیے آئندہ بننے والی ہیں، پھر بہت سے قلمی نسخے بھی خوبصورتی سے سجے ہوئے رکھے تھے، ان میں ترجمہ تفسیر طبری از ابو بکر محمد بن فضل الامام کا ایک قدیم نسخہ چوتھی صدی ہجری کا تھا، احیاء العلوم کا ایک نسخہ ۵۲۲ھ کا مخطوطہ تھا، لوائح جامی کے ایک قلمی نسخہ پر شاہجہاں اور اس کے جانشینوں کی شاہی مہریں تھیں، مرزا صائب کے شاگرد قاسم نامی کی رباعیوں کا ایک مجموعہ بہت ہی خوشخط لکھا ہوا تھا، ہری سکھ رائے بن جیون داس کی تاریخ مجموعۃ الاخبار کی تین جلدیں بھی تھیں، جس میں ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے حالات ہیں۔

اثاثۂ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب سید حسین بلگرامی

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی

۶ مئی ۱۹۲۳ء مطابق ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۴۱ھ

جناب مخدومی مکرمی زیدت معالیہ

عنایت نامہ پہنچا۔ نہایت مشکور و ممنون ہوا۔

کتاب العمدۃ فی الجراحات ضرور بھیجدیجئے۔ یا تو کتب خانہ کے نام بھیجئے یا خود بندہ کے نام روانہ کیجئے، غالباً خرید لیجائے گی، یا اس کی نقل بذریعہ کاتب کتب خانہ حاصل کر لیجائے گی۔

دائرۃ المعارف کی توسیع مدت گذری ہو چکی ہے۔ اور سر دست کوئی خدمت خالی نہیں ہے، بندہ کو سید ہاشم صاحب کا خود خیال ہے، کوئی موقع ملے گا تو ضرور ان کو اس رشتہ میں شامل کر لیا جائیگا، وہ بیچارے بالفعل جس کام پر ہیں وہ ان کی لیاقت سے بہت گرا ہوا ہے،

تفسیر ابی مسلم اصفہانی کا نسخہ پہنچ گیا۔ ندوہ[1] نے اسے چھاپکر بڑا احسان کیا ہے، کتاب قابل قدر ہے، میں مطالعہ کر رہا ہوں۔

"یومنون بالغیب" کی تاویل سے آپ متفق ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ معنی کیونکر قبول کیے جائیں'

---

[1] معارف۔ ندوہ سے یہاں مراد دار المصنفین ہے۔

آپ کے دار المصنفین کو کسی کی سند کی ضرورت نہیں ہے، خصوصاً ایسے نا اہل کی جیسا کہ راقم الحروف ہے، دار المصنفین ایسا کام انجام دے رہا ہے جو آج تک ہندوستان میں کبھی شروع تک نہیں ہوا، خود معارف اس کا بین ثبوت ہے۔

میری حالت بہت زار ہے، آنکھوں میں بصارت ضعیف ہے، اور پاؤں کے درد کے مارے چل پھر نہیں سکتا، کتاب بینی برائے نام رہ گئی ہے، اس کا مقتضی بھی یہی ہے، میرا سن اب اسی برس کا ہے،

ع دانم کہ چند رفت و ندانم کہ چند ماند

تفسیر الیٰ مسلم میں آپ کا دیباچہ کس قدر عمدہ ہے۔

دیگر لطف عالی زیادہ باد

بندہ

سید حسین بلگرامی

۱۶ر جولائی ۲۳ء

جناب من

مرحمت نامہ مورخہ ۱۱ر جولائی کل صبح کے وقت وصول ہوا، باعث مسرت و امتنان ہوا، دیوان انوری اور رقعات اورنگ زیب شائع ہو جائیں گے تو قدرداں لوگ بہت قدر کریں گے، تفسیر الیٰ مسلم میں "یومنون بالغیب" کی تفسیر کے نسبت جناب کی کیا رائے ہے۔

میرے کتب خانہ کا زیادہ حصہ فروخت ہو گیا، باقی ماندہ بھی فروخت ہو جائے گا۔ انشاء اللہ بوقت فرصت بشرط صحت مزاج کچھ کتابیں انتخاب کر کے دار المصنفین کی نذر کروں گا۔ فی الحال بندہ بالکل معذور ہے،

زیادہ لطف عالی زیادہ باد

بندہ

سید حسین بلگرامی

مکرر عرض ہے

کہ کس کی فارسی کتاب کس عہد کی اور کس کی تصنیف ہے، اور کس ملک میں تصنیف ہوئی،

اس کی قدر و قیمت اس کی قدامت پر موقوف ہے۔

۱۰ر اگست ۲۲ء

جناب مخدومی مکرمی زیدت معالیہ و بورکت ایامہ و لیالیہ

آپ کے عنایت نامہ کے جواب میں تاخیر ہوئی، معاف فرمائیے۔ بندہ کا مزاج مدت سے کسلمند ہے،

میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ سرکاری طور پر اس وقت تک دارالمصنفین کے رقم امداد کے بند

کرنے کا کوئی حکم یا تجویز نہیں ہے۔ مگر عام طور پر لوگوں کے زبانی یہی خبر سننے میں آئی کہ اعانت بند کردی گئی

ہے۔ انشاء اللہ پھر دریافت کرکے مطلع کروں گا۔

البتہ اس قدر معلوم ہوا کہ معارف کے مداخلت سیاسی امور میں خصوصاً مخالفانہ[۱] خیالات ہماری

سرکار کو ناپسند ہیں، ممکن ہے کہ اس سے دارالمصنفین کو ضرر پہنچے۔

میری حقیر رائے یہ ہے کہ معارف کو سیاسیات سے بالکل احتراز کرنا چاہیے۔ ایسے معاملات میں

مداخلت کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ انجام اس کا سخت مضر[۲] ہوگا۔ فقط

عقیدتمند

سید حسین بلگرامی عماد الملک

۱۴ر اپریل ۲۵ء ۱۷ر رمضان المبارک

جناب مخدومی مکرمی زیدت معالیہ و بورکت ایامہ و لیالیہ۔

عنایت نامہ پہنچا، باعث سرفرازی و مسرت ہوا، ابن رشد[۳] کا نسخہ بھی پہنچ گیا، اور اب

۱؎ معارف: یعنی انگریزی حکومت کے خلاف ۔ ۲؎ معارف: یہ مشورہ قبول نہیں کیا گیا جس پر اس زمانہ کے شذرات شاہد ہیں،

۳؎ معارف: مولانا محمد یونس مرحوم فرنگی محلی کی تصنیف جو دارالمصنفین سے شائع ہوئی تھی،

احتیاطاً جلد کراکے رکھتے ہیں، انشاء اللہ اگر ممکن ہوا تو کتاب کا مطالعہ کروں گا، اپنے قسم کی یہ پہلی کتاب اردو زبان میں تالیف ہوئی ہے،

مجھ غریب کی حالت کچھ ایسی ہے کہ کسی کتاب کا من اولہ الی آخرہ مطالعہ کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

بصارت میں بہت ضعف آگیا ہے، اور حافظہ رخصت ہوگیا ہے، "پیری و ہزار عیب و تنگیری" کا مصداق ہوں،

آپ اگر یہاں تشریف لائیں گے تو حیدرآباد کو ایک نیا شرف حاصل ہوگا اور مجھکو بڑی مسرت ہوگی،

شبیر حسین صاحب جوش یہاں ہیں، اور چند بار مجھ سے ملے ہیں، آجکل ایک نئی کتاب لکھ رہے ہیں،

جس کو ہماری سرکار میں پیش کریں گے۔ زیادہ التماس دعائے خیر کا

رقیمہ بندہ درگاہ

سید حسین بلگرامی عماد الملک

گرینڈ ہوٹل، انگلینڈ نیلگری

۸ رمئی ۱۹۲۳ء / ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۴۱ھ

جناب مکرمی محترمی زیدت معالیہ و بورکت ایامہ ولیالیہ

مبارک ہو، بڑی خوشی کی بات ہے کہ آخر کار ہمارے خداوند نعمت نے ندوہ کالج کی قدر فرمائی، اور تین سو روپیہ ماہانہ سے اس کی امداد فرمائی،

بندہ تو حسب معمول اوائل ماہ اپریل سے یہاں اس پہاڑی مقام میں مقیم ہے، یہ بہت سرد جگہ ہے، میں نہیں عرض کرسکتا کہ مجھکو یہاں آنے سے کتنا فائدہ ہوا، کیونکہ سخت گرمی سے ایسے سرد ملک میں آنا جہاں اکثر آتش خانہ روشن کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، چند فائدہ محسوس ہونا مشکل ہے، علاوہ اسکے بقول "پیری و ہزار عیب و تنگیری" اسی برس کے سن میں کامل صحت کا قائم رکھنا دشوار ہے، جس روز سے جولائی ۱۹۲۲ء میں مقام لندن میں بندہ پر حادثہ عظیم گذرا، جس سے

میرا بایاں پاؤں ٹوٹ گیا۔ اس وجہ سے میں بالکل معذور ہوں، نقل وحرکت دشوار ہے، کہیں آنا جانا محال ہے،

مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر جناب بندہ کو مطلع فرمائیں کہ ندوہ کالج میں کون کون کتابیں درس میں ہیں، کونسے علوم وفنون کی تعلیم ہوتی ہے،

حیدرآباد واپس جانے پر انشاء اللہ پوری کیفیت بارگاہ خسروی میں پیش کروں گا تاکہ حقیقت حال معلوم ہو۔ اور بندہ نے جو کچھ عرض کیا تھا، اس کی تصدیق ہوجائے۔ فقط

دیگر لطف دعاے زیادہ باد

بندۂ کمترین

سید حسین بلگرامی

مکاتیب شبلی حصہ اول و دوم

مولانا مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ، جس میں مولانا کے قومی خیالات اور علمی، تعلیمی اور ادبی نکات ہیں، یہ درحقیقت مسلمانوں کی تیس برس کی تاریخ ہے،

ضخامت: ۲۰۱ صفحے۔ قیمت: حصہ اول للعہ حصہ دوم عہ

انتخابات شبلی

مولانا شبلی کی شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح اور عیب و ہنر اور شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے، صفحات ۲۲۴ قیمت ۱۲ عہ

منیجر

ادبیات

بیتابیِ شوق

زائرِ حرم، حمید صدیقی لکھنوی

سوئے حرم اہلِ سفر لے چلو
کب سے ہوں میں خاک بسر لے چلو

سوزشِ دل، دیدۂ تر لے چلو
ساتھ یہی رختِ سفر لے چلو

دوریٔ طیبہ سے ہے مضطر حمید
دھن ہے یہی شام و سحر "لے چلو"

نذر کروں تم کو میں حج کا ثواب
کوچۂ طیبہ میں اگر لے چلو

لے تو چلو آگے ہمارا نصیب
جو بھی گذر جائے گذر لے چلو

پھر مری منزل مجھے مل جائے گی
پہلے سرِ راہ گذر لے چلو

قبلۂ دل، سجدہ گہِ عاشقاں
کعبۂ کعبہ ہے جدھر لے چلو

ہوتی ہے جس کوچے میں تکمیلِ حج
کاش مجھے پہلے ادھر لے چلو

گردِ رہِ شوق ہی سمجھو مجھے
منزلِ طیبہ پہ مگر لے چلو

ان کی عنایت ہے تو باقی یہ عمر
طیبہ میں اب ہوگی بسر لے چلو

کیفِ حضوری کے لیے شرط ہے
خستگیٔ درد و اثر لے چلو

حسنِ حقیقت کی جسے تاب ہو
وہ نگہِ جلوہ نگر لے چلو

مہرِ رسالت ہے جہاں ضو فگن — اب یہ وہیں دامنِ تر لے چلو

اور تو کیا ہے پئے نذرِ حبیب — اشکِ ندامت کے گہر لے چلو

جلوے ہی جلوے ہیں وہاں ہر طرف — وسعتِ دامانِ نظر لے چلو

ان کے حضور آرزوئے دلِ حمید

ایک بعنوانِ دگر لے چلو

غزل

از جناب مرزا سعید الظفر چغتائی دریابادی ایم ایس سی

تصورات کا ہر گوشہ جگمگایا ہے — یہ کون آج خیالوں میں میرے آیا ہے

شبِ فراق کا احساس تک نہیں باقی — سحر کا نور ضمیرِ جنوں پہ چھایا ہے

دہکتی آگ تمنا کی ہو گئی گلزار — مرا حبیب مرے دل میں مسکرایا ہے

ہے ایک موجِ تبسم حیات در آغوش — جو اس نے حسنِ تصور کو گدگدایا ہے

کہیں کرشن نے چھیڑی ہو تان بنسی کی — کہیں یہ حافظِ شیراز گنگنایا ہے

مرے وجود کا ہر ریشہ برگِ گل کی طرح — نسیمِ صبح کا نم پا کے رسمسایا ہے

نیا چراغ جلا آرزو کی محفل میں

حریمِ ناز کا ہر تار جھلملایا ہے

مطبوعات جدیدہ

روزگار فقیر: از فقیر الدین صاحب، صفحات ۲۰۰، کتابت و طباعت اعلیٰ معیاری،

قیمت عہ

علامہ اقبال کی وفات سے لیکر ابتک ان کی زندگی اور علم و فضل اور شاعری پر بیشمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان کی زندگی، شاعری اور علم و فضل کا کوئی گوشہ مشکل ہی سے بچا ہوگا، جس پر پوری پوری کتاب نہ لکھی گئی ہو، روزگار فقیر اقبالیات میں ایک نیا اضافہ ہے، اور واقعی وہ ہر لحاظ سے نیا ہے، یہ کتاب نہ تو علامہ اقبال کی سوانح عمری ہی ہے، اور نہ ان کے علم و فضل اور فلسفہ و شاعری کا تذکرہ ہے، بلکہ یہ ذاتی ڈائری ہے جس کا موضوع ہے اقبال بحیثیت انسان اور محب رسول۔

سید فقیر الدین صاحب کے والد اور انکے خاندان سے علامہ اقبال کے برسوں گھریلو تعلقات رہ چکے ہیں، مرتب بچپن ہی سے علامہ کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور ان کی گفتگوئیں سنتے رہے ہیں، اور ان کو انھوں نے جلوت و خلوت، دونوں میں بہت قریب سے دیکھا ہے، اس لیے اس میں انھوں نے علامہ اقبال کی جو گھریلو اور نجی مجلسوں کی گفتگوئیں کو نقل کیا ہے، وہ شنیدہ سے زیادہ دیدہ ہیں، یہ گو ایک شخص کی ذاتی ڈائری ہے، مگر علامہ اقبال کی آفاقیت نے اسے بھی آفاقیت بخش دی ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے علامہ اقبال کی زندگی کے بعض ایسے گوشے سامنے آجاتے ہیں جو اس سے پہلے کم ہی لوگوں کے علم میں تھے، اس میں کوئی تحقیقی ترتیب نہیں ہے مگر کتاب اتنی سنجیدہ، شگفتہ اور پرلطف ہے کہ ایک ہی مجلس میں ختم کرنے کو جی چاہتا ہے، کتاب کی طباعت و کتابت معیاری اور ذاتی کتب خانہ میں رکھنے کے قابل ہے، اس لائق

ساڑھے سات روپے اس کی قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے۔

فن تعمیر: از ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی صاحب، ضخامت ۲۰۰ صفحات، ٹائپ عمدہ، ناشر ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ، اردو بازار لاہور، قیمت [illegible]

ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی صاحب ایک معمار خاندان کے فرد ہیں، اور ایک مدت سے وہ اس موضوع پر جو تحقیقی مواد پیش کر رہے ہیں اس سے اہل علم واقف ہیں، اس موضوع پر ان کی متعدد کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں، زیر تبصرہ کتاب دنیا کے فن تعمیر کی ایک مختصر تاریخ ہے، اس میں انھوں نے قدیم مصری، یونانی، رومی اور ہندی تعمیروں کی خصوصیات سے لیکر موجودہ عہد تک کی تعمیری خصوصیات اور ان پر گفتگو کی ہے، خاص طور پر مغل فن تعمیر جس پر وہ سند ہیں، زیادہ تفصیل سے لکھا ہے، دنیا کی تمام اہم تعمیرات کے تذکرے کے ساتھ ان کی تصویریں بھی دیدی ہیں، جن سے یہ کتاب فن تعمیر کا مرقع بن گئی ہے، تاریخی کام کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ بیحد مفید ہوگا۔

اسلامی قانون کی تدوین - از مولانا امین احسن صاحب اصلاحی، صفحات ۲۰۰، کتابت و طباعت بہتر، مع گرد پوش، ناشر مکتبہ المنبر لائل پور، قیمت [illegible]

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے مختلف علمی مجلسوں میں اس موضوع پر مختلف لکچرز دیے تھے، جس کا کچھ حصہ مضمون کی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے، انہی کو مکتبۂ المنبر نے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ مولانا نے اس میں اسلامی قانون، اسلامی قانون کے مآخذ، اسلامی قانون کا ارتقاء، اسلامی قانون کی تدوین اور اجتہاد وغیرہ مسائل پر بحث کی ہے، اسی کے ساتھ اس کے نفاذ کے طریقے اور موانع پر بھی گفتگو کی ہے، اس سلسلہ میں تعلیم یافتہ ذہنوں میں جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں ان کا عقلی و الزامی دونوں حیثیتوں سے جواب بھی دیا ہے، غرض یہ کہ مولانا نے اس پوری کتاب میں اپنے ذوق کے مطابق اسلامی قانون کی بڑی اچھی نمائندگی کی ہے۔

اسلامی قانون کے ماخذ کے ضمن میں مولانا نے جو معروف اور مصلحت کا ذکر فرمایا ہے، اس میں بنیادی ماخذ اور ضمنی ماخذ کے فرق کو ملحوظ رکھنا چاہئے تھا، اگر مولانا کے نزدیک اجماع اجتہاد ہی کی ایک شکل ہے تو یہ دونوں خالص اجتہادی ماخذ ہیں، ان کو بالذات ماخذ بنانے میں بہت سے فتنوں کا اندیشہ ہے، جس کا اظہار فقہا نے ان کے ذکر میں کر بھی دیا ہے، یہ ایک فنی کتاب ہے اس لیے اسے اسی انداز میں لکھنا زیادہ موزوں تھا، یہ موضوع اصول فقہ کا ہے جس پر متقدمین نے مفروغ عنہا کام کر دیا ہے اس لیے جابجا ان کی رایوں کا ذکر آنا چاہئے تھا، تاکہ یہ تاثرات اور ذوقیات کی قسم کی چیز نہ بن جاتی، کتاب متوسط پڑھے لکھے لوگوں کے بار بار مطالعہ کے لائق ہے۔

مکاتیب یورپ ۔ از مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی، ضخامت ۹۴ صفحے، کتابت و طباعت متوسط، ناشر مکتبہ اسلام گوئن روڈ، لکھنؤ، قیمت عمر

یورپ کے بیشتر ملکوں میں مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے، اور مختلف اسلامی ملکوں سے ہزاروں طلبہ ہر سال ان ملکوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں، اور وہاں جا کر اکثر اسلامی روایات کو بھول جاتے ہیں، بلکہ بسا اوقات مناسب ذہنی و عملی تربیت نہ ملنے کی وجہ سے اسلامی تعلیمات سے باغی ہو جاتے ہیں، اور بھی اپنے وطن میں واپس جا کر فاسد جراثیم دوسرے ذہنوں میں ڈالتے ہیں، جناب شیخ سعید رمضان صاحب جو اسلامی دردمندی کے جرم میں مصر بدر ہو کر جنیوا میں مقیم ہیں، انھوں نے یورپ میں رہنے والے طلبہ کی فکری و عملی راہنمائی اور اسلامی تربیت کے لیے جنیوا میں ایک اسلامی سنٹر قائم کیا ہے جس کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے ایک ممبر مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی بھی ہیں، مولانا اسی بورڈ کی مجلس میں شرکت کے لیے جنیوا تشریف لے گئے تھے، اور اس ضمن میں انھوں نے یورپ کے بعض اور ملکوں مثلاً فرانس، انگلستان اور اندلس وغیرہ کا دورہ بھی کیا، وہاں سے مولانا نے اپنے عزیزوں اور تلامذہ کو جو خطوط لکھے ہیں، انکو مکتبہ اسلام لکھنؤ نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، یہ مختصر

ذاتی علمی و دینی تھا، اس لیے ان خطوط میں بھی اس کی پوری جھلک موجود ہے، یہ خطوط خاص طور پر دعوت دین کا کام کرنے والوں کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

اقلیت و اکثریت کے مسائل۔ از مولانا احمد الرحمٰن صاحب رحمانی جہانگیری، صفحات ۹۰ کتابت و طباعت بہتر، پتہ قاضی مبارک اللہ، بڑھنی بازار، راہت گنج بستی۔ قیمت عہ

کتاب کے نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اقلیت و اکثریت کے ان مسائل کا ذکر ہوگا، جو آج کل پریشان کن ثابت ہو رہے ہیں، اور ان کا تفصیلی تذکرہ کرکے ان کے حل کی کچھ سیاسی اور عقلی بنیادیں فراہم کی گئی ہوں گی، مگر ایسا نہیں ہے، بلکہ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے، کہ اقلیت و اکثریت کا تصور سرے سے غلط ہے، غلبہ و تسلط کا تعلق دوسرے عوامل سے ہے، پھر مسلمانوں کے دورِ حکومت کے ایسے بہت سے تاریخی واقعات نقل کیے گئے ہیں، جن سے ان کی محکوم نوازی اور مذہبی و تہذیبی آزادی کا پتہ چلتا ہے، اس لحاظ سے کتاب مطالعہ کے لائق ہے۔

...اور ہندوستان جاگ اٹھا۔ از عبد القوی دسنوی صفحات ۱۰۰، کتابت و طباعت بہتر ین، پتہ شعبہ اردو سیفیہ کالج بھوپال، قیمت درج نہیں۔

نومبر ۱۹۶۲ء میں چین نے ہندوستان کی شمالی مشرقی اور مغربی شمالی دونوں سرحدوں پر جارحانہ کارروائیاں شروع کردیں اور ایک ماہ کے اندر اندر اس نے ہزاروں میل زمین پر قبضہ کرلینے کی کوشش کی، اس جارحانہ کارروائی سے ملک کی سالمیت کو خطرہ پیدا ہوگیا، جس سے یہاں کا بچہ بچہ متاثر ہوا، چنانچہ اردو شعراء بھی اس سے متاثر ہوئے اور انھوں نے پچھلی روایات کے مطابق ایسی ایسی پر جوش اور موثر رزمیہ نظمیں کہیں کہ اگر وہ نظمیں اردو نہ سمجھنے والے فوجیوں کے سامنے بھی پورے انداز رجز کے ساتھ پڑھ دی جائیں تو ان کا جوش دوبالا ہوجائیگا، اس میں ہر خطہ اور صوبہ کے شعراء نے حصہ لیا ہے، انھی مختلف نظموں کو عبد القوی صاحب دسنوی نے "...اور ہندوستان جاگ اٹھا" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع کردیا ہے۔

ع ۔ م
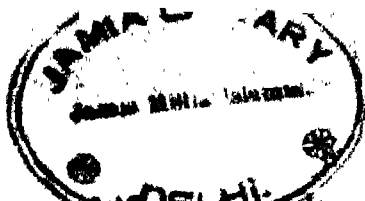
جلد ۹۳۔ ماہ شوال المکرم ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۴ء۔ عدد ۳

مضامین

شذرات

ہندوستان کے مسلمان جن مشکلات میں مبتلا ہیں اور ان پر جو کچھ گذر رہی ہے اگر وہ غور کریں تو اس میں ان کے لیے بڑا سامانِ عبرت ہے، اس سنت الٰہی کا قرآن مجید میں بتکرار اعلان کیا گیا ہے کہ جو قومیں احکام الٰہی سے سرتابی کرتی ہیں اور تنبیہ کے بعد بھی اس سے باز نہیں آتیں تو آخرت کے عذاب کے علاوہ ان کو دنیا میں بھی مختلف شکلوں میں اس کی سزا ملتی ہے، ان قوموں کے عبرت آموز واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں، یہودیوں کی تو قریب قریب پوری تاریخ موجود ہے، ان کی مسلسل سرکشی کی سزا میں ان پر جابر قوموں کو مسلط کر دیا گیا جنھوں نے ان کو حکومت اور سلطنت سے محروم اور غلام بنا کر ساری دنیا میں منتشر کر دیا، ان کا قبلہ چھین کر ان کا معبد اعظم تک مسمار کر دیا، اگر "بحبل من الناس" یعنی امریکہ اور برطانیہ کا سہارا نہ ہوتا تو آج بھی اس کا کوئی مرکز نہ ہوتا،

کیا مسلمانوں کی حالت ان قوموں سے مختلف ہے؟ ان کو مذہب سے برائے نام تعلق رہ گیا ہے، عمل کے لحاظ سے ان میں اور غیر مسلموں میں بہت کم فرق ہے، دینی اعمال و اخلاق کے ساتھ قومی وحدت و تنظیم، ہمدردی و مواسات، ایثار و قربانی، سعی و عمل، سادگی و جفاکشی، عزم و استقلال، جرأت و حوصلہ مندی وہ سارے اوصاف بھی ان سے رخصت ہو گئے ہیں جن پر قوموں کی زندگی اور ان کے استحکام کا دارومدار ہے، کیونکہ یہ اوصاف کسی بڑے مقصد اور نصب العین کے تابع ہوتے ہیں، مسلمانوں کا نصب العین رضائے الٰہی اور اسلام کی شوکت و سربلندی تھی، یہی جذبہ ان میں حوصلہ مندی، بلند نظری اور ایثار و قربانی کا

ولولہ پیدا کرتا تھا، اس لیے یہ جذبہ ختم ہونے کے بعد ان کے یہ اوصاف بھی ختم ہوگئے، اور دین کے ساتھ ان سے دنیا بھی رخصت ہوگئی، موجودہ حالات ان کے لیے تنبیہ کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے ابھی موقع ہاتھ سے نہیں گیا ہے،

گو مسلمانوں کے دلوں سے ایمان کا شعلہ بجھ چکا ہے لیکن ابھی اس کی حرارت باقی ہے، اس کے ذریعہ ان میں دوبارہ دینی روح پیدا ہو سکتی ہے، اب ہندوستان میں ان کے لیے صحیح اسلامی زندگی کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ نہیں، جب تک ان میں مبلغوں کی اسپرٹ، مجاہدوں کا جوش و جذبہ اور صوفیوں کا اخلاق نہ پیدا ہوگا، ان کے لیے باعزت زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہے، اسلامی اعمال و اخلاق ہی سے ان میں زندگی کی قوت بھی پیدا ہوگی اور دوسرے بھی ان سے متاثر ہوں گے، اس لیے ان کی موجودہ مشکلات کا علاج بھی یہی ہے، مسلمانوں کو موجودہ حالات سے گھبرا کر ہمت نہ ہارنا چاہیے، انکو ہندوستان ہی میں رہنا ہے، اور پکا مسلمان اور سچا وطن دوست بنکر رہنا ہے، اور ان دونوں کے حقوق ادا کرنا ہیں، دین سے بیگانگی نے ان کو "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق بنا دیا ہے ورنہ ان کا اصلی مقام تو ہندوستان کی رہنمائی اور اس کی اصلاح تھی، ایک زمانہ میں اسلام ان کو بہت کچھ دے چکا ہے، اور اب بھی دے سکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کا مسلمان اب خود اس دولت سے تہی دامن ہو چکا ہے، ورنہ آج اس کی پوزیشن دوسری ہوتی۔

پست ہمتی اور فرار کی ذہنیت قوموں کے لیے موت ہے، مسلمانوں کے سامنے تو حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا اسوۂ حسنہ موجود ہے، قسطنطنیہ پر پہلی فوج کشی میں وہ مجاہدانہ شریک تھے، وہ وہاں محاصرہ میں ان کا انتقال ہو گیا، موت سے پہلے وصیت کی کہ میری لاش کو جہاں تک دشمن کی سرزمین میں لیجا کر دفن کر سکیں کریں، چنانچہ مسلمانوں نے تیر و تفنگ کی بارش میں قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے لیجا کر دفن کیا، اس واقعہ کو دیکھ کر ایک طرف رومی متحیر ہو گئے، دوسری طرف مسلمانوں میں مدفن ایوبی پر قبضہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوگیا،

اور ایک دن وہ آیا کہ سینٹ صوفیا پر اسلامی جھنڈا لہرا رہا تھا، ایسی حالت میں مسلمانوں کیلئے فرار کی ذہنیت اور جیتے جی
اپنے محبوب وطن کو چھوڑنے یا عارضی حالات سے بد دل ہونے کا جذبہ کس قدر بزدلانہ ہے، ہندوستان کی سرزمین کو اندلس نہیں بنانا ہے
جو مسلمان حالات سے گھبرا کر ترک وطن کا تصور ذہن میں لاتے ہیں وہ درحقیقت ہندوستان سے اسلام کا نام
مٹانے کے مجرم ہیں، اور جو لوگ مسلمانوں کو جلاوطن کرنا چاہتے ہیں وہ محض تخیل کی دنیا میں رہتے ہیں، مسلمانوں کو مسلمان
بنکر ہندوستان میں رہنا ہے، اور اسلام کی برکتوں کو یہاں پھیلانا ہے، قوموں کی موت و حیات دوسروں کے نہیں
بلکہ خود ان کے اختیار میں ہوتی ہے، آج کی دنیا میں کوئی قوت چھوٹی سے چھوٹی قوم کو بھی نہیں مٹا سکتی، مسلمانوں کی تعداد
تو اب بھی ہندوستان میں پانچ کروڑ سے زیادہ ہے جو ایک بڑی طاقتور قوم کے برابر ہے، اگر ان میں سے چند لاکھ مسلمان
بھی ہندوستان میں باعزت زندگی کا عزم بالجزم کرلیں تو کوئی قوت بھی ان کو اس سے محروم نہیں کر سکتی، مگر ان میں
جان دین ہی سے آسکتی ہے، ہندوستان تو ایک جمہوری اور سیکولر ملک ہے، اس لیے موجودہ حالات کتنے
ہی مخالف سہی لیکن ایک نہ ایک دن یا وہ صحیح معنوں میں جمہوری اور سیکولر بنے گا اور اقلیتوں کو ان کے حقوق
ملیں گے یا پھر خود ہندوستان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔

مسلمانوں کے ایک روزانہ انگریزی اخبار کی تحریک بارہا ہو چکی ہے، موجودہ حالات نے اس کی ضرورت
اور بھی واضح کردی ہے، اس کے بغیر ان کی آواز حکومت کے کانوں تک بھی نہیں پہنچتی، اور ان کے مخالف پریس کی
آواز پورے ہندوستان میں گونج جاتی ہے، جو ہمیشہ واقعات کی غلط تصویر دکھاتے ہیں، مسلمانوں میں سب سے بڑی خرابی
یہی ہے کہ وقتی جوش میں آکر وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں، لیکن عام حالات میں ضروری کاموں کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے
انھوں نے جبلپور اور کلکتہ کے مظلومین کی امداد کے لیے جتنا روپیہ صرف کیا ہے (یہ بھی ایک ضروری کام تھا) اتنی رقم سے ایک
روزانہ اخبار آسانی سے نکل سکتا تھا، اس کے بغیر ان کی آواز کا کوئی اثر نہ ہوگا، پریس ہی کی قوت سے حکومت مسلمانوں کی آواز
سننے پر مجبور ہوگی، اس لیے اخبار کا اجرا مسلمانوں کی ایسی ناگزیر ضرورت ہے، جس کو ہر حال میں پورا کرنا ہے۔

مقالات

اسلامی رصدخانے

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، جسٹرار امتحانات عربی و فارسی، اتر پردیش

(۳)

امونی رصدگاہ کی دریافتیں | رصدگاہ مامونی کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے اپنے موقر مقالہ "اسلامی رصد خانے" میں فرمایا تھا:۔

سب سے پہلا اسلامی رصد خانہ جیسا کہ عام طور سے معلوم ہے، رصد امونی ہے۔

رصد مامونی بغداد

مامون جب تخت نشین ہوا اور تمام دنیا کے اہل کمال سمٹ کر بغداد میں آگئے اور بطلیموس کی مجسطی کا ترجمہ ہوا تو مامون نے اس رصد خانے کے بنانے کا حکم دیا، بغداد کے قریب ایک جگہ شماسیہ وہاں کی زمین اس رصد خانے کے لیے منتخب کی گئی اور ۲۱۴ھ میں یہ رصد خانہ بنکر تیار ہوا، لیکن ۲۱۸ھ میں مامون کا انتقال ہو گیا اس کا جانشین معتصم ایک سپاہی آدمی تھا۔ اس لیے یہاں کی تحقیقات کا سلسلہ صرف چند سالوں تک جاری رہ سکا۔ یحییٰ بن ابی منصور اس رصد خانے کا افسر تھا جس کے ماتحت عباس بن سعید جوہری، سند بن علی، حبش، یحییٰ، عبد اللہ مروزی، محمد بن موسیٰ وغیرہ کام کرتے تھے۔ اس رصد خانے میں ان لوگوں نے جو تحقیقات کیں وہ زیج مامونی کے نام سے چند کتابوں میں جمع کر دی گئیں۔

ان میں سے چند مسائل یہ ہیں :-

(۱) معدل اور منطقۃ البروج کے تقاطع سے جو زاویہ پیدا ہوتا ہے اس کو اوجاج منطقۃ البروج کہتے ہیں، اس رصد خانے میں اوجاج منطقۃ البروج تیئیس درجہ پینتیس دقیقہ اور باون ثانیہ دریافت کیا گیا تھا جو موجودہ تحقیقات کے بالکل قریب ہے، موجودہ تحقیقات کی رو سے یہ زاویہ تیئیس درجہ ستائیس دقیقہ ہے۔

(۲) وہ دو نقطے جہاں معدل النہار اور منطقۃ البروج کا تقاطع ہوتا ہے، نقطۂ اعتدال کہلاتے ہیں، نقطۂ اعتدال کی تحقیق سے شمسی سال کے دنوں کی تعداد نہایت صحت کے ساتھ دریافت کی گئی۔

(۳) نقطۂ اعتدال کی نسبت اگرچہ یہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ہر سال پچاس ثانیہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس حرکت کا نام استقبال اعتدالین ہے، اس رصد خانے میں استقبال اعتدالین بھی دریافت کیا گیا تھا۔

(۴) آفتاب کے مقامات اوج اور مقدار میل وخروج مرکز کی بھی تحقیق کی گئی۔

(۵) ثوابت اور سیاروں کے بعض حالات بھی یہاں دریافت ہوئے۔

رصد مامونی دمشق

تحقیقات رصدیہ کی مزید تحقیق کے لیے عموماً مختلف مقامات پر چند رصد خانے بنائے جاتے ہیں، تاکہ اگر کل رصد خانوں کا کسی ایک تحقیق پر اتفاق ہو جائے تو وہ مسئلہ بالکل صحیح تسلیم کر لیا جائے لہٰذا بغداد کے رصد خانے کی تصحیح کے لیے دمشق میں کوہ قاسیون کے دامن میں بھی مامون نے ایک رصد خانہ بنوایا تھا، غالباً اس کی سنہ تعمیر بھی بغداد کے رصد خانے کے موافق ہوگا۔" (ماخوذ از رسالہ الندوہ، مارچ [illegible])

غالباً یہ جائزہ قاضی صاعد اندلسی کی طبقات الامم سے ماخوذ ہے جس میں اس کی تفصیل وغیرہ [illegible] ان ہیئتی سرگرمیوں کی تفصیل ابن یونس نے "زیج حاکمی" میں دی ہے جس کا مطالعہ [illegible] وغیرہ وغیرہ کا ذخیرہ سے حاصل شدہ معلومات کے ساتھ ذیل میں دیا جا رہا ہے :-

میل کلی، میل کلی یا میل اعظم کی تعریف جسے یہ ساحب "العرجات منطقة البروج" سے تعبیر کیا ہو، جو البیرونی نے قانون مسعودی میں دی ہے، چنانچہ مقالہ دہم کے باب اول کا عنوان یہی ہے:-

"مقدار زاویة تقاطع معدل النهار مع منطقة البروج وهو الميل الاعظم"[1]

دوسری تعریف متاخرین کی ہے، جس کی رو سے دائرہ مارہ با قطاب اربعہ کی وہ قوس جو معدل النہار اور منطقة البروج کے مابین ہوتی ہے میل کلی کہلاتی ہے، اسی کی دریافت کی طرف قاضی صاعد نے "مقدار میلها" سے اشارہ کیا ہے، بہرحال قاضی زادہ نے شرح چغمنی میں اس تعریف میں لکھا ہے:-

"وغاية الميل ويقال لها الميل الكلي ..... والميل الاعظم لكونها اعظم من غيرها قوس بينهما اى بين المعدل ودائرة البروج من الدائرة المارة باقطاب الاربعة فانها هي المارة بالانقلاب" (Solstice)

اسی طرح "تصریح" میں ہے:-

"وتقطع المارة (دائرة المارة باقطاب الاربعة) الثانية (منطقة البروج على الانقلابين (الانقلاب الصيفي والانقلاب الشتوي)...... واقصر قوس منها (من الدائرة المارة باقطاب الاربعة) بينهما (بين منطقة البروج ومعدل النهار) اوبين قطبيهما هو الميل الكلي"

"میل کلی" کی مقدار حسب تصریح البیرونی قدیم ہند و جوتشیوں کے نزدیک متفقہ طور پر ۲۴ درجے تھی۔

"فاما مقدار هذا الميل الذى بقدر الزاوية الحادثة من تقاطع معدل النهار ومنطقة البروج فاتفقت فرق الهندية على انه اربع وعشرون جزءا"[2]

البیرونی لکھتا ہے کہ قدیم یونانی ہیئت داں (مثلاً بطلیموس) بھی اسے ۲۴ درجے مانتے تھے، چنانچہ

---

[1] قانون مسعودی جلد دوم ص ۳۹۰ [2] ایضاً ص ۳۶۲

ابن ابی الحجاج تیمی "حل شکوک اصول اقلیدس" میں لکھتا ہے کہ اسی مقدار کی بنا پر اقلیدس نے کتاب الاصول کے چوتھے مقالہ (شکل گیارہ) میں دائرہ کے اندر شکل مخمس بنانے کا عمل لکھا تھا۔[۱]

لیکن بطلیموس اور اس کے پیشروؤں ایراتوستھینس (اراطیسانس) اور ابرخس (Hipparchus) کے نزدیک یہ ۲۳°-۵۱'-۲۰" تھی۔[۲]

رصدگاہ ماموی میں میل کلی کو دریافت کیا گیا۔ حسب تصریح عمر بن محمود الجغمینی و قاضی زادہ رومی ۲۳ درجے ۳۵ دقیقے تھی،

"غایۃ میل دائرۃ البروج عن معدل النہار وسقدارھا کج لہ الی ثلث وعشرون جزأ وخمس وثلثون دقیقۃ علی ما وجد بارصاد المامون"[۳]

مگر البیرونی نے لکھا ہے کہ یحییٰ بن ابی منصور نے شماسیہ بغداد میں اسے ۲۳°-۳۳' پایا تھا، اس سے پہلے مرو کے ہیئت دانوں نے اس (یحییٰ بن ابی منصور) کی سرکردگی میں بھی اتنی ہی مقدار معیاف کی تھی، خالد بن عبد الملک المروزی نے رصدگاہ دمشق میں اسے ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ اور ۵۲ ثانیہ پایا تھا۔ خود سند بن علی کا خیال ہے کہ یہ ۲۳°-۳۳'-۵۷" ہے۔[۴]

وسط شمس:۔ ۲۱۴ھ (مطابق ۱۹۹ یزدجرد) میں یحییٰ بن ابی منصور نے اسے یاکط مہ مہ یہ (حسب ترتیب فرانسیسی = ۱۱-۲۹°-۴۵'-۴۵"-۱۴"') پایا تھا، جو مبسوط ہو کر ۳۵۹°-۴۵'-۴۵"-۱۴"' آتا ہے۔ (یہ مقادیر زیج حاکمی ابن یونس سے ماخوذ ہیں)

"اما وسط الشمس بمذہب یحییٰ بن ابی منصور فانہ فی السنۃ الفارسیۃ یاکط مہ مہ ید ثالثۃ یکون مبسوطہا شنط مہ مہ یہ"[۵]

لیکن البیرونی اپنے حساب سے آفتاب کی اوسط حرکت یومیہ کو ۰-۵۹'-۸"-۲۰"'-۳۵"" بتاتا ہے

---

[۱] و [۴] قانون مسعودی ج اول ص ۳۶۳ [۲] شرح جغمینی ص ۷۰، [۳] قانون مسعودی ج اول ص ... [۵] زیج کبیر حاکمی ...

"خروج مسیر الشمس یوم ۔ نط ۔ ح ۔ ك ۔ لج ۔ كا ۔ لج ... "[1]

اسی طرح شرح چغمینی میں "وسط شمس" نیز "خارج" شمس کی اوسط حرکت روزینہ : ۵۹ ۔ ۸ ۔۔ مذکور ہے۔ اول الذکر کے بارے میں مرقوم ہے :-

"وھی فی کل یوم بلیلة ھا نط ح ك لے تسع وخمسون دقیقة وثمان ثوان و عشرون ثالثة ..... وھی مثل وسط الشمس"

اور موخر الذکر کے بارے میں تحریر ہے،

"حرکة الفلك الخارج المرکز الشمس حول مرکز الخارج ..... فی الیوم بلیلة ھا نط ح ك لے تسع وخمسون دقیقة وثمان ثوان وعشرون ثالثة"

جملہ تعدیل شمس :- ۱ ۔ ۵۹ "وجملة تعدیلها فانه انط دقیقه"

اوج شمس :- برج جوزا ۲۲ ۔ ۳۹ (۲۱۵ھ مطابق ۱۹۹ ۔ یزدجرد)

حرکت قمر :- سن فارسی میں ۴ ۔ ۹ ۔ ۲۳ ۔ ۵ ۔ ۱۵ ثالثہ (واما القمر فانه حرکة عند یحیی بن ابی منصور فی السنه الفارسیة وط کج لا ثالثة)

حرکت خاصہ قمر :- سن فارسی میں ۲ ۔ ۲۸ ۔ ۴۳ ۔ ۷ ۔ ۲۸ ۔ ۱۳ رابعہ

وسط الجوزہر :- ۱۹ ۔ ۳۳ ۔ ۴۲ ثالثہ

جملہ تعدیل القمر ۵ درجہ

وسط زحل :- ۲ ۔ ۳ ۔ ۳۹ ۔ ۴۳ ثالثہ

تعدیل مرکز زحل :- ۶ ۔ ۱۳ دقیقہ

تعدیل اوسط زحل :- ۴ ۔ ۱۳ دقیقہ

---

[1] قانون مسعودی جلد ثالث ص [illegible]

اوج زحل :- ۸ - ۴۳ - ۳ (مطابق ۱۹۹ یزدجرد)

وسط مشتری :- صفر - ۲۰ - ۴۳ - ۱۲ ثالثہ

تعدیل مرکز مشتری :- ۵ - ۱۵ دقیقہ

تعدیل اوسط مشتری :- ۱۱ - ۳ دقیقہ

اوج مشتری :- ۵ - ۲۲ - ۳۲ دقیقہ (مطابق ۱۹۹ یزدجرد)

وسط مریخ :- ۹ - ۱۱ - ۱۷ - ۱۷ - ۲۷ ثالثہ

تعدیل مرکز مریخ :- ۱۱ - ۲۵ دقیقہ

تعدیل اوسط مریخ :- ۴۱ - ۹ دقیقہ

اوج مریخ :- ۳ - ۳ - ۳۳ دقیقہ

حرکت خاصہ زہرہ :- ۷ - ۱۵ - ۲ - صفر - ۳ ثالثہ

تعدیل مرکز زہرہ :- ۱ - ۵۹ دقیقہ

تعدیل اوسط زہرہ :- ۴۵ - ۵۹ دقیقہ

اوج زہرہ :- مثل اوج شمس

حرکت وسطی عطارد :- ۱ - ۲۳ - ۵۶ - ۲۴ - ۳۳ ثالثہ

تعدیل مرکز عطارد :- ۴ - ۲ دقیقہ

تعدیل اوسط عطارد :- ۲۲ - ۲ دقیقہ

اوج عطارد : ۶ (میزان) ۱۲ - درجہ[1]

رصدگاہ مامونی کی دریافتوں کے بارے میں یورپی ماہرین کی رائے | رصدگاہ مامونی کی دریافتیں انتہائی احتیاط اور غور سے

---

[1] یہ پوری تفصیل زیج ابن یونس کے چھٹے باب سے ماخوذ ہے۔ ص ۲۱۵ تا ص ۲۲۱

بانچ پڑتال کے بعد قلمبند کی گئی تھیں، اس لیے اسے "الزیج الممتحن" (Tested Tables)
کہتے تھے، جسے ہیئت دانوں نے "المجسطی" کی طرح اس کو بھی اپنا معمول بنایا۔

اسی غیر معمولی اعتنا کا نتیجہ تھا کہ بعض اہل فن نے اسے حریفانہ تنقید کا موضوع بنایا۔ ان حریف
نقادوں میں ابن یونس خاص طور سے قابل ذکر ہے، چنانچہ "زیج حاکمی" کا چوتھا باب جس کا عنوان

الباب الرابع فی کواکب الزیج الممتحن وغلط من غالیٰ فی صحته[1]

ہے ان لوگوں کی تغلیط میں ہے جنھیں اس کی صحت کے باب میں غیر معمولی خوش فہمی تھی یہی نہیں، بلکہ
ابن یونس نے اس سلسلے میں اپنے پیشرووں کی نکتہ چینی کا بھی ذکر کیا ہے، مثلاً اس نے ثابت ابن قرہ
کے ایک رسالہ کا اقتباس نقل کیا ہے، جو اس نے قاسم بن عبید اللہ کو بھیجا تھا اور اس میں لکھا تھا۔

امر الحساب الممتحن جعلت فداك	زیج ممتحن میں مرقوم حسابات نہ تو مکمل ہوئے
ما تم ولا قارب بالتمام[2]	اور نہ تکمیل کی حد تک پہنچے

اسی طرح اس نے ایک خط اسحاق بن حنین کو لکھا تھا جس میں تحریر کیا تھا کہ "زیج ممتحن کی کوتاہیوں کی
وجہ آفتاب کی ترصید میں بے احتیاطی تھی"[3]

خود ان مشاہدات کے متولیوں میں بھی ان کے متعلق اختلاف تھا، چنانچہ سند بن علی جو دونوں
رصدوں میں شریک تھا، یحییٰ بن ابی منصور کے ارصادات سے متفق نہ تھا، اسی طرح اور لوگوں نے
بھی جو ان کے زمانہ کے قریب تھے، ان ارصادات پر اعتراض کیے تھے، ابن یونس لکھتا ہے:

فانا ظن کثیر من علماء اهل	ہمارے زمانے کے بہت سے علماء نے گمان کیا کہ
زماننا ومن قرب منهم علی	جو ان کے زمانہ سے قریب تھے تو ابو معشر بلخی
ان ما رصدناه باستعمال [illegible]	اور علی بن اسحاق بکسر [illegible]

---

[1] زیج ابن یونس ص ۹۸ ۔ [2] ایضاً ص ۹۹ ۔ [3] ایضاً ص ۱۰۴

وعلی بن عیسیٰ بن کسوف و سند	ارصادات پر اعتراضات کیے تھے، نیز سند
بن علی وقد حضر الرصدین	بن علی نے بھی جو بذات خود دمشق اور بغداد
(زیج ابن یونس ص ۴۴)	دونوں جگہ کی رصدگاہوں میں شریک تھا، اعتراضات کیے تھے۔

سند بن علی نے ان کوتاہیوں کی وجہ یہ بتائی ہے کہ یحییٰ بن ابی منصور نے جس ذات الحلق کی مدد سے یہ مشاہدات کیے تھے، وہ زیادہ دقیق نہ تھا، صرف دس دس دقیقوں کے نشانات پر منقسم تھا۔[1] بنو موسیٰ نے بھی جنھوں نے رصدگاہ مامونی کے کچھ ہی عرصہ بعد اپنی رصدگاہ قائم کی تھی، "زیج ممتحن" کے مرصودات سے بہت زیادہ اختلاف کیا ہے، اسی طرح الماہانی اور سہل بن بشر نے اپنے مرصودات "زیج ممتحن" کے مرصودات سے مختلف پائے، چنانچہ ابن یونس لکھتا ہے:-

"وذکر بنو موسیٰ ابن شاکر فی ارصاد لهم کثیرة خلافهم وکذلك الماهانی وسهل بن بشر"[2]

بہرحال زیج ابن یونس کا چوتھا باب ان لوگوں کے ارصاد کی تفصیل پر مشتمل ہے، جن میں عیان و محسوس (ارصادی مشاہدات) ان نتائج سے مختلف پائے گئے، جو "زیج ممتحن" کے حساب سے آنا چاہیے تھے، یہ اختلافات احمد بن عبداللہ المعروف بحبش ہی کے زمانہ سے شروع ہو گئے تھے جس نے رصدگاہ مامونی ہی کے زمانہ میں نئے ارصاد کرنا شروع کر دیے تھے، اور بعد میں تو الماہانی وغیرہ بالخصوص بنو اماجور اور ابن یونس نے بعض مرصودات کو "زیج ممتحن" کے حسابات سے بہت زیادہ مختلف پایا۔

محیط ارضی کی پیمائش لیکن رصدگاہ مامونی کا سب سے اہم کارنامہ محیط ارضی کی پیمائش ہے، ابن خلکان نے لکھا ہے:

"مامون کو علوم الاوائل (قدیم علم و حکمت) کی تحقیق سے بڑا شغف تھا، اس نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ کرۂ زمین کا محیط ۲۴ ہزار میل ہے...... مامون نے اس کی اصلیت پر واقف ہونا چاہا

[1] زیج ابن یونس ص ۱۵ [2] ایضاً ص ۴۴

اس نے بنی موسیٰ سے پوچھا۔ انھوں نے کہا بیشک یہ بات صحیح ہے، مامون نے کہا میں چاہتا ہوں کہ جس طریقہ سے متقدمین نے ذکر کیا ہے تم بھی اس کے مطابق عمل کرو، تاکہ ہم دیکھیں کہ آیا یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے یا نہیں، چنانچہ انھوں نے ہموار اور چوڑی زمین کو تلاش کیا جو صحرائے سنجار اور کوفہ میں ملی، اس کے بعد وہ ایک جماعت کو لیکر جن پر مامون کو اعتماد تھا سنجار پہنچے، وہاں وہ ایک مقام پر ٹھہرے اور آلات رصدیہ کی مدد سے قطب شمالی کا ارتفاع دریافت کیا، اور اس مقام پر ایک میخ گاڑی اور اس میں ایک لمبی رسی باندھ دی اور بغیر دائیں بائیں مڑے ہوئے ٹھیک شمالی سمت میں چلے، جب رسی ختم ہوگئی تو زمین میں دوسری میخ گاڑکر پھر رسی باندھ دی، اور پہلے کی طرح شمالی سمت میں چلے، وہ اسی طرح کرتے رہے یہاں تک کہ ایسے مقام پر پہنچے جہاں قطب شمالی کا ارتفاع ایک درجہ زیادہ ملا۔ اسکے بعد درمیانی زمین کو رسیوں کی مدد سے ناپ لیا پس یہ فاصلہ ۶۶ $\frac{2}{3}$ میل نکلا، پھر وہ اس مقام پر آئے جہاں پہلی میخ گاڑی تھی، اور پھر رسی باندھکر ٹھیک جنوب کی طرف چلے اور پہلے کی طرح میخوں کو گاڑتے ہوئے اور رسیاں باندھتے ہوئے آگے بڑھے، یہانتک کہ وہ رسیاں ختم ہوگئیں جنھیں شمالی جہت میں استعمال کیا تھا، پھر انھوں نے اس مقام پر قطب شمالی کا ارتفاع ناپا اور معلوم کیا کہ وہ پہلے سے ایک درجہ گھٹ گیا ہے، اس سے ان کا حساب صحیح ہوگیا، اور جس بات کا ارادہ کیا تھا، اس کی تحقیق ہوگئی"۔

(وفیات الاعیان جلد ثانی ص ۷۹-۸۰)

لیکن مامون نے اسی تجربہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ دوسرے مقام پر بھی اس کا تجربہ کراکے اس تحقیق کی مزید تصدیق کی، چنانچہ ابن خلکان آگے چل کر لکھتا ہے:۔

فلما عاد بنو موسیٰ الی المامون و	جب بنو موسیٰ لوٹ کر مامون کے پاس آئے اور
اخبروہ بما صنعوا وکان موافقا لما	اپنے تجربہ کی اطلاع کی اور یہ تجربہ اسکے مطابق تھا
رآہ فی الکتب القدیمۃ من استخراج	جو مامون نے قدیم کتابوں میں قدماء یونان کا

الا و انّل طلب تحقیق ذلک فی موضع
آخر فسیرهم الی ارض الکوفة و
فعلوا فی سنجار فتوافق الحسابان
فعلم المامون صحة ما حرّره القدماء
فی ذلک (وفیات الاعیان ج ۲ ص ۸۰)

کہ اس دریافت کے بارے میں دیکھا تو اس نے
اسکی مزید تحقیق دوسری جگہ کرانا چاہی اور انھیں
کوفہ کی طرف بھیجا، وہاں انھوں نے اس عمل کو جو سنجار
میں کر چکے تھے، دہرایا، اس طرح دونوں حساب
ایک دوسرے کے موافق ہو گئے، اور قدما نے اس بات
میں جو کچھ لکھا تھا، مامون کو اسکی صحت کی تصدیق ہو گئی۔

ابن خلکان نے رصدگاہ مامونی کی اس دریافت کو بنو موسیٰ کا کارنامہ بتایا ہے، چنانچہ انکے تذکرے میں لکھتا ہے:-

ومما اختصوا به فی ملة الاسلام
واخرجوه من القوة الی الفعل و
ان کان ارباب الارصاد المتقدمون
علی الاسلام قد فعلوه ولکنه
لم ینقل ان احدا من هذه الملة
تصدی وفعله الا هم
(ایضاً ص ۷۹)

اور بنو موسیٰ کا امتیازی کارنامہ جس کے لیے وہ
تاریخ اسلام میں ممتاز ہیں اور جسے انھوں نے عمل
کرکے دکھایا (محیط ارضی کی پیمائش ہے جس کی تفصیل
آگے آرہی ہے) اگرچہ اسلام سے پہلے کے فلکیاتی
مشاہدات کرنے والے ہیئت داں اسکو کر چکے تھے،
لیکن ملت اسلامیہ کی تاریخ میں کسی ہیئت داں
کے متعلق یہ منقول نہیں ہے کہ اس نے یہ کام (محیط ارضی
کی پیمائش) انجام دیا ہو سوائے بنو موسیٰ کے۔

مگر یہاں ابن خلکان سے تسامح ہوا ہے، کیونکہ رصدگاہ مامونی کا قیام ۲۱۴ھ میں ہوا تھا، اسی زمانہ میں مامون الرشید کے حکم سے صحرائے سنجار میں محیط ارضی کی پیمائش کی گئی، اس کے بعد وہ غزوۂ روم پر چلا گیا، (جہاں اس کی وفات ہوئی) اس زمانہ میں (۲۱۸ھ کے قریب) بنو موسیٰ جنھیں ان کا باپ مرتے وقت مامون کو سپرد کر گیا تھا، ہنوز بچے تھے، اور مامون نے انھیں اسحٰق بن ابراہیم المصعبی کی تربیت میں دیدیا تھا، اور

روم سے برابر اس کو ان کی خبرگیری کے لیے لکھتا رہتا تھا، یہانتک کہ اسحاق ابن ابراہیم یاددہانیوں سے گھبرا گیا اور کہنے لگا کہ مامون نے تو مجھے ان بچوں کی دایہ بنادیا، چنانچہ ابن القفطی لکھتا ہے:-

مات (ابوهم) وخلف هؤلاء	ان کے باپ کا انتقال ہو گیا، اور انھوں نے یہ تین
الاولاد الثلاثة صغاراً فوصّى بهم	چھوٹے بچے چھوڑے، مامون نے انھیں اسحٰق
المامون اسحاق بن ابراهيم المصعبي	ابن ابراہیم مصعبی کی نگرانی میں دیدیا، اور بیت الحکمۃ
واثبتهم مع يحيى بن ابي منصور	میں یحیٰی بن ابی منصور کی اتالیقی میں رکھا، جب
في بيت الحكمة وكانت كتبه ترد	مامون روم گیا تو وہاں سے اسکے خط برابر اسحٰق
من بلاد الروم الى اسحق بان يراعيهم	کے پاس آتے رہتے کہ انکی نگہداشت میں کوئی
ويوصيه بهم ويسئل عن اخبارهم	دقیقہ فروگذاشت نہ کرے، وہ برابر انکے متعلق
حتى قال جعلني المامون داية	اسے توجہ دلاتا رہتا اور انکی خیریت دریافت
لاولاد موسى بن شاكر"	کرتا رہتا تھا، یہانتک کہ اسحٰق گھبرا کر کہنے لگا کہ
(اخبار العلماء باخبار الحکماء، ص ۲۸۰)	مامون نے تو مجھے موسیٰ بن شاکر کے بچوں کی دایہ بنادیا ہے

اس لیے ابن خلکان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ محیط ارضی کی پیمائش کے اس اہم تجربہ کو بنو موسیٰ نے انجام دیا تھا، بلکہ یہ تجربہ رصدگاہ مامونی کے منتظمین نے کیا تھا، جن میں سند بن علی، خالد بن عبد الملک المروزی علی بن عیسیٰ الاصطرلابی، اور احمد (علی)، البختری[1] خاص طور سے مشہور ہیں۔

سائنٹفک طور پر محیط ارضی کی پہلی پیمائش اسکندریہ کے مدرسۂ فلسفہ و حکمت کے مشہور یونانی جغرافیہ داں و ہیئت داں ایراٹوستھینس (Eratosthenes) (زمانہ ۲۷۶ تا ۱۹۴ق م) نے کی تھی، انقلاب صیفی (Summer Solstice) کے موقع پر اس نے

[1] ابن یونس نے اس کا نام علی بن البختری دیا ہے، مگر البیرونی نے "تحدید نہایات الاماکن" میں اس کا نام احمد بن البختری اور کتاب التفہیم (فارسی) میں ابو البختری بتایا ہے۔

معلوم کیا کہ شہر اسکندریہ میں دوپہر کے وقت خط سمت الراس سے سورج کا زاویائی فاصلہ پورے محیط
کا ۱/۵۰ یا تقریباً ۷° ہوتا ہے، حالانکہ اسی وقت بالائی مصر کے شہر اسوان میں سورج کا سمت الراس پر
ہونا مشہور و معروف تھا، اور یہ فرض کر کے کہ اسوان اسکندریہ کے ٹھیک جنوب میں واقع ہے، ایراتوستھینس
نے اس مشاہدہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ اسوان سے اسکندریہ کا فاصلہ زمین کے محیط کا ۱/۵۰ ہے اور چونکہ یہ فاصلہ
۵۰۰۰ اسٹیڈیا تھا، لہذا اس نے تخمینہ لگایا کہ زمین کا محیط ۲۵۰۰۰۰ اسٹیڈیا ہے، بعد میں اس عدد کو
۲۵۲۰۰۰ میں بدل دیا گیا تاکہ خط نصف النہار کے ارضی کے ہر درجہ کا طول ۷۰۰ اسٹیڈیا ہو جائے[1]
مسلمان ہیئت داں بھی ایراتوستھینس کی اس کاوش سے ناواقف نہ تھے، چنانچہ البیرونی
"قانون مسعودی" میں لکھتا ہے:-

وقد قدره الروم بمقدار	اور اہل روم (یونانیوں) نے زمین کی پیمائش
سماه اسطاذيا وزعم جالينوس	"اسٹیڈیا" نام پیمانے کی تھی۔ جالینوس کا خیال ہے
ان اراطشانوس قدر به ما بين	کہ ایراتوستھینس نے شہر اسوان اور اسکندریہ کے
بلدي اسوان والاسكندرية	درمیانی فاصلے کو اسی پیمانے سے ناپا تھا کیونکہ یہ دونوں
فانهما على خط واحد من خطوط	ایک ہی خط نصف النہار پر واقع ہیں، جیسے شہر
انصاف النهار مثل بلدي تدمر	تدمر اور رقہ لیکن جالینوس کی تصنیف "کتاب البرہان"
والرقة ومتى جمع ما في كتاب البرهان[2]	میں جو کچھ مذکور ہے، اگر اس کا مقابلہ بطلیموس کی
لجالينوس الى ما في كل واحد	کتاب "المدخل الی الصناعة الکریة" نیز "تصنیف"
من كتاب بطليموس في المدخل الى	(جغرافیا) کے محتویات سے کیا جائے تو پیمائش کی

[1] Berry: Short History of Astronomy, P. 39-40.

[2] کتاب البرہان جالینوس کی کتاب تھی جو فن منطق پر تھی، پندرہ مقالے تھے، اس کے کچھ مقالوں کا ترجمہ حنین بن اسحاق نے کیا تھا اور کچھ کا ترجمہ جبریل بن بختیشوع نے ایوب سے کرایا تھا۔

الصناعة الکریة بکتابه فی صورة الارض تفاوت المقادیر ایضاً علی ان اسماء تقدیراتها اذا وقعت الینا لم یکد یهتدی بها لغربة اللغة واختلاف المفسرین فیها"[1]
(قانون مسعودی جلد ثانی ص ۵۲۸-۵۲۹)

مقداروں میں بڑا تفاوت نظر آتا ہے جالینوس نے یہ فاصلہ ۵۰ اسٹیڈیا اور بطلیموس نے ۵۰۰ اسٹیڈیا بتایا ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بات ہو کر، ان کے مستعملہ پیمانوں (اسٹیڈیم) کے نام بسبب غرابت؟ ہو گئے نیز مفسرین (کتب یونانی) کے اختلاف تعبیر کے باعث سمجھنے میں آسان نہیں ہیں۔

البیرونی دوسری جگہ کہتا ہے کہ اراطستانوس (ایراٹوستھینس) کے حساب کے مطابق خط نصف النہار ارضی کے ایک درجہ کا فاصلہ جالینوس نے "کتاب البرہان" میں ۵۰، اور بطلیموس نے "جغرافیا" میں ۵۰۰ اسطاذیا (اسٹیڈیا) بتایا ہے، لیکن "اسطاذیا" کے معنی معلوم نہیں، اور ہمارے یہاں جو پیمانے مستعمل ہیں ان میں ان کی مقدار کو بیان نہیں کیا جا سکتا، اسی وجہ سے مامون الرشید کے زمانہ میں اس تجربہ کی تجدید کرائی گئی۔[1] بہرحال البیرونی نے ایراٹوستھینس کے تجربہ کے بعد عہد مامونی کے ہیئت دانوں کی کوشش کا ذکر کیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے:

وبهذا التفاوت العظیم بین رأی الفریقین فیها هو الذی بعث المأمون بن الرشید علی تجدید الاعتبار فی بریة سنجار من ارض الموصل علی ید جماعة من المتقدمین فی هذه الصناعة فقصدوا معرفة

اسی (اسطاذیا کی لمبائی معلوم نہ ہونے) نیز جالینوس اور بطلیموس کی رایوں میں اختلاف ہونے کی وجہ سے مامون الرشید کو خیال ہوا کہ علاقہ موصل میں صحرائے سنجار کے اندر اس فن کے ماہرین سے اس کی (محیط ارضی کی) پیمائش کی تحقیق کرائے، چنانچہ ان لوگوں نے دائرہ عظیمہ کی ایک ایسی قوس کو جو تمام دور (محیط) کی

[1] قانون مسعودی جلد ثانی ص ۱۵

ما يخص قوساً من دائرة عظمى معلومة	ایک نسبت معلومہ رکھتی ہو گزوں میلوں اور
النسبة الى كل الدور من اذرع او	فرسخوں میں ناپنے کا ارادہ کیا..........
اميال او فراسخ	....
وحين احتاطوا فيه وجدوا حصة	اور پوری احتیاط ملحوظ رکھنے کے بعد انھوں نے
الجزء الواحد من الثلاث مائة و	محیط ارضی کے ۳۶۰ درجوں میں سے ایک درجہ کی لمبائی
الستين المفروضة لكل الدور	۵۶ $\frac{۲}{۳}$ میل پائی، ہر میل ۴ ہزار گز کا تھا (جو
ستة وخمسين ميلا وثلثي ميل، كل	ذراع سوداء کے نام سے مشہور تھا).....
ميل منها اربعة آلاف ذراع	....
تعرف بالسوداء..........	....
ولذالك يكون اذرع هذا الجزء	لہذا ایک درجہ میں ۲۲۶۶۶۶ گز اور
مائتين وستة وعشرين الفاً وستة	۱۸ $\frac{۵۳\frac{۱}{۳}}{۶۰}$ فرسخ ہوتے ہیں اور پورے
مائة وستة وستين ذراعاً و	محیط میں آٹھ کروڑ سولہ لاکھ گز یا بیس ہزار
فراسخه ثمانية عشر فرسخاً وثلث	چار سو میل یا چھ ہزار آٹھ سو فرسخ ہوتے ہیں
وخمسون دقيقة وثلث دقيقة	
واذرع الدور كله..... ۸۱۶	
وامياله.. ۲۰۴۰ وفراسخه.. ۶۸۰[1]	

اسی طرح وہ "کتاب التفہیم" (عربی) میں اس پیمائش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

لما لم تكن تحصل الحقيقة ما ترجم	جب (یونانی) کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں

---

[1] قانون مسعودی جلد ثانی ص ۵۲۹ - ۵۳۰

من الكتب الى اللسان العربي
امر المامون بن الرشيد باعتبار
ذلك فتولاه جماعة من العلماء
وقتئذٍ فى برية سنجار ووجدوا
حصة الدرجة الواحدة
من الاميال ستة وخمسين
ميلا وثلثا ميل بذراع السوداء
وضربوا ذلك فى ثلثمايه وستين
فاجتمع عشرون الفا واربع
مائة وذلك اميال دور الارض
فى الدائرة العظمى ..... وكل
ميل فهو مشتمل على اربعة
آلاف ذراع يسمّى بالعراق
سوداء[1]

اور دن سے حقیقت حال معلوم نہ ہو سکی تو
مامون الرشید نے اسکی (محیط ارضی کی پیمائش کی)
تحقیق کا حکم دیا اور اس کام پر اس وقت کے
علما کی ایک جماعت مامور ہوئی، انھوں نے
صحرائے سنجار میں محیط ارضی کے ناپنے کا تجربہ کیا،
اور ایک درجہ کا طول ۵۶ ⅔ میل پایا (سوداء
گزوں کے حساب سے) اسے ۳۶۰ میں ضرب دیا تو
محیط زمین کا طول ۲۰۴۰۰ (بیس ہزار چار سو)
میل آیا .... اور ہر میل
۰۰۰ ۴ (چار ہزار) گزوں پر مشتمل ہوتا ہے
جو عراق میں سوداء کہلاتے ہیں

اسی طرح وہ (البیرونی) "کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم" (فارسی) میں لکھتا ہے:-

"وزیں جہت چوں کتابہا بتازی ہمی گردانیدند وآں اندازہا بحقیقت دانستہ نیامد مامون خلیفہ
پسر ہارون الرشید فرمودہ است تا اندازہ زمیں از سرنو آزمودہ آید۔ دگروہے را از دانایاں چوں

[1] کتاب التفہیم (عربی) ص ۱۱۰ مرتبہ رمزے رائٹ۔ مسٹر رمزے رائٹ نے برٹش میوزیم کے نسخۂ تفہیم (عربی) (نمبر ۸۳۴۹ .Or)
کو جو ۱۹۳۰ء کا مکتوبہ ہے، مع ترجمہ و تصاویر (ص ۳۰۶) ۱۹۳۴ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ الہ آباد یونیورسٹی لائبریری
میں ہے، میں نے اسی سے استفادہ کیا ہے۔

خالد مروروذی و ابوالبختری مساح و علی بن عیسیٰ اسطرلابی و گروہی مانند ایشان بفرمان مامون بدشت سنجار کہ طریق آن بجا رو داشتند حصہ یکی درجہ بیافتند از دایرہ بزرگ بر زمین، پنجاہ و شش میل و چہار دانگ میل و آنرا بسی صد و شصت زدند تا میلہاے دور زمین گرد آمد بیست ہزار و چہار صد و ہر میلی سہ یک فرسنگ بود و میل چہار ہزار ارش سودا است۔"[1]

اسی طرح اس نے "تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات الاماکن" میں لکھا ہے:۔

وانما رصد المامون کان لما طالع من کتب الیونانیین حصۃ الجزء الواحد خمس مائۃ اسطاذیا وھو مقدار کانوا یقدرون بھا المسافات ولم یجد عند المترجمین علما شافیا بمقدار ما یتعارفون علیہ حینئذ امر علی ما حکی حبش عن خالد المروزی جماعۃ من علماء الصناعۃ وحذاق الصناع من النجارین والصفارین بعمل الآلات واختیار موضع یعمل فیہ المساحۃ فاختیر موضع من بریۃ سنجار من حدود الموصل یبعد عن قصبتھا ستۃ عشر

اور جب مامون الرشید نے یونانی حکما کی کتب کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ (محیط زمین کے) ایک درجہ کی لمبائی ۵۰۰ اسطاذیا ہوتی ہے، اور یہ ان کا پیمانہ تھا جس سے وہ فاصلے ناپا کرتے تھے، مگر مترجموں کے پاس اس کی لمبائی کے بارے میں کافی معلومات نہ تھیں، جو اس وقت اس پر روشنی ڈالتیں، اس لیے اس نے جیسا کہ حبش الحاسب نے خالد المروزی سے روایت کی ہے، اس فن (ہیئت) کے ماہرین کی ایک جماعت اور ہوشیار کاریگروں جیسے بڑھئی، لوہار وغیرہ کو آلات رصد تیار کرنے، نیز اس پیمائش کے تجربہ کے لیے مناسب مقام کو انتخاب کرنے کا حکم دیا، چنانچہ مضافات موصل میں صحرائے

[1] کتاب التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم (فارسی) مرتبہ جلال ہمائی ص ۱۹۰ - ۱۹۲

فرسخاً و من سر من رأى ثلثة و
اربعين فرسخاً، فارتضوا استواها
وحملوا آلات اليها وعينوا منها
موضعاً رصدوا ارتفاع
الشمس نصف النهار. ثم افترقوا
منه فريقين فتوجه خالد طائفة
من المساح والصناع الى جهة
القطب الشمالي وتوجه علي بن عيسى
الاصطرلابي واحمد بن البحتري
الذراع مع جماعة نحو القطب
الجنوبي ورصدت كل طائفة
منهما ارتفاع الشمس نصف النهار
حتى وجدوه قد تغير جزءاً
واحداً سوى التغير الحادث
من الميل. وكانوا يذرعون
الطريق في ذهابهم وينصبون
السهام على طريقهم فلما عادوا
اعتبروا المساحة ثانية واجتمعت
الطائفتان حيث افترقتا

کے اندر، ایک مقام منتخب کیا گیا جو دجلہ کے
مدمقام سے ۱۹ فرسخ اور سرمن رای سے
۴۳ فرسخ دور تھا، انھوں نے اسکی ہمواری
اور چورس پن کو پسند کیا، اور آلات رصدیہ
وہاں لے گئے اور ایک مقام متعین کر کے
نصف النہار کے وقت آفتاب کے ارتفاع
کو ناپا، پھر وہاں سے وہ دو جماعتوں میں بٹ گئے،
خالد المروروذی پیمائش کرنے والوں نیز
کاریگروں کی ایک جماعت کے ساتھ قطب شمالی
کی سمت میں اور علی بن عیسیٰ الاصطرلابی اور
احمد البحتری گزدار دوسری جماعت کے ساتھ
قطب جنوبی کی سمت میں چلے۔ دونوں جماعتوں
نے آگے چل کر نصف النہار کے وقت آفتاب کے
ارتفاع کو ناپا، یہانتک کہ انھوں نے دیکھا کہ
اس میں ایک درجہ کا فرق ہو گیا ہے سوائے
اس تغیر کے جو میل شمسی کی بنا پر پیدا ہوتا ہے
وہ اپنے راستہ کو ناپتے جاتے تھے، اور تیر
گاڑتے جاتے تھے، پھر جب لوٹے تو انھوں نے
اپنی مساحت کی دوبارہ پیمائش کی اور

فوجد طحصة الجزء الواحد	دونوں جماعتیں جہاں سے جدا ہوئی تھیں وہاں
من الارض ستة وخمسين ميلاً	پھر آ ملیں، پس ہر حصے کی زمین کا ایک درجہ کا ہنا

یہ مقدار اس سے مختلف ہے جو عام طور پر روایت کی گئی ہے (مزید تفصیل آگے آتی ہے)، چنانچہ البیرونی نے الفرغانی سے وہی ۵۶ ⅔ میل کی روایت کی اور آگے چل کر کہتا ہے :۔

وحكى عن الفرغانی ثلثا ميل تتبع	اور فرغانی سے مذکورہ (یعنی چھپن) میلوں کے ساتھ
الاميال المذكورة	"دو ثلث" (⅔) میل کو مزید نقل کیا گیا ہے۔

البیرونی کہتا ہے کہ عام طور پر یہی (۵۶ ⅔) والی مقدار نقل کی گئی ہے۔

وكذلك وجد الحكايات كلها مطبقة	اور اس باب میں جتنی حکایات مجھے ملی ہیں ان سب کا
على هذين الثلثين	(۵۶ میلوں کے ساتھ) اس ⅔ میل پر اتفاق ہے یعنی سب

البیرونی نے "تحدید نہایات الاماکن" میں حبش کی طرف جو روایت منسوب کی ہے وہ اس کی تصنیف "کتاب الابعاد والاجرام" سے ماخوذ ہے جس کا اس نے حوالہ بھی دیا ہے، مگر حبش خود ان پیمائش کرنے والوں میں شریک نہ تھا، لیکن ابن یونس نے "زیج حاکمی" میں "الکلام فی ما بین الاماکن من الذراع" کے زیر عنوان ان پیمائش کرنے والوں میں سند بن علی کو بھی بتایا ہے اور اس سے روایت کی ہے، وہ لکھتا ہے :۔

ذكر سند بن علی فی كلام وجدته له	مجھے سند بن علی کی تصریحات ملیں جن میں اس نے لکھا ہے
ان المامون امره هو وخالد بن	کہ مامون الرشید نے اسے اور خالد بن عبد الملک مروذی
عبد الملك المروذی ان يقيسا	کو دائرۂ عظمیٰ کے ایک درجہ کی لمبائی دریافت کرنے کا حکم دیا
مقدار درجة من اعظم دائرة من	سند کہتا ہے کہ ہم سب اس کام کے لیے روانہ ہوئے،

۱۔ تحدید نہایات الاماکن لتصحیح مسافات المساکن۔ اس کتاب کا واحد نسخہ البیرونی کے ہاتھ کا لکھا ہوا کتب خانہ فاتح (قسطنطنیہ) میں موجود ہے۔ زیر نظر اس کا متعلقہ حصہ کا جس سے مذکورہ عبارت ماخوذ ہے ذکی ولیدی طوغان نے "صفۃ المعمورۃ علی البیرونی" یا Biruni's Picture of The world کے زیر عنوان شائع کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو "Memoirs of The Archaeological Survey of India No 53

دوائر سطح كرة الأرض، قال فخرجنا
لذلك جميعاً وأمر علي بن عيسى
الاصطرلابي وعلي بن البحتري
بمثل ذلك فسارا الى ناحية اخرى
قال سند بن علي فسرت انا وخالد بن
عبد الملك الى ما بين وامعه (الرقه)
وتدمر وقسنا هنالك مقدار درجة
من اعظم دائرة تمر بسطح الارض
فكان سبعة وخمسين ميلاً وقاس
علي بن عيسى وعلي بن البحتري فوجدا
مثل ذلك وورد الكتابان من
الناحيتين في ذلك في وقت
واحد بقياسين متفقين

ہموں نے علی بن عیسیٰ الاصطرلابی اور علی بن
البحتری کو بھی اسی کام پر مامور کیا، وہ دوسری
طرف روانہ ہوئے، سند بن علی نے لکھا ہے کہ میں
اور خالد بن عبد الملک، رقہ اور تدمر کے درمیانی
علاقے میں چلے اور وہاں سطح زمین کے دائرہ عظمیٰ
کے ایک درجہ کی لمبائی کا حساب لگایا تو یہ ۵۷ میل
تھی، اور علی بن عیسیٰ اور علی بن البحتری نے بھی
دریافت کیا تو اتنا ہی پایا، اور دونوں طرف سے
دونوں جماعتوں کے (اطلاعی) خطوط
بیک وقت پہنچے، جن میں ایک ہی
حساب درج تھا۔

لیکن یہ مقدار [ستاون میل] عام روایتوں میں مروی مقدار سے بالکل ہی مختلف ہے۔ اسی طرح ابن یونس نے حبش سے جو مقدار روایت کی ہے وہ بھی سب روایتوں سے مختلف ہے، اس نے اس سے ایک درجہ کی لمبائی ۵۶ ¼ میل روایت کی ہے۔ چنانچہ وہ (ابن یونس) لکھتا ہے:-

وذكر احمد بن عبد الله المعروف
بحبش في الكتاب الذي ذكر فيه
الارصاد الممتحن بدمشق ان المأمون

احمد بن عبد اللہ المعروف بحبش نے اپنی اس کتاب
میں جس کے اندر دمشق کی "ارصاد ممتحن" کا
ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ مامون نے سطح زمین کے

امر بان تقاس درجة من اعظم	دوائر عظمی میں سے ایک دائرہ کے درجہ واحد
دائرة من دوائر بسيط كرة الارض	کی لمبائی معلوم کرنے کا حکم دیا، اسکے لیے ہیئت دان
قال فسار والذ لك فی برية سنجار	صحرائے سنجار میں روانہ ہوئے، یہانتک کہ دونوں
حتى اختلف ارتفاع النهار بين	مقاموں کے (جس مقام سے روانہ ہوئے تھے
القياسين فی يوم واحد بدرجة	اور جس مقام پر پہنچے تھے) ایک ہی دن کے
ثم قاسوا ما بين المكانين فكان	"ارتفاع نہار" میں ایک درجہ کا فرق پڑ گیا،
نو ميلا وربع ميل وكل ميل منها	اس سے انھوں نے دونوں مقاموں کے درمیانی فاصلے
اربعة الاف ذراع بالذراع السوداء	کو ناپ لیا جو ۵۶ ¼ میل تھا، ہر میل چار ہزار گز
التی اتخذها المامون[1]	(گز سودا کے حساب سے جسے مامون نے رائج کیا تھا)

البیرونی کا محاکمہ البیرونی لکھتا ہے کہ جس طرح حبش نے صرف ۵۶ میل کی روایت کی ہے، اسی طرح ابو حامد الصغانی نے ثابت بن قرہ سے بھی ۵۶ میل کی روایت کی ہے، مگر یہ روایت پیمائش کرنے والوں نے حبش سے نہیں بیان کی تھی، بلکہ جب ان میں سے ایک شخص (خالد بن عبد الملک المروزی) محیط ارضی کے درجۂ واحد کی لمبائی کی مسافت کی کیفیت قاضی یحیٰی بن اکثم کو لکھا رہا تھا تو حبش نے بھی سن لیا تھا، خالد نے خاص طور سے اسے اس سے روایت نہیں کی تھی، (لہذا یہ اتفاقیہ روایت خرقِ اجماع کا باعث نہیں ہو سکتی) یہ بھی گمان کیا جا سکتا ہے کہ

---

[1] زیچ کا ابن یونس کا ایک نسخہ لیڈن میں اور دوسرا گورنمنٹ بباڈیلکے (Bibliothèque Nationale) کے اندر موجود ہے، ان دونوں نسخوں کی مدد سے Par Le Cem Caussin نے ۱۸۰۴ء میں پیرس سے اس کتاب کو شائع کیا، اسکے مطبوعہ نسخے بھی کیاب ہیں، ایک نسخہ دار المصنفین اعظم گڈھ میں ہے، دوسرا شاید کتب خانۂ آصفیہ حیدر آباد میں ہے، میں محترم المقام جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کا صمیم قلب سے شکر گذار ہوں کہ ان کی عنایت سے مجھے اس نسخے سے حسب دلخواہ استفادہ کا موقع ملا۔

کتاب الابعاد والاجرام" میں حبش نے یہ واقعہ لکھا ہے، ۵۶ کے بعد ۱/۴ لکھنے سے رہ گیا ہو، البیرونی کہتا ہے کہ اس کا احتمال نہیں ہے، کیونکہ حبش نے زمین سے متعلق تمام پیمائشوں کو اسی "۵۶" سے مستخرج کیا ہے، کیونکہ البیرونی نے جب ان مختلف ابعاد کا امتحان لیا تو ان کی اصل "۵۶" ہی آئی۔

اس لیے البیرونی کہتا ہے کہ یہ دو روایتیں ہیں [ایک صرف ۵۶ کی اور دوسری ۵۶ ۲/۳ کی] جو غالباً دو مختلف جماعتوں سے مروی ہیں، بہرحال یہ حیرت و استعجاب کی بات ضرور ہے، اس لیے اسکی جانچ نئی پیمائش ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے[۱]۔

لہذا البیرونی کی تحقیق پسند طبیعت خاموش نہ رہ سکی اور اس کے باوجود کہ نہ اس کے پاس ذرائع تھے اور نہ کسی ساتھی کی اعانت حاصل تھی، اس نے پہلے یہ تجربہ جرجان کے مضافات میں دہستان کے علاقہ میں کیا، مگر وہاں ناکام رہا، شاید قسام ازل نے بھی یہ شرف برصغیر پاک و ہند ہی کے نصیب میں مقدر کر رکھا تھا۔ چنانچہ ۱۰۱۲ء کے قریب اس نے یہاں یہ تجربہ کیا جس میں کامیابی ہوئی۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا جس پر عہد مامونی کے ہیئت داں پہنچے تھے، چنانچہ کتاب التفہیم (عربی) ۱۰۲۹ء میں لکھتا ہے:-

وقد اعتبرت انا ذلك بارض	میں نے ہندوستان میں اس کا تجربہ کیا تو
الهند فلم يخالف شئ يعبأ به	اس میں کوئی قابل ذکر اختلاف نہیں نکلا،

[مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "آجکل" دہلی بابت جولائی ۱۹۶۳ء میں "سرزمین ہند پر محیط ارضی کی پہلی پیمائش" صفحہ ۲۷ - ۳۲]

---

[۱] تحدید نہایات الاماکن

قاضی مبارک اور انکی شرح سلم

از جناب مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی

"قاضی مبارک" ایک کتاب کا، اس کتاب کے مصنف کا اور مصنف کے خاندان کی کئی ممتاز شخصیتوں کا نام ہے، یہاں کتاب اور اس کے مصنف کے بارے میں کچھ لکھنا مقصود ہے،

اتر پردیش کے ضلع ہردوئی میں ایک قصبہ گوپامئو ہے، جو ایک صدی قبل تک معقولات، منقولات اور تصوف و سلوک کا گہوارہ رہا ہے، اور دنیاوی وجاہت سے بھی اس مردم خیز خطے کے افراد کو وافر حصہ اپنے زمانے میں ملا، گوپامئوی خاندان کی ایک شاخ عرصے تک علاقۂ مدراس میں واقع ریاست آرکاٹ کی نیم خودمختار والی اور وارث رہی ہے،

اس عنوان کے معنون قاضی مبارک سوم ہیں جن کو شارح سلم کی حیثیت سے امتیاز حاصل ہے، اور جو مدرسگاہوں، قدیم کتب خانوں کی فہرستوں اور مشرقی علوم کے حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں،

قاضی مبارک اول گوپاموی جن کا تذکرہ بحر زخار (قلمی کتب خانہ عبدالباری اکیڈمی فرنگی محل)، سیر الاولیاء اور نزہۃ الخواطر میں موجود ہے، حضرت نظام الدین اولیاءؒ دہلوی کے مرید اور خلیفہ اور مشہور فارسی شاعر حضرت امیر خسروؒ کے پیر بھائی تھے، یہ قاضی صاحب اپنے پیر کے مزار پرانوار کے جوار میں مدفون ہیں،

در پایان روضۂ سلطان المشائخ دفن گشت رحمۃ اللہ علیہ (بحر زخار)	اپنے پیر سلطان المشائخ (حضرت نظام الدین اولیاءؒ) کے مزار کے پائیں دفن ہوئے، اللہ ان پر رحم نازل فرمائے

قاضی مبارک دوم قصبۂ دیسنی ضلع لکھنؤ کے مشہور بزرگ اور عہد اکبری کے ایک روحانی پیشوا بندگی نظام الدینؒ کے مرید اور خلیفہ تھے، ان کا ذکر بحر زخار، منتخب التواریخ (بدایونی) اور تذکرہ علمائے ہند (رحمان علی) وغیرہ میں ہے،

قاضی مبارک سوم شارح سلم بھی صوفی مشرب اور سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں شیخ محمد اکرم کے مرید نیز شاہ اللہ دیہ قلندر لاہرپوری کے خلیفہ تھے (بحر زخار) اس کے علاوہ وہ اپنے وقت کے بڑے عالم، فقیہ، منطق اور فلسفی گذرے ہیں۔ قاضی مبارک سوم کی مشہور تصنیف "شرح سلم" "قاضی مبارک" کے نام سے مشہور ہے، تو یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ کتاب اپنے مصنف کے ہم نام ہوگئی، بات یہ ہے کہ سلم العلوم جو منطق کی ایک ادق اور مشکل ترین کتاب ہے، اور جس کے مصنف ملا محب اللہ بہاری (وفات ۱۱۱۹ھ) ہیں، جب سے لکھی گئی، اس وقت سے کسی معقولی عالم و فاضل کی لیاقت جانچنے کا یہی معیار بن گیا کہ وہ سلم العلوم کے اسرار و رموز کا کتنا زیادہ واقف کار ہے، بہت سے لائق اور ذہین علما نے سلم العلوم کی شرحیں لکھ کر اپنی قابلیت کا سکہ منوانے کی کوشش کی، اور سلم العلوم کی بہت سی شرحیں ہوگئیں، ان شرحوں میں باہم امتیاز قائم کرنے کی غالباً یہی آسان صورت سمجھی گئی کہ مصنفین کے نام ہی سے ان کو یاد کیا جائے تو جو شرحیں درسگاہوں اور علمی حلقوں میں مقبول ہوگئیں وہ اپنے مصنف کے نام ہی سے موسوم ہوگئیں، جیسے ملا حسن، قاضی مبارک، حمد اللہ وغیرہ، دوسری شرحیں مصنفین کی اضافت سے شرح کہلائیں، جیسے شرح سلم ملا عبدالحق، شرح سلم ملا مبین وغیرہ۔

قاضی مبارک گوپاموی کی شرح "قاضی مبارک" منطق کی انتہائی اور آخری کتاب سمجھی جاتی ہے اور جو مدرس اس کے مطالب تشفی بخش طریقے سے طلبا کو سمجھا دیتا اس کا لوہا سب مان لیتے تھے،

قاضی مبارک کی تصانیف میں شرح سلم جو مصنفات او شرح سلم کرشتہ از مشرق
مشرق سے لیکر مغرب تک مشہور ہوا تا مغرب وارد و حاشیہ میرزاہد و شرح

مواقف و حاشیہ میرزاہد ملا جلال وو بحر	حاشیہ میرزاہد شرح مواقف و حاشیہ میرزاہد
مسائل بسیار از آنحضرت یادگار مانده	ملا جلال اور دوسرے بہت سے رسائل بطور
(بحر زخار)	یادگار موجود ہیں،

مولانا فضل امام خیرآبادی (وفات ۱۲۴۴ھ) نے اپنی کتاب "آمدنامہ"[1] میں نئی بات یہ لکھی ہے:-

اول کسیکہ حاشیہ بر میرزاہد نوشت و	قاضی مبارک پہلے شخص ہیں جنھوں نے
سلم را شرح کرد او بود	"میرزاہد" پر حاشیہ لکھا اور سلم کی شرح لکھی،

مولانا فضل امام کے اس دعوے نے کہ سلم العلوم کی سب سے پہلی شرح قاضی مبارک گوپاموی نے لکھی تھی، تحقیق کے لیے ایک نیا باب کھول دیا ہے،

---

[1] "آمدنامہ" مولفہ مولانا فضل امام خیرآبادی کے نام سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ وہی مروج آمدنامہ ہے جو فارسی نصاب کا بالکل ابتدائی رسالہ ہے، جو "صفوۃ المصادر" کے نام سے بھی موسوم ہے۔ ہمارے عہد کے مشہور مصنف اور محقق علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کو بھی غالباً یہی اشتباہ ہوا، انھوں نے "حیات شبلی" میں مولانا فضل امام خیرآبادی کے ذکر میں لکھ دیا "بچوں کا فارسی ابتدائی رسالہ آمدنامہ" ان ہی کی آمدطبع کا نتیجہ ہے" (ص ۲۲) بچوں کا ابتدائی فارسی رسالہ آمدنامہ یا صفوۃ المصادر، دراصل مصطفیٰ خاں ولد حاجی روشن خاں مالک مطبع مصطفائی (کانپور) کی آمدطبع کا نتیجہ ہے۔ مولانا فضل امام کا آمدنامہ دوسری چیز ہے، یہ ابتک کہیں طبع نہیں ہوا ہے، اور مصنف کے قلم کا لکھا ہوا لاہرپور (ضلع سیتاپور) کے کتب خانے میں محفوظ ہے، یہ آمدنامہ، فارسی کے صرف و نحو، معانی و بیان اور بدیع کے قواعد پر مشتمل ہے، اور اس کا آخری باب (پانچواں باب) چند نامور علماء کے حالات پر مشتمل ہے، یہ پانچواں باب "تراجم الفضلاء" کے نام سے انگریزی ترجمے اور انگریزی حواشی کے ساتھ کراچی میں ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ہے،

تحقیق کرنے والے کو سب سے پہلے سابقہ ایک ایسی روایت پڑتا ہے جس کی حیثیت افواہ سے زیادہ نہیں ہے "احوال علمائے فرنگی محل (مصنفہ مولانا الطاف الرحمٰن قدوائی تلمیذ حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی) میں ہے :۔

" آپ کی (ملا احمد عبد الحق فرنگی محلی کی) شرح سلّم قاضی مبارک کے پہلے ہے، کیونکہ جب ملا محب اللہ بہاری نے سلّم و مسلّم دونوں متن لکھ کر ملا نظام الدین صاحب کی خدمت میں بھیجے تو ملا صاحب نے فرمایا کہ ملا بہاری نے میرا امتحان لیا ہے، یہ فرما کر ایک متن مسلّم خود لے لیا اور ایک ملا عبد الحق قدس سرہ کو دیا، دونوں صاحبوں نے شرحیں لکھیں اور ملا بہاری کے پاس بھیجا انھوں نے دیکھ کر بہت تعریف کی اور کہا کہ الحمد للہ میرے استاد زادے اب استاد ہو گئے۔" (ص ۱۲)

اس مفہوم کی ایک عربی تحریر جدّی و استاذی مولانا محمد عنایت اللہ مرحوم فرنگی محلی (وفات ۱۹۴۱ء) کے قلم کی لکھی ہوئی، ملا احمد عبد الحق کی شرح سلّم کے مطبوعہ نسخے کے شروع میں نظر سے گزری، اس عربی عبارت کا لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے :۔

" سلم العلوم کے مصنف ملا محب اللہ بہاریؒ نے جب سلّم اور مسلّم تصنیف کیں تو ان دونوں کتابوں کو ملا نظام الملۃ والدینؒ فرنگی محلی کے پاس بھیجا، اور خواہش کی کہ وہ ان کی شرحیں تحریر کریں، مسلم کی شرح تو خود ملا نظام الدینؒ نے لکھی اور سلم ان کو (اپنے شاگرد اور حقیقی بھتیجے مولانا احمد عبد الحق کو) دیدیں، پس انھوں نے کیا خوب اس کی شرح کی، ملا صاحب (ملا نظام الدینؒ) نے یہ دونوں شرحیں ملا محب اللہ بہاری کو بھیجیں تو وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور ان کا انتقال سنہ (کذا) میں ہوا، جیسا کہ کہا جاتا ہے، یہ میں نے اپنے کسی استاد سے سنا ہے، جن کا نام حافظے میں نہیں رہا۔"

مولانا عنایت اللہ مرحوم کی یہ تحریر زمانۂ طالب علمی کی معلوم ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں ان کو خود اس روایت پر بھروسہ نہیں رہا تھا، اسی لیے انھوں نے اپنی تصنیف " تذکرۂ علمائے فرنگی محل "

ہی مولانا احمد عبد الحق نے مقالات میں اس کا ذکر نہیں کیا،

بہرحال یہ روایت درایتاً بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی، اور دوسری تصریحات کے اعتبار سے بھی غلط ہو کر سلم اور مسلم کے مصنف ملا محب اللہ بہاری حسب تصریح میر غلام علی آزاد بلگرامی (مآثر الکرام) مولانا فضل امام خیرآبادی (آمدنامہ) بانی درس نظامیہ استاذ الہند ملا نظام الدین فرنگی محلی کے والد ماجد ملا قطب الدین شہید سہالوی کے بھی شاگرد تھے، اور ملا قطب الدین شہید کے ایک نامور شاگرد ملا قطب الدین شمس آبادی کے بھی شاگرد تھے، اسی شاگردی کی نسبت نے اس روایت کو شہرت دی ہوگی کہ ملا محب اللہ بہاری نے اپنی تصانیف اپنے استاذزادے ملا نظام الدین کی خدمت میں بھیجیں اور شرح لکھنے کی فرمایش کی،

لیکن ملا بہاری کی زندگی میں ملا احمد عبد الحق فرنگی محلی کا سلم کی شرح لکھ دینا ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے، جب ملا بہاری کا انتقال ہوا (۱۱۱۹ھ) تو اس وقت ملا احمد عبد الحق کی عمر صرف ۱۰ سال تھی (پیدائش ۱۱۰۹ھ) اگر اس وقت وہ فارغ التحصیل بھی ہو چکے ہوں تب بھی ایسی مشکل کتاب کی ایسی شرح لکھنے کے لیے جو مدت درکار ہونا چاہیے وہ ان کو ملا بہاری کی زندگی میں نصیب نہیں ہو سکتی تھی،

اور پھر اس صراحت کے بعد جو خود ملا احمد عبد الحق نے شرح سلم میں کر دی ہے، ایسی تمام روایتوں اور افواہوں کا خود بخود خاتمہ ہو جاتا ہے، ملا عبد الحق اپنی شرح سلم (تصدیقات) کے خاتمے پر لکھتے ہیں:-

صنفہ خادم الطلبۃ احمد عبد الحق	طلباء کے خادم عبد الحق نے جو فاضل کامل
بن الفاضل الکامل محمد سعید بن ملا قطب الدین	محمد سعید بن قطب العلماء والعرفاء ملا قطب الدین
الشہید قطب العلماء العرفاء	شہید انصاری سہالوی کا بیٹا ہے

الانصاری السہالی (کذا) اس شرح کو ۱۱۶۳ھ میں
سنۃ الف ومائۃ وستۃ وثلثین من الہجرۃ تصنیف کیا

ملا محب اللہ بہاری کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہو چکی تھی، اس کے پندرہ سال بعد ملا عبد الحق کی شرح تصنیف ہوئی، اس لیے ملا بہاری کی شرح دیکھنے اور اس پر حواشی ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں رہا،

اس تصریح نے جہاں یہ واضح کر دیا کہ ملا احمد عبد الحق کی شرح سلم ملا بہاری کی زندگی میں تصنیف نہیں ہوئی تھی، وہاں یہ بھی واضح کر دیا کہ قاضی مبارک کی شرح سلم سے پہلے ملا احمد عبد الحق کی شرح تصنیف ہو چکی تھی، اس لیے کہ قاضی مبارک گوپاموی نے اپنی شرح سلم کے خاتمے پر جو تاریخ تصنیف خود بیان کی ہے وہ کئی سال متاخر ہے:

قد تم الشرح بفضل من اللہ	اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و
تعالیٰ وتبارك من عبدہ	احسان سے اس کے بندے محمد مبارک
محمد مبارك فی سنۃ الف	کے ہاتھوں یہ شرح، ربیع الاول
ومائۃ اربعین وثلث من	پنجشنبہ ۱۱۴۳ھ میں شہر دہلی میں
من الهجرة النبویۃ فی سابع	پایۂ تکمیل کو پہنچی،
شہر ربیع الاول یوم الخمیس	
فی بلدۃ شاہ جہان آباد	

۱۱۳۷ھ اور ۱۱۴۳ھ کے درمیان پورے چھ سال کا فرق ہے، اور قاضی مبارک کی شرح سے ملا احمد عبد الحق کی شرح چھ سال مقدم ہے، ایسی صریح شہادتوں کے باوجود، جو شرحوں کی تصنیف کے وقت سے موجود ہیں، ایسی بے بنیاد باتیں اگر مشہور ہو گئیں تو ان کو

محض خوش اعتقادی سمجھنا چاہیے،

یہاں ایک پیچیدگی باقی رہ جاتی ہے، ملا احمد عبد الحق کی شرح اگرچہ مقدم ہے، جیسا کہ دونوں شارحوں کی تصریح سے ظاہر ہو چکا ہے، لیکن ملا کی شرح میں قاضی کی شرح کے بعض مطالب کی تردید بھی موجود ہے، یہاں سوائے قیاس کی مدد لینے کے اور کوئی چارہ نظر نہیں آتا، یہی ہوا ہوگا کہ ملا نے تردیدی مطالب کا اضافہ بعد میں قاضی کی شرح نظر سے گذرنے کے بعد کیا، یہ بھی ممکن ہے کہ ملا احمد عبد الحق اور قاضی مبارک دونوں نے شرحیں لکھنا شروع کی ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ شرحیں دو چار مہینے کیا دو چار برس میں بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی تھیں، اس سے دوگنی بلکہ تگنی مدت ایسی اہم تصنیف کے لیے درکار ہونا چاہیے، اور یہ دونوں بزرگ صاحب درس بھی تھے، تو شرحوں کی تکمیل سے پہلے ہی طلبہ اور شاگردوں کے ذریعہ شرحوں کے مطالب گوپامئو اور فرنگی محل کے درمیان منتقل ہوتے رہے ہوں، اس زمانے میں جب چھاپے خانے نہیں تھے، ایسا ہوا ہی کرتا تھا کہ مصنف نے تصنیف شروع کی اور شاگردوں نے اس کے اجزا نقل کر دینا شروع کر دیے قبل اس کے کہ تصنیف تمام ہو علمی حلقوں میں تصنیف پہنچ چکی ہوتی تھی، اس کی ایک مثال، امام صدر الشریعۃ شارح وقایہ نے جو آٹھویں صدی ہجری کے بڑے مصنف گزرے ہیں خود بیان کر دی ہے، شرح وقایہ کے مقدمے میں ہے:

حتی اتفق اتمام تالیفہ مع
اتمام حفظی وانتشر بعض النسخ
فی الاطراف

وقایہ کی تالیف ادھر تمام ہوئی جس کے ساتھ میرا
حفظ کرتے جانا بھی پایۂ تکمیل کو پہنچا، ادھر اس کے
بعض نسخے اطراف و جوانب میں پھیل گئے۔

خیر قاضی کی شرح پر ملا احمد عبد الحق کی شرح کا تقدم ثابت اور متحقق ہو گیا، اور مولانا فضل امام خیرآبادی کا قاضی مبارک کے بارے میں یہ دعویٰ کہ "اول کسیکہ ..... سلم را شرح کردہ او بود" محض دعویٰ بلا

پھر بھی ابھی یہ بات تشنۂ تحقیق ہے کہ کیا ملا احمد عبد الحق ہی سلم العلوم کے پہلے شارح ہیں یا ان پر بھی کسی کو شرف تقدم حاصل ہے؟ یہ بات بھی ملا کی شرح کے خاتمے کی ایک عبارت سے واضح ہوجاتی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

وقد کنت بالغاً فی الایضاح لم نجد — میں نے مطالب کی وضاحت میں کوشش بلیغ کی ہے
مثلہ شرحاً موضحاً فائقاً لائقاً — ایسی واضح اور خیالات سے ممتاز اور طلبہ کے لیے
نافعاً للطلاب — مفید کوئی دوسری شرح ہم نے نہیں پائی۔

گویا ملا احمد عبد الحق کی شرح سے پہلے بھی کچھ شرحیں لکھی جاچکی تھیں جو بہت واضح اور طلبا کیلئے زیادہ مفید نہیں تھیں، اس شرح سے پہلے دوسری شرحوں کے وجود کا علم ملا صاحب ہی کی ایک دوسری تحریر سے پوری صراحت کے ساتھ ہوجاتا ہے، وہ سلم العلوم کی نازک خیالیوں اور باریک بینیوں کی تعریف کرنے کے بعد اپنی شرح (تصورات) کے دیباچے میں لکھتے ہیں:-

"سلم العلوم کے طلباء کے لیے کتاب کے مشکلات کا بغیر امداد کے سمجھنا ممکن نہ تھا، اگرچہ اس کتاب کی شرحیں کی گئی تھیں جن میں بعض غیر ضروری طور پر طویل تھیں، اور بعض کتاب کے مطالب سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں (یعنی غلط شرحیں تھیں)، نہ ان سے کتاب کے نکات کھلتے تھے اور نہ مبتدی طلباء کے لیے ان میں کوئی نفع تھا، تو مجھے خیال ہوا کہ سلم کی ایک مفصل، واضح اور مطالب سے پردہ اٹھا دینے والی شرح کروں تو پہلے میں نے سلم کے مبحث تصدیقات کی شرح کی، اس کے بعد مبحث تصورات کی بدرجۂ اتم واکمل شرح لکھی۔" (عربی عبارت کا ماحصل اپنے الفاظ میں)

بہرحال جب ملا احمد عبد الحق کی شرح جو ۱۱۳۶ھ میں (مبحث تصدیقات تک) پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی، اولین شرح ثابت نہیں ہوپاتی تو قاضی مبارک کی شرح سلم یعنی "قاضی مبارک" جو ۱۱۴۳ھ میں مکمل ہوئی، اولین شرح کیسے ہوسکتی ہے۔

قاضی مبارک شارح سلم کے بارے میں مشہور اور بعض متاخر کتابوں میں مرقوم ہے کہ وہ میرزاہد ہروی

کے شاگرد تھے، میرزاہد کی شاگردی ایک ماہر علوم عقلیہ کے لیے یقیناً مایۂ افتخار ہے، لیکن شاگردی کی اس شہرت کا تسلیم کرنا بہت دشوار ہے، جب تک معاصر تذکروں میں اس کی صراحت نہ مل جائے، ظاہری قرائن اس کے بالکل خلاف جاتے ہیں،

خاندان گوپامئو کے ایک صاحب تصنیف اور واقف انساب بزرگ حکیم محمد بہاء الدین مرحوم نے اپنے انتقال سے کچھ مہینے پہلے ایک استفسار کے جواب میں تحریر کیا تھا، یہ (قاضی مبارک) اپنے خاندانی بزرگ ملا قطب الدین الشہیر بہ ملا قطب اول کے شاگرد تھے، اور کچھ حضرت حاجی صفۃ اللہ خیرآبادی سے پڑھیں، میرزاہد ہروی کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا... ۱۱۶۲ھ میں وفات پائی۔

حکیم صاحب مرحوم نے بھی میرزاہد سے تلمذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا، اور محض سرسری اس کا ذکر کیا ہے، خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی شہرت کو قابل اعتماد قرار دے کر یہ تحریر کر دیا۔

پہلی بات یہ دیکھنے والی ہے کہ میرزاہد کا سنہ وفات ۱۱۰۱ھ اور قاضی مبارک کا ۱۱۶۲ھ اگر قاضی صاحب نے میر صاحب سے پڑھا ہے، اور سماً نہیں بلکہ پڑھنے کے لائق پڑھا، اور میر صاحب کی بالکل آخری عمر میں پڑھا تو قاضی صاحب کی عمر ۱۱۰۱ھ میں تخمیناً ۱۵-۱۶ سال ہونا چاہئے اور قاضی صاحب کی عمر وفات کے وقت لگ بھگ اسی سال ہوگی، یہ طویل عمری اگر ہوتی تو تذکروں میں اس کی صراحت بھی ہوتی،

اور جب اس امر کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ میرزاہد کی آخری عمر کابل میں بسر ہوئی تو قاضی مبارک کے بارے میں یہ بھی صراحت ملنا چاہیے کہ وہ بغرض حصول تعلیم کابل تک گئے تھے۔

میرزاہد کے بارے میں لکھا ہے:-

فلما تولی السلطان عالمگیر یعنی	(شاہجہاں کے بعد جب عالمگیر بادشاہ ہوا
ایضاً علی تلک الخدمۃ بایام کثیرۃ	تو میرزاہد اسی خدمت (کابل کی وقائع نگاری)

ثم اتصل الیٰ معسکرہ ولاہ	پر بہت دنوں تک مامور رہے پھر وہ
احتساب عسکرہ سنہ ۱۰۷۷ھ	عالمگیر کی چھاؤنی میں واپس آئے تو بادشاہ
ثم سلمہ السلطان صدارۃ	نے انھیں چھاؤنی کا محتسب مقرر کر دیا۔
کابل فاعاد الیہا و اشتغل	۱۰۷۷ھ کی بات ہے، پھر بادشاہ نے کابل
بالدرس حتی صار استاذ	کی صدارت ان کے سپرد کر دی اور وہ اپنے
الکل	پرانے عہدے پر لوٹ آئے (اور کابل پہنچکر)
(منقول از تقریظ نوشتۂ مولوی محمد سعد اللہ	درس و تدریس میں مشغول ہو گئے، یہانتک
بر رسالۂ قطبیہ مطبوعۂ قدیم)	کہ کلیت استاد کا درجہ حاصل کر لیا۔

اس سلسلے میں یہ بھی تحریر ہے :-

وقد سلط علیہ فی آخر عمرہ	میرزاہد ہروی آخری عمر میں انتہائی پرہیزگار
غایۃ التورع والاحتیاط فاستعفیٰ	اور محتاط ہو گئے تھے جنھوں نے تمام عہدوں
عن کل المناصب واشتغل بعبادۃ	سے استعفا دیدیا تھا، اور معبود حقیقی کی عبادت
المعبود الحق وتاب سائر المعاصی	میں تمام لغویات سے تائب ہو کر مشغولیت
حتی لقی اللہ عزوجل سنہ ۱۱۰۱ھ	اختیار کر لی تھی، یہانتک کہ ۱۱۰۱ھ میں
	وہ لقائے خداوند تعالیٰ سے فائز ہو گئے۔

مطلب یہ ہوا کہ قاضی مبارک نے اگر ان کے سامنے زانوے شاگردی تہ کیا تھا تو اولاً یہ کہ وہ کابل گئے ہوں گے، ثانیاً یہ کہ کابل جانے کے وقت ان کی اتنی عمر ضرور ہوگی کہ وہ ہردوئی، یا دلی و شاہجہان آباد سے بغرض حصول تعلیم جا سکتے ہوں، اور ثالثاً یہ کہ میرزاہد کے انتقال سے چند سال قبل وہاں پہنچے ہونگے اور ان سے پڑھا ہوگا، کیونکہ آخری عمر میں میرزاہد صرف معبود حقیقی کی عبادت میں مشغول ہو گئے تھے۔

ان سب چیزوں کو حساب میں رکھا جائے تو ایک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ میرزاہد کے انتقال کے وقت (۱۱۰۱ھ) قاضی مبارک کی عمر بیس سال سے متجاوز ہوگی اور قاضی مبارک کا جب ۱۱۶۲ھ میں انتقال ہوا تو وہ اسّی سال سے بھی متجاوز ہو چکے تھے ،

عقلاً اس اندازے میں کوئی سقم نہیں ہے، لیکن تذکرہ نویسوں کی عادت کے پیش نظر یہ وہ امور ہیں جن کی صراحت تذکروں میں ضرور ہونا چاہئے ،

اگر قاضی مبارک کا سال پیدائش معلوم ہو جاتا تو قصہ طے تھا، اور کسی قیاس آرائی کی ضرورت باقی نہ رہتی، افسوس ہے کہ اس جستجو میں ابتک کامیابی نہیں حاصل ہوسکی ،

قاضی مبارک کے سنہ پیدائش کی صراحت تو نہیں، ایک اشارہ ضرور ملتا ہے ۔

پرگنہ گوپامئو کے منصب قضا کے بارے میں قاضی مبارک کے نام مغل بادشاہ کا جو فرمان صادر ہوا تھا، اس میں " کام کی حد تخمیناً ۴۰ سالہ" مرقوم ہے، یہ فرمان عہد محمد شاہ میں معتمد الملک میرجملہ معظم خان خانجہاں بہادر مظفر جنگ وزیر اعظم و ظہیر الدولہ اعظم خاں بہادر مجاہد جنگ صدر الصدور کی مہروں کے ساتھ ۱۰ ربیع الاول ۹ھ جلوس محمد شاہ بادشاہ کو صادر ہوا تھا جس کو ہجری سال سے مطابق کرنے سے ۱۱۳۹ھ نکلتے ہیں ،

اگر ۱۱۳۹ھ میں قاضی صاحب کی عمر تخمیناً ۴۰ سال تھی تو ان کی پیدائش تخمیناً ۱۰۹۹ھ میں ہوئی، اور جب میرزاہد ہروی کا ۱۱۰۱ھ میں انتقال ہوا تو قاضی مبارک کی عمر تخمیناً ۹-۱۰ سال تھی، دس سال کی عمر میں قاضی مبارک کا کابل جا کر میرزاہد سے پڑھنا مستبعد اور سراسر خلاف قیاس ہے ،

قاضی مبارک کی شاگردی کے بارے میں جو صراحتیں قدیم تذکروں میں ملتی ہیں ان میں کہیں میرزاہد سے شرف تلمذ کا ذکر نہیں ہے ۔

" آمدنامہ" (مولفہ مولانا فضل امام خیرآبادی متوفی ۱۲۴۴ھ) میں ہے :-

"قاضی مبارک شاگرد ملا قطب گوپاموی ست و بعض کتب از شاہ حاجی صنعۃ اللہ خیرآبادی

اخذ کردہ"

رسالۂ قطبیہ (مولفہ مولانا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی متوفی ۱۲۲۵ھ) میں استاد قاضی مبارک یعنی

ملا قطب گوپاموی کو اپنے والد قاضی شہاب گوپاموی کا شاگرد لکھا ہے، اور قاضی شہاب گوپاموی

کو ملا قطب الدین شہید سہالوی کا شاگرد لکھا ہے۔

ملا قطب الدین شہید سہالوی (متوفی ۱۱۰۳ھ) کے تلامذہ کے ذکر میں صاحب رسالۂ قطبیہ

نے قاضی شہاب گوپاموی کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:-

"عالم مدرس باعمل بودند اعلیٰ شاگردان شان ملا قطب خلفش و ملا محمد صالح کہ در بنگالہ بود

و نیز شاگرد میر زاہد بودند و قطب مسطور تصانیف میر زاہد از ملا مذکور سند کردہ اند چنانچہ

ملا واجد الدین ولد قطب مسطور فخر دریں معنی می کردند"

یعنی قاضی شہاب گوپاموی (شاگرد ملا قطب الدین شہید سہالوی) کے خاص شاگرد ان کے بیٹے

ملا قطب گوپاموی اور ملا محمد صالح تھے، ملا محمد صالح بنگال میں رہتے تھے اور میر زاہد کے شاگرد بھی

تھے، ملا صالح سے ان کے استاد کے بیٹے اور ہم استاد ملا قطب نے میر زاہد کی تصانیف کی

سند اور اجازت بھی حاصل کر لی تھی، چنانچہ ملا قطب گوپاموی کے بیٹے ملا واجد الدین اپنے باپ

کو اس سند اور اجازت حاصل ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قاضی مبارک ہی نہیں بلکہ

ان کے استاد ملا قطب الدین گوپاموی نے بھی میر زاہد سے شرف تلمذ حاصل نہیں کیا بلکہ قاضی صاحب

کے استاد نے میر زاہد کے ایک شاگرد ملا محمد صالح سے میر زاہد کی تصانیف کی اجازت (جو رسما

ایک کارروائی ہوتی ہے) حاصل کی۔

رسالۂ قطبیہ کی ایک عبارت جو قاضی مبارک کے بارے میں ہے بڑی مشتبہ ہے، متعدد قلمی نسخوں کے

دیکھنے سے بھی یہ اشتباہ رفع نہیں ہوا، تمام نسخوں کی عبارت یکساں ہے اور وہ یہ ہے :-

" و قاضی مبارک شارح سلم وزواہد ثلثہ و ملا اشرف شارح سلم اعلیٰ شاگردانش ملا محمد صالح "

" اعلیٰ شاگردانش " میں ضمیر کا مرجع نہیں کھلتا، اگر مطلب یہ ہے کہ ملا محمد صالح اعلیٰ شاگرد ہیں قاضی مبارک کے یا ملا اشرف شارح سلم کے تو یہ رسالہ قطبیہ کی اس سے اوپر والی عبارت کے خلاف پڑتا ہے، جس میں ملا محمد صالح کو قاضی شہاب گوپاموی کا اعلیٰ شاگرد لکھا گیا ہے، اس کے علاوہ قاضی مبارک کے استاد ملا قطب گوپاموی کے بارے میں ہے کہ انھوں نے میرزاہد کی تصانیف کی اجازت ملا محمد صالح سے حاصل کی تو کیسے ہو سکتا ہے کہ استاد تو ملا صالح سے اجازت لے اور اس کا شاگرد ملا صالح کو پڑھائے، جب کہ ملا صالح میرزاہد سے بھی پڑھ چکے ہیں۔

اگر یہ کتابت کی غلطی ہے (اور یہ کتابت کی غلطی ہی ہو سکتی ہے) تو اصل عبارت " اعلیٰ شاگردان ملا صالح اند" ہے، یعنی قاضی مبارک اور ملا اشرف، ملا محمد صالح کے خاص شاگرد ہیں، یہ قرین قیاس بھی ہے کہ قاضی مبارک نے ملا قطب الدین گوپاموی سے بھی پڑھا اور ان کے استاد بھائی ملا محمد صالح سے بھی پڑھا، اس کے بعد یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ قاضی مبارک کو میرزاہد ہروی کا شاگرد جو کہا جاتا ہے تو کیسے کہا جاتا ہے، قاضی مبارک نے جب ملا محمد صالح سے پڑھا اور ان کے خاص شاگرد ہوئے تو بیک واسطہ میرزاہد کے بھی شاگرد ہوئے، کیونکہ قاضی صاحب کے استاد ملا صالح براہ راست میرزاہد کے شاگرد تھے۔

خود قاضی مبارک نے شرح سلم میں جو " قاضی مبارک" کے نام سے مشہور ہے، بعض مقامات میں جا بجا میرزاہد ہروی کو " قال الاستاذ " لکھکر یاد کیا ہے، ظاہر ہے کہ استاد کا استاد " الاستاذ " قطعاً ہے، اگر قاضی صاحب " قال استاذی " کہتے تو بلاشبہ ان کو میرزاہد کا شاگرد ماننا پڑتا، چاہے قرائن ظاہری اس کے کتنے ہی خلاف ہوتے۔

ابوحیان توحیدی

از جناب مولوی شاہ محمد شبیر عطا صاحب ندوی

(۳)

ابوحیان توحیدی کی تصنیفات | ابوحیان توحیدی کی اکثر کتابیں دست برد زمانہ کی نذر ہوگئیں، اب چند ہی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں اپنی اکثر کتابیں خود جلوادی تھیں، گو امام سیوطی اور طاش کبری زادہ اس نظریہ سے متفق نہیں ہیں، ان کا بیان ہے کہ ابوحیان توحیدی کی تصنیفات نے اس کی زندگی ہی میں قبول عام حاصل کر لیا تھا، جلائے جانے کا ان پر اثر نہیں پڑا۔[۱]

بہرحال ابوحیان توحیدی کی مندرجۂ ذیل تصنیفات کا پتہ چل سکا ہے :۔

ادبی تصنیفات | (۱) الامتاع والموانسہ۔ یہ کتاب تین جلدوں میں مصر سے شائع ہو چکی ہے، ڈاکٹر احمد امین اور احمد الزین نے اس پر گرانقدر حواشی اور تعلیقات کا اضافہ کیا ہے۔ الامتاع ابوحیان توحیدی کی وہ معرکۃ الآراء کتاب ہے جس پر وہ فخر کر سکتا ہے، اس میں اس نے بے نظیر استحضار اور محیر العقول حافظہ کا مظاہرہ کیا ہے، یہ اس کے علمی و ادبی محاضرات کا مجموعہ ہے، جس میں اس نے ان سوالات کے جوابات دیئے ہیں جو ابن عارض کی جانب سے کئے گئے تھے۔ الامتاع الف لیلہ کے طرز کی ایک کتاب ہے، فرق یہ ہے کہ الف لیلہ ایک ہزار راتوں پر مشتمل ہے اور الامتاع صرف چالیس

---

[۱] بغیۃ الوعاۃ ص ۳۴۸ و مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۱۸۸

راتوں پر، الف لیلہ میں زیادہ تر واقعات افسانوی اور تخیلی ہیں، اس کے برعکس الامتاع کے مباحث عقلی اور واقعاتی ہیں، یہ تمام مباحث ابن عارض کے پیش کردہ ہیں، اور ابوحیان توحیدی نے فی البدیہہ ان کے جوابات دیئے ہیں جو انتہائی عالمانہ اور بڑے سنجیدہ ہیں، جس سے ابن عارض کے تبحر اور ابوحیان توحیدی کی عبقریت دونوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے، عام طور پر گفتگو کا آغاز ابن عارض کیجانب سے ہے، گفتگو کے خاتمہ پر وہ ابوحیان سے یہ فرمایش کرتا ہے کہ وہ اس بحث کے حسب حال کوئی دلچسپ شعر یا پھڑکتا ہوا فقرہ کہے، ابوحیان توحیدی ان مسامرات کو روزانہ قلمبند کرکے اس کی نقل ابوالوفاء کو بھیجدیتا تھا[1]،

الامتاع میں جو مباحث ہیں وہ زیادہ تر بغداد سے تعلق رکھتے ہیں اور ابوحیان ان کا عینی شاہد ہے، اس لیے ان کے بارہ میں اس کی رائے زیادہ وقیع ہے، ان مباحث کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ابوحیان نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے، اس لیے اس نے اپنے دوست ابوالوفاء سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اس میں رازداری سے کام لیگا،

الامتاع کے ذریعہ عہد بویہی کی ثقافت اس زمانہ کی عقلی اور علمی سرگرمیوں کا بھی علم ہوتا ہے، اس کتاب میں دو ایسے واقعات بھی ہیں جو ادب اور تاریخ کی دوسری کتابوں میں نہیں نظر آتے، اس سے اس کتاب کی وقعت اور بڑھ جاتی ہے،

(۱) ایک اس مناظرہ کی دلچسپ روداد جو وزیر اعظم ابن فرات کے حضور میں یونانی منطق اور عربی نحو کے بارے میں متی بن یونس اور ابوسعید سیرانی کے درمیان ہوا تھا[2]۔

(۲) دوسرے اخوان الصفا کے بارے میں بعض اہم انکشافات، چنانچہ بعد کے مورخ اخوان الصفا کے حالات کے بارے میں ابوحیان ہی کو اپنا ماخذ قرار دیتے ہیں

---

[1] الامتاع ج ۱ ص ۲۲۲ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ابن عارض کون تھا؟ جس نے الامتاع کا مواد فراہم کیا۔ ابوحیان کا بیان ہے کہ ابن عارض وزیر کے عہدہ پر فائز تھا۔ عارض کی تعریف امام سمعانی نے کتاب الانساب میں یہ کی ہے: من یعرف العسکر ویحفظ ارزاقھم ویوصلھا الیھم ویعرضھم علی الملک اذا احتیج الی ذالک[1]" اس لیے اردو میں ہم اس عہدہ کو بخشی کے عہدہ سے تعبیر کر سکتے ہیں، عام طور پر ابن عارض اور ابن سعدان دو علحدہ شخصیتیں سمجھی جاتی ہیں جو صحیح نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ابن سعدان ہی کا دوسرا نام ابن عارض ہے، اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل دلائل ہیں:-

۱۔ ابوعبداللہ حسین بن احمد بن سعدان نے ۳۷۳ھ تا ۳۷۵ھ صمصام الدولہ کی وزارت کے عہدہ پر رہا، ممکن ہے بخشی گیری کے عہدہ پر وزارت سے پہلے رہا ہو، یا یہ عہدہ اس کے خاندان میں موروثی چلا آرہا ہو۔

۲۔ ابوحیان توحیدی ۳۷۰ھ میں رے سے واپس آیا ہے، اسی زمانہ میں اس کی ملاقات ابوالوفا سے ہوتی ہے، ابوالوفا اس سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ اسے ابوعبداللہ العارض وزیر اعظم کے یہاں باریاب کرا دے گا، اور ۳۷۳ھ سے ۳۷۵ھ تک ابن سعدان ہی وہ شخص ہے جو وزارت عظمی کے عہدہ پر تھا، اور جس کی کنیت ابوعبداللہ ہے۔

۳۔ ابوحیان توحیدی اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتا ہے کہ اس نے بغداد کے پل پر وزیر ابن بقیہ کو

---

[1] کتاب الانساب للسمعانی (لندن اڈیشن) [2] ابن بقیہ عضد الدولہ کا وزیر تھا، عضد الدولہ نے کسی جرم پر اسے سولی دیدی تھی، مشہور شاعر ابوالحسن انباری نے ابن بقیہ کا مرثیہ لکھا ہے، جو عربی کے بے مثل مرثیوں میں ہے، مرثیہ کا مطلع یہ ہے

علو فی الحیاۃ وفی الممات ۔۔۔ لحق انت احدی المعجزات

(باقی حاشیہ ص ۲۰۲ پر)

کو سولی پر لٹکا ہوا دیکھا، وہ یہ عبرت ناک منظر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا "سبحان اللہ، قاتل (عضد الدولہ) زیر زمین اور مقتول (ابن بقیہ) زیر آسمان"، ابوحیان نے وزیر اعظم ابو عبد اللہ سے جب یہ واقعہ بیان کیا تو اس نے کہا، میں نے جہاں پناہ سے ابن بقیہ کی تدفین کی اجازت حاصل کر لی ہے۔ (الامتاع ج اول ص ۴۲)

یہ مسلّم ہے کہ ابن بقیہ کو عضد الدولہ نے سولی دیدی تھی، اور اس پر بھی مورخین کا اتفاق ہے کہ ابن بقیہ کی لاش عضد الدولہ کے جانشین صمصام الدولہ کے عہد میں سولی سے اتاری گئی، اس وقت وزارت کے عہدہ پر ابن سعدان ہی تھا جس کی کنیت بھی ابو عبد اللہ تھی، اس لیے ابن سعدان کے سوا کوئی دوسری شخصیت نہیں ہو سکتی جس کی کنیت بھی ابو عبد اللہ ہو اور جو وزیر بھی ہو۔

۴۔ ابوحیان توحیدی نے اپنی دوسری مشہور کتاب الصدیق والصداقہ بھی ابن سعدان ہی کی فرمائش پر لکھی تھی، اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن سعدان اور ابن عارض ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ الصدیق والصداقہ کے شروع میں ابوحیان کے الفاظ پر غور کیجئے

ان السبب کان فی انشاء هذه	اس رسالہ کی تالیف کا سبب یہ ہوا کہ میں نے
الرسالة انی ذکرت شیئاً منها	(شاید تصنیف سے پہلے) اس رسالہ کے کچھ اقتباسات
لزید بن رفاعة ابی الخیر فنماه	ابو الخیر زید بن رفاعہ کو سنائے تھے، اس نے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۱) ابن عماد حافظ ابن عساکر کے حوالہ سے لکھتے ہیں "ابو الحسن انباری نے مرثیہ لکھ کر بغداد کی ایک پبلک سڑک پر پھینک دیا تھا۔ لوگوں نے اٹھا کر دیکھا تو ابن بقیہ کا مرثیہ تھا، رفتہ رفتہ بادشاہ تک خبر پہنچی، اس نے جب اس مرثیہ کو سنا تو کہا کاش میں ابن بقیہ کی جگہ پر ہوتا اور میرے لیے یہ مرثیہ کہا گیا ہوتا۔ ابو الحسن انباری بادشاہ کے خوف سے روپوش ہو گیا تھا، آخر صاحب بن عباد نے امان دے کر بلایا، صاحب نے دربار عام میں اس سے مرثیہ پڑھنے کی فرمائش کی، جب وہ اس شعر پر پہنچا

ولم ار قبل جذعك قط جذعا ‖ تمكن من عناق المكرمات

تو صاحب نے اپنے تخت سے اتر کر شاعر کی پیشانی چوم لی، اور اپنے اثر و رسوخ سے عضد الدولہ سے شاعر کی جان بخشی کا وعدہ بھی لے لیا۔ (شذرات الذہب ج ۳ ص ۷۴)

الی ابن سعدان سنة احدی	اس کا تذکرہ ۳۷۱ھ میں ابن سعدان سے کردیا،
وسبعین وثلاث مائة قبل تقلده	یہ اس وقت کا قصہ ہے جب وزارت کی
اعباء الدولة وتدبیرہ امر	ذمہ داریوں سے گرانبار نہیں ہوا تھا، اور
الوزارة حین کانت الاشغال	اس کی زندگی پرسکون اور حالات معمول پر تھے،
خفیفة والاحوال علی اذلالها	ابن سعدان نے کہا کہ زید نے مجھ سے تمہارے
جاریة فقال ابن سعدان	بارے میں فلاں فلاں باتیں بیان کی ہیں، میں نے
قد قال لی زید عنك کذا وکذا	کہا وہ صحیح ہیں، تو اس نے کہا اس کو مزو
قلت قد کان ذلك قال فدون	دون اور ایک سلسلہ میں منسلک
هذا الکلام وصله لصلابة ..."	کرلو۔

الصدیق والصداقہ وہ کتاب ہے جس میں ابوحیان نے اپنی زندگی کی ناکامیوں پر آنسو

بہائے ہیں،

۵۔ الامتاع والموانسہ میں وزیر اعظم ابن عارض کے جن حاشیہ نشینوں اور مصاحبوں کا تذکرہ آیا ہے، الصدیق والصداقہ میں بعینہ وہی افراد ابن سعدان کے گرد نظر آتے ہیں، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ابن سعدان اور ابن عارض ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔[1]

۶۔ مسکویہ کی تاریخی کتابوں میں تجارب الامم اور اس کا تتمہ بڑے پایہ کی کتابیں ہیں، ان تاریخوں میں ابن سعدان کے حالات بڑی تفصیل سے درج ہیں، الامتاع والموانسہ میں جس وزیر کے حالات ہیں اس کی تمام خصوصیات ابن سعدان میں پائی جاتی ہیں، اس میں تاریخی جھلکیاں بھی ہیں، درباری سازشیں بھی ہیں، علمی صحبتوں کا تذکرہ بھی ہے، ابن مسکویہ ایک مشہور حکیم

[1] الصدیق والصداقہ ص ۱۰۳

اور ماہر اخلاقیات، ابن زرعہ نامور عیسائی فلسفی، ابوالوفا، فاضل ریاضی داں، ابن حجاج مشہور شاعر اور ابوحیان جیسا عبقری ابن سعدان ہی دربار کے نورتن ہیں، جو ابن عارض کے دربار میں بھی نظر آتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ ابن سعدان کے لیے ابن عارض کا استعمال ابن مسکویہ یا ابن شجاع اور ابن اثیر نے نہیں کیا ہے، لیکن ابوحیان چونکہ اس کے خاندانی حالات سے واقف تھا، اور اس کو وزیر سے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا، اس لیے وہ ابن سعدان کو کبھی ابن عارض کے نام سے بھی یاد کرتا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ابن سعدان اور ابن عارض دو شخصیتیں ہیں، صحیح نہیں ہے، اسی غلط فہمی کا شکار ڈاکٹر ذکر دعلی جیسے مورخ بھی ہوئے لیکن مندرجہ بالا دلائل سے اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے،

الامتاع کے سلسلہ میں ایک بحث ابھی اور باقی ہے، وہ یہ کہ الامتاع کس کی فرمائش پر لکھی گئی؟ میں نے اوپر بتایا ہے کہ ابوالوفا کی فرمائش پر لکھی گئی، اور اسی کے نام ابوحیان نے اس کو معنون بھی کیا ہے، لیکن جمال الدین قفطی مصنف اخبار العلماء باخبار الحکماء کو اس سے اختلاف ہے، اس کی رائے میں کتاب ابوالوفا، کے لیے نہیں، ابوسلیمان منطقی کے لیے لکھی گئی ہے، وہ لکھتا ہے:

ان اباسلیمان کان اعور وکان[1]	ابوسلیمان یک چشم تھا، اس کے جسم پر سفید داغ
وضحٍ وکان ذلک سبب انقطاعہ	بھی تھے، اس لیے وہ سوسائٹی سے الگ تھلگ
عن الناس ولزومہ منزلہ	اپنے گھر میں گوشہ گیر تھا، اس کے پاس صرف
فلا یأتیہ الا مستفید وطالب علم	وہی لوگ آتے تھے جو اس چشمۂ علم سے سیراب
فکان یشتھی الاطلاع علی	ہونا چاہتے ہوں، ابوسلیمان کو حکومت کے
اخبار الدولۃ وعلوما یحدث	حالات وحوادث سے بھی دلچسپی تھی، اور

فیھا.... وکان ابوحیان التوحیدی	اور اس سے وہ باخبر رہا جاتا تھا، ابوحیان
من بعض اصحابہ المختصین بہ	توحیدی اس کے خاص شاگردوں میں تھا، وہ
وکان یغشی مجالس الرؤساء	امراء کی محفلوں میں جاتا رہتا تھا اسلئے اس کو ہر قسم
ویطلع علی الاخبار ومعاملہ	کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے جب اسکو
من ذلک نقلہ الیہ وحاضرہ بہ	کوئی خبر ملتی تھی تو اپنے استاد سے نقل کر دیتا تھا،
ولاجلہ صنف کتاب الامتاع	اور اس کے لیے اس نے الامتاع والموانسہ
والموانسۃ[1] الخ	لکھی تھی،

لیکن قفطی کو خود تسامح ہوا ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ الامتاع ابوالوفا ہی کے لیے لکھی گئی ہو ابوسلیمان کے لیے نہیں، اس بارے میں حسب ذیل دلائل ہیں:

۱۔ الامتاع والموانسہ میں ابوسلیمان پر چند سخت تنقیدیں ہیں، اگر وہ ابوسلیمان کے لیے لکھی جاتی تو اس میں یہ تنقیدیں نہ ہوتیں یا ان کا لب ولہجہ نرم ہوتا،

۲۔ الامتاع میں کثرت سے ابوسلیمان کے اقوال درج کیے گئے ہیں، اگر وہ اس کے لیے لکھی گئی ہوتی تو خود ابوسلیمان کو اسی کے اقوال سنانے کی ضرورت کیا تھی،

۳۔ الامتاع میں ابوحیان اس شخص سے صلہ کا بھی طالب ہے جس کے لیے اس نے کتاب لکھی ہے، ابوسلیمان کے افلاس کا یہ حال تھا کہ وہ مکان کا کرایہ بھی مشکل سے ادا کر پاتا تھا، ایسے شخص سے وہ صلہ کا کیا طالب ہوتا[2]، اس کے برعکس ابوالوفا اس پایہ کا شخص تھا کہ وزیر اعظم بھی اسے "شیخنا" کہہ کر یاد کرتا تھا، وہ بغداد میں بڑی شان سے رہتا تھا، بڑے بڑے امراء سے اس کے تعلقات تھے اسی نے ابوحیان کو البیمارستان العضدی میں ملازمت دلائی تھی، اور اس کو ابن سعدان (وزیر اعظم)

[1] اخبار الحکماء ص ۲۸۳ [2] الامتاع ج ۳ ص ۱۳۰

تک پہنچایا تھا، اس لیے مختلف حیثیتوں سے ابوالوفا کی وہ پوزیشن تھی جس سے ابو حیان صلہ کا طالب ہو سکتا تھا،

۴۔ الامتاع میں ہے کہ ابن سعدان نے ابو حیان سے کہا، ابوالوفا کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے، اس نے جواب دیا، ابوالوفا کے لیے تو میرے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، اسی نے مجھکو اس بارگاہ تک پہنچایا ہے،

(۲) الصداقة والصدیق۔ (الصداقة والصدیق) پہلی بار اسے الجوائب نے ۱۳۰۱ھ میں قسطنطنیہ سے شائع کیا، پھر ۱۳۲۳ھ میں یہی کتاب قاہرہ سے الادب والانشاء فی الصداقة والصدیق کے نام سے دوبارہ شائع ہوئی۔

دوست اور دوستی کے بارے میں جس قدر مواد فراہم ہو سکتا ہے، وہ سب اس میں موجود ہے کتاب کے ہر لفظ سے ابو حیان توحیدی کا یہ تاثر نمایاں ہے:

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا　　　بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

اخوانیات کے موضوع پر ادب میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے، اس کتاب میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں، وہاں یہ نقص بھی ہے، کہ وہ ترتیب و تبویب سے محروم ہے اور اسکی حیثیت کشکول کی ہے، یاقوت اس کتاب کو بہت پسند کرتا ہے، اس نے لکھا ہے "کتاب حسن نفیس[1]"

(۳) الهوامل والشوامل۔ یہ کتاب ڈاکٹر احمد امین اور احمد الصقر کے حواشی و تعلیقات کے ساتھ ۱۳۷۰ھ میں قاہرہ سے پہلی بار شائع ہوئی، اس میں زیادہ تر فلسفیانہ مباحث ہیں جو ادبی انداز میں پیش کیے گئے ہیں، اس کتاب میں ابن مسکویہ اور ابو حیان توحیدی کے علمی مذاکرات دیکھنے کے لائق ہیں۔

---

[1] معجم الادباء ج ۵ ص ۳۸۰ (قدیم اڈیشن)

(۴) البصائر والذخائر۔ اس کتاب کا پورا نام بصائر القدماء و سرائر الحکماء ہے، اس کی تالیف میں ابوحیان نے ۱۵ سال (۳۵۰ھ تا ۳۶۵ھ) صرف کئے[۱]، پوری کتاب دس جلدوں میں ہے اس کا ایک قلمی نسخہ کتبہ سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ میں موجود ہے، یہ نسخہ ۶۱۶ھ کا مکتوبہ ہے اور پانچ جلدوں میں ہے، البصائر کا دوسرا نسخہ کیمبرج یونیورسٹی لندن میں ہے، یہ نسخہ پہلی اور دوسری جلد پر مشتمل ہے، اور ۱۱۱۶ھ کا مخطوطہ ہے، تیسرا نسخہ جو صرف نویں و دسویں جلد پر مشتمل ہے، قسطنطنیہ کے ایک دوسرے کتب خانہ میں دستیاب ہوا ہے[۲]،

۱۹۵۳ء میں البصائر کی پہلی جلد ڈاکٹر احمد امین اور احمد الصقر کی نگرانی میں شائع ہوئی ہے، اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ابوحیان توحیدی کے ان الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے "ثمرۃ العمر و زبدۃ الایام و ودیعۃ التجارب"۔ توحیدی نے کتاب کے مقدمہ میں اپنے ماخذ کا بھی تذکرہ کیا ہے، ان میں جاحظ کی تصنیفات سرفہرست ہیں، اس کے علاوہ مندرجۂ ذیل کتابیں بھی اس کے پیش نظر رہیں:

۱۔ کتاب النوادر (ابو عبداللہ محمد بن زیاد الاعرابی)

۲۔ عیون الاخبار (ابن قتیبہ)

۳۔ مجالس ثعلب

۴۔ کتاب المنظوم والمنثور (احمد بن ابی طاہر طیفور مؤلف کتاب بغداد)

۵۔ کتاب الاوراق (الصولی)

۶۔ کتاب الوزراء (الجہشیاری)

۷۔ کتاب الحیوانات (قدامہ)

۸۔ کتاب الکامل (المبرد)

[۱] معجم الادباء ج ۱۵ ص ۶ [۲] ابوحیان توحیدی ص ۴۰ ڈاکٹر ابراہیم کیلانی

(۵) ذم الوزیرین۔ یہ رسالہ مختلف ناموں سے مشہور ہے، ابن خلکان نے مثالب الوزیرین[1] حاجی خلیفہ نے قلب الوزیرین[2]، اور یاقوت نے اخلاق الوزیرین کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے[3] اس رسالہ کی اکثر عبارتیں صاحب بن عباد کے حالات کے ضمن میں یاقوت نے نقل کی ہیں، ذم الوزیرین کا مخطوطہ قسطنطنیہ میں موجود ہے۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱ ص ۳۳۳)

(لطیفہ) مثالب الوزیرین یا ذم الوزیرین کے بارے میں ابن خلکان کا یہ ریمارک سننے کے قابل ہے:

هذا الكتاب من الكتب المحذورة	یہ کتاب ممنوعہ کتابوں میں ہے، یہ کتاب
ما ملكه احد الا وانعكست	جس شخص کی ملک میں بھی رہی اس پر تباہی
احواله ولقد جربت ذلك و	آئی۔ خود میں نے اور دوسرے لوگوں نے
جربه غيري[4]	اس کا تجربہ کیا ہے۔

(۶) النوادر۔ یہ کتاب ناپید ہے، توحیدی نے المقابسات میں اس کا تذکرہ کیا ہے[5]۔

(۷) تقریظ الجاحظ۔ یاقوت نے سیرافی اور دینوری کے حالات میں اس کتاب کے اقتباسات نقل کیے ہیں[6]۔

(۸) رسالۃ الحنین الی الاوطان۔ یاقوت نے اس رسالہ کا تذکرہ معجم الادباء میں کیا ہے[7]،

(۹) رسالۃ فی علم الکتابۃ۔ توحیدی خود بھی اچھا خطاط تھا، اس لیے اس نے اس رسالہ میں فن خوشنویسی پر جو کچھ لکھا ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے، اس میں عربی خط اور اس کے اقسام پر بڑی محققانہ بحثیں ہیں، یہ رسالہ اس مجموعہ میں شامل ہے، جسے ڈاکٹر ابراہیم کیلانی نے ثلاث رسائل لابی حیان توحیدی کے نام سے مصر سے شائع کیا ہے،

---

[1] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۴۰ [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۳۹۰ [3] معجم الادباء ج ۶ ص ۲۰۱ [4] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۶
[5] المقابسات ص ۸۸ [6] معجم الادباء ج ۳ ص ۳، و ج ۴ ص ۱۵۰ [7] ایضاً ج ۱۵ ص ۷

فلسفیانہ کتابیں (۱) المقابسات - یہ ابوحیان توحیدی کی مشہور تصنیف ہے۔ پہلی بار ۱۳۰۶ھ میں ملک الکتاب مرزا محمد شیرازی کے اہتمام میں بمبئی سے شائع ہوئی، دوسری بار مصر سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی، اس کا سب سے بہتر اڈیشن وہ ہے جو استاذ حسن سندوبی کی تعلیقات کے ساتھ شائع ہوا۔ المقابسات کے دو قلمی نسخے (پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے مخطوطے) مکتبہ خالدیہ تونس اور دارالکتب الظاہریہ دمشق میں موجود ہے۔ المقابسات کے بارے میں ڈاکٹر کیلانی نے حسب ذیل تاثرات ظاہر کیے ہیں۔

"یہ کتاب ایک سو چھ مقابسات پر مشتمل ہے، بعض مقابسے طویل ہیں بعض مختصر، یہ مقابسے مختلف موضوع رکھتے ہیں، یہ گویا چند فی البدیہ لکچر ہیں جو مختلف موقعوں پر اس مجلس علمی میں پیش کیے گئے تھے جو یحییٰ بن عدی نصرانی اور ابوسلیمان سجستانی منطقی کی صدارت میں ہوتی رہتی تھی۔ یہ مجلس علمی کبھی وزیر اعظم ابن عارض کے محل میں منعقد ہوتی کبھی سوق وراقین میں (جو باب بصرہ کے بالمقابل باب طاق کے پاس ہے) یا سجستانی کے کسی شاگرد کے یہاں۔ اس مجلس میں ہر طبقہ کے نمایندے اور ہر مذہب و ملت کے افراد (خواہ وہ کسی عقیدہ کے ماننے والے ہوں) شریک ہوتے، ان کے شرکا میں فلسفی، طبیب، ریاضی داں، ہیئت داں، مورخ، شاعر، ادیب، متکلم، غرض ہر صنف کے اصحاب کمال نظر آتے تھے، جو اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے دنیائے اسلام کے دور دراز علاقوں سے آتے تھے، عام طور پر مجلس میں فلسفہ اور تصوف کی بحثیں زیادہ ہوتیں، طالبان علوم (جنہیں) بیاضیں کھول کر بیٹھتے اور صدر محفل جو جواب دیتا اسے نوٹ کر لیتے، جب کسی مسئلہ پر اتفاق نہ ہوتا تو صدر اپنی رائے دیتا جس سے لوگوں کی تشفی ہو جاتی۔"[5]

صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

وهو كتاب مفيد جدا ولعل الحريري حذا حذوه[6]

یہ بڑی مفید کتاب ہے، معلوم ہوتا ہے حریری نے اسی کا چربہ اتارنے کی کوشش کی ہے۔

---

۵ ابوحیان ص ۳۰۰ ۶ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۷۹۲

ایک معاصر مورخ لکھتا ہے :-

ذکر المؤلف فی ھذا الکتاب بعض ما وقع لہ من مناظرات علماء عصرہ[1]	مولف نے اس کتاب میں ان علمی مذاکرات کا تذکرہ کیا ہے جو اس عہد کے علماء کے درمیان ہوا کرتے تھے ،

الکتفاء القنوع کا مصنف اڈورڈ فنڈیک لکھتا ہے :-

کتاب المقابسات ھذا من اہم الکتب لوقوف الباحث علی تاریخ الفلسفۃ[2]	فلسفہ کی تاریخ پڑھنے والے کے لیے یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے ،

(۲) رسالۃ فی ضلالات الفقہاء - یاقوت نے معجم الادباء میں اس کا تذکرہ کیا ہے[3] -

(۳) المحاضرات والمناظرات - یاقوت نے معجم الادباء میں ، ابن عربی نے مسامرات میں اور غزولی نے مطالع البدور میں اس کا تذکرہ کیا ہے[4] ،

(۴) الاقناع - کشف الظنون میں اس کا تذکرہ ہے[5] ،

(۵) التذکرۃ التوحیدیہ - غرر الخصائص الواضحہ کے مصنف نے اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے[6] ،

متصوفانہ تصنیفات الاشارات الالٰہیۃ والانفاس الروحانیہ - ڈاکٹر عبد الرحمٰن بدوی نے ۱۹۵۰ء میں قاہرہ سے اسے شائع کیا ہے ، اس کا ایک قلمی نسخہ دار الکتب الظاہریہ دمشق میں موجود ہے ، جو ۱۱۰۹ھ کا مخطوطہ ہے ، اس کتاب کا اختصار برلن کے کتب خانہ میں ہے[7] - الاشارات میں ۴۵ رسائل ہیں ، جو مواعظ اور ادعیہ پر مشتمل ہیں[8] ، ڈاکٹر کیلانی اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں :-

> یہ کتاب ادعیہ اذکار کے موضوع پر ہے ، اس میں ۴۵ ابواب ہیں جس میں ابوحیان توحیدی نے بڑے والہانہ انداز سے انتہائی دلکش زبان میں دعائیں مانگی ہیں ، ابوحیان توحیدی کی آخری عمر

---

[1] المقتبس (نشرۃ) [2] اکتفاء القنوع ص ۱۸۰ [3] معجم الادباء ج ۱۵ ص ، [4] ایضاً ج ۱۵ ص ، ۵ و ج ۱ ص ۱۵۲ ومسامرات ج ۲ ص ۷ ، ومطالع البدور ج ۲ ص ۲ [5] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۵ [6] غرر الخصائص الواضحہ ص ۳۴ [7] فہرست اہل وارڈ نمبر ۱۰ ۲ [8] شرح نہج البلاغہ ج ۳ ص ۵۵

کی تصنیف ہے، جب اس کی عمر ستر سال سے بھی زیادہ ہو چکی تھی، اور اس کے مزاج کی حدت اور شعلہ فشانی ختم ہو چکی تھی، اس کے دل میں دنیا کی ہوس کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہ گیا تھا، اور اب وہ سکون کا متلاشی تھا، اور ایسی زندگی چاہتا تھا جس میں دنیا کی کوئی آرزو نہ ہو، اور آخرت کی تلاش جس کا مقصد ہو، اسی لیے اس میں جو دعائیں ہیں اس سے اس کا سوز دروں معلوم ہوتا ہے[۱]

الحج العقلی اذا ضاق الفضاء عن الحج الشرعی ۔ یاقوت نے معجم الادباء میں اس کا تذکرہ کیا ہے[۲] ڈاکٹر کرد علی کے بیان کے مطابق اس کتاب کا قلمی نسخہ لینن گراڈ کے کتب خانہ میں موجود ہے[۳]

الزلفی ۔ یاقوت نے معجم الادباء میں اور ابو شجاع نے ذیل تجارب الامم میں اس کا تذکرہ کیا ہے[۴]،

ریاض العارفین ۔ یاقوت نے معجم الادباء میں اس کا تذکرہ کیا ہے[۵]،

رسالۃ فی اخبار الصوفیۃ ۔ الرسالۃ القشیریہ کے طرز پر یہ رسالہ لکھا گیا ہے، دنیادار صوفیوں نے اپنی حرکتوں سے تصوف کو اتنا بدنام کر دیا تھا کہ لوگوں کا میلان تصوف کی جانب سے کم ہو گیا تھا، اس کی اصلاح کے لیے توحیدی نے یہ رسالہ لکھا تھا[۶]،

رسالۃ الحیٰوۃ ۔ ڈاکٹر ابراہیم کیلانی نے ۱۹۵۱ء میں دمشق سے اسے شائع کیا ہے۔

رسالۃ فی بیان ثمرات العلوم ۔ یہ سات صفحہ کا مختصر رسالہ ہے، الصداقہ والصدیق کے ساتھ قاہرہ سے شائع ہوا ہے، یہ رسالہ ان لوگوں کے رد میں ہے جو مذہب میں فلسفہ کی ضرورت نہیں سمجھتے،

رسالۃ الامامۃ المعروفۃ بروایۃ السقیفہ ۔ یہ رسالہ شیعوں کے رد میں ہے، ڈاکٹر ابراہیم کیلانی نے ۱۹۵۱ میں اسے شائع کیا ہے۔

۱؎ ابوحیان ص ۷۴ ۲؎ معجم الادباء ج ۱۵ ص ۸ ۳؎ امراء ابوحیان ۴؎ معجم الادباء، ج ۱۵ ص ۸ ذیل تجارب الامم ص ۲۹۶ ص ۵۵، ۵؎ معجم الادباء [illegible] ص ۷ ۶؎ الصداقہ والصدیق ص ۱۹۲

المناظرۃ بین ابی سعید السیرافی ومتی بن یونس القنائی۔ الامتاع والموانسہ جلد اول صفحہ ۱۰۸ تا ۱۲۸ میں یہ رسالہ موجود ہے ۱۹۰۵ء میں اس رسالہ کا انگریزی میں بھی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ رسالہ الہلال (تیرھواں سال) ص ۳۳۸ [1]

بعض غیر معروف تصانیف | الرسالۃ البغدادیۃ۔ یاقوت نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ [2]

رسالۃ الی ابی الفضل ابن العمید۔ براکلمن نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ [3]

کتاب الرد علی ابن جنی فی شعر المتنبی۔ یاقوت نے معجم الادباء میں اور علامہ سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ [4]

---

[1] معجم المطبوعات العربیہ ج ۲ ص ۳۰۵ [2] معجم الادباء ج ۵ ص ۱، [3] ملحق ۱ ص ۴۳۴
[4] معجم الادباء ج ۵ ص ۳۸۰ قدیم اڈیشن وبغیۃ الوعاۃ ص ۳۴۸

حکمائے اسلام

حصہ اول

یہ کتاب دوسری صدی سے لیکر خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ کے حالات میں ہے۔ جلد اول پانچویں ہجری تک کے حکماء کے حالات پر مشتمل ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے۔

(از مولانا عبد السلام ندوی مرحوم)

ضخامت ۵۰۴ صفحے قیمت ۔ للعہ

منیجر

امام بخاری

اور

ان کی جامع کی خصوصیات

از جناب مولوی تقی الدین صاحب ندوی استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

(۳)

ایک غلط فہمی کا ازالہ | صحیحین پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ وغیرہ ائمہ نے بہت سی ایسی روایات سے استدلال کیا ہے جو صحیحین میں موجود نہیں ہیں، پھر صحیحین کے اصح ہونے کا کیا مطلب ہے؟ تحریر کے شارح ابن امیر الحاج نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ صحیحین کی اصحیت ان کے بعد کے لوگوں کے لحاظ سے ہے، وہ ائمہ مجتہدین جو ان کے پیشتر گذرے ہیں وہ اس زمرہ میں شامل نہیں ہیں۔ علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ شیخین اور اصحاب سنن وغیرہ فقہ اسلامی کی تدوین کے بعد پیدا ہوئے اور حدیث کی طرف اعتنا کیا لیکن ائمہ مجتہدین جو ان سے پیشتر گذرے ہیں ان کے سامنے مرفوع، موقوف اور صحابہ و تابعین کے فتاوی کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تھا، ان حضرات کی نظر حدیث کی صرف ایک قسم پر محدود نہیں ہوتی تھی، آج ہمارے سامنے اس دور کی جوامع و مصنفات موجود ہیں جن کے مصنفین ائمہ مجتہدین کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد ہیں، اس لیے علو سند کی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے لیے احادیث کی اسانید پر غور و فکر کرنا آسان تھا، پھر مجتہد کا کسی حدیث سے استدلال اس کی صحت کی دلیل ہے کتب ست

۱؎ التقریر والتحبیر جلد [illegible] ۲؎ حاشیہ شروط الائمہ

کی ضرورت اور ان سے استدلال ما بعد کے لوگوں کے لحاظ سے ہے۔[۱]

امام اعظم ابوحنیفہ سے روایت نہ کرنے کی وجہ | کہا جاتا ہے کہ امام بخاری چونکہ حنفیہ سے ناراض تھے، اس لیے انھوں نے امام ابوحنیفہ سے کوئی روایت نقل نہیں کی، علامہ زیلعی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے شدت تعصب اور امام ابوحنیفہؒ کے مسلک پر بے جا تنقید کی وجہ سے ان کی کوئی روایت اپنی کتاب میں نہیں نقل کی[۲] اسی طرح بعض الناس کے ذریعہ امام صاحب پر تعریض کی ہے اور ان پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگایا ہے، مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے امام اعظم کے ساتھ وہی روش اختیار کی ہے جو امام جعفر صادق کے ساتھ کی تھی، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ امام جعفر صادق کو امام بخاری نے قابلِ استدلال نہیں سمجھا، حالانکہ وہ جمہور امت کے نزدیک ثقہ ہیں۔[۳]

لیکن امام بخاری اور دیگر ائمۂ محدثین کے متعلق عناد و تعصب کا شبہہ کرنا نہایت نامناسب ہے۔ اکابر کی شان اس سے بلند تھی، علامہ کوثری نے اس بارہ میں نہایت مناسب و معتدل رائے ظاہر کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ قابل غور امر یہ ہے کہ شیخین نے امام ابوحنیفہؒ سے کوئی روایت نہیں نقل کی، حالانکہ ان کے صغیر السن تلامذہ سے ان کا لقاء و روایت دونوں ثابت ہے، اسی طرح امام شافعیؒ کے بعض تلامذہ سے بھی ان کی ملاقات ہوئی لیکن امام شافعی کی کوئی روایت اپنی کتاب میں درج نہیں کی، امام بخاری کو امام احمد سے زیادہ ملنے اور ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، اسکے باوجود ان سے صرف دو روایتیں اپنی کتاب میں نقل کی ہیں، ایک تعلیقاً اور دوسری ایک واسطے سے، امام مسلم، امام بخاری کے شاگرد ہیں، اور انھوں نے اپنی کتاب میں ان سے پورا استفادہ کیا ہے، لیکن امام بخاری سے صحیح مسلم میں کسی روایت کی تخریج نہیں کی، امام احمد امام شافعی کے تلمیذ رشید ہیں، اور ان سے موطا امام مالک کا

۱؎ الانتقاء ص ۱۹۴ ۲؎ نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۵۵ ۳؎ الحسن؛ الحاجۃ ص ۲۶

کا سماع بھی کیا لیکن امام مالک کی کل پانچ روایات امام شافعی کے واسطے سے اپنی کتاب میں درج کی ہیں، ان واقعات اور ان محدثین کرام کے اخلاص و دیانت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ محدثین کی احادیث کو روایت کرنے والے شرق و غرب ہر چہار سو پھیلے ہوئے تھے، ان کے ضایع ہونے کا اندیشہ نہیں تھا، اس لیے ان محدثین کرام نے صرف راویوں کی روایات کی طرف توجہ مبذول فرمائی، جن کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ تھا، اس لیے ان محدثین کا دامن ہر تعصب و عناد سے پاک تھا۔[1]

جامع صحیح کے شروح و حواشی جامع صحیح کی اہمیت و مقبولیت کی بنا پر ہر دور کے علماء نے اس پر شروح و حواشی لکھے ہیں، لامع میں ایک سو سے زائد شروح و حواشی اور متعلقات بخاری کا تذکرہ ہے، ان میں سب سے زیادہ فتح الباری کو شہرت حاصل ہوئی۔

(۱) **فتح الباری** ۔ یہ شیخ الاسلام حافظ ابو الفضل احمد بن علی بن حجر م ۸۵۲ھ کی تصنیف ہے، مصنف نے ۸۱۳ھ سے اس کا آغاز کیا، سب سے پہلے ایک مبسوط مقدمہ لکھا، جب وہ مکمل ہوگیا تو شرح کی تالیف شروع کی، ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب شرح کا معتد بہ حصہ ہوجاتا تو اس کو ائمہ محدثین کی ایک جماعت نقل کرتی، پھر ہفتہ میں ایک دن اس پر مباحثہ و مقابلہ کیا جاتا، علامہ برہان بن خضر پڑھتے اور لوگ اپنے اعتراضات اور بحث پیش کرتے تھے، حافظ صاحب جواب دیتے، اس طرح یہ کام ۸۴۲ھ میں ختم ہوا، مگر اس کے بعد مصنف نے اس پر کچھ اضافے بھی کیے، اور اس کی تکمیل وفات سے کچھ مدت پہلے ہوئی۔

علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ بخاری کی شرح کا دین امت پر باقی ہے، حافظ سخاوی کا فرمانا ہے کہ غالباً فتح الباری سے یہ دین ادا ہوگیا۔

---

[1] حاشیہ شروط الائمہ ص ۵

اس میں مصنف نے صحیح کے ان نکات پر جو فن رجال یا تراجم ابواب کی ترتیبات فقہیہ سے متعلق ہیں مختصر بحث کی ہے اور حدیث کے مختلف طرق کو جمع کیا ہے جس سے حدیث کے کسی ایک احتمال یا اعراب کی تعیین ہوجاتی ہے۔ (ارشاد الساری ص ۳۶)

(۲) عمدۃ القاری - علامہ بدرالدین ابو محمد محمود بن احمد العینی الحنفی المتوفی ۸۵۵ھ کی تصنیف ہے۔ مصنف نے ۸۲۱ھ سے اس کی ابتدا کی اور ۸۴۷ھ میں یہ شرح مکمل ہوئی۔ اتنی مدت اس لیے صرف ہوئی کہ درمیان میں مختلف موانع کی بنا پر متعدد بار اس کام کو بند کرنا پڑا، ورنہ زیادہ سے زیادہ دس سال کی مدت صرف ہوتی۔ علامہ عینی نے فتح الباری سے بہت استفادہ کیا ہے، یہاں تک کہ اس کے بعض بعض ورق پورے کے پورے نقل کر دیے ہیں۔ علامہ عینی نے اپنی شرح میں حافظ ابن حجر پر تعقبات بھی کیے ہیں، اور جن باتوں کو انھوں نے بالقصد ترک کر دیا تھا ان کی تفصیل کر دی ہے۔ مثلاً (۱) حدیث کے پورے متن کو نقل کر دیا ہے، (۲) رواۃ کے انساب کی وضاحت کی ہے، (۳) ہر راوی کا ترجمہ دیا ہے، (۴) لغات و اعراب، معانی و بیان کی وضاحت کی ہے، اور حدیث سے مسائل کا استنباط کیا ہے۔ اشکالات و جوابات فتح الباری سے زیادہ ہیں۔ (مقدمہ ارشاد الساری ص ۳۶)

علامہ کوثری فرماتے ہیں کہ عمدۃ القاری فتح الباری سے ایک ثلث مقدار میں زیادہ ہے، اس میں مختلف مباحث کی ایسی وضاحت کی گئی ہے کہ قاری کو کسی دوسری شرح کی ضرورت نہیں رہتی، اگر فتح الباری کا مقدمہ نہ ہوتا تو عمدۃ القاری کو اس پر نمایاں فوقیت حاصل ہوتی۔ عینی نے حافظ ابن حجر کے بہت سے اوہام پر تنبیہ کی ہے، اور جب یہ کتاب ان کے سامنے آئی تو حافظ ابن حجر نے ان مقامات کی اصلاح کر لی، اور علامہ عینی کی تردید میں ایک رسالہ انتقاض الاعتراض لکھنا چاہا لیکن زندگی نے وفا نہیں کی، اس لیے یہ رسالہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ علامہ عینی حافظ ابن حجر

کے شیوخ کے صف کے آدمی ہیں، وہ عمر میں حافظ ابن حجر سے ۲ سال چھوٹے تھے البتہ ان کا انتقال تین سال بعد ہوا،

(۳) ارشاد الساری شہاب احمد بن محمد الخطیب القسطلانی المصری صاحب المواہب اللدنیہ المتوفی ۹۲۳ھ۔ اس میں شرح و متن مخلوط ہے لیکن متن کو سیاہی و سرخی سے ممتاز کر دیا ہے، حقیقت میں یہ فتح الباری، عمدۃ القاری کی تلخیص ہے، اگرچہ مصنف نے دوسری شرحوں سے بھی استفادہ کیا ہے،

(۴) الکواکب الدراری۔ علامہ شمس الدین محمد بن یوسف بن علی کرمانی ۷۸۶ھ، حافظ ابن حجر اور عینی نے اپنی شرحوں میں اس سے بہت کچھ لیا ہے، مصنف نے اس میں نحوی اعراب اور غریب الفاظ کو پوری طرح حل کیا ہے، یہ شرح مصر میں چھپ گئی ہے،

(۵) شرح النووی۔ امام نووی المتوفی ۶۷۶ھ نے صرف کتاب الایمان تک شرح لکھی تھی، اس کی تکمیل نہیں کر سکے، صحیح مسلم کے مقدمہ میں اس کا ذکر ہے،

(۶) ہدایۃ الباری۔ شیخ الاسلام زکریا الانصاری تلمیذ حافظ ابن حجر المتوفی ۹۲۶ھ مصر سے چھپ چکی ہے۔

(۷) تیسیر القاری۔ علامہ نور الحق بن مولانا عبد الحق الدہلوی، المتوفی ۱۰۷۳ھ جس زمانے میں شیخ عبد الحق نے مشکوٰۃ شریف کی شرح لکھی تھی، اسی زمانہ میں ان کے صاحبزادے علامہ نور الحق نے صحیح بخاری کی شرح فارسی میں لکھنی شروع کی،

(۸) التوشیح علی الجامع الصحیح۔ حافظ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی لطیف شرح ہے، اس کی تلخیص علامہ دمشقی نے کی ہے، اور اس کا نام ترشیح التوشیح رکھا ہے، طبع ہو چکی ہے،

(۹) شواہد التوضیح والتصحیح لمشکلات الجامع الصحیح: شیخ جمال الدین مالکی المتوفی ۶۷۲ھ

رسالہ ہے جو ہندوستان میں طبع ہو چکا،

(۱۰) علامہ ابوالحسن نورالدین محمد بن عبدالہادی السندی الحنفی کا حاشیہ جو مشہور و معروف ہے، یہ بھی طبع ہو چکا ہے،

(۱۱) شرح شیخ الاسلام محب اللہ البخاری الدہلوی، یہ فارسی شرح تیسیر القاری کے حاشیہ پر چھپی ہے، مگر صرف ۱۳ پارے ہی طبع ہوئے ہیں،

(۱۲) عون الباری، نواب صدیق حسن خاں صاحب المتوفی ۱۳۰۷ھ نے تجرید بخاری کی مختصر شرح لکھی ہے۔

(۱۳) نبراس الساری فی اطراف البخاری۔ مولانا ابوسعید محمد عبدالعزیز الحنفی کی تصنیف ہے،

(۱۴) فیض الباری، علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کے افادات ہیں، جو ان کے تلمیذ رشید مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی نے درس کے وقت لکھے تھے،

(۱۵) مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری المتوفی ۱۲۹۷ھ کا حاشیہ جس کے آخری حصے کی تکمیل حضرت نانوتوی نے کی، نہایت مفید ہے،

(۱۶) لامع الدراری، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی المتوفی ۱۳۲۳ھ کے درس کے افادات ہیں جن کو ان کے مختلف تلامذہ نے جمع کیا تھا، سب سے آخری دورہ جس میں ملک کے بڑے بڑے علماء و فضلاء شریک تھے، اور اس کے بعد سلسلۂ درس ختم ہو گیا تھا، اس دورہ میں حضرت کے مایۂ ناز شاگرد مولانا محمد یحیی صاحب شریک تھے، بلکہ ان ہی کی خاطر حضرت نے اس دورہ کا افتتاح فرمایا تھا، اس آخری درس کے افادات کو حضرت کے تلامذہ نے قلمبند کیا تھا، اس پر حضرت الاستاذ مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم نے تعلیق اور ایک بسیط مقدمہ لکھا، اس کا مطالعہ حدیث کے طلباء و اساتذہ کے لیے بہت مفید ہے، اس کی جلد اول طبع ہو چکی ہے اور جلد ثانی زیر طبع ہے، اس مضمون کا بیشتر حصہ اسی سے ماخوذ ہے۔

ٹیپو سلطان شہید کا ایک اہم اور تاریخی مکتوب

بنام

نواب نظام علی خان

از جناب سید امین الحسینی صاحب حیدرآباد

یہ وہ تاریخی مکتوب ہے جس کو نواب شہید نے نواب نظام علی خاں کی خدمت میں اس غرض سے بھیجا تھا کہ نواب صاحب حقیقی واقعات سے واقف ہوکر انگریزوں کی حمایت سے اپنے آپ کو باز رکھیں اور ان خود غرض عہدہ داروں کے مشوروں پر بھی نہ چلیں جن کو ریاست کے مفاد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اور محض اپنی ذاتی اغراض کی خاطر غلط رہبری کرتے تھے۔

یہ مکتوب اصل میں فارسی زبان میں ہے، جس کو جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سابق مشیر تحقیقات و اشاعت کاغذات تاریخی سنٹرل ریکارڈز آفس و صدر شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ نے مختصر تمہید کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ مضمون کی شکل میں انڈین ہسٹری کانگریس کے سالانہ اجلاس میں بمقام جے پور پیش کیا تھا۔

چونکہ یہ مضمون انگریزی زبان میں تھا، اس لیے میں نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی اجازت سے اس تاریخی اہم مکتوب کا اردو ترجمہ اس طریقہ سے کیا ہے کہ مکتوب کے سمجھنے و نقل بھی واضح ہو جائیں اور اس کے اہم نکات بھی سمجھنے میں آ جائیں۔

<u>تمہید کا ترجمہ</u> سنٹرل ریکارڈز آفس کے ذخیرۂ مخطوطات میں ٹیپو سلطان کے مکتوب کی نقل موجود ہے

نواب نظام علی خاں محفوظ ہے لیکن تاریخ سے معرا ہے لیکن اندازاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مکتوب جنوری ۱۷۹۱ء کا تحریر کردہ ہے، جب آصفی اور انگریزی افواج مشترکہ طور پر سرنگاپٹن پر حملہ آور ہونا چاہتی تھیں۔

اس خط سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مکتوب گورم کنڈہ کے واقعہ کے بعد اس وقت لکھا گیا ہو جب نواب نظام علی خاں کی فوج جنوری ۱۷۹۱ء میں بری طرح پھنس گئی تھی،

اس مکتوب میں ٹیپو سلطان نے حضور نظام کو لکھا ہے کہ وہ خود غرض مشیروں کے ایما پر انگریزوں کی حمایت کرتے ہیں اور تعجب ہے کہ وہ کس طرح اسد علی خاں اور حافظ فریدالدین جیسے ناقابل اعتماد اشخاص پر بھروسہ کرتے ہیں،

نواب نظام صلح نامہ ۱۷۹۰ء کے بموجب ان کے اور کمپنی کے درمیان طے پایا تھا، ایک بڑی فوج کے ساتھ حیدرآباد سے نکلے، اور پانگل میں قیام کیا، پھر وہاں سے ایک رسالہ بسر کردگی راجہ تیجونت اور اسد علی خاں ان ہدایات کے ساتھ بھیجا کہ وہ ٹیپو سلطان کے علاقے میں داخل ہوں اور موقع و محل دیکھ کر کمپنی کی فوجوں سے ربط پیدا کریں، آصفی فوجوں کی رفتار عمداً اس لیے سست رکھی گئی تھی تاکہ اس کی قوت برقرار رہے، اس کے برخلاف انگریزوں اور ٹیپو سلطان کی فوجوں نے ایک دوسرے کا مقابلہ کر کے اپنے آپ کو کمزور بنا لیا تھا، اس کے علاوہ انگریزی دستہ جو معاہدہ کے مطابق حضور نظام کی فوجوں کے ساتھ تھا، وہ بالکل غیر تربیت یافتہ تھا۔

حضور نظام کی فوجوں نے ۱۵ را پریل ۱۷۹۱ء کو قلعہ کپل پر قبضہ کر لیا، اور ایک ہفتے کے بعد دوسرے مضبوط قلعہ "بہادر بندہ" پر بھی قابض ہو گئی، کہم اور سدھوٹ اور گنجی کوٹہ کے قلعے بھی آصفی فوج کے تصرف میں آ گئے، اس کے بعد ۱۹ ر ستمبر ۱۷۹۱ء کو گورم کنڈہ کا محاصرہ کر لیا گیا، اسی اثنا میں شہزادہ سکندر جاہ مشیر الملک کے ہمراہ ایک بہت بڑی امدادی فوج لے کر گورم کنڈہ

پہنچ گئے، ٹیپو نے ارادہ کیا کہ پانچ ہزار پیدل اور دو سو سواروں کو حافظ فرید الدین کے زیر اہتمام تعا
برباخت کے لیے متعین کیا، اور خود سیرینگاپٹن کا رخ کیا، لیکن جونہی وہ گرم کنڈہ پہنچے تیس میل
کے فاصلے ہی پر انھیں خبر ملی کہ ٹیپو سلطان کے بڑے فرزند دس ہزار فوج کے ساتھ قلعے کے ساتھ
مقابلے کے لیے تیار کھڑے ہیں، حافظ فرید الدین یہ خیال کرکے کہ حملہ آوروں کی کوئی بڑی تعداد
نہ ہوگی ہاتھی پر سوار ہو کر تھوڑے سے سواروں کے ہمراہ طلایہ گردی کی غرض سے نکلا اس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تمام ساتھیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے۔ اور اس کو قید کر کے
قتل کر دیا گیا،

مکتوب کا ترجمہ | مخلوق کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قادر مطلق کا شکر ادا کرتی اور سجدۂ عبودیت
بجالاتی رہے۔ کیونکہ وہ اس کو عدم سے وجود میں لایا، اور اس پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ مصیبت کے
وقت اپنے پیغمبر سے مدد طلب کرے،

جب حضور والا نے رود کرشنا کے اس پار کے علاقہ جات کو فتح کرنے کا قصد فرمایا تھا تو متعدد
مرتبہ حضور والا کے سمع ہمایونی تک یہ پہنچایا گیا تھا کہ بلحاظ تعلقات دوستانہ ان عزائم کی جانب تو
نہ فرمائی جائے،

اگرچہ حضور والا نے یقیناً ان خیالات کو جگہ نہیں دی ہوگی لیکن چند شریر النفس اشخاص
کی بدطینتی، کمینہ پن اور خفیہ طور پر انگریزوں کے آلہ کار ہونے کی وجہ سے حضور والا کو
عزائم کا مشورہ دیا، ایسے اشخاص کے پیش نظر ریاست کی فلاح کبھی نہیں ہو سکتی، انھوں نے محض
اپنی ذاتی اغراض کی خاطر حضور والا کو ایک خطرناک موقف میں جھونک دیا۔ —

یہ امر خاص توجہ کا محتاج ہے کہ اس وقت حضور والا اور انگریزوں کی فوجیں منتشر طور پر
پہنچ چکی ہیں، لیکن ہماری کسی فوج کو حرکت نہیں دی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا بندۂ درگاہ کے علاقے کے

قلعے ہاتھ سے نکل گئے، اور یہ شکست اس لیے ہوئی کہ ہمارے تعلقہ داروں نے غداری کر کے قلعوں کو حضور والا کے عہدہ داروں کے حوالے کر دیا، اس کے باوجود ہم نے چشم پوشی اختیار کی،

اسد علی خاں جو ہمارا مردود بارگاہ ہو چکا تھا، حکومت حیدر آباد نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی، حالانکہ ہمارے ایک مقامی ضلعدار قطب الدین نے اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ اس کو نیچا دکھایا، اور اس کو زخمی کر کے ایک داغ بھی لگا دیا تھا، جو اس سرکار کی نشانی ہے، اس نشانی کو وہ اپنے ہمراہ لے گیا، اور باوجود اس کے وہ نادم نہیں ہوا، بلکہ وہاں جا کر فخر و مباہات کے ساتھ اپنی ہمت و شجاعت کا ڈنکا پیٹا، ایسے شخص کو حیدر آباد میں "مظفر الملک" کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور شہزادہ سکندر جاہ وزیر اعظم، اعظم الامراء کے ہمراہ ہمارے مقابلے کے لیے بھیجے گئے، جنھوں نے ہمارے علاقے کو فوجوں سے خالی پا کر گورم کنڈہ کا محاصرہ کر لیا، کہا جاتا ہے کہ جب سورج ڈوب جاتا ہے تو چمگاڈریں میدان میں نمودار ہو کر اپنے کرتب دکھانا شروع کرتی ہیں۔

حافظ فرید جو کچھ عرصہ کے لیے حضور والا کے وکیل کی حیثیت سے اس دربار میں متعین تھا، اس کی قابل ملامت حرکات کی وجہ سے اسکو حیدر آباد واپس بلا لیا گیا لیکن موئید الملک کے خطاب سے اسکی عزت افزائی کی گئی، اور منصب پنجہزاری و پنجہزار سوار سے سرفراز کیا گیا، اور حالیہ مہم میں گورم کنڈہ کے محاصرہ کا کمانڈر بنا دیا گیا، وہ بے وقوف تو محض شیخی باز ہے، اور دربار حیدر آباد میں اس نے اپنے آپ کو ایک بڑا آزمودہ کار سپاہی مشہور کر رکھا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے اسلاف میں سے کسی نے بھی جنگ کی صورت تک نہیں دیکھی ہے۔ پہلے پہل تو ہماری فاتح فوجوں نے اس کا مقابلہ کرنے سے تامل کیا، لیکن بعد میں اس ریاست کی روایات و وقار کے مطابق یہ ضروری سمجھا گیا کہ ہماری فاتحانہ پیشقدمیوں کو ان لوگوں کے کانوں تک پہنچا دیں جنھوں نے گورم کنڈہ کا محاصرہ کر رکھا تھا، اور یہ احکام جاری کیے گئے کہ قلعہ کو نجات دلانے کے لیے خاندان شاہی کے

ایک رکن کے زیر کمان ایک فوج بھیجی جائے، اور محمد قمرالدین نے بھی اپنی بہادر فوج کے اس جانب رخ کیا، حالانکہ قریب ہی میں نعمت خاں والی کرنول کے فرزند اعظم خاں اور کشن راؤ ہالال کے فرزند گوبند کشن کی فوجیں بھی موجود تھیں، لیکن ان کی تنبیہ مقصود نہیں تھی، اس لیے ان کا مقابلہ نہیں کیا گیا، اور قلعہ کی حدود میں ہماری فوجوں نے صرف راجہ جودہ سنگھ کے دستہ کا مقابلہ کرکے اس کا مکمل طور پر قلع قمع کر دیا،

اس کے بعد حافظ فریدالدین کے ہراول کی باری آئی، لیکن اس نے ہماری حملہ آور فوج کی آمد کی پروا نہیں کی، حافظ ایک نہایت ہی آراستہ پیراستہ ہاتھی پر سوار ہو کر انتہائی رعونت کے ساتھ جنگ کے اصولوں کے بالکل خلاف طلایہ گردی کے لیے نکلا، حالانکہ فوج کے کمانڈر کی حیثیت سے اس کو فوج کے عقبی حصے میں رہنا چاہئے تھا، اس لیے ہماری حملہ آور فوجوں نے اس پر اس طرح حملہ کیا جس طرح ایک شکاری اپنے شکار پر حملہ کرکے دبوچ لیتا ہے، اور حافظ فریدالدین ہمارے غیر دل سپاہیوں کے درمیان گھر کر زندہ گرفتار کر لیا گیا، اور جملہ سپاہیوں کا صفایا کر دیا گیا اور ہمارے غازیوں نے سامان حرب و رسد کی ایک بڑی مقدار کے علاوہ ایک معتد بہ خزانے پر بھی قبضہ کر لیا، ہمارے بہادر سپاہی حضور والا کی پوری فوج کا قلع قمع کر سکتے تھے لیکن محض شہزادہ سکندر جاہ کے پاس خاطر سے اس سے باز رہے،

چونکہ حیدر علی کے بعض نصائح میں یہ بھی ارشاد تھا کہ جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کے خون سے بچا جائے اس لیے یہی حکمت احتیاط برتی گئی، شام کے وقت ہماری خدمت میں ایک فرانسیسی افسر کو نندہ گرفتار کر لیا جس نے گورم کنڈہ کے بائیں حصہ پر قبضہ کر لیا تھا، اور اس کے جملہ ساتھیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا، لیکن ان قیدیوں کو رہائی دیدی گئی جنھوں نے اس کی درخواست کی تھی، اور دوسرے دن ان کی صلاحیتوں کے مطابق انھیں خدمتیں بھی دی گئیں اور منصب و مناسب کام تفویض کیا گیا،

اس مکتوب کے بھیجنے کی اصل غایت یہ ہے کہ حضور والا کی سمع ہمایوں تک ان واقعات کو پہنچا دیا جائے اب بھی وقت نہیں گیا ہے، اور حضور والا کے ہاتھوں میں بہت کچھ ہے، حضور والا اس وقت بھی انگریزوں کو مدد دینے سے انکار کر سکتے ہیں، اور مرہٹوں کو بھی جو حضور والا کے معاہدین میں ہیں، اس کی ترغیب دی جا سکتی ہے۔ انگریزوں کا یہ خیال کہ وہ محض اپنی فوج اور توپخانوں پر بھروسہ کر کے فتح حاصل کر سکتے ہیں، بالکل باطل ہے اور وہ بہت جلد اپنی تباہی کو دیکھ لیں گے۔ اگر وہ اپنے برے عزائم پر اڑے رہے تو عید اضحیٰ کے بکروں کی طرح ذبح کر دیے جائیں گے، اور ان کی خوش کن توقعات کی کشتی تباہی کے سمندر میں غرق کر دی جائے گی، وہ اس فکر میں ہیں کہ سلطنت حیدری کو اپنی فوجی قوت سے مسمار کر دیں، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے گا۔ کون قوت ایسی ہستی کا تخت و تاج چھین سکتی ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اقتدار اور دولت دی ہو، اس لیے ان کو اپنے برے عزائم اور کبر و نخوت کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

یہ ہماری عین خوشی ہے کہ وہ ملک جو قدیم زمانہ سے بشمول ادھونی مع ملحقات حضور والا کے تصرف میں اور حضور والا ہی کے نظم و نسق کے ماتحت رہے۔ اس سلسلہ میں دربار پونہ کے دعاوی بھی معرض بحث میں لائے جا سکتے ہیں، تاکہ ان کا مناسب تصفیہ کیا جا سکے۔

میدان کارزار سے حیدر آباد کو حضور کی مراجعت ذاتی تقویت اسلام کا موجب ہوگی، اور اگر مرہٹے بھی اس سے اتفاق کر کے پونہ واپس ہو جائیں تو دوستانہ تعلقات کے لیے راہیں ہموار ہو جائیں گی۔

یہ ہماری دلی خواہش ہے کہ دولت آصفیہ پھلے پھولے، اگر حضور والا بھی نواب آصف جاہ بہادر کی طرح شمالی ہند کا قصد فرمائیں تو بندہ درگاہ بھی ہمراہ رکاب رہے گا، اور اس بارے میں علیحدہ خط و کتابت کرے گا۔

میں دست بدعا ہوں کہ آصفی ریاست کو ترقی ہو اور اس کا وجود برقرار رہے۔

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

۱۳ر اگست ۱۹۲۷ء

مکرم محترم دام مجدہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔ براہ کرم بواپسی ڈاک مجھے مطلع فرمائیں کہ کمیٹی کی رپورٹ[1] کے متعلق جناب کی رائے کیا ہے۔ رپورٹ کا اردو ترجمہ میرے پاس بھی پہنچا ہے، مگر اس میں صرف حصہ اول کا ترجمہ ہے۔ اس میں سے بھی باب سوم بالکل نہیں ہے۔

جناب نے اس سے اتفاق کیا ہے یا کچھ ترمیمیں لکھی ہیں، آپ کی سب کمیٹی نے کیا فیصلہ کیا؟ اور یہ کہ ۲۰ لغایۃ ۲۲ر اگست کو آپ لکھنؤ کے جلسہ میں شریک ہوں گے یا نہیں، غالباً یہ آخری جلسہ ہوگا۔

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

مدرسہ امینیہ دہلی

---

[1] غالباً اس سے مراد [illegible] کے امتحانات عربی و فارسی کے ترتیب نصاب کی کمیٹی ہے۔

۳۱ اگست ۱۹۲۰ء

جناب محترم دامت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ الہ آباد کے خط سے معلوم ہوا کہ آئندہ کمیٹی کا جلسہ ۱۵ تا ۱۸ ستمبر لکھنؤ میں ہوگا، مجھے کچھ معلوم نہ ہوا کہ جناب نے کیا ترمیمات کی ہیں، اگر ہو سکے تو اس کی نقل بھیجدیں، اور نہ ہو سکے تو کم از کم یہ کیجئے کہ ۱۵ ستمبر کو لکھنؤ پہنچ جائیے، میں بھی ۱۵ کو لکھنؤ آجاؤں اور لکھنؤ کے ممبران فرنگی محل اور میں اور آپ ملکر متفقہ یادداشت تیار کرلیں، تاکہ علماء کی طرف سے متفقہ تحریر پیش کیجا سکے، براہ کرم اپنی رائے سے مطلع فرماکر ممنون فرمائیں۔

امید کہ مزاج سامی مع الخیر ہوگا،

خاکسار

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ ۔ مدرسہ امینیہ دہلی

۸ اگست ۱۹۲۰ء

جناب محترم دامت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ جناب والا کے عوض افضال کی آبیاری کا شاید علم ازلی میں وقت مقدر قریب آگیا ہے، خادم کا ارادہ ہے کہ ۱۱ یا ۱۲ اگست کو دہلی سے بعزم اعظم گڈھ روانہ ہو، خدا تعالیٰ پورا کرے،

مولانا احمد سعید صاحب میرے رہبر ہوں گے، امید کہ مزاج اقدس بخیر ہوگا، فقط

خاکسار

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

کوچۂ چیلان۔ دہلی

۱۶ اگست ۱۹۳۸ء
دہلی

حضرت مولانا دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ جناب کی خدمت سے جدا ہو کر ساڑھے پانچ بجے لکھنؤ اور وہاں سے ۶ بجے روانہ ہو کر پونے آٹھ بجے کانپور اور وہاں سے آٹھ بجے روانہ ہو کر صبح ۵ بجے دہلی پہنچ گیا، اس طریقہ سے راستہ جلد طے ہو گیا، ورنہ مرادآباد کے راستہ سے دس بجے دہلی پہنچتا۔

جناب والا کے کرم و الطاف بے پایاں کا شکریہ ادا نہیں ہو سکتا، میں آپ کی مہربانیوں کے نہایت عمیق احساسات دل میں لایا ہوں، جو ہمیشہ باقی رہیں گے، مولانا مسعود علی صاحب مولانا عبدالسلام صاحب، شاہ صاحب، مولوی سید محمد صاحب، سید نجیب اشرف صاحب ایم اے اور دیگر رفقاء و کارکنان دارالمصنفین سے سلام عرض ہے، مولانا احمد سعید صاحب سلام فرماتے ہیں، لغات ۳۹ کتابوں کی قیمت کے مولانا مسعود علی صاحب کی خدمت میں بذریعہ منی آرڈر بھیج دئے۔

خادم
محمد کفایت اللہ غفرلہ

۱۰ دسمبر ۱۹۳۸ء

حضرت محترم دام فضلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ گرامی نامہ نے معزز و ممتاز فرمایا تھا، میں اس قدر نادم اور شرمندہ ہوں کہ خط لکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی، روزانہ یہ خیال کرتا رہا کہ آج شاہجہانپور ضرور روانہ ہو جاؤں گا، مگر افسوس کہ اب تک یہ ارادہ پورا نہ ہوا، اور جواب گرامی نامہ میں بھی اس قدر تاخیر ہو گئی،

دو روز سے رات دن مشغول ہوں، اور آج شام کو مرادآباد جانا ہے کہ وہاں جمعیۃ عاملہ کا

جلسہ ہے، اور ممکن ہے کہ وہاں سے کلکتہ بھی جانا پڑے۔

جب یہ بات قطعی ہوگئی کہ اب دسمبر کے مہینے میں شاہجہاں پور جانا نہ ہوسکے گا تو آج میں عریضہ لکھنے کا ارادہ کیا، اور سخت ندامت کے ساتھ یہ سطریں لکھ رہا ہوں، مجھے حکیم صاحب کے تفکر اور تردد کا بیحد خیال ہے، اور ان کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتا ہوں، مگر انسان اپنے ارادوں میں مجبور ہے، اب ۱۰ جنوری تک کے لیے آخری مہلت اور چاہتا ہوں، اگر حکیم صاحب منظور فرمائیں تو میں سعی کروں گا کہ دہلی آل مسلم پارٹیز کے جلسے سے جو یکم و ۲ جنوری کو دہلی میں ہوگا، فارغ ہو کر وطن جاؤں اور فیصلہ کرکے حکیم صاحب کو اطلاع دوں، امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، رفقائے دار المصنفین سے سلام فرما دیں۔

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

کوچہ چیلان دہلی

۱۳ جون ۱۹۲۹ء

مولانا المحترم دامت فیوضکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ چند روز ہوئے کہ میں نے ایک خط میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے درجۂ حدیث و تفسیر کے امتحان کے پرچے بنانے کے بارے میں ہدایات طلب کی تھیں آج جواب کا انتظار تھا، نہیں آیا، وقت کم رہ گیا ہے، براہ کرم مطلع فرما دیں، ورنہ میں ۱۸ جون کو پرچے بنا کر روانہ کر دوں گا،

امید ہے کہ مزاج اقدس مع الخیر ہوگا۔

خادم

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

۲۰ جولائی ۱۹۲۸ء

محترم مولانا دامت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آج کی ڈاک میں مسلم و بیضاوی کے پرچے بصیغۂ رجسٹری واپس کر دیئے گئے نتیجہ کی اسم وار فہرست بھی انھیں پرچوں کے ساتھ رکھ دی ہے، سوالات کے دونوں پرچے بھی واپس کر دیئے گئے ہیں۔

طلبہ کی حالت پر اظہار رائے نہ کرسکا، اگر ارشاد ہوگا تو علیحدہ لکھ کر بھیج دوں گا، امید کہ مزاج سامی بخیر ہوگا۔

محمد کفایت اللہ غفرلہ

۱۶ ستمبر ۱۹۲۹ء

مولانا المحترم دامت مکارمکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

جناب کا گرامی نامہ موجب افتخار و امتنان ہوا تھا، میں روز ارادہ کرتا تھا کہ آج جواب لکھوں کل لکھوں، یہاں تک کہ اس قدر تاخیر ہوگئی، کرم ہائے متوالیہ سے امید ہے کہ اسکو بھی معاف فرمائیں گے۔

مولانا المکرم۔ مجھے تو یہ نظر آرہا ہے کہ علما بحیثیت جماعت سیاسیات میں دخل دیں یا نہ دیں، جو جماعت کہ علما کے وجود کو ہی اپنی مطلق العنانی کے لیے سخت خطرہ تصور کرتی ہے، اور جس کی نظر میں شرعی اوامر و نواہی ہی دور حاضر کی ترقی کے لیے سنگ راہ ہیں اور جو مذہبی اعمال، مذہبی وضع کو دقیانوسی اعمال اور بوسیدہ وضع سمجھتی ہے، وہ بہرصورت ان کے استیصال کے درپے رہے گی کسی سیاسی مسئلہ کا اختلاف تو ایک بہانہ بنتا ہے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اب انھیں اس بہانے کی بھی ضرورت نہیں رہی، مثال کے لیے نگار کے مضامین ملاحظہ ہوں، نیز فتنۂ افغانستان میں بغیر کسی تحقیق و تفتیش واقعات کے جو طوفان اٹھایا گیا، اور مولوی ظفر علی خاں کے خلاف زہر افشانی کی گئی یہ سب میرے خیال کی مؤید ہیں۔

اگر علما اجتماعی حیثیت سے سیاسیات سے علیحدہ بھی ہو گئے، تاہم انفرادی شرکت تو جناب بھی تجویز فرماتے ہیں، تو اس انفرادی شرکت کی صورت میں کوئی عالم ایک جماعت کے ساتھ شریک ہوا تو مخالف جماعت اس کی حیثیت کو گھٹانے کے لیے کیا صرف اس فرد واحد کا خلاف کرے گی، بلکہ اس ایک کی وجہ سے ساری جماعت علما کو بھی برا بھلا کہے گی، اور اس کا استدلال یہی ہوگا کہ مولوی سارے کے سارے خر دماغ، بیوقوف ہیں، اس لیے ان کے افراد کی رائے بھی کسی طرح قابل وقعت نہیں، اس طرز عمل سے ان کی غرض یہ ہوگی کہ عالم کی شرکت سے عوام پر جو اچھا اثر ہو جاتا ہے اس کو زائل کر دیا جائے، اور دونوں سیاسی متخالف جماعتوں کی طرف سے یہی عمل ہوگا، کیونکہ کچھ کچھ علما، دونوں جانب ہوں گے، تو نتیجہ یہی ہوگا جو اس وقت پیش نظر ہے، میں نے اگست کے معارف میں جناب کا شذرہ معہودہ پڑھا، مگر میری رائے میں اس کا علاج اگر ہے تو علما کا اتفاق و اتحاد ہے، ورنہ اور کوئی صورت ان کے فلاح کی نہیں۔ اور علما کا اتفاق و اتحاد اگر اغراض شامل نہ ہوں تو کوئی مشکل امر نہیں ہے، مگر اغراض نفسانیہ کا برا ہو کہ یہ کسی طرح بھی اتحاد نہیں ہونے دیتے، اگر جناب والا کوئی ایسی تجویز فرمائیں جو علما کو متفق اور متحد کر سکے تو یہ امت مرحومہ کے اور طبقۂ علما کے ساتھ مسیحائی کا کام دے گی۔

فتنۂ صدارت اجلاس کانپور

کانپور کے مجوزہ سالانہ کی صدارت کے ضمن میں جو فتنہ برپا کیا جا رہا ہے، یہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو ملت میں مضمون "ہم۔ یعنی علمائے کرام" میں جناب نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

بہرحال خدا تعالیٰ رحم فرمائے اور جمعیۃ کو خود اعضائے جمعیت کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچائے، امید کہ مزاج اقدس بخیر ہوگا۔ رفقائے دار المصنفین کی خدمات مبارک میں سلام عرض ہے، حکیم محمد اسحٰق صاحب سے بھی سلام فرما دیں، اور دعا و لا تفقد سے یاد فرماتے رہیں۔

محمد کفایت اللہ غفر لہٗ

۲۷ر اپریل ۱۹۳۰ء

جناب محترم دامت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ - ۳-۴-۵ مئی ۱۹۳۰ء کو امروہہ میں جمعیۃ علمائے ہند کا سالانہ اجلاس ہو رہا ہے، ہندوستان کی موجودہ حالت بیحد نازک اور صحیح رہنمائی کی محتاج ہے، اس سے پہلے کبھی اتنی شدید ضرورت پیش نہ آئی ہوگی، جو اس وقت درپیش ہے علاوہ سیاسی نازک ترین صورت حال کے اندرونی فتنہ بھی سامنے ہے کہ دوسری جماعت نے "توسیع نظام علما" کے نام سے ان ہی تاریخوں میں امروہہ میں دوسرے جلسہ کا انتظام اور اعلان کیا ہے، جمعیۃ کے جلسہ کو ناکام کرنے کی انتہائی کوشش ہو رہی ہے، اس لیے بصد ادب گذارش ہے کہ جمعیۃ علما کو اپنے زریں مشورے سے فائدہ پہنچانے اور اس فتنہ سے محفوظ رکھنے کی خاطر اس جلسہ میں ضرور شرکت فرمائیں - امید کہ یہ مخلصانہ گذارش ضرور مسموع اور مقبول ہوگی -

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

۱۷ر نومبر ۱۹۳۳ء
۱۳۵۲

مخدوم محترم دام فیضہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ - عنایت نامہ ۱۵ر نومبر کو ملا، مجھے چونکہ کانپور کے جلسے کی نوعیت کا پورا علم نہ تھا، اس لیے میں نے ماسٹر ہلال احمد اڈیٹر الجمعیۃ سے دریافت کرنے پر تحریر جواب کو ملتوی کیا رات ماسٹر ہلال احمد سے معلوم ہوا کہ اخبار وحدت روزانہ جو مولوی مظہر الدین صاحب کا اخبار ہے، مورخہ ۱۷ر نومبر کے صفحہ ۳ پر خود مولوی مظہر الدین کی جانب سے یہ اعلان ہے کہ

- مجلس تحفظ حقوق شرعی مسلمانان انڈیا کی عظیم الشان کانفرنس کانپور کی صدارت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب
[illegible] فرمائیں گے

نیز اسی اعلان میں یہ الفاظ بھی ہیں :-

"مسلمانان کانپور کے جلسۂ عام منعقدہ ۱۲ نومبر جو حافظ ہدایت حسین صاحب بیرسٹر کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا، مرکزی جمعیۃ علمائے ہند مرکزی والان دہلی سے درخواست کی ہے کہ یہ کانفرنس اس کی تحریک پر ہو رہی ہے، لہٰذا وہ خصوصیت سے شرکت و تعاون کرے۔"

کانپور سے میرے یا مولانا احمد سعید صاحب کے نام کوئی دعوتی خط نہیں آیا ہے، اور آج ۱۷ نومبر ہے، یہ قضا کانفرنس غالباً گذشتہ رات کو ہو بھی چکی ہوگی یا آج کسی وقت ہو جائے گی، میں نے اس کی تاریخ و وقت کا کوئی اعلان نہیں دیکھا، بہر حال اس وحدت کے اعلان سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ صدارت کا قصہ تو یکسو ہو گیا، نیز یہ بھی کہ گو قضا کانفرنس کی صورت بظاہر بدل لی تھی، مگر جمعیتہ مرکزی والان دہلی سے ہی وہ متعلق تھی،

جناب کے سفر افغانستان اور اس سے کامیاب و بخیریت مراجعت پر دلی مسرت ہوئی، مگر افغانستان کا یہ حادثہ بالکل سخت المناک ہے، حق تعالیٰ افغانوں کو رشد و ہدایت نصیب کرے، اور قومی فلاح اور نعمت استقلال کو وہ حمیت و عصبیت خاندانی پر ترجیح دیں، امید کہ مزاج اقدس بخیر ہوگا، رفقائے دار المصنفین کو اور حکیم محمد اسحاق صاحب کو سلام فرما دیں۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

مدرسۂ امینیہ دہلی

۱۰ مارچ ۱۹۳۶ء

حضرت محترم دام فیضہم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ! خاکسار انتہائی مسرت کے ساتھ آں محترم کی خدمت اقدس میں پُرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے جناب والا کو صحت عطا فرمائی

رب العزت جل شانہٗ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے مسلمانان ہند کے لیے فیوض علمیہ و عملیہ آن محترم سے متمتع ہونے کا سلسلہ جاری رکھا، اور دعا ہے کہ تادیر آن محترم کی فیض رسانی جاری رہے۔ آمین آمین۔ رفقائے دار المصنفین کی خدمات مبارکہ میں سلام عرض ہے، اور جناب حکیم محمد اسحاق صاحب کی خدمت میں بھی۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

دہلی

۱۴ر اپریل ۱۹۳۶ء

حضرت مخدوم محترم دامت مکارمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ کرمت نامہ نے عزت افزائی فرمائی، میری کیا خصوصیت ہندوستان کے تمام علمی، ادبی حلقے آن مکرم کی درازیِ عمر و امتداد ظل فیوض علمیہ کے متمنی اور بارگاہ احدیت میں آں جناب کی صحت وسلامتی کے لیے داعی و ملتجی تھے اور ہیں، اور رہیں گے، مژدۂ صحت جناب والا نہ صرف عوام مسلمین ہند کے لیے ملکہ علماء و فضلاء اور باکمال ماہرین کے لیے ایک نوید جانفزا بنکر موجب سجدہ ریزی شکر باری تعالیٰ و تقدس ہوا،

رب العزت آپ کے سایۂ افاضات علمیہ کو تادیر قائم رکھے، آمین۔ امید ہے کہ قیام دہرہ دون صحت کے لیے مفید ہوگا۔ رفقائے دار المصنفین کی خدمت عالیہ میں سلام شوق۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

۳۱ر دسمبر ۱۹۳۶ء

مکرم محترم جناب مولانا السید سلیمان صاحب دام مجدہم

بعد سلام مسنون معروض ہے کہ کرمت نامہ نے سرفراز فرمایا۔ دسمبر ۳۶ء کا معارف بھی پہنچا۔

یہ افسوسناک خبر کہ ادارہ صابری صاحب نے جناب کو ازالۂ حیثیت عرفی کا نوٹس دیا ہے، میرے لیے سوہان روح ہوگئی،

میں نے معارف کا وہ شذرہ بھی پڑھا جس پر اس نوٹس کی بنیاد ہے، اگر وہ یہی ہے جو معارف بابت دسمبر ۱۹۳۶ء کے صفحہ ۴۰۲ پر مندرج ہے تو میرے خیال میں اس پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعوی درست نہیں،

اللہ تعالیٰ بہتر کرے، اور مسلمانوں کو راہ راست اور عرفان قدر کی توفیق ارزانی فرمائے۔ اور ذات گرامی کو ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھے۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ

۱۷ر نومبر ۱۹۴۰ء

مولانا المحترم دام فضلہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، اس وقت ایک خاص ضرورت سے مکلف ہوا ہوں، وہ یہ کہ مسلم یونیورسٹی میں مولانا ابوبکر شیث کی جگہ افسر دینیات کا معاملہ زیر غور ہے۔ مولوی سید فخر الحسن صاحب مدرس مدرسۂ فتحپوری بھی امیدوار ہیں، انٹرویو میں وہ شامل تھے، آدمی بہت لائق ذی استعداد اور صالح ہیں، اگر ان کے تقرر کی صورت ہوسکے تو وہ اس خدمت کے اہل ہیں، میں تو آج تک کورٹ کی میٹنگ میں شریک نہ ہوسکا، جناب کچھ سعی فرماسکیں تو دریغ نہ فرمائیں۔

مولانا احمد سعید صاحب کل ۱۸ر کو دہلی سے روانہ ہوں گے،

مولانا مسعود علی صاحب کی خدمت میں سلام عرض ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ

مطبوعات جدیدہ

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ - از شیخ ابوزہرہ ترجمہ رئیس احمد جعفری صفحات ۸۰۲،
کتابت وطباعت بہتر، ناشر المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ لاہور، قیمت ۲۱ روپے۔

آج سے پچاس ساٹھ برس پہلے ہندوستان میں امام ابن تیمیہ کی شخصیت زیادہ معروف نہیں تھی، اہل علم کا جو حلقہ واقف تھا، ان میں بھی معتد بہ تعداد ان کے افکار وخیالات کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا تھی جس کی وجہ سے ان کے علم وفضل اور مجددانہ اور مجتہدانہ کارناموں پر پردہ پڑا ہوا تھا، سب سے پہلے مولانا شبلی اور مولانا آزاد اور اسکے بعد علمائے اہل حدیث کی کوششوں سے انکی شخصیت عام لوگوں میں معروف ہوئی اور غلط فہمیوں کے پردے چاک ہوئے، اور اب ہندوستان کے اہل حق کا مشکل ہی سے کوئی طبقہ ہوگا جن کا دل ان کی محبت وعقیدت سے لبریز نہ ہو، اس مدت میں امام کی متعدد سوانح عمریاں شائع ہوئیں، جن میں بعض بہت ضخیم اور برسوں کی محنت کے بعد لکھی گئی ہیں، مگر اس موضوع پر شیخ ابوزہرہ نے جو داد تحقیق دی ہے، اس میں ان کا کوئی مشکل سے شریک وسہیم ہو سکتا ہے، شیخ نے نہ صرف ان کی مفصل سوانح حیات لکھی ہے بلکہ انکے علم وفضل اور افکار واجتہادات پر پورے مالہٗ وماعلیہ کے ساتھ بحث کی ہے، اور جہاں جہاں امام نے دوسرے ائمہ مجتہدین سے اختلاف کیا ہے، اس کی بدلائل وضاحت کی ہے، ساتھ ہی انکے تفردات کو بھی جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور امام صاحب کی طرف جو باتیں غلط طور پر منسوب ہیں، ان کی بھی تردید یا توجیہ کی ہے، خاص طور پر نزول باری کے مسئلہ میں ابن بطوطہ نے جو غلط فہمی پھیلائی ہے

اس کی بڑی مدلل تردید کی ہے،

ائمہ اربعہ کی سوانح حیات کے بعد یہ کتاب ابوزہرہ کا بڑا کارنامہ ہے، کتاب پر مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کے مفید حواشی ہیں مگر اپنے مسلک کے خلاف جو باتیں مولانا کو نظر آئیں ایسے میں امام کا ساتھ انھوں نے نہیں دیا ہے، مثلاً رجوع ہبہ کے مسلک میں، بہرحال یہ کتاب شائع کرکے المکتبۃ السلفیہ نے ایک بہت ہی مفید کام انجام دیا،

علی برادران ۔ از رئیس احمد جعفری، صفحات ۶۲۰، کتابت و طباعت بہتر، ناشر محمد علی اکیڈمی لاہور، قیمت ۱۵ روپے

مولانا محمد علی مرحوم میں جو گوناگوں خصوصیات تھیں اور ان کے جتنے متنوع کارنامے ہیں، اس کی مثال کسی دوسرے مسلمان لیڈر میں نہیں مل سکتی، ان کو جو مقبولیت و محبوبیت مسلمانوں میں حاصل ہوئی، وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی، ان کی سب سے بڑی خصوصیت وطنیت و قومیت اور دینی غیرت و حمیت کی جامعیت تھی، انھوں نے ان میں سے کسی کے حق کو بھی نظر انداز نہ ہونے دیا، وہ ایک طرف کٹر مسلمان تھے، دوسری طرف پکے ہندوستانی، وہ جنگ آزادی کے نامور قائد بھی تھے اور دین و ملت کے مجاہد بھی، اس کے لیے ان کو اپنوں سے جنگ کرنا پڑی اور اپنے ننگ و ناموس تک کی پروانہ کی لیکن دین و ملت کا دامن ان کے ہاتھوں سے نہ چھوٹا، ان کی وطنی خدمات ناقابل فراموش ہیں، ایک زمانہ تک وہ جنگ آزادی کے قافلہ کے سالار رہے، اس تحریک میں ان ہی نے جان ڈالی تھی، اور اس راہ میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، لیکن ہندوستان نے ان کو بہت جلد بھلا دیا، اور افسوس یہ ہے کہ مسلمان بھی ان کو بھولتے جاتے ہیں، اس لیے جب ان کی یاد میں کہیں سے کوئی آواز اٹھتی ہے تو بڑی قابل قدر معلوم ہوتی ہے، اور یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ مولانا مرحوم کے پہلے سوانح نگار نے، مذکورہ بالا کتاب مرتب کرکے مسلمانوں کا ایک فرض کفایہ ادا کیا ہے

یہ کوئی مرتب سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ اس کی حیثیت ایک کشکول کی ہے جس میں علی برادران کے متعلق ہر قسم کے معلومات ہیں، جو کسی ایک کتاب میں ایک جگہ نہیں مل سکتے، اس سے ان کی زندگی اور ان کے کارناموں کے ہر رخ کی جھلک نگاہ کے سامنے آجاتی ہے، لکھنے والوں میں مختلف طبقوں کے موجودہ اکابر کے مضامین ہیں، اگر ان میں کچھ پرانے مسلم اور غیر مسلم لیڈروں کے تاثرات بھی نقل کر دیے جاتے تو اس کتاب کا وزن اور بڑھ جاتا، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مولانا محمد علی مرحوم کی زندگی کا اچھا مرقع ہے، اور محمد علی اکیڈمی نے اس کو شائع کرکے ایک بڑا فرض ادا کیا ہے۔

روائع اقبال - از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، صفحات ۱۲۶، ٹائپ بہتر، ناشر دار الفکر دمشق

علامہ اقبال کو عرب دنیا سے روشناس کرانے کی غالباً سب سے پہلی کوشش عبد الوہاب عزام پاشا مرحوم سابق سفیر مصر نے کی یعنی انھوں نے ان کے فارسی اشعار کا عربی اشعار میں ترجمہ کیا، کسی زبان کی شاعری کو دوسری زبان کی شاعری میں منتقل کرنے پر خواہ کتنی ہی زیادہ قدرت کیوں نہ ہو، پھر بھی ضرورت شعری کی خاطر شاعر کے اصل جذبات کو کہیں کہیں مجروح ہی کرنا پڑتا ہے، اس لیے اس کے لیے نثر کی زبان زیادہ موزوں ہوتی ہے، جس میں نہ صرف اشعار کا اچھے سے اچھا ترجمہ کرنے کا موقع ہوتا ہے، بلکہ اس میں شاعر کے فکر و نظر کے پس منظر کو سامنے لانے کا موقع بھی ملتا ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے عربی زبان کے ادیب علی طنطاوی کی تحریک اور اقبال سے اپنے طبعی شغف کے نتیجہ میں روائع اقبال کے ذریعہ اقبال کی شاعری کو نثر میں عرب دنیا تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، انھوں نے اس میں ان کی ایک درجن کے قریب اہم نظموں کا بہترین عربی نثر میں ترجمہ کیا ہے اور اس کی پوری کوشش کی ہے کہ اقبال نے جن دردمندانہ جذبات و تاثرات کے ساتھ یہ اشعار کہے ہیں سامع کے دل و دماغ میں بھی وہی تاثرات پیدا ہوں، مولانا اور دوسرے حضرات

کی یہ سعی اس حیثیت سے بھی مشکور ثابت ہوئی کہ عرب دنیا جو علامہ اقبال کو ٹیگور سے بھی کم جانتی
تھی، اب ان سے پورے طور پر نہ صرف روشناس ہو چکی ہے، بلکہ ان کی گرویدہ ہے۔

آہنگ حیات۔ از محمد منشاء الرحمن صاحب منشا، مرتب محمد قمر الدین صاحب صابری
صفحات ۲۰۰، کتابت و طباعت اعلیٰ، ناشر بیت الاشاعت چھاؤنی ناگپور

محمد منشاء الرحمن صاحب منشا جدید دور کے ممتاز شعراء میں ہیں، ان کی غزلیں اور نظمیں
اردو کے تمام ہی قابل ذکر رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں، اب پہلی بار ان کا مجموعہ آہنگ حیات
شائع ہوا ہے، ان کو نظم و غزل دونوں میں یکساں قدرت ہے، مگر غزل سے ان کو فطری مناسبت
ہے، اس لیے ان کی نظموں میں غزل کا سا درد و سوز اور غزلوں میں نظم کا توازن و تسلسل محسوس ہوتا
ہے، ظاہری و معنوی شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ ان کا کلام جدت و قدامت کے امتزاج کا بھی بہترین
نمونہ ہے، انھوں نے جدید رجحانات اور اس دور کے تقاضوں سے صرف نظر نہیں کیا ہے، مگر ان کی
اور نظمیں نہ تو ترقی پسندوں کی آشفتہ خیالی کی نذر ہونے پائی ہیں اور نہ غزلوں کی "شان رعنائی" مجروح
ہونے پائی ہے، یوں تو پورا مجموعہ بار بار مطالعہ کے لائق ہے، مگر ان کی بعض غزلیں اور نظمیں تو بے مثال
ہیں، بعض الفاظ اور ترکیبیں محل نظر ضرور ہیں، مگر اس سے ان کے کلام کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا

لمحات۔ از حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، صفحات ۸۸، ٹائپ عمدہ، ناشر شاہ ولی اللہ
اکیڈمی صدر حیدرآباد (پاکستان)، قیمت عہ

شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فلسفۂ تصوف اور اسرار معرفت ربانی پر جو
کتابیں لکھی ہیں، ان میں ایک لمحات بھی ہے، یہ کتاب گویا ان کے فلسفہ کا خلاصہ اور درودساہے،
مگر اب تک اشاعت سے محروم تھی، مولانا غلام مصطفےٰ صاحب قاسمی کو جو اس سے پہلے بھی شاہ صاحب
کے بعض اور رسائل کو مرتب کرکے شائع کر چکے ہیں، اس کا ایک نسخہ قادری خانقاہ محمد شاہ پیر دا

کراچی کے یہاں دستیاب ہوگیا، جسے انھوں نے جامعہ ملیہ کے اصل نسخہ اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی مدد سے مرتب کرکے شائع کیا ہے، ایک یادگار کے طور پر اسکی اشاعت ایک مفید کام ہے۔

انڈونیشیا۔ از شاہ حسین رزاقی، صفحات ۴۴۰، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر ادارۂ ثقافت اسلامیہ، پاکستان، قیمت عہ/

انڈونیشیا ہمارا قریبی پڑوسی ملک ہے، مگر ہندوستانی زبانوں میں اس پر اتنا کام بھی نہیں ہوا ہے، جتنا انگریزی میں ہوا ہے، انگریزی میں دو درجن سے زیادہ ضخیم کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، شاہ حسین صاحب رزاقی قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اردو زبان میں ایک تحقیقی کتاب پیش کرنے کی پہلی کوشش کی ہے، کتاب میں کل بیس ابواب ہیں، جن میں انڈونیشیا کی قدیم تاریخ، اسلام کے داخلہ، پرتگالیوں کی یورش، اور اس کی حکومت سے لیکر جدید عہد کی سیاسی تبدیلیوں اور سیاسی تحریکوں تک پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس کتاب کے مرتب کرنے میں مصنف نے نہ صرف انگریزی اور دوسری زبانوں کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے بلکہ ملک کی بہت سی زندہ شخصیتوں سے ملکر بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی اشاعت پر مصنف کے ساتھ ادارۂ ثقافت بھی قابل مبارکباد ہے۔ "م-ن"

روزگار فقیر کا پتہ

پچھلے مہینہ میں روزگار فقیر پر جو تبصرہ نکلا تھا، اس میں سہواً اس کا پتہ درج ہونا رہ گیا۔ ناظرین اس کا پتہ نوٹ کرلیں۔

نفیر اسپننگ ملز لمیٹڈ ۴۳ کیمبل اسٹریٹ
کراچی

فارم ۴

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" "
قومیت	....
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام وپتہ مالک رسالہ	

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

صدیق احمد

جلد ۹۳ ماہ ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۴ء عدد ۴

مضامین

شذرات

اس مرتبہ جس شکل میں اور جیسے مسلسل فسادات ہو رہے ہیں، وہ اس کا ثبوت ہے کہ یہ کوئی ہنگامی واقعہ نہیں بلکہ ایک مرتب و منظم اسکیم کا نتیجہ ہیں جو مسلمانوں اور حکومت دونوں کیلئے یکساں خطرناک ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ یا حکومت فرقہ پرستوں کے سامنے سپر ڈالدے یا اس کا تختہ الٹ کر اس کو اپنے قالب میں ڈھالا جائے، اب فسادات نے ایک انقلابی اور وسیع منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی ہے، اور فرقہ پروری کا زہر پورے ہندوستان میں سرایت کر چکا ہے جس سے کانگریس اور حکومت کے ارکان تک کا دامن پاک نہیں ہے، وہ حکام جن پر امن و امان کے قیام کا دار و مدار ہے خصوصیت کے ساتھ اس کا شکار ہیں، اس نے حکومت فرقہ پروروں کے خلاف کوئی کوئی سخت قدم نہیں اٹھا سکتی، اگر وہ اس کی ہمت کرے بھی تو اس میں کامیاب نہ ہوگی،

ان فسادات کو روکنے کی صرف یہی شکل ہے کہ پہلے کانگریسی اور حکومت کے ارکان خود اپنا ذہن صاف کریں، اور ایسے بیانات نہ دیں جن سے فرقہ پرستوں کو شہ ملتی ہے، ان کے اخبارات لیڈروں اور جارح تنظیموں پر پابندیاں عائد کی جائیں، ان میں سے جو بھی فرقہ پروری کو بھڑکائے، اس سے سختی کیساتھ مواخذہ کیا جائے، یہ عذر لغو ہے، کہ زبان اور قلم پر پابندی عائد کرنا جمہوریت کے خلاف ہے، جب ان کو جمہوریت کو ختم کرنے کے لئے استعمال کیا جائے، اس وقت ان کی آزادی کو قائم رکھنا جمہوریت نہیں بلکہ جمہوریت دشمنی ہے جو حکام فسادات میں فرقہ پروری سے کام لیں ان کو سخت سزائیں دی جائیں، فوج اور پولیس میں مسلمانوں کو ان کے تناسب سے جگہیں دی جائیں،

کانگریس پوری قوت اور تنظیم کیساتھ پورے ملک میں فرقہ پرستی کے خلاف تحریک چلائے اور جس طرح وہ آزادی کی جنگ لڑی تھی، اسی ہمت و جرأت سے فرقہ پروری کا مقابلہ کرے، اگر اس میں حکومت ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ہو، تو اس کی بھی پروا نہ کرے، اس کے بغیر اس طوفان کا روکنا ممکن ہی اور دوسرے ذرائع سے ممکن ہی فسادات عارضی طریقہ سے دب جائیں لیکن جب تک فرقہ پرستی کی جڑ نہ اکھڑے گی، اس وقت تک فسادات کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، اس میں شبہہ نہیں کہ فرقہ پرستوں کی قوت اتنی بڑھ گئی ہی، اور ان کا اثر اتنا ہندوستان پر ہو چکا ہی کہ ان باتوں پر عمل کرنا بہت دشوار ہے لیکن ان حالات میں بھی ہندوستان سے انسانیت کا چراغ بجھ نہیں گیا ہی، اور اب بھی ایک طبقہ ایسا موجود ہے، جو دل سے فرقہ پروری کا استیصال چاہتا ہے، اگر وہ ہمت کرکے میدان میں نکل آئے تو کامیابی بالآخر اسی کو ہوگی، اس لئے کہ فرقہ پروروں کی بنیاد تخریب، نفرت اور دشمنی پر ہی، اس لئے وہ تعمیری اور اصلاحی جماعتوں کے مقابلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے، اور دیر سویر ان کو ان کے مقابلہ میں شکست ماننا پڑیگی، اور اگر یہ صورت نہ اختیار کی گئی، تو حکومت کو یا فرقہ پرستوں سے سمجھوتہ کرنا، یا اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے گا، دونوں صورتوں میں اس کا خاتمہ ہے،

حکومت کی کمزوری اور عارضی مصلحتوں نے اس کو حقائق سے غافل کر دیا ہی، فرقہ پرستوں کا اصل مقصد حکومت پر قبضہ کرکے اس کو اپنے قالب میں ڈھالنا ہی، مسلمانوں کی دشمنی کو انھوں نے اس مقصد کے حصول کا وسیلہ بنایا ہی، اس لئے اگر وہ غالب آ گئے تو کانگریس کو نہ صرف حکومت سے ہاتھ دھونا پڑیگا، بلکہ اس کے ساتھ ہندوستان سے جمہوریت اور سیکولرزم کا بھی خاتمہ یقینی ہی، اور اس نے اس کے ذریعہ دنیا میں جو وقار حاصل کیا ہی وہ خاک میں مل جائیگا اور فرقہ پرستی کی آگ محض مسلمانوں کی دشمنی تک محدود نہ رہے گی، بلکہ آگے چل کر اس سے اور بھی فرقہ بندیاں پیدا ہوں گی، جو ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیگی، اسلئے فرقہ پرستی کا مسئلہ تنہا مسلمانوں کے تحفظ کا نہیں بلکہ خود جمہوریت اور سیکولرزم کے تحفظ کا ہی، اسلئے یا حکومت کو کھل کر فرقہ پروری کا مقابلہ کرنا یا اپنے اصولوں کو خیرباد کہنا پڑیگا، دونوں چیزیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں، ہمیں توقع ہے کہ پاکستان بھی خدا دونوں کو اپنی اپنی اقلیتوں کی ذمہ داری محسوس کرنیکی توفیق

دارالمصنفین نصف صدی سے جو علمی خدمت انجام دے رہا ہے، اس نے جس طرح ملک کا مذاق بنایا، اور جیسا سنجیدہ معیاری علمی لٹریچر پیدا کیا، اس سے علمی حلقہ پوری طرح واقف ہے، اسلئے اسکی تفصیل کی ضرورت نہیں اس طویل مدت میں اس نے اپنے اشتہار کا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا، وہ خاموشی کیساتھ اپنا کام انجام دیتا رہا، جس کی اہل علم نے پوری قدر دانی کی، دارالمصنفین اس حیثیت سے پورے ہندوستان میں منفرد ادارہ ہے، کہ اس کا اپنا وسیع کتبخانہ ہے، اپنا برقی پریس ہے، اپنے مستقل رفقار و مصنفین ہیں، جو دارالمصنفین میں رہ کر کام انجام دیتے ہیں یعنی ایک علمی ادارے کیلئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ سب دارالمصنفین میں موجود ہیں، اس کو کسی چیز کیلئے باہر کی ضرورت نہیں اور یہ ساری چیزیں اس نے حکومت کی سرپرستی اور قوم کی امداد کے بغیر فراہم کیں، نہ اس نے انگریزوں کے زمانہ میں کوئی امداد لی، اور نہ قومی حکومت نے بعض عارضی امدادوں کے علاوہ جو خاص کام کے لئے تھیں کوئی مستقل امداد دی، نہ اس نے قوم کے سامنے کبھی ہاتھ پھیلایا، دارالمصنفین کے کارکنوں نے جس قناعت اور سادگی کے ساتھ پوری عمر گذار دی، اس کا تصور بھی اس زمانہ میں نہیں کیا جا سکتا،

اب ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات نے اس قسم کے اداروں کی اہمیت بہت گھٹا دی ہے، لیکن بعض پہلوؤں سے اس کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ملک کے سامنے دارالمصنفین کے خدمات پیش کر کے اسکی اہمیت واضح کیجائے، اور ان طبقوں میں بھی اسکی آواز پہنچائی جائے جو اس سے کم واقف ہیں، اس لئے اگر حالات سازگار رہے تو انشاء اللہ آئندہ نومبر میں اس کی پچاس سالہ جوبلی کرنے کا ارادہ ہے، نائب صدر جمہوریہ عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے جن کے دارالمصنفین سے دیرینہ تعلقات ہیں، اور جو اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی ہیں، اس کی صدارت منظور فرمالی ہے، امید ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومت کے علم دوست وزراء، اسلامی حکومتوں کے سفراء، یونیورسٹیوں اور عربی درسگاہوں کے فضلاء، اور ہندوستان کے نامور علماء و مشاہیر اس تقریب میں شریک ہوں گے، اور علمی حیثیت سے اس کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی کوشش کیجائیگی

مقالات

علامہ سید سلیمان کی نثر و انشاء

از جناب سید ذوالفقار حسین بخاری ایم، اے، لکچرار اسلامیہ کالج لائل پور

جن اصحاب علم و قلم نے لیلائے اردو کے گیسوؤں کو سنوارا اور اس کو ایک علمی و ادبی زبان بنایا اُن میں مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک ممتاز مقام ہے، وہ اسلامی علوم کے فاضل اجل ہی نہیں، ایک صاحب طرز ادیب بھی تھے، اور مختلف مرحلوں سے گذرنے کے بعد اس منزل تک پہنچے تھے، اس مضمون میں ان مراحل اور ان کے مخصوص طرز کا جائزہ لیا گیا ہے، (م)

سید صاحب کا طرز تحریر مختلف اوقات میں بدلتا رہا ہے، سید صاحب نے ابتدا میں مولانا شرر کی "منصور موہنا" پڑھی تھی، اس کے مطالعہ سے انھیں شرر کا طرز تحریر بہت پسند آیا، اور اسی سے اُن کی تحریر کی ابتدا ہوئی، چنانچہ ۱۹۰۲ء میں الندوہ لکھنو کے لیے انھوں نے دو مضامین "علم حدیث" اور "منطق" پر اسی رنگ میں لکھے، اسی زمانے میں مولانا شبلی ندوۃ العلماء میں آئے، انھوں نے یہ مضامین دیکھے اور بقول سید صاحب :-

"پہلے مضمون کو تو کچھ اصلاح دیکر باقی رکھا، اور دوسرے کو جس میں شرریت زیادہ تھی نکال ڈالا" (یہیں سے متاثر ہو" معارف جولائی ۱۹۴۰ء ص ۴)

اس لیے سید صاحب نے مولانا شبلی کے رنگ کی پیروی شروع کر دی، مگر بقول ان کے:

"اصل منزل تک پہنچنے میں کچھ دیر لگی، کیونکہ ابھی رنگ پوری طرح چڑھنے بھی نہ پایا تھا کہ ۱۹۰۸ء میں "سخندان پارس" کے مطالعہ کا اتفاق ہوا، اس کی دلکشی نے اپنی طرف کھینچا ایک دو مضمون اسی رنگ میں لکھے۔" (معارف جولائی ۱۹۴۰ء ص ۴)

مگر اس طرز کا نباہنا ان کے بس میں نہ تھا، اس لیے پھر شبلی کی طرز تحریر کی طرف مائل ہوئے، جو علمی مضامین کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھا۔

"اس لیے ان کی ایک ایک تصنیف کئی کئی دفعہ پڑھی اور سالہا سال اُن کی صحبت اٹھائی، تو علمی زندگی کا ایک نہج، تقریر کا ایک انداز اور تحریر کا ایک رنگ نکل آیا۔" (معارف جولائی ۱۹۴۰ء ص ۵)

لیکن ابھی سید صاحب، شبلی کے طرز کو اپنا سکے اور نہ اپنا انفرادی اسلوب پیدا کر سکے تھے، کہ جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ادارت میں "الہلال" نکلا تو سید صاحب اس کے اسٹاف میں شامل ہو گئے، اور الہلال کے مضامین میں یکسانیت قائم رکھنے کے لیے مولانا ابوالکلام کے مقبولِ عام خطیبانہ طرز میں لکھنا شروع کیا، چنانچہ اس زمانے کی اکثر و بیشتر تحریریں الہلالی رنگ میں ہیں، اس طرز کا کامیاب ترین مضمون مسجد کانپور کے بارے میں "مشہد اکبر" ہے[1]۔ لیکن ابوالکلام کا رنگ بھی عارضی ثابت ہوا، اور سید صاحب پھر ایک بار استاد کے نقشِ قدم پر آ گئے، فرماتے ہیں:-

---

[1] "مشہد اکبر" ابوالکلامی رنگ میں اتنا ڈوبا ہوا ہے کہ عام طور پر لوگ اس کو مولانا ابوالکلام آزاد کی نگارشات کا نتیجہ سمجھتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ مضمون سید صاحب ہی کا ہے، ہم نے اس پر ایک مضمون میں مفصل بحث کی ہے جس کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام کا کوئی ایسا بیان نہیں ہے جس میں انھوں نے اس مضمون کو اپنی ملکیت بتایا ہو، اس کے برعکس سید صاحب کا صریح بیان موجود ہے کہ یہ مضمون میرا ہے، یہاں یہ بات کہہ دینا ضروری ہے کہ مولانا ابوالکلام اپنے طرز خاص کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی، ان کے (باقی ص پر)

"معارف میں جو شذرات لکھے جاتے ہیں، اس کا آغاز میں نے الہلال ہی میں کیا تھا لیکن معارف میں آکر الہلالیت کم ہو کر ایک اور خاص رنگ ابھر آیا، لیکن بہرحال چند ٹرز ادھر ادھر بہک کر پھر اسی راستہ پر آ گیا جس پر استاد مرحوم نے لا کر کھڑا کر دیا تھا، خصوصیت کے ساتھ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ان کے طرز ادا کے نباہنے کی پوری کوشش کی ہے۔" (معارف جولائی ۱۹۴۰ء)

آخرکار انھوں نے شبلی کے طرز میں اپنی تحریروں کو ڈھالا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی تحریروں سے ابوالکلام کے طرز کا اثر پوری طرح مٹ نہ سکا۔ ان کی آخری زمانے کی تحریروں تک میں کسی نہ کسی حد تک یہ اثر موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ سید صاحب کے اسلوب خاص پر گفتگو کی جائے، مولانا شبلی کے طرز اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب بیان پر ایک نظر ڈال لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کی روشنی میں سید صاحب کے طرز خاص کا تجزیہ کیا جائے گا۔

ہر تحریر اپنے لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ بفن (Buffon) کا قول ہے "Style is the man"[1]۔ لیکن بعض اوقات لکھنے والوں میں دوسرے مصنفین کے اسالیب کی بھی جھلک آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ لکھنے والے کی ذات (خواہ وہ اسکے دبانے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے) اپنے کو ظاہر کر دیتی ہے۔ بقول ڈربے ہر مصنف کی ذاتی

(بقیہ حاشیہ ص) تقلید کوئی آسان کام نہیں، سید صاحب کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے ابوالکلام کے رنگ میں اتنا ڈوب کر لکھا کہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ آیا یہ تحریر سید صاحب کی ہے یا ابوالکلام کی، اسی طرح شرر اور محمد حسین آزاد کی تحریروں کی پیروی کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ سید صاحب جس طرز سے متاثر ہوتے تھے، اسی میں لکھنے کی استعداد پیدا کر لیتے تھے۔

[1] The Problem of Style by Murry p. 3

آواز کا لہجہ بھی سنائی دے ہی جاتا ہے[1]، اور لکھنے والا چاہے کتنے ہی دوسروں کے اسالیب کی خارجی شکل (External form) کو اختیار اور اس کی تقلید کرنے کی کوشش کرے لیکن اس کی اپنی شخصیت کہیں نہ کہیں ضرور ظاہر ہو کر رہتی ہے، یہی حال سید صاحب کا ہے، انھوں نے دوسرے مصنفین کا انداز بیان اپنانے کی کوشش کی، لیکن ان مصنفین اور سید صاحب کے مزاج میں بڑا فرق تھا، اس لیے یہ فرق ان کی تحریروں میں بھی جھلکے بغیر نہیں رہا،

شبلی بڑے جذباتی تھے، وہ راجپوت تھے، ان میں اسلام کی خدمت کا بے پناہ جذبہ تھا، اس لیے ان کی تحریروں میں قوت اور جوش بیان ہے، انھیں اپنے کمال اور اپنی عظمت کا احساس بھی تھا، اس لیے ان کا قلم فخر و مباہات کے واقعات میں زیادہ جولانی دکھاتا ہے، شبلی کی شخصیت نے ان کی تحریر کو بعض نمایاں خصوصیات عطا کی ہیں، ان کے احساس عظمت نے خاص طرح کے ذخیرۂ الفاظ ان کے قلم پر چڑھا دیے تھے، مثلاً وہ فخر و ناز افتخار، شباب، ہستی، نشہ، شراب، انجمن، بہار، رنگ، داستان وغیرہ، الفاظ کا استعمال زیادہ کرتے ہیں[2]، ان کے مزاج میں شاعری کا رنگ رچا ہوا تھا، اس لیے تشبیہ و استعارہ کو زیادہ کام میں لاتے ہیں، اور نثر میں بھی شاعرانہ فضا قائم کر دیتے ہیں، شبلی کی تحریر میں استدلالیت بھی ہے اور سادگی بھی، مگر وہ سپاٹ نہیں ہوتی، وہ طنز و تعریض سے بھی بڑا کام لیتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ طنز کا رنگ زیادہ تیز ہوتا چلا گیا، طنزیاتی جملے ان کی سب کتابوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں، ان کے طنز کا سب سے زیادہ موثر اور کامیاب رخ یورپ کے بے درد

---

[1] The modern prose style by Dobree. P.3

[2] محترمی ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب نے اپنے مقالہ "شبلی کا اسلوب بیان" میں اس طرح کے بہت سے الفاظ کی فہرست دی ہے، ملاحظہ ہو "بحث و نظر" ص ۱۲۵ تا ۱۴۵

مورخین اسلام[۱] کے خلاف ہے، اس کا دوسرا انشا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور ہمعصر علما، وفضلاء ہیں، شبلی کے اسلوب کا تیسرا نمایاں پہلو ان کی خطابت ہے، ایسے موقعوں پر وہ "تم" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، شبلی کی جوشیلی طبیعت کے اس پہلو نے ان کی مورخانہ حیثیت کو نقصان بھی پہنچایا لیکن ان کی مورخانہ حیثیت ان کے مورخانہ کمال سے زیادہ ان کے اسلوب کی دلکشی کی وجہ سے بلند مقام رکھتی ہے،

شبلی کی خطابت کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اختیار کیا، اور جذبات کی تندی وتیزی میں ان سے بھی آگے نکل گئے، وہ ایک شعلہ بیان خطیب اور آتش نوا سیاسی لیڈر تھے، جنگ بلقان وطرابلس اور تحریک خلافت کے زمانے میں ان کی شخصیت اپنے عروج پر تھی، شبلی اور آزاد کے مزاج کا یہ اشتراک سید صاحب کے اسلوب پر کئی طرح سے اثر انداز ہوا، وہ شبلی سے زیادہ صیغۂ واحد متکلم[۱] کا استعمال کرنے لگے۔ "الہلال" اور "البلاغ" میں مولانا آزاد پر یہی رنگ چھایا ہوا نظر آتا ہے، اسی طرح فارسی عربی کی بڑی بڑی ترکیبوں کی کثرت بھی شبلی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں، جس سے بعض اوقات قاری کو بڑی الجھن ہوتی ہے، الہلال، البلاغ اور تذکرہ میں آزاد کی تحریر کا یہی عالم ہے، بلکہ ان کے فقروں میں طوالت اور جملہ ہائے معترضہ کی کثرت بھی بہت ہے، جس سے آزاد کا رنگ شبلی کے رنگ سے الگ ہو جاتا ہے، یہاں وہ بعض اوقات شبلی کے بجائے ابوالفضل کا رنگ اپنانے لگتے ہیں، آزاد کی طبیعت طوالت کی طرف مائل ہے اور شبلی ایجاز و اختصار کے قائل تھے[۲]، اس رجحان کی وجہ سے آزاد کی تحریر میں مبالغہ، فخریات

---

[۱] مولانا ابوالکلام آزاد کے صیغۂ واحد متکلم یعنی "میں" میں جو کشش اور رعنائی ہے وہ کسی رومانی اور غیر رومانی ادیب کے "میں" میں نہ پیدا ہو سکی۔ [۲] سید صاحب مولانا شبلی کا یہ قول سنایا کرتے تھے کہ میں ایجاز کا بادشاہ ہوں اور ابوالکلام اطناب کا بادشاہ ہے"۔ بروایت سید صباح الدین عبدالرحمن، مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں"

احساس کمال اور طنز و استہزا کا رنگ بہت شوخ ہو گیا ہے، اور ان کی تحریر شبلی سے الگ ہو گئی ہے، "غبار خاطر" میں آزاد کی تحریر کا گھن گرج کم ہو جاتا ہے، اور اعتدال آجاتا ہے،

سید سلیمان ندوی کا مزاج تاریخی، تحقیقی اور علمی تھا، انھیں ہنگامہ خیز واقعات سے بہت کم دلچسپی تھی، ان کی شخصیت میں ایک سکون، وقار اور خلوص تھا، یہی اوصاف انکی تحریروں میں ظاہر ہوئے، انھوں نے شبلی کا اسلوب اختیار کیا لیکن بقول ڈوبرے (De Buffon)

اپنا اسلوب بھلا کہاں چھپ سکتا ہے، سید صاحب کی تحریروں میں شبلی کا اسلوب محض خارجی اور اختیاری وصف کے طور پر آگیا ہے لیکن ان کے مزاج میں جوش و خروش کے بجائے ٹھہراؤ ہے، اس لیے شبلی کا اسلوب ان سے نبھ نہیں سکا، گو سید صاحب کا دعویٰ ہے کہ وہ شبلی کے کامیاب مقلد ہیں، لیکن نقادوں کو ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے،

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں :-

"سید صاحب کی تحریر میں شبلی کی برجستگی و بے ساختگی اور فارسی تراکیب کی چستی نہیں" (قومی آواز لکھنؤ، ۳۰ نومبر ۱۹۵۳ء)

مولانا عبد الماجد دریابادی تحریر فرماتے ہیں :-

"سلیمانی ادب و انشا، کا جو اردو کی تاریخ ادب و انشا، میں ایک خاص مقام ہے شبلیت اور ابو الکلامیت دونوں سے الگ ایک خوشگوار حد تک دونوں کو سموئے ہوئے ہے" (صدق جدید لکھنؤ ۲۲ر جنوری ۱۹۵۴ء)

اس سے انکار نہیں کہ سید صاحب نے شبلی اور آزاد دونوں کے اسالیب کو اپنانے کی کوشش کی لیکن ان کے طبائع میں بنیادی اختلاف ہے، اس لیے ان کے اسلوب سید صاحب کے اپنے اسلوب کا جزو نہ بن سکے،

سید صاحب نے شبلی کی تحریر کے دو پہلوؤں سے زیادہ اثر لیا ہے: (۱) فارسی کی شگفتہ

تراکیب کا استعمال (۲) طنز :-

سید صاحب کے ہاں فارسی ترکیبوں کا استعمال خاصا ہے لیکن عربیت کی طرف میلان کی وجہ سے ان کی تحریر کا عام رنگ شبلی سے کچھ مختلف ہو گیا ہے، تاہم شبلی کی محبوب ترکیبیں، سید سلیمان ندوی کی تحریروں میں پائی جاتی ہیں، طنز سید صاحب کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں اور ان کی عام کتابوں میں ان کا استعمال بھی زیادہ نہیں ہے، لیکن معارف کے شذرات میں اور بعض جوابی تحریروں میں یہ رنگ ضرور ظاہر ہوا ہے۔ دو شذرات ملاحظہ ہوں :-

"ابتک جمہوریت کا نشانہ، کانفرنس، لیگ، یونیورسٹی وغیرہ قومی مجالس تھیں اور ہم خوش تھے کہ خیر دنیا کے دیگر طبقات کسی حال میں ہوں لیکن ہم مصنفین اور ارباب قلم کا رقبۂ حکومت تو اس خیرہ سری سے پاک ہے، لیکن ہم کو اپنے حسن ظن میں کس قدر ناکامی ہوئی جب ہم نے گذشتہ ہفتوں میں نواب وقار الملک مرحوم کی ترتیب سوانح کے لیے بعض اخبارات میں ایک مجلس شوریٰ کی تجویز پڑھی جس میں چند ملک کے مسلم تعلیمی و سیاسی اصحاب کے نام درج تھے، کہ باہم مشورہ سے وہ اس عظیم الشان قومی کارنامے کو انجام دیں" (معارف جولائی ۱۹۱۷ء)

دوسرا شذرہ :-

"علی گڑھ کی سب سے نمایاں جگہ یعنی صدر نشین کی نشست گاہ کے اوپر کسی خوش مذاق شاعر کا جلی حرفوں میں کپڑے پر لکھ کر یہ شعر آویزاں کیا گیا تھا۔

وفا شعاری و حب الوطنی و دیں پرستی کی علامت

کہ اپنے قومی نشاں میں آج اسے جگہ دی اور ہلال بھی ہے

یہ صحیح ہے کہ شعر جن کے موزوں پڑھنے میں شبہ ہو کامل شاعروں کو کافی زحمت اٹھانی

تھی، دراصل علی گڑھ کی اصلی اور اندرونی ذہنیت تھی، جو اس کے ذرہ ذرہ سے نمایاں تھی، منتظمین کالج کو داد دینی چاہیے کہ انھوں نے علی گڑھ کا دل نکال کر سب کے سامنے رکھ دیا تھا۔" (معارف جنوری ۱۹۲۷ء)

جوابی تحریروں میں اکثر لطیف طنز ہوتا ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:۔

پروفیسر مارگولیتھ نے واقدی کے حوالے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر چند ناگوار اعتراضات کیے ہیں، سید صاحب کے واقدی کی صحیح حیثیت متعین کرتے ہوئے جوابی مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ناظرین غور کریں، بات کہاں سے کہاں گئی۔ واقدی تو نیند کا ذکر کرتا ہے، ولہاؤزن اس ترجمہ غشی کرتے ہیں، مارگولیتھ ڈر سے غش کھا کر گر جانا (Fainted) اس سے مطلب نکالتے ہیں، کیا یورپین مستشرقانہ تحریف کی اس سے بہتر کوئی مثال ہو سکتی ہے؟" (آگے عربی عبارت دے کر اس پر روشنی ڈالتے ہیں، اس کے بعد لکھتے ہیں):

"کیا مستشرقانہ ژرف نگاہی کی اس سے اور زیادہ بہتر کوئی دلیل چاہیے؟ کیا علمائے یورپ کے ناقدانہ مطالعہ مشرقیات کی سب سے اچھی مثال نہیں؟ اور آکسفورڈ کے عربی پروفیسر کے تبحر وفضل اور بے تعصبی کی عمدہ نمائش نہیں؟"

شبلی اپنی تحریروں میں اکثر اشعار لاتے ہیں، سید صاحب کو یہ طرز پسند نہیں، اس لیے ان کے ہاں اشعار کی وہ کثرت نہیں جو شبلی یا آزاد کے ہاں پائی جاتی ہے، سید صاحب کی اکثر کتابیں اشعار سے خالی ہیں، سیرت کی کتابوں میں نعتیہ اشعار کا عام رواج رہا ہے، کیونکہ جذبات کی شدت کے موقع پر اکثر اشعار قلم اور زبان پر آجاتے ہیں، مگر سید صاحب نے ایسے موقعوں پر بھی

۱؎ محمد بن عمر واقدی معارف جنوری ۱۹۲۷ء ص ۲۲-۲۳

عموماً اشعار کا استعمال کرنے سے احتراز کیا ہے، چنانچہ سیرۃ النبی کی چاروں جلدوں میں تیسری جلد کے شروع میں صرف ایک شعر اور درمیان میں مولانا روم کے چند اشعار دعوی کے ثبوت کے طور پر لکھے ہیں چوتھی اور پانچویں جلدوں کے صرف دیباچوں میں چند اشعار ہیں، جلد پنجم میں درمیان میں ایک شعر (ص ۲۹۱) پر ہے، "عربوں کی جہازرانی"، "عرب و ہند کے تعلقات"، "خیام"، "سیرت عائشہؓ" اور "رحمتِ عالم" اشعار سے بالکل خالی ہیں، "خطبات مدراس" میں صرف تین شعر اور تین مصرعے ہیں، آخری تصنیف "حیات شبلی" میں بھی چند اشعار نظر آتے ہیں، اس کا سبب[1] شاید یہ ہو کہ وہ استاد کی سوانح عمری لکھتے وقت استاد کے محبوب رجحانات سے زیادہ متاثر ہو گئے تھے،

سید صاحب کی مندرجہ ذیل کتابوں میں شبلی کا اثر زیادہ ہے:-

(۱) سیرۃ النبی (۲) نقوش سلیمانی کے بعض خطبات (۳) حیات شبلی،

مندرجہ ذیل چیزوں میں ابوالکلام کا اسلوب غالب نظر آتا ہے:

(۱) معارف کے ابتدائی سالوں کے شذرات (۲) متفرق مقالات (۳) ارض القرآن (۴) حیات شبلی میں بھی معمولی سا اثر ہے،

مئی ۱۹۱۳ء سے لیکر اکتوبر ۱۹۱۳ء تک جب سید صاحب "الہلال" کے شعبۂ ادارت میں شامل تھے، ان کی تحریروں میں ابوالکلام کا اثر زیادہ نظر آتا ہے، جس کو انھوں نے بعد میں ترک کر دیا تھا، پھر بھی کچھ نہ کچھ اثر باقی رہا، مثلاً معارف کا یہ شذرہ دیکھئے:

"ذرا ٹھہریے اور ایک لمحہ غور کیجئے! یہ غلط کاری سر منزل نہیں بلکہ سر راہ واقع ہوئی ہے۔ مستغفر کہ جب ہم نے آنکھیں کھولیں تو ایک ایسے رہنما کو اپنے قافلہ کا رہبر پایا جو مذہب، تعلیم اور سیاست

---

[1] شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مولانا شبلی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے کے بعد سید صاحب اپنے خطوط میں کبھی کبھی اشعار کا استعمال کرنے لگے تھے، حیات شبلی پہلی مستقل تصنیف ہے [illegible] میں بہت اشعار آگئے ہیں۔

تینوں کی قافلہ سالاری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا منزل ترقی کے یہ تینوں راستے مختلف جہات تھے اس لیے ایسے قافلہ سالار کے لیے تصادم مصالح ناگزیر تھا" (شذرات معارف ۵ نمبر ۲) مضمون "محبت الٰہی اور اسلام" میں لکھتے ہیں :۔

"ربانی خمخانۂ عشق کا آخری ہوشمند سرشار، ریاض محبت کی بہار جاوداں کا آخری نغمہ خواں عندلیب، نظارۂ جمال حقیقت کا پہلا مشتاق، مستور ازل کے چہرۂ زیر نقاب کا پہلا بند کشا زندگی کی آخری گھڑیوں میں ہے، مرض کی شدت سے بدن بخار سے جل رہا ہے، اٹھ کر چل نہیں سکتا، لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے مسجد نبوی میں جاں نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضور کی طرف لگی ہیں، نبوت کے آخری پیغام کے سننے کی آرزو ہے[1] "

سید صاحب کی حسب ذیل کی کتابوں میں یہ دونوں اثر کم ہیں، اور خود ان کا نکھرا اور ستھرا اسلوب نمایاں نظر آتا ہے :

(۱) خیام (۲) خطبات مدراس (۳) سیرت عائشہؓ (۴) رحمت عالم (۵) نقوش سلیمانی (۶) یاد رفتگاں (۷) عرب و ہند کے تعلقات،

ان میں ہر ایک شق کی کتابوں کی مدد سے ہم شبلی اور ابو الکلام کے اثر کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے، سید صاحب نے شبلی کے طرز کو سیرۃ النبیؐ کی چاروں جلدوں، نقوش سلیمانی نیز حیات شبلی میں نباہنے کی پوری کوشش کی ہے شبلی کے ہاں بعض بعض جگہوں پر الفاظ کی تکرار ہوتی ہے جس سے عبارت میں ایک خاص قسم کی صوتی فضا قائم ہو جاتی ہے، دور دور، گھر گھر، رفتہ رفتہ، بڑے بڑے،

---

[1] خطیبانہ طرز کا یہ خاصہ ہے کہ بات تو معمولی کہنی ہے مگر اس کو پراثر بنانے کے لیے مختلف تشبیہیں اور استعارے کام میں لائے جاتے ہیں، اس سے جملے بھی لمبے ہو جاتے ہیں، سید صاحب ایک زمانہ میں ابو الکلام کے طرز خطیبانہ تحریر لکھتے تھے، ان تحریروں میں یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ سید صاحب کی تحریر ہے یا ابو الکلام کی (مضمون ... ... مولفہ ڈاکٹر سید محی الدین زور سے ماخوذ ہیں، ص ۶۹ - ۷۰)

ایک ایک، آہستہ آہستہ، تکرار کے علاوہ "یہ عجیب بات ہے" "تعجب ہے" کے فقرے بھی اکثر استعمال کرتے ہیں، سید صاحب سیرۃ النبیؐ کی جلد ششم کے دیباچے میں رقمطراز ہیں :۔

"یہ عجیب بات ہے کہ جو جتنے ضروری اور مفید ہونے کے ثبوت میں اخلاقی تعلیم کو نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہے عملی حیثیت سے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں"

اسی جلد کے خاتمے پر لکھتے ہیں :۔

"آپ نے کتاب کا ایک ایک صفحہ پڑھ لیا، اسلام کی اخلاقی تعلیموں اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کی آخری ہدایتوں کا ایک ایک حرف آپ کے سامنے آگیا"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"مستدرک حاکم اس وقت نا پید تھی، اب طبع ہو کر گھر گھر پھیل گئی ہے"[2]

شبلی کے رنگ کی چند اور امثال ملاحظہ کیجئے :۔

"اگر افراد جماعت اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح و آشتی اور امن و امان پیدا کر دے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر اس کے حقوق و فرائض کی تعیین کرے"

جہاد کے سلسلے میں رقمطراز ہیں :۔

"ترقی و سعادت کا یہ گر صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے، آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا، اسی جہاد کا جذبہ اور اسی حصول ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے کہ یہی مسلمانوں نے

[1] مثلاً شبلی اس طرح لکھیں گے۔ (۱) اسلام ایک ابر کرم تھا جو سطح خاک کے ایک ایک چپہ چپہ پر برسا، شہر مجھ کو (۲) ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک حصہ (الفاروق ص ۸۱) [2] دیباچہ سیرۃ النبیؐ ج ۳ ص ۹۔ ۱۰ طبع اول۔

تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھروں کی بھاری سلیں، طوق و زنجیر کی گرانباری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزوں کی انی، تلوار کی دھار، بال بچوں سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری اور گھر بار سے دوری، کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی، اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انھوں نے تلوار کی چھاؤں میں جس طرح گذارے وہ دنیا کو معلوم ہے۔" (سیرۃ النبی ج ۵ ص ۱۰۳ طبع اول)

سیرت کے علاوہ شبلی کے بعض رجحانات سید صاحب کی دوسری کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں، سید صاحب نے برامکہ کے متعلق پہلی دفعہ یہ تحقیق کی ہے کہ وہ مذہباً بدھ مت کے پیرو کار تھے، اسی تحقیق کے ضمن میں جملہ معترضہ اس طرح لکھ جاتے ہیں :۔

"تعجب ہے کہ پرانے مورخوں کو چھوڑ کر یورپ کے نئے باخبر مورخوں کی بھی ادھر نظر نہ پڑی، فان کریمر نے برامکہ کو مزدکی بتایا اور پروفیسر براؤن جیسے مستشرق سے بھی یہ حقیقت چھپی رہی۔"[1]

اسی طرح خیام میں مستشرقین یورپ کی تحقیق پر جا بجا طنز ہے، ایک جگہ ضمناً حاشیہ[2] میں حافظ محمود شیرانی پر بھی طنز کیا ہے، لیکن ان کے طنز میں وہ تندی اور تیزی کہاں جو شبلی کے طنز میں ہے۔

حیات شبلی کے دیباچہ کے خاتمہ کے الفاظ میں شبلی کے طرز کی پیروی ہے، شبلی کسی بات پر زور دینے کے لیے مبالغہ سے کام لیتے تھے، سید صاحب نے بھی ایسا کیا ہے، مثلاً وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف کے بعد لوگوں میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا ہوا، اس مفہوم کو اس طرح مبالغہ کے ساتھ ادا کرتے ہیں :۔

---

[1] عرب و ہند کے تعلقات ص ۱۱۲، سید صاحب کی طنز کی بہار و رنگینی ہو تو علامہ مشرقی کے تذکرہ کے خلاف معارف کے شذرات ملاحظہ ہوں، اسی طرح ۱۹۳۰ء میں ٹنڈن جی نے جب اردو کے خلاف زہر اگلا تو اس پر بھی شذرات میں بھرپور طنز کیا ہے [2] ملاحظہ ہو حاشیہ خیام ص ۲۲۲ و ۲۲۳

"صرف پچیس برس کے اندر سیرت پاک کے موضوع پر چھوٹی بڑی ہزاروں کتابوں سے دفتر مملو ہوگیا ہے۔"[1]

حیاتِ شبلی کا مقدمہ شبلی کے ذیل کے الفاظ سے شروع کیا ہے:۔

"اسلام ایک ابر کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن فیض بقدر استعداد پہنچا جس خاک میں جس قدر قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیض یاب ہوئی۔"

اسی صفحہ پر سید صاحب کی عبارت کا اسلوب یہ ہے:۔

"سلطان محمود نے ہندوستان کی سرزمین کو اسلام کے نعروں سے پُرشور کر دیا، اور غزنی سے لیکر پنجاب تک ایک تختِ اسلام کی حکومت قائم کر دی۔"[2]

اس میں واقعیت کے باوجود شبلی کا مبالغہ بھی ہے، اور یہ پہچاننا ذرا مشکل ہے کہ یہ دونوں جملے دو مختلف قلم کے ہیں یا ایک ہی موقلم کا کرشمہ ہیں،

مبالغہ کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

"اس سلسلہ میں یورپ کا ایک ایک اخبار طرح طرح کی دروغ بافی کرکے دنیا کی نگاہ میں ترکوں کو ملزم ٹھہرا رہا تھا۔"[3]

نقوشِ سلیمانی میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"ہمارے دامن کا ایک ایک موتی اور ہمارے علمی خزانہ کا ایک ایک گوہر ہم سے کھو چکا ہے۔"[4]

مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریک کے اثرات کا دور (جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے) اس زمانے میں زیادہ تھا جب سید صاحب الہلال میں کام کرتے تھے، اس زمانے کے مقالات میں انھوں نے آزاد کے طرزِ تحریر کو اس حد تک اپنایا کہ ان کی بعض تحریروں کو آزاد کی تحریریں سمجھ لیا گیا، اس کی مثال "مشہدِ اکبر" ہے، اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، اس میں ابوالکلام کا اسلوب کس قدر غالب ہے:۔

---

[1] دیباچہ ص ۲۵ [2] مقدمہ حیاتِ شبلی ص ۱ [3] حیاتِ شبلی ص ۵۰۰ [4] نقوشِ سلیمانی ص ۲ طبع دوم

"مقتولو! کیا پھر ہم تم پر نماز نہیں پڑھی گئی کہ تم مغفور تھے، ہم گنہگار تمہاری مغفرت کی دعا کیا کرتے .... مجروحین کا تمہیدا تم نے گولیاں کھائی ہیں، نیزوں سے تمہارے سینوں میں سوراخ کیا گیا! تمہاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں، تمہارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا ہو تمہیں یاد ہوگا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا جس کے بعد بنو امیہ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا۔" (بحوالہ "حالات ابوالکلام" محمد عظمت اللہ خاں ص ۸۵)

سید صاحب بعد میں اس اثر سے بچنے کی کوشش کرتے رہے، چنانچہ ایک جگہ خود لکھتے ہیں:۔

"یہ شبہ نہ ہو کہ "معارف" کا دامن ان داغوں سے پاک ہے یا ہم ان داغوں سے پاک ہیں یا ہم اپنے عیبوں سے واقف نہیں۔ الہلال کا جادو جو برسوں تک رہا اب اتر رہا ہے اور ہم خود اپنے آپ کو اپنے رفیقوں کو بھی ہوشیار کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں جی چاہا کہ اپنے ہم پیشہ دوسرے ہم قلم دوستوں کو بھی ٹوکا جائے۔" (معارف شذرات ص ۲۴۴ اکتوبر ۱۹۳۰ء)

لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ سید صاحب ابوالکلام کے اثر سے بڑی حد تک آزاد ہو گئے، مگر اس کی پرچھائیاں باقی رہ گئیں، چنانچہ ان کی کتاب "رحمتِ عالم" بھی جو چھوٹے لڑکوں اور معمولی لکھے پڑھے لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے، اور جس کی دوسری اشاعت میں زبان آسان اور ہلکی کر دی گئی ہے، اس اثر سے خالی نہیں ہے،

"خدا کے سوا ہر باطل کا خوف، آسمان و زمین کی ہر قوت کا ڈر، ہر باطل وسوسہ کا ہراس، دیو، بھوت، پریت، چاند، سورج، ستارے، دریا، جنگل، پہاڑ غرضیکہ ہر مخلوق، ہر طاقت اور ہر مادی اور روحانی مظہر کی خدائی ہیبت جو کمزور انسانوں پر چھائی ہوئی تھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حق کی آواز نے اس سارے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا...... اب ایک نئی قوم نئی امت نیا تمدن نیا قانون اور نئی حکومت کے پردہ میں قائم ہوئی۔" (رحمتِ عالم ص ۴۵)

آخری زمانے کی تحریروں میں بھی آزاد کا اثر کہیں کہیں نظر آتا ہے:

"پیش نظر ایک ایسی ہستی کے اوراق سوانح ہیں جس نے چھتیس برس (۱۸۸۲ء تا ۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پرشور رکھا

سالہا سال گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ است[1]

شبلی و آزاد کے ان وقتی اثرات سے قطع نظر سید صاحب کا اپنا بھی اسلوب ہے جس میں ان کی شخصیت پوری آب و تاب سے نمایاں ہوتی ہے، ان کے مزاج کا ٹھہراؤ، سنجیدگی اور وقار ان کے اسلوب کا آہنگ بناتے ہیں لیکن انھیں قاری کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرنے کا ڈھنگ بھی آتا ہے، وہ جب کوئی کتاب یا مقالہ شروع کرتے تو عموماً تمہید اس طرح اٹھاتے ہیں کہ قاری فوراً متوجہ ہو جائے، وہ ابوالکلام کی طرح جوشیلے خطیب نہیں ہیں لیکن ایسے موقعوں پر وہ خطابت کی ہلکی چاشنی سے عبارت کو حسین و دلکش بنا دیتے ہیں، مثلاً ارض القرآن کے جلد اول کے دیباچے کی ابتدائی عبارت:

"آج مسلمانوں کا وطن تمام دنیا ہے، تاہم مولد اسلام، موطن رسالت، مہبط قرآن دنیا کا ایک ہی گوشہ ہے، یعنی عرب، جس کو وادی زرخیزی کی محرومی نے گو بن کھیتی کی زمین و وادی غیر ذی زرع کا خطاب دیا ہے، لیکن جہاں روحانی کھیتی کا کوئی سرسبز قطعہ موجود ہے، آج کشت زار الٰہی کے آخری کسان کی تخم ریزی و آب سیری کا نتیجہ ہے"

---

[1] دیباچہ حیات شبلی میں ادبی کے علاوہ "ارض القرآن" جلد اول میں سید صاحب کی کوشش کے باوجود ابوالکلام کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکے جس کا ان کو خود بھی اعتراف ہے۔

سیرۃ النبیؐ جلد سوم کی ابتدا اس طرح کی ہے:

"سیرت نبویؐ کا یہ حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان حالات، مشاہدات اور کیفیات کے بیان میں ہے جن کا تعلق ماورائے عالم مادی و قوانین مادی سے ہے جس طرح ہماری یہ مادی دنیا ایک نظام پر چل رہی ہے، شب تار کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں تو آفتاب نکلتا ہے، گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں، درخت اپنے موسم پر پھلتے ہیں، ستارے اپنے معین اوقات میں ڈوبتے اور نکلتے ہیں، اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا خاص نظام رکھتا ہے اور اس کا بھی ایک آسمان و زمین ہے، وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے خزاں اور بہار ہے فصل و موسم ہے۔"

سیرۃ النبیؐ جلد ششم کی تمہید یہ ہے:۔

"عقائد اور عبادات کے بعد تعلیمات نبویؐ کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے .... دنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن و امان اسی اخلاق کی دولت سے ہے، اسی دولت کی کمی کو حکومت و جماعت اپنے طاقت و قوت کے قانون سے پورا کرتی ہے، اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو"

گو ان تحریروں میں شبلی کے قلم کی شوخی اور ابوالکلام کا جوش و خروش نہیں ہے لیکن وہ ایک "زاہد خشک" کی روکھی پھیکی عبارت بھی نہیں، اور اس میں ایک منجھے ہوئے صاحبِ فن کی صناعی نظر آتی ہے، سید صاحب کا پُروقار اور متین لب و لہجہ اس عبارت کی جان ہے جس سے پڑھنے والا مصنف کے وقار سے متاثر ہو کر اسکے عالمانہ مطالب کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے،

سید صاحب جس طرح اپنی تصنیف کا آغاز محنت اور سلیقے سے کرتے ہیں اسی طرح اس کے انجام کو بھی پوری طرح سنوارتے اور بناتے ہیں جس سے قاری ایک خاص قسم کا لطف اور چاشنی محسوس کرتا ہے،

ایسے موقعوں پر سید صاحب کے قلم میں عجیب طرح کا جوش اور لطف زبان پایا جاتا ہے۔

سیرۃ النبیؐ جلد چہارم کا خاتمہ ان الفاظ میں کیا ہے :۔

"کاغذ کے سات سَو صفحات سیاہ ہو چکے، ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گرانباری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لیے بہتر ہے کہ رہرو قلم کے ساتھ قافلۂ نظر کے دوسرے رفقا بھی کچھ دیر آرام کریں، ہر چند کہ

رہروان را خستگی راہ نیست

عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است[1]

عرب و ہند کے تعلقات کے خاتمہ کی عبارت یہ ہے :۔

"ان گذشتہ اوراق میں کوشش کی گئی ہے کہ ہم اپنے ہم سفروں کو عرب و ہند اور اسلام و ہندوستان کے باہمی تعلقات کے وہ مناظر دکھائیں جو خیبر سے آنے والے مسلمان فاتحین سے پہلے بھی وہاں جلوہ گر تھے، ان سے اندازہ ہوگا کہ فتوحات سے پہلے بھی اس ملک میں کہاں کہاں مسلمان آباد تھے، اور ان کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ کیسے چند در چند اور گہرے تھے اور اسلام کا تعلق ہندوستان سے کتنا پرانا اور قدیم ہے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس[2]

حیات شبلی کا اختتام ان الفاظ پر کیا ہے :۔

" ناظرین! آپ نے نو سَو صفحوں تک میری رفاقت کی، اس اثنا میں آپ کے رفیق سفر اور رفیق نظر نے ایک مجسمۂ علم و فن اور پیکر خدمت دین و ملت کی زندگی کا مرقع جیسا کہ اس نے دیکھا یا دیکھنے والوں نے بتایا

---

[1] شبلی کو بہت سی کتابیں اشعار سے شروع ہوئی ہیں اور بعض اوقات اشعار ہی پر ختم ہوئی ہیں، مثلاً الغزالی، علم الکلام، شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کا خاتمہ اشعار ہی پر ہوا ہے، شعر العجم جلد چہارم کا آغاز و انجام اشعار سے ہوا ہے، سیرت حبیب کی یہ پہلی کتاب ہے جس کا آغاز اور انجام شعر ...

کھینچ کر آپ کے سامنے پیش کیا ہے، اس مرقع میں کہیں کہیں بشری کمزوریوں کی جھائیاں بھی ہونگی لیکن مجموعی طور سے حسن و جمال کا ایک غیر معمولی منظر بھی تصور کی آنکھوں کے سامنے ہوگا، آئیے ہم اور آپ اس کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھائیں اور زبان سے کہیں اللھم اغفر لہ وارحمہ

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را ۔"

سید صاحب مزاج انسانی کے بھی بڑے واقف کار ہیں، اس لیے جس طبقہ کو مخاطب بنانا ہوتا ہے، اس کے ذوق کے مطابق زبان و بیان اختیار کرتے ہیں، چنانچہ جب اردو سید صاحب کی اصطلاح میں ہندوستانی زبان کے متعلق کچھ کہنا ہوتا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ان کی بات زیادہ عام فہم اور موثر ہو تو عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں اور ان کا اسلوب عربی و فارسی کے مشکل اور عالمانہ الفاظ و تراکیب سے خالی اور ہندی اور بھاشا کے نامانوس اور ثقیل الفاظ سے پاک ہوتا ہے، ہندی اور ہندوستانی کے سلسلے میں ایک جگہ پر لکھتے ہیں:۔

"ہندو یونیورسٹی کے ایک ریسرچ اسکالر اپنے مضمون کی ضرورت سے میرے پاس اکثر آتے رہے، لیکن اگر انگریزی کا سہارا نہ ہوتا تو نہ میں ان کی سمجھ سکتا تھا اور نہ وہ میری، کیا مجھکو اور ان کو کوئی ایک دیس کا رہنے والا سمجھ سکتا ہے؟ ہندی جس طرح سنسکرت سے کٹ چھنٹ کر بنی ہے، اسی طرح ہندی سے کٹ چھنٹ کر ہندوستانی بنی ہے، اب ہمارے ہندو دوستوں کی یہ کوشش کہ پھر ہندی لفظ کو اسی روپ میں بولیں جس میں وہ ٹھیٹ ہندی میں بولا گیا ہے، ایک طرح کا نرا ظلم ہے۔" (نقوش سلیمانی ص ۹۰ طبع دوم)

فصاحت کا یہ وصف سید صاحب کی تحریر کا خاصہ ہے، وہ قاری کی ذہنی سطح کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے، عالمانہ مباحث میں ان کے مخاطب اہل علم ہوتے ہیں، اس لیے ان میں ان کا لب و لہجہ بھی بدل جاتا ہے تحقیقی اور علمی مباحث میں شبلی کا تخیل بلند پرواز ہو جاتا ہے، ابوالکلام آزاد خطابت کا سہارا لیتے ہیں، محمد حسین آزاد "لفظوں کے طوطے مینا" اڑانے لگتے ہیں لیکن سید صاحب ایسے موقع پر بھی سنجیدگی اور توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اس لیے ان کا اسلوب تحقیقی اور علمی مباحث کے لیے دوسرے

صاحب طرز ادیبوں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہے،

ان کی تین کتابیں خیام، عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی اس کی شاہد ہیں، خصوصاً خیام جو انکی تحقیقی کتابوں میں سب سے اہم درجہ رکھتی ہے، اس خوبی میں سب سے بڑھ گئی ہے، مثلاً۔

"خیام کچھ بھی تھا اور کچھ بھی ہو، مگر آج اس کی شہرت صرف اس کی فارسی رباعیات کی بدولت قائم ہے، خصوصاً آج لوگوں کو جو اس سے دلچسپی ہے، وہ صرف اس لیے ہے کہ یورپ فرنزجیرلڈ کے انگریزی ترجمہ کے بدولت اس سے دلچسپی لے رہا ہے، ورنہ تنہا ایک رباعی گو شاعر کی حیثیت سے مشرق میں اس نے کوئی بڑا درجہ نہیں پایا ہے" (خیام ص ۲۱۹)

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

"۴۲۹ھ میں نیشاپور کے مطلع سے سلجوقی دور کا آفتاب طلوع ہوتا ہے، سلجوقیوں کا زمانہ اس صنف سخن کے اوج شباب کا زمانہ ہے، اس عہد میں رباعی گوئی سلاطین، وزراء، امراء، علماء، حکماء اور عام شعراء کا دلچسپ مشغلہ ہو جاتا ہے، اسی میں سوال و جواب ہوتے ہیں، حسن و عشق کی رُوداد بیان کیجاتی ہے، مناظر قدرت کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں، اور بادۂ ساغر کی نئی نئی تشبیہوں کے مرقعے تیار کیے جاتے ہیں، اس عہد میں ہر قسم کی عشقیہ، خمریہ، حکیمانہ اور صوفیانہ رباعیاں کے دفتر ملتے ہیں، یہی زمانہ خیام کی رباعیوں کا ہے" (خیام ص ۲۴۳)

لکھنؤ کے پرانے ادبی ماحول یعنی رعایت لفظی کا اثر بھی کہیں کہیں سید صاحب کی تحریروں میں نظر آتا ہے لیکن اس میں اعتدال کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، اسکی مثال ملاحظہ ہو :

"اگلے زمانے میں مصر وغیرہ اور ہمارے ملک میں بھی جہانگیر نے ڈاک کے کبوتر ادیے تھے، اس نسبت سے ایک نازک عبارت کبوتر ہی سے لیجئے پرندے کی نسبت سن لیجئے" (نقوش سلیمانی ص ۳۰۳ طبع دوم)

ایک جگہ سلسلۂ کلام میں اصغر گونڈوی کا ذکر آجاتا ہے تو لکھتے ہیں :۔

"اور وہیں سے اٹھ کر نشاط رخ مطبوع ہو کر نشاط دو عالم کا باعث ہوا۔" (نقوش سلیمانی ص ۸۸، طبع دوم)

لفظ نستعلیق کے سلسلے میں تحقیق کرتے ہوئے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس سے ہماری زبان میں یہ وسعت پیدا ہوئی کہ نستعلیق لباس، نستعلیق چال اور نستعلیق بول چال کہنے لگے۔" (ایضاً ص ۹۲)

پانی کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"پانی ہندی لفظ ہے ۔ اب لفظی چھوت کے ڈر سے آپ پانی چھوڑ کر "جل" پینے لگیں تو کتنی بیگانگی ہے۔" (ایضاً)

سید صاحب خطابت کا بے موقع استعمال نہیں کرتے، اس میں بھی وہ افراط و تفریط سے بچتے ہیں، اعتدال ان کے مزاج کا بنیادی وصف ہے جسے وہ کسی قیمت پر بھی قربان نہیں کرتے، مجالس کی صدارت بھی انھیں کرنا پڑی، ان میں خطبے بھی پڑھے لیکن کہیں ان کا قدم جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹا، یہ خطبات نقوش سلیمانی میں شامل ہیں، انکی زبان مقدمات و مقالات سے قدرے مختلف ہے، یہی حال خطبات مدراس کا بھی ہے یہ خطبات مقالے کے طور پر پڑھنے کے لیے لکھے گئے تھے، اس لیے ان میں عبارت آرائی کا تھوڑا سا لحاظ ہے اور اس میں الفاظ کی شوکت، فقروں کی برجستگی، ترکیبوں کی چستی اور بیان کی دلکشی کا اہتمام نظر آتا ہے، مثلاً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونا ۱۹۳۱ء کے شعبہ ترقی اردو کے خطبۂ صدارت میں لکھتے ہیں:۔

"حضرات! آج مجھے ہندوستان کی ایک عظیم الشان تعلیمی مجلس کے، ایک علمی شعبہ کی صدارت کی عزت ملی ہے، یہ بظاہر میرے لیے مسرت کا دیباچہ تھا، لیکن آہ! اس دیباچہ میں بدبختی اور شومیٔ نصیب کے کتنے ابواب اور فصول ہیں، اب سے صرف ڈیڑھ سال پہلے اس اعزاز کے لیے اکابر کے نام پیش کیے جا سکتے تھے، حضرت الاستاذ علامہ شبلی، شمس العلما، مولانا حالی، خواجہ غلام الثقلین، ہماری زبان کے وہ ارباب قلم اور ہندوستان کے وہ سحر نگار ادیب تھے، جن کا وجود ہمیشہ قوموں اور ملکوں کی عزت کا تاج ہوتا ہے، لیکن بدنصیبی کی انتہا ہو کہ ہمارے دامن کا ایک ایک موتی اور ہمارے علمی خزانہ کا ایک ایک گوہر ہم سے کھو چکا ہے، اور اسلامی ہند کے خلوت کدہ میں فضل و کمال کا کوئی چراغ نظر نہیں آتا ع

افسوس کہ [illegible]

اسی طرح "ہندوستان میں ہندوستانی"، "ہندوستانی اکاڈمی" اور مسلم یونیورسٹی کے بعض صدارتی خطبات کا آغاز و خاتمہ بھی بڑا موثر ہے:۔

خطباتِ مدراس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"واقعات کی انتہا نہیں ہے، مثالوں کی کمی نہیں ہے، مگر وقت محدود ہے، اور آج شاید میں نے سب سے زیادہ آپ کا وقت لیا ہے، میرے دوستو! میرے معروضات کی روشنی میں آدم سے لیکر مسیح تک اور شام سے لیکر ہندوستان تک، ہر ایک تاریخی انسان کی مصلحانہ زندگی پر نظر ڈالو، کیا ایسی عملی ہدایتوں اور کامل مثالوں کا کوئی نمونہ کہیں نظر آتا ہے؟"

حاضرین! چند لفظ اور!

بعض شیریں بیان واعظ شاعرانہ پیرایہ میں اپنے "خداوند" کی ربانی محبت اور الٰہی عشق کا تذکرہ کرتے ہیں، مگر انہیں کے مقولہ کے مطابق کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔" اس پاک عشق و محبت کا کیا اثر ان کی زندگی میں نمایاں تھا؟" (خطبات مدراس ص ۱۴۹)

کراچی کے خطبۂ صدارت میں لکھتے ہیں:۔

"ہم صفیرو! آپ کی زندگی کے ایک نئے موڑ اور سفر کے ایک نئے راستے کے لیے تیاری کر رہے ہیں، اس لیے ہمارا دامن ان داغوں سے پاک ہو جن سے گذشتہ مورخوں کے دامن داغدار ہیں، حرص و طمع کی ناجائز امید اور ڈر اور خوف کے ناجائز دباؤ سے بے پرواہ ہو کر دنیا کے واقعات کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دینا چاہیے جس کے لیے مورخ پیدا کیا جاتا ہے، اب نہ اکبر اور شاہجہاں کے زر و سیم کی امید ہے اور نہ تغلق اور اورنگ زیب کی تلوار کا خوف ہے، اب تو جو کچھ ہے وہ حق کی خاطر اس کی تبعیت ہے"

(The Proceedings of This Tory Conference, held ... at Karachi. P35)

لیکن یہ خطابت بلند آہنگ اور زور ب ولہجہ کی خطابت ہے، اس میں سکون اور شگفتگی نہیں ہے

عام طور سے عام خطابت کا جزو سمجھی جاتی ہے، اس میں تخیل کی بے راہ روی بھی نہیں ہے جس کے بہ خطیب بد نام ہوتے ہیں۔ سید صاحب نے خطابت کو ایک شائستہ اور خوشگوار لب و لہجہ عطا کیا، اس میں پرشور سیلاب کی جگہ ایک سبک رفتار ندی کی کیفیت ہے جس کا رشتہ ان کی دوسری کتابوں اور تحریروں سے ملا ہوا ہے، اگر کلمات خطاب کو حذف کر دیا جائے تو ان تقریروں اور سید صاحب کی دوسری تحریروں میں کوئی نمایاں فرق باقی نہیں رہتا۔

خطیبانہ لب و لہجہ سے سید صاحب نے ایک جگہ بھی کام لیا ہے، شعراء اور ادباء کے کارناموں کے جائزے میں یہی خطابت، انشا پردازی کے روپ میں نظر آتی ہے، ان دونوں میں ایک مماثلت ہے، خطیب زبان کی مدد سے سامعین کے دلوں کو متاثر کرتا ہے، انشا پرداز یہ کام تحریر سے لیتا ہے۔

سید صاحب شعراء اور نثر نگاروں کا جائزہ لیتے وقت، انشا پردازی سے کام لیتے ہیں، اس وقت ان کی تحریر علمی مقالہ نہیں رہتی، ایک ادب پارہ بن جاتی ہے۔

جگر کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"جگر کی شاعری میں نہ زلف و شانہ ہے، نہ سرمہ و آئینہ، نہ ہوس بالائے بام، نہ شکایت منظر عام، نہ اس کے کاشانۂ خیال میں چشم ہائے بسمل کی آئینہ بندی، نہ اس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری اور جلاد کی تلوار ہے، نہ اس کے کوچہ میں شہیدوں کے دل و جگر کی گلکاری ہے، وہ مست ہے اور اسی مستی میں کسی نادیدہ کا سراپا مشتاق نظر" (نقوش سلیمانی ص ۴۳۱)

مہدی افادی کے مکاتیب کی خصوصیات بتاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں،

"مہدی افادی مرحوم کے خطوں کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان میں مصوری کا کمال نہیں، تصویر فطرت کا جمال ہے، ان کا حسین خیال اپنے پیکر ظہور کے لیے اپنی پسند کا لباس پہنکر جلوہ افروز ہے، وہ آسمان ادب کے ستاروں کی طرح دوسروں کی پسند کا لباس پہنکر جلوہ فروش نہیں۔" (نقوش سلیمانی ص ۵۰۰)

اکبر کا ظریفانہ کلام، گلستان امجد، مقدمہ مکاتیب شبلی وغیرہ تنقیدی مقالات اس خصوصیت کے حامل ہیں۔

سید صاحب کی پُرتاثیر انشا اور کمال تحریر کا نمونہ ان کی وہ تحریریں بھی ہیں جو انھوں نے اعزہ و احباب اور علما و اصحاب کمال کی وفات پر لکھی ہیں، وہ جب کسی رفیق کا نوحہ لکھتے ہیں تو اس میں اپنے دلی جذبات کو اس طرح سمو دیتے ہیں کہ دل کا ایک ایک تار اس کے ساتھ بندھ جاتا ہے، ان تحریروں کے متعلق وہ خود لکھتے ہیں:

"اسلامی تاریخ کا ایک اہم کارنامہ وفیات یعنی ہزاروں لاکھوں بزرگوں، فاضلوں، ادیبوں اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ کا تعین ہے، تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدون ہوئی ہیں، کیا عجب ہے کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بن جائیں" (یاد رفتگاں ص ...)

مولانا عبد الماجد صاحب دریا بادی کو ان کی ایسی تحریروں کی تاثر آفرینی، ادبیت اور اہمیت کا بڑا احساس ہے، چنانچہ انھوں نے ایک موقع پر تحریر فرمایا تھا کہ

سید صاحب کا وہ معاصر خوش قسمت ہے جو ان کے سامنے وفات پائے اور اس کی ماتم گساری کی دولت اس کے حصہ میں آئے" (معارف سلیمان نمبر ص ۴۹)

یہ نقوش غم ادب و انشا کا بہترین نمونہ ہیں، ان کے قلم نے علامہ شبلی نعمانی، اپنی رفیقۂ زندگی، اکبر الٰہ آبادی، مولانا عبد الرحمٰن نگرامی ندوی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا محمد علی جوہر، علامہ اقبال، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی، اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ بہت سے اعزہ و اکابر کی یاد میں آنسو بہائے ہیں[1]، اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

مولانا محمد علی کی وفات پر لکھتے ہیں:-

"تو ملت کا عزادار تھا، حق یہ ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو، تو امت محمدیہ کا سوگوار تھا، فرض ہے کہ پوری امت محمدی تیرا سوگ کرے، تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا، سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے، ہندوستان کا ماتم کناں، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لیے غمزدہ، بلقان کے لیے اشکبار، شام کے

[1] ان نقوش غم میں وہ ۵۰ شخصیتوں کی وفات پر تاثرات ہیں جو یاد رفتگاں کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گئے ہیں۔

گریاں، آنکھ وہ مرثیہ خواں، حجاز کا سوختہ دل اور بیت المقدس کے لیے وقف الم۔ اے ہندستان کے لعل اور [illegible]
تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا، مناسب یہی تھا کہ تیرے لیے اولین قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ جائے
اور تو اس میں سما جائے۔" (یاد رفتگاں ص ۱۵۵)

اپنے مرشد مولانا اشرف علی تھانوی کی وفات پر ان الفاظ میں ماتم کرتے ہیں:۔

"جس کی ذات میں حضرات چشت اور حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد بریلوی کی نسبتیں یکجا تھیں، جس کا سینہ چشتی ذوق و عشق، مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا، جس کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان تھی، جس کے قلم نے فقہ و تصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا، اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا، اور جس نے اپنی تحریر و تقریر سے حقائق ایمانی و دقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموز حکمت ربانی کو برملا فاش کیا تھا، اور اسی لیے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا........" (یاد رفتگاں ص ۲۰۴)

ان تحریروں میں خاص بات یہ ہے کہ سید صاحب عام روش کے مطابق آخر میں بعض دعائیہ کلمات پر اپنے تاثرات کو ختم نہیں کرتے بلکہ اکثر ایسے فقرے لکھ جاتے ہیں جس سے حزن و یاس کا ایک گہرا تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر طاری ہو جاتا ہے، اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں،

اکبر الٰہ آبادی کا ماتم ان الفاظ پر ختم کیا ہے:۔

"بوڑھے اکبر! مبارک ہو کہ تیرے دل کی مراد پوری ہوئی اور تجھے حسرت جاوید نصیب ہوئی۔" (یاد رفتگاں ص ۴۴)

علامہ اقبال کا ماتم ان فقروں پر ختم ہوتا ہے:۔

"اقبال، ہندستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال، فضل و کمال کا پیکر اقبال، حکمت و معرفت کا دانا اقبال، کاروان ملت کا رہنما اقبال، رخصت، رخصت، الوداع، الوداع، سلام اللہ علیک [illegible]" (یاد رفتگاں ص [illegible])

علامہ شبلی نعمانی کے وطن ہونے کے بعد کا یہ جملہ کس قدر موثر ہے:۔

"اے استاد بزرگوار! جا جا! اور سایۂ رحمت میں آرام کر، دنیا تجھکو بہت ڈھونڈھے گی لیکن نہ پائے گی۔" (حیاتِ شبلی ص ۷۰۲)

حسرت موہانی کے غم فرقت کا افسانہ ان الفاظ میں قلم بند کرتے ہیں:۔

"حسرت رخصت! تو تنہا آیا تھا، تنہا رہا، تنہا گیا، البتہ تیری نیکی، شرافت، تیرا اخلاص، اور تیرے حسن عقیدت کے اعمال تیرے ساتھ ہیں اور وہی تیرے رفیقِ آخرت بھی، بار الٰہا! اس کی حق گوئی بےکسی کی شرم رکھ لیجئے اور اس کو اپنی رفاقت سے نوازیے۔ وانت الرفیق الاعلیٰ" (یادِ رفتگاں ص ۲۹۴)

یہ نثر پارے نثر کے بجاے شعر منثور کہلانے کے مستحق ہیں، سید صاحب کی نثر نگاری اس میں اپنے انتہائی کمال کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔

ان کے اسلوب کے عام خط و خال یہی ہیں، یہ اوصاف تقلید سے نہیں خون جگر سے حاصل ہوتے ہیں، انھوں نے اپنی تحریر پر بڑی محنت کی اور اسے اپنی شخصیت کا آئینہ بنانے میں پورے انہماک سے کام لیا، اس لیے جو شخص اس طرز کو اپنانے کی کوشش کرے گا وہ محض خارجی اوصاف ہی کی تقلید کرے گا، ان کے مزاج کی ہمواری، نرمی اور اعتدال اس کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے۔

سید صاحب کے تلامذہ اور ارادت مندوں نے ان کی طرز تحریر کو اپنایا ہے، چنانچہ مولانا شاہ معین الدین ندوی مدیر معارف کے شذرات اور سید صاحب کے شذرات میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے[1] اسی طرح سید نجیب اشرف ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن وغیرہم نے سید صاحب کے اسلوب کی تقلید کی ہے مگر یہ اثر محض اسلوب کی خارجی وضع تک ہے، اصل روح تو گرفت میں آنے والی چیز نہیں

---

[1] سید صاحب نے تو محسوس کر لیا تھا کہ شاہ معین الدین ندوی ان کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش میں کامیاب ہو رہے ہیں، چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں "معارف میں آپ کے شذرات پڑھے، مجھ پر شذرہ نویسی کا دھوکہ ہوا..." [illegible]

دوسرے ادبانے بھی سید صاحب کے اسلوب کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

آل احمد سرور صاحب نے حیات شبلی کے دیباچے کی تعریف کے بعد لکھا ہے :۔

"حیات شبلی کا یہ حصہ بہت اہم ہے اور لکھنے والے کی عقیدت کے علاوہ اسکے اپنے اسلوب پر بھی روشنی ڈالتا ہے"۔ [1]

مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی تحریر فرماتے ہیں،

" سیرۃ النبیؐ میں معجزات کی بحث پڑھیئے یا "ارض القرآن" میں جغرافیائی و تاریخی تحقیقات ہر جگہ آپکا ادبی حاسہ اپنی غذا پائے گا اور آپ سے پڑھنے کی سفارش کرے گا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب کی تحریر میں مولانا شبلی کی برجستگی و بے ساختگی اور فارسی ترکیب کی چستی نہیں مگر شیرینی و سلاست اور ادبی محاسن پورے پورے موجود ہیں اور انکی علمی تصانیف تک کے بعض ٹکڑے شہ پارے معلوم ہوتے ہیں خطبات مدراس کے بعض پیراگراف، سیرۃ النبیؐ کے بعض صفحات اور معارف کے بہت سے شذرات و تحریریں ہیں جن پر سارے ادب عالی کو ملکیت کا دعویٰ ہے، نقوش سلیمانی کے بعض نقش ادبی حیثیت سے تو یادگار رکھے جانے کے قابل ہیں"۔ [2]

مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی سید صاحب کی نثر نگاری کے بارے میں رقم طراز ہیں :

" سید صاحب کی نثر پر اگر قلم اٹھایئے تو دیدہ و دل حیران کہ شروع کہاں سے کیجئے اور خط تمت کہاں پہنچکر کھینچئے، سیرۃ النبیؐ کی ضخیم مجلدات سے لیکر خیام، خطبات مدراس اور رحمت عالم تک بڑی اور چھوٹی کتابوں تک کونسی ایسی ہے، جہاں سلیمانؒ ایک خشک ملا نے معلوم ہوتے ہیں، اور صحت زبان و سلاست بیان نمایاں نہ ہو؟ شستگی، متانت، شرافت، یہ تو ان کے اسلوب کے جوہر اصلی ہیں، اور اس پر شوخی و ظرافت کی گلکاریاں اور حسن صناعت کی سحر طرازیاں، جیسے خاتم سلیمانی میں نگیں"۔ [3]

ڈاکٹر سید اعجاز حسین صاحب لکھتے ہیں :۔

" آپ نثر لکھنے میں ایک خاص طرز کے مالک ہیں، ان کی عبارت میں ادبیت و پختگی کے علاوہ علمیت

---

[1] تنقیدی اشارے" ص ۲۱۲ [2] روزنامہ "قومی آواز" لکھنؤ [3] معارف سلیمان نمبر ص ۳۳۲

کا بھی ذخیرہ رہتا ہے، لیکن علمیت ایسی نہیں جو کانوں کو گراں محسوس ہو، بلکہ عربی اور فارسی کے ایسے
الفاظ ہوتے ہیں جن کا استعمال کرنا اب ہمارے لیے ناگزیر ہو گیا جن کے بارے میں ہم اپنے خیالات کا
اظہار آسانی سے نہیں کر سکتے۔ سید سلیمان ندوی لفظوں کی رنگینی سے لوگوں کو اپنا گرویدہ نہیں
بناتے، ان کے نزدیک رنگینی کا نام ادبیت نہیں بلکہ اپنے خیالات اور الفاظ کو اس طرح ترتیب
دیتے ہیں کہ پڑھنے والا ان عالمانہ حقیقتوں میں ادبیت کے مزے لیتا ہے[1]۔"

نسیم قریشی صاحب رقمطراز ہیں :۔

"سید سلیمان کی انشا میں ایک بیدار فکر، محتاط عالمانہ ذہن اور نہایت ستھری اور لطیف طبیعت
کا جوہر بکھرا ہوا ملتا ہے، وہ بہت متانت اور سنجیدگی سے قلم اٹھاتے ہیں، اور از اول تا آخر ادبی
بلاغت کا معیار قائم رکھتے ہیں[2]۔"

سید ابوالخیر کشفی اور ظہیر الدین احمد صاحبان تحریر فرماتے ہیں :۔

"سید سلیمان ندوی کا انداز تحریر صاف اور سلیس ہے یہ سادگی بے رنگ نہیں بلکہ اس میں رعنائی
اور لطافت بھی ہے، مگر اس قدر جو مذہبیات اور تاریخ کے موضوعات کے مطابق ہے، ان کا خلوص
الفاظ میں کیمیاوی تغیرات پیدا کر دیتا ہے، اور اسی لیے ان کے یہاں بے حد تاثر ہے[3]۔"

مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی نے خطبات مدراس[4] پر تبصرہ کرتے ہوئے سید صاحب کے اسلوب
کو اس طرح سراہا ہے :۔

"ان اٹھائیس برسوں میں وقت کے تقاضے کہیں سے کہیں پہنچ گئے، زمانے کی گردش کا رنگ کچھ اور ہی ہو گیا ہے۔

---

[1] مختصر تاریخ ادب اردو ص ۲۲۴ و ۲۲۳ [2] اردو ادب کی تاریخ ص ۲۲۱ [3] اردو نثری ادب ص ۱۵۱

[4] صدی افادی نے ارض القرآن کے متعلق جو تاثر دیا اس میں یہ بھی لکھا "عربیت سے زیادہ آپ کی ادبیت مرعوب بنا لیتی ہے، زبان نفس موضوع کے لحاظ سے قطعاً لائق شکایت نہیں۔" پورا اقتباس پہلے نقل کیا جا چکا ہے (شخصیات نمبر جلد اول ص ۱۱)

طریق فکر اور اسلوب زبان کے سانچے کیسر بدل چکے ہیں، یہانتک کہ دلائل دینیات کا جو قالب اب سے تیس چالیس سال پہلے دلپذیر اور موثر سمجھا جاتا تھا، آج بے جان اور افسردہ ہو کر رہ گیا ہے اور عینیاً وحی و نبوت اور الٰہیات کے مسائل کو ایک دوسرے ہی ڈھنگ پر سوچنے کی عادی ہو گئی ہے، لیکن تیس سال پہلے کے لکھے ہوئے ان مقالوں کے اسلوب اور طرز استدلال پر گہری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی دل نشینی و دلپذیری اور شادابی و شگفتگی آج بھی اسی طرح باقی ہے، اور جہانتک سیرت نبوی کی خصوصیات اور اسلام کی بنیادی تعلیمات کو یورپ کے ذہن و دماغ سے قریب کرنے اور اسی لب و لہجہ میں سمجھانے کا تعلق ہے لاریب کوئی دوسرا انداز بیان اس سے زیادہ اثر انگیز نہیں ہو سکتا۔"[1]

پروفیسر ادیب نے "نقوش سلیمانی" کی روشنی میں سید صاحب کے اسلوب بیان کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، آخر میں لکھتے ہیں :۔

"علامہ سید سلیمان ندوی صاحب کی زبان اور اسلوب بیان میں بحیثیت مجموعی ان کے استاد مولانا شبلی مرحوم کی سلاست و روانی اور تلاش و تجسس، وسعت فکر و نظر اور استقصاء، مولوی محمد حسین آزاد کی شوخی و زندہ دلی اور وحید الدین سلیم کی متانت، سادگی اور ادبی کاوش جلوہ گر ہے۔"[2]

غرض سید صاحب اردو کے ایک صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز ہیں، ان کی علمی حیثیتوں کو اگر وقتی طور پر فراموش بھی کر دیا جائے جب بھی ان کا نام اپنی "دلکش اور معتدل" نثر کی وجہ سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

---

[1] "برہان" مارچ ۱۹۴۳ء ص ۱۸۰ [2] "علامہ سید سلیمان ندوی کے اسلوب بیان پر ایک نظر" معارف اپریل ۱۹۵۹ء ص ۲۴۹

یورپ میں اسلام کی اشاعت

مترجمہ جناب مولوی ابوالبقا صاحب ندوی

مسلمانوں نے یورپ کے دو خطوں پر حکومت کی اور اسلامی تمدن ابتداءً انھی دونوں راستوں سے یورپ میں داخل ہوا، یہ دونوں ملک اسپین (اندلس) اور سسلی (صقلیہ) ہیں، اندلس کے راستے سے عرب فرانس کے جنوب تک پہنچ گئے تھے۔ اور اگر ۷۳۲ء مطابق ۱۱۴ھ میں چارلس مارٹل نے مسلمانوں کو روکا نہ ہوتا تو عرب فرانس کے قلب میں پہنچ گئے ہوتے صقلیہ کے راستے سے مسلمانوں نے اٹلی کے جنوبی حصوں تک اپنی حکومت قائم کی۔ اور اگر مجاہدین اسلام ملکی انتظامات میں مشغول نہ ہو گئے ہوتے تو اٹلی کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے روم کے پایۂ تخت تک قبضہ کر چکے ہوتے،

پندرہویں صدی عیسوی میں ترک بھی یورپ میں داخل ہوئے لیکن وہ جلد ہی اپنے ملک واپس آ گئے، یہ حقیقت ہے کہ مسلمان یورپ میں جہاں کہیں بھی گئے اس خطہ کو اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پرشور رکھا، اور اپنے علوم و فنون اور اپنی تہذیب و ثقافت کے ایسے نقش چھوڑے جس سے متاثر ہو کر یورپ کی قومیں اسلام کی حلقہ بگوش ہو گئیں، انھوں نے اسلامی علوم و فنون اور اسلامی صنعت و حرفت کے حصول میں خاص توجہ صرف کی اور اس کے لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں ایسے شعبے قائم کیے گئے جن میں اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و تمدن کا خاص طور پر درس دیا جاتا تھا، اور کثرت سے اسلامی علوم و فنون کی کتابیں

یورپ کی زبانوں میں منتقل ہوئیں،

یورپ کے تمام جزیروں میں جزیرۂ صقلیہ عرب سے قریب تر تھا، صقلیہ فنیقی، قرطاجنہ اور رومی تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہونے کی بنا پر زیادہ مشہور تھا، اس کی ترقی کا سبب یہ بھی تھا کہ بحر روم زمانۂ قدیم سے یورپ، ایشیا اور افریقہ کی مختلف قوموں کا رابطۂ اتصال رہا ہے، اس لیے بحر ابیض اور بحر روم کے ذریعہ قرطاجنہ اور شمالی افریقہ کے باشندے آکر صقلیہ میں آباد ہو گئے، جس سے وہ مشرقی، یونانی، فنیقی اور رومی تہذیبوں کا گہوارہ بن گیا،

صقلیہ چونکہ افریقہ کی شمالی سرحد سے متصل تھا اس لیے افریقہ کی فتح کے بعد ضروری تھا کہ اسلامی مقبوضات اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے صقلیہ کو اسلامی مقبوضات میں شامل کیا جائے، اس لیے قدرۃً مسلمانوں کو اس کے فتح کرنے کی فکر ہوئی، سب سے پہلے امیر معاویہؓ والیٔ شام نے سرقوسہ پر حملہ کے لیے ایک فوج روانہ کی، جو کچھ علاقوں کو فتح کرنے کے بعد شام واپس آگئی، پہلی صدی ہجری کے آخر میں موسیٰ بن نصیر نے ایک اسلامی بیڑا اپنے لڑکے عبد اللہ کی سرکردگی میں صقلیہ کی سمت روانہ کیا، جو برقہ، مزقہ، سردانیہ اور صقلیہ کے ساحلی علاقوں کو زیرنگیں کر کے اور مال غنیمت حاصل کر کے لوٹ آیا، اس کے بعد بھی صقلیہ پر کئی بار فوج کشی ہوئی، لیکن عرصہ تک یہ مہم پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی، لیکن ان حملوں سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ رومی اور افریقہ کے حاکم مسلمانوں سے ثقافتی اور تجارتی تعلقات قائم ہو گئے،

۲۲۷ھ میں بیزنطی حاکم کے خلاف سرقوسہ کے عوام نے بغاوت کر دی اور افریقہ کے حاکم سے مدد چاہی، اس وقت اغلبی خاندان کا فرمانروا زیادۃ الاول (۲۰۱ھ - ۲۲۳ھ) افریقہ پر حکمرانی کر رہا تھا، اس نے سرقوسہ کے باغیوں کی مدد کے لیے ایک لشکر جرار اسد بن فرات کی سرکردگی میں جزیرہ کو روانہ کیا، پورا لشکر ستر جنگی جہازوں پر مشتمل تھا، جن میں سات سو سوار

اور دس ہزار پیادہ فوج تھی، سب سے پہلے یہ بیڑا مازر میں لنگر انداز ہوا، مازر کو فتح کرنے کے بعد اسلامی لشکر نے سرقوسہ کا قصد کیا، اور اس کا محاصرہ کر لیا، ابھی محاصرہ جاری تھا کہ اسلامی لشکر میں وبا پھیل گئی، اور امیر لشکر اسد بن فرات انتقال کر گئے، اس وبا میں اور بہت سے آزمودہ کار افسروں اور مجاہدین کی جانیں تلف ہو گئیں، اس لیے سرقوسہ کا محاصرہ اٹھا لیا گیا، جب فوج میں سکون ہوا تو مجاہدین نے پھر پیش قدمی شروع کر دی اور ۸۳۱ء میں بلرم جو فنیقی دور کا آباد اور مضبوط شہر تھا فتح کر لیا، اس کے بعد مسلمانوں نے سرقوسہ کے گرد و نواح میں چھوٹی چھوٹی فتوحات حاصل کیں، اور نو مہینے کی مسلسل چھوٹی بڑی جنگوں کے بعد صقلیہ پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا، اس کوشش میں تقریباً ۸۰ سال صرف ہوئے تھے۔

اس کے بعد ۸۳۷ء میں نابولیوں کی خواہش پر عربوں نے اٹلی کا رخ کیا، اور بڑھتے ہوئے اٹلی کے جنوبی حصہ قلوریہ تک پہنچ گئے، اس طرح ان عرب مجاہدین کے ذریعہ جنوبی اٹلی تک اسلامی تہذیب و تمدن پہنچ گیا، ساتویں صدی کے نصف آخر میں اٹلی اور عربوں میں ایک خونریز جنگ ہوئی جس سے عربوں کی پیشقدمی رک گئی، اس کے باوجود عربوں نے اٹلی کے آٹھویں حکمراں پوپ یوحنا (۸۷۲ء۔ ۸۸۲ء) سے برابر دو سال تک جزیہ وصول کیا۔

دسویں صدی کے آخر تک مسلمانوں نے صقلیہ پر حکومت کی لیکن پھر ان کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر ۱۰۹۱ء میں نارمنوں نے چالیس سال کی مدت میں پورے صقلیہ پر قبضہ کر لیا، ابتدائی دور کے نارمن فرمانرواؤں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کے مٹانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، لیکن بعض فرمانرواؤں کے دور میں صقلیہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت کو ترقی کرنے کا موقع بھی ملا، مثلاً راجر اول (المتوفی ۱۱۰۱ء) کو اسلامی تہذیب و ثقافت سے شدید شغف تھا، اس نے حکومت کے اکثر شعبوں میں مسلمانوں کو رکھا، بلرم (پلرمو) نے اتنی ترقی کی کہ وہ مشرق کا ایک خطہ بن گیا تھا،

عربوں نے صقلیہ میں ایک نئی تہذیب کو جنم دیا، جو "دورِ جدید" کے نام سے یاد کی جاتی ہے، اس میں کثرت سے مسجدیں تعمیر اور ہر طرح کی ملکی و معاشرتی ترقیاں ہوئی، ابن حوقل اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے، کہ اس نے بلرم میں صرف گوشت کی ایک سو پچاس دکانیں اور تقریباً تین سو مسجدیں دیکھی تھیں، جن میں ہر مسجد اتنی بڑی تھی کہ اس میں ۲۳ صفیں ہوتی تھیں، اور ہر صف میں تقریباً دو سو آدمی نماز پڑھتے تھے۔ اس طرح تمام مسجدوں میں نماز پڑھنے والوں کی تعداد سات ہزار تھی،

راجر اول کے بعد راجر ثانی صقلیہ کا فرمانروا ہوا، یہ اسلامی تہذیب و ثقافت میں اپنے پیشروؤں سے بڑھا ہوا تھا، حتیٰ کہ اس کے جبہ پر عربی الفاظ کڑھے رہتے تھے، اس کے پوتے ولیم دوم (۱۱۶۶ء – ۱۱۸۹ء) کی پرورش و پرداخت چونکہ اسلامی طرز پر ہوئی تھی، اس لیے اس کے دورِ حکومت میں اسلامی تہذیب و تمدن کے اثرات کا رنگ وہاں کی معاشرت پر غالب رہا، ابن جبیر اندلسی اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ بلرم کی عیسائی عورتوں نے بھی اسلامی معاشرت قبول کر لی تھی، یہاں تک کہ بغیر حجاب و نقاب کے باہر نہیں نکلتی تھیں، راجر ثانی نے ادریسی کو صقلیہ مدعو کیا اور جب وہ اس کے دربار میں پہنچا تو اس نے اسکی نہایت عزت و توقیر کی اور اسے اپنے دربار سے وابستہ کر لیا، ادریسی نے ایک نقرئی کرۂ ارض تیار کیا جس میں دنیا کے تمام شہروں، پہاڑوں، سمندروں، دریاؤں، وادیوں اور ان کے نشیب و فراز کا نقشہ دکھایا گیا تھا، ادریسی نے اس کرہ کی تشریح کے لیے ایک کتاب تالیف کی جس میں دنیا کے مختلف خطوں کے لوگوں کے حالات اور ان کے اطوار، وضع، لباس پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

اسی طرح نارمن فرمانرواؤں میں فریڈریک ثانی کو بھی اسلامی علوم و آداب اور عربی زبان سے خاص مناسبت تھی، اس کا دور ایک مسلمان بادشاہ کی طرح گذرا، اس نے اسلامی علوم و فنون کے ماہرین کو اپنے دربار میں خاص جگہ دی، سیر و تفریح کے اوقات میں بھی عربوں کو اپنے ساتھ رکھتا، جب جامعہ نابولی کا قیام عمل میں آیا تو اس نے اندلس، مصر، شام وغیرہ سے علماء بلا کر [illegible]

کے فرائض سپرد کیے، اور دنیائے اسلام سے بہت سی اہم کتابیں منگوا کر خود ان سے استفادہ کیا، اور انھیں مقامی زبانوں میں منتقل کرایا، فریڈریک ثانی جب ۱۲۴۱ء میں قاہرہ آیا تو اس کا شاندار استقبال ہوا، اکثر وہ مشکل مسائل میں افریقیہ، اندلس، مصر وغیرہ کے علماء سے رجوع کرتا، وہ اپنی مادری اور لاطینی زبان کے علاوہ عربی اور یونانی میں بھی کامل دستگاہ رکھتا تھا،

غرض صقلیہ کی تاریخ ایک ایسی تمدن آفریں قوم کی سرگذشت ہے جس کی تمدنی ترقیاں یورپ کی جدید ترقیوں کی بنیادوں میں سے ایک بڑی بنیاد ہیں، بلرم میں پارچہ بافی کی صنعت درجۂ کمال پر تھی، سوتی اور ریشمی ہر طرح کے کپڑے تیار کیے جاتے تھے، جو نہایت نفیس، عمدہ اور باریک ہوتے تھے، ان میں اعلیٰ قسم کے نقش و نگار بھی کاڑھے جاتے تھے، اور بازار میں یہاں کا کپڑا سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا تھا، یورپ نے اس صنعت کو یہیں سے سیکھا،

مسلمانوں نے بحر ابیض کے ذریعہ صقلیہ کے علاوہ دوسرے جزائر بھی فتح کیے، مثلاً ۲۱۲ھ مطابق ۸۲۷ء میں عرب فوجوں نے ایک بہادر جوان ابو عمر حفص بن عیسیٰ اندلسی کی سرکردگی میں اقریطش (کریٹ) کو فتح کیا، اور تقریباً ڈیڑھ صدی تک یہ جزیرہ مسلمانوں کے قبضہ و تصرف میں رہا، اس کے بعد اس پر ۹۶۱ء مطابق ۳۵۰ھ میں رومیوں کا قبضہ ہو گیا، اس کے علاوہ مسلمانوں نے موسیٰ بن نصیر فاتح اندلس کی سرکردگی میں ۷۱۳ء میں کورسیکا، جوناربٹ اور مسقط کو فتح کیا، اور ایک صدی ۸۱۳ء تک یہ سب مقام مسلمانوں کے قبضہ میں رہے، اسی طرح مسلمانوں نے آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں سردانیہ کو فتح کر لیا، اس کے علاوہ آس پاس کے اور بھی چھوٹے چھوٹے جزیروں پر بھی وہ قابض ہو گئے، یہاں تک کہ ۲۵۵ھ میں مالٹا کو فتح کر لیا، اس کے فتح کے بعد پورے شمالی افریقیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، مصنف کتاب مجمع البیان فی اخبار القیروان لکھتا ہے کہ مالٹا ابو الغرانیق محمد بن احمد بن اغلب المتوفی ۲۶۱ھ کے دور میں فتح ہوا تھا، ان کا

لقب غرانیق اس مناسبت سے پڑ گیا تھا کہ وہ شکار کا بڑا شیدائی تھا، اس لقب کے بارے میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے ایک وادی میں غرانیق (آبی سیاہ پرندہ) کے شکار کے لیے ایک شکار گاہ تیس ہزار دینار میں تعمیر کرائی تھی، اس مناسبت سے اس کا لقب بھی غرانیق پڑ گیا، مالٹا کی فتح کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ اغلبی فرمانرواؤں کے دور میں فتح ہوا تھا، انھوں نے یہاں کے باشندوں کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا کہ اس سے متاثر ہو کر بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے، مالٹا کی عام بول چال کی زبان بگڑی ہوئی عربی تھی، بعض مورخین کی رائے ہے کہ وہاں کے قدیم باشندے فنیقی تھے، جب نابلی اس جزیرہ میں داخل ہوئے تو انھوں نے بارہ سو توپیں، دو لاکھ رطل بارود، چالیس ہزار بندوقیں اور چار ہزار پانچسو مسلمان قیدی پائے، ۱۷۹۸ء میں ان قیدیوں نے رہائی حاصل کی،

مسلمانوں نے جزیرہ قبرص کو بھی فتح کر لیا تھا، اس وقت یہ جزیرہ دو حصوں میں منقسم ہے، ایک حصہ میں مسلمان اور دوسرے حصہ میں عیسائی آباد ہیں، مسلمانوں اور عیسائیوں میں کافی روابط ہیں، ابن حوقل جزیرہ قبرص اور جزیرہ اقریطش (کریٹ) کے بارے میں لکھتا ہے کہ "دونوں جزیرے نہایت سرسبز و شاداب اور دولت سے مالا مال ہیں، ان جزیروں کے حاکم مسلمان ہیں"۔ ابن جبیر اندلسی اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ جب اس نے کریٹ کا سفر کیا تو اس وقت اس جزیرہ کا حاکم ابوالقاسم بن حمود الملقب ابن حجر تھا، وہ بڑا صاحب خیر و فضل تھا، غربا کی اعانت، حاجیوں کی نگہداشت، قیدیوں کو آزاد کرانا اس کا خاص مشغلہ تھا، اس کا تعلق اہل بیت سے تھا، اس خاندان میں امارت و سیادت قدیم زمانہ سے چلی آرہی تھی،

اسی زمانہ میں مسلمانوں نے روڈس بھی فتح کیا تھا، اس کی فتح کے بارے میں بلاذری فتوح البلدان میں لکھتا ہے کہ "مسلمان روڈس میں سات سال تک اس قلعہ میں مقیم رہے جو خود انھوں نے اپنے لیے تعمیر کرایا تھا، حضرت امیر معاویہؓ کے انتقال کے بعد یزید نے جنادہ کو حکم دیا کہ

یہ قلعہ مسمار کر دیا جائے۔ مجاہد بن جبیر نے اس قلعہ میں مستقلاً سکونت اختیار کر لی تھی، اور وہ لوگوں کو قرآن پڑھایا کرتے تھے،

جنادہ بن ابی امیہ نے ۵۴ھ میں ارواڈ کو فتح کیا، ارواڈ قسطنطنیہ کے قریب ایک جزیرہ ہے، جہاں حضرت امیر معاویہؓ کے حکم سے ان مجاہدین نے مستقلاً سکونت اختیار کر لی جو اس کی جنگی مہم میں شامل تھے، ان ہی میں مجاہد اور تبیع بھی تھے، تبیع کعب الاحبارؓ کی بیوی کے پہلے شوہر کے لڑکے تھے، یہیں مجاہد نے تبیع کو قرآن پڑھایا، بعض مورخین کا خیال ہے کہ انھوں نے رودس ہی میں قرآن پڑھایا تھا،

روڈس میں اس وقت بھی کافی مسلمان آباد ہیں، وہاں کے مفتی اور امام شیخ سلیمان فاشلی اوغلو ہیں، ۱۹۴۰ء میں یونانی مسلمانوں اور اٹلی میں ایک شدید جنگ ہوئی تھی جس میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے، لیکن اس جنگ میں عظیم نقصان کے باوجود مسلمانوں نے نصف البانیہ فتح کر لیا، یونان ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء تک خانہ جنگی میں مبتلا رہا جس کی وجہ سے تقریباً ایک لاکھ انسانوں کی جانیں ضائع ہو گئیں،

اس وقت یونان اور اس کے اردگرد تقریباً ایک لاکھ مسلمان آباد ہیں، جن میں زیادہ تر کاشت کار ہیں، یہ لوگ زیادہ تر یونان کے پایہ تخت اور مغربی خطوں میں ہیں، مسلمانوں کو اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنے دین کی نشر و اشاعت میں حکومت یونان کی طرف سے پوری آزادی حاصل ہے، اسلامی مدارس کی تعمیر میں بھی حکومت پورے طور سے دلچسپی لیتی ہے اور مستقل امداد دیتی ہے، گذشتہ سال یونانی زبان میں قرآن کا ترجمہ بھی شائع ہوا ہے،

روڈپ بلقان کی کل آبادی ۳۰۵ ہزار ہے، جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے، یونان میں حقیقی جمہوری نظام ہے، اور ہر شخص کو مکمل آزادی اور اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کے پورے حقوق حاصل ہیں

مسلمان آزادانہ طور پر مساجد تعمیر کرتے ہیں، اور اس میں حکومت بھی ان کی امداد کرتی ہے، قرآن کی تعلیم کا عام رواج ہے، جو زیادہ تر حفظ پر مشتمل ہے، بلقان کے حالات و مشاہدات کے بعد اسکی ضرورت ہے کہ یہاں کے مسلمانوں میں عام دینی و تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیے مختلف ممالک کے تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل وفود روانہ کیے جائیں۔

عرب کے بیں ماہی گیر اسپین کے ساحل کے ذریعہ پرد فرانس پہنچے، اور مسلمانوں کی ایک جمعیت کے ساتھ فرکسینا ٹوم پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا، اس قلعہ کے جائے وقوع کے بارے میں مورخین کی رائیں مختلف ہیں، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ فرانس اور اٹلی کے درمیان میں کوہستان الپ میں واقع تھا، مسلمانوں نے آہستہ آہستہ یہاں زبردست قوت حاصل کر لی، یہانتک کہ ۹۰۶ء میں ڈوفینی کی تمام گھاٹیوں پر قبضہ کر لیا جس سے اٹلی اور فرانس کا مواصلاتی اور ثقافتی و تجارتی راستہ منقطع ہو گیا، مسلمانوں کی مرضی اور اجازت کے بغیر کوئی شخص ان گھاٹیوں کو عبور نہیں کر سکتا تھا، ۹۱۱ء میں رئیس اساقفہ کو بھی روم جانے کے لیے ان مسلمانوں سے اجازت لینی پڑی، برد فرانس میں آباد اساقفہ مسلمانوں کے خوف سے برد فرانس چھوڑ کر سوئزرلینڈ کے علاقہ میں آباد ہو گئے، مگر مسلمانوں نے ان کو یہاں بھی دم نہ لینے دیا، اور اس علاقہ کو بھی فتح کر لیا۔

فرانس میں نیس (ادنیقہ) بھی عرصہ تک مسلمانوں کے قبضہ و تصرف میں رہا، ڈورانٹ تاریخ میں لکھتا ہے کہ "نیس میں ایک پورا محلہ مسلمانوں سے آباد تھا،

یورپ میں مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا، جس کا اصل مقصد اپنی حفاظت اور ملک کی سالمیت تھا، یورپ کی فتوحات کے سلسلہ میں مجاہدین کے حوصلے اس لیے بھی بلند تھے کہ حدیث نبوی میں اس کے فتح کی پیشین گوئی موجود ہے، وہ حدیث یہ ہے:

زویت لی مشارق الارض — میرے لیے مشرق سے مغرب تک زمین

ومغاربها وسیبلغ ملک امتی	پلیٹ دی گئی اور عنقریب ان تمام علاقوں
ما زوی لی منها (رواہ مسلم واحمد ونسائی)	پر میری امت کا قبضہ ہوگا۔

دوسری سند سے یہ روایت اس سے زیادہ مفصل طور پر یوں مروی ہے:-

حدثنا حماد عن ایوب عن ابی	حماد ایوب سے اور وہ ابو قلابہ سے اور
قلابۃ عن ابی اسماء عن ثوبان	وہ ابو اسماء سے اور وہ ثوبان سے
قال قال رسول اللہ صلی اللہ	روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم ان اللہ زوی لی الارض	علیہ وسلم نے کہ خدا نے میرے لیے زمین لپیٹ
فرأیت مشارقها ومغاربها	دی، میں نے اس کو مشرق سے مغرب تک دیکھا
وان امتی سیبلغ ملکها ما زوی لی	اور عنقریب میری امت ان تمام علاقوں
منها واعطیت الکنزین الاحمر	کی مالک ہوگی، اور مجھے دو خزانے احمر و ابیض
والابیض وانی سألت ربی	دیے گئے، میں نے اپنے پروردگار سے درخواست
لامتی ان لا یهلکها بسنۃ عامۃ	کی کہ میری امت کو خشک سالی سے ہلاک
وان لا یسلط علیهم عدوا	نہ کریگا، اور دوسری قوم کو ان پر مسلط نہ کریگا،
من سوی انفسهم فیستبیح بیضتهم	جو ان کی سرزمین پر تصرف کرے اخیر پروردگار
وان ربی قال یا محمد انی اذا قضیت	نے کہا اے محمد میں نے بعض فیصلے ایسے کیے ہیں
قضاء فانہ لا یرد وانی اعطیتک	جن میں کبھی رد و بدل نہیں ہوسکتا، (ان
لامتک ان لا اهلکهم بسنۃ عامۃ	میں سے ایک یہ ہے) میں تمھاری امت کو
وان لا یسلط علیهم عدوا من	خشک سالی سے تباہ نہ کروں گا، ان پر
سوی انفسهم یستبیح بیضتهم	کسی دوسری قوم کو مسلط نہ کروں گا جو انکی

ولو اجتمع علیھم من اقطارھا او قال من بین اقطارھا حتی یکون بعضھم یھلک بعضا ویسبی بعضھم بعضا

سرزمین پر تصرف کرے، اگرچہ اس کے لیے ساری دنیا کے لوگ جمع ہو جائیں یہاں تک کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو ہلاک اور قید کرنے لگیں گے۔

یورپ میں اسلام کی نشر و اشاعت میں ان فتوحات کے علاوہ مسلمان سیاحوں، تاجروں اور واعظوں کا بھی بڑا دخل ہے، تاریخ کی قدیم عربی کتابوں میں یورپ کے بعض خطوں اور وہاں سے تجارتی و ثقافتی روابط کا تذکرہ اکثر ملتا ہے، مثلاً مقدسی نے مسعودی (۳۴۶ھ ۹۵۶ء) کے حوالہ سے احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم میں لکھا ہے کہ یورپ میں ایک قبیلہ سلافیہ کے نام سے مشہور ہے، اس قبیلہ میں کثرت سے مسلمان تھے،

بحر اڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر ڈالمسیا جو آج کے جدید یوگوسلاویہ کے زیر حکومت ہے، پہلے یہاں قبیلہ صقالبہ آباد تھا، اس خطہ پر مسلمانوں کے قبضہ سے پہلے بھی یہاں کے باشندوں کے عربی ممالک سے تجارتی و ثقافتی تعلقات تھے، صقلبیوں کا تذکرہ تاریخ کی اکثر کتابوں میں ملتا ہے، ابن جریر تاریخ طبری میں لکھتے ہیں کہ "مامون کے حکم سے جن چار غلاموں نے وزیر فضل بن سہل کو قتل کیا تھا، ان میں ایک کا نام سرفق الصقلبی تھا، یتیمۃ الدہر میں ہے کہ "عرب صقلبی اور ترکی غلاموں میں صقلبی غلاموں کو ترجیح دیتے تھے" جاحظ کتاب الحیوان میں غلاموں کے اقسام کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "صقالبہ سفید حمام کے مانند ہوتے تھے،" مسعودی لکھتا ہے کہ خلیفہ مستعین عباسی کی ماں صقلبی تھی، اور اسکا نام مخارق تھا، مشہور مورخ ابو الفدا اشبقراد کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا قبیلہ ہے، جو جرمنی اور انگلینڈ کے درمیان میں آباد ہے، یہ قبیلہ عیسائیوں اور مسلمانوں پر مشتمل ہے، مگر عیسائیوں کو اکثریت اور غلبہ حاصل ہے، یہاں کے آباد مسلمان ذمیوں کی طرح جزیہ دیتے ہیں، یاقوت حموی معجم البلدان میں باشغارد کی تشریح کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میں نے حلب میں بہت سے

ایسے لوگ پائے جن کو لوگ باشنا رد یہ کہتے ہیں، کیونکہ ان کے بال اور چہرے بے انتہا سفید ہوتے ہیں اور وہ امام ابوحنیفہ کے مسلک کے پیرو ہیں، میں نے ان میں سے ایک سمجھ دار آدمی سے اس کے حسب نسب کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ ہم قسطنطنیہ سے کچھ دور ہنگری کے رہنے والے ہیں جو انگریزوں کے ماتحت ایک علاقہ ہے، مگر مذہباً ہم مسلمان ہیں، ہمارا ظاہری رہن سہن انگریزوں سے ملتا جلتا ہے، ہم میں زیادہ تر لوگ فوج میں ملازم ہیں، میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اتنے دور دراز ملک میں اسلام کیسے پہنچا، اس نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ بلغاریہ سے سات افراد پر مشتمل مسلمانوں کی ایک جماعت یہاں آکر آباد ہوگئی، اس نے ہمیں ہدایت کی دعوت دی جس سے متاثر ہوکر ہمارے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا، اور خدا کا یہ فضل ہے کہ اس نے اب تک ہماری نسل میں اسلام کو باقی رکھا، چونکہ ہمارے یہاں تعلیم کا باقاعدہ نظام نہیں ہے، اس لیے ہم تعلیم کے لیے عرب کے اسلامی ملکوں کا سفر کرتے ہیں، اور حصول تعلیم کے بعد لوٹ کر اپنے ملک میں دین و اسلام کی خدمت کرتے ہیں، میں نے اس سے یہ بھی سوال کیا کہ تم لوگ داڑھی کیوں منڈاتے ہو، اس نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں داڑھی رکھنے کا رواج عام ہے، البتہ نوجوان طبقہ اور فوج میں ملازمت کرنے والے داڑھی نہیں رکھتے، میں نے اس سے اس کے ملک کی مسافت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ یہاں سے قسطنطنیہ ڈیڑھ ماہ کی مسافت پر ہے اور اتنی ہی مسافت قسطنطنیہ سے ہمارے ملک کی ہے،

غرض تجارتی و ثقافتی تعلقات اور اسلامی فتوحات کے ذریعہ یورپ کے جنوب مشرق کے اکثر حصوں میں مسلمانوں کی آبادیاں قائم ہوگئی تھیں، کہیں مسلمان حاکم تھے اور کہیں محکوم، یورپ میں مسلمانوں پر بڑے بڑے مظالم بھی ہوئے، مگر انھوں نے ان کو اسلام کی راہ میں بڑے صبر استقلال کے ساتھ برداشت کیا، مشہور کارل اول دابرٹ (۱۳۰۱ء تا ۱۳۴۲ء) نے اپنے مقبوضہ علاقے میں

یہ قانون نافذ کر دیا تھا کہ کوئی شخص روزہ نہیں رکھ سکتا، ذبیحہ صرف مسیحی طرز پر ہوگا، خنزیر کا گوشت نہ کھانا جرم متصور ہوگا، کوئی شخص نماز سے پہلے وضو نہیں کر سکتا، مسلمانوں کی وراثت میں حکومت بھی حصہ دار ہوگی، اس کے دورِ حکومت میں مسلمانوں پر ناروا مظالم کی ایک طویل داستان ہے، اس کے پورے دور میں مسلمانوں کو سخت مشکلات کا سامنا رہا، اس کے مرنے کے بعد مسلمانوں کو قدرے سکون حاصل ہوا، مگر اس کے باوجود ہنگری کے مسلمانوں کی زندگی ہمیشہ مصائب کا شکار رہی، اور اس وقت بھی وہاں کے مسلمان سخت مشکلات میں زندگی کا مقابلہ کر رہے ہیں،

یوگوسلاویہ میں مسلمان پہلی ہی صدی سے آباد ہیں، قبیلہ سنجاک اور بُسناق میں کثرت سے مسلمان ہیں، ابھی حال ہی میں ایک سیاح بسنہ کے حالات میں لکھا ہے کہ یورپ میں یوگوسلاویہ ہی ایک ایسا خطہ ہے جہاں کے مسلمانوں نے مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار نہیں کیا، وہ اس بارہ میں قابلِ تحسین ہیں کہ انھوں نے مغربی تہذیب و تمدن کے نرغے میں رہنے کے باوجود اسلامی طرز معاشرت نہیں چھوڑا، اسلامی طرز معاشرت میں مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں سے فائق ہیں، وہاں کے پہاڑی علاقہ کے بعض مسلم گھرانوں کو دیکھنے کا موقع ملا، ان کے رہن سہن کو دیکھ کر قرنِ اول کے مسلمان یاد آجاتے ہیں،

۱۳۶۳ء سے قبل بسنہ میں ترکوں کی آمد کا پتہ چلتا ہے، اس سے پہلے وہاں اسلام کے پھیلنے کا موقع کم ملا، ۱۳۶۳ء کی فتح اور ۱۴۸۶ء میں قبیلہ بلج کے اسلام لانے کے بعد بسنہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی، وہاں کے باشندے عرصہ تک سکون و اطمینان کی زندگی گذارتے رہے، یہاں تک کہ انیسویں صدی میں کچھ فتنہ پروروں نے سرحد بلغاریہ، اور جبلِ اسود کے باشندوں میں یہ فتنہ پھیلایا کہ اسلام میں مسیحیوں کا قتل مباح اور باعثِ ثواب ہے، ان فتنہ پروروں نے اس سلسلہ میں سلانیک میں جرمنی اور فرانس کے سفیروں کے قتل کو بہانہ بنایا، جس سے وہاں کے مسیحی عوام بھڑک اٹھے اور بسنہ اور ہرسک نے باغیوں نے یہ مطالبہ کیا کہ انھیں حکومت کے مقبوضہ علاقے سے الگ

آزاد ریاست کے طور پر ⅓ حصہ دیا جائے، اس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر باغیوں اور ترکی حکومت میں عارضی صلح کرا دی، اس طرح روس کو ان علاقوں میں قدم جمانے اور اپنا سیاسی مسلک کی اشاعت کا کافی موقع ملا، اور وسط یورپ کے اکثر خطوں میں اس کو غلبہ اور تسلط حاصل ہو گیا۔

یوگوسلاویہ میں مسلمانوں کو ہر طرح کی مذہبی اور شخصی آزادی اور وہاں کے وفاقی دستور میں مسلمانوں کو پورے مراعات حاصل ہیں، چونکہ وہاں کی حکومت سیکولر ہے اس لیے مسلمان اپنے مذہبی امور و معاملات کا انتظام خود کرتے ہیں، سراجیفو میں باقاعدہ علماء کی ایک مجلس ہے، جو دینی امور کی نگران ہے، اس مجلس کا باقاعدہ انتخاب ہوتا ہے، اس انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ منتخب نمائندوں میں ایک تہائی عالم دین ہوں، اور بقیہ نمایندے بھی دیندار ہوں، پورے یوگوسلاویہ میں اس وقت تقریباً آٹھ ہزار مسجدیں ہیں، خاص سراجیفو میں کئی اعلیٰ اسلامی درسگاہیں اور بہت ثانوی و ابتدائی مکاتیب ہیں، وہاں کے مسلمان ملک کی عوامی اور سیاسی زندگی میں برابر کے شریک ہیں، مثلاً عثمان کرہیوفنتش یوگوسلاویہ کے وزیر اتحادی اور حسن بیرکتش وزیر تجارت ہیں، ایک مسلمان خاتون عدالت العالیہ کی جج ہیں، بلغراد میں ایک عالم دین شیخ الاسلام کے منصب پر مقرر ہوتا ہے، اس کا انتخاب مجلس العلماء، اصحاب افتا، مدرسہ قضاء شرعی کا نگراں اور محکمہ اوقاف کے منتخب ارکان کرتے ہیں،

مجلس نواب میں مسلمانوں کے تیس منتخب شدہ نمایندے ہوتے ہیں، جو مجلس اعلیٰ اور محکمۃ التمیز سے منتخب ہوتے ہیں، یہ نمایندے مسلمانوں کے دینی معاملات، اوقاف اور تعلیم وغیرہ کی نگرانی کرتے ہیں، ہر علاقہ میں قضاۃ مقرر ہوتے ہیں، جو نکاح، طلاق، میراث اور اوقاف وغیرہ کے مقدمات فیصل کرتے ہیں، بوسنہ میں ان تمام مجالس کی نگرانی کے لیے ایک الگ محکمہ قائم ہے جو محکمۃ التمیز کے نام سے موسوم ہے، دو اعلیٰ درسگاہیں "مدرسہ قضاء شرعی" اور "مدرسہ علوم شرعی" قائم ہیں، ان کے علاوہ دوسرے مدارس [illegible]

دو ٹیچرز ٹریننگ اسکول قائم ہیں،

البانیہ میں اسلام کی اشاعت ترکوں کے ذریعہ ہوئی، ترکوں کے فتح بلقان کے بعد البانیوں نے جارج کسٹریوٹ بن یوحنا کی سرکردگی میں سخت مقابلہ کیا، اس معرکہ میں بھی ترکوں کو فتح ہوئی اور اس کے بعد جارج نے اسلام قبول کر لیا، اور عثمانی لشکر میں جنرل مقرر ہوا، اس کا اسلامی نام اسکندر بک ہوا،

البانیہ کی کل آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے، جس میں نصف مسلمان ہیں، اور نصف آبادی میں ارتھوڈکس اور رومن کیتھولک عیسائی ہیں، مسلمانوں اور عیسائیوں کی عام معاشرت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے، یہاں عیسائی بھی ترکی ٹوپی استعمال کرتے ہیں، اور اپنے مدارس میں قرآن پڑھاتے ہیں، البانیہ میں سب سے مشہور اسلامی درسگاہ مدرسہ تیرانا ہے، جس میں عربی اور علوم شرعیہ کی اعلیٰ تعلیم دیجاتی ہے، البتہ ابھی تک اس درسگاہ میں ذریعہ تعلیم البانی زبان ہی ہے، اس درسگاہ میں البانیہ کے علاوہ مختلف مقامات باسان، داشکودرا، کورتسادو، رازد اور فلورا کے تقریباً ۳۰ طلباء تعلیم حاصل کر رہے ہیں، اس درسگاہ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ مفتی، ائمہ، خطباء اور اسلامی مدارس کے لیے اساتذہ تیار کیے جائیں۔

جرمنی میں مسلمانوں کی کل تعداد تقریباً ۹ ہزار ہے جن میں تین ہزار خاص جرمن باشندے ہیں اور ۶ ہزار میں عرب، ہندوستان، پاکستان اور دوسرے اسلامی ملکوں کے باشندے شامل ہیں، جرمنی میں مسلمانوں کو دینی اور تعلیمی ہر طرح کی آزادی حاصل ہے، ' یہ ' میں بہت سی اسلامی جماعتیں دینی کام کر رہی ہیں، ان میں ایک اسلامی جماعت کا نام جمعیۃ الاخوۃ الاسلامیہ ہے، اس کے امیر سید احمد ہارون ہیں، فرانکفورٹ کی اسلامی جماعت کے امیر ایک جرمن نومسلم محمد امین ہیں، ہیمبرگ میں بھی ایک اسلامی جماعت قائم ہے، جس کے امیر برلن کے امام محمد امان ہیں، جنکی کتابوں

کے مصنف ہیں، انھوں نے عام فائدے کی غرض سے جرمن زبان میں نماز کی ترکیب پر ایک مصور کتاب شائع کی ہے، محمد امان اور ان کے دست راست سید محمد احمد نے جرمن باشندوں میں اسلام کی اشاعت اور اس کو عام فہم بنانے میں انتھک کوشش کی ہے،

جرمنی کے مسلمانوں کے علمی اور ثقافتی، روابط سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا، ہالینڈ، فن لینڈ اور سوڈان کے مسلمانوں سے قائم ہیں، ابھی حال ہی میں جرمن زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی شائع ہوا ہے،

فرانس میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد تقریباً دو لاکھ ہے، جن میں بیس ہزار پیرس اور اس کے گرد و نواح میں آباد ہیں، ان میں زیادہ تر شمالی افریقہ کے لوگ ہیں، یہاں کے مسلمان زیادہ تر مزدور پیشہ ہیں،

مرسلیز میں ایک مسلم مسافر خانہ ایک مسلمان خاتون کی نگرانی میں قائم ہے جس میں نو وارد مسلمانوں کے قیام و طعام کا باقاعدہ انتظام ہے، خاص پیرس میں ۱۵ر جولائی ۱۹۲۶ء میں ایک عظیم الشان مسجد کی بنیاد رکھی گئی تھی، اس میں دینی جلسوں کے لیے ایک وسیع ہال بھی تعمیر کیا گیا ہے، یہ مسجد شرقی اور مغربی طرز تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے، اس کے صحن میں خوش منظر حوض ہے، جس میں ایک خوشنما فوارہ مسجد کے حسن و وقار کو دوبالا کرتا ہے، فرانس میں بہت سی دینی جماعتیں بھی قائم ہیں، مثلاً ایک جماعت "جمعیۃ الاخوۃ الاسلامیہ" کے نام سے قائم ہے، جس کا بنیادی مقصد مدارس اور یونیورسٹیوں کے فارغ طلبا کی دینی تربیت ہے، اس جماعت کے ایک سرگرم کارکن استاد مسیو دینی ہیں، جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حج پر جامع کتابیں لکھی ہیں،

انگلینڈ میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد تقریباً تیس ہزار ہے، یہاں کی اسلامی تاریخ ۱۸۸۷ء سے شروع ہوتی ہے، اگرچہ اس سنہ سے پہلے بھی اسلامی دعاۃ انگلینڈ پہنچ چکے ہیں، لیکن ان کے

ناموں کو شہرت نہ حاصل ہو سکی، یہاں تک کہ ترکی میں انگلینڈ کے مشہور سفیر لارڈ ہاشانلی اوف دولی نے اسلام قبول کرلیا، ان کا اسلامی نام عبدالرحمٰن تھا، انھوں نے قبول اسلام کے بعد انگلینڈ میں اسلام کی تبلیغ واشاعت میں انتہائی جد وجہد کی، ان کی کوشش سے ایک اچھے خاصے طبقے نے اسلام قبول کرلیا، اس سے چند سال پہلے ۱۸۶۶ء میں مسٹر کوبلیام نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا، وہ لورپول کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، ان کا اسلامی نام عبدالرحمٰن تھا، سلطان عبدالحمید نے ان کی خدمات وکارہائے نمایاں سے متاثر ہو کر اپنے یہاں بلالیا، اور ایک خطاب عطا کر کے برطانیہ میں شیخ الاسلام کا منصب تفویض کیا، وہاں کچھ دنوں قیام کرنے کے بعد موصوف اپنے وطن لورپول واپس آگئے، اور آنے کے بعد اپنے گھر کو مسجد قرار دیا، جو اسلامی تہذیب وثقافت کے شیدائیوں کا مرکز بن گئی، موصوف نے دو اسلامی رسالوں کا اجرا بھی کیا، جس میں اسلامی علوم اور اسلامی تعلیمات کو اچھے اور اچھوتے انداز میں پیش کیا جاتا تھا، اس کو پڑھ کر شمالی انگلینڈ میں بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا، اور ایک اچھا خاصہ طبقہ اسلام سے واقف ہو گیا،

۱۸۸۶ء میں ایک اور اسلامی جماعت قائم ہوئی جس نے تقریباً سترہ سال تک اسلام کی تبلیغ واشاعت کی خدمت انجام دی، اس جماعت کے امیر شیخ عبداللہ سہروردی تھے، اسی درمیان میں ہندوستان سے بھی بہت سے مبلغین اسلام انگلینڈ پہنچے، ان میں فاتح محمد سیال اور خواجہ کمال الدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان حضرات کی مساعی کا یہ اثر ہوا کہ مشہور انگریز لارڈ ہیڈلے نے اسلام قبول کرلیا، انھوں نے انگلینڈ میں ایک اسلامی جماعت کی بنیاد ڈالی، جو "الجمعیۃ الغربیۃ الاسلامیۃ" کے نام سے مشہور ہوئی، اس کے امیر ڈاکٹر خالد شلدریک مقرر ہوئے، اس جماعت کا اسلام کی تبلیغ واشاعت کے علاوہ ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ عرب، ہندوستان، ملایا اور صومال وغیرہ کے ان مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے جو انگریزی کمپنیوں میں کام کرتے ہیں، اس کے علاوہ

پریشان حال مسلمانوں کی اعانت، مدارس و مساجد کا قیام اور ان کی نگرانی مسلمان بچوں اور بچیوں کی تعلیم و تربیت اس کے مقاصد میں تھی، ان ہی بنیادوں پر بیسویں صدی کے ربع اول میں بھی نومسلم انگریزوں، ہندوستانی مسلمانوں اور عرب ملکوں کے مسلمانوں سے مل کر ایک اور جماعت کی بنیاد ڈالی،

مانچسٹر میں ایک اسلامی مرکز قائم ہے، جہاں مسلمانوں کے نکاح اور دیگر اسلامی شعائر کی دیکھ بھال کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے، اس مرکز سے متعلق نماز، مذہبی تقریروں اور عام جلسوں کے لیے الگ الگ ہال ہیں، مرکز کے اوپر کی دو منزلیں شادی شدہ مسلمان طلبا کی رہائش کے لیے مخصوص ہیں، اس وقت مانچسٹر اور اس کے آس پاس میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد تقریباً تین سو ہے، اسلامی مرکز میں ہر ہفتہ میں ایک دن اسلامی تعلیمات پر تقریر اور ایک دن عام مسلمانوں کی تعمیری ترقی کے لیے غور و خوض ہوتا ہے، مانچسٹر یونیورسٹی اور اس سے متعلق صنعتی شعبوں میں مسلمان طلبا کو تعلیم کی پوری سہولت حاصل ہے، مانچسٹر میں ایک صاحبِ خیر اور مشہور تاجر لبابیدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو ریشمی اور سوتی کپڑوں کی تجارت کرتے ہیں، ان کی تجارتی ایجنسیاں شرق اوسط، مشرقی افریقہ، مغرب، سنگال، پاکستان، ہندوستان، جنوبی افریقہ وغیرہ میں قائم ہیں،

کارڈیف کے ایک حصہ میں یمن، عدن اور صومال کے مسلمان باشندے آکر آباد ہو گئے ہیں، جن کی مجموعی تعداد تقریباً ۱۵۰۰ ہے، ان میں صرف صومال کے ۶۰۰ سو مسلمان ہیں، ان صومالی مسلمانوں نے اپنی الگ ایک اسلامی جماعت "جمعیۃ شباب الصومال" قائم کی ہے، اس کارڈیف میں بہت سے ہوٹل، کافی ہاؤس، ریسٹورنٹ کے مالک عرب ہیں، اس کے علاوہ بہت سے عربوں نے سبزی، پھلوں اور گوشت وغیرہ کی دوکانیں کھول لی ہیں، یہاں مسلمانوں کو

ہر قسم کی تجارتی اور کاروباری سہولتیں حاصل ہیں، ان میں اور وہاں کے مقامی باشندوں میں کوئی امتیاز نہیں ہے، ان تاجروں میں صومال کے ایک عربی تاجر سید محمد عمر خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو کاروباری حیثیت سے وہاں ممتاز مقام رکھتے ہیں،

کارڈیف کی جماعت نورالاسلام نے خاص کارڈیف میں ایک مسجد "مسجد نورالاسلام" کے نام سے تعمیر کی ہے، اس جماعت نے کارڈیف میں تین اور شیلز میں ایک مکان خرید کر مسجد پر وقف کیا ہے، کارڈیف کے مسلمانوں نے ایک مسافر خانہ بھی تعمیر کیا ہے، اور اس سے متعلق ایک دینی مدرسہ بھی ہے، جس کے تمام تعلیمی مصارف ایک صاحب خیر سید علی سلمان زبیدی برداشت کرتے ہیں، حال ہی میں کارڈیف کے مسلمانوں نے ایک جامع مسجد کی تعمیر کے انتظامات شروع کر دیے ہیں،

لندن سے ۲۰ میل دور وکنگ میں بھی ایک مسجد ہے، یہ مسجد عرصہ ہوا ہندوستانی مسلمانوں کے چندوں سے تعمیر ہوئی تھی، اور اس کے تمام بالائی مصارف کی کفالت بیگم بھوپال کرتی تھیں، اسی مناسبت سے اس مسجد کا نام شاہجہانی ہے، خاص لندن میں ایک اسلامی مرکز قائم ہے، خدا اس دینی مرکز کو اور انگلینڈ کے دیگر مراکز کو مزید ترقی عطا فرمائے۔

اسلام اور عربی تمدن

شام کے مشہور فاضل اجل علامہ محمد کرد علی کی کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کا اردو ترجمہ جس میں مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور پھر یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی اور تمدنی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ (از شاہ معین الدین احمد ندوی) قیمت: ۸ روپے

فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ

(جامع مسجد برہان پور)

از جناب جاوید انصاری، برہان پور

برہان پور جنوبی ہند کا قدیم تاریخی شہر ہے، جس کو نصیر خاں فاروقی نے اپنے پیر و مرشد شیخ برہان الدین غریب کے نام پر ۱۴۰۶ء میں آباد کیا تھا، سلاطین فاروقیہ نے اس شہر کو صوبہ خاندیش کا پایہ تخت بنا کر دو سو سال حکومت کی، اور اپنے عہد میں یہاں کئی شاندار عمارتیں بنوائیں، جن میں شاہی قلعہ کی عمارتیں، شاہان فاروقیہ کے مقبرے، پیر بنا صاحب کی مسجد، بی بی کی مسجد، شاہ باجن کی مسجد، عید گاہ قدیم، جامع مسجد اسیر گڑھ اور جامع مسجد برہان پور خاص طور سے قابل ذکر ہیں، فاروقی دور کی اکثر عمارتیں پتھر کی ہیں، اگرچہ یہ ہندوستان کی عمارتوں کی طرح بلند و بالا نہیں ہیں لیکن اپنے دور کی سنگ تراشی اور صناعی کا نادر نمونہ ہیں، فاروقیہ عہد کی عمارتوں کی بنیادیں گہری اور دیواروں کے آثار چوڑے ہیں، اس لیے صدیاں گذر جانے کے باوجود ان میں مرمت کی بہت کم ضرورت پیش آئی، پیش نظر مضمون میں برہان پور کی تاریخی جامع مسجد کا حال تحریر کیا گیا ہے، جو اپنی ساخت اور فن تعمیر کے اعتبار سے نہ صرف دکن بلکہ تمام ہندوستان میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس مسجد کی صناعی اور ندرت کا اعتراف عہد مغلیہ کے مورخوں نے بھی کیا ہے۔ اور اسے خطۂ دکن کی بہترین عمارت قرار دیا ہے چنانچہ مصنف مآثر رحیمی لکھتا ہے:

"مسجد جامع ایں شہر عمارتے ست عالی و بنائے متعالی و دراں آثار عجیبہ غریبہ کہ دریں ولایت

ہست بہتر ازیں عالی بنا چیزے نیست" (ص ۶۰۲ جلد دوم)

مشہور مورخ خافی خاں نے اس مسجد کو کاریگری اور نقاشی کے لحاظ سے جامع مسجد دہلی

کے بعد دوسرا درجہ دیا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"بہ خوبی مسجد برہان پور سوائے مسجد شاہجہان آباد کمتر مسجد بہ نظر آمدہ" (منتخب اللباب جلد سوم ص ۳۳۴)

اس جامع مسجد کو صوبہ خاندیش کے خود مختار فرمانروا عادل شاہ بن مبارک شاہ فاروقی نے

تعمیر کرایا تھا جس کا اصلی نام راجہ علی خاں تھا، وہ ۹۸۴ھ میں برہان پور میں تخت نشین ہوا،

اور ۱۰۰۸ھ میں وفات پائی، بادشاہ مذکور متقی اور پابند صوم وصلوٰۃ تھا،

برہان پور کی قدیم جامع مسجد پہلے وہ تھی جو اب محلہ اتوارہ میں بی بی کی مسجد کہلاتی ہے،

یہ مسجد اس شہر کی ملکہ راجہ رقیہ بیگم نے بنوائی تھی، اس کا سنہ تعمیر ۹۳۶ھ ہے جب شہر کی

آبادی شمال سے جنوب کی طرف بڑھنے لگی تو یہ مسجد کنارے پڑ گئی، جس سے جمعہ کے دن نمازیوں

کو آنے میں تکلیف ہوتی تھی، اس لیے بادشاہ نے شہر کے بالکل وسط میں ایک جامع مسجد

بنانے کا حکم دیا،

اس مسجد کا سنگ بنیاد ۹۹۷ھ میں رکھا گیا، اور ۱۰۰۲ھ میں تعمیر ختم ہوئی، یعنی پانچ

سال کے عرصے میں یہ عالیشان عمارت بنکر تیار ہوئی، تاریخ برہان پور میں تعمیر مسجد کا جو قطعۂ

تاریخ درج ہے۔ اس میں ایک ہی مصرع میں تعمیر کی ابتدا اور تکمیل کا سنہ دونوں تحریر کئے

ہیں، مسجد کی وسطی محراب میں جو عربی کتبہ ہے اس میں ابتدائے تعمیر کا سنہ ۹۹۷ھ تحریر ہے،

لیکن تکمیل کا کسی وجہ سے کندہ نہ ہو سکا، جس سے بعض لوگوں نے یہ غلط رائے قائم کر لی کہ تعمیر

اور تکمیل کا ایک ہی سنہ ہے، یعنی مسجد ایک سال میں بنی ہے، حالانکہ اسیر گڑھ کی مسجد کی تعمیر میں

جو اسی نمونے کی ہے، اور اس سے طول و عرض میں کم ہے، تقریباً چار سال صرف ہوئے تو اتنی بڑی عمارت کا ایک سال میں مکمل ہونا کس طرح ممکن ہے، اس لیے قطعۂ تاریخ ہی درست ہو جو حسب ذیل ہو:-

شاہ عادل خلف شاہ مبارک فاروق — بسلاطین جہان بود وجودے کامل

مسجدے ساختہ از مال عزتی بے شک — کہ زبان ست توصیف ثنائش عاطل

بہ برہانپور از این مسجد رونق افزا — می شود شام و سحر رحمت ایزو نازل

خوش دو تاریخ خرد گفت دریں یک مصرع — مسجد فیض بنا گشت بہ فیض عادل

۹۹۷ھ ۱۰۰۲ھ

مسجد کا محل وقوع جامع مسجد دہلی کی طرح بالکل وسط شہر میں ہے، اس کے چاروں طرف چوک بازار کی دوکانیں ہیں، جہاں بڑی چہل پہل رہتی ہے، مسجد کے مشرقی جانب صدر دروازے کے اندر ایک وسیع احاطہ اور پختہ سنگین صحن ہے، جسے طے کرکے مسجد میں داخل ہوتے ہیں، پوری عمارت نیچے سے اوپر تک سفیدی مائل سیاہ پتھر کی ہے، اندرونی حصے میں پالش کیا ہوا چمکیلا پتھر استعمال کیا گیا ہے، مسجد کی ساخت محرابی طرز (آرچ سسٹم) پر ہے، سامنے کے رُخ ۱۵ در ہیں،

پیمائش | مسجد کا طول اندر سے ۸ ۱۴ فیٹ اور عرض ۵۲ فیٹ ہے، ہر دیوار کا اُتار ۵ فٹ اس کے علاوہ ہے، چھت کی بلندی ۵۱ فٹ ہے، جو ۰۰ ، چوکور ستونوں پر قائم ہے، ہر ستون کا حجم $1\frac{1}{2} \times 1\frac{1}{2}$ فٹ اور اونچائی $5\frac{1}{2}$ فیٹ ہے، یہ ستون منقش کرسیوں پر قائم ہیں، کئی ستون تو ایک ہی سالم پتھر کو تراش کر بنائے گئے ہیں، جہاں دو پتھروں کو جوڑا گیا ہے وہاں ذرا بھی شگاف دکھائی نہیں دیتا، بلکہ ایسا نظر آتا ہے، مسجد کے طول میں ۲۵ دالان اور عرض میں ۱۵ دالان ہیں، شمالی جنوبی دیواروں میں ہر دالان کے سرے پر تقریباً ۷ فٹ اونچے محرابی روشن دان ہیں۔

اور صنعت | جامع مسجد کی چھت دوسری مساجد کی طرح گنبد دار نہیں بلکہ اوپر سے ہموار اور نیچے سے محرابی ہے، اندر سے ہر ستون کے بالائی حصے کو محرابی خم دے کر اس طرح ملا دیا گیا ہے کہ ہر طرف

اپ ہی محراب بن گئے ہیں اور اوپر چھت قائم ہو گئی ہے، محرابوں کے کٹاؤ اور جوڑ میں اس قدر صفائی اور یکسانیت ہے کہ معلوم ہوتا ہے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے، جسے دیکھکر انسان دنگ رہ جاتا ہے، اس خصوصیت کی بنا پر یہ مسجد ہندوستان کی قدیم عمارتوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ پوری عمارت میں کہیں بھی کوئی ایسا سوراخ یا شگاف نہیں جس میں کوئی پرندہ آشیانہ بنا سکے۔

منبت کاری | سنگ مرمر میں بیل بوٹے کندہ کرنا اور پچیکاری کا کام آسان ہے، اور اس کے عالی نمونے بہت سی عمارتوں میں دیکھے جاسکتے ہیں، لیکن فولاد کی طرح سخت پتھروں میں منبت کاری اور باریک نقش و نگار کندہ کرنا بہت مشکل ہے، یہ نادر صناعی اس جامع مسجد ہی میں نظر آتی ہے، مغربی دیواروں کی کمانوں میں جو قد آدم محرابیں ہیں ان کے حاشیے پر بہت عمدہ بیل بوٹے تراشے گئے ہیں، جن کی نوک پلک اور صفائی کو دیکھکر انسان کچھ دیر کے لیے عالم حیرت میں گم ہو جاتا ہے، خصوصاً وسطی محراب کی آرایش دیکھنے کے لایق ہے، اس کے علاوہ سامنے کے رخ کی کمانوں کے اوپر ہر ستون کے بالائی حصے میں نہایت خوبصورت سورج مکھی کے پھول بنائے گئے ہیں، جو عمدگی اور نفاست سے تراشے گئے ہیں کہ زمانۂ حال کا کوئی کاریگر اس صفائی سے شاید ہی بنا سکے، بلا مبالغہ یہ خارا تراشی کا وہ نمونہ ہے جو دیکھنے والوں سے خراج تحسین حاصل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

کتبے | مسجد کے اندر فاروقی عہد کے تین کتبے ہیں، پہلا کتبہ عربی میں بخط کوفی نہایت خوشخط تحریر ہے، یہ منبر کے بیچ والی محراب کے اوپر ہے، اس میں قرآن کی آیت اور اس مفہوم کی حدیث ہے کہ خدا بانی مسجد کو بہشت میں قصر عالی عطا فرمائے گا، اس کے بعد مسجد کے تعمیر کا ذکر ہے، اور بانی مسجد کا لقب عادل شاہ بن مبارک شاہ تحریر ہے، اس کے بعد جامع مسجد کی تعریف و توصیف لکھی ہے، آخر میں تعمیر کی ابتدا ۹۹۷ھ درج ہے اور کتبہ نویس کا نام مصطفےٰ ابن ملا محمد خطاط کندہ ہے۔

دوسرا کتبہ مسجد کے شمالی کونے کی محراب پر ہے، یہ بھی عربی میں بخط طغرا تحریر ہے اس میں قرآن مجید کی آیت اور حدیث نبوی ہے، اس کے بعد سلاطین فاروقیہ کا شجرۂ نسب اور آخر میں مسجد کی ابتدائے تعمیر کا سنہ درج ہے،

تیسرا کتبہ اسی محراب میں عربی تحریر کے نیچے ہے، جو سنسکرت میں ہے، اس میں کلام کی آیت اور حدیث کا ترجمہ ہے، اس کے بعد شاہان فاروقیہ کا شجرۂ نسب اور آخر جامع مسجد کے سنگ بنیاد رکھنے کا وقت، دن، مہینہ، سمبت بکرمی اور شکے راس گ اور پل نہایت تفصیل سے تحریر ہے،

اس کتبے سے مسلمان بادشاہوں کی مذہبی رواداری کا ثبوت ملتا ہے، جنھوں نے زمانہ اقتدار میں اپنی ہمسایہ قوم کی سنسکرت زبان کو عبادت گاہوں میں جگہ دی،

اس کتبے میں سمبت بکرمی ۱۶۴۶ مطابق شکے ۱۵۱۱ تحریر ہے، اسیر گڑھ کی جامع میں بھی اسی طرح سنسکرت زبان اور رسم الخط میں کتبہ موجود ہے،

اس کے مقابلے میں آج اس جمہوری دور میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اقلیت کی زبا اور کلچر کے ساتھ تعصب رکھتے ہیں، ان کے لیے جامع مسجد کا سنسکرت کتبہ اس کا بین ثبوت ہے کہ مسلم فرمانرواؤں نے اپنی غیر مسلم رعایا کی زبان اور کلچر کا کتنا لحاظ رکھا ہے،

چوتھا کتبہ مسجد کے جنوبی مینار پر ہے، جو قلعہ اسیر کی فتح کے بعد اکبر بادشاہ کے حکم سے کندہ کیا گیا ہے، یہ فارسی زبان میں بخط نستعلیق ہے، اس میں اسیر کی فتح اور بادشاہ فا کی اطاعت کا حال تحریر ہے، آخر میں کتبہ نویس کا نام محمد معصوم معروف ولدیت سید ولیت مد ہے، اس کے بعد اکبری کی عہدِ روانگی کا حال ہے۔

کتبے کی عبارت حسب ذیل ہے:-

تاریخ الٰہی عبادت ہست از زمان جلوس حضرت شاہنشاہ ظل الٰہ اکبر بادشاہ غازی کہ

ز تائید جوان بخت خویش قلعہ آسیر کشاد ؎

گشت آباد اسیر از دان نامی

سنہ بشش بگفت الہ آباد!

تاریخ اار فرودین ماہ الٰہی ۴۵ء موافق ۵ رمضان ۱۰۰۹ھ ہجری

حضرت شاہنشاہ فلک بارگاہ ظل الٰہ بر بانپور ا قتدار رایات ظفر آیات ساختند و بہادر

خاں آمدہ بپابوس مشرف شد وا درا باتباع جاں بخشی کردند و قلعۂ آسیر فتح شد ؎

شاہ غازی جلال دیں اکبر | آں بتائید بخت قلعہ کشا

کرد فتح اسیر از اں نامی! | گفت بگرفت قلعہ اعلا

قائلہ وکاتبہ محمد معصوم المتخلص بہ نامی بن سید صفائی الترمذی اصلاً والبکری مسکناً و مدفناً

والمنتسب انا الی سید شیر قلندر ابن باباحسین ابدال السبزواری مولداً والقندھاری

موطناً حرّرہ تاریخ روز دوازدہم ماہ اردی بہشت ۴۶ء موافق ۲۶ شوال ۱۰۰۹ھ

بندگان حضرت عازم لاہور شدند ؎

فتح خاندیش و دکن چوں کرد شاہ | عازم ہندوستاں فی الفور شد

یک صد و نامی فزود آں گاہ گفت | شاہ والا عازم لاہور شد!

مینار | مسجد کے شمالی اور جنوبی کنارے دو فلک بوس مینار سر اٹھائے کھڑے ہیں، جو زبان حال سے بانی مسجد کی شان و شوکت کا اعلان کرتے ہیں، اور میلوں دور سے دکھائی دیتے ہیں، ان کی بلندی صحن سے گنبد کی چوٹی تک ۱۲۰ فیٹ ہے، ہر مینار کے چار حصے ہیں۔

پہلا حصہ صحن کی چھت تک چوکور ہے جس کا ہر ضلع ½ ۱۰ فیٹ ہے، دوسرا اور تیسرا حصہ ہشت پہلو ہے، ان کا ہر ضلع ½ ۴ فیٹ ہے، چوتھا حصہ ۱۶ پہل کا بنا ہوا ہے، یہ دونوں حصوں سے کچھ چھوٹا ہے، چھت سے اوپر میناروں کا بیرونی دور ۳۴ فیٹ ہے، ہر مینار کے اوپر چار چار در کے خوش قطع برجیاں ہیں، ان کے اوپر اینٹ چونے کے خوبصورت گنبد اور گنبدوں پر طلائی کلس ہیں، ان کی اونچائی ۵ فیٹ ہے، کلس کی شکل یہ ہے کہ چار گولے تلے اوپر رکھے ہیں، اور ان کے اوپر سنہری پان نصب کیے گئے ہیں، کلس کا دور اتنا ہے کہ دونوں ہاتھوں میں نہیں سما سکتے، مگر زمین سے چھوٹے چھوٹے پیالوں کی طرح نظر آتے ہیں،

دونوں میناروں کا توازن اور تناسب یکساں ہے، ان کی بلندی کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں جب کہ باربرداری کے آلات اور کرین وغیرہ نہ تھے، اس قدر وزنی پتھر کس طرح اوپر چڑھائے گئے ہوں گے، دونوں میناروں میں اوپر جانے کے لیے چکردار زینہ ہے، شمالی مینار کا زینہ کسی وجہ سے بند کر دیا گیا ہے، جنوبی مینار سے اوپر جا سکتے ہیں، مینار میں کئی جگہ روشندان ہیں، جن سے اوپر جانے والے کو ہوا اور روشنی ملتی ہے، مینار کے اوپر سے سارا شہر دکھائی دیتا ہے، سرسبز درختوں کے درمیان مکانوں کی سفید چھتیں عجیب خوشنما منظر پیش کرتی ہیں، کئی میل دور تک کا نظارہ یہاں سے ہوتا ہے، ۱۹۲۴ء میں جنوبی مینار کے چھجے کا ایک پتھر ٹوٹ گیا تھا، اس وقت کے محکمۂ آثار قدیمہ کے ایک انگریز افسر سرجان مارشل صاحب نے اپنی جیب خاص سے اس کی مرمت کرا دی تھی،

اس کے بعد شمالی مینار کے چھجے کا ایک بڑا پتھر زلزلے کے صدمے سے گر پڑا جو وزنی ہونے کے سبب سے اوپر نہیں چڑھایا جا سکتا تھا، اس لیے کاریگروں نے وہ حصہ سمنٹ سے ڈھال کر درست کر دیا،

صحن | مسجد سے ملا ہوا کشادہ صحن ہے جس کا طول شمالاً جنوباً ۹۰ فیٹ ہے، اس کے شمال و جنوب

میں پختہ دیواروں کا احاطہ ہے۔ یہ صحن بھی مسجد کے ساتھ ہی تعمیر ہوا تھا، اس لیے دو مرتبہ اس کی مرمت ہو چکی ہے، پہلی بار تیموریوں کے عہد میں خان خانان عبد الرحیم نے جب وہ یہاں کے صوبہ دار تھے، چونے اور گچ سے تعمیر کرایا تھا۔ مصنف مآثر رحیمی لکھتا ہے:۔

"صفۂ وسیع و منیع کہ با عرصۂ سماوات دم مساوات می زند در پیش طاق آں ساختہ بودند۔ بمرور ایام بساں بنائے عمر ظلمہ منہدم و ویران شدہ بود۔ بساختن و تعمیر امر فرمودند و بنوعے باتمام رسید کہ زبان قلم کسور اللسان از تعریف و توصیف آں عاجز ست" (ص ۳۰۳ ج ۲)

اس کے بعد جب دوبارہ خراب ہوا اور کئی جگہ سے پلاسٹر اکھڑ گیا تو ایک کمپنی میں حاجی کریم لوز محمد صاحب کے فرم نے اپنے خرچ سے از سر نو تعمیر کرایا،

اس مرتبہ یہ پالش کیے ہوئے سفید شاہ آبادی پتھروں سے جوڑا گیا، صحن کے درمیانی حصے میں سفید پتھروں کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے کالے پتھروں کے چوکور ٹکڑے جڑ دیے گئے جس سے صحن کی خوشنمائی میں اضافہ ہو گیا ہے، اس تعمیر میں دس ہزار روپئے صرف ہوئے، یہ تعمیر ۱۳۵۲ھ میں ہوئی تھی، شہر کے ایک مشہور شاعر حضرت خیالی مرحوم نے حسب ذیل تاریخ تعمیر لکھی تھی:۔

تعمیر فرش با وجب ۱۳۵۲ھ

پہنچتا ہے جب آکے وقت سعید	تو نیکی سے ہوتا ہے دل آشنا
عطا ہوتی ہے عمر میں خاص بات	ہمیشہ یہ نہی دور دوراں رہا!
ہوا سرخرو وہ خدا کے قریب	جو مسجد کا اک کام پورا کیا
خیالی ادا ہو گیا خیر سے	یہ حصہ تھا احکام اللہ کا

چمک رہے کے سجدوں کی صبح کو
سپہر بریں فرش سنگیں بنا

اس کے بعد سنہ ۱۳۴۱ھ میں صحن کا نچلا حصہ ایک دوسرے میمن سیٹھ محمد ہاشم صاحب نے بنوایا، یہ معمولی شاہ آبادی پتھروں سے جوڑا گیا ہے، صحن اتنا وسیع ہے کہ ایک ہی وقت میں اس میں پانچ ہزار آدمی باجماعت نماز ادا کر سکتے ہیں،

فاروقی بادشاہوں کے عہد میں شہر میں آب رسانی کا کوئی انتظام نہ تھا، لوگ عام طور سے کنوئں کا پانی استعمال کرتے تھے، عبد الرحیم خان خاناں نے اپنی صوبہ داری کے زمانے میں اس کمی کو محسوس کرکے شہر سے چار میل دور پہاڑیوں میں میٹھے پانی کے قدرتی چشمے دریافت کیے اور وہاں سے زیر زمین نہروں کے ذریعہ جامع مسجد تک پانی لایا گیا اور یہاں سے مٹی کے نلوں سے شہر کے مختلف حصوں سے پہنچایا گیا، مآثر رحیمی میں اس نہر کی تعمیر کا حال اس طرح لکھا ہے:-

"از لعل باغ تا در مسجد جامع کہ در جنب میدان برہانپور واقع ست کہ وسط حقیقی این شہر ست بنایان چابک دست و معماران صاحب خطرت را گماشتند کہ بنگ ... دیگچ دا آبک عمر و مجری آں را بصد استحکام جوئے شیر و نہر اخیر ترتیب دادند، حقا کہ اگر فرہاد زندہ بودے اعتراف کردے کہ ناسخ جوئے شیر ست ۔ ودر مسجد جوئے نمار انیان و بنائے عالی مکان بنا نہادند" (ص ۲۶)

مولانا فرید الدین منعم دہلوی نے اس نہر کی تکمیل کی تاریخ لکھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنہ ۱۰۲۴ھ میں بنکر تیار ہوئی تھی،

سپہ سالار گیتی خان خاناں ستون بارگاہ و شہر یاری

کف رادش پل رود سوال ست — نم دستش ز جود ابر بہاری
روان کردہ بشہر اندر تمنا ے — کزو سیراب شد سوتی و داری
در ایام جہانگیر جہان بخش — کہ از فرقش بنازد تا جداری
گرفت انجام کار چشمہ خیر — مبادا انجام جریانش زباری
بود چون دولت نامیش لا زال — بود تا دور ہاے روزگاری

دل دانا چو تاریخش بہ پرسید !
جوابش داد ہاتف ۔ خیر جاری
۱۰۲۴ھ

مسجد میں ایک حوض فاروقیہ زمانے کا موجود تھا ، خان خانان نے اسی نمونے کا دوسرا حوض بنوایا ، یہ دونوں حوض صحن کے شمالی اور جنوبی سرے پر ہیں ، ان کا طول و عرض ۳۰ × ۳۰ فیٹ مربع ہے ، پہلے یہ ہر وقت پانی سے بھرے رہتے تھے ، جنوبی حوض کے پاس ہی پانی کا خزانہ تھا ، جہاں سے قدیم نلوں کے ذریعے حوض میں پانی آتا تھا ، جو صحن کی تعمیر کے وقت توڑ دیا گیا ،

۱۹۲۳ء میں میونسپل کمیٹی نے اسی حوض میں ایک نل لگوا دیا تھا لیکن سطح ٹھیک نہ ہونے سے پانی کم آنے لگا ، اور اس کی پہلی افراط خواب و خیال ہو گئی ، آج مسجد میں پانی کی قلت دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے ، جس جامع مسجد کی بدولت آج بھی تمام شہر کو پانی مل رہا ہے ، اسی جگہ پانی کی کمی ہے ، کاش میونسپل کمیٹی اپنی ذمہ داری محسوس کرتی ،
صحن کی تعمیر کے وقت سیٹھ محمد ہاشم صاحب نے حوضوں کے وضوگاہ پر سائبان لگوا دیا ، تاکہ بارش اور موسم گرما میں نمازیوں کو وضو کرنے میں تکلیف نہ ہو ۔

مزارات | دونوں حوضوں کے درمیان صحن سے ملا ہوا ایک مستطیل چبوترہ ہے جس پر موجود

پیش امام سید احکام اللہ صاحب کے والدین اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کے مزارات ہیں، اس چبوترے اور حوض کے گرد آہنی سلاخوں کا قد آدم کٹہرا ہے اور اندر جانے کے لیے تین جگہ لوہے کے پھاٹک لگے ہوئے ہیں،

حجرے | مسجد کے احاطے میں تینوں طرف ۲۲ حجرے ہیں جو اینٹ اور چونے سے تعمیر کیے گئے ہیں، ہر ایک کا طول وعرض ۱۵ × ۱۵ فیٹ مربع اور اونچائی تقریباً ۱۲ فیٹ ہے، یہ مغلیہ عہد حکومت میں بنائے گئے تھے، کیونکہ عادل شاہ کو تعمیر مسجد کے بعد کچھ ایسی مہمات پیش آئیں کہ وہ عمارت کے شایان شان حجرے اور صدر دروازہ تعمیر نہ کروا سکا،

بادشاہ مذکور کی وفات کے بعد جب یہاں مغلوں کی عملداری ہوئی، اور عبد الرحیم خانخانان صوبہ داری پر مامور ہوا، اس وقت اس نے اپنے پیر و مرشد میر محمد نعمان اکبر آبادی کی نگرانی میں حوض، حجرے اور دروازہ وغیرہ بنوایا، میر صاحب اپنے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کی تبلیغ و اشاعت کے لیے برہانپور میں مقیم تھے، مدت تک جامع مسجد کی امامت کرتے رہے،

عرصہ دراز سے بے مرمت پڑے رہنے کی وجہ سے ان حجروں میں سیل ہوگئی ہے اور بعض کی چھتیں ٹپکنے لگی ہیں، شمالی جانب کا ایک حجرہ توڑ کر راستہ نکالا گیا ہے، چند حجروں کو دوکانداروں نے کرائے پر لے رکھا ہے، باقی خالی پڑے ہیں، اگر ان کی نئے سرے سے مرمت ہوجاتی تو مسجد کے اخراجات بآسانی پورے ہوسکتے تھے، فی الحال ۲۵-۳۰ روپیہ ماہانہ وصول ہوتا ہے جس سے روشنی اور صفائی کا خرچ، اور موذن کی تنخواہ بشکل دی جاتی ہے، چند سال سے میونسپل کمیٹی نے ان حجروں پر ہاؤس ٹیکس لگا کر مزید بار ڈال دیا ہے، افسوس ہے کہ اتنی بڑی عمارت کے لیے اخراجات کا کوئی معقول انتظام نہیں، اور نہ موجودہ پیش امام مولانا سید احکام اللہ صاحب کو کوئی تنخواہ ملتی ہے، آپ کے پردادا حافظ سید کرم اللہ صاحب بخاری

کے زمانے سے مسجد کی نگرانی آپ ہی کے خاندان میں چلی آتی ہے، موصوف ۱۹۱۱ء سے جامع مسجد کی امامت اور خدمت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

صدر دروازہ | احاطے کی مشرقی دیوار کے بیچ میں صدر دروازہ ہے، یہ بھی حجروں کے ساتھ ہی بنایا گیا تھا۔ اس کی دہلیز کا طول ۳۴ فیٹ اور عرض ۱۲ فیٹ ہے، اس میں ابھی تک جہانگیری زمانے کے لکڑی کے کواڑ لگے ہیں۔ یہ دروازہ عمارت کی بلندی اور شان کو دیکھتے ہوئے بہت چھوٹا یعنی صرف ۱۱ فیٹ اونچا تھا۔ ۱۲۸۲ھ میں جب بھوپال کی بیگم نواب سکندر جہاں حسنا مع اپنی والدہ کے بھوپال سے بمبئی حج کے لیے جانے لگیں تو چند دن برہان پور میں قیام کیا تھا، انھوں نے دوسرا عالیشان دروازہ بنانے کا حکم دیا، اور اس کے لیے دو ہزار روپیہ اپنی جیب خاص سے عطا فرمائے۔ اور سرکاری اہلکاروں کی نگرانی میں ۱۲×۸ فیٹ زمین قدیم دروازے سے آگے بڑھا کر یہ شاندار محرابی پھاٹک تعمیر ہوا جس کی بلندی تقریباً ۲۵ فٹ ہے، یہ پتھر سے جوڑا گیا ہے، اور اس کی چھت منقش ہے، تاریخ حسب ذیل مصرعے سے برآمد ہوتی ہے:

مثل درِ فردوس معلی آباد
۱۲۸۲

اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا دروازہ جنوبی رخ پر بھی ہے، جس کا راستہ بازار کی طرف نکلتا ہے، آج یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ اتنی بڑی عمارت کے مصارف کا کوئی بھی بندوبست نہیں، ممکن ہے شاہان وقت نے کچھ اوقاف مسجد کے لیے کیے ہوں لیکن آج ان کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ زمین کے پیچھے کی زمین کے کچھ کاغذات تھے، جس کے حاصل کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی، مگر مقامی مسلمانوں کے آپس کے اختلافات نے کامیابی نہ ہونے دی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ زمین نزدل میں نکل گئی۔ مسجد کے جنوبی حصے کی زمین کو میونسپل کمیٹی نے خرید کر مولانا آزاد کے نام پر ایک پارک بنا دیا، پھر چند سال بعد کسی مصلحت کی بنا پر اس پارک کو ختم کرکے

اس کی جگہ پختہ دکانیں تعمیر کر دی گئیں۔

تزول والوں نے بھی مسجد کی عقبی اور شمالی دیوار سے ملا کر کئی دکانیں بنا کر کرایہ پر دیدی ہیں، اس طرح انگریزوں کے زمانے سے مسجد کے اطراف میں جو محفوظ جگہ چھوڑ دی گئی تھی، اب تینوں طرف سے دوکانوں نے اس کا محاصرہ کر لیا ہے، جامع مسجد کے جنوبی سرے پر چند حلوائیوں کی دوکانیں ہیں، جو بالکل دیوار سے ملی ہوئی ہیں، ان کے دھوئیں سے عمارت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ایک مسجد کمیٹی بنائی گئی تھی، پھر معلوم نہیں کیوں اس کا خاتمہ ہوگیا، فی الحال جامع مسجد کے میناروں کا بالائی حصہ مرمت طلب ہوگیا ہے، اور بعض جگہ پتھروں کے جوڑ اکھڑنے لگے ہیں جس کی مرمت کے لیے کافی رقم درکار ہے،

ہم محکمۂ آثار قدیمہ سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ دیگر تاریخی عمارتوں کی طرح جامع مسجد برہان پور کو بھی اپنی نگرانی میں لے لے تاکہ فن تعمیر کا یہ نادر نمونہ جو اپنے آرٹ اور سنگ تراشی کے لحاظ سے بے مثل ہے، محفوظ رہ سکے۔

علم بدیع کا موجد

(ابن المعتز)

از جناب اعتشام احمد صاحب ندوی ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علم بدیع عربی تنقید کا ایک اہم موضوع ہے، بدیع کے معنی کوئی نئی اور انوکھی چیز پیدا کرنے کے ہیں، اس لفظ کو "اصطلاح" کی حیثیت ابو تمام کی شاعری سے حاصل ہوئی، ابو تمام نے قدیم شعراء کے مضامین اور ان کے حدود و معینہ سے آگے بڑھ کر اپنی شاعری میں نئے مضامین باندھے، اور اپنے خداداد ذہن و فکر سے نئی نئی ترکیبیں استعمال کیں، یہ نئے مضامین اور نئی ترکیبیں ابو تمام کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی موضوع اختلاف رہیں، اس جدت کا نام عربی تنقید میں مذہب بدیع یا بدیع مکتب فکر رکھا گیا،[۱] چونکہ اس طرز شاعری نے قدیم عربی اسلوب شاعری سے اختلاف کیا تھا، اس کے علاوہ اس میں کہیں کہیں تکلف سے فلسفیانہ اور پیچیدہ اسلوب بیان، تعقید لفظی و معنوی اور مشکل مضامین بھی ہوتے تھے، اس لیے بعض ناقدوں نے اس طرز پر کڑی تنقیدیں کیں، بعض نے یہ ثابت کیا کہ ابو تمام کے یہاں جو جدید باتیں ملتی ہیں وہ در اصل جدید نہیں ہیں، بلکہ قدماء کے یہاں بھی موجود تھیں، چنانچہ ابن المعتز نے اپنی کتاب "کتاب البدیع" میں ثابت کیا ہے کہ علم بدیع تو قرآن مجید، احادیث نبوی اور قدیم کلام عرب میں بھی موجود ہے، تیسری اور چوتھی صدی کے اکثر ناقدوں نے ابو تمام پر "سرقہ"

۱؎ النقد المنہجی عند العرب تالیف ڈاکٹر محمد مندور، مطبوعہ نہضۃ مصر ص ۶۲ - ۶۳

کا الزام لگایا، یہی وجہ ہے کہ سرقہ کا تفصیلی ذکر ہر عربی تنقید کی کتاب میں ملتا ہے، اور اس کو عربوں نے مستقل فنی و تنقیدی مسئلہ بنا کر پیش کیا ہے[1]،

اسی طرح کے اختلافات متنبی کی شاعری سے بھی پیدا ہوئے، کیونکہ اس نے بھی قدیم عرب شعرا سے ہٹ کر ایک نیا اسلوب اختیار کیا تھا جس میں یونانی فلسفہ کا اثر بھی موجود تھا،

ابو تمام کے بعد بھی اس کے اور اس کے معاصر البحتری کے بارہ میں عرب ناقدین باہم مختلف الرائے رہے، اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ علم بدیع اور اس کی بحثیں تیسری صدی میں موجود تھیں، مگر اس موضوع پر کسی نے نہ کوئی کتاب لکھی تھی اور نہ اس کا پورا مطالعہ ہی کیا تھا، ابن معتز پہلا شخص ہے جس نے علم بدیع کا سائنٹفک مطالعہ کیا، اور اس کو نہ صرف مدوّن کیا، بلکہ اس کی بنیادوں کو علمی نظریات سے مستحکم کر دیا، اس طرح علم بدیع کی تدوین اور علمی بنیادوں پر اس کی تاسیس کی فضیلت اس کے حصہ میں آئی،

علم بدیع کی اقسام اور تعریفات انھوں نے کہاں سے حاصل کیں؟ یہ ایک اہم مسئلہ ہے؛ اس میں شبہ نہیں کہ ابو تمام کی شاعری سے متعلق اختلافات سے اس کو اس سلسلہ میں کافی مدد ملی ہوگی، مگر مسائل کو پوری شرح و بسط سے پیش کرنا، اصطلاحات کی ایجاد اور تعریفات کا تعین کچھ آسان کام نہیں ہے، قدامہ بن جعفر کی کتاب "نقد الشعر" کتاب البدیع سے ہر حیثیت سے بہتر اور مکمل ہے، یونانی اثرات صاف ظاہر ہیں، مگر ابن معتز، ارسطو اور جالینوس وغیرہ کا ذکر نہیں کرتا، ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ اسی زمانہ میں حنین بن اسحٰق نے کتاب الخطابۃ (Rhetoric) کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، ممکن ہے کہ ابن معتز نے اسی سے استفادہ کیا ہو[2]، اور ڈاکٹر مندور یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ابن معتز ان تمام اقسام بدیع میں سے کسی کا موجد نہیں ہے، ان میں سے چار قسمیں

---

[1] الثرات الادبیۃ الیف بدوی طبانہ مطبوعہ مصر [2] ملاحظہ ہو نقد النثر تالیف قدامہ مطبوعہ دار الکتب المصریۃ

اس نے ارسطو سے لی ہیں، اور ایک جاحظ سے۔[1]

کتاب البدیع کے اصل عناصر پانچ ہیں، یعنی طباق، جناس، استعارہ، "رد الاعجاز علی ما تقدمہا" اور "المذہب الکلامی"۔ ان کے علاوہ تیرہ[2] محاسن شعری بھی ابن المعتز نے بیان کیے ہیں، المذہب الکلامی کے بارے میں ابن معتز کا یہ اعتراف کہ یہ قسم اس نے جاحظ سے لی ہے۔[3]

ابن معتز کا خیال تھا کہ علم بدیع قدیم عربوں کا سرمایہ ہے، جس کو انھوں نے اپنی عقل و فہم سے حاصل کیا تھا، اور ابو تمام نے اس پر خاص توجہ کی تھی، اس کی نظر میں اس جدید مکتب فکر کی تین بنیادیں تھیں، (۱) استعارہ شعر کی بنیاد ہے (۲) طرز ادا کا اثر شعر کی ظاہری شکل پر زیادہ اور اس کے جوہر پر کم پڑتا ہے، اسی سلسلہ میں وہ طباق، جناس اور رد اعجاز وغیرہ کو پیش کرتا ہے (۳) عقل کا استعمال شعر میں ضروری ہے، المذہب الکلامی کا مقصد یہی ہے۔[4]

ابن معتز کی اہمیت کا راز اسی میں ہے، اس نے مذہب بدیع کی امتیازی خصوصیات تلاش کیں اور ان کو مرتب شکل میں ایک طرز فکر کے طور پر پیش کیا

اس نے استعارہ، طباق، جناس اور رد اعجاز کی تعریف وہی کی ہے جو ارسطو نے کی ہے،[5] قدامہ نے انھیں اصطلاحات کا ترجمہ بالکل دوسرے الفاظ میں کیا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارسطو دونوں کے پیش نظر تھا،

کتاب البدیع میں ابن معتز نے نہ صرف مثالیں عربی شاعری سے پیش کی ہیں، بلکہ اشعار پر تنقید بھی کی ہے، اور اس کی کئی مثالیں موجود ہیں،[6] ابن معتز کے تمام مباحث پر غور کرنے سے مندرجۂ ذیل تنقیدی اشارے ملتے ہیں،

علم بدیع کوئی محدود شے نہیں، جس میں اضافہ ممکن نہ ہو، چنانچہ ابن معتز کے بعد قدامہ، ابو ہلال عسکری

۱؎ النقد المنہجی عند العرب ص ۷۰ ۲؎ کتاب البدیع ص ۵۲ ۳؎ النقد المنہجی عند العرب ص ۷۴ ۴؎ ایضاً ص ۷۵ ۵؎ کتاب البدیع مطبوعہ اسکو ص ۵۳۔ ۵۴ ۶؎ ایضاً ص ۵۸

اور آخر میں اسامہ بن منقذ وغیرہ نے علم بدیع میں بہت سی اقسام کا اضافہ کیا،

کتاب البدیع میں ابن معتز نے محاسن شعری کو بھی شامل کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ علم بدیع نقد شعر سے قریبی تعلق رکھتا ہے، جاحظ ایک جگہ لکھتا ہے کہ لفظ بدیع بلاغت کی ہر قسم کو شامل ہے،[1] نثر اور نظم میں علم بدیع کے اقسام کے استعمال کے بغیر بھی حسن ممکن ہے۔[2]

واقعہ یہ ہے کہ بعد میں عربوں نے یہ اصول فراموش کر دیا ورنہ بعد کے دور میں علم بدیع کے استعمال میں اتنا غلو نہ ہوتا کہ زبان میں جمود کی نوبت آتی،

شاعری میں معنی کی اہمیت بہت زیادہ ہے، اگر کسی شعر میں علم بدیع کے تمام محاسن پائے جاتے ہوں لیکن معنی کا عنصر کمزور ہو تو وہ اچھا شعر نہیں کہلا سکتا،[3]

علم بدیع کا استعمال اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی، اس کے لیے عقل اور ذوق کی رہنمائی ضروری ہے،[4] نثر و نظم کے محاسن کا احاطہ ممکن نہیں ہے، اس میں اضافہ کی گنجائش ہمیشہ باقی رہے گی،[5]

بدیع اور اس کے اقسام جس طرح محدثین کے یہاں پائے جاتے ہیں، اتنے قدما کے یہاں بھی ہیں[6]

ابن معتز اور قدامہ بن جعفر

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، ابن معتز اور قدامہ بن جعفر دونوں نے روشنی تو ارسطو سے لی ہے، مگر دونوں کا انداز فکر بالکل مختلف ہے، دونوں نے ارسطو سے جو اصطلاحات اخذ کی ہیں ان کے مختلف نام رکھے ہیں، ایک اصطلاح کو ابن معتز "التجنیس" کہتا ہے، تو قدامہ اسی کو "التکافو" سے تعبیر کرتا ہے، ذیل کے نقشہ سے یہ فرق آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے،

ابن معتز کی وضع کردہ اصطلاحات	قدامہ کی وضع کردہ اصطلاحات
الافراط فی الصفۃ	الغلو
اعتراض کلام فی کلام لم یتم معناہ	التتمیم

۱؎ البیان والتبیین ج ۳ ص ۲۱۳ ۲؎ کتاب البدیع ص ۱ ۳؎ ایضاً ص ۵۸ ۴؎ ایضاً ابواب لیس من الکلام والشعر ۵؎ ایضاً ص ۱ ۶؎ ایضاً مقدمہ مولف۔

الطباق	المطابق والمجانس
التجنیس	التکافؤ

ابن معتز اور قدامہ دونوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے عربی تنقید میں بدیع اور اس کے اقسام پر غور کیا، اور اپنی کتابوں میں ان کو استعمال کرکے عربی ادب میں ان کو نمایاں کیا۔ محاسن شعری کو بھی ان دونوں نے خاص اہمیت دی اور اس کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ابن معتز کی کوشش محدود اور جزئی ہے، اور قدامہ بن جعفر کی پورے نقد الشعر کو محیط ہے۔

عربوں کا شغف ابن معتز سے — ابن معتز سے عربوں کو ایک خاص تعلق اس لیے ہے کہ اس نے علم بدیع کا مرجع عربوں ہی کے ادب کو قرار دیا، اس کے برعکس قدامہ کے یہاں یہ تحدید نہیں ہے بلکہ وہ کہیں کہیں ارسطو و جالینوس وغیرہ کے حوالہ بھی نقد الشعر میں دے دیتا ہے، اسی لیے عربوں کو جہاں ابن معتز کی اصطلاح مل جاتی ہے، وہاں قدامہ کی اصطلاح کو چھوڑ دیتے ہیں[۱]۔

ڈاکٹر مندور کا یہ نظریہ بالکل غلط ہے کہ ابن معتز کی اصطلاحات سے عربی تنقید کی بنیاد پڑی، اور اس کی وضع کردہ اصطلاحات نے آئندہ اصول کی شکل اختیار کرلی، یہ محض ایک حسن ظن اور مفروضہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ معدودے چند اصطلاحات پر فن تنقید کی بنیاد نہیں پڑتی اور حقیقت قدامہ بن جعفر کی کتاب نقد الشعر عربی تنقید کی اصل بنیاد ہے، اس میں نقد شعر کے ہر ہر پہلو پر بحثیں موجود ہیں، جو مجبوراً عربوں کو قبول کرنا پڑیں، کیونکہ ان کے پاس اس کتاب سے بہتر کوئی تنقیدی سرمایہ نہ تھا۔

ڈاکٹر مندور کا یہ نظریہ بھی محض تعصب پر مبنی ہے کہ جہاں ابن معتز کے نظریات کا قدامہ سے ٹکراؤ ہوا وہاں ابو ہلال عسکری نے ابن معتز کے نظریات کو ترجیح دی[۲]۔

واقعہ یہ ہے کہ عربوں کو شروع ہی سے اپنے ادب اور اپنی شاعری پر فخر تھا، اور وہ

---

[۱] النقد المنہجی عند العرب ص ۶۶ - ۶۷ [۲] ایضاً ص ۱۴۳

اس سلسلے میں کسی دوسرے کا احسان ماننے کے لیے تیار نہ تھے، اسی لیے انھوں نے یونانی خیالات کو عربی میں بہت کم منتقل کیا، اور عربی ادب و شعر پر اسی لیے اس کے اثرات بھی کم پڑے، اور اسی بنا پر وہ قدامہ کی فضیلت کے قائل نہیں ہیں، اس کے مقابلہ میں ابن معتز، آمدی اور قاضی جرجانی وغیرہ کو زیادہ بڑا ناقد شمار کرتے ہیں۔[۱]

اس سلسلہ میں ڈاکٹر بدوی طبانہ کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ ابن معتز کی وجہ ترجیح صرف یہ ہے کہ اس نے قدامہ سے پہلے اپنی کتاب تصنیف کی اور عرب عموماً متقدم کو ترجیح دیتے ہیں،[۲] اگر یہ کلیہ صحیح ہوتا تو پھر وہ "قواعد الشعر" تالیف ابوالعباس ثعلب کی اصطلاحات کو ترجیح دیتے جو ابن معتز کی کتاب سے بھی پہلے کی تصنیف ہے، اور ابن خلدون، ابن رشیق قیروانی کی کتاب "العمدہ" کو جو پانچویں صدی کی تصنیف ہے، سب سے بہتر قرار نہ دیتے، کیونکہ اس سے پہلے متعدد تنقیدی کتابیں موجود تھیں،

علم بدیع کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ اس سے عربی ادب کو نقصان پہنچا اور وہ اس میں جمود کا باعث بنا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بدیع کی ایجاد ان ذہنی ترقیوں کا نتیجہ تھی جو عصر عباسی میں عربوں نے کیں، ادب و تنقید میں علم بدیع عربوں کی فکر کا بہترین مظہر ہے، بدیع عربی تنقید کے ان بنیادی عناصر میں سے ایک اہم عنصر ہے، جس کو تمام ناقدین عرب نے اپنی کتابوں میں موضوع بحث بنایا ہے، اکثر ناقدوں نے بدیع کی اقسام ہی کے ذریعہ شعراء کے محاسن کلام کو نمایاں کیا ہے، چنانچہ آمدی نے اپنی کتاب "الموازنۃ بین ابی تمام والبحتری" اور قاضی جرجانی نے اپنی کتاب "الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ" میں علم بدیع ہی کو معیار بنا کر شعراء کے کلام کو جانچا ہے، اور ان کی شاعرانہ عظمت نمایاں کی ہے۔

---

[۱] النقد المنہجی عند العرب ص ۸۹ [۲] قدامہ بن جعفر والنقد الادبی تالیف بدوی طبانہ ص ۲۰۳ [۳] ملاحظہ ہو مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر باب علوم اللسان العربی ص ۵۸۵

علم بدیع فی نفسہ مفید ہے، البتہ اس کا غلط اور بکثرت استعمال یقیناً بُرے نتائج پیدا کرتا ہے، علم بدیع تو اصل میں حسنِ کلام کو جانچنے اور پرکھنے کا ایک ذریعہ تھا، لیکن پانچویں صدی ہجری اور اس کے بعد کے طویل عرصہ میں ادبا، و شعراء عمداً بدیع کی اقسام کو شعر میں سمونے کی کوشش کرتے رہے جس سے ادب عربی کو سخت نقصان پہنچا اور اس کے نتیجہ میں ایک ایسی زبان وجود میں آئی جس میں الفاظ زیادہ اور معانی کم یا مفقود ہوتے تھے۔

اہل نظر ادیب اور نقاد جب ادب و شاعری کے محاسن کے متعلق اظہار رائے کرتے ہیں تو اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہوتا کہ ان محاسن کو بہ تکلف کلام میں پیش کیا جائے، ابن معتز، قدامہ ابن جعفر اور ابو ہلال عسکری وغیرہ نے علم بدیع پر جو فکر انگیز بحثیں کیں اور انھیں شعر و ادب کا بہترین مظہر قرار دیا، اس سے یہ غلط فہمی عام ہوگئی کہ ان محاسن کا تتبع ضروری ہے، اور ان کے بغیر شاعری شاعری نہیں ہے، حالانکہ خود ابن معتز نے لکھا ہے کہ علم بدیع کے بغیر بھی کلام میں حسن ممکن ہے، علم بدیع کا استعمال اگر فطری طور پر ہو تو وہ حسن ہے، لیکن اگر بہ تکلف اسکو ٹھونسا جائے تو عیب بنجائے گا، اور کلام میں خوبی باقی نہ رہے گی، اس لیے اول درجہ کے اصحاب فن کبھی ان چیزوں کی تقلید نہیں کرتے، ورنہ ان کے کلام سے جدت و ندرت مفقود ہو جائے، علم بدیع اور اس قبیل کے دوسرے علوم مثلاً بیان اور معانی وغیرہ کی پابندی درحقیقت درجہ دوم کے وہ شعرا کرتے ہیں جو فنی حیثیت سے ناقص ہوتے ہیں[1]۔

ابن معتز اور محاسن شعر ابن معتز نے محاسن شعر پر جو بحث کی ہے، اس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے، واقعہ یہ ہے، ان کی تیرہ اقسام میں سے تشبیہ، غلو، کنایہ اور حسن تضمین وغیرہ کو فن تنقید میں غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے، جیسا کہ تنقید کی ان کتابوں سے معلوم ہوتا ہے جو چوتھی

---

[1] النقد المنہجی ص ۵۳،

اور پانچویں صدی ہجری میں تصنیف کی گئیں، شعر کے محاسن بے شمار ہیں، ابن معتز نے مذکورہ بالا محاسن کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ کسی کو بھی یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے کہ جتنے محاسن اس نے تلاش کیے ہیں اس سے زیادہ نہیں ہیں[1] ابن معتز سے قبل بھی ابو العباس ثعلب ابن قتیبہ اور ابن سلام وغیرہ نے تنقیدی کتابیں لکھی تھیں، مگر ان میں سے کسی نے نہ شعر کے محاسن سے بحث کی ہو اور نہ اس کو فکر کا موضوع قرار دیا ہے، اس حیثیت سے ابن معتز کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس نے عربی شاعری کی تنقید کے لیے ایک نئی راہ کھولی،

ابن معتز کے ادبی اور تنقیدی ذوق کا اندازہ ان کی مشہور کتاب "طبقات الشعراء" سے بھی ہوتا ہے، اس کے بارہ میں عبدالستار فراج نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ ابن معتز طبقات الشعراء میں محض ایک راوی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ایسا شائق شعر و ادب بن کر سامنے آتا ہے، جو اپنے جذبات حسن و قبح کو چھپا نہیں سکتا[2]

نظم و نثر دونوں میں یکساں بلکہ بہت مشکل سے پیدا ہوتا ہے، عام طور سے ادباء کے اشعار بے جان ہوتے ہیں اور شعراء کی نثر بے روح لیکن دونوں صلاحیتوں کا اجتماع جس شخص میں ہو جائے تو یہ اس کے عظیم فنکار ہونے کی دلیل ہے،[3]

سب سے بہتر کلام وہ ہے کہ سامع اسے سنکر یہ سمجھے کہ وہ بھی اس طرح کہہ سکتا ہے، مگر جب کہنا چاہے تو عاجز رہ جائے، یہ خیال ابن قتیبہ نے بھی الشعر والشعراء میں ظاہر کیا ہے، مگر ابن معتز نے اس کا ایک اصطلاحی نام "سہل ممتنع" بھی تحریر کر دیا ہے[4]

ایک جگہ ابن معتز نے ایک اہم تنقیدی مسئلہ سے بحث کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ یہ عام رجحان ہے کہ جس شعر میں شوخی وبے باکی اور بے حیائی ہو اس کو لوگ فوراً ابونواس کیجانب منسوب

---

[1] کتاب البدیع ص ۵۸ [2] طبقات الشعراء تالیف ابن المعتز ص ۵ [3] طبقات الشعراء ص ۲۰۰ [4] ایضاً ص ۲۷۷،

کر دیتے ہیں، بالکل اسی طرح کہ جس شعر میں لیلیٰ کا ذکر ہو اس کو بلا تکلف مجنوں بن عامر کی جانب منسوب کر دیتے ہیں "ابن معتز کے نزدیک یہ عوام کا طرز ہے اہل فکر کا نہیں"[۱]

طبقات الشعراء سے اس کی ایک اور خصوصیت کا بھی علم ہوتا ہے، اس نے اپنے پیش رو ناقدین ابن سلام اور ابن قتیبہ کی طرح تمام شعراء کا ذکر اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے، بلکہ اپنے معاصرین کا انتخاب کیا ہے، اس جدت سے بڑا فائدہ ہوا کہ بعد کے اکثر مصنفین نے اس کی تقلید کی اور اپنی بحث دائرہ معاصرین تک محدود رکھا،

ابن معتز کی ایک دوسری کتاب "طبقات الشعراء" بھی ہے، جس میں صرف ان شعراء کا ذکر ہے، جنھوں نے عباسی خلفاء کی مدح میں قصائد لکھے ہیں

مذکورہ بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابن معتز اپنے دور کے ممتاز ناقدین میں تھا، اس کی نظریاتی تنقید کا مظہر کتاب البدیع ہے اور عملی تنقید کا طبقات الشعراء، اس کی عظمت اس سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ وہ تیسری صدی کا آدمی ہے، جبکہ عربوں کے علوم و فنون غیر مرتب اور غیر مدون تھے، اس زمانہ میں اس نے علم بدیع کو مدون کیا، اس لحاظ سے اس کو ادبی تنقید کے ارتقاء میں غیر معمولی اہمیت اور عظمت حاصل ہے۔

---

[۱] طبقات الشعراء ص ۹۸

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب عماد الملک سید حسین بلگرامی

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

یہ خط بعد میں ملے، اس لیے سلسلہ میں نہ شائع ہو سکے تھے، ان کو اب شائع کیا جاتا ہے۔

سیف آباد حیدر آباد دکن

غرۂ اپریل سنہ ۱۹۲۴ء

جناب من

میں اپنا سالانہ چندہ سنہ ۲۳ و سنہ ۲۴ء ملفوف کرتا ہوں، دفتر کو تاکید فرمائیے کہ رسید جلد بھیج دیں، اگر میں زندہ رہا تو سنہ ۲۵ء کا چندہ اوائل سال ہی یعنی ماہ جنوری یا فروری یا مارچ میں ادا کر دیا جائے گا۔

میری صحت درست نہیں ہے، اور میری بصارت میں بھی ضعف ہے، آپ کا پھر کبھی یہاں آنا ہوگا،

بندہ

سید حسین عماد الملک بلگرامی

سیف آباد، حیدر آباد دکن

۹ جون سنہ ۱۹۲۴ء مطابق ۶ ذیقعدہ سنہ ۱۳۴۲ھ

جناب مکرمی محترمی معظمی زید معالیہ و لا برکت ایامہ ولیالیہ

روداد دار المصنفین کی دیکھنے میں آئی، تعجب ہوا کہ ادنیٰ اراکین میں بھی اس ناچیز کا نام [illegible][1]

---

[1] [illegible]

اور نہ میں نے جو دو سو روپیہ حضرت کی خدمت میں گذرانے تھے، ان کا کہیں پتہ ہے،
معلوم نہیں کیا وجہ ہے۔

معارف میں جناب کے مضامین جب کبھی مطالعہ میں آتے ہیں تو بڑی مسرت ہوتی ہے اور بہت کچھ علمی فائدہ پہنچتا ہے، یہاں ہم لوگوں کو امید تھی کہ جناب عنقریب یہاں تشریف لائیں گے، مگر اس وقت تک تو جناب کی تشریف آوری نہیں ہوئی، اب معلوم نہیں کب تشریف لائیں گے۔

جناب کے مضامین جو وقتاً فوقتاً معارف میں نکلے ہیں، وہ اگر جمع کرکے کتاب کی صورت میں طبع کرا لیے جائیں تو بہت مناسب ہوگا۔

ندوہ کالج کی کیا حالت ہے، اور عربی کا درس کہاں تک ہوتا ہے، اور کتنے طلبہ اس میں شریک ہوتے ہیں۔

بندہ تو اب بیکار محض ہے، صحت درست نہیں ہے، اور پاؤں کے درد کے مارے سخت تکلیف ہے،

بندہ کے رسائل ملاحظہ سے گذرے ہوں گے، جناب کی ان کے نسبت کیا رائے ہے، جناب کے قلم سے ان کے اصلاح کی ضرورت ہے، فقط زیادہ کیا عرض کیا جائے
لطف عالی زیاد باد

بندہ

سید حسین بلگرامی عماد الملک

۲۶ مارچ ۱۹۲۵ء

جناب مخدومی مکرمی معظمی زیدت معالیہ و بورکت ایامہ لیالیہ

عنایت نامہ عرصہ ہوا پہنچ گیا، مگر بعض وجوہ سے جلد جواب روانہ نہ کر سکا، میری تو

آرزو تھی کہ میں اپنی سرکار میں دوبارہ سیرۃ کی جلدوں کے بابت کچھ عرض کروں، مگر اس وقت حالات یہاں کی کچھ ایسی ہے کہ مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا، اور نہ کسی ایسی ذات سے واقف ہوں کہ وہ اس بارہ میں کچھ کر سکے، بندہ تو ہمہ تن گوشہ نشیں و عزلت گزیں ہے۔ پاؤں کی درد اور تکلیف کی وجہ سے کہیں جانا آنا بھی نہیں ہوتا، اس پر بھی جہاں تک اس عاجز سے ممکن ہوگا کوشش کرے گا،

جہاں تک میری بصارت اجازت دیتی ہے، آپ کے معارف کو ہمیشہ زیر مطالعہ رکھتا ہوں، بے مثل رسالہ ہے،

اس عریضہ کے اختصار کو معاف فرمائیں گے، کوئی تازہ خبر نہیں ہے کہ لکھی جائے۔

نمیقہ بندہ

عماد الملک سید حسین بلگرامی

۱۲ مئی ۱۹۲۵ء

مولانا مخدومنا محترمنا زیدت معالیہ و بورکت ایامہ ولیالہ

سلام علیکم والعہود بحالہا

وقد بلغ الاشواق حد کمالہا

اس مشہور شعر کا مدعا یہ ہے کہ اگر صحت مزاج اور دوسرے حالات اجازت دیتے تو میں ضرور دار المصنفین کی زیارت سے اور جناب والا کی ملاقات سے مشرف ہوتا، عنایت نامہ مورخہ ۱۶ ماہ حال انگریزی نے میرے دلی اشتیاق کو اور زیادہ کر دیا۔

مزاج کی حالت ابھی تک بالکل صحیح اور درست نہیں ہے، بیماری کے دوران میں زندگانی دو چار روز سخت خطرہ کی حالت میں رہی، مگر بفضل خداوند تعالیٰ وہ حالت

بدل گئی، مگر ضعف و اضمحلال اب تک باقی ہے، کوئی کام کرنے کی اجازت نہیں ہے، لکھنے پڑھنے کے لیے اجازت بہت قلیل ہے،

اس حقیر نالائق کے ترجمہ کو جناب جس طرح مناسب سمجھیں کام میں لا سکتے ہیں، مگر اس قدر یاد رہے کہ ترجمہ معرض نظر ثانی میں تھا، جب بعض جسمانی اور روحانی مزوروتوں سے کام بند ہوگیا، اور اب تو حالت اور بدتر ہے، اعادہ ناممکن ہے، جس قدر اوراق طبع ہو چکے تھے، وہ جناب والا کے ملاحظہ کے لیے پیش کیے جاتے ہیں، ان کی نظر ثانی کی سخت ضرورت ہے، مگر کیا کیا جائے۔

اس وقت تو مجھے یہ عریضہ تمام کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے، اس کے خطیات کو جناب والا معاف فرمائیں گے، فقط

بندۂ ناچیز

سید حسین بلگرامی عماد الملک

بہترین مضامین پر عطیہ

حاجی وارث علی شاہ مسولیم ٹرسٹ دیوہ شریف بارہ بنکی نے دو عنوانات تحقیقی مقالہ لکھنے کی دعوت عام دی ہے، سب سے بہتر مقالہ پر انعام دیا جائے گا۔

پہلا مضمون حضرت حاجی سید وارث علی شاہ صاحب قبلہ کی حیات پاک، تعلیمات و ارشادات پر لکھا جائے گا۔

دوسرا مضمون دیوہ شریف کی روحانی اور علمی تاریخ پر ہوگا، دونوں میں آٹھ آٹھ ہزار الفاظ سے کم نہ ہونے چاہئیں، اس سلسلہ میں ٹرسٹ کمیٹی کے مقرر کیے ہوئے ججوں کا فیصلہ آخری ہوگا، جن مضامین پر انعام دیا جائیگا وہ ٹرسٹ کمیٹی کی ملکیت ہونگے اور بقیہ کے واپسی کی ذمہ داری ٹرسٹ پر نہ ہوگی دونوں عنوانوں پر سب سے بہتر مضمون پر ڈھائی ڈھائی سو کے نقد انعامات دیے جائیں گے، دیوہ شریف اکر معلومات حاصل کرنا چاہیں گے تو ان کے قیام کا انتظام ٹرسٹ کی طرف سے کیا جائیگا، مضامین بھیجنے کی آخری تاریخ ۳۰ ستمبر ہے، اور رضی احمد صاحب آنریری منیجر حاجی وارث علی شاہ مسولیم ٹرسٹ دیوہ شریف کے پاس داخل ہو جانی چاہئیں، ڈاک سے بھیجے جانے والے مضامین رجسٹری سے بھیجے جائیں تو مناسب ہوگا، مضامین صاف کاغذ کے ایک ہی طرف لکھے جائیں،

مطبوعات جدیدہ

پیغمبر انسانیت کتابت وطباعت بہتر ناشر ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، قیمت :- عہ
سیرت نبوی کے موضوع پر نصف صدی کے اندر چھوٹی بڑی سیکڑوں کتابیں اردو زبان میں لکھی گئی ہیں، جن میں بعض صدیوں تک زندہ رہیں گی، مولانا جعفر شاہ صاحب نصف درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں، انھوں نے سیرت نبوی پر پیغمبر انسانیت کے نام سے یہ کتاب لکھی ہے جو سیرت کی متوسط درجہ کی کتابوں میں ایک انفرادی حیثیت رکھتی ہے مصنف نے محض فضائل ومناقب کی روایتیں نقل کر دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ سیرت نبوی کے منبع انوار سے فکر ونظر اور عمل وکردار کو روشنی بخشنے کی کوشش کی ہے، محض واقعات نگاری کا فرض انجام نہیں دیا ہے، بلکہ خود اس سے تاثر لیا ہے، اور دوسروں کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے، کہیں کہیں اخذ نتائج اور استدلال سے اختلاف کی گنجائش ہے، پھر بھی قلم جادۂ اعتدال سے ہٹا نہیں ہے، اگر واقعات کا حوالہ بھی دیدیا گیا ہوتا تو اس کی افادیت میں اعتماد کی کیفیت زیادہ پیدا ہو جاتی، یہ کتاب اس موضوع پر ایک اچھا اضافہ ہے،

العقیدۃ السنیہ شرح العقیدۃ الحسنہ عربی از مولانا محمد اویس صاحب ندوی، صفحات ۵۶ ٹائپ عمدہ ناشر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ قیمت :- ۱۲؍

اسلامی عقائد میں کوئی فلسفیانہ پیچ وخم نہیں ہے، ان میں عقلیت کے ساتھ اتنی فطری سادگی ہے کہ اگر اس کے خلاف پہلے سے دل میں عناد نہ ہو تو وہ انسان کے ذہن میں بڑی آسانی سے بیٹھ جاتے ہیں خاص طور پر خدا کی ذات وصفات کا عقیدہ، مگر مسلمانوں میں یونانی اور ہند و فلسفہ کے اثر سے اس میں طرح طرح کی موشگافیاں شروع ہوئیں جن کی بنا پر متکلمین اسلام نے بہت سے نو مولود مسائل کی روشنی میں عقائد میں بہت سی احترازی قیدوں کا اضافہ کر دیا ہے، گو انھوں نے ایسا نیک نیتی سے کیا مگر پھر بھی اسلامی عقائد کی سادگی اس سے قدرے مجروح ہوئی، امام ابن تیمیہ امام ابن قیم، اور عزالدین بن عبد السلام وغیرہ نے اس پر تنقیدیں کی ہیں اور کتاب وسنت کی روشنی میں اسلامی عقائد کی وضاحت کی، ہندوستان میں شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی اس موضوع پر ایک مختصر رسالہ العقیدۃ الحسنہ لکھا تھا، جسے ندوہ نے غالباً سب سے پہلے اس کو داخل نصاب کیا، العقیدۃ السنیہ شاہ صاحب کے اسی رسالہ کی شرح ہے، شارح یعنی مولانا محمد اویس صاحب ندوی نے شرح میں ان ائمہ کے خیالات کے ساتھ خود شاہ صاحب نے اپنی دوسری تصانیف میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے ان سب کو جمع کر دیا ہے، اس طرح یہ کتاب اس موضوع پر ایک جامع کتاب بن گئی ہے، کتاب اس قابل ہے کہ اسے داخل نصاب کر لیا جائے۔

مکتوبات عبد الحق | مرتبہ جلیل احمد قدوائی، صفحات ۸۰، کتابت وطباعت متوسط ناشر مکتبہ اسلوب کراچی ۱۸، قیمت: ۱۲

اردو میں ذاتی خطوط میں سب سے پہلے غالب کے خطوط کو ادبی حیثیت دی گئی، اور اس کے بعد شبلی اور اقبال کے خطوط کو ادبی اہمیت کے ساتھ علمی وفکری حیثیت حاصل ہوئی، مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کا نام بھی اس سلسلہ میں لیا جاتا ہے، مگر انکے زیادہ تر خطوط لکھے گئے ہیں، بھیجے نہیں گئے ہیں، یہ واقعی سے زیادہ تخیلی ہیں،

ڈاکٹر عبدالحق مرحوم اردو کے بڑے محسن بلکہ معماروں میں ہیں، انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی اور ان کے تعلقات ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں سے رہے، اسی لئے انھوں نے مختلف ذاتی، سیاسی ادبی اور علمی کاموں کے سلسلہ میں بیشمار خطوط لکھے تھے، تاہم نجی خطوط کی اشاعت گو کوئی خوش گوار کام نہیں ہے، مگر اس دور کا یہ فیشن ہوگیا ہے، چنانچہ خود ڈاکٹر صاحب اپنے خطوط کی اشاعت کے بارے میں اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں، "یہ بھی فیشن میں داخل ہوگیا ہے کہ ہر کس وناکس کے خط جمع کر کے شائع کر دئے جاتے ہیں، اور غریب لکھنے والے کی خوب تشہیر کی جاتی ہے" (ص ۳۱) مگر جن خطوط کی واقعی کوئی ادبی علمی یا سیاسی اہمیت ہو ان کی اشاعت سے بڑے فائدے بھی ہوتے ہیں، چنانچہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے خطوط بھی اس قابل تھے کہ ان کو شائع کیا جائے، ان سے ایک طرف ان کی شخصیت پورے طور پر سامنے آجاتی ہے، دوسری طرف اس دور کی ادبی اور علمی تحریکوں اور سیاسی رجحانات کے ساتھ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے کن کن وقتوں اور مشکل حالات میں اردو کی خدمت کی ہے، ان میں گاندھی جی اور سر سپرو سے لیکر ان کے بعض تلامذہ کے تلامذہ تک کے خطوط شامل ہیں، جلیل صاحب نے اسکو مرتب کر کے ایک اچھا کام انجام دیا ہے،

اردو ناول کی تنقیدی تاریخ از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی صفحات ۳۰۰، کتابت وطباعت بہتر،

ناشر ادارہ فروغ اردو امین آباد لکھنؤ، قیمت :- سے

داستان گوئی اور فسانہ نویسی کی ایک ترقی یافتہ شکل ناول نگاری ہے، ہندوستان میں اس فن کو سب سے زیادہ ترقی انگریزوں کے دور میں ہوئی، اس زمانہ کی سب سے مشہور داستان میرامن کی چہار درویش ہے، میرامن کے بعد سرشار، شرر اور رسوا وغیرہ نے اس کو ترقی دی، مصنف نے قدیم داستانوں سے لیکر موجودہ دور تک کے ناولوں کا ایک تنقیدی جائزہ لیا ہے، کہیں کہیں ان کی رائیں انتہا پسندانہ معلوم ہوتی ہیں، مثلاً وہ پریم چند کے ناولوں کو ناول ہی تسلیم

کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں، مگر پھر بھی انھوں نے چونکہ اس موضوع پر کافی محنت کی ہے، اور کئی کتابیں بھی لکھی ہیں، اس لئے اس بارے میں ان کی رائیں بے وزن نہیں ہیں،

انتخابات اردو، صفحات ۴۰، کتابت و طباعت معمولی ناشر و دار ایند کمپنی پبلشرز پرائیٹ لمیٹڈ بمبئی ۲ قیمت ۱۔ عہ

اردو نثر و نظم کے جو مختلف منتخب مجموعے اسکولوں کے لئے تیار کئے گئے ہیں ان میں انتخابات اردو بھی ہے، جسے گجرات سرٹیفکٹس اگزامیشن بورڈ نے مرتب کرایا ہے، نثر میں میر امّن سے لیکر دہندر ناتھ تک کے مضامین کا انتخاب شامل ہے، اسی طرح نظم میں ولی گجراتی سے لیکر آنند نرائن ملا تک کے کلام کے نمونے؟ شامل ہیں، تعجب ہے کہ اردو کی سب سے قدیم صنف حمد و نعت کے نمونے اس میں شامل نہیں ہیں، منظومات میں مولوی اسمٰعیل میرٹھی کو نظر انداز کر دینا بھی تعجب خیز معلوم ہوا، یہ انتخاب مکمل تو نہیں کیا جا سکتا مگر مفید ہونے میں کوئی شبہہ نہیں ہے،

جماعت اسلامی کے نظریات و افکار از مولانا عبدالصمد رحمانی، صفحات ۵۶، کتابت اشاعت اعلیٰ ناشر دار التالیف مانڈر ضلع مونگیر

قیمت ۵۰ پیسے

جماعت اسلامی کے نظریات و افکار کے بارے میں پہلے بہت سے چھوٹے بڑے رسالے شائع ہو چکے ہیں، انہی میں یہ رسالہ بھی ہے، مگر اس رد مودودیت کی مہم سے نہ تو ان لوگوں کے خیال کے مطابق جماعت اسلامی کی اصلاح ہوئی اور نہ اس سے عام مسلمانوں کو کوئی تعمیری فائدہ پہنچا، اس کتاب میں جتنے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں، ان سب کی تاویل و توجیہ ہو سکتی ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا کہ مودودی صاحب کا قلم کہیں کہیں جادہ ادب سے ہٹ گیا ہے، مگر اس سے ان کے اصول و معتقدات پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور قابل بحث یہ ہے کہ کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت مودودی صاحب کی کتابوں سے اقتباسات جمع کر دئے گئے ہیں،

(م ح)

جلد ۹۳ - ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ مئی سنہ ۱۹۶۴ء - عدد ۵

مضامین

مقالات

اثار علمیہ و ادبیہ

شذرات

گذشتہ مہینے ہم نے ہندوستان کی حکومت سے کچھ صاف صاف باتیں کہی تھیں، اس مہینہ اسی صفائی سے پاکستان سے چند باتیں کہنا ہیں، ہندوستان کی حکومت خالص دنیاوی ہے اور اس پر صرف دنیاوی قانون کی حیثیت سے اپنی اقلیتوں کی ذمہ داری ہے، اگر وہ ان کو پورا نہیں کرتی تو اس کو کسی بالاتر قوت کے مواخذہ کا خوف نہیں ہے لیکن پاکستان اسلامی حکومت کا مدعی ہے اور اسلام میں غیر مسلموں کے بارہ میں اسلامی حکومت کی بڑی ذمہ داریاں ہیں، اور ان ذمہ داریوں کا اس کو خدا کے سامنے جواب دینا ہے، اس لیے غیر مسلم محکوموں کے ساتھ حسن سلوک اسلامی حکومتوں کی روایت رہی ہے جسکو انھوں نے اس زمانہ میں بھی قائم رکھا ہے، اسلامی حکومتیں پورے ایشیا اور افریقہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور عرب کے علاوہ ان سب میں غیر مسلم اقلیتیں ہیں، جو مسلمانوں کی طرح امن وسکون اور عزت ووقار کی زندگی بسر کر رہی ہیں، ان میں سے کسی کو بھی اپنی حکومتوں سے بدسلوکی کی شکایت نہیں ہے، ایسی حالت میں پاکستان کا اس روایت کو توڑنا اس کے دامن پر ایک بدنما داغ ہے۔

اس کا فرض تو یہ تھا کہ اپنی اقلیتوں کے ساتھ حسن سلوک کا ایسا نمونہ پیش کرتا جس سے دوسرے سبق حاصل کرتے اور اسلام اور مسلمانوں کی طرف ان کا دل کھنچتا، نہ کہ ان سے نفرت پیدا ہو، اس لیے اقلیتوں کے ساتھ زیادتی نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی جرم بھی ہے، وہ حکومت خدا کی نگاہ

فطری کیوں نہ ہو لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے سراسر لغو ہے، کسی بے گناہ سے محض اس بنا پر کہ وہ کسی مجرم کا ہم قوم اور ہم مذہب ہے، بدلہ لینا ایک وحشیانہ تصور اور اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے، یہ تو اس مسئلہ کا مذہبی پہلو ہے، سیاسی پہلو یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان گو دستوری لحاظ سے ہندوستان کے شہری ہیں، اور ان کو وہ سارے حقوق حاصل ہیں جو یہاں کی اکثریت کو حاصل ہیں اور حکومت کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے، لیکن فرقہ پرست جماعتیں ان کو اجنبی اور پاکستان کا یرغمال سمجھتی ہیں، ان کو ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود گوارا نہیں اور وہ جھوٹے جھوٹے الزام تراش کر ان کو مٹانا چاہتی ہیں، اگر پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ کوئی ناگوار واقعہ پیش آجاتا ہے تو ان کو ایک بہانہ ہاتھ آجاتا ہے اور اس کا بدلہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں سے لیتی ہیں، اور اکثریت کے عوام کا بھی ان حالات سے متاثر ہو جانا ایک حد تک فطری ہے، اس لیے حکومت بھی ان کے مقابلہ میں بے بس ہو جاتی ہے،

ہندوستان کی تقسیم کے بعد یہاں کے مسلمانوں کی حیثیت یونہی ختم ہو گئی ہے، اگر دونوں ملکوں کے تعلقات خوشگوار ہوتے اور پاکستان کی اقلیتیں مطمئن ہوتیں تو کم از کم مسلمان امن و سکون کی زندگی بسر کر لیتے اور آیندہ ان کے پنپنے کی کوئی راہ نکلتی، لیکن دونوں ملکوں کی کشاکش نے ان کو امن و سکون سے بھی محروم کر دیا ہے، گو انشاء اللہ ان حالات میں بھی وہ اپنا وطن نہ چھوڑیں گے اور اسلام کا نام یہاں سے مٹنے نہ دیں گے اور ایک نہ ایک دن یہ دور ابتلا ختم ہوگا، لیکن اگر بالفرض ان حالات سے گھبرا کر وہ ہندوستان چھوڑنا بھی چاہیں تو کون ملک پانچ کروڑ انسانوں کا بار اٹھائے گا، اس لیے مسلمانوں کو بہرحال ہندوستان ہی میں رہنا ہے، اور اپنی ہمت، استقلال اور تدبر و ہوشمندی

ہے ملک میں اپنا اعتبار پیدا کر کے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا ہے، لیکن اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی کشیدگی، خصوصاً پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ اس کے سلوک کا مسئلہ ہے، پاکستان کو اگر ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ واقعی ہمدردی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے یہاں کوئی ایسی شکل نہ پیدا ہونے دے جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات و مصائب میں اور اضافہ ہو، اور ان پر ہندوستان کی سرزمین تنگ ہو جائے، خصوصاً اپنی اقلیتوں کو مطمئن رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، جو صرف سیاسی بلکہ مذہبی ذمہ داری بھی ہے

یہ تنہا ہندوستانی مسلمانوں یا ہندو پاک کی اقلیتوں کا نہیں بلکہ انسانیت کا مسئلہ ہے، آخر دونوں ملکوں کی اقلیتیں کب تک مصائب میں مبتلا اور امن و سکون کی زندگی سے محروم رہیں گی، ان سے کہیں بہتر ان ملکوں کے جانوروں کی زندگی ہے، ہندوستان اور پاکستان کے اختلاف کا نتیجہ دونوں ملکوں کی تباہی ہے، انکی توانائیوں کا بڑا حصہ ملک کی تعمیر و ترقی میں صرف ہونے کے بجائے ایک دوسرے کی مدافعت کی تیاری میں صرف ہو رہا ہے، مغربی طاقتیں الگ ان کے اختلافات سے فائدہ اٹھا رہی ہیں، ہندوستان اور پاکستان میں خواہ کتنے ہی اختلافات ہوں لیکن وہ مختلف طبعی اور فطری رشتوں سے ایک دوسرے سے اسقدر وابستہ ہیں کہ ہمیشہ کیلئے جدا نہیں رہ سکتے، ان کو بہرحال ایک نہ ایک دن اپنے اختلافات کو ختم کرنا ہے اس لیے دانشمندی کا تقاضہ یہی ہے کہ جو واقعہ ایک دن ہونے والا ہے اس کے لیے بعد از خرابی بسیار کا کیوں انتظار کیا جائے، ابھی حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی یہی خیال پارلیمنٹ میں ظاہر کیا ہے اور یہی صحیح طریقہ فکر ہے، اس لیے پاکستان کو بھی اسی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مقالات

ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ایم، اے

(سلسلہ کیلئے دیکھو معارف ماہ نومبر ۱۹۶۲ء)

(۹)

اشاعت اسلام ہندوستان کے سلاطین نے اشاعت اسلام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی، چنانچہ جہاں جہاں انکے دار السلطنت رہے وہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہونے کے بجائے کم ہی رہی، انصاف پسند ہندو مورخین بھی اسکا اعتراف کرتے ہیں کہ جب فتح و کامرانی کا جوش و خروش ختم ہو جاتا اور ملک میں اقتصادی بحالی کا مسئلہ سامنے آتا تو بڑے بڑے پُرجوش اور متعصب سلاطین کو بھی معتدل روش اختیار کرنی پڑتی، اسی لیے انھوں نے کبھی اسکی فکر نہیں کی کہ ہندو زمینداروں اور کاشتکاروں کو مسلمان بنا کر اسلام کے دائرہ کو وسیع کریں، دو آبہ میں مسلمانوں کی حکومت ساتسو برس رہی بہار اور دکن میں بھی وہ آٹھ سو برس تک حکمراں رہے لیکن ان علاقوں میں انکی آبادی ۱۰ فیصدی سے زیادہ نہ بڑھ سکی۔

برطانوی دور حکومت میں انگریز مورخین اور انکے مقلدوں نے ہندو مسلم اختلافات کو ہوا دینے کیلئے اس پر بہت زیادہ زور دیا کہ فیروز شاہ تغلق، سکندر لودی، عالمگیر، حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا، اور اسکے ثبوت میں تاریخ اور تذکروں سے ضمناً کچھ شہادتیں بھی فراہم کی گئیں، اگر یہ واقعی ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کرتے تو کم از کم انکے پایۂ تخت کے گرد و نواح کی زیادہ آبادی مسلمان ہوتی، لیکن انکے عہد تک وہاں ہندو اپنے دیرینہ رسوم و عادات کے ساتھ اکثریت میں رہے، اس میں شک نہیں کہ ان حکمرانوں کے عہد میں کچھ اچھے خاصے ہندو مسلمان ضرور ہوئے، لیکن وہ زیادہ تر جاہ و اقتدار اور دنیاوی منافع کی خاطر اسلام میں داخل ہوئے، خود فیروز شاہ تغلق نے فتوحات فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ اس نے غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب کیلئے یہ

منادی کرادی تھی کہ جو شخص اسلام قبول کرے گا وہ جزیہ سے بری سمجھا جائیگا، اس اعلان پر کثرت سے غیر مسلم روزانہ ہر طرف سے آتے تھے اور اسلام قبول کرکے انعام و اکرام سے مالا مال ہوکر واپس جاتے تھے، مغلوں کے زمانے میں اودھ کے بچگوتی راجپوت، بلند شہر کے لال خانی راجپوت، مرزاپور کے کھروار راجپوت اور اعظم گڈھ کے گوتم راجپوت اپنی خوشی سے اس لیے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ اس سے مذہبی برتری کے علاوہ ان کی سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حالت بھی بلند اور مستحکم ہو جائے گی،

اشاعت اسلام کے سلسلہ میں علماء کی خدمات ضرور ہیں، لیکن وہ اس لیے زیادہ نمایاں نہیں ہیں کہ ان کی کوششوں کا ذکر تاریخوں میں محض سرسری طور پر آتا ہے، البتہ اس سلسلہ میں عرب تاجروں اور صوفیوں نے جو کوششیں کیں اس کی پوری تفصیل ملتی ہے، عرب تاجر جنوبی ہند میں پہنچے تو خاموشی سے اسلام کا پیام اس علاقہ میں پہنچایا، ملابار، گجرات، کچھ اور جزائر ہند میں اچھوتوں کو بہت ذلیل سمجھا جاتا تھا، ان کے لیے ضروری تھا کہ وہ برہمن سے چونسٹھ قدم دور رہیں، اس سے زیادہ قریب آنے کی جرأت نہ کریں، اور جب راستہ چلیں تو پکارتے جائیں تاکہ لوگ ان سے دور ہٹ جائیں، اگر کوئی اونچی ذات کا ہندو ان سے چھو جاتا تو جب تک وہ غسل نہ کرتا، کھا نہیں سکتا تھا، اگر کھا لیتا تو برادری سے خارج سمجھا جاتا اور نیچ ذاتوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا، اور اس کی بقیہ عمر غلامی میں بسر ہوتی یا وہ بھاگ کر دوسری جگہ چلا جاتا تھا، عرب تاجر ایسے لوگوں کو اپنی پناہ میں لے لیتے اور جب وہ مسلمان ہوکر دوسرے مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل کر لیتے تو دوسرے ہندو بھی ان کی عزت میں کمی نہیں کر سکتے تھے، اس لیے دیگر اچھوتوں کے مظلوم فرقوں کی رغبت اسلام کی طرف بہت بڑھ گئی، اس طرح اسلام اپنی اخوت و مساوات سے اپنا راستہ خود صاف کرتا گیا، اور نیچ ذات والوں کے [illegible] ملک پر قابض ہو گئے، ملابار میں جیسے عرب تاجر آتے تھے وہاں کے باشندوں کے ساتھ گھل مل جاتے

رکھتے کہ ہندوؤں کی حکومت میں بھی ان کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہوتی، ہندو راجہ ان کی سرپرستی اسلیے بھی کرتے کہ ان کی تجارت سے ان کے یہاں کا بازار گرم رہتا، اور بہت سی چیزیں آسانی سے میسر آجاتیں، اور وہ ان کی تبلیغ اسلام میں بھی مزاحمت نہ کرتے تھے، چنانچہ ان کے عقائد و عبادات کو دیکھکر ملابار کے چیرامن پیرو کا آخری راجہ شیب خاطر مشرف بہ اسلام ہوگیا، اس کی راجدھانی کوڈنگلور تھی، اس نے ایک عرب کو اپنے یہاں بلاکر کنانور کا راجہ بنا دیا تھا، کالی کٹ کا زیمورن بھی عرب تاجروں کی بڑی قدر کرتا تھا، اسی کے زمانہ میں ایک عرب تاجر نے اس کے حدود سلطنت میں ایک بازار قائم کیا، جو بعد میں کالی کٹ کی ایک خوشحال بندرگاہ بن گئی، یہ تاجر یہاں کا قاضی بھی مقرر ہوا، اس کے جانشین زیمورن کی حمایت میں ناؤ کے راجہ کے خلاف برابر لڑتے رہے، یہانتک کہ زیمورن کا اقتدار جنوبی ملابار میں بھی ختم ہوگیا، زیمورن مسلمانوں کا بڑا خیال رکھتا تھا، اور اسلام کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کرتا تھا، اس نے حکم دے رکھا تھا کہ اس کے حدود سلطنت کے ملاحوں کے ہر خاندان سے ایک مرد مسلمان ہو جائے، یہ نومسلم جہازوں میں بھرتی ہوتے تھے، جو زیمورن کی جنگی مہموں میں کام آتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان کس عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، کولتری کا راجہ کا ایک وزیر نایر تھا، جو خود مسلمان ہوگیا اور آگے چل کر کنانور کا راجہ ہوا۔

ہندوستان کے مشرقی ساحل پر بھی عرب تاجر دسویں صدی میں پہنچ چکے تھے، وہ یہاں بلا تکلف شادی بیاہ کر لیتے، جس سے ان کی آبادی بڑھتی رہی، اور ان کی معاشرت اور عبادت کو دیکھکر وہاں کے اصلی باشندے متاثر ہوتے اور اسلام قبول کرتے رہے،

اشاعت اسلام میں صوفیوں کا بھی بڑا حصہ رہا ہے، مدراس اور ترچناپلی میں حضرت نا تھڑ ولی (المتوفی سنہ ۱۰۳۹ھ) کی ذات سے اسلام پھیلا، وہ ایک ترک شہزادے تھے، اور ریاست و امارت چھوڑکر درویش بن گئے، اور مکہ، مدینہ، اور شمالی ہند کی سیاحت کرکے ترچناپلی پہنچے، اور اپنے زہد و عبادت اور اخلاق سے وہاں کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا، بہت سے ہندو ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

ان کا مزار ترچناپلی میں ہے، ان کے جانشین سید ابراہیم شہید (المتوفی ۱۱۸۹ھ) تقریباً بارہ برس تک اس علاقے کے حکمراں بھی رہے، ان کا مزار اروادی میں ہے، حضرت نا تھڑ ولی کے ایک دوسرے مرید اور خلیفہ بابا فخر الدین (المتوفی ۱۲۹۶ھ) نے پینو کونڈا کے راجہ کو مسلمان کیا، مدورا میں اشاعت اسلام حضرت علی بادشاہ کے ذریعہ ہوئی جو گیارہویں صدی عیسوی میں بغداد سے بابا ریحان کی ایک جماعت کے ساتھ بھروچ آئے، اور وہاں کے راجہ کے لڑکے کو مسلمان کیا، نورالدین ستاگر نے گجرات کے کیبیوں کوریوں اور کھارواؤں میں اشاعت اسلام کی، اور سب کو مسلمان بنایا، جو اسماعیلی عقائد رکھتے ہیں، ۱۳۰۴ھ میں عرب واعظین میں ایک مبلغ پیر مہابر کھندایت کے نام سے مشہور ہوئے، یہ بیجاپور آکر وہاں کے کاشتکاروں کو مسلمان کیا، چودہویں صدی میں حضرت خواجہ گیسو دراز نے پونا اور بلگام کے ہندوؤں میں اسلام کی تبلیغ کی، کوکن میں حضرت عبدالقادر جیلانی کی نسل کے ایک بزرگ شیخ بابا عجب نے اسلام پھیلایا، اور وہ دہانوں میں مدفون ہیں، دھوار کے اضلاع میں حضرت ہاشم پیر گجراتی کے ذریعہ اسلام پھیلا، ستارا کے علاقہ میں ایک نومسلم پیر شمپوا پاکوشی نے وہاں کے لوگوں کو مسلمان کیا، بارہویں صدی عیسوی میں ایک بزرگ سید احمد سلطان سخی سرور المعروف بہ لکھی داتا (المتوفی ۱۱۸۱ھ) نے شاہ کوٹ متصل ملتان میں آکر قیام کیا، اور ہندو مسلمان دونوں ان کے معتقد ہوئے، ان کے پیرو سلطانی کہلاتے ہیں، اور پنجاب خصوصاً جالندھر میں بہت ہیں، راجستھان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ذریعہ بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا، صرف دہلی سے اجمیر کے راستے میں انھوں نے سات سو ہندوؤں کو مسلمان کیا، پنجاب کا مغربی حصہ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی اور حضرت فرید الدین گنج شکر (المتوفی ۱۲۶۵ھ) کے فیوض سے سیراب ہوا، جواہر فریدی میں ہے کہ بابا گنج شکر نے پنجاب کی گیارہ قوموں کو تعلیم و تلقین سے مشرف بہ اسلام کیا، حضرت بو علی قلندر (المتوفی ۱۳۲۴ھ) نے پانی پت میں تین سو راجپوتوں کو مسلمان کیا، کشمیر میں شاہ مرزا، بلبل شاہ، سید علی ہمدانی (المتوفی ۱۳۸۴ھ

اور میر شمس الدین عراقی کی وجہ سے اسلام کو فروغ حاصل ہوا، بہار میں فردوسیہ سلسلہ کے بزرگ اسلام کی تبلیغ واشاعت میں لگے رہے، پندرھویں صدی عیسوی میں جب بنگال کے راجہ کنس کے بیٹے جت مل نے اسلام قبول کیا تو اسکے اثر سے کثرت سے ہندو مسلمان ہوئے، وہاں عام طور سے متمول مسلمان قحط کے زمانے میں ہندو کے بچوں کو خرید لیتے اور انکی تعلیم و تربیت اسلامی طریقہ پر کرتے، جب حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ شیخ اخی سراج الدین (المتوفی ۱۳۵۷ء) اور انکے خلیفہ شیخ علاء الحق (المتوفی ۱۳۹۸ء) نے بنگال میں قیام کیا اور توحید و رسالت کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی مساوات بھی پھیلائی تو اسکے اثر سے وہاں کے نیچی ذات کے ہندو جو خود ہندوؤں میں ذلیل نظروں سے دیکھے جاتے تھے، بکثرت دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، سلہٹ میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے مرید اور حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پیر بھائی شیخ جلال الدین تبریزی (المتوفی ۱۲۲۵ء) نے اسلام کی اشاعت کی، ان کا مزار سلہٹ میں ہے،

اشاعت اسلام کا روشن اور تاریک پہلو اشاعت اسلام سے مسلمانوں کی تعداد ضرور بڑھ گئی، گو جس سرعت سے عراق، شام، مصر اور ایران میں اسلام پھیلا، ہندوستان میں نہ پھیل سکا، پھر بھی مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی، مبلغوں نے غیر مسلموں کو مسلمان تو ضرور بنا دیا، مگر ان کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ ان میں اسلامی اعمال و اخلاق اور اسلامی کردار پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، خود پشتینی مسلمان بھی بڑی حد تک اسلامی تعلیمات سے بیگانہ ہوتے گئے، نو مسلموں سے تو ان کے بہت سے موروثی رسوم و رواج بھی دور نہ ہو سکے، اسی لیے آج بعض اہل قلم کو یہ لکھنے کا موقع مل گیا ہے کہ پنجاب کے بہت سے مسلمان گگتی اور سلاچی جیسے دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں، امرتسر کے میراثی درگا بھوانی پر نذریں چڑھاتے ہیں، پنڈی کے مسلمان جھنک کی دیوی کی پوجا کرتے ہیں، یوپی کے مسلمان جاٹوں کے یہاں برہمن پروہت بنتے ہیں، کچھ کے بعض میمن ہندوؤں کی طرح جسم پر بھبوت ملتے ہیں، پنجاب کے بعض مسلمان فقرا دھونی بھی رماتے ہیں، یوپی کے جلاہے کالکا کی پوجا کرتے ہیں اور ہندوؤں کی طرح سرادھ کی رسم ادا کرتے ہیں، مشرقی بنگال کے ترک لکشمی دیوی کے سامنے جھکتے ہیں، اور مغربی بنگال کے مسلمان فقیر لکشمی دیوی کے گیت گاتے ہیں، اس کے علاوہ

دھرم میں جنتیا دھونا کی پرستش کرتے ہیں تاکہ ایسے مسلمانوں کو ان کے عقائد سے ہٹا دینے کی تھوڑی سی بھی کوشش کی جاتی تو وہ آسانی سے ہندو ہو جاتے، اور مسلمان سلاطین جن پر جبر و تشدد سے اسلام پھیلانے کا الزام لگایا جاتا ہے، کبھی ان کو دوبارہ اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کرتے، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان سلاطین میں وہ مذہبی جوش اور ولولہ نہ تھا جو شروع کے عرب حکمرانوں میں رہا، دوسرے وہ ملک داری اور ملک گیری میں ایسے مشغول رہے کہ ان کو تبلیغ اسلام کی فرصت ہی نہ ملی، یہ ضرور ہے کہ ملک گیری کے سلسلہ میں انھوں نے شجاعت پامردی اور سپہگری کے جو جوہر دکھائے اپنے نقطۂ نظر سے اسی کو اسلام کی سربلندی تصور کرتے رہے، اور اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں ان کے کارنامے پر بجا طور سے فخر کیا جا سکتا ہے۔

تسخیر ملک دستیز طلب | ہندوستان میں محمود غزنوی کی متواتر لشکرکشی پر خواہ کتنی ہی تلخ بحث کی جائے، لیکن اگر اس کا مطالعہ ایک فوجی سردار کی حیثیت سے کیا جائے تو کسی شخص کو اس کے اعتراف میں تامل نہ ہوگا کہ اس میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو دنیا کے اعلیٰ سے اعلیٰ فوجی قائدوں میں پائے جاتے ہیں، وہ میدان جنگ میں اپنی جان پر کھیل کر اس حصہ میں کود پڑتا جہاں گھمسان کی جنگ ہو رہی ہوتی، مختلف لڑائیوں میں اس کے جسم پر ۷۲ زخم لگے تھے، وہ پورے تہور کے ساتھ لڑتا تو بعض اوقات اس کی گرفت میں تلوار اس طرح چپک جاتی کہ بڑی مشکل سے علحدہ کی جاتی، اس کی جانبازی اور پامردی کو دیکھ کر اس کے لشکری پوری جانبازی اور سرفروشی سے لڑتے، وہ عراق سے [illegible] کی وادی تک تقریباً ۳۳ سال لڑائیاں لڑتا رہا، کبھی ترکستان کی ساری جنگی قوتیں اس کے خلاف صف آرا ہو جاتیں، کبھی ہندوستان کے تمام بہادر راجپوت سردار اس کے خلاف صف آرا ہو جاتے، لیکن وہ کسی موقع پر بھی سراسیمہ نہیں ہوا، ہر لڑائی میں فتح کا سہرا اسی کے سر با[illegible] وقت [illegible] گویا ہی تھا لیکن اپنی جانبازی سے اپنی فوج میں نئی زندگی [illegible] سرگرمیاں پیدا کر [illegible] اس کے لشکری

عرب، خلجی، افغان، ترکمان، دیلمی اور ہندو بھی تھے، اور ان سب مختلف عناصر کو ملا کر ایک ناقابل شکست فوجی دستہ بنائے رکھا، وہ تھکنا جانتا ہی نہ تھا، غور کی دشوار گذار پہاڑیاں، کشمیر کی برفانی وادیاں اور راجپوتانہ کے ہلاکت خیز ریگستانی علاقے اس کی ہمت کو پست نہ کر سکے، وہ غنیم کے سر پر اس طرح دفعۃً پہنچ جاتا کہ اس کو خبر تک نہ ہونے پاتی، اس لیے وہ ان غیر معمولی اوصاف کی بنا پر ان فوجی رہنماؤں کی صف میں جگہ پانے کے لائق ہے جنھوں نے قوموں کی تاریخ بدل دی ہے،

شہاب الدین غوری کے فوجی کارنامے محمود غزنوی کے سامنے ماند ضرور پڑ جاتے ہیں لیکن اس کو محمود غزنوی پر اس حیثیت سے فوقیت حاصل ہے کہ محمود ہندوستان میں لڑائیاں جیت کر واپس چلا جاتا، لیکن شہاب الدین غوری اس سرزمین میں ایک سلطنت قائم کرنے کے لیے لڑتا رہا، محمود غزنوی کبھی کوئی جنگ نہیں ہارا، اور شہاب الدین غوری کو ہندو راجاؤں نے دو لڑائیوں میں شکست دی لیکن کسی کو اس کے اعلیٰ درجہ کے فوجی قائد ہونے میں شک نہیں ہوا، وہ میدان جنگ میں اترتا تو پہلے صحیح صورت حال کا جائزہ لیتا، پھر اسی حساب سے اپنی فوج کو صف آرا کرتا، اور اس کی ہدایت کے مطابق اس کے صبا رفتار سوار پہلے آگے بڑھتے پھر پیچھے ہٹ جاتے، پھر اچانک پلٹ کر غنیم کے بازوؤں کی صفیں الٹ دیتے، وہ کسی حال میں بھی شکست کو شکست تسلیم نہیں کرتا تھا، جب پرتھوی راج سے پہلی بار ہارا تو اس نے قسم کھائی کہ بیوی کی خوابگاہ میں اس وقت تک نہیں جائے گا جب تک اس شکست کو فتح و کامرانی میں نہ بدل دے گا۔

قطب الدین ایبک نے بعض اپنے سپاہیانہ اوصاف کی بنا پر گمنامی اور غربت سے نکل کر شہرت و ناموری حاصل کی، اور اس کی سپہ گری سے متاثر ہو کر شہاب الدین غوری نے اس کو اپنا فرزند بنالیا، شمس الدین [illegible]

اور بہادر کوئی اور فوجی نہ ہوتا، شہاب الدین غوری نے جب گکھڑوں پر لشکر کشی کی تو جہلم کو عبور کرنے میں سب سے پہلے التمش نے برگستوان پہنا اور اپنا گھوڑا مردانہ وار دریا میں ڈال دیا اور اس کو عبور کرکے دشمنوں پر ٹوٹ پڑا، اس کی جانبازی دیکھ کر دوسرے لشکری بھی دریا میں کود پڑے، اس کے اسی سپاہیانہ اور مدبرانہ اوصاف کے سبب سے قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد ایک نوزائیدہ سلطنت ختم ہونے سے بچ گئی، منگولوں کے طوفان کو دنیا کا کوئی ملک روک نہ سکا، لیکن غیاث الدین بلبن نے اپنے آہنی عزم سے ان کی غارت گری سے ہندوستان کو بچا لیا، غلام سلاطین کے فوجی سرداروں میں بختیار خلجی نے مٹھی بھر فوج سے بہار اور بنگال کو فتح کیا، بلبن کا چچا زاد بھائی شیر خاں اپنے اوصاف میں واقعی شیر تھا، وہ جب تک زندہ رہا، تاتاری سنام، لاہور اور دیپال پور کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہ کر سکے، ملک قمر الدین قیران تمر اور ملک عز الدین طغرل طغان نے اودھ اور لکھنوتی کو دہلی سے منسلک کیا۔

خلجی سلاطین میں جلال الدین خلجی کہا کرتا کہ اگر میں اپنی تلوار کھینچ لوں تو بیس بائیس افراد کو تنہا دو ڈالوں، اور اگر سر میدان کھڑا ہو جاؤں تو اگر ایک بڑی جماعت مجھ پر چالیس بار بھی حملہ کرے تو میرا بال بیکا نہیں کر سکتی، علاء الدین خلجی صحیح معنوں میں تمام فوجی سرداروں کا سردار تھا، وہ دشمنوں کو مغالطے میں ڈال کر اور تھکا کر پسپا کر دیتا تھا، اس کے سرداروں میں ظفر خاں میدان جنگ میں اپنے حریفوں سے کشتی لڑ کر اپنی بہادری کا جوہر دکھاتا تھا، الغ خاں اور نصرت خاں نے ملتان، گجرات، رن تھنبور اور جیسلمیر وغیرہ کو فتح کرکے خلجی حکومت کا دبدبہ قائم کیا، ملک کافور ہزار دیناری کے سر دکنی فتوحات کا سہرا رہا۔

غیاث الدین تغلق نے منگولوں سے ۲۹ بار جنگ کی اور ہر بار ان کو شکست دی، سلطان محمد تغلق کے نصف دور حکومت تک اس کی فوج جہاں بھی گئی فتح و کامرانی کا پھریرا لہراتی آئی، منگولوں کو اپنی فوج

اس قدر عادی تھا کہ وہ جب کہیں کوئی لشکر بھیجتا تو صبح و شام دو فرامین بھیجا کرتا تھا جن میں روزانہ کی ضروری ہدایتیں ہوتی تھیں، اور کسی کو اس کی عدول حکمی کی جرأت نہ ہوتی تھی،

ایک فوجی قائد میں جتنی خوبیاں ہونی چاہئیں، وہ سب بابر میں موجود تھیں، اس نے جتنی لڑائیوں میں فتح حاصل کی، اتنے ہی میں شکست بھی کھائی لیکن شکست سے اس کی اندرونی صلاحیتیں اور بھی ابھر آتیں، وہ اپنے لشکریوں اور ساتھیوں کو محض اپنی باتوں اور تقریروں سے تازہ بنا دیتا تھا،

اکبر کا شمار دنیا کے بہترین سپہ سالاروں میں ہوتا ہے، اس کی تیز نگاہی، شمشیر زنی، نیزہ بازی اور نشانہ بازی، دشمنوں پر بجلی کی سرعت کے ساتھ یورش، حیرت انگیز حد تک تھی، اس نے اپنی فوج کا جو نظم و نسق قائم کیا تھا وہ اس دور کے لحاظ سے بہترین سمجھا جاتا تھا، اسی لیے اس کو کسی جنگ میں شکست نہیں ہوئی، جہانگیر گو بڑے ناز و نعمت میں پلا تھا لیکن ضرورت کے وقت ایک جری سپاہی بھی بن جاتا تھا، وہ نور جہاں سے کئی دن تک محض اس لیے خفا رہا اور نہیں بولا کہ ایک بار اس کے ایک خیمہ میں ایک شیر آگیا تو وہ بھاگ کر دوسرے خیمہ میں چلی گئی تھی، شاہ جہاں کو اپنے جنگی تجربات پر اتنا بھروسہ تھا کہ جب اس نے بلخ اور قندھار کی تسخیر کے لیے اپنے شہزادوں کو بھیجا تو دارالسلطنت میں بیٹھ کر ان کو ہدایتیں بھیجتا تھا، عالمگیر کی فوجی قیادت کے مقابلہ میں بڑے بڑے آزمودہ کار فوجی سردار بے بس ہو کر رہ جاتے، اور بلخ کے حکمرانوں کو کہنا پڑا کہ ایسے آدمی سے لڑنا اپنی قسمت سے جنگ کرنا ہے، اس کے زمانہ میں مغلوں کی سلطنت کے حدود انتہائی درجہ تک پہنچ گئے۔

عہد مغل بادشاہوں کے فوجی سرداروں کے کارنامے بھی فخر کے ساتھ لکھے جانے کے لائق ہیں، اکبری بیرم خاں، خان زماں، شہاب الدین بہادر خاں، اتگہ خاں، منعم خاں، مظفر خاں، خان اعظم مرزا کوکہ خاں، عسکر خاں، شہباز خاں، ادہم خاں کوکہ، آصف خاں، فتح اللہ شیرازی، مرزا نظام الملک جعفر بیگ، جہانگیری عہد میں سپہ سالار، شریف خاں، شیخ فرید، خانخاناں عبد الرحیم خاں۔

آصف خاں قزوینی، آصف خاں ابوالحسن، صادق خاں، ارادت خاں، اسلام خاں مشہدی، اعتماد الدولہ مرزا غیاث بیگ طہرانی، احمد خاں نیازی، ، اقتدور دی ، شاہجہانی دور میں علامہ شکر اللہ افضل خاں آصف خاں ابوالحسن، ارادت خاں، صادق خاں، اسلام خاں، میر جملہ، معتمد خاں، صلابت خاں احسن اللہ خاں، جعفر خاں، اور خلیل اللہ خاں، عالمگیری عہد میں میر جملہ، محمد امین خاں، افضل خاں شایستہ خاں، دلیر خاں، ہمت خاں، ذوالفقار خاں، قاسم خاں وغیرہ نے جو فتوحات حاصل کیے وہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ کے لیے شاندار اور زریں کارنامے کہے جاسکتے ہیں،

ظاہر ہے کہ ان فاتحوں کو بڑی بڑی لڑائیاں لڑنی پڑیں جن میں بیشمار جانیں تلف ہوئیں، خونریزی کے ساتھ غارتگری بھی ہوئی جیسا کہ جنگ کے موقع پر آج بھی متمدن ممالک میں ہوتی ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ خونریزی اور غارتگری اسلام کی طرف منسوب کردی گئی اور ان فاتحوں کی تلوار اسلام کی تلوار سمجھی گئی، اس میں شک نہیں کہ جنگ کے وقت جہاں اور تدبیریں کی جاتی تھیں، وہاں لشکریوں کی مذہبی غیرت اور حمیت بھی ابھاری جاتی، جس سے بڑا فائدہ حاصل ہوتا تھا، اس لیے فاتحین عام لڑائیوں کو بھی جہاد کا رنگ دیدیتے تھے لیکن ان لڑائیوں کو جہاد کا رنگ دینے میں اسلامی تعلیمات کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے تھا، جس میں اس کی تصریح ہے کہ جنگ کے موقع پر ایسے لوگوں کو چھوڑ دیا جائے جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر رکھا ہو، عورتیں، بچے اور بوڑھے قتل نہ کیے جائیں، پھل دار درخت نہ کاٹے جائیں، کوئی آباد جگہ ویران نہ کی جائے، بکری اور اونٹ کھانے کے سوا بیکار نہ ذبح کیے جائیں، نخلستان نہ جلائے جائیں، مال غنیمت میں غبن نہ کیا جائے، لوٹ کا مال مردار کا گوشت سمجھا جائے، خانقاہیں اور عبادت گاہیں منہدم نہ کی جائیں، اور نہ کوئی ایسا قصر گرایا جائے جس میں ضرورت کے وقت دشمن قلعہ بند ہوتے ہوں، ناقوس پھونکنے اور گھنٹے بجانے کی مانعت کسی حال میں نہ ہو،

اگر یہ تمام باتیں ملحوظ رکھی جاتیں تو واقعی مسلمان فاتحین کی لڑائیوں سے اسلام کو سربلندی

حاصل ہوتی، لیکن اس کے بجائے مسلمان فاتحین اپنی نسلی اور قبائلی خصوصیات کی بنیاد پر وہ تمام باتیں کرتے رہے جو عام طور سے جنگ کے موقع پر ہوتی ہیں، گو ملک گیری کے بعد ملک داری کے سلسلہ میں انھوں نے مفتوحہ علاقہ میں امن پروری اور عدل پسندی کی بہتر سے بہتر مثالیں پیش کیں، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آچکا ہے۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کی حکومت کے زمانے میں ہندوستان کی تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی زندگی میں بہت سے جلوے پیدا ہوئے، درباری اور معاشرتی زندگی میں نئے نئے آداب رائج ہوئے، جن کو خود یہاں کے ہندو راجاؤں نے بھی اختیار کیا، زینت و آرائش میں انتہائی حسن و جمال نظر آنے لگا، علوم و فنون کی سرپرستی میں پوری فیاضی سے کام لیا گیا، لباس میں بڑا تنوع پیدا ہوا، کپڑے کی مصنوعات کو انتہائی ترقی ہوئی، زربفت، مخمل، طاس، مشجر، دیبا، ململ، پشمینے، شال، قالین وغیرہ کی طرح طرح قسمیں بنائی گئیں، مختلف قسم کے زیورات کی صناعی میں بڑی لطافت پیدا کی گئی، جواہرات کا انبار لگا دیا گیا، سنگار کے نئے نئے طریقے ایجاد ہوئے، خوشبوئیات میں مشک، عنبر، لاون، کافور، زباد، میدہ، عود، صندل، سلارس، لوبان، اظفار الطیب، منخوک، ارگجہ، عبیر، امیہ، زعفران وغیرہ سے طرح طرح کی چیزیں تیار کی گئیں، پھولوں کی چمن آرائی، خیابان بندی اور طرح داری کو ایک مستقل فن بنا دیا گیا، لاہور، دہلی، کشمیر اور آگرہ کے باغات آج بھی ان کے ذوق کی لطافت کی گواہی دے رہے ہیں، پھلوں میں پیوند کاری کر کے بہت سے نئے پھل ہندوستان میں رائج کئے گئے، کھانے کی چیزوں میں چاول، آٹے اور گوشت کی جتنی متنوع چیزیں بنائی گئیں، اسی طرح طرح طرح کے جو حلوے اور مربے تیار ہوئے، ان سے ہندوستانی کھانوں میں بڑی رنگا رنگی پیدا ہوئی، فن تعمیرات میں شلجم نما گنبدوں، کئی کئی پہل کے برجوں، منبت کاری، پچی کاری، استرکاری، کاشی کاری، سنگ مرمر پر پچی کاری وغیرہ پر جو جدت پیدا کی گئی، اس کو کسی حال میں

بھلایا نہیں جا سکتا، تاج محل آج بھی اس زمانے کے فن تعمیرات کی لطافت، نفاست اور نزاکت کی شہادت دے رہا ہے،
موسیقی میں امیر خسرو، حسین شاہ شرقی، نائک بخشو، تان سین، باز بہادر، سبحان خاں، محب خاں، بایزید خاں،
سلطان زین العابدین، سلطان مظفر گجراتی، سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی، سلطان محمد علی شاہ کی ایجادات
کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، اکبر اور جہانگیر کے عہد میں فن مصوری میں جو نزاکت، رنگ آمیزی، باریکی، مرصع کاری
اور فطرت نگاری پیدا ہوئی، اس سے ایک خاص اسٹائل بنا، جو مغل مصوری کے نام سے اب تک باقی ہے۔
اور یہ اسٹائل نہ بنا ہوتا تو ہندوستان کی مصوری کے مختلف اسکول وجود میں نہ آتے، کاغذ
مسلمانوں کے عہد کی یادگار ہے۔ رنگ پور، اچھ، جونپور، احمد آباد، احمد نگر، نعمت آباد،
برہانپور، زین آباد، مبارک آباد، مصطفےٰ آباد، دولت آباد، فیروز آباد، لاہور، الہ آباد،
آگرہ، فتحپور سیکری، حیدر آباد، مراد آباد، اورنگ آباد، ابراہیم آباد، عظیم آباد، بھکر،
سامانہ، اور خدا جانے کتنے اور قصبات اور قریے مسلمانوں کے زمانے میں آباد ہوئے، پھر
جو پل، نہریں اور سڑکیں تعمیر کی گئیں ان کی ان گنت تعداد شمار میں نہیں آسکتی، پھر پورے ہندستان
کی پیمایش کرائی گئی، قابل زراعت اور ناقابل زراعت زمینوں کی تفریق کی گئی، تقاوی دینے کا قاعدہ
جاری کیا گیا، تشخیص وجمع کے متعدد طریقے مقرر ہوئے، زمین کی قسمیں کی گئیں، مثلاً بنائی، بارانی،
چاہی، نہری وغیرہ، حیوانات کی نسل کی ترقی میں پوری کوشش کی گئی، ان تمام تفصیلات کے لیے
علیحدہ کتابیں بھی مطالعہ کی جا سکتی ہیں، اور خود جدوناتھ سرکار نے ہندوستان پر مسلمانوں کے
احسانات کا اعتراف کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ (۱) مسلمانوں نے ہندوستان کے تعلقات
بیرونی دنیا سے قائم کرائے، جس کی وجہ سے بحری جہاز رانی اور بحری تجارت کو از سر نو فروغ ہوا،
ہندوستان میں چولا کی حکومت کے خاتمہ کے بعد یہ دونوں چیزیں ختم ہو گئی تھیں، (۲) ہندستان
کے بیشتر علاقوں خصوصاً وندھیا کے شمال میں اندرونی طور پر امن و سکون قائم ہوا

(۳) ایک ہی قسم کے نظام حکومت سے تمام ملک میں یکسانیت پیدا ہوئی (۴) مذہبی عقائد کے اختلات کے باوجود اونچے طبقہ کے لوگوں کے عادات و اطوار و لباس وغیرہ اور معاشرتی امور میں یکرنگی پیدا ہوئی (۵) ہندی اور اسلامی طرز کا ایک آرٹ پیدا ہوا، جس میں ہندوؤں اور چینیوں کے آرٹ کی بھی آمیزش تھی، اس سے تعمیرات میں ایک نیا اسٹائل پیدا ہوا، اور عمدہ قسم کی صنعتوں کو فروغ ہوا، شال، کمخواب، قالین اور مرصع کاری اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں (۶) ایک مشترکہ زبان پیدا ہوئی، جو ہندوستانی یا ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی، نثر نویسی میں ایک سرکاری اسٹائل کا رواج ہوا، جس کی بنا ان ہندو منشیوں نے ڈالی جو فارسی لکھا کرتے تھے، اور اس اسٹائل کو مرہٹوں نے بھی اپنی زبان میں رائج کیا (۷) دہلی کی حکومت کی وجہ سے جب امن اور اقتصادی خوشحالی بڑھی تو ملکی لٹریچر کو بھی ترقی ہوئی، (۸) مذہب میں توحید کے تصور کی تجدید ہوئی اور تصوف پھیلا (۹) تاریخی لٹریچر پیدا ہوا (۱۰) فنون جنگ اور تمدن کے عام شعبوں کو فروغ ہوا، جدوناتھ سرکار یہ بھی لکھتے ہیں کہ مسلمانوں ہی کی وجہ سے تعمیرات میں ایک نیا طرز ایجاد ہوا، محلوں اور مقبروں کی تعمیر انکی خاص چیز ہے، پھر ان کی وجہ سے مصوری کا ایک خاص اسکول قائم ہوا، اور ان ہی کی وجہ سے ہندوستان میں فن باغبانی کا ذوق پیدا ہوا،

لیکن یہ دیکھکر دکھ ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کا ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو ان تمام کارناموں کو نظر انداز کر کے مسلمان بادشاہوں نے جنگ کے زمانے میں جو کچھ کیا اسی کو نمایاں اچھالنے کی کوشش کر رہا ہے، اور اس سلسلہ کی خونریزی اور غارت گری کو اسلام کی طرف منسوب کر کے اسلام کے خلاف نفرت اور اشتعال پیدا کر رہا ہے۔

تیسرا مطالبہ مسلمانوں نے جنگ کے علاوہ جنگ کی غرض سے غضب اور عداوتیں مگر مسلمانوں کے مذہب کو بھی بدنام کر

کی کوشش کا نتیجہ علما اور صوفیہ حکام کے بعد اسلام کی سچی تعلیم کے مطابق اس کو دین رحمت کی حیثیت سے پیش کرتے رہے اور یہ بتلاتے کہ ان کی کوئی تعلیم بھی انسانوں کے لیے رحمت سے خالی نہیں، اور دنیا کی کوئی مخلوق بھی اس کے فیضان رحمت سے محروم نہیں۔ اس کا خدا رحمن و رحیم ہے، ستار و غفار ہے، اس کی تمام صفات میں رحمت، ستاری اور غفاری کا غلبہ ہے، اس کی رحمت و مغفرت کا دروازہ گنہ گاروں کے لیے بھی بند نہیں، اور بڑے سے بڑا گناہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت بے پایاں کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اسلام میں انسان کا رتبہ بہت بلند ہے، وہ اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے، زمین و آسمان، چاند اور سورج، دریا اور سمندر، خشکی اور تری سب اس کے لیے پیدا کی گئی ہے، اسلام رنگ و نسل و نسب اور سارے امتیازات کو ختم کرنے کے لیے آیا ہے، اور وہ سارے انسانوں کو ایک سطح پر کھڑا کرنا چاہتا ہے، وہ انسانی مساوات، اخوت، غربا و مساکین کی پرورش، خدمت خلق، انسان دوستی، عدل پروری، رحم و کرم، لطف و مدارات، نیک کاموں کی تبلیغ و ترغیب اور برائیوں کے انسداد کے لیے ہے۔ وہ اس حدیث قدسی کی عملی تعبیر و تشریح ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل قیامت کے دن فرمائے گا کہ اے ابن آدم میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی، بندہ عرض کرے گا پروردگار! میں تیری عیادت کس طرح کرتا، تو تو خود سارے جہان کا پروردگار ہے، خدا فرمائے گا، کیا تجھکو نہیں معلوم میرا فلاں بندہ بیمار پڑا، مگر تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تو عیادت کرتا تو مجھکو اس کے پاس موجود پاتا۔ اے ابن آدم! میں نے تجھے کھانا مانگا تو نے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا، پروردگار، تو تو خود رب العالمین ہے، میں تجھکو کھانا کس طرح کھلاتا، خدا فرمائے گا، میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا،

مگر تونے نہیں کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کھانے کو میرے پاس موجود پاتا، اے ابن آدم!
میں نے تجھ سے پانی مانگا، مگر تو نے نہیں پلایا، بندہ عرض کرے گا، پروردگار، میں تجھکو کس طرح
پانی پلاتا، تو تو خود رب العالمین ہے، خدا فرمائے گا، فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا
تو نے نہیں پلایا، اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس موجود پاتا۔

اسی طرح علما، اس کا ثبوت دیتے کہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی انسان سے نفرت
نہ کیجائے، اور ان کو انسانی حقوق سے محروم نہ کیا جائے، اور ان سے معاشرتی حقوق
ادا کیے جائیں، کیونکہ کلام مجید میں دوسروں کے معبودوں کو برا کہنے کی ممانعت ہے،
اور یہ حکم ہے کہ مسلمانو! جو لوگ خدا کے سوا دوسرے لوگوں (معبودوں) کو پکارتے ہیں،
ان کو برا نہ کہو، ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ بھی ناحق اور نادانی سے خدا کو برا کہیں، پھر کلام مجید
میں یہ بھی ہے کہ دین میں جبر و زبردستی نہیں، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسلموں
کے مظالم سے تنگ آجاتے، اور آپ سے درخواست کی جاتی کہ آپ ان کے لیے بددعا فرمائیں
تو آپ فرماتے کہ میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں، بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں،

پاک طینت علماء نے اسلام کو اس رنگ میں ضرور پیش کیا ہوگا، کیونکہ اگر اسلام
اس رنگ میں یہاں کے باشندوں کو نظر نہ آتا تو یہاں وہ سرسبز نہیں ہو سکتا تھا لیکن
ایسے علما کی کوششوں کا ذکر تاریخوں میں نہیں کیا گیا ہے، اور ستم یہ ہے کہ بعض مورخوں
نے بعض متشدد علماء کے ایسے اقوال نقل کر دیے ہیں جن کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں،
مثلاً ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی نے قاضی
مغیث الدین سے ہندوؤں کی شرعی حیثیت کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے
جواب دیا کہ

"ہندوؤں کو ذلیل رکھنا دینداری کے لوازم میں سے ہے، کیونکہ یہ حضرت مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اسی لیے حضرت مصطفیٰ علیہ السلام نے ہندوؤں کے قتل اور ان سے مال غنیمت لینے اور ان کو غلام بنانے کا حکم دیا ہے۔" (ص ۲۹۰)

یہ تمامتر قاضی مغیث الدین کی من گھڑت حدیث ہے، جس کو مولانا ضیاء الدین برنی نے خواہ مخواہ نقل کرکے نہ صرف اس عہد کی تاریخ بلکہ اسلام کو نقصان پہنچایا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ مسلمان حکمرانوں کے رویے کی جو وضاحت کر دی ہے وہ اس حدیث کی روایت سے ظاہر ہوتی ہے، جو قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں کی ہے، اس میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ارقم کو جزیہ کے وصول کرنے پر مقرر کیا تو ان کو بلا کر فرمایا

الا من ظلم معاهدا او كلفه	جان لو کہ جو شخص کسی معاہد (یعنی ذمی) پر
فوق طاقته او انتقصه واخذ	ظلم کرے گا یا اس سے اس کی طاقت سے
منه شيئا بغير طيب نفسه فانا	زیادہ کام لے گا یا اس کو ذلیل کرے گا
حجيجه يوم القيامة	یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر لے گا تو میں قیامت کے دن اسکا دشمن ہونگا۔

صحابہ کرام کا بھی عمل اسی پر رہا، شام کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو جو فرمان لکھا اس میں یہ الفاظ تھے، کہ مسلمانوں کو ان کے ظلم و نقصان سے روکو، اور ان کے مال کھانے سے منع کرو، اور ان کو جو حقوق تم نے جن شرائط پر دیے ہیں، ان کو پورا کرو، حضرت عمرؓ کو ایک غیر مسلم ہی نے شہید کیا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی وفات کے وقت نہایت ضروری وصیتیں جو کیں ان میں ایک یہ تھی کہ ذمیوں یعنی غیر مسلموں کے ساتھ جو اقرار ہے

وہ پورے کیے جائیں، ان کی طاقت سے زیادہ کام ان سے نہ لیا جائے اور ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی طرف سے لڑائی کی جائے، حضرت عمرؓ کی اس وصیت کو امام بخاری نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، حضرت عمرؓ کے پاس ایک عیسائی غلام استق نامی تھا، جس کو انھوں نے دعوت اسلام دی، اس نے انکار کیا تو فرمایا کہ لا اکراہ فی الدین یعنی مذہب میں کوئی زبردستی نہیں، اور دوسرے صحابہ بھی ذمیوں یعنی غیر مسلموں پر کسی قسم کی سختی ہوتی دیکھتے تو فوراً مواخذہ کرتے تھے، سعید بن زیدؓ نے ایک دفعہ دیکھا کہ ذمیوں کو مال گذاری وصول کرنے کے لیے دھوپ میں کھڑا کیا گیا ہے، اسی وقت وہاں کے حاکم سے جاکر کہا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص لوگوں کو عذاب دیتا ہے، خدا اس کو عذاب دے گا، ہشام بن حکیم کو بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا اور انھوں نے اسی وقت حاکم یعنی عیاض بن غنم کے پاس جاکر ملامت کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی قول سند میں پیش کیا، ان تاریخی حقایق کے باوجود مولانا ضیاء الدین برنی کو قاضی مغیث الدین کے اس بیان کو نقل کرنے میں تامل نہیں ہوا کہ محصل دیوان جب ہندو خراج گذار کے منہ میں تھوکے تو وہ بغیر کسی کراہت کے اپنا منہ کھول دے اور اس حالت میں بھی محصل کی پوری خدمت کرے، مولانا ضیاء الدین برنی نے یہ بھی لکھا ہے کہ علاء الدین خلجی کے دور حکومت میں ایک مشہور مصری محدث اور عالم مولانا شمس الدین ترک ہندوستان تشریف لائے تو علاء الدین خلجی کا طرز عمل یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ جو خواری، زاری، لااعتباری اور بے مقداری کا تھا، اس پر آفرین بھیجی، لیکن موجودہ دور کا کوئی تنگ نظر اور متعصب عالم بھی اس مصری عالم کے آفرین بھیجنے پر خوش نہیں ہو سکتا، معلوم نہیں اس زمانے میں کس بنا پر ایسی فضول باتیں کہی گئیں، جن کو اسلام سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے، اس سے کوئی

فائدہ تو حاصل نہیں ہوا، لیکن یہ نقصان ضرور ہوا کہ اس قسم کے اقوال سے فرقہ پرست ہندوؤں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک حربہ مل گیا۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی دور میں مولانا ضیاء الدین برنی کے معاصر اور دوست امیر خسرو اپنی شاعری اور تحریروں کے ذریعہ سے ہندوؤں کی تسخیر قلوب کے لیے ہر قسم کی کوشش کر رہے تھے، اور ان کی شاید یہ تمنا تھی کہ یہاں کے مختلف باشندوں میں یگانگت اور موانست ہو، اور وہ ایک دوسرے کے خدمات کو سمجھ کر باہمی احترام کا جذبہ پیدا کریں، چنانچہ وہ اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں میں ایک آتش پرست ہندو کا ذکر مقصد آلے آتے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ اس سے سوال کیا گیا کہ وہ آگ کی پرستش کیوں کرتا ہے، اور اس کے لیے کیوں جان دیتا ہے، اس نے جواب دیا کہ آگ کو دیکھ کر امید وصل فروزاں رہتی ہے، اور آگ میں فنا ہو کر بقا حاصل ہوتی ہے، خسرو نے اس جذبہ کی قدر کی ہے، اسی طرح وہ ہندوؤں کے علوم و فنون کی مدح سرائی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ دانش و معانی ہندوستان میں اندازہ سے باہر ہے، یونان حکمت میں مشہور ہے، لیکن ہندوستان اس میں تہی ما یہ نہیں، یہاں منطق بھی ہے اور نجوم اور کلام بھی، البتہ ہند وفقہ سے واقف نہیں ہیں، لیکن وہ طبعیات، ریاضیات اور ہیئت کے ماہر ہیں، مابعد الطبیعیاتی علوم نہیں جانتے ہیں، لیکن مسلمان اور دوسری قومیں بھی ان سے ناواقف ہیں، خسرو ہندوؤں کے تصور وحدانیت کے بھی معترف تھے، وہ لکھتے ہیں کہ ہندو ہمارے مذہب کے قائل نہیں، لیکن ان کے بہت سے عقائد ہمارے عقائد سے مشابہ ہیں، وہ خداوند تعالیٰ کی توحید، اس کے وجود اور قدم کے معترف ہیں، اس کی قدرت ایجاد اور اس کے رازق، خالق، فعال، فاعل مختار اور عالم جزو کل ہونے کے قائل ہیں، اس سلسلہ میں امیر خسرو نے ہندوؤں کے مذہب کا بھی اسلام کے علاوہ اور تمام مذہب سے مقابلہ کیا ہے،

اور اس کو ان سے برتر بتایا ہے، اور اس کے وجوہ یہ بیان کیے ہیں کہ ثنوی فرقہ خدا کو دو مانتا ہے، لیکن ہندو ایک مانتے ہیں، عیسائی حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں، لیکن ہندو اس قسم کے عقائد کے قائل نہیں، فرقۂ مجسمہ خدا کو صاحب جسم مانتا ہے، لیکن ہندو ایسا اعتقاد نہیں رکھتے، ستارہ پرست سات خدا کو مانتے ہیں، لیکن ہندو اس قسم کے عقائد کے قائل نہیں، فرقۂ مشبہ خدا کو ممکنات سے تشبیہ دیتے ہیں، ہندو اس کے خلاف ہیں، پارسی نور و ظلمت دو خدا مانتے ہیں، لیکن ہندو اس خیال سے بری ہیں، وہ پتھر، جانور، آفتاب اور درخت کو ضرور پوجتے ہیں، لیکن ان کی پرستش میں اخلاص ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں اور اس کی اطاعت کے منکر نہیں، وہ اور چیزوں کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے آباد اجداد ان کی پوجا کرتے آئے ہیں،

امیر خسرو ہندو مرد اور عورت کے جذبات وفاشعاری سے بھی متاثر ہوئے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہندو اپنی وفاداری میں تلوار اور آگ سے اپنی جان دے سکتا ہے، اور ایک ہندو عورت اپنے شوہر کی خاطر جل کر راکھ ہو جاتی ہے، ہندو مرد اپنے بت اور مالک کے لیے اپنی جان بھینٹ چڑھا دیتا ہے، اور وہ تو یہ بھی کہہ گئے ہیں،

اے کہ ز بت طعنہ بہ ہندو بری ہم ز وے آموز پرستش گری

اور پھر تسخیر قلوب کے لیے امیر خسرو نے ہندوستان کی ہر چیز کی تعریف کی ہے، اپنے ہم مذہبوں کو اس سے محبت اور لگاؤ پیدا کرنے کی تلقین کی، ہندوستانی زبان، ہندوستانی کپڑوں، ہندوستانی پھولوں، میووں، پرندوں، جانوروں اور عورتوں کے حسن کے بیان کرنے میں ان کا قلم رقص کرنے لگتا ہے، اسی تسخیر قلوب کے لیے انھوں نے جنت ہی ہندستان کو کہہ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر ہمیشہ چھائے رہیں گے،

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی ڈسکوری آف انڈیا میں تحریر فرماتے ہیں کہ امیر خسرو نے بہت سے موضوع پر لکھا ہے، خاص طور سے ہندوستان کی ان چیزوں کی مدح کی ہے جن میں ہندوستان کو فوقیت حاصل ہے، یہاں کے مذہب، فلسفہ، منطق، زبان، سنسکرت، گرامر، موسیقی، ریاضی، سائنس اور آم کی تعریف کی ہے، لیکن ان کی زیادہ شہرت ان کے مشہور گیتوں کی وجہ سے ہے جو انھوں نے عام فہم ہندی زبان میں لکھے ہیں،" پنڈت جی یہ بھی لکھتے ہیں کہ مجھکو کسی جگہ کی ایسی مثال نہیں ملی کہ چھ سو برس پہلے جو گیت لکھے گئے وہ عوام میں برابر مقبول رہے، اور الفاظ کی تبدیلی کے بغیر ویسے ہی گائے جاتے ہیں،

امیر خسرو کی تقلید میں بہت سے مسلمان شعراء نے ہندی اور سنسکرت میں اشعار کہے، ان کے ناموں کی فہرست طویل ہے، کچھ کے نام یہ ہیں، داؤد، قطبن، ملک محمد جائسی، شیخ نبی، قاسم شاہ، نور محمد، تاج، جمال، عبدالرحیم خانخاناں، قادر، مبارک، عالم، شیخ، شاہ محمد نظام الدین مدھنایک، سید رحمت اللہ، میر عبدالجلیل بلگرامی، غلام نبی، سید برکت اللہ، محمد عارف، شاہ کاظم وغیرہ،

خود صوفیہ کرام نے ہندی دوہے کہے، پہلے ذکر آیا ہے کہ حضرت شیخ شرف الدین یحیٰی منیری، حضرت شیخ عبد الحق ردولوی، اور حضرت شیخ عبد القدوس گنگوہی کے دوہے مشہور ہیں، قوالی میں بھی کا رنگ غالباً ہندوؤں ہی کی تسخیر قلوب کے لیے پیدا کیا گیا، صوفیہ کرام نے اپنی لینت، محبت، شفقت، نرمی، خوش خلقی، وسیع المشربی، وسیع الخیالی اور انسان دوستی سے غیر مسلموں کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش برابر کی، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء ہندو جوگیوں سے بلا تکلف ملتے اور ان کی باتیں غور سے سنتے، فوائد الفواد میں ہے کہ ایک بار اجودھن میں حضرت فرید الدین گنج شکر کے پاس ایک جوگی آیا تو حضرت شیخ نظام الدین اولیاء نے

اس سے پوچھا کہ تم کونسی روش پسند کرتے ہو اور کس چیز پر عمل کرتے ہو تو اس نے جواب دیا کہ ہمارے علوم یہ بتاتے ہیں کہ انسانی نفس میں دو عالم ہیں، ایک عالم علوی اور ایک عالم سفلی۔ سر سے ناف تک تو عالم علوی ہے، اور ناف سے پاؤں تک عالم سفلی ہے، عالم علوی میں سچائی، صفائی، بلند اخلاق اور حسن معاملہ ہوتا ہے، اور عالم سفلی میں نگہداشت، پاکی اور پارسائی ہوتی ہے، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء نے جب یہ باتیں سنیں تو فرمایا

مرا ایں سخن او خوش آمد

اسی طرح ایک اور جوگی حضرت فرید الدین گنج شکر کی خانقاہ آیا تو اس نے بچوں کی پیدائش کے متعلق گفتگو کی، جس کو حضرت شیخ نظام الدین اولیاء نے بڑے شوق سے سنا اور کہا کہ میں نے تمہاری گفتگو کو سنکر ذہن نشین کر لیا ہے، اور تم بھی میری گفتگو کو غور سے سنو۔

غیر مسلموں کے ساتھ چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں کا جو رویہ رہا، اس کی ترجمانی شاہ محمد سلیمان تونسوی (المتوفی ۱۸۴۹ء) کے ان ملفوظات سے ظاہر ہے جو نافع السالکین میں درج ہے، انھوں نے فرمایا کہ ہمارے سلسلہ کے طریقہ میں ہے کہ ہندو اور مسلمان سے صلح رکھی جائے اور اس بیت کو شہادت کے طور پر پیش کرتے تھے۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام

با مسلمان اللہ اللہ اور با برہمن رام رام سے مراد یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں جام شریعت ہو تو دوسرے ہاتھ میں سندان عشق، اور تمام اکابر صوفیہ کا عمل اسی پر رہا، اور اسی کے ذریعہ ہندو مسلم ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکتے تھے، البتہ کچھ صوفیہ ایسے بھی گزرے ہیں جنھوں نے تبحر قلب کی خاطر جام شریعت کو چھوڑ دیا اور صرف سندان عشق لیکر آگے بڑھے

[illegible] میں کچھ ایسے صوفی پیدا ہو گئے تھے جو اپنے کو رشی کہتے، انھوں نے ہندو رشیوں ہی
طرح یوگ، حبس دم اور دھیان، گیان کے طریقوں کو اپنایا، ہندوستان کے مختلف
گوشوں میں کچھ ایسے صوفی بھی تھے، جو تصوف اور ویدانت کو ایک ہی چیز سمجھتے رہے،
پھر کبیر، اکبر اور دارا شکوہ صرف سندان عشق ہی کے معترف تھے، کبیر نے جب یہ تعلیم
دی کہ دنیا کا مالک ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس کے سامنے دیوی دیوتاؤں
کی کوئی حقیقت نہیں، وہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے، اس تک پہنچنے کے لیے محض سچے
پریم کی ضرورت ہے، کسی کی وساطت اور شفاعت درکار نہیں،

کہے کبیر اک رام جپو رے، ہندو ترک نہ کوئی

تو اس میں بڑی ہمہ گیریت تھی، لیکن اس پیام میں سندان عشق کے ساتھ جام شریعت نہیں
تھا، اسی لیے علماء کے زیر اثر رہنے والے مسلمان عوام ان کی طرف بہت زیادہ مائل نہیں
ہوئے، یہی حال دین الٰہی کا بھی ہوا،

اکبر کے دین الٰہی میں بظاہر بڑی وسیع المشربی ہے، اور اس کو ایک گروہ انسانیت
کا بہت بڑا منشور سمجھتا ہے، اکبر نے اس کے ذریعہ سے ہندوستان کے غیر مسلموں.....
کے دلوں کو تسخیر کر کے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا، لیکن جب اس نے اس کو عمل میں لانے
کی کوشش کی تو پہلے اس کو امام عادل، مجتہد، صاحب دین حق اور ہندوستان بہتر فرقوں
کے اختلاف مٹانے والا نبی امی بننا پڑا، اور پھر دین الٰہی کی تاسیس وترویج کے سلسلہ میں
اس نے جو کچھ کیا، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کی اس مذہبی بدعت
سے نہ صرف اس زمانہ کے مسلمان برگشتہ خاطر ہوئے، بلکہ خود شہزادہ سلیم نے زندگی بھر اس سے پہلو تہی کی

مآثر الامراء جلد دوم ص ۱۷۱۶ میں ہے،

"جنت مکانی (یعنی جہانگیر) می فرمودند کہ چوں شیخ ابوالفضل بہ بے دینی و بیمذہبی یکتا بود کہ جناب ختمی پناہی (صلی اللہ علیہ وسلم) فصاحت تمام داشتہ، قرآن کلام اوست لہٰذا وقت آمدنش از دکن نرسنگہ دیو گفتم کہ بقتل آورد، بعد ازیں پدرم ازیں اعتقاد برگشت۔"

اس دور کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا حضرت احمد سرہندیؒ کو بھی دکھ تھا کہ اکبر نے کلمہ کی جگہ لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ پڑھوانا شروع کیا تھا، حج، زکوٰۃ، نماز با جماعت کو بدعقلی کی باتیں قرار دی گئی تھیں، مسلمانوں کے لیے گاؤکشی کی ممانعت ہو گئی تھی، لیکن سور اور کتے کے ناپاک ہونے کا مسئلہ منسوخ کر دیا گیا تھا، مسلمانوں کے لیے قاضیوں کا مقرر کرنا بند ہو گیا تھا، حتیٰ کہ مسجدیں ویران ہو گئی تھیں، بلکہ بہت سی منہدم کر دی گئی تھیں وغیرہ وغیرہ، ان تمام باتوں سے حضرت احمد سرہندیؒ کو انتہائی تکلیف تھی، وہ بڑے دکھ اور درد سے جہانگیر کے دربار کے ممتاز امیر شیخ فرید کو لکھتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں کہ گذشتہ زمانہ میں اہل اسلام کے سر پر کیا گذرا ہے..... مسلمان اسلام کے احکام جاری کرنے سے عاجز تھے، اور اگر کرتے تھے تو قتل کیے جاتے تھے، (مکتوب نمبر ۴۷ جلد اول)

اسی سلسلہ میں بعض اوقات انھوں نے ہندوؤں اور شیعوں کے متعلق کچھ سخت الفاظ استعمال کیے ہیں، جن سے ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو، لیکن انھوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ انتہائی آزردگی اور اشتعال کا نتیجہ ہے، وہ ایک دکھے ہوئے دل کی چیخ اور پکار ہے، اکبر کی بدعتوں سے جو نتائج پیدا ہوئے، وہ ان کے لیے ناقابل برداشت تھے، ان کے لیے تو بدعت حسنہ بھی کوئی چیز نہیں تھی، اور اکبر کی تمام بدعتیں تو ان کے نزدیک تو بدعات سیئہ تھیں، وہ اسلامی عقائد میں کسی قسم کی بیرونی آمیزش پسند نہ کرتے تھے،

دوسرے مذاہب سے اسلام کا موازنہ اور مقابلہ کرکے خواہ مخواہ کا اشتراک پیدا کرنا بھی ان کو گوارا نہ تھا، ایسی کوششوں سے ان کی رگ حمیت پھڑک اٹھی تھی، اسی لیے انھوں نے اسلام کو تمام بدعتوں سے پاک کرنے میں بڑی صعوبتیں اٹھائیں، اور جو ہندوانہ رسم ورواج مسلمانوں میں پیدا ہوگئے تھے، ان کو بدعت سیئہ سمجھ کر دور کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کی تو مذمت کی ہے کہ مسلمانوں نے ان کو قبول کرلیا ہے، لیکن جہانگیر کے زمانے میں جب ان کی مقبولیت زیادہ بڑھی تو اس وقت بھی کبھی سرزمین ہند سے ہندوؤں کی معاشرت سے ان کے رسم ورواج کو بالکل ہی پاک کر دینے کی تلقین نہیں کی، کسی مسلمان کا ہندو ہونا تو ان کے لیے بہت بڑا سانحہ ہوتا، لیکن ہندو کا ہندو رہنا ان کو کسی حال میں ناگوار نہ ہوتا، وہ اپنے مکتوب میں لکم دینکم ولی دین کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مسلمان اپنے دین پر قائم رہیں اور غیر مسلم اپنے طریق (کیش) پر رہیں (مکتوب ۲۴۶ ج اول) اور وہ تو اس کے بھی قائل تھے کہ ہندوستان میں بھی پیغمبر مبعوث ہوئے، اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ گذشتہ امتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی جگہ بہت کم ہے جہاں پیغمبر مبعوث نہ ہوئے ہوں، اہل ہند میں بھی پیغمبر ہوئے، اور صانع جل شانہ کی طرف دعوت دی گئی، ہندوستان کے بعض شہروں میں محسوس ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے انوار اندھیرے میں شعلوں کی طرح روشن ہیں، اگر کوئی ان شہروں کو متعین کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، اور ہندوستان میں جن لوگوں نے واجب تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات اور اس کے تنزیہ وتقدیس کی نسبت لکھا ہے، سب انوار نبوت سے مقتبس ہیں، کیونکہ گذشتہ امتوں میں ہر ایک کے زمانہ میں ایک نہ ایک پیغمبر ضرور گذرا ہے جس نے واجب تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات قدیمہ اور اس کے تنزیہ وتقدیس کی نسبت خبر دی ہے (مکتوب ۲۵۹ ج اول)

اگر حضرت احمد سرہندیؒ کے بعض مکتوبات میں لینت اور نرمی کے بجائے ان کے مسلک کی شدت اور سختی کا اظہار ہوتا ہے تو اسکی ذمہ داری اکبر پر آتی ہے جس نے دلوں کی تسخیر دارو گر دکھا کر کیا، اور یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اس کے دین الٰہی اور دوسرے اقدام سے ہندو تو اس کی ضرور مائل ہوگئے لیکن ہندو مسلمان ایک دوسرے کے قریب تر نہ ہو سکے، بلکہ ہندو مسلما ایک ملا جلا معاشرہ خود بخود بن رہا تھا، اس کو سخت نقصان پہنچا،

بابر نے پانی پت اور کنواہا میں بڑی خونریزی کر کے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم پھر بھی اس نے یہاں کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کرنے کی پوری کوشش کی جس میں وہ کامیاب پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کے . . . . بارے میں لکھا ہے کہ اس کی ذات میں بڑی دلکشی وہ نشاۃ ثانیہ کے عہد کا ایک رہنما تھا. بہت ہی بہادر اور دلیر تھا. آرٹ، ادب اور خوش با کا دلدادہ تھا. ہمایوں نے بھی اپنی رواداری سے یہاں کے باشندوں کو اپنی طرف مائل رکھا، شیر شاہ کی رواداری کا راگ تو ہر زمانہ میں الاپا جائے گا، اس نے مذہب اور سیاست میں ایسا خوشگوار امتزاج پیدا کر دیا تھا، جس سے ہندوستانی قومیت کو ترقی کرنے کیلئے نہایت مناسب فضا مل گئی تھی، انگریز اور ہندو دونوں مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ہندوستان کا پہلا حکمراں ہے جس نے عوام کی مرضی کے مطابق ایک ہندوستانی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی، اور یہ کام اس نے اپنے عہد کے اس سیاسی اصول سے ہٹ کر انجام دیا کہ سیاسی اتحاد بغیر مذہبی یکسانیت کے قائم نہیں ہو سکتا، وہ تنگ نظری پسند نہ کرتا تھا، اسی لیے اس کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ صرف اس کے ہم نسل ہی اپنے کو ارکان حکومت سمجھیں، بلکہ ملک کے تمام باشندے ملک کے مشترکہ مفاد کو سامنے رکھ کر اس کے خیر خواہ رہیں، اس طرح اس نے ہندوستانی قومیت کے لیے راستے ہموار کیے، موجودہ دور کے مورخوں میں شیر شاہ کے معتقد کالکا رنجن

نے لکھا ہے:

"شیر شاہ پہلا حکمران ہے جس نے مختلف مذاہب کے پیروؤں کو ملا کر ایک ہندوستانی قوم بنانے کی کوشش کی، یہ امتیاز اکبر کو دیا جاتا ہے، اور شیر شاہ کے لیے یہ دعویٰ فضول سا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بظاہر اس نے جزیہ لینا بند نہیں کیا، گائے کے ذبیحہ کی ممانعت کے لیے کوئی قانون نہیں بنایا، سنسکرت زبان کی کوئی ایسی سرپرستی نہیں کی جس سے ہندو اور مسلمان دونوں میں کلچرل اتحاد اور علمی یگانگت پیدا ہوئی، اس نے ہندو مسلمان میں شادی بیاہ کا رشتہ بھی قائم کرنے کی کوشش نہیں کی، اور یہ تمام باتیں اکبر کی جانب منسوب ہیں، لیکن شیر شاہ صحیح معنوں میں ایک مدبر تھا، اس نے علاء الدین کے چراغ کے ذریعہ ایک رات میں کوئی ہوائی قلعہ تیار کرنے کی سعی نہیں کی، بلکہ ایک ایسا جاندار اور پائدار نظام حکومت قائم کیا جس سے ہندوؤں میں سیاسی اور اقتصادی خوشحالی خود بخود پیدا ہو گئی، اس نے ہندو مسلمانوں کو متحد رہنے پر آمادہ کیا، اس طرح اس نے ہندستانی قومیت کی بنیاد ڈالی اور اس کے لیے جتنی چیزیں ضروری تھیں، ان سب کو عمل میں لانے کی کوشش کی۔"

شیر شاہ نے جو فضا پیدا کی تھی، اسی کو اور بھی زیادہ خوشگوار بنانے کی ضرورت تھی، اس نے ہندو مسلمان کے اتحاد و یگانگت کی جو بنیاد ڈالی تھی، اسی کو اور مستحکم بنانا تھا، لیکن اکبر نے شیر شاہ سے علیحدہ ایک شاہ راہ بنانے کی کوشش کی، اور اس کے نتیجہ پر بحث کرتے ہوئے کالکا رنجن قانون گو رقمطراز ہیں:

"اگر اکبر غلط قدم نہ اٹھاتا تو ہندستان کی قومیت سترھویں صدی عیسوی ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی، اکبر نے جزیہ بند کر دیا ہوتا، یا ذبیحہ گاؤ کو روک دیا ہوتا، اپنے نظام حکومت میں ہندو

کو ایک منگ شریک کرلیا ہو، یا سنسکرت زبان کی سرپرستی میں لگا دیتا تو یہاں تک
کوئی مضائقہ نہ تھا، لیکن اس کے عجیب و غریب خیالات نے اس کو ایک نئے مذہب کا پیغمبر
بنا دیا اور ساتھ ہی ساتھ وہ رعایا کا سیاسی حکمران بھی رہا، اور یہی خیالات اس کی اسکیم کی
تباہی کے باعث بنے، اس نے کوئی متحدہ قوم نہیں بنائی بلکہ اس کی اسکیم سے ایسے چند مخالف
مسلمان اور مخالفانہ ذہنیت کے ہندو ضرور پیدا ہوئے جو اس کو خوش کرنے کے لئے
افترا و پسند لکھا کرتے تھے"

آگے چل کر کالکا رنجن نے ایک غیر جانبدار مورخ بن کر اور تمام جذبات سے خالی ہو کر جو کچھ لکھا ہے
اس کو مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کے جذبات کی بھی ترجمانی سمجھنا چاہیے، وہ لکھتے ہیں:۔

"اکبر نے اسلام کے ساتھ ناانصافی کی، اس کو خواہ مخواہ رسوا کیا جس کے لیے اس کی تاریخ
اس کو معاف نہیں کر سکتی، اس نے جو کچھ کیا ریاست کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ ایک وہم
کو پورا کرنے کے لیے کیا، اس کی پالیسی کی وجہ سے ہندو اور مسلمان تخت کو اتحاد و اتفاق
کا مرکز سمجھنے میں بالکل قاصر رہے، ہندو تو اس کی جانب مائل ہوئے لیکن مسلمانوں کی رغبت
جاتی رہی، اکبر کا اسلام سے انحراف اس کی غیر معمولی ذہانت کا اچھا نمونہ نہ تھا، اس کو اپنی
نجی زندگی میں سچا مسلمان ہونا چاہیے تھا، اگر وہ واقعی ہندو مسلمانوں کے تعلقات کی خوشگواری
اور ہمواری کا خواہاں تھا، تو سے اپنے ہم مذہبوں کو ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرنا
سکھانا چاہیے تھا، لیکن اس کی تکمیل کسی جابرانہ حکم کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتی تھی، مگر وہ
خود اسلام کا ہمدرد بنتا تو مسلمان اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کی [illegible]
کو نیک نیتی پر محمول کرتے، بلکہ اس کو اسلام کا غدار تصور کرنے لگے، اس کا
[illegible] وہ اسلام کی خدمت ہی سمجھنے لگے کہ [illegible]

بنیادوں کی ہر چیز سے نفرت کریں، یہیں سے ہندوستانی قومیت کا خاتمہ ہوگیا، اگر اکبر کا جانشین دارا ہوتا تو خاندان بابری ایک بار پھر دربدر کر دیا جاتا، اکبر کے مرنے کے بعد اس کی پالیسی کا ردعمل بالآخر اورنگ زیب کی صورت میں ظاہر ہوا۔

دین الٰہی ہندو مسلمانوں میں جگہ نہ پا سکا، اور یہ فطری موت مر گیا، لیکن جہانگیر اور شاہجہاں کے رواداریانہ اور مصالحانہ رویہ سے ہندو مسلم کا پھر ایک ملاجلا معاشرہ خود بخود پیدا ہونے لگا تھا، ضرورت تھی کہ اس میں مزید سیاسی، معاشرتی، عمرانی اور اجتماعی رواداری سے اور بھی قوت نمو پیدا کی جاتی، لیکن اکبری عہد کے تلخ تجربہ کے بعد دارا شکوہ نے ایک بار پھر ہندو مت اور اسلام کو ملا کر مذہب کا ایک نیا سنگم بنانے کی کوشش کی جس سے راسخ العقیدہ مسلمان اس سے مشکوک اور بدظن ہو کر اورنگ زیب کی طرف مائل ہوگئے، اب اورنگ زیب مسلمانوں کا ہیرو بن گیا ہے، جس کو ہندو مورخین کسی حال میں بھی اچھا حکمراں کہنے کو تیار نہیں ہیں، اور وہ اس کو ہندوؤں کا بہت بڑا مخالف ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں، جس سے مسلمان اور مسلمان مورخین دونوں کو انکار ہے، اور یہ ہندوستان کی بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ مسلمان جس کو اپنا ہیرو سمجھتے ہیں اس کو ہندو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں، اور ہندو جس کو اپنا ہیرو تصور کرتے ہیں اس کو مسلمان اچھا تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔

ہندو مسلمان کو ملے جلے مذہب کے ذریعہ سے ملانے کی ناکام کوشش تو برابر ہوتی رہی، لیکن صحیح طور پر ایک دوسرے کو سمجھ کر سمجھانے کی باضابطہ کوشش نہیں ہوئی، البیرونی اور ابوالفضل نے ہندوؤں کے مذہب کا گہرا مطالعہ ضرور کیا لیکن ان کا رنگ تحقیقی اور علمی ہے، اور پھر انھوں نے کچھ ایسی مشکل زبان میں قلمبند کیا ہے کہ عام طور سے لوگ انکو سمجھ نہ سکے، اس طرح اسلام کی خوبیاں صحیح طور پر ہندوؤں تک نہیں پہنچیں، اسی لیے دونوں ایک دوسرے کیلئے نازیبا اور نامناسب الفاظ استعمال کرتے رہے، ہندوؤں کا ذکر کر کے جن مسلمانوں نے

ان کے لیے جو ناخوشگوار الفاظ استعمال کیے، ان کا ذکر پہلے آچکا ہے، اسی طرح ہندو بھی مسلمانوں کو چنڈال اور ملیچھ جیسے الفاظ سے یاد کرنے میں خوش ہوتے، اور ان کے جو جذبات مسلمانوں کے خلاف مرتب ہوتے رہے، ان کی ترجمانی موجودہ دور کے ایک بڑے مورخ آر، سی موزمدار کی حسب ذیل تحریر سے ہوگی،

"گیارہویں صدی کے شروع ربع میں ہندوستان کے لیے ایک بڑا المیہ پیش آیا، اور یہ المیہ ایسا تھا جس سے مستقبل میں بڑے نتائج پیدا ہوئے، اس سے نہ صرف ہندوستان کی دولت اور انسانی قوت جاتی رہی، بلکہ مسلمانوں کو پنجاب میں مستقل طریقہ سے پاؤں جمانے کا ایک موقع مل گیا، جہاں سے ان کو اندرون ملک کے لیے ایک شاہراہ مل گئی .... کچھ ہندو راجاؤں نے مسلمانوں کو شکست دی، اور ان کی جارحانہ معرکہ آرائیوں کو روکا، ان ہی راجاؤں میں سے ایک نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس نے ملیچھوں (مسلمانوں) کو نکال باہر کیا ہے، تاکہ آریہ ورت کا نام پورا پورا اس پر صادق ہو، اور یہ آریاؤں کا مسکن رہے، لیکن اس قسم کے قومی شعور کی مثالیں کم ملتی ہیں، اسی لیے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ڈینگ ہانکنے کے بجائے ہندو راجاؤں نے اس کی فکر کوشش نہیں کی کہ وہ ترک فاتحوں کو ہندوستان سے باہر نکال کر اپنے گوشت سے کا نشان بھی نکال پھینکتے، بہت سے مواقع آئے جب کہ یہ کام آسانی سے ہو سکتا تھا ...... لیکن طاقتور ہندوستانی راجاؤں نے نہ صرف یہ ہی کہ ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنے ہمسایہ راجاؤں کو نقصان پہنچا کر اپنی حکومت کے دائرہ کی توسیع کی فکر میں لگے رہے، اور انھوں نے اس قومی فریضہ کو انجام دینے کی طرف مل کر پوری توجہ نہیں کی کہ ایک غیر ملکی مذہب کے پیرو لوگوں

کو غلامی سے پنجاب کو آزاد کرا تے...... (ہسٹری اینڈ کلچر آف انڈین پیوپل جلد پنجم، تمہید از ڈاکٹر آر، سی، مجمدار، ص ۲۷)

اور پھر آر، سی، موزمدار یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ اسلام کے پیغمبر بہت ہی غیر روادار تھے، وہ اپنے زمانہ کے کسی مذہب کو، روا نہیں رکھتے تھے (ہسٹری آف انڈین پیوپل اینڈ کلچر، ج ۶، ص ۴۴۶) اور عام ہندو مورخین اس کو ثابت کرنے میں پیش پیش ہیں کہ اسلام کی اسپرٹ جنگ جویانہ اور جنگ پسندانہ ہے، اسی لیے کے، ایم، منشی کی نگرانی میں جو ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیوپل لکھی جا رہی ہے، اس میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان فاتحین اور سلاطین نے اپنی وحشی فوجوں کے ذریعہ سے گاؤں جلائے، غارتگری کی، لوگوں کی دولت لوٹی، برہمنوں، بچوں اور عورتوں کو قیدی بنایا، ان کو تسموں اور کچے چمڑے کے کوڑوں سے پٹوایا، قتل عام کرایا، شاندار مندروں کو منہدم کر کے ان کو جلا دیا، عورتوں کی بے حرمتی کی، بازاروں میں کنیز بنا کر فروخت کیا، وہ اپنے ساتھ ایک سفری قید خانہ لیے پھرتے تھے، اور ان قیدیوں کو پھر زبردستی مسلمان بنا لیتے تھے،

یہ تحریریں ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۷ء کی ہیں، جس کے معنے یہ ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے پہلے جو انصاف پسند ہندو مورخین کی تحقیقات ہیں، ان کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور اب ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی تاریخ کو ایک نئے انداز اور نئے رنگ میں پیش کیے جانے کی نئی کوشش ہو رہی ہے، جو کسی حال میں بھی ملکی مفاد کے لیے مناسب نہیں۔

ہندو مسلمانوں میں جو ہم آہنگی نہ ہو سکی، اس کی بڑی وجہ ابو الفضل کے الفاظ میں یہ بیان کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف اور ناآشنا ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے خیالات سے لاعلم رہے، اور اس لاعلمی نے دشمنی اور مخالفت کو رنگ بنیاد کیا۔

جار تقلید کی وجہ سے عقل و دانش کی شمع گل ہو گئی، اور تحقیقات کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں، اور مسائل کی تحقیق پر رد و قدح کرنا گناہ اور کفر میں داخل ہو گیا ہے، اور ہر مجتہد کے ساتھ معتقدات پر تبادلۂ خیالات کرنا، اور اغیار کے چون و چرا کو حق شناسی کی ترازو میں تول کر صحیح نتیجہ پر پہنچ کر ہدایت حاصل کرنا بالکل مفقود ہو گیا، اسی لیے ہر شخص صرف اپنی ہی جماعت کو مخلوق خدا سمجھنے لگا، اور اغیار کو خالق مطلق کے دائرۂ بندگی سے خارج کر کے خوں ریزی اور آبرو ریزی، مردم آزاری ہی کو مذہبی فرائض میں داخل کر لیا، اور انھیں تباہ کن افعال کو سرخروئی دارین کا وسیلہ سمجھتا رہا، ابوالفضل اپنے عقائد کے لحاظ سے بدنام ہے، لیکن اس کے یہ خیالات غور طلب ضرور ہیں،

اور اب بھی ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جو ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، لیکن وقتاً فوقتاً ایسے اہل دل بھی گذرتے رہے ہیں جنھوں نے اپنے عقائد میں راسخ ہونے کے ساتھ ساتھ ہندو مسلمانوں دونوں کو ایک دوسرے کا احترام کرنے کا درس دیا، ان میں سے امیر خسرو کے بعد نمایاں نام مرزا مظہر جانجاناں (المتوفی ۱۱۹۵ھ) کا ہے، پہلے ذکر آیا ہے کہ ان کے نزدیک ہندوؤں کی بت پرستی اسلام سے پہلے کے عربوں کی بت پرستی سے مختلف ہے، پھر راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے شریعت اسلام ہی کو قابل تقلید اور بقیہ تمام شریعتوں کو منسوخ سمجھتے رہے، لیکن ہندوؤں کے اوتاروں کے احترام کرنے کی یہ تلقین کی ہے کہ گذرے ہوئے لوگوں پر جب تک کہ شرع سے کفر ثابت نہ ہو کفر کا حکم لگانا جائز نہیں، مقامات مظہری میں ہے کہ ایک روز مرزا صاحب کے سامنے کسی خواب کا ذکر آیا، ایک صحرا جس میں آگ جل رہی ہے اور کرشن جی آگ میں ہیں اور رام چندر کنارے پر کھڑے ہیں، معبّرِ

اس خواب کی تعبیر یہ بیان کی کہ صحرا کی آگ عشق و محبت کی حرارت ہے، کرشن کی زندگی عشق و محبت کی زندگی تھی، اس لیے آگ کے اندر دکھائی دیے، اور رام کی زندگی تیاگ و ایثار کی زندگی تھی، اس لیے راہ سلوک میں کنارے کھڑے نظر آئے، پھر فرمایا کہ قرآن شریف میں ہے کہ وَاِنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡهَا نَذِیۡرٌ۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوؤں میں کوئی بشیر و نذیر ضرور آیا ہوگا، اور ممکن ہے کہ رام چندر اور کرشن ہی نبی رہے ہوں، رام چندر ابتدائی عہد میں دنیا میں بھیجے گئے، جبکہ لوگوں کی عمریں دراز اور طاقت و توانائی زیادہ ہوتی تھی، اس لیے انھوں نے لوگوں کی تربیت سلوک کے طریقہ کے مطابق کی، کرشن اس وقت دنیا میں آئے جب عمر کوتاہ اور قوت ضعیف ہو چکی تھی، اس لیے انھوں نے اپنے زمانہ کے لوگوں کی تربیت جذبے کے مطابق کی، ان کی موسیقی اور بانسری ان کے جذب و مستی کا ثبوت ہیں، مرزا صاحب وید کو الہامی کتاب مانتے تھے۔ اسی لیے ہندوؤں کو اہل کتاب سمجھتے رہے۔

ہندوؤں میں بھی اہل دل ایسے رہے جو اسی قسم کی تعلیم دیتے رہے، مثلاً درگا داس نے اپنی کتاب مخزن الاخلاق میں لکھا ہے کہ انسان کو لازم ہے کہ اپنے دل کو کدورت کے زنگ سے صاف کر کے ہر مذہب اور ملت کے لوگوں کے ساتھ برادرانہ سلوک رکھے، مخالفت کے خارزار سے اپنے آپ کو علیٰحدہ کر کے اتفاق کے بوستانِ جنت نشان میں قیام کرے۔

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف است   با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

وہ جب کسی مذہب کی عبادت گاہ میں پہنچے تو اس کی عزت و احترام کرے اور جب کسی مذہب کے بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہو تو ان کی پوری تعظیم و تکریم کرے، دینی معاملات میں کسی سے نہ الجھے اور ان بے کار جھگڑوں سے یگانگی کے تعلقات میں

بیگانگی پیدا نہ ہونے دے۔

لیکن یہ لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ایسی آوازیں ہندوستان کے باشندوں کے کانوں تک تو ضرور پہنچیں لیکن وہ زیادہ اثر انداز نہ ہو سکیں، ورنہ ظاہر ہے کہ کئی ہزار میل سے انگریز جیسی اجنبی قوم ہندوستان میں داخل ہو کر نہ چھا جاتی،

تتمہ حضرات! یہ مقالہ زیادہ طویل ہو گیا، اس میں اصل موضوع سے ہٹ کر بھی کچھ باتیں قلم سے بے اختیارانہ طور پر نکل آئی ہیں، جس کے لیے معذرت خواہ ہوں، لیکن دکھانا یہ مقصود تھا کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں ان کی سیاسی، مذہبی اور روحانی طاقتوں کی نشو و نما سلاطین، علماء اور صوفیہ کے ذریعہ سے ضرور ہوئی، لیکن پھر ان تینوں گروہوں میں جتنی ہم آہنگی ہونی چاہیے تھی، وہ نہ ہو سکی، ضرورت اس کی تھی کہ سلاطین، علماء کی مذہبی حمیت اور ایمانی حرارت سے پورا فائدہ اٹھاتے، اور علماء سلاطین پر تنقید کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی اقتدار کا بہتر سے بہتر مصرف لے کر مسلمانوں کی مذہبی غیرت کا صحیح اندازہ کرتے رہتے، اسی طرح اکابر صوفیہ سے وہ تعاون کرتے، کیونکہ مسلمانوں میں روحانی قوتیں ان ہی سے پیدا ہوتی رہیں، ان سے سلاطین اور علماء دونوں کو پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تھا، اس ہم آہنگی سے عام مسلمانوں کا ایک صالح، پائدار اور جاندار معاشرہ لازمی طور پر تیار ہو جاتا، جس سے اچھے سلاطین، اچھے امراء، اچھے علماء اور اچھے صوفیہ بھی پیدا ہوتے رہتے، جو عام سیاست اور معاشرت کے نگہبان بن کر اس کو زوال سے بچائے رکھتے، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مغلوں کے آخری دور حکومت میں عام مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی اور روحانی زندگی بھی کھوکھلی ہو چکی تھی، وہ خود سیاست کو سنبھال کر اس کو ایک غیر قوم کے استیلاء سے محفوظ نہ

رکھ سکتے تھے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اپنے پورے دورِ حکومت میں ا
ذہنی بحران میں مبتلا رہے، ان کا دماغ سلاطین کی طرف رہا، کیونکہ ان ہی کے ذر
ان کو دنیا ملتی تھی لیکن جن کے ذریعہ ان کو دین ملتا، وہ ان سلاطین کی حکومت
فکری طور پر غیر اسلامی سمجھتے، اور پھر جن سے مسلمانوں کی روح کی جلا ہوتی، وہ یعنی
صوفیہ ان دونوں سے الگ ہوتے چلے گئے، ان فطری اختلافات سے مسلمان ذہنی کرب
میں مبتلا رہے، وہ کبھی اپنے جان و مال کے نگہبان، کبھی اپنے ایمان کے پاسبان اور
اپنی روح کے محافظ کو تاکتے، اور زبانِ حال سے ان تینوں میں ہمنوائی اور باہمی
تعاون کے خواہاں ہوتے، لیکن کوئی تحریک اور کوئی قوت ایسی پیدا نہیں ہوئی جو ا
ٹھوس اور مستحکم بنیاد پر یگانگت پیدا کر دیتی، اسی لیے مسلمان کبھی بادشاہ کے سا
ہو جاتے، کبھی علماء کے سایۂ عاطفت میں پناہ لیتے، اور کبھی صوفیہ کا دامن تھامتے
اس ذہنی بحران کی وجہ سے ان میں اجتماعی مقصدیت اور مرکزیت نہ پیدا ہو سکی
اور وہ برسرِ اقتدار اُسی وقت تک رہے جب تک ان کے حکمرانوں کی قوت
رہی، اور جب یہ قوت کمزور ہو گئی تو انھوں نے خود محسوس کیا کہ ان کے قوائے عمل
شل ہو کر رہ گئے ہیں، اور ان میں وہ کردار، بلند اخلاق اور اعلیٰ فکر و عمل نہیں
جن کی رو سے حکمراں کے نااہل ہونے کے باوجود حکومت کو برقرار رکھ سکیں۔

اور ایک بہت ہی شاندار حکومت ختم ہو کر رہ گئی، اکبر کے زمانہ میں یہی حکومت
اپنے زمانہ میں دنیا کی طاقتور ترین حکومت سمجھی جاتی تھی، اورنگ زیب کے عہد
جدوناتھ سرکار کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ اس کے عہد میں مغلوں کی سلطنت کا رقبہ
سب سے زیادہ تھا، اور ہندوستان کی پوری تاریخ میں یہاں پر مغلوں کی حکومت سے

کبھی اتنی بڑی سلطنت قائم نہ ہوئی تھی، غزنی سے چاٹگام اور کشمیر سے کرناٹک تک پورا ملک ایک ہی تاج و تخت کے ماتحت تھا، اور پھر دور دراز علاقوں میں بلخ اور بخارا میں بھی منبروں پر اسی بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا،

لیکن یہ سلطنت مسلمانوں کے ہاتھوں سے جاتی رہی، اس کے زوال کا الزام اورنگ زیب کے بعد کے ناکارہ حکمرانوں پر آتا ہے، کہ انھوں نے جانشینی کی خونریز لڑائیاں لڑ کر حکومت کو نقصان پہنچایا، نفاق پرور، مفاد پرست اور راحت پسند امراء کو دربار میں جمع کرکے اس کو سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا مرکز بنادیا، طریقۂ جنگ میں جو ترقی ہوتی رہی اس سے وہ بالکل بے خبر رہے اور شمشیر و سنان کو چھوڑ کر طاؤس و رباب میں پڑ گئے وغیرہ،

لیکن اس زوال کی ذمہ داری علماء، صلحاء اور صوفیہ پر بھی عائد ہوتی ہے، وہ اچھی معاشرت بناتے رہتے تو حکومت بھی اچھی رہتی، مگر علماء اچھی معاشرت بنانے کی جد و جہد کے بجائے زیادہ تر جزوی اختلافات میں مبتلا رہے، حرام و حلال کے مسائل میں وہ ایسے الجھے کہ عام لوگوں کو دین میں صرف خشکی ہی خشکی نظر آتی، اور وہ اس کے دائرہ میں آسانیاں کم اور دشواریاں زیادہ پاکر اپنی زندگی کو تنگ محسوس کرنے پر مجبور ہو گئے، علماء نے مذہب اور شریعت کی گہرائیوں کو سمجھ کر غور و فکر سے کم کام لیا، انھوں نے معاملات اور اعمالِ حسنہ پر کم اور عقائد و عبادات پر زیادہ زور دیا، ان کی درسگاہوں میں جو تعلیمی نصاب بھی صرف زمانہ کا لحاظ کئے بغیر بالکل جامد اسی لیے وہ زیادہ تر حواشی اور تعلیقات ہی لکھنے میں مشغول رہے، اور صرف، نحو، منطق اور یونانیوں کے علوم [illegible] ایسے [illegible] کہ اپنے دین اور تجدید [illegible] اجتہاد کی ضرورت تھی اس کو [illegible] عمل میں لانے کی کبھی کوشش نہیں کی، وہ [illegible]

سے بدظن ہو کر خلافت راشدہ کے طرز حکومت کے خواہاں تو ضرور رہے، لیکن اس طرز حکومت کے لیے خلافت راشدہ کی معاشرت بھی پیدا کرنے کی ضرورت تھی، جو علماء و صلحاء کے ذریعہ ہی بن سکتی تھی، لیکن وہ صرف محراب و منبر کی زینت اور درس و تدریس کی مسند پر متمکن رہنے ہی پر اکتفا کرتے رہے۔ اور ان کی نظر سلاطین کی طرف اٹھی رہی کہ وہ اچھی حکومت کے ساتھ اچھی معاشرت بھی بنائیں لیکن سلاطین کے ذریعہ صالح معاشرت کا بننا ممکن نہ تھا، وہ معاشرت میں حسن عجم تو پیدا کر سکتے تھے لیکن سوز دروں عرب، علماء اور صلحاء ہی کی وساطت سے پیدا ہو سکتا تھا۔ مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے عہد کا اتباع سنت اور زہد و تقویٰ کے ساتھ اخلاق کی بلندی، کردار کی پاکیزگی، خلق اللہ کی خدمت گزاری، مخالفین کے ساتھ حسن سلوک، مصیبت کے وقت صبر و تحمل، معاملات میں دیانت و صفائی کا پیدا کرنا علماء ہی کے بس کا تھا، منبر پر بیٹھ کر وہ ان باتوں کی تلقین تو کرتے رہتے لیکن ان کی دعوت میں عزیمت نہیں تھی، اسی لیے وہ مسلمانوں میں وہ سوز و مستی اور جذب و شوق پیدا نہ کر سکے، جس سے وہ صحیح معنوں میں مومن بنکر صاحب لولاک ہوتے، اور حکومت کو برائیوں سے بچا کر اسکے نگہبان و پاسبان بھی بنے رہتے،

شروع میں صوفیاے کرام نے اچھی معاشرت ضرور بنائی، لیکن آخر میں وہ بھی غیر موثر ہو گئے تھے۔

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن
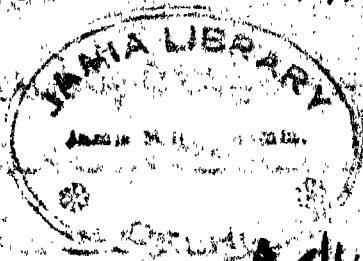
(اقبال)

القاضی الرشید

مؤلف کتاب الذخائر والتحف

از

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پاریس

تین سال کا عرصہ ہوا، معارف میں عنوانِ بالا پر متعدد اہلِ علم نے دادِ تحقیق دی تھی، اسکے بعد سے میرے پاس کچھ نیا مواد جمع ہوا ہے، معارف کے علم پرور صفات سے توقع ہے کہ یہ معلومات بھی اہل نظر تک پہنچائی جائیں گی، "تاکہ جو لوگ اس سے استنباط کر سکتے ہیں وہ اسے جان لیں"

البتہ ان ناظرین کے لیے جو پہلی دفعہ اس بحث سے دو چار ہوں گے، دو چار تمہیدی باتیں عرض کی جائیں تو تکرار بے محل غالباً نہ ہوگی، قصہ یہ ہے کہ ترکی کے شہر افیون قرہ حصار کے کتبخانے میں ایک نایاب مخطوطہ "کتاب الذخائر والتحف" ہے، کتاب میں اس کے مولف کا ذکر نہیں، ناچیز نے اسے طباعت کے لیے مرتب کیا، اور کویت کی حکومت نے ۱۹۵۹ء میں اسے شائع کیا، اس سے بہت پہلے ۱۹۵۳ء میں اس کا ایک اقتباس "ہدایا ملکہ روما کا خط المکتفی باللہ خلیفہ بغداد کے نام" کے عنوان سے کراچی کے انگریزی رسالے "جرنل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" میں شائع کرتے ہوئے میں نے اس مجہول الحال کتاب کو ۱۱ویں صدی کی طرف منسوب کیا تھا کیونکہ کتاب میں اس کا کچھ مبہم سا ذکر ہے، اس مضمون کے اطالوی اور فرانسیسی ترجمے بھی چھپے اور اہم علمی حلقوں میں کافی دلچسپی پیدا ہوئی، پھر جب ۱۹۵۹ء میں کتاب کے چھپنے کی نوبت آئی تو چھپنے سے

بعض حوالوں کی بنا پر القاضی الرشید بن الزبیر کی طرف منسوب کرنے کی جسارت کی اور لکھا کہ یہ فاطمی دور کا ایک مؤلف ہے جو ۵۶۳ھ تک زندہ تھا، معارف میں ایک اہل علم نے اس پر تنقید کی اور ضمناً اسے ۶۵۳ھ میں فوت ہونے والے ایک مؤلف کی طرف منسوب کیا،

میں اس مضمون میں نہ افراد کی بحث میں پڑ کر دانشگاہ انفرادی آراء کی تدقیق کی ناخوشگوار خامہ فرسائی میں صرف تالیف اور مولف کا ایک عام اور ممکنہ حد تک جامع تبصرہ مقصود ہے،

کتاب کے مندرجات | کتاب کا پورا نام ہے "کتاب الذخائر والتحف وما کان بالقصر من ذالک"۔ اس کے دیباچے میں مولف نے بیان کیا ہے کہ اس میں قیمتی تحفوں اور ہدیوں کا، شادیوں دعوتوں، ختنہ کی رسموں اور بچوں کے ختم قرآن کی تقریبوں کے مصارف کا، یادگار زمانوں کا، عجائب و غرائب کے ذخیروں کا، دولتمندوں کی وفات کے بعد ان کے یہاں سے برآمد ہونے والے خزانوں کا، غنیمت اور فتوحات میں حاصل ہونے والی قیمتی چیزوں کا اور (فاطمی) امام المستنصر باللہ کے محل سے ۴۶۰ھ اور ۴۶۱ھ کے ہنگاموں کے موقع پر لٹنے والے نوادرات کا ذکر ہے،

اگر یہی ہوتا تو بھی بڑا دلچسپ مواد تھا لیکن کتاب اس سے بھی کہیں زیادہ پُر از معلومات ہے، اس میں نہ صرف ترکستان، ایران وغیرہ اسلامی ممالک کے غیر معروف لیکن اہم واقعات کا ذکر ہے، بلکہ چین اور یورپ کے اہم واقعات کا بھی ذکر ہے، یورپ کے (۲۶) واقعات اس کتاب میں ہیں جن میں گیارہویں صدی عیسوی کے یورپ کی معاشی، صنعتی اور سماجی تاریخ کے متعدد ایسے پہلوؤں کا بیان ہے جن سے خود یورپ کی تاریخیں خالی ہیں، اور یہ خلا اس کتاب سے پُر ہوتا ہے، بلاط الشہداء کے عبد الرحمن الغافقی کے بعد فرانس فتح کرنے کا بھی اس میں ذکر ہے، فرانس، اٹلی، صقلیہ اور اسپین کے بھی ایسے حالات ہیں جو کسی اور ماخذ میں نہیں ملتے اور یہ سب سرکاری دستاویزوں پر مبنی ہیں،

مؤلف کا نام | کتاب کے مصنف کا کہیں ذکر نہیں، صرف ورق پر ایک جدید نسخہ ہوئے ہیں، بظاہر

کتب خانہ ایوان ترو حصار کے فہرست نگار نے اسے شیخ شہاب الدین احمد بن عبد اللہ بن حسن الاوحدی المقرئ الشافعی کی طرف منسوب کیا ہے، وہیں ایک پرانے خط میں ہے کہ یہ مولی ابراہیم بن محمد بن آیدمیر العلائی المعروف بابن دقماق کا نقل کردہ نسخہ ہے (۱) اوحدی کی وفات ۸۱۱ھ میں اور ابن دقماق کی ۸۰۹ھ میں ہوئی))

مگر پیچیدگی کتاب کے آخر کی ایک تحریر سے شروع ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ "کتاب الہدایا والتحف کا جو حصہ دستیاب ہوا یہ اس کا انتخاب ہے"، سرورق پر ذخائر و تحف نام تھا، اس تحریر میں اس کو ہدایا و تحف کر دیا گیا ہے۔

اس خاتمۂ کلام کے بعد ایک ضمیمہ ہے، اس میں تحریر ہے کہ کتاب الہدایا و التحف کے دستیاب شدہ حصے پر یہ اضافہ ہمارے صاحب (یعنی رفیق) امیر کبیر شہاب الدین احمد بن عبد اللہ ابن الحسن الاوحدی المقرئ الشافعی کے انتخاب کردہ معلومات کے ذریعے سے کیا گیا ہے، وہ مجموعے "بعونہ انتہی" پر اس کو ختم کیا گیا ہے، اس کے علاوہ کوئی حوالہ یا تفصیل نہیں ہے، اگر ضمیمہ اوحدی کا ہے تو پھر اصل کتاب کس کی ہے؟

چونکہ کتاب میں فاطمی خلفاء کے زمانے کے بھی حالات ہیں، اس لیے میں نے مقریزی کی خطط مصر کی طرف رجوع کیا، کیونکہ "الضوء اللامع" میں سخاوی نے اوحدی کے حالات میں لکھا ہے کہ اوحدی نے خطط مصر پر بڑی محنت سے ایک کتاب لکھی تھی، اور صرف ایک حصے کا مبیضہ کیا تھا کہ اس کی وفات ہوگئی، اور مقریزی نے اسی کو اپنی طرف منسوب کر لیا، اوحدی فوجی دستے میں بحیثیت مقدم [illegible] بہ حالت افلاس ۲۰ جمادی الاولیٰ ۸۱۱ھ میں وفات پائی، مقریزی نے اپنی کتاب المقفیٰ میں سوانح [illegible] کے ذیل میں [illegible] کا تذکرہ کیا ہے، مقریزی کی [illegible] [illegible] ہے، اس [illegible] ایک [illegible] مشرق [illegible] ہے، مگر [illegible] نہیں

لیکن [illegible] وہ اوحدی [illegible] سے متعلقہ حصے سے خالی ہے [illegible]

بہر حال خطط مقریزی (طبع بولاق) میں تلاش سے ہماری پیش نظر کتاب کے کوئی دس بارہ اقتباس ملے (دیکھو جلد اول صفحات ۴۰۸، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۹۲)، یہ عبارتیں "کتاب الذخائر" کے حوالے سے نقل کی گئی ہیں (جو ہماری کتاب کا بھی نام ہے)۔ لیکن مولف کے نام کا کہیں حوالہ نہیں ہے (ص ۴۲۴) پر ایک اور اقتباس ہماری کتاب کا ہے لیکن مقریزی نے اس میں ماخذ کا بھی ذکر نہیں کیا ہے، البتہ اس قصہ کا تکملہ (جو ہماری کتاب میں نہیں ہے) القاضی المہذب کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

مقریزی پر روسی، جرمن، اطالوی، فرانسیسی، انگریزی وغیرہ میں کافی چیزیں لکھی گئی ہیں، اور اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مقریزی کے ماخذ معلومات کا پتہ چلایا جائے، اس سلسلہ میں لندن کے رسالہ JRAS ۱۹۰۲ء صفحہ (۱۰۳ تا ۱۲۳) میں ایک مضمون ہے "خطط مقریزی میں مذکورہ مولفوں اور تالیفوں کا ذکر"۔ اس میں مضمون نگار گیسٹ (GUEST) نے لکھا ہے "الذخائر والتحف کے مؤلف کا نام معلوم نہیں، ممکن ہے کہ یہ مجلی بن جمیع کی ذخائر ہو"۔ اگر مضمون نگار صاحب ذرا تحقیق کر لیتے تو کشف الظنون ہی سے معلوم ہو جاتا کہ مجلی بن جمیع کی کتاب الذخائر فقہ شافعی کی کتاب ہے، اس کو تاریخ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اوپر میں نے ملکہ برتا کے جس قصے کا ذکر کیا ہے، اس کا مختصر ذکر ابن ندیم نے بھی کیا ہے، اور اس کی اساس پر روسی مولف بارتولد نے چیکوسلواکیا کے ایک رسالے میں ایک مضمون لکھا ہے میں نے اسے پڑھا لیکن اس میں ظاہر ہے کہ مقریزی کے ماخذ پر بحث نہیں ہے۔ پھر ایک اور روسی مولف انوسترانسیف (INOSTRANCEV) نے روسا کے رسالہ RSO سنہ ۱۹۱۱ء میں فرانسیسی زبان میں ایک مضمون اسی ملکہ برتا پر لکھا ہے، اور الغزولی کی مطالع البدور میں بھی اس قصے کے وجود کا ذکر کیا ہے، جب میں نے اس کتاب کا [illegible] [illegible] تو اس میں بھی ہماری

کتاب کے ایک دو نہیں بیس مقامات پر اقتباس نظر آئے اور آٹھ مقامات پر ان کے ماخذ کا ذکر بھی تھا (دیکھو مطالع البدور، جلد اول صفحہ ۵۸، ۶۱، ۱۳۰، ۲۳۳، نیز جلد دوم ص ۴۰، ۹۵، ۱۹۲، ۱۰۹، ۱۸۹)۔ ان میں سے سب سے پہلے اقتباس میں ہے: "دسواں باب خیمے تکیے اور فرش" القاضی الرشید ابو الحسین احمد بن القاضی الرشید بن الزبیر نے اپنی کتاب العجائب والطرف والہدایا والتحف میں بیان کیا ہے کہ ......" دوسرے حوالوں میں مولف یا عنوان کتاب کا مختصر ذکر ہے۔

اسی کی اساس پر میں نے کتاب الذخائر والتحف کو شائع کرتے وقت اسے القاضی الرشید ابن الزبیر کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کی، اور چونکہ کتاب میں مولف نے ۴۴۴ھ تا ۴۶۳ھ تک چشم دید حالات لکھے ہیں، اس لیے میں نے قیاس کیا کہ مؤلف کی وفات ۴۶۳ھ کے بعد ہونی چاہیے، دو حوالے یہ ہیں :-

(۱) بادشاہ میخائیل نے اس سفیر کے ہاتھوں ۴۴۴ھ میں[1] .... بہت قیمتی تحفے بھیجے جو میں نے خود تنیس میں مشاہدہ کیا،" "شاہدتُ" (دیکھو کتاب الذخائر ص۵) [مشاہدہ یقیناً سوا سو سال بعد نہیں ہو سکتا، سفیر کی آمد کے لگ بھگ زمانے ہی میں ہونا چاہیے]

(۲) خطیر الملک نے مجھے اطلاع دی (اخبرنی) .... جبکہ وہ شام سے ذیقعدہ ۴۶۲ھ میں تنیس آیا کہ اندلس کے حکمراں اقبال الدولہ علی بن مجاہد نے المستنصر باللہ فاطمی کو ایک تحفہ بھیجا ..... (کتاب الذخائر ص۹۶)، یہ اطلاع ۴۶۲ھ کی ہے، اور اقبال الدولہ و مستنصر کا زمانہ بھی یہی ہے، [illegible] میں یہ لوگ زندہ نہ تھے۔

---

[1] اس حوالے میں [illegible] میخائیل [illegible] میں [illegible] تھا [illegible] نہیں ہوا، [illegible] مطابق [illegible] تا [illegible] میں [illegible] قسطنطینیہ [illegible] حکمراں تھا، [illegible] بادشاہ کے نام میں مولف سے غلطی ہوئی ہے، یا [illegible] نہیں۔

(۳) "ناصر الدولہ ابو علی الحسن بن حمدان نے سنہ ۳۹۳ھ میں بزنطینی حکمراں رومانوس دیوجینس کو ایک تحفہ بھیجا... (دیکھو کتاب الذخائر ص ۱۰۵) اور ابو الفضل ابراہیم بن علی الکفرتابی نے مجھ سے بیان کیا (حدثنی)، جبکہ وہ سنہ ۴۶۳ھ میں قسطنطنیہ سے دمیاط آیا تھا کہ اس نے رومانوس دیوجینس کو دیکھا کہ.... (کتاب الذخائر ص ۲۶۳) اس حکمراں کا یہی زمانہ ہے؛ اس کے سو سال بعد کا نہیں،

(۴) ایک شخص نے جو جھنڈوں اور پرچموں سے خوب واقف ہے، مجھے بتایا (اخبرنی) کہ جھنڈے بھی کے سرکاری ذخیرے میں.... سپہ سالار جوہر کی آمد مصر اور سنہ ۳۵۸ھ میں (فاطمی) قصر شاہی کی تعمیر کے بعد سے اب تک (الیٰ ہذا الوقت)، جبکہ ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے... (کتاب الذخائر ص ۲۵۸)۔ سنہ ۳۵۸ھ کے بعد سے "زائد از صد سال" کے معنی سنہ ۴۵۸ھ سے کچھ ہی بعد مثلاً سنہ ۴۶۳ھ ہو سکتا ہے، سنہ ۵۶۳ھ نہیں،

ان اقتباسوں سے واضح ہوتا ہے کہ بیان کنندہ راوی یعنی مولف کتاب سنہ ۴۴۴ھ اور سنہ ۴۶۳ھ کے درمیان دربار فاطمی کے صیغۂ استقبال سفراء میں مامور تھا،

ایک اور اندرونی شہادت کتاب کے ص ۸۱ میں ہے، جہاں ایک بے حقیقت اور تقریباً گمنام حکمراں کا بڑے طنطنہ خیز القاب کے ساتھ اس طرح ذکر کیا ہے: "الملک المعظم شاہنشاہ سلطان دین اللہ وملک عباد اللہ وعضد خلیفۃ اللہ ابو کالیجار بن سلطان الدولۃ بن بہاء الدولۃ بن عضد الدولۃ بن رکن الدولۃ بن بویہ...."

مولف کا مذہب | یہ ابو کالیجار تاریخ ابن اثیر، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام وغیرہ کے مطابق بغداد میں امیر الامراء رہا ہے؛ اور غالباً اسی لیے ہمارے مولف کو، جو ابن کی پیشی میں ملازم ہوگا، سرکاری محافظ خانے میں طغرل بیگ وغیرہ کے اصل خطوط کے دیکھنے کا موقع ملا ہوگا، ابو کالیجار اور طغرل بیگ سلجوقی میں لڑائیاں رہیں، ابو کالیجار نے اصفہان اور کرمان فتح کر لیا، لیکن

ایک وبا میں اس کے بارہ ہزار گھوڑے ہلاک ہو گئے، اس لیے اس نے طغرل بیگ سے صلح کر لی، اور طغرل نے ابو کالیجار کی بیٹی سے، اور ابو کالیجار کے بیٹے نے طغرل کی بھتیجی سے نکاح کرکے آپس میں رشتہ بھی کر لیا، سنہ ۴۴۰ھ میں کرمان کے مقام خناب میں ابو کالیجار کا انتقال ہو گیا، ابو کالیجار کی وفات کے بعد طغرل کا کوئی حریف نہ رہا اور اس کا اثر سارے ایران، عراق وغیرہ میں پھیل گیا، ان حالات میں ابو کالیجار کے کارندوں، خاصکر شیعہ کارندوں کا سلجوقیوں کے ہاں ترقی یا رسوخ کا کیا امکان ہے، ابو کالیجار شیعہ تھا، اس لیے القاضی الرشید کو بھی اصولاً شیعہ ہونا چاہیے، اور تاریخی مواد بھی یہی ثابت کرتا ہے، (جیسا کہ ابھی بیان ہوگا) اس لیے اگر القاضی الرشید نے سلجوقی علاقے کو خیرباد کہہ کر مصر یعنی فاطمی شیعوں کے ہاں قسمت آزمائی کی کوشش کی تو حیرت کی بات نہ ہونی چاہیے،

"اعیان الشیعہ" ایک مشہور کتاب ہے، اس کی جلد نہم صفحہ ۹۸ تا ۱۰۹ میں سوانح نمبر (۱۳۸۶) پر القاضی الرشید کے حالات تفصیل سے ہیں، اس میں لکھا ہے کہ "نسمۃ السحر نامی کتاب کے بیان کے مطابق القاضی الرشید ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے شیعیت قبول کی، اور وہ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا"،

محمد علی تبریزی نے اپنی ریحانۃ الادب (جلد پنجم، صفحہ ۳۵۵ تا ۳۵۶، نمبر ۶۰۰) میں لکھا ہے: "یہ ظاہر ہے کہ وہ شیعہ تھا، اور شیخ محمد محسن طہرانی کی "الذریعہ الی تصانیف الشیعہ"، اور کتاب اعیان الشیعہ میں اس کی تصریح موجود ہے"،

ایک دوسری علمی عالمانہ بحث میں جامعۂ ڈھاکہ کے پروفیسر محمد حنیف اللہ کبیر نے کلکتے کے انگریزی رسالے "اندو ایرانیکا" میں سنہ ۱۹۵۵ء سے برہمن خانوادے پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا، اس کی ۱۹۵۵ء کی جلد میں صفحہ (۳۶) پر ایک اہم بیان ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

امیر الامراء بننے سے پہلے ابو کالیجار اسماعیلی فرقے کی دعوت سے متاثر ہو چکا تھا۔ یہ دعوت شیراز میں ایک اسماعیلی داعی دے رہا تھا، جو اسماعیلیوں کے ہاں المؤید فی الدین الشیرازی کے نام سے مشہور ہے۔ جب ابو کالیجار بصرہ کی بغاوت فرو کر کے تقریباً ۴۲۹ھ میں شیراز لوٹا تو المؤید نے اس سے خط و کتابت شروع کی اور اسے اسماعیلیت قبول کرنے کی دعوت دی، اور یہ بھی بتایا کہ ابو کالیجار کے سارے آبا و اجداد اسماعیلی ہی تھے، (جو ظاہر ہے کہ لغو بات ہے) (دیکھو سیرۃ المؤید صفحہ ۱۳-۱۴)۔ رفتہ رفتہ ابو کالیجار بھی اس دعوت سے متاثر ہو گیا، جو نہایت ہوشیاری کے ساتھ اس کی دیلمی فوج میں بھی پھیلائی جا رہی تھی، (دیکھو فارس نامہ ص ۱۱۹) لیکن جلد ہی مختلف وجوہ سے ابو کالیجار کو اس داعی سے قطع تعلق کر لینا پڑا، کیونکہ نہ صرف اس کے چند درباریوں نے جن میں شیراز کا قاضی القضاۃ بھی شامل تھا، اسے یقین دلایا کہ یہ داعی اس کی فوج کو بغاوت پر اکسا رہا ہے، بلکہ خلیفہ القائم کو بھی جب داعی المؤید کی سرگرمیوں کی اطلاع ملی تو اس نے ابو کالیجار سے خواہش کی کہ اس داعی سے تعلقات منقطع کر لے۔ (سیرۃ المؤید، صفحہ ۶۳-۶۴) اسی اثنا میں جلال الدولہ کا انتقال ہو گیا، اور ابو کالیجار نے کوشش کی کہ جلال الدولہ کی جگہ خود اسے امیر الامرا بنایا جائے، اور یہ ممکن نہ تھا کہ عباسی خلفاء کے حریف کے فرستادہ داعی سے تعلقات منقطع کیے بغیر اس کی خواہش پوری ہو سکے۔ (دیکھو سیرۃ المؤید، ص ۶۳، ۶۴) اس لیے ابو کالیجار نے حکم دیا کہ اس داعی کو دریائے فرات کے پار ملک بدر کر دیا جائے، اور داعی سے کہا کہ اگر وہ عباسی خلفاء کی سرزمین میں آیا تو اس کو موت کی سزا دی جائے گی (المؤید نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس حکم کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ یہ لکھا ہے کہ "ابو کالیجار نے مجھے ایک خط لکھا کہ حضرت امام (فاطمی حکمران) کے ہاں واپس چلا جاؤں، اور کسی دوسرے مناسب وقت پر آؤں" (دیکھو سیرۃ المؤید، ۶۳-۶۴)

اسی کتاب میں (ص ۶۲ تا ۶۸) پر ایک اور خط ہے جو اس کا لکھا ہوا ہے جو اس نے داعی کو اس کے مصر جاتے وقت بھیجا تھا۔ اگر المؤید کے بیان پر اعتماد کیا جائے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ جو کا لکھا ہوا دل سے اس داعی ہی کی طرف میلان رکھتا تھا۔ اگرچہ سیاسی وجوہ سے اس نے اس سے رخصت ہونے کی خواہش کی تھی۔"

مولف کا عصر | اوپر جن شیعہ سوانح عمریوں کا ذکر ہوا، ان میں[1] ان کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی القاضی الرشید کے حالات ملتے ہیں اور یہ سب اس کی وفات ۵۶۲ھ یا ۵۶۳ھ میں یعنی کتاب کی تالیف کے ایک سو سال بعد بیان کرتے ہیں، مثلاً:-

یاقوت، معجم الادباء (یا ارشاد الاریب) جلد چہارم ص ۵۱ تا ۶۶

ابن خلکان، وفیات الاعیان، نمبر ۶۴

ابن العماد، شذرات الذہب، جلد چہارم صفحہ ۱۹۷، ایضاً خریدہ ج ۱ ص ۲۰۰ تا ۲۰۲

سیوطی، بغیۃ، صفحہ ۱۴۴، ایضاً حسن المحاضرہ جلد دوم ص ۱۳۳

خوانساری، روضات الجنات صفحہ ۶۶ تا ۶۷

یافعی، مرآۃ الجنان جلد سوم ص ۳۶۷ تا ۳۶۹

جعفر الادفوی، الطالع السعید، نمبر ۵۲

الاسنوی، طبقات الشافعیہ، ورق ۶۲/الف

الذہبی، سیر النبلاء ج ۱۲ صفحہ ۲۶۲

ابن سمرۃ الجعدی[2]، طبقات فقہاء الیمن، صفحہ ۲۱۳، مخطوطہ ز ۱۶۸، تالیف ۵۸۶ھ

---

[1] یہ کتاب [illegible] میں مصر میں چھپی ہے۔ [illegible] نے حاشیے میں لکھا ہے کہ القاضی الرشید کے حالات [illegible] جلد دوم صفحہ [illegible] میں [illegible] ورق ۲۳ میں [illegible] الدعاۃ اور یمن کی [illegible] ص ۲۰۳ میں بھی ہیں۔ دیکھئے کتاب مذکور ص ۱۹۶

ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، حالات سنہ ۵۶۳ھ

ابن تغری بردی، النجوم الزاہرہ، بر موقع،

ان میں سے متعدد حوالے میرے کرم دوست بیروت کے پروفیسر صبحی الصالح نے مہیا کیے، اور جو کتابیں مجھے پیرس میں نہ ملیں ان کی ضروری عبارتوں کی نقلیں بھی بھیجیں، جزاہ اللہ خیراً، مذکورہ حوالوں میں القاضی الرشید کے اشعار بھی ہیں، لیکن ان کو ہماری اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے ان کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں، بعض حوالے مولانا عبد العزیز میمن نے بھی از راہِ عنایت بھیجے، جس کے لیے میں ان کا شکر گذار ہوں،

میں ان میں سے صرف پہلے دو اقتباسوں کو یہاں درج کروں گا۔

(الف) یاقوت نے لکھا ہے: "احمد بن علی بن ابراہیم بن الزبیر الغسانی الاسوانی المصری جس کا لقب الرشید، اور کنیت ابو الحسین ہے،.... اس کا صعید مصر کے ایک بڑے اور بہت مالدار گھرانے سے تعلق تھا، اسے اسکندریہ کی بندرگاہ اور دواوین سلطانیہ (سرکاری مرکزی دفتر) کا ناظم بنایا گیا، پھر اس کو ظالمانہ طور پر محرم سنہ ۵۶۲ھ میں قتل کیا گیا، اس کی تصانیف مصر سے باہر بھی مشہور ہیں، ان میں کتب ذیل بھی شامل ہیں: منیۃ الالمعی وبلغۃ المدعی، جس میں کئی علوم کا ذکر ہے، کتاب المقامات۔ کتاب جنان الجنان وروضۃ الاذہان چار جلدوں میں مصری شعراء کا تذکرہ۔ کتاب الہدایا والطرف۔ کتاب شفاء الغلۃ فی سمت القبلۃ۔ رسائل جو تقریباً پچاس ورق میں ہے، دیوان تقریباً سو ورق میں، وہ صعید مصر میں اسوان میں پیدا ہوا، پھر ترک وطن کرکے مصر (قاہرہ) میں آباد ہوگیا،

لہ لفظ مصر عربوں کی ایجاد نہیں ہے، یہ بڑا پرانا لفظ ہے، چنانچہ توریت میں قبطی مصریم کا لفظ آیا ہے، ہندوستان میں جو [illegible] اور مصری کہلاتے ہیں، ان کا بھی اس سے رشتہ جوڑا جاتا ہے۔

اور وہاں کے حکمرانوں سے توسل پیدا کیا اور وزرا کی مدح میں قصیدے کہے جنھوں نے اس کو عطائیں، چنانچہ اسے "سفارت" (یعنی فاطمی دعوت) کے لیے یمن بھیجا گیا، جہاں بعد میں اس کو قاضی اور گورنر بھی بنایا گیا "قاضی القضاۃ الیمن اور داعی دعاۃ الزمن" کے لقب سے ملقب... رسوخ و اقتدار حاصل ہونے کے بعد اس کو خلیفہ بننے کی ہوس پیدا ہوئی، اور اس کوشش میں اس کو کامیابی ہوئی، لوگوں نے اس کو قبول کر لیا، اور اس نے اپنے نام کے سکے ڈھالے جن کے ایک جانب "الامام الامجد ابو الحسین احمد" اور دوسری طرف "قل ہو اللہ احد اللہ الصمد" درج تھا لیکن بعد میں اسے گرفتار کر کے قوص بھیج دیا گیا... اس کے قتل کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ اسد الدین شیرکوہ کی طرف مائل ہو گیا تھا، چنانچہ جب وہ اس ملک میں آیا تو القاضی الرشید نے اس سے خط و کتابت کی....."۔ اس اقتباس میں اس کی تالیف نمبر ۴ کی طرف خاص کر اشارہ کرتا ہے۔

(ب) ابن خلکان نے اس گتھی کو سلجھانے کی کلید مہیا کی ہے، اس کا بیان ہے کہ "القاضی الرشید ابو الحسین احمد بن القاضی الرشید ابو الحسن علی بن القاضی الرشید ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن حسین بن الزبیر الغسانی الاسوانی، یہ اچھا عالم اور فرزانہ شخص تھا، بڑے عہدہ پر فائز تھا، اس نے کتاب الجنان و ریاض الاذہان تالیف کی جو شاعر علما کی سوانح پر مشتمل ہے، اس کی نظموں کا ایک دیوان بھی ہے، اس کے بھائی القاضی المہذب کا بھی دیوان ہے، العماد نے السیل والذیل میں لکھا ہے کہ شاور نے اس کا شیرکوہ کی طرف میلان کی بنا پر ۵۶۳ھ میں اس کو ظالمانہ طور سے قتل کر دیا، اس کا رنگ کالا اور سینہ چوڑا تھا، وہ صاحب علم ہندسہ، منطق، علم، دیوان، ادب اور شاعری میں اس کا کوئی حریف نہ تھا"۔

لہذا ان تحریروں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس خاندان میں تین نسل تک مسلسل القاضی الرشید کا لقب جاری رہا، قاضی رشید اول کا پوتا اختلاف روایت ۵۶۲ھ یا ۵۶۳ھ میں ...

میں فوت ہوا، ایسی حالت میں کیا یہ ممکن نہیں کہ ہماری کتاب کا مولف پوتا نہیں بلکہ دادا یا ہو۔ مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے فروری ۱۹۵۰ء کے معارف میں جو تحقیق فرمائی ہے، اس سے اس خاندان کے متعلق کوئی حالات معلوم ہوتے ہیں، وہ الادفوی کے حوالے سے لکھتے ہیں :

(الف) " نمبر ۳۵ احمد بن علی بن ابراہیم بن علی بن الزبیر ابو الحسن القرشی الاسدی الاسوانی المعروف بہ الرشید ۔"

(ب) " نمبر ۲۹۳ علی بن احمد بن علی الاسوانی، الرشید کا باپ، العماد الاصفہانی نے اس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ قاہرہ میں ۵۶۲ھ [؟ ۵۳۳ھ] میں فوت ہوا ۔"

(ج) " نمبر ۳۳ ابراہیم بن محمد بن الحسین بن محمد بن الزبیر الاسوانی القاضی، جو قوص اور اس کے نواحی کا ۵۲۲ھ میں قاضی تھا۔ یہ الرشید اور المہذب کا دادا ہے جن دونوں کا باپ الزبیر تھا، النضر نے اس کا مرثیہ لکھا، اس کا کچھ اقتباس ہم آگے ابن النضر کے حالات کے سلسلے میں دیں گے ۔"

شیعہ سنی میلانات اور ابن الوقت لوگوں کے طرز عمل پر اس کتاب کے ذیل کے بیانات سے کچھ روشنی پڑے گی :

" نمبر ۲۵۵ عبد القادر بن مہذب بن جعفر الادفوی جو میرا چچا زاد بھائی ہے ..... اسمٰعیلی فرقے سے تعلقات رکھتا ہے، اور النعمان بن محمد کی کتاب دعائم الاسلام کے مطالعے میں لگا ہوا ہے ۔" " نمبر ۱۹ ابراہیم بن محمد بن احمد بن نصر المخاطب بہ فخر الدولہ جو الزبیر کے بیٹوں الرشید اور المہذب کا بھانجا تھا، یہ ادیب، شاعر اور ... تھا، سب سے پہلے اس کو صلاح الدین ایوبی نے کاتب مقرر کیا، اس کے بعد صلاح الدین کے بھائی الملک العادل کا کاتب بنا، اس نے اپنے ماموں الرشید کے بعض ... [illegible]

اس بیان سے منکشف ہوتا ہے کہ اس خاندان میں شیعہ سنی دونوں میلانات کے لوگ بیک وقت پائے جاتے تھے، کیونکہ سلطان صلاح الدین کا کاتب سنی ہونا چاہیے، خود الادفوی سنی ہے، اور اس کا چچا زاد بھائی اسمٰعیلی شیعہ، (ادفوی کی وفات [illegible]ھ میں ہوئی)

خلاصہ | اس کا خلاصہ یہ ہے کہ القاضی الرشید جو اولاً بویہی حکمران ابو کالیجار کی پیشی میں تھا، ابوکالیجار کی وفات [illegible]ھ کے بعد جب بویہیوں کا سقوط ہوا تو وہ مصر چلا گیا، یہاں فاطمیوں نے اس کی قدردانی کی اور اس کو صعید مصر میں ایک جاگیر عطا کی، [illegible]ھ تا [illegible]ھ وہ دفتر خارجہ میں رہا، پھر [illegible]ھ میں تونس کا قاضی مقرر ہوا، اس کے بیٹے اور پوتے ہی نہیں پڑپوتے تک کے حالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں کہ وہ سب مصر میں سرکاری ملازم اور خاصے ممتاز رہے، اس کا مفصل نسب اسی ادفوی نے یہ بیان کیا ہے: "وہ

ابراہیم بن احمد بن علی بن ابراہیم بن محمد بن الحسین بن محمد بن خلیفہ بن سعید بن ابراہیم بن حسین القرشی الاسدی ابو اسحاق بن ابو الحسین بن ابو اسحٰق الاسوانی الکاتب۔ یہ الرشید بن الزبیر کا بیٹا تھا… میں نے اس کی تاریخ ولادت پوچھی تو [illegible]ھ معلوم ہوئی، یہ سرکاری دفاتر میں کارگزار تھا۔"

میں ان بیانات سے فی الحال اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ

(۱) کتاب الذخائر والتحف اپنی موجودہ شکل میں الاوحدی کی تالیف ہے جس نے القاضی الرشید کے مسودے کا جو حصہ بھی دستیاب ہوا اس کو صاف کر کے شائع کیا، اور المقریزی نے اپنی کتاب خطط میں اسی سے استفادہ کیا،

(۲) لیکن اوحدی کا کام صرف مبیضہ کرنا تھا یا تلخیص و انتخاب، اصل کتاب کا نام الہدایا والطرف تھا، اور اوحدی کے اڈیشن کا نام الذخائر والتحف ہوا۔

(۳) کتاب کا نام چونکہ بہت لمبا تھا، اس لیے بعد کے لوگوں نے اس کا طرح طرح کے ناموں میں اختصار کیا،

(۴) چونکہ القاضی الرشید بن القاضی الرشید تینوں آدمیوں کا نام ہے، اسی لیے یاقوت کو سہو ہوا، اور اس نے دادا کی کتاب کو اس کے مشہور پوتے کی طرف منسوب کر دیا، یہ بھی ممکن ہے دادا کی تالیف کو پوتے نے اپنی طرف منسوب کر لیا ہو، اور بے خیالی میں ان عبارتوں کی اصلاح نہ کی ہو جہاں دادا نے سال اور تاریخ بیان کر کے ضمیر متکلم کے ساتھ کوئی روایت بیان کی ہے (بالکل اسی طرح جس طرح خلیفہ مامون نے بیت المقدس کے قبۃ الصخرہ میں عبدالملک بن مروان کا نام کتبے میں سے نکال کر اپنا نام تو داخل کرا دیا لیکن سنہ تعمیر بدلنے کا خیال نہیں کیا، اس لیے اب یہ چوری پکڑ لی گئی،

(۵) دادا القاضی الرشید اگر پانچویں صدی کے آغاز مثلاً ۴۰۱ھ میں پیدا ہوا تو ۴۴۲ھ تک اس کا برسر کار رہنا اور قوص میں قاضی کے فرائض انجام دینا، اور ۴۴۳ھ سے ۴۶۳ھ تک وزارت خارجہ میں رہنا بالکل ممکن ہے،

ممکن ہے آئندہ اہل علم کی کوشش سے مزید حالات معلوم ہو سکیں کہ فوق کل ذی علم علیم!

مقالات شبلی حصہ ششم

محبت خاں محبت اور انکا کلام

از جناب ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ادیب

ماہتاب کی روشنی میں تاروں کی ضیا ماند پڑجاتی ہے یہی عمل تاریخ ادب اردو میں جاری ہو جب کبھی انکی شاعری پر ماہتاب ابھرکر آئے تاروں کی روشنی ماند پڑگئی، میر و سودا اپنے عہد کے آفتاب ماہتاب تھے، جن کی شہرت وعظمت کے سامنے کتنے ہی شاعر جو ان سے ارفع نہ ہوتے ہوئے بھی داد و ناموری کے مستحق تھے دب کر رہ گئے، ہماری تاریخ ادب کی یہ روایت بھی رہی ہے کہ ہم شاعروں کو عموماً ایک ہی پیمانے پر ناپتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر تمام اصناف سخن پر قادر نہیں ہوتا مگر اس کی عظمت کا اندازہ کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کا مطالعہ ہر صنف سخن کے شاعر کی حیثیت سے کریں، اگر اس نے غزل کے علاوہ قصیدہ بھی لکھا ہے تو ہمیں اس کا مطالعہ قصیدہ نگار کی حیثیت سے بھی کرنا چاہیے، ہم نے میر کی غزل، سودا کے قصائد اور میر حسن کی مثنوی پر تمام زور قلم صرف کر دیا لیکن میر کی مثنویات، سودا اور میر حسن کی غزلیات کی طرف کم توجہ کی، کیونکہ سودا اور میر حسن کی غزلیات میر کی غزلوں کے پایہ کی نہیں تھیں، اسی طرح میر کی مثنویات میر حسن سے کمتر تھیں اور سودا کے قصائد کے سامنے میر و میر حسن کے قصائد بالکل پھیکے نظر آتے تھے، اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو ادب کا ایک معمولی طالب علم میر کو غزل گو، سودا کو قصیدہ نگار اور میر حسن کو مثنوی نگار کی حیثیت سے جانتا ہے، اس سے اگر میر کی مثنویات، سودا و میر حسن کی غزلیات پر سوال کیا جائے تو جواب دینے میں اس کو بڑی دشواری پیش آئے گی،

اس میں شک نہیں کہ میر تقی میر بزم غزل گوئی کے صدر نشین تھے، لیکن ان کے ساتھ ہی یہ امر

شک و شبہ سے بالاتر ہے، کہ اس کے عہد کے چند شعراء میر کے ہم رتبہ نہ ہوتے ہوئے بھی انکے
بزم نشینوں میں ہیں، اور فرق مراتب کے پیش نظر ان کا شمار صف دوم کے شعراء میں کیا جا سکتا
ہے۔ چنانچہ خواجہ حسن، میر حسن، حسرت اور محبت اسی صف میں ہیں۔ ان میں محبت خاں محبت
غزلگو بھی تھے اور مثنوی نگار بھی۔ فارسی، عربی اور پشتو میں بھی کہتے تھے۔ انھوں نے فارسی کا
ایک لغت اور ایک آمد نامہ بھی لکھا تھا۔ مربی سخن بھی تھے۔ چنانچہ خواجہ حسن، جعفر علی
حسرت اور قلندر بخش جرأت ان کے دامن دولت سے وابستہ رہے۔ انھیں موسیقی
میں بھی مہارت حاصل تھی۔ انکے کئی ہمعصر موسیقار ان کی سرکار سے تنخواہیں پاتے تھے۔ صاحب سیف
بھی تھے۔ انھوں نے جنگ روہیلہ (۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء) میں داد شجاعت دی تھی۔

اس مضمون میں اس جامع صفات شخصیت کی حیات اور شاعری پر تلاش و جستجو
سے ممکن مواد فراہم کیا گیا ہے، تاکہ تاریخ ادب اردو میں اس کی جائز حیثیت متعین ہو سکے۔

مظفر الدولہ شہباز جنگ نواب محبت خاں محبت، نواب حافظ رحمت خاں ([illegible]
تا [illegible])، والی روہیل کھنڈ ([illegible] تا [illegible]) کے صاحبزادے تھے۔ ان کی پیدائش
[illegible] میں ہوئی، ابتدائی تعلیم حسب رواج علماء کی نگرانی میں پائی، مادری زبان پشتو
اور فارسی تھی، اردو لشکری اور عوامی زبان تھی، اس میں انھیں فطرۃً مہارت حاصل ہوئی
عربی پر پوری قدرت حاصل تھی، اس میں شعر کہتے تھے۔ فنون سپہ گری میں پٹھانوں کی روایات
کے مطابق کمال حاصل تھا۔ ان کی شادی تحصیل فرید پور ضلع بریلی میں صاحب استار خان
کمال زائی کی صاحبزادی سے ہوئی، یہ شادی روہیلوں کے مختصر دور حکومت کا ایک
یادگار واقعہ ہے۔ میر عوض علی مدعا شاہجہاں آبادی نے شادی پر تہنیت کا قصیدہ گزرانا جس کے
چند شعر یہ ہیں[1]:-

---

[1] [illegible]

ماہ نے کھول لیا ہے کفِ سیمیں اپنا دوسرا ہاتھ چھپایا تو بجا یار شنگ

نشۂ عیش سے ہے سرو بہانک سرشار کر رہا ہے ہر غنچہ کے نمک ناچ کی گزک

حسن کے خلوتیاں بزم حنا بندی ہیں شعلے سے باز ہیں پروانے کے پاؤں پہ کنک

محفلِ عیش میں بلبل نے بجائی شہنا گوشۂ باغ میں غنچے نے اٹھائی ڈھولک

قلقلِ شیشہ یہ کہتا ہے کہ مت بیٹھ خموش جام مائلے ہے صفِ بادہ کشاں پر چشمک

ساقی شوخ کہے ہے کہ غنیمت ہے یہ وقت ساغر عمر تو لبریز ہے مت جائے چھلک

شیخ اگر کچھ بھی ہے غیرت کی ترے دل میں ترنگ ساغر و شیشہ اٹھا سبحہ و سجادہ پٹک

جشن نواب فلک رتبہ محبت خاں ہے جس کی شادی میں ہیں سب جمع بزرگ و کوچک

نجے زادوں کو جو دیکھو تو بہ ہنگامِ سرود بج رہا ہے یہی غل رعشۂ بلک بلک

نواب صاحب کی بیشتر اولادیں سخن فہم و سخن سنج تھیں، صاحبزادوں میں محمد منصور خاں شاہ عالم خاں عالمؔ، محمد مقیم خاں مقیمؔ، پوتوں میں محمد حسین خاں ضیاؔ، احمد حسن خاں جوشؔ محمد سلیمان خاں اسدؔ، پرپوتوں میں عابد علی خاں خورشیدؔ، اور محمد علی خاں قمرؔ، نواسوں عبدالعزیز خاں عزیزؔ اچھے شاعر گذرے ہیں[1]۔

محبت خاں نہایت وجیہ و شکیل تھے، غلام حسین مولف سیر المتاخرین رقمطراز ہیں[2]:

"میں نے آصف الدولہ کے آغاز حکومت میں حافظ رحمت اللہ خاں اور دوسرے پٹھانوں کی اولاد کو اکثر لکھنؤ میں دیکھا، اور ان کی کیفیت خود مشاہدہ کی، اس جماعت میں سب سے بہتر محبت خاں ابن حافظ رحمت اللہ خاں ہے، جو عنایت خاں کا چھوٹا بھائی ہے، یہ شخص صورت و سیرت دونوں کے اعتبار سے حکومت اور سرداری کی لیاقت رکھتا ہے۔"

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں از الطاف علی، ص ۳۶۹ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں [2] [illegible] رحمت خاں، ص ۳۰۳

۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو جنگ روہیلہ ہوئی، اور نواب شجاع الدولہ اپنے حلیف انگریزوں کی مدد سے فتحیاب ہوئے، نواب حافظ رحمت خاں جنگ میں کام آئے، اور روہیلکھنڈ کی نوابی ختم ہوگئی، روہیلوں پر مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، الطاف علی خاں نے لکھا ہے:[1]

"شجاع الدولہ نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا، اور نواب دوندے خاں مرحوم کے دار الحکومت بسولی کی طرف روانہ ہوئے۔ لشکر کے ہمراہ محبت خاں اور ان کے بھائیوں کے علاوہ حافظ الملک مرحوم کی اہلیہ محترمہ نواب عنایت خاں مرحوم کی بیوہ اور دوسری بیگمات اور بچوں کو بھی شیدی بشیر نے کشاں کشاں سخت بے حرمتی اور رسوائی کے ساتھ پیدل اور باربرداری کے چھکڑوں پر سوار کرکے اپنے ساتھ لے لیا، مئی کا مہینہ جو روہیلکھنڈ میں سخت گرمی اور دھوپ کا زمانہ ہوتا ہے، شروع ہوگیا تھا، اور ان نازپروردوں کو بیسیوں کوس چٹیل میدانوں میں اسی دھوپ اور لو میں پیدل یا چھکڑے پر تمام تمام دن سفر کرایا جاتا، تمام قیدی ایک دوسرے سے رسیوں میں بندھے ہوئے تھے، جسموں پر میلے کپڑے نہایت کثیف اور بوسیدہ ہوگئے تھے، کئی کئی دن بھوکے اور پیاسے رکھے جاتے اور کوئی نہ پوچھتا کہ تم نے کیا کھایا اور کیا پیا۔"

اس کے بعد نواب محبت خاں مع افراد خاندان قلعۂ الٰہ آباد میں قید ہوئے، کچھ دنوں کے بعد رہا ہوکر شجاع الدولہ کے لشکر کے ہمراہ فیض آباد میں رہے۔ نواب شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ کے دور وزارت میں، انگریزوں کی مداخلت پر دوبارہ قلعۂ الٰہ آباد سے رہا کرکے لکھنؤ لائے گئے، جہاں ان کے وظائف مقرر ہوئے، نواب محبت خاں کو سترہ ہزار ایک سو اکتیس روپیہ چند آنے وجہ مقررہ سے اور دس روپیہ یومیہ ریزیڈنٹ لکھنؤ کے خزانے سے

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں ص ۲۳۹

ملتے تھے، آٹھ ہزار چھ سو چھیالیس روپیہ سالانہ حافظ الملک کے سرداروں کا بھی وظیفہ ان کے اختیار و تصرف میں تھا، اس سے محبت خاں کے مصائب کا دور ختم ہو گیا، اور وہ لکھنؤ میں بافراغت زندگی بسر کرنے لگے، نواب آصف الدولہ ان کے ساتھ ہمیشہ لطف و عنایت کا برتاؤ کرتے تھے،

محبت خاں محبت کی تصانیف کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) عربی، فارسی، پشتو اور اردو شاعری پر مشتمل ایک دیوان (۲) مثنوی اسرار محبت (۳) لغت (۴) فارسی آمدنامہ

ان میں آخر الذکر دو کتابیں نہیں ملتیں، ممکن ہے تلف ہو گئی ہوں، مثنوی کے قلمی اور مطبوعہ نسخے ملتے ہیں، مکمل دیوان کا نسخہ ہندوستان میں نہیں ہے، مجھے صرف اردو غزلیات پر مشتمل دیوان کا نسخہ مل سکا جو رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے (مخطوطہ نمبر ۱۷۰ الف نظم اردو)

محبت خاں محبت کے تغزل اور مثنوی کا تعارف پیش کرنے سے پہلے، ان کے تلمذ کے متعلق گفتگو کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ تذکرہ نگاروں کا اس بارہ میں اختلاف ہے، میر حسن نے لکھا کہ محبت خاں محبت، خواجہ حسن یا جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے (تذکرۂ شعرائے اردو) مرزا علی لطف نے گلشن ہند میں، رام بابو سکسینہ نے تاریخ ادب اردو میں، اور عبد السلام ندوی نے شعر الہند، ج ۲ میں انھیں جعفر علی حسرت کا شاگرد بتایا ہے، عبد الغفور نساخ (سخن شعرا) سید نور الحسن خاں (طور کلیم) اور سید علی حسن خاں (بزم سخن) نے لکھا ہے کہ وہ خواجہ میر درد اور جعفر علی حسرت سے اصلاح لیتے تھے، سید محسن علی محسن (سراپا سخن) کی رائے ہے کہ وہ ابتدا میں جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے، ان کے انتقال کے بعد جرأت سے رجوع کیا، روشن علی

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں ص ۲۱۳

نے حیاتِ عاشق و محبت خاں میں انھیں صرف جرأت کا شاگرد بتایا ہے۔ ان افراد کو یکجائی طور پر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر تذکرہ نگاروں کا اجماع جعفر علی حسرت سے تلمذ پر ہے اور ہمارے خیال میں یہی صحیح ہے۔

کیا محبت خاں خواجہ حسن کے شاگرد تھے؟ اس سلسلہ میں خود میر حسن، جنھوں نے خواجہ حسن کا ذکر کیا ہے، مشتبہ ہیں، جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے: "باصلاح خواجہ حسن یا میاں جرأت نمودہ۔" میر حسن کے تذکرہ کی تکمیل ۱۱۸۸ھ ـ ۱۱۹۲ھ مطابق ۱۷۷۴ء ـ ۱۷۷۸ء میں ہوئی، جو محبت کے ورود لکھنؤ کا نیا زمانہ تھا، اس لیے وہ یقین کے ساتھ نہیں لکھ سکے کہ خواجہ حسن کے شاگرد تھے یا جعفر علی حسرت کے۔ جہاں تک خواجہ حسن کا تعلق ہے، وہ اور ان کے بھائی خواجہ حسین مصنف سیر المتاخرین چشتی مودودی درویش ہونے کی وجہ سے امرائے روہیلہ میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ روہیلکھنڈ کی نوابی ختم ہونے کے بعد خواجہ حسن اور محبت لکھنؤ میں یکجا ہوئے اور دونوں نے جعفر علی حسرت کی شاگردی اختیار کی۔ ان حالات کی روشنی میں یہ تو قرین قیاس ہے کہ جوان العمر محبت خاں اور خواجہ حسن میں مشورۂ سخن ہوتا ہو لیکن یہ تصور کہ محبت نے خواجہ حسن سے اصلاح لی ہو، قابل تسلیم نہیں معلوم ہوتا۔ دونوں ایک ہی استاد کے شاگرد ہوئے، اور اگر استادی و شاگردی کا فرق مراتب درمیان میں ہوتا تو خواجہ حسن اولاً تو کسی کے شاگرد ہوتے ہی نہیں، اور ہوتے بھی تو حسرت کے ہرگز نہیں۔ میرے خیال میں اس محبت و مودت کی بنا پر جو محبت خاں کو خواجہ حسن سے تھی میر حسن کو یہ گمان ہوا کہ وہ خواجہ حسن سے اصلاح لیتے ہیں۔ دراصل اس محبت اور توقیر کا سبب خواجہ حسن کی سیادت زیادہ اور شاعری کم معلوم ہوتی ہے۔ میر حسن کی تائید دیگر تذکرہ نگاروں نے بھی نہیں کی ہے۔

میر درد کا انتقال ۱۱۹۹ھ مطابق ۱۷۸۴-۸۵ء میں ہوا۔[1] لکھنؤ پہنچ کر محبت خاں جعفر علی

---

[1] میر درد کی تاریخ وفات میں میں نے رام بابو سکسینہ کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ دیکھیے تاریخ ادب اردو ص ۱۲۳

حسرت کے شاگرد ہوئے، حسرت کا انتقال سنہ ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۷۹۵ء میں ہوا[1]، لہٰذا [illegible]
۱۱۸۹ھ جو محبت خاں کے لکھنؤ پہنچنے اور حسرت کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا زمانہ ہے،
اس وقت سے حسرت کے انتقال کے وقت تک ان کا میر درد سے مشورہ سخن کرنے کا سوال
پیدا ہی نہیں ہوتا، ایک ہی وقت میں کوئی شاعر باضابطہ طور پر دو استادوں کا شاگرد نہیں ہوتا
اور نہ کوئی استاد اس بات کو پسند کر سکتا ہے، جنگ روہیلہ ۱۱۸۸ھ سے پہلے محبت خاں کو
خواجہ حسن کی رفاقت میسر تھی، اس کے باوجود اگر وہ باضابطہ طور پر کسی کے شاگرد ہوتے تو
کسی ایسے شاعر کو تلاش کرتے جو ان کے قریب ہوتا، اس وقت بریلی اور اس کے مضافات
میں محمد قیام الدین قائم، غلام ہمدانی مصحفی، حکیم کبیر سنبھلی، فدوی لاہوری، محمد نعیم نعیم
میر عوض علی مدعا، اور پروانہ علی شاہ پروانہ مرادآبادی موجود تھے، محبت خاں ان میں سے
کسی کے شاگرد نہیں ہوئے، ان اساتذہ کی موجودگی میں جو ان کے بزرگوں کے نمکخوار اور
ان کے بالکل قریب تھے، ان کا میر درد کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا،
جرأت، محبت خاں کی طرح جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے، اس لیے حسرت کے انتقال
کے بعد محبت کا جرأت سے مشورۂ سخن کرنا مضحکہ خیز امر ہے، محبت خاں کے لکھنؤ آنے اور حسرت
کی وفات تک کا زمانہ اکیس سال کا ہے، یعنی محبت خاں نے بیس اکیس سال حسرت سے کسب فیض
کیا، محبت جیسے جامع العلوم انسان کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ وہ حسرت کی وفات کے بعد بھی محتاج
اصلاح تھے، خلاف قیاس ہے، یہاں محبت کا ایک شعر نقل کرنا بے محل نہیں ہوگا۔

شاعران حال کو دو کیا سوا استاد کے
اب محبت ہے سخن پر ایک سر تیرا بلند

---

[1] حسرت کی تاریخ وفات کے سلسلے میں میں نے مرزا علی لطف کی رائے کو صائب مانا ہے، دیکھئے گلشن ہند ص ۱۰۰

اس شعر کا مفہوم تو یہی ہے کہ وہ جعفر علی حسرت کے بعد اپنے کو یہی وہی حیثیت سمجھتے تھے، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حسرت کی وفات کے بعد انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی، یہ کلیہ ہی صحیح نہیں ہے کہ اگر شاعر کسی سرکار میں ملازم ہو تو اس کا نواب کا استاد ہونا بھی لازمی ہے، محبت خاں کے بڑے بھائی نواب عنایت خاں جنگ پانی پت (۱۷۶۱ء) کے آزمودہ سپاہی تھے، ان کو شاعری سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، لیکن میر عوض علی مدعا سو روپے ماہانہ پر ان کی سرکار میں ملازم تھے، اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکالا جا سکتا کہ عنایت خاں، مدعا کے شاگرد تھے، اس لیے ہمارے خیال میں الطاف علی صاحب کا یہ لکھنا کہ محبت خاں جرأت کے شاگرد تھے، اور ثبوت میں یہ شعر پیش کرنا ؎

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے بستان کے ... نوکر ہوئے بھی ہم تو محبت خاں کے

کوئی ثبوت نہیں ہے، جرأت از راہ پرورش محبت خاں کی سرکار میں ملازم تھے، وہ بھی استاد بھائی ہونے کی وجہ سے، اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے،

دیوانِ محبت کے قلمی نسخے میں محبت کا تخلص سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے، یہی التزام دو ایک جگہ حسرت کے نام کے ساتھ ہے، محمد یار خاں امیر اور درد کا تخلص بھی بعض اشعار میں آیا ہے، لیکن اس کو سرخ روشنائی سے نہیں لکھا گیا ہے، اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ محبت کو حسرت کے ساتھ شاگردی کی بنا پر ایک خاص خصوصیت تھی، یہ بھی اس کی ایک قوی شہادت ہے کہ محبت، درد کے شاگرد نہیں تھے اور انھیں صرف جعفر علی حسرت سے تلمذ حاصل تھا،

اس بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ محبت اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں خواجہ حسن سے باہمی اصلاح کے طور پر مشورۂ سخن کرتے رہے جس کا تعلق شاگردی و استادی

---

۵ تذکرۂ شعرائے اردو میر حسن ص ۱۷۱

کے ضابطوں سے نہیں تھا، [illegible] سنہ [illegible] میں جب وہ لکھنؤ آئے تو انھوں نے جعفر علی حسرت کی شاگردی اختیار کی۔ حسرت کے انتقال کے بعد اپنی فکر کو رہنما بنایا، وہ کسی استاد کے سامنے زانوئے شاگردی تہ نہیں کیا، اس طرح اول و آخر وہ صرف جعفر علی حسرت ہی سے وابستہ رہے، اور انھیں خواجہ حسن، درد اور جرأت کا شاگرد بتانا صحیح نہیں۔

محبت خاں محبت کے دیوان مخطوطہ رامپور کے اوراق کی تعداد ایک سو دس ہے، یعنی دو سو بیس صفحات ہیں، ہر صفحے پر اوسطاً دو غزلیں ہیں، دیوان میں نہ تمہید ہے نہ ترقیمہ۔ البتہ ابتدائی صفحہ پر ایک نوٹ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کتب خانہ رامپور میں ۹ جون سنہ ۱۹۰۶ء میں آیا، کاغذ دبیز اور قدیم ہے، غزلیں صاف اور خوشخط لکھی گئی ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ دیوان محبت خاں کی زندگی میں نہیں لیکن اس کے کچھ ہی عرصے بعد لکھا گیا ہے، کیونکہ انداز تحریر قدیم ہے، محبت کے کلام میں خیالات کی سادگی اور بحروں کی شگفتگی اور ترنم نمایاں ہے، قافیہ و ردیف کا ربط استادانہ ہے، جو جعفر علی حسرت کا فیض معلوم ہوتا ہے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں جو محبت خاں کی شاعری کا دور ہے اردو زبان ادبی و لسانی اعتبار سے راہ ترقی پر گامزن تھی، اردو زبان میں فارسی اور عربی الفاظ کا اضافہ ہو رہا تھا، یہ دور "دکھنی" اور "ہندوی" کا ناسخ تو نہیں لیکن فارسی و عربی لغات کے اضافے اور ان کے صحت کے ساتھ استعمال کا زمانہ ضرور ہے، اس وقت تک اردو شاعری میں بھاشا کی نراہٹ باقی تھی، اور فارسی خیالات اور الفاظ کے استعمال سے اثرات شعری دو آتشہ ہو گئے تھے، غزل میں خیال کی سادگی، جذبات کی گرمی، بیان کی اثر انگیزی تھی، اس کے ایک چوتھائی صدی گزرنے کے بعد ہی لکھنؤ کے شعرا کے یہاں [illegible] اور مشکل پسندی و [illegible]

عمر انہ کا تشبیہات و استعارات ، مبالغہ آرائی ، ژولیدہ خیالی وغیرہ کی وجہ سے غزل کی روح ختم ہو گئی اور متروک وغیر متروک ، فصیح و غیر فصیح کی بحثوں میں فارسی دعوؤں کا استعمال غلبہ ہوا ، کہ اصل تحریک غیر فطری بن گئی ۔ اس دور کے شاعر الفاظ کے جوہری تو تھے ، مگر جواہر کے سحر کا راز ان پر منکشف نہیں ہوا ۔ اس تحریک کے مظاہر مصحفی کی شاعری میں مل جاتے ہیں ۔ محبت خاں کا تعلق اس تحریک کے فطری دور سے تھا ، اور وہ قائم ، میر ، میر حسن وغیرہ کی طرح الفاظ کے فطری اثرات پر نظر رکھتے تھے ۔ انھوں نے بھی فارسی سے استفادہ کیا ہے ، مگر ایک خاص تناسب سے ، اس اعتبار سے محبت خاں محبت کی شاعری خاصی اہم ہے ۔ اسکے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں :

نظر کے پڑتے ہی تجھ پر مرا گلہ نہ رہا — کہ دیکھتے ہی تجھے دل میں مدعا نہ رہا

یہ بڑھا دیوانہ پن اپنا کہ ناصح دل ہوا — تھا مرا ہمدرد لیکن مجھکو سمجھانے لگا

تمنا یار سے ہیہات کہنے میں نہیں آتی — غرض یہ کیا کہوں کچھ بات کہنے میں نہیں آتی

ساقی ہمیں گھٹا جو برستی نظر پڑی — یاد آئی مے وہیں وہ ہی مستی نظر پڑی

دیدہ زمانہ کرتے ہیں ہم چشم خانہ میں — اڑتا ہے اپنا مرغ نگہ آشیانہ میں

دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ اے صبا تک — مرا غبار کیجیو برباد اس طرح کا

دل جو جاتا ہے چلا جائے کہیں مجھکو کیا — اس کی رسوائی کو کہتا ہوں نہیں مجھکو کیا

منزل اول ہے ابھی عشق کی لے تاب تواں — چھوڑ جاتے ہو تم افسوس مجھکو کیا

گالی کا انتظار تو حد سے گزر چکا — منہ کو کہاں تلک ترے دیکھا کرے کوئی

دامن جھٹک جھٹک کے گزر اس گلی سے تو — آخر کو تیری راہ کا میں ایک غبار ہوں

تعلیم کس نے کی ہے یہ بیداد زلف کو — زنجیر اپنا کہتی ہے استاد زلف کو

ہوا سر دار پر منصور کے چڑھنے سے [illegible] ظاہر — [illegible]

ایک تو زلف کے پیچ میں پھنسا تھا یہ دل — تس پہ یہ خط اور جو ادام خدا خیر کرے
جی دھڑکتا تھا پڑے لگ کے جب پاؤں سے — لایا قاصد وہی پیغام خدا خیر کرے
تو بکل اس عشق سے اس دل نے توبہ کی تھی پر آج — پھر محبت کا لیا نام خدا خیر کرے

دل ہے تو آشنا کس کا — عقل کا یا جنون کا کس کا
فائدہ کیا ہے نالہ کرنے سے — حال سنتا ہے بے وفا کس کا
دل جگر دونوں اس نے قتل کیے — دے محبت کو خونبہا کس کا

ودے قیامت کے تب آنے کی بھی امید — جب ہم سے ترا وعدۂ فردا نہ ہوا تھا
کچھ شور سا ہے دل کی خبر بھیجیو ہمدم — اب تک کبھی اس کوچے میں غوغا نہ ہوا تھا
مجھ پر ہی زباں تیری کھلی ہے نہیں مجھ سے — سرزد کبھی اک حرف بھی بیجا نہ ہوا تھا

کل راہ میں گھیرا ہے تو گھبرا کے وہ بولے — ہاں ڈھب نہیں کیجیے گا ملاقات کہیں اور

پاکبازی پہ مری شک ہے تو دیتے جاؤ — بوسہ ہر بار مجھے یار قسم لے لیکر

جی میں ہے دل کو سرخرو کیجے — تیغ قاتل کے روبرو کیجے
نالہ اپنا اثر نہیں کرتا — فائدہ کیا جو ہائے ہو کیجے
دیر و کعبہ میں تو نہیں ملتا — کس جگہ تیری جستجو کیجے
بات اپنی تو وہ نہیں سنتا — اس سے کیا ہائے گفتگو کیجے
خون میرا اٹھا لے دامن سے — جانے کیا لا کے شست و شو کیجے
مسجودہ دعویٰ عشق کرتے ہیں — لا کے اب مجھے دوبدو کیجے
جو کہ ثابت ہے محبت میں — ملے جہاں اس کی آبرو کیجے

اس چشم کو کیوں گھر کر چلے — یہ اشک ہوں گے کہ اب ہار کر چلے

انداز و ناز و عشوہ میں کیا کیا بیاں کروں
اس دل کو سو جگہ پہ گرفتار کر چلے

کیا سحر تھا کہ باغ میں خوش چشم آن کر
نرگس کو اک نگاہ میں بیمار کر چلے

ہشیار رہیو دل تو شب تار زلف میں
رہزن بہت ہیں ہم تجھے بیدار کر چلے

کیا بات تھی نہ جانیں کہ دو لب ہلا کے یاں
دونوں جہاں سے اب ہمیں بیزار کر چلے

ہم کر چلے نہ سہی محبت میں چھوڑ حیف
دنیا میں تھا یہی کہ جو تم پیار کر چلے

دین و ایمان و خرد تو لے چکے ہیں ہم سے آپ
باقی اب جان ہے اسے لیجائیے یوں ہی سہی

اب تلک دنیا میں کیا کیا نعمتیں کھاتے رہے
عشق میں اب تیرے غم کو کھائیے یوں ہی سہی

پیام آمد کا کس کی صبا کے ساتھ آتا ہے
کہ گل آپ ہی کھلا جاتا ہے غنچہ مسکراتا ہے

میسر وصل ہو جس کو وہ اس لذت کو کیا جانے
مرا دل فرقتوں میں آہ جو جو حظ اٹھاتا ہے

دل اس شوخ کو دیئے ہی بنی
اور عوض اس کے غم لیے ہی بنی

جس گھڑی تو لگائے تیر نگاہ
سینہ اپنا ہدف کیے ہی بنی

میرے لاشے پہ تو مسیحا دم
اگر آوے تجھے جیے ہی بنے

چاک ہے جیب ناصح آ پہنچا
اب محبت مجھے سیے ہی بنے

اس سادہ، شگفتہ اور غنائی فضا میں درد کی ٹیسوں، غم کی تپش، کرب و الم کے چرکوں اور مایوسی و محرومی کے احوال کا شبہہ تک نہیں ہوتا، لیکن اشعار میں محبت خاں کی شخصیت کا سونا گھل کر جھلکتا ہے۔

اس غم کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں؟ ذہنی لذت، میر تقی میر کی شاعری کے اثرات، عشق یا کسی مقصد میں ناکامی اور احساس محرومی، ہمارے سامنے ان کی زندگی کے حالات ہیں، نوجوانی میں ان کی شادی ہوئی، وہ کثیر العیال تھے۔ دو ایک سال چھوڑ کر عمر کا تمام حصہ

ش و عشرت میں گزرا، شہرت، عزت اور ثروت نے قدم چومے، اس لیے بظاہر ان کی زندگی
نا دو بامراد تھی، لیکن ان کے کلام کی یاس و حرمان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زخم خوردہ
ل کی صدا ہیں ؎

روتے دیکھا مجھے تو دشمن کا دیدۂ بے اختیار بہ آیا
ہر چند کہ روئے ہم محبت پر دل کا غبار کچھ نہ نکلا

دل تو ایک مدت ہوئی جاتا رہا سینے سے جان بھی جاتی ہے اب میری خدا خیر کرے
ایک زندہ ہوں میں درد محبت سے وگرنہ یہ درد کشندہ اتھا مسیحا نہوا تھا

جیوں عشق میں تغیر ہوئی ہے میری حالت ایسا تو مدا احوال کسی کا نہوا تھا
سن سن کے بیقرار محبت ہوئے سبھی بس درد کے پڑھے گا تو اشعار کب تلک

آمد آمد ہے اب درد کی رخصت ہو چلے صبر اور طاقت و آرام خدا خیر کرے
سرخی اشک کبھی اور کبھی زردی رو تو نے اے عشق عجب رنگ دکھایا مجھکو

اور کیا جانوں بجز حرف محبت ناصح یہ ہی استاد ازل نے ہے پڑھایا مجھکو
بت آبلۂ پا کو ہوئی ہے ابکے پھر وحشت یہ مژدہ جا کے پہنچا دو کوئی خار بیاباں کو

ہو کباب جگر اور سینے کی بریانی ہو ہو سکے عشق کی اے دل تو یہ مہمانی ہو
روشن ہیں مرے جسم کے سب داغ جیوں چراغ وقت نظارہ ہے کہ سراپا بہار ہوں

ا کہیں پہچاننے سے آشنا سب ہو گئے ہم نے دیکھا یاں تلک آزار دل کے ہاتھ سے
شام سے ہے میرا ایک دم خون دل کا کیا کروں ہیں مری آنکھیں سدا خونبار دل کے ہاتھ سے

و ز ناشغل ہے میرا کبھی آہ و فغاں میں کبھی رہتا نہیں بیکار دل کے ہاتھ سے
ے فلک پیدا کیا تو نے غم میرے لیے راحت اوروں کے لیے درد و الم میرے لیے

دیکھ تو آشنا کوئی غمگین ہے تیرے دور میں — جام مے اوروں کو ہے اور جام غم میرے لیے

کیا کرے کوئی لکھا قسمت کا کب تبدیل ہو — رنج ہی گر لکھ دیا قسّام لوح و قلم میرے لیے

اگرچہ لالہ تیرے دل میں داغ ہیں لیکن — ابھی تو لینی ہے تعلیم میرے سینے سے

محبت خاں کی زندگی کے دو سال (۱۱۷۴ھ / ۱۷۷۵ء) کے حالات ایک غیور پٹھان اور ایک والی ملک کے اعصاب منتشر کرنے کے لئے کافی تھے۔ جنگ روہیلہ میں ناکامی، ایک اولو العزم باپ کی وفات، جنگ کے بعد روہیلوں کا استیصال، اہل خاندان کی کسمپرسی اور بے توقیری ایسے حالات ہیں جو ایک ذہین و ذکی الحس انسان کا نظام فکر بدلنے کے لیے کافی ہیں، لکھنؤ میں اقامت اختیار کرنے کے بعد گو انھیں عزت و آرام میسر ہوا لیکن زخم مندمل نہ ہو سکا۔ اور غریب الوطنی اور عظمت رفتہ کے احساس سے ان کا دل برابر غمگین رہا، ان کا یہ شعر اسی نوعیت کا ہے،

صیاد گر ز باغ جدا گشتہ ام چہ غم — از خون خود قفس شدہ رشک چمن مرا

اہل طریقت کی بات زبان سے نہیں دل سے نکلتی ہے، اور شاعری میں اسی کلام میں تاثیر ہوتی ہے جس میں زبان سے زیادہ دل کو دخل ہوتا ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود شاعر کا دل کسی جذبے سے متاثر ہو، محبت خاں نے غم جاناں اور غم حیات کو خون دل میں تحلیل کرکے اشعار کہے ہیں، اس لیے ان کے کلام میں سوز و اثر ہے۔

پڑھ محبت کی غزل اے دل کہ کٹ جائے سفر — رہ منددوں کو یہی ہے نغمہ و آہنگ راہ

سید الطاف علی مولف حیات حافظ رحمت خاں نے محبت کے دو عربی اور اکتالیس فارسی اشعار درج کیے ہیں، ہم اس سے انکے فارسی کلام کا نمونہ پیش کرتے ہیں،[۱]

---

[۱] ص ۳۱۴ - ۳۱۵

ز سرگذشت محبت ز ہر کہ پرسیدم | بہ عارض اشک پیاپے چکید و ہیچ نگفت
دویم ببیں شگفتہ کہ در عین خرمی | چوں گل ہزار چاک شود پیرہن مرا
صیاد گر ز باغ جدا گشتہ ام چہ غم | از خون خود قفس شدہ رشک چمن مرا

قاصد از شہد و شکر بہ سخنے می گوید | زاں کہ حرف از لب شیریں دہنے می گوید
دلم از سینۂ پر داغ حدیثے دارد | بلبلے حرف بہار چمنے می گوید
گل فشاں آمدہ ہر وقت محبت بہ کلام | زانکہ ہر دم سخن گلبدنے می گوید

از تپ خورشید محشر فارغم | بر سر من سایۂ دیوار تست

عزیزم دار و آں یوسف کہ گوید | کسے شاید کہ خوابے دیدہ باشد
چشم اے ماہ شب و روز زبس گریان است | خلق گویند کہ امسال عجب باران است
درد محبت تو مرا آہ ندانی صادق | باوجودیکہ مرا نام محبت خان است
دل زخود رفتہ براہ طلبت برخاست | باز نہ نشست دمے تاکہ ز دنیا برخاست
چوں تو برخاستی از بہر علاجم جاناں | شور افتاد بہ عالم کہ مسیحا برخاست
بسکہ گردید فزوں گرمی و اشک و آہم | آب شد آتش و دود از دل دریا برخاست
یار موجود در آغوشش نمی بیند کس | اے محبت زجہاں دیدۂ بینا برخاست

(باقی)

شعر الہند حصہ دوم

اس میں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔

۴۴۴ صفحے (طبع ششم) قیمت معہ

منیجر

آثارِ علمیہ و تاریخیہ

مکاتیب مولانا احمد سعید صاحب دہلوی

بنام

بنام مولانا سید سلیمان ندوی

مورخہ ۱۸ شوال المکرم ۱۳۴۴ھ
دہلی

سیدی و مولائی دامت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ، دفتر میں مولانا سجاد صاحب کا ایک خط موصول ہوا ہے جس کا ضروری اقتباس مولانا کی حسب ہدایت آپکے پاس بھیج رہا ہوں،

۱ ۔ الموتمر العالم الاسلامی قائم کیجائے جس کے مقاصد ونصب العین حسب ذیل ہوں گے۔

(الف) حکومت حجاز کو قوی تر بنانے کی سعی کرنی،

(ب) غیر مسلمین کے دسائس واثر سے ارض حجاز وجزیرۃ العرب کو پاک رکھنے کی کوشش کرنی،

(ج) دنیائے اسلام کے مرکز وحید (ارض حجاز) کی طرف مسلمانانِ عالم کو ہمیشہ متوجہ رکھنا،

(د) دنیاے اسلام کے ساتھ روابط قائم کرنا اور اس کو مستحکم بنانا،

۲ ۔ آیندہ موتمر حجاز میں مندوبین حجاز ومندوبین عالم اسلامی سے انتخاب کرکے موتمر عالم اسلامی کی بنیاد قائم کردیجائے۔ اور جن ممالک سے مندوبین نہ آئے ہوں ان ممالک کے ارکان کی تعداد متعین کرکے ان کو اطلاع دیجائے۔

۳۔ اس موتمر میں الموتمر العالم الاسلامی کے لیے ایک مختصر دستور العمل تیار کیا جائے جس میں یہ دو دفعات بھی ضرور ہوں، اوّل یہ کہ ہر سال موتمر حجاز کا سالانہ اجلاس ارض حجاز میں ہوا کرے گا، دوّم یہ کہ اس موتمر کا صدر، دفتر مکہ معظمہ میں رہے گا،

۴۔ اسی موتمر میں لجنۃ العالم الاسلامی المستشاریہ للحکومت الحجاز کی تشکیل ہونی چاہیے، جس کے اعضا کم از کم سات ہوں، جو مندوبین عالم اسلامی سے منتخب کیے جائیں، اس لجنہ کے تمام اعضا کا قیام ایام رکنیت تک ارض حجاز میں لازم ہوگا، یہ مجلس حکومت حجاز کو مفید مشورے دیتی رہے گی، اس مجلس کے اخراجات ان ممالک کے ذمہ ہونگے جن کے نمایندے اس مجلس کے رکن ہوں گے۔

۵۔ اس موتمر میں یہ بھی طے کر لیا جائے کہ چونکہ حکومت حجاز خالص حکومت اسلامی ہے اور ہمیشہ خالص اسلامی حکومت رہے گی، اس لیے اس حکومت کی تشکیل اور اس کے اصول و قوانین شریعت اسلامیہ کے مطابق ہوں گے اور حاکم حجاز کے تعین و انتخاب میں نسل و وراثت کو دخل نہوگا۔ اور حاکم حجاز کا انتخاب اگرچہ حجاز کے ارباب حل وعقد کے انتخاب سے عمل میں آئے لیکن اصول طریق انتخاب و قوانین عزل و نصب ایسے وضع کیے جائیں گے جو شریعت اسلامیہ سے ماخوذ اور اس میں موجود ہوں، یا کم از کم مخالف شرع نہ ہوں، اور ان اصول کی ترتیب و وضع میں اہل حجاز کے ساتھ مندوبین عالم برابر کے شریک ہوں گے،

میرے خیال میں اس وقت اگر یہ سب باتیں طے ہو جائیں تو بہت بڑی کامیابی اور اس سے آیندہ کامیابیوں کے لیے راہ کھل جائے گی اور امید کی جاتی ہے کہ ملا سے خوش آیند توقعات آگے چل کر پورے ہوں گے اور رفتہ رفتہ اس اصول سے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ حکومت حجاز کے اندر مسلمانان عالم کا اثر سرایت کرے گا، اور ابن سعود وغیرہ سے جو خطرات ہیں ان کا بھی سد باب ہو جائے گا، اور اس طریق کار سے مجلس دول اسلامیہ کی بنیاد قائم ہو جائے گی اور

اور بہت ممکن ہے کہ صحیح معنوں میں خلافت اسلامیہ کے قائم کرنے کا موقع مل جائے، اور اگر اس وقت حجاز میں جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کی گئی یا یہ کہ موجودہ حاکم کے انتخاب کو غلط بتا کر انتخاب جدید کا مطالبہ کیا گیا یا یہ کہ حکومت حجاز کی تشکیل میں کسی قسم کے تغیر کی خواہش ظاہر کی گئی تو اغلب قرینہ یہ ہے کہ سلطان ابن سعود ہرگز ان امور سے متفق نہ ہوں گے اور موجودہ احوال میں عموماً اہل حجاز بھی ابن سعود کے منشا کے خلاف رائے نہ دے سکیں گے، اور ان امور کے پیش کرنے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ جمعیۃ علمائے ہند و خلافت کمیٹی کی وساطت سے مسلمانانِ ہند کا جو اثر سلطان ابن سعود پر ہے، وہ زائل ہو جائے گا اور جو کچھ اصلاح کی توقع ہے وہ جاتی رہے گی۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہمارے اس خط کو مولانا سید سلیمان ندوی کے ذریعہ سے وفد خلافت کو دکھا دیجئے، میں ان کو بھی انہی امور کے بابت خط لکھنا چاہتا تھا، مگر تنگی وقت مانع ہے۔

احمد سعید

مولانا المحترم دامت معالیکم

السلام علیکم۔ اعظم گڈھ کی چند روزہ صحبت میری زندگی کی بہترین یادگار ہے[1] جی تو یہ چاہتا تھا کہ دار المصنفین کی عمارت ہی کو اپنے ہمراہ دہلی اٹھا لاؤں، تاکہ آپ جیسے مخلصین کی زیارت کا ہمیشہ شرف حاصل ہوتا رہے، آپ کی خاموش مساعی اور خدمت ملک و ملت موجب ہزار تحسین و آفرین ہے، خدا تعالیٰ آپ کی اس سعی کو مشکور و مقبول فرمائے، اور آئندہ آنے والی نسلوں کو اس ذخیرہ سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے، جو آپ ان کے لیے جمع کر رہے ہیں، مولانا عبد السلام صاحب کی انتہائی خاموشی اور مولانا مسعود علی صاحب کی انتہائی شگفتگی نے دار المصنفین کی فضا میں ایک اعتدال پیدا کر دیا ہے، رفقائے دار المصنفین کی محبت و ایثار مجھ جیسے نالائق کے لیے موجب رشک و غبطہ ہے،

---

[1] مولانا کی مؤضلع اعظم گڈھ کی ایک تقریر پر اعظم گڈھ میں مقدمہ چلا تھا، اس سلسلہ میں ان کا قیام دار المصنفین رہا تھا۔

آپکے تمام رفقاء بہترین رفقا ہیں، کاش یہ کسی کی درخواست پر مضمون لکھ دینے کے بھی عادی ہوتے،
آخر میں جناب کے اخلاق کریمانہ اور میزبانہ، آرام و آسایش کا مخلصانہ شکریہ پیش کرتا ہوں،
امید ہے کہ جناب کا مزاج عالی بخیر ہوگا، جملہ پرسان حال کو عموماً اور بالخصوص مولانا
مسعود علی صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب کی خدمت میں سلام مسنون، رفقائے دار المصنفین
کی خدمت میں بھی سلام پہنچا دیں، حکیم محمد اسحاق صاحب کی خدمت میں سلام مسنون، اگر سہیل صاحب
تشریف لائیں اور ان کا دماغ صحیح ہو تو ان کی خدمت میں بھی سلام پہنچا دینے کا کچھ مضائقہ نہیں۔

خویدکم للا فقر سعید

۳۰ اگست ۱۹۳۹ء
دہلی

محترم و مکرم حضرت سید صاحب دام اللہ مجدکم

السلام علیکم۔ ہندوستان کے حالات و واقعات اس قدر تعجیل کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ کسی کے روکے رک نہیں سکتے، کانگریسی حکومتوں کا رویہ قابل اطمینان نہیں ہے، اور مسلمانوں کو ان حکومتوں کے طرز عمل سے عام شکایتیں پیدا ہو رہی ہیں، اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک مخصوص اجتماع میں اس امر پر غور کیا جائے کہ مسلمانوں کو کیا صورت اختیار کرنی چاہیے۔

میں دو چار دن میں مجلس عاملہ کا ایک جلسہ طلب کر رہا ہوں جس کی اطلاع آپ کی خدمت میں روانہ کی جائے گی، اس موقع پر عام ممبران کی یہ خواہش ہے کہ آپ ضرور شرکت فرمائیں، کچھ عرصہ سے آپ کی عدم توجہ کے باعث استفادہ سے محرومی ہے، جو ہمیشہ جمعیۃ علماء کے ارکان آپ کی ذات گرامی سے حاصل کرتے رہے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ مجلس عاملہ کے اس جلسہ میں جو ستمبر کے پہلے ہفتہ میں ہونے والا ہے، آپ ضرور تشریف لا کر اپنی رائے سے استفادے کا موقع دیں، میں آپ کے امید افزا جواب کا منتظر ہوں، ارباب ندوہ کی خدمت میں سلام مسنون۔

آپ کا مخلص
فقیر احمد سعید کان اللہ لہ

۲۴ر مارچ ۱۹۴۳ء
دہلی

سیدنا المطاع زاد اللہ مجدکم علماً وحلماً

السلام علیکم۔ حضرت والا کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا تھا، مسٹر عام کے خطوط سے بیگم صاحبہ اور بعض بچوں کی علالت کا حال معلوم ہوتا رہا، لیکن جناب کا کوئی گرامی نامہ ابتک موصول نہیں ہوا، نہ تشریف آوری کی صحیح تاریخ کا علم ہوا، نہ یہ معلوم ہوسکا کہ قیام کتنے دن ہوگا۔ اور یہ بھی نہیں معلوم ہوسکا کہ میاں سلمان ہمراہ ہوں گے یا نہیں؟

کل اخبارات میں اعظم گڈھ میں فرقہ وارانہ فساد کی خبر پڑھکر تشویش ہوئی، لیکن تفصیل نہ معلوم ہوسکی،

میری حالت یہ ہے کہ جس دن سے آیا ہوں کچھ نہ کچھ بیمار رہوں، آج کل گلا ایسا آیا ہے کہ نہ بات ہوسکتی ہے اور نہ آسانی سے کچھ کھایا پیا جاسکتا ہے، جب افاقہ ہوتا ہے، اعظم گڈھ اور شبلی منزل کے احباب کو شکریہ کے خطوط لکھتا ہوں، مولانا مسعود علی صاحب کی خدمت میں اس وقت تک کوئی خط نہیں لکھ سکا ہوں، روز سوچتا ہوں کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں، مگر الفاظ میسر نہیں آتے۔ جب تک طبیعت کو افاقہ نہ ہو ان کو خط لکھنا مشکل ہے، چاہتا ہوں کہ خط ان کے ذوق کے موافق ہو، لیکن دماغ ہی حاضر نہیں۔

گلا آجانا بظاہر تو معمولی مرض ہے، لیکن میں تو بہت ہی تکلیف محسوس کر رہا ہوں،

خدا کرے آپ مع متعلقین بخیریت ہوں، میں شکر گزار ہوں گا اگر جناب والا چند سطور سے مجھے ممنون فرمائیں گے، تاکہ مجھے اطمینان ہو، اور میں بھی اپنا پروگرام بنا سکوں، اسمٰعیل کاکا مدراس سے تشریف لائے ہوئے ہیں اور خواجہ عبدالحئی صاحب کی تحویل میں ہیں۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہٗ

۲۴ اگست ۱۹۴۱ء
دہلی

سیدنا المطاع زادکم اللہ مجداً و شرفاً

السلام علیکم، گرامی نامہ کا شکریہ! یہ صحیح ہے کہ اکثر روایت پیش نظر رہی، بعض احادیث کے ضعف کی تصریح کر دی گئی ہے، غالباً تین مقامات پر اس قسم کی تصریح موجود ہے، جناب کو معلوم ہے الاتحافات السنیہ پر میری توجہ زیادہ مرکوز رہی، مگر اعتماد سب سے زیادہ حظیرۃ القدس پر رہا، حظیرۃ الانس کو پورا کرنے کے بعد میں نے دوسری جانب توجہ کی، بہر حال آپ حضرات کی توجہ اور دعاؤں سے جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا، نواب سید علی حسن صاحب کا نام چونکہ معلوم نہ تھا اس لیے نہیں لکھا جا سکا، اگرچہ میں جانتا تھا کہ ابو النصر علی حسن ان کے صاحبزادے ہیں، مگر یہ کوتاہی ہو گئی، اگر میری زندگی میں دوسرے اڈیشن کی نوبت آئی تو انشاء اللہ اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

مسٹر عاصم کا عرصہ سے خط نہیں آیا نہ ان کے امتحان کا نتیجہ معلوم ہوا، ایم اے پاس ہو گئے؟ کس درجہ میں پاس ہوئے، بہر حال آپ کا انتخاب قابل ستائش ہے، خدا تعالیٰ انجام بخیر کرے مسٹر عاصم خدا کے فضل سے بہت شریف الطبع نوجوان ہیں، کیا چھوٹی صاحبزادی کی بھی شادی ہو رہی ہے؟

میاں سلمان کے ندوے میں داخل ہونے پر مبارکباد قبول کیجئے، اللہ تعالیٰ ان کے علم و فہم میں ترقی عطا فرمائے، اور میاں سلمان کو آپ کی صحیح جانشینی کا فخر حاصل ہو،

رفقاء دار المصنفین کی خدمت میں سلام مسنون بالخصوص مولانا مسعود علی صاحب ندوی، امام صاحب، مولوی عبد السلام صاحب، شاہ معین الدین صاحب، پروفیسر نجیب صاحب سے میرا سلام کہہ دیجئے۔ خدا جانے پی ایچ ڈی کہاں ہیں؟

محتاج دعا خویدکم لا مفتقر فقیر احمد سعید کان اللہ لہ

۳ اپریل [illegible]
ندوۃ المصنفین دہلی

سیدنا المکرم دامت معالیہم — السلام علیکم

عرصہ کے بعد جناب کا گرامی نامہ موجب مسرت ہوا، پہلے کبھی کبھی میاں حکم اور سہیل آ نکلتے تھے، تو شبلی منزل کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، لیکن اب کچھ عرصہ سے ان کا بھی پتہ نہیں، خدا جانے کہاں ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

حضرت والا! مجھ پر ایک عرصہ سے ایک خاص مرض کا تسلط ہے جس نے مجھے صاحب فراش بنا دیا ہے، سو بڑھ روز کم ہو گیا ہے، ریاحی ہوا سیر نے قلب اور معدہ کے دوروں کی شکل اختیار کر لی ہے، ہر وقت اختلاجی کیفیت رہتی ہے، تقریباً ۲ سال سے نہ کوئی سفر کیا ہے اور نہ کہیں جلسہ میں تقریر، شہر میں کہیں چلا جاتا ہوں تو بیٹھے بیٹھے دس پانچ منٹ کچھ کہہ دیتا ہوں، ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ کب دورہ پڑ جائے، امراض کا تداول ہوتا تو کیفیات میں تبدیلی ہوتی رہتی، اور میں یہ عرض کر سکتا کہ فلاں مرض کی حالت میں حاضر ہو جاؤنگا، لیکن ایک ہی مرض نے ایسے پاؤں جما لیے ہیں کہ گویا گھر بنا لیا ہے، زندہ ہوں مگر زندگی کی لذتوں سے محروم ہوں۔ مولوی مسعود علی صاحب کا سفارش نامہ سمینار کے سلسلے میں آیا تھا، لیکن نہ سمینار والوں نے مجھے دیکھا اور نہ مولوی مسعود علی صاحب نے ملاحظہ فرمایا، اگر یہ لوگ دیکھتے تو ایک عجیب حالت دیکھتے، اور خود مجھکو مشورہ دیتے کہ تو سفر سے احتراز کر۔ ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری کے زیر علاج ہوں، وہ تو بات کرنے اور ترجمہ کا کام کرنے سے بھی منع فرماتے ہیں، اگر خیر ان کی ہدایات پر تعمیل ناممکن ہے، تھوڑے تھوڑے کچھ کام ہوتے رہا ندوۃ المصنفین کا کرتا رہتا ہوں، مرض ایسا نہیں جو قابل افاقہ ہو، اگر ایسا ہوتا تو میں یہ کہہ سکتا تھا کہ میں دس دن میں یا مہینہ بھر میں حاضر ہونگا، مگر مرض کی حالت تو تقریباً یکساں ہے۔

یہ مختصر سی روداد زندگی ہے، جو نہایت افسوس اور ندامت و شرمندگی کے ساتھ لکھ رہا ہوں، معلوم نہیں یہ غم ہے کہ میں تعمیل حکم سے کس طرح قاصر ہوں، ورنہ آپ کی سفارش کو تو میں کا سوال الالد لابنہ سمجھتا ہوں۔ واللہ علی ما نقول وکیل۔

آپ حضرات کی دعاؤں کا طالب ہوں، خدا کو صحت دیتے دیر نہیں لگتی، اگر اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے صحت عطا فرمائے تو مجھے تعمیل حکم سے کیا عذر ہو سکتا ہے، بہرحال میں جناب سے مکرر عذر کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔

شبلی منزل کے تمام اکابر اور احباب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔ ایک جوابی لفافہ بھی موصول ہوا ہے جسکی قیمت مع شکریہ استعجاب کے ساتھ اسی لفافہ میں بھیج رہا ہوں۔

فقیر احمد سعید کان اللہ لہ

مطبوعات جدیدہ

مقدمۃ فی النحو (عربی)۔ از خلف الاحمر، صفحات ۱۲۲، ٹائپ اعلیٰ، ناشر وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی، دمشق (شام)

نحو کے قواعد سب سے پہلے ابو اسود دؤلی نے ترتیب دیے، پھر اس کے بعد بیشمار ائمۂ فن نے اسے ترقی دی، دوسری صدی ہجری اس فن کے شباب کا زمانہ تھا، اور اس میں بڑے بڑے ائمۂ نحو پیدا ہوئے اور بڑی مفصل و مطول کتابیں اس فن پر تصنیف ہوئیں، انہی ائمۂ نحو میں ایک ممتاز امام نحو خلف الاحمر البصری بھی ہے، جس نے نحو کی یہ مختصر مگر جامع کتاب تصنیف کی، جو ابتک ناپید تھی عبد العزیز میمن صاحب نے اس کا ایک قلمی نسخہ فروق (ٹرکی) میں دیکھا جسکی طرف شام کی وزارت ثقافت وارشاد کو متوجہ کیا، چنانچہ وزارت مذکور نے علم دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے اس کا فوٹو لیکر شائع کرنے کا اہتمام کیا، چونکہ اس کا کوئی دوسرا نسخہ موجود نہیں تھا، اس لیے اس کے مرتب و محشی عزالدین تنوخی کو جہاں جہاں شبہہ ہوا، عرب ملکوں اور خاص طور سے مصر کے نحاۃ سے رجوع کے بعد پوری تحقیق سے اس کی تصحیح کی ہے،

نحو کی مختصر کتابوں میں غالباً یہ پہلی کتاب ہے جو دوسری صدی ہجری میں تصنیف ہوئی۔ خلف الاحمر اس فن کا امام تھا، اس لیے کتاب کی زبان انتہائی صاف اور مباحث بہت ہی مرتب ہیں، اسم، فعل اور حرف کی تقسیم کے بعد سب سے پہلے حروف پر بحث کی ہے، وہ "حرف" کا لفظ اصطلاحی معنی کے ساتھ کلمہ اور عام معنی میں بھی استعمال کرتا ہے، کتاب درس میں داخل کرنے کے قابل ہے۔

اقبال اور سیاست ملی - از رئیس احمد جعفری ندوی، صفحات ۵۰۰، کتابت و طباعت متوسط، ناشر اقبال اکیڈمی، کراچی۔ قیمت عیر

اقبال اول و آخر شاعر اور فلسفی تھے، اور یہ دونوں خارزار سیاست میں اپنا دامن الجھانا پسند نہیں کرتے، مگر اقبال نرے شاعر اور فلسفی نہیں تھے، بلکہ وہ اپنے سینہ میں ایک دلِ دردمند بھی رکھتے تھے، اور اپنے اسی دلِ دردمند کی نواہائے دروں کے اظہار کیلئے انھوں نے شاعری اور فلسفہ کا سہارا لیا تھا، اس لیے ہندوستان کی سیاست میں جو مدوجزر ہوتا تھا، اس سے وہ اثر لیے بغیر نہیں رہتے تھے، خاص طور پر وہ مسلمانوں کے سیاسی زوال اور دینی بےحسی سے بےحد متاثر تھے، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان موجودہ سیاست میں دوسروں کے زلہ ربا نہ بنیں، بلکہ دنیا کے سامنے اس پیغام حیات کے داعی بنیں، جو ان کی تخلیق کا مقصد وحید ہے،

علامہ اقبال کا عہد خاص طور پر ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۵ء یعنی جنگ بلقان سے وفاقی حکومت کے قیام کے درمیان کے زمانہ میں ہندوستان میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات ہوئے، یہی زمانہ ہے جس میں مسلمانوں میں سیاسی بیداری، ملی جذبہ اور اپنی انفرادیت کا احساس پیدا ہوا، علامہ اقبال جنھوں نے اس احساس کے پیدا کرنے میں خود حصہ لیا تھا، سیاسی اعتبار سے جب بھی اس پر کوئی زد پڑتی تھی، وہ متاثر ہوتے تھے، چنانچہ انھوں نے پنجاب اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے گول میز کانفرنس کے رکن کی حیثیت سے سائمن کمیشن کے معاون، اور نہرو رپورٹ کے مخالف کی حیثیت سے ہندوستان کی سیاست میں حصہ لیا اور بڑی کامیابی حاصل کی۔ اس کتاب میں اقبال کی اسی حیثیت کو ان کے خطوط اور واقعات سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

امام الہند۔ از ابو سلمان ہندی، صفحات ۳۰۰، کتابت و طباعت معمولی
ناشر مکتبہ اسلوب، کراچی، قیمت ۔۔۔

اس کتاب میں مولانا آزاد کے سوانح حیات کے ساتھ ان کے افکار و خیالات پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، ہندی صاحب مولانا آزاد کے بڑے پرجوش عقیدت کیش ہیں، اس لیے پوری کتاب میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے، جو باتیں انکے ذہن میں مولانا آزاد کی بلند شخصیت کو مجروح کرنے والی تھیں، ان سب کا دفاع کیا ہے، مثلاً یہ بات کہ مولانا آزاد علامہ شبلی کے شاگرد تھے، مولانا آزاد کی شاگردی سے مولانا شبلی کی عظمت میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوتا، لیکن اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ مولانا آزاد کی تعمیر افکار میں مولانا شبلی کی علمی صحبتوں کا بھی دخل تھا تو اس سے مولانا آزاد کی شخصیت کی بلندی میں کوئی فرق نہیں آتا، مگر مرتب نے اسکی تردید کے لیے بیسیوں صفحے سیاہ کرنا ضروری سمجھا، کتاب کا ماخذ زیادہ تر ملیح آبادی کی مولانا آزاد کی کہانی خود انکی زبانی ہے، اسلیے اس میں نئے مباحث کم ہی ملتے ہیں۔

وسیلۃ القبول الی اللہ والرسول۔ مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب
صفحات ۱۴۴، کتابت و طباعت بہت معمولی، ناشر تصوف سوسائٹی سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد ۔۔۔

ہندوستان میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے احیائے شریعت اور اتباع سنت کا جو چراغ جلایا تھا، اسے ان کے خانوادے نے صدیوں نہ صرف روشن رکھا بلکہ اس کی لو کو اور زیادہ تیز کر دیا۔

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

اسی خانوادہ کے ایک وسیع الفیض شیخ محمد نقشبند ثانی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو حضرت مجددؒ کے پوتے اور خواجہ محمد معصومؒ کے منجھلے صاحبزادے تھے، اپنے دادا اور والد کی طرح انھوں نے بھی اپنے متوسلین، بادشاہ وقت اور بہت سے امراء و رؤسا کو خطوط کے ذریعہ احیائے شریعت، تعلق باللہ

اور اتباع سنت کی ترغیب دی ہے، اور ان کو اس دور کے کفر و الحاد سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے، خود عالمگیرؒ کو انھوں نے متعدد نصیحت آمیز خطوط لکھے ہیں، ان کے ان خطوط کے پڑھنے سے پتہ چلے گا کہ دوسرے مغل بادشاہوں کے مقابلہ میں عالمگیر کے اندر جو غیر معمولی دینی احساس تھا وہ اسی خانوادۂ مجددیہ کا فیض ہے،

اس کی اشاعت پر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سندھ یونیورسٹی بھی قابل مبارکباد ہے،

اس کتاب کا نام تاریخی ہے، یعنی اس سے ۱۱۱۵ھ تاریخ نکلتی ہے۔

مقالات امینی - از مولانا محمد تقی امینی صاحب، صفحات ۴۸، کتابت، طباعت عمدہ

ادارۂ علم و عرفان، اللہ رکھا بلڈنگ (اجمیر)

مولانا تقی امینی صاحب کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تھیالوجیکل سوسائٹی کی طرف سے ۱۹۶۰ء میں اسلامی فقہ پر اظہار خیال کے لیے مدعو کیا گیا تھا، مولانا نے اس موقع پر تین مقالے پیش کیے جو پسند کیے گئے، انہی مقالوں کو مقالات امینی کے نام سے شائع کر دیا گیا ہے، پہلا مقالہ اجتہاد پر اور دوسرا تیسرا تدوین فقہ اور فقہ کے اجتماعی مسائل پر ہے،

تینوں مقالوں کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ شریعت اسلامی حالات کے مطابق اجتماعی مسائل کے حل کرنے میں درماندہ نہیں ہے، البتہ جس طرح ہر قانون کے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں جو حالات کے تابع نہیں ہوتے بلکہ حالات کو وہ اپنا تابع بناتے ہیں، بالکل یہی صورت اسلامی شریعت کی بھی ہے، اس نے اپنے مبادی اور بنیادی اصولوں کو باقی رکھتے ہوئے ہمیشہ اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے،

امید ہے کہ یہ مقالے اہل علم میں شوق سے پڑھے جائیں گے اور جن مسائل پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے، ان پر وہ سنجیدگی سے غور کریں گے۔

"م، ح"

جلد ۹۳ - ماہ محرم الحرام ۱۳۸۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۶۴ء - عدد ۶

فہرست مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ

ادبیات

آہ جواہر لال

ہندوستان کی عظمت کا آفتاب غروب ہوگیا

جس نازک وقت کا خطرہ کروروں دلوں کو مضطرب کیے رہتا تھا بالآخر پیش آکر رہا، اور وہ آواز جو تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کے در و دیوار میں گونجتی رہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی وہ حیات آفریں جس نے ہندوستان کی مردہ رگوں میں زندگی کی روح پھونکی، خود موت کے آغوش میں سوگیا، وہ آفتاب جس کی ضیاباریوں نے نہ صرف ہندوستان کو منور کیا بلکہ دوسرے ملکوں تک اسکی روشنی پھیلی ۲۷ مئی کو عین دوپہر کے وقت ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا، پنڈت جواہر لال کی موت ایسا حادثہ نہیں جس کو زمانہ کی گردش بھلا سکے۔ ان کا جسم گو خاک میں مل چکا ہے لیکن ان کی روح ہندوستان میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور اس کے ذرے ذرے پر ان کا نام ثبت رہے گا۔

وہ آزاد ہندوستان ہی کے بانی اور اس کے معمار نہ تھے، بلکہ پورے ایشیا کی آبرو اور دنیا کی عظیم شخصیتوں میں تھے، ہندوستان نے ابتک جتنی بڑی شخصیتیں پیدا کیں ان میں بعض قدیم مذہبی پیشواؤں کو چھوڑ کر پنڈت جواہر لال کا درجہ سب میں بلند تھا، انھوں نے نصف صدی تک ہندوستان کی مسلسل اور ان تھک خدمت کی، وہ جنگ آزادی کے سپہ سالار بھی تھے، آزاد ہندوستان کے معمار بھی اور اس کے محبوب لیڈر بھی، اس لیے انھوں نے دلوں پر حکمرانی کی اور کل سترہ سال میں جو قوموں اور ملکوں کی عمر کے لحاظ سے نہایت قلیل مدت ہے، ہندوستان کا درجہ سارى دنیا میں بلند کر دیا۔

پنڈت جواہر لال کی جیسی تاریخ ساز شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور اپنا نام صفحۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت کر جاتی ہیں، ان میں جتنے اوصاف جمع تھے مشکل ہی سے کسی ایک انسان میں ان کا اجتماع ہوتا ہے، وہ اس دور کے بہت بڑے مدبر اور مفکر تھے، ان کی شخصیت اتنی عظیم تھی کہ جو آواز ان کے منہ سے نکلتی تھی، ساری دنیا میں گونج جاتی تھی، وہ ایشیا کا مرکز ثقل تھے اس لیے دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں ان کی دوستی کے لیے مسابقت کرتی تھیں، ان میں ایسی عظمت و کشش تھی کہ بڑی سے بڑی شخصیت کو متاثر اور مخالفین تک کو مسحور کر لیتی تھی، وہ اس ایٹمی دور میں امن و آزادی کے بڑے علمبردار تھے، محکوم قوموں کی آزادی کی حمایت میں ان کا قدم سب سے آگے تھا، ان کی آواز نے ایشیا کی آزادی پر بڑا اثر ڈالا، اس اعتبار سے وہ پورے ایشیا کے لیڈر تھے،

اتنی طویل مدت تک پوری مقبولیت کے ساتھ حکومت اور ملک و قوم کی خدمت کی مثال دنیا کے موجودہ لیڈروں میں نہیں مل سکتی، انھوں نے قانون کی قوت سے نہیں بلکہ اپنی مقبولیت سے دلوں پر حکمرانی کی، ان کے خیالات بہت بلند اور دل بڑا وسیع تھا، اس کا دروازہ بلا امتیاز رنگ و نسل اور مذہب و ملت ہر شخص کے لیے کھلا ہوا تھا، وہ پرانی مشرقی تہذیب کے یادگار تھے، ان میں اس کی تمام شرافتیں اور وضعداریاں جمع تھیں، اپنے پرانے دوستوں اور ادنیٰ اونیٰ درجہ کے ملنے والوں کے ساتھ تعلقات کو جس طرح نباہا اس کی مثال اس درجہ کے آدمیوں میں کم ملے گی، غرض جس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے، جواہر لال ہندوستان کے ایک انمول جوہر تھے، اور ان کی وفات تنہا ہندوستان کا نہیں، بلکہ عالم انسانیت کا حادثہ ہے، اور ان کی ذات پر تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا، آیندہ ہندوستان میں اتنی بڑی اور ایسی جامع اوصاف شخصیت کے پیدا ہونے کی امید نہیں۔

دار المصنفین کے لیے پنڈت جی کی وفات تنہا قومی نہیں بلکہ ذاتی حادثہ بھی ہے، دار المصنفین سے ان کے اور پنڈت موتی لال کے تعلقات بہت قدیم تھے، خلافت اور نان کوآپریشن تحریک کے زمانہ میں اور اس کے بعد ایک عرصہ تک دار المصنفین قومی و سیاسی تحریکوں کا ایک بڑا مرکز رہا، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی اس زمانہ کے ممتاز لیڈروں میں تھے، سید صاحب تو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے

دلی بھی تھے، اس لیے اس زمانہ کے بڑے لیڈروں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو دارالمصنفین نہ آیا ہو،
پنڈت موتی لال اور پنڈت جواہر لال جب اعظم گڈھ کے دورے پر آتے تھے تو دارالمصنفین ہی میں
قیام کرتے تھے، پنڈت جواہر لال نہرو کی آخری آمد ۱۹۳۶ء کے الیکشن میں ہوئی تھی، وزارت
کے زمانہ میں اس کی کوئی تقریب نہ پیدا ہو سکی، خیال تھا کہ دارالمصنفین کی پچاس سالہ جوبلی میں
ان کو شرکت کی دعوت دیجائے گی، لیکن افسوس، ع

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

پنڈت جی نے ان تعلقات کو آخر عمر تک نباہا، وہ دارالمصنفین کے لائف ممبر بھی تھے، انکی ممبری کا
یہ سبق آموز واقعہ قابل ذکر ہے کہ لائف ممبری کی فیس ایک ہزار روپئے ہے، مولانا مسعود علی صاحب نے جب انکو
ممبر بنایا تو انھوں نے اس کی پہلی قسط ڈھائی سو روپئے کی دی، مولانا مسعود علی صاحب نے ان سے کہا
کہ آپ ہندوستان کے وزیر اعظم ہو کر ایک ہزار یکمشت نہیں دے سکتے، انھوں نے کہا مجھکو جو تنخواہ ملتی
ہے اس میں سب کٹ کٹا کر دو ہزار ماہوار کے قریب میرے ہاتھ میں آتا ہے، اس میں ایک ہزار
یکمشت دینے کی گنجایش کہاں، یہ واقعہ ان کی عظمت کا کتنا بڑا ثبوت اور ہمارے بہت سے وزراء کے لیے
کس قدر سبق آموز ہے، ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب دارالمصنفین مالی مشکلات میں مبتلا ہوا تو مولانا
ابوالکلام نے پنڈت جی کی تائید بلکہ تحریک سے وزارت تعلیم کیجانب سے ساٹھ ہزار روپئے کی امداد دی، اس وقت
مولانا ابوالکلام سالانہ امداد دینے کے لیے بھی تیار تھے، لیکن دارالمصنفین کے کارکنوں نے اس کو منظور نہیں
کیا، اس لیے پنڈت جی دارالمصنفین کے محسن بھی تھے، اور ان کی وفات سے اس کا ایک بڑا قدردان
اٹھ گیا، ان کے جانشینوں میں یہ وضعداری کہاں، ان کے بعد کی نسل بلکہ ان کے بہت سے معاصر
تو دارالمصنفین کو شاید جانتے بھی نہ ہوں گے، پنڈت جواہر لال کی وفات پر ان کے دارالمصنفین
میں قیام کے زمانہ کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے آگیا، اور ان کے اور پنڈت موتی لال نہرو
کے بہت سے دلچسپ واقعات اور لطائف یاد آگئے، جو کسی موقع پر پیش کیے جائیں گے۔

مقالات

بعض رائج الوقت اصطلاحیں

اور

اُن کا پس منظر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

حضرت علیؓ کا ایک مشہور تاریخی فقرہ ہے "کلمۃ حقٍ اُرید بھا الباطل" یعنی بات سچی ہے مگر اس سے باطل مراد لیا گیا ہے، یہ مقولہ آج بھی صادق آتا ہے، اس زمانہ میں بہت سی ایسی اصطلاحیں رائج ہوگئی ہیں جو اپنے اصل مفہوم اور مقصد کے لحاظ سے تو صحیح ہیں، لیکن ان کو بول کر ان سے غلط معنی مراد لیے جاتے ہیں، ان اصطلاحوں میں سب سے زیادہ رائج الوقت تعصب، تنگ نظری، عدم رواداری، فرقہ پروری اور رواداری ہیں، ان معنوں میں بلاشبہہ یہ چیزیں نہایت مذموم ہیں کہ اپنے مذہب اور ہم مذہبوں کے سوا دوسرے مذاہب اور ان کے ماننے والوں کو برا سمجھا جائے، ان سے نفرت اور ان کی بدخواہی کیجائے لیکن آجکل کی اصطلاح میں مذہبی عقائد میں رسوخ و پختگی اور اس پر استقامت کا نام تعصب، ہر قسم کے عقائد و خیالات کو خواہ وہ کتنے ہی متضاد ہوں، صحیح اور یکساں ماننے کا نام تنگ نظری اور عدم رواداری اور ان سب کو حق اور صحیح تسلیم کرنے کا نام رواداری اور اپنی مذہبی و ملی خصوصیات کے تحفظ اور اس پر قائم رہنے کا نام فرقہ پروری ہوگیا ہے اور اسکا ملزم زیادہ تر مسلمانوں کو بنایا جاتا ہے، اس لیے اس کا تجزیہ کرکے اصل حقیقت کا پتہ چلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

درحقیقت کسی عقیدے اور نظریۂ حیات کی صداقت اور افادیت پر یقین کامل کا نام ہی کو مذہبی اصطلاح میں ایمان کہتے ہیں، یہ لازمی اور فطری نتیجہ ہے کہ صرف اسی عقیدے اور نظریۂ حیات کو حق، انسانی زندگی کے لیے سب سے زیادہ مفید اور قابل قبول سمجھا جائے، اور اس کے سوا تمام دوسرے عقائد کو غلط، غیر مفید بلکہ مضر سمجھا جائے اور ان سے کامل علٰحدگی اختیار کیجائے، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان ایک عقیدہ اور نظریۂ حیات کی صداقت اور افادیت پر یقین کامل بھی رکھے اور اس کے مقابل اور متضاد عقائد کو بھی صحیح اور قابل قبول سمجھے، اور یہ اصول نہ صرف مذہبی عقائد بلکہ دنیاوی اور مادی امور و معاملات میں بھی کار فرما ہے، اور اسی پر ساری دنیا کا عمل ہے، مثلاً یورپ اور امریکہ جمہوریت اور سیکلرزم کی افادیت پر عقیدہ رکھتے ہیں، اور اس کو سب سے بہتر نظام حکومت سمجھتے ہیں، اس لیے وہ اس کے علاوہ اور کسی نظام کو بھی قابل قبول نہیں سمجھتے اور جمہوریت کو ساری دنیا میں جاری کرنا چاہتے ہیں یہی نقطۂ نظر کمیونزم کے بارہ میں کمیونسٹوں کا ہے، بلکہ وہ اس بارہ میں اور بھی زیادہ سخت ہیں، ان کو جبر و قوت سے بھی اپنے نظریۂ حیات کو پھیلانے میں تامل نہیں ہے، چنانچہ ان دونوں کی کشمکش نے انسانی خدمت کے نام پر پوری دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے، آج سے چند سال پہلے قومی افتخار اور سربلندی کے لیے جرمنی اور اٹلی میں ڈکٹیٹرشپ کا عروج تھا، اور اس کے لیے انھوں نے بڑی بڑی حکومتوں کو زیر و زبر کر ڈالا اپنے پورے ملک اور قوم تک کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا اور معلوم ہوتا تھا کہ ڈکٹیٹرشپ کا سیلاب پورے یورپ کو بہا لیجائے گا اور جمہوریت کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

اس لیے اگر کسی عقیدہ پر رسوخ و استقامت اور اس کے سوا دوسرے عقائد کو غلط سمجھنے کا نام تعصب و تنگ نظری اور عدم رواداری ہے، تو اس کا مجرم تنہا مذہب ہی کیوں ہے، اور رواداری کا سارا وعظ اسی کے لیے کیوں مخصوص ہے، دنیاوی نظاموں کا فائدہ تو

زیادہ سے زیادہ اسی مادی دنیا تک محدود ہے اس کے مقابلہ میں ایک صاحب مذہب کا تو اس پر ایمان ہوتا ہے کہ سارے عالم کی دینی و دنیوی فلاح و سعادت اس کے مذہب سے وابستہ ہے اس لیے اس پر استقامت نہ صرف اس کی ذات اور اس کے ہم مذہبوں کے لیے ضروری ہے بلکہ دوسروں کو اس کی دعوت دینا اس کا انسانی فرض ہو جاتا ہے،

ممکن ہے یہ مثالیں ان لوگوں کی نگاہ میں کھٹکیں جو دین و دنیا اور مذہب و سیاست کو جدا سمجھتے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک مذہب پر دنیاوی نظاموں کا قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن معترضین زیادہ تر اسلام اور مسلمانوں ہی کو تعصب و تنگ نظری وغیرہ کا طعنہ دیتے ہیں، اس لیے ہم کو اسلام ہی کے نظامِ حیات کو سامنے رکھکر بحث کرنا ہے، اسلام میں دین و دنیا اور مذہب و سیاست جدا نہیں ہے، بلکہ ان پر سب حاوی ہے، معترضین کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ وہ اسلام کو بھی ان مذاہب پر قیاس کرتے ہیں جن میں مذہب کا دائرہ صرف عبادت گاہوں تک محدود ہے، اور ان کو انسان کی دنیاوی اور مادی زندگی اور دنیاوی معاملات سے کوئی بحث نہیں، اسی لیے اسلام پر اعتراض کرتے ہیں، اگر وہ اسلام کی جامعیت کو سمجھ لیں تو بہت کم اعتراض کا موقع باقی رہ جاتا ہے،

یہی حال فرقہ پروری کی اصطلاح کا ہے، دوسرے فرقوں سے نفرت اور انکی بدخواہی بلاشبہ مذموم ہے، جس کی کوئی مذہب اجازت نہیں دیتا، لیکن اپنی مذہبی و ملی خصوصیات اور اپنے حقوق کا تحفظ اور اپنے فرقہ کی جائز حمایت تو ہر فرقہ کا قانونی اور اخلاقی حق ہے، لطف یہ ہے کہ جو لوگ مسلمانوں کو فرقہ پروری کا طعنہ دیتے ہیں، اس کے سب سے بڑے مجرم وہی ہیں، جنانچہ یورپ کی کوئی قوم بھی اپنی تہذیبی خصوصیات کا ایک جزء بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے، بلکہ ساری دنیا میں اس کو پھیلانا چاہتی ہے، ہندوستان اپنی ہزاروں سال کی پامال اور بوسیدہ

تہذیب تک کو زندہ کرنے میں لگا ہوا ہے، اگر آج بھی دنیا کے کسی حصہ میں عیسائیوں پر کوئی مصیبت آجاتی ہے تو پورا یورپ اس کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، بلکہ ان کی بے جا اور غلط شکایتوں پر دوسری قوموں اور حکومتوں پر فوجکشی تک کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتا، اور آج یورپ کی بڑی بڑی حکومتیں ساری دنیا کے عیسائیوں کی نگہبان ہیں، ہندوستان کی فرقہ پروری تو روزانہ کا تجربہ ہے، ہندوستان کے مسلمان یہاں کے شہری ہیں، اور دستوری لحاظ سے ان کو وہی حقوق حاصل ہیں جو اکثریت کو حاصل ہیں لیکن عملاً ان کے ساتھ اجنبیوں کے جیسا سلوک ہے، ان پر آئے دن مصائب ٹوٹتے رہتے ہیں لیکن زبانی جمع خرچ کے علاوہ ان کے ازالہ کی کوئی موثر تدبیر نہیں کیجاتی، بلکہ اب تو زبانی ہمدردی بھی ختم ہوتی جاتی ہے، اور کسی کی زبان پر انکی مظلومیت کا ذکر تک نہیں آتا، اور پاکستان کے ہندوؤں کی مظلومیت پر پورا ہندوستان چیخ اٹھتا ہے، اور پارلیمنٹ کے ایوان تک میں شور برپا ہو جاتا ہے، اس سے زیادہ صریح فرقہ پروری اور کیا ہو سکتی ہے، بلاشبہ پاکستان کے مظلوم ہندو ہمدردی کے مستحق ہیں، لیکن کیا ہندوستان کے مسلمانوں کا اتنا بھی حق نہیں ہے، اس سے ظاہر ہوگا کہ ان اصطلاحوں کے استعمال کرنے والوں کے نزدیک ان کا ہر فعل عین قوم پروری اور مسلمانوں کا ہر عمل فرقہ پروری ہے،

درحقیقت اس قسم کی رواداری کا وجود کہ سارے مذاہب حق اور ہر قسم کے عقائد و خیالات یکساں ہیں، اولاً تو کہیں بھی نہیں ہے، اور اگر بالفرض کسی مذہب میں ہو بھی تو ان مذاہب میں نہیں ہو سکتی جن کے مثبت و منفی عقائد ہیں، یعنی جن میں کچھ چیزوں کا ماننا اور کچھ چیزوں سے انکار اور علیحدگی ضروری ہے، ایک موحد کس طرح شرک کو اور ایک خدا پرست الحاد کو ایک درجہ دے سکتا ہے لیکن اس کو وہ قومیں نہیں سمجھ سکتیں جن کے مذہب میں سرے سے مثبت و منفی عقائد ہی نہیں ہیں، اس قسم کی رواداری کا سب سے بڑا مبلغ یورپ ہے، لیکن اس کے نزدیک بھی سارے مذاہب حق اور ہر قسم

کے عقائد و خیالات یکساں نہیں ہیں، ورنہ انسانوں کی نجات کے لیے باپ بیٹے روح القدس کی الوہیت پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے، اور اس نے ساری دنیا میں عیسائیت کی تبلیغ کا جال کیوں پھیلا رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رواداری کے صحیح مفہوم کے لحاظ سے جتنی رواداری اسلام میں ہے کسی مذہب میں نہیں ہے، اسلام کی تبلیغ میں جبر نہیں، قرآن مجید کا صریح حکم ہے:

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ	دین میں زبردستی نہیں، راہ راست گمراہی سے علانیہ ممتاز ہو چکی۔

اسلام کا قبول کرنا نہ کرنا ہر شخص کی مرضی پر موقوف ہے۔

قُلِ الحق من ربکم فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر	کہہ دو یہی بات (اسلام) تمھارے رب کے پاس سے آئی ہے پس جو چاہے قبول کرے جو چاہے قبول نہ کرے۔

تبلیغ کے لیے جنگ و جدال کے بجائے حکمت و دانائی اور پند و موعظت ضروری ہے، اگر بحث و مباحثہ کی ضرورت پیش آجائے تو اس کو بھی خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے کرنا چاہیے۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ	اپنے رب کے راستہ کی طرف دانشمندی اور اچھی اچھی نصیحتوں سے بلاؤ اور بہت پسندیدہ طور سے ان سے بحث کرو۔

اور یہی تعلیم عین فطرت کے مطابق ہے، اس لیے کہ قبول اسلام نام ہے اس پر دل سے یقین اور زبان سے اس کے اقرار کا۔ جبر و قوت سے زبان سے تو اقرار کرایا جا سکتا ہے لیکن دل میں یقین نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اس لیے وہ اسلام ہی معتبر نہیں جس کا جبر و زور سے اقرار کرایا جائے۔ اسلام میں دوسرے مذاہب کے معبود ان باطل کو بھی برا کہنے کی ممانعت ہے۔

لَا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدواً بغیر علم	مسلمانو! جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں (یعنی انکی پرستش کرتے ہیں) ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ بھی نادانی سے خدا کو برا کہنے لگیں۔

تقریباً تمام مذاہب میں کسی نہ کسی نوع کی انسانی تفریق اور طبقاتی تعصب ہے، حتی کہ عیسائی مذہب میں بھی کالے گورے عیسائیوں کی تقسیم ہے، اور ہندو مذہب میں تو پست و بلند اور ادنیٰ و اعلیٰ کے مستقل طبقات قائم ہیں، اور ادنیٰ طبقوں کے ساتھ اعلیٰ طبقوں کا سلوک غلامانہ ہے، جو تعصب ہی کی ایک قسم ہے، لیکن اسلام نے سارے انسانوں کو خدا کا کنبہ قرار دیا ہے اور سب کے ساتھ نیکی اور بھلائی کی تعلیم دی ہے۔

الخلق کلھم عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ	ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ وہ مخلوق ہے جو اسکے کنبے (یعنی تمام انسانوں) کے ساتھ نیکی اور بھلائی کرتا ہے۔
ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء	مسلمانو! تم زمین پر بسنے والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا (یعنی خدا) رحم کریگا۔

اس سے زیادہ رواداری اور انسانی ہمدردی کی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے، تہذیبی رواداری اور کلچرل اخذ و استفادہ مسلمانوں کی خاص خصوصیت رہی ہے، انھوں نے نہ اپنی تہذیب دوسروں پر زبردستی مسلط کی اور نہ دوسری قوموں کی تہذیبوں کے استفادہ سے پرہیز کیا، انھوں نے ہر قوم کی تہذیب کے اچھے عناصر کو اپنی تہذیب میں شامل کر لیا، اسی لیے جو تہذیبی

رنگا رنگی مسلمانوں میں نظر آتی ہے، وہ دنیا کی کسی قوم میں بھی نہیں پائی جاتی، اور ہندوستانی تہذیب سے تو وہ اتنا متاثر ہوئے کہ ان کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے خالی نہیں ہے، اور آج ہندوستانی مسلمانوں کی تہذیب سے ہندی عناصر کو جدا کرنا مشکل ہے، لیکن اسلام ایک کامل اور مکمل مذہب ہے، اس کے بنیادی عقائد و تصورات ہیں، جن میں سے بعض کا ماننا اور بعض سے علٰحدگی ضروری ہے، اس لیے مسلمان تمام مذاہب اور ہر قسم کے متضاد عقائد کو ایک درجہ میں نہیں رکھ سکتے، لیکن اسلام میں نہ کسی مذہب کو برا کہنے کی اجازت ہے اور نہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی انسان سے نفرت کی تعلیم ہے، بلکہ سارے انسانوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا حکم ہے۔

درحقیقت تعصب، تنگ نظری، رواداری، عدم رواداری اور فرقہ پرستی وغیرہ کی اصطلاحیں یورپ کی وضع کردہ ہیں، جو مذہب سے تقریباً آزاد ہو چکا ہے، کم سے کم اس کی عملی زندگی میں اس کا کوئی اثر نہیں ہے، اور وہ زیادہ سے زیادہ گرجوں کی چہار دیواری تک محدود ہے، اور مذہب کی جگہ سیاست نے لے لی ہے، اس لیے سیاست میں ان کے یہاں کسی قسم کی رواداری نہیں ہے، اور اس میں وہ چنگیز و ہلاکو بن جاتا ہے، اور رواداری مذہب کے لیے مخصوص کر دی ہے، اور اپنے مصالح کی بنا پر تعصب، تنگ نظری، عدم رواداری وغیرہ کا سب سے زیادہ نشانہ اسلام اور مسلمانوں کو بنایا ہے، ان کی تقلید میں وہ قومیں بھی ان کی ہمنوا ہو گئی ہیں، جن کے یہاں مذہب کے کوئی حدود و قیود نہیں ہیں، یا جن کو ان کے خیال میں مسلمانوں سے کسی قسم کا نقصان پہنچا ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یورپ اور عیسائیوں کی دشمنی کے اسباب کھلے ہوئے ہیں، وہ صدیوں ایک دوسرے کے حریف رہ چکے ہیں، عیسائی دنیا کو سب سے زیادہ نقصان

اسلام اور مسلمانوں ہی سے پہنچا، اسلام کے ظہور سے پہلے مذہبی اور سیاسی سیادت عیسائیوں کے ہاتھوں میں تھی، یہودی بھی تھے لیکن ان کا حلقۂ اثر بہت محدود تھا، اور عیسائی مذہب اور اس کی حکومتیں سارے مغربی ایشیا، شمالی افریقہ اور ایشیائے کوچک تک اور پورے یورپ میں پھیلی ہوئی تھیں، مسلمانوں نے ایشیا اور افریقہ کے ہر حصے سے ان کی حکومتیں ختم کرکے ان دونوں براعظموں سے ان کو بالکل بے دخل کر دیا، یورپ میں جو ان کا گڑھ تھا، تقریباً پورے اسپین اور پرتگال، اٹلی اور فرانس کے بعض حصوں، بحر روم کے بڑے بڑے جزائر پر قبضہ کر لیا، اور آخر میں مشرقی کلیسا کے مرکز قسطنطنیہ اور بلقانی ریاستوں کو فتح کر لیا، دونوں میں صدیوں تک جنگ صلیبی کا سلسلہ جاری رہا، جس میں مسلمانوں نے متحدہ یورپ کو شکست دی، اس لیے مسلمانوں سے ان کی دشمنی کچھ بیجا نہیں ہے،

لیکن اگر عیسائیوں کو مسلمانوں سے سیاسی حیثیت سے نقصان پہنچا تو علمی اور تمدنی حیثیت سے اس سے زیادہ فوائد پہنچے، انہی کی بدولت وہ علم و تمدن سے آشنا ہوئے، جب پورا یورپ وحشت و جہالت کی تاریکی میں مبتلا تھا مسلمانوں نے اسپین اور سسلی میں علم و تمدن کی شمع روشن کی جس کی روشنی پورے یورپ میں پھیلی، اگر یہ یونیورسٹیاں نہ ہوتیں تو یورپ صدیوں تک جہالت کی تاریکی میں مبتلا رہتا اور اس کو جو درجہ آج حاصل ہے، وہ کبھی حاصل نہ ہوتا، عیسائی مذہب کی بھی بہت سی اصلاحات اسلام کی رہین منت ہیں، یورپ پر مسلمانوں کے علمی و تہذیبی احسانات کا تمام یورپین مصنفین کو اعتراف ہے،

یہ تو پرانی داستان ہے، آج بھی یورپ کا سب سے زیادہ سابقہ مسلمانوں ہی سے ہے، وہ پورے بحر روم کے ساحلی علاقہ پر قابض ہیں، جو افریقہ اور ایشیا میں یورپین اقوام کے داخلہ کا راستہ ہے، دنیا کے مختلف خصوصاً شمالی افریقہ سے لیکر پورے مشرقی وسطی اور ایشیائے کوچک

اسلامی حکومتیں پھیلی ہوئی ہیں، جو ان کی بین الاقوامی سیادت میں حائل ہیں، اس لیے وہ ان کی نگاہ میں کھٹکتی رہتی ہیں، اور جہاں موقع ملتا ہے ان کو نقصان پہنچانے سے نہیں چوکتیں اور ان کو کمزور کرنے کے لیے ہر قسم کی چالیں چلتی رہتی ہیں، انھوں نے قومیت اور وطنیت کے نام پر عربوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور ان کو مختلف چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم کر کے انکی قوت کمزور کردی، فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم کر کے مشرق وسطیٰ میں اپنا ایک مضبوط قلعہ قائم کر دیا۔

گو مسلمانوں میں بڑی حد تک مذہبی روح ختم ہو گئی ہے، اس کے باوجود آج بھی مذہب کا جتنا اثر مسلمانوں میں ہے، کسی قوم میں نہیں ہے، جس پر مشنریوں کی رپورٹیں شاہد ہیں، لیکن آزادی و جمہوریت کے اس دور میں ان کو جبر و قوت سے دبانا مشکل ہے، اسلام کی علانیہ مذمت اور اس پر کذب و افترا کی گنجایش بھی بہت کم باقی رہ گئی ہے، اس لیے مسلمانوں کے مذہبی جذبہ کو ختم، ان کے مذہب سے ان کو بدگمان اور دوسری قوموں میں اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے انھوں نے مختلف تدبیریں اختیار کی ہیں، ان میں سب سے کارگر حربہ یہ ہے کہ وہ اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کرنے کے بعد اس میں کوئی ایسا عیب نکال دیتے ہیں کہ ساری خوبیوں پر پانی پھر جاتا ہے، علم و تحقیق کی راہ سے اسلام کے اصل سرچشمے قرآن و حدیث میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں، واقعات میں تدلیس سے کام لیکر ان سے غلط نتائج نکالتے ہیں، انفرادی واقعہ سے کلیہ بنا لیتے ہیں، بے سند روایات بلکہ کبھی کبھی اپنے مفروضات پر پوری عمارت کھڑی کر دیتے ہیں، مسلمانوں کی تاریخ غلط رنگ میں پیش کرتے ہیں، اس قبیل کے اور مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں[1]، ان میں ایک

---

[1] سب مستشرقین اس زمرے میں نہیں آتے، ان میں کچھ منصف مزاج بھی ہیں، جنھوں نے اسلام کی دینی اور روحانی برکتوں اور مسلمانوں کے علمی و تہذیبی کارناموں اور یورپ پر ان کے احسانات کا پورا اعتراف کیا ہے، اور متعصب پادریوں اور مستشرقین کی پھیلائی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، اور مسلمانوں کی اتنی گرانقدر علمی

(باقی ص ۳۴۴ پر)

چلتا ہوا نسخہ تعصب، تنگ نظری اور عدم رواداری کا بھی ہے، بعض مسلمان سلاطین کے طرز عمل سے جو کسی حیثیت سے بھی اسلام کے نمایندے نہ تھے، اور جنکی سیاست اسلامی قوانین کے بجائے حکومت کے مصالح کے تابع تھی، اور بعض متشدد فقہاء کے فتاویٰ سے جنکی قرآن مجید اور احادیث نبویؐ میں کوئی سند نہیں ہے، اور ایرانی نژاد، فارسی مورخین کی تحریروں سے جن کی فطرت میں مبالغہ آرائی ہے، غیر مسلموں پر ظلم و تشدد کے کچھ واقعات بھی مل جاتے ہیں، اس سے ان کو ایک سند ہاتھ آجاتی ہے، اور وہ اس رائی کو پہاڑ بنا کر مذہب اسلام اور پوری مسلمان قوم کو تعصب اور تنگ نظری وغیرہ کا مجرم بنا دیتے ہیں،

ایک زمانہ تک مغربی قوموں سے مسلمانوں کی مرعوبیت کا یہ حال رہا کہ وہ مذہب کو بھی انہی کی لگائی ہوئی عینک سے دیکھتے تھے، جہاں یورپین مصنفین کی زبان سے کوئی اعتراض نکلا اس کی صحت کو جانچے بغیر یا اس سے انکار کر دیا یا اس کی ایسی لغو تاویل شروع کر دی جس کو مذہب سے کوئی علاقہ نہیں، بہت سے مذہب سے ناواقف اور ضعیف العقیدہ مسلمان ان اعتراضوں کے اثر سے اپنے مذہب ہی سے بدگمان ہو جاتے تھے، مگر اب یہ مخلوق کم ہو گئی ہے اور مسلمانوں میں ایسے اہل علم و نظر پیدا ہو گئے ہیں، جنھوں نے ان اعتراضوں کی دھجیاں اڑا دیں، لیکن اب بھی گذشتہ مرعوبیت کے کچھ نہ کچھ آثار باقی ہیں،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۱۳) خدمات انجام دی ہیں جو خود مسلمانوں سے نہ ہو سکیں، انھوں نے اسلامی علوم و فنون کی نادر و نایاب کتابوں کو تلاش کر کے بڑی محنت سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ ان کو شائع کیا، اپنی زبانوں میں ان پر مضامین لکھے اور ان کے ترجمے کئے، اگر ان کی کوششیں نہ ہوتیں تو آج بہت سے نوادر گوشۂ گمنامی میں پڑے رہتے، لیکن اب بھی ان کی اکثریت اغراض سے خالی نہیں ہے اور وہ اپنی اسلام دشمنی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔

اس کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ انگریزوں نے اسی آزمودہ نسخہ کو ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کیلئے استعمال کیا اور ہندوستان کے اسلامی دور کی تاریخ بہت مسخ کرکے دکھائی، اب یہی نسخہ ہندوستان کا ایک طبقہ مسلمانوں کے خلاف استعمال کر رہا ہے، اور اس کے مورخین اور اہل قلم اس مہم میں لگے ہوئے ہیں، اور اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کے خلاف آئے دن کتابیں اور مضامین نکلتے رہتے ہیں جس سے پوری فضا مسموم ہو گئی ہے،

انگریز تو اجنبی قوم تھے، وہ تو اپنا کام پورا کرکے ہندوستان سے رخصت ہو گئے، لیکن ہندوستان مسلمانوں کا وطن ہے، ان کو یہیں رہنا اور یہیں جینا اور مرنا اور ہندو مسلمان دونوں کو مل آزاد ہندوستان کی تعمیر کرنا ہے، اس لیے اب ضرورت اس کی ہے کہ گذشتہ واقعات کی تلخیوں نے ان دونوں میں جو خلیج پیدا کر دی ہے، اس کو ہر پہلو سے پاٹنے کی کوشش کیجائے۔

کسی ملک و قوم کی تعمیر ماضی کی تلخ یادوں سے نہیں بلکہ حال اور مستقبل کے مصالح اور ضروریات سے ہوتی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ

(۱) اس قسم کے تمام واقعات اور اعتراضات کا تحقیقی جائزہ لیا جائے اور اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کو دور کیا جائے، اور اسلام کے چہرہ کو مخالفوں کے اڑائے ہوئے گرد و غبار سے پاک کرکے اس کی اصل شکل میں پیش کیا جائے، اور مسلمان اپنے اسلامی کردار اور اخلاق و عمل سے اس کا ثبوت دیں،

(۲) ہر قوم میں اچھے برے دونوں طرح کے فرمانروا ہوتے ہیں، کوئی قوم بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ اس کے سارے حکمراں کل کے کل سراپا عدل و انصاف تھے، اس لیے اگر کسی مسلمان بادشاہ کے ظلم و زیادتی کے کچھ واقعات ملتے ہیں تو ان کو اس کی ذات اور اسکی سیاست کا نتیجہ سمجھا جائے، اسلام اور مسلمان قوم کو اس کا مجرم نہ بنایا جائے، یہ تاویل نہیں

بلکہ واقعہ ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان میں جن مسلمان خاندانوں نے حکومت کی، انھی نے ایک دوسرے کو مٹایا، بلکہ بعض بادشاہوں نے ہندوستان کے باہر وسط ایشیا کی اسلامی حکومتوں تک کو ختم کر دیا، علاء الدین جہانسوز نے غزنین کو جلا کر خاکستر کر دیا، اس قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن سے تاریخ بھری ہوئی ہے، یہ سب کس مذہبی تعصب کا نتیجہ تھا،

اس سلسلہ میں ایک اور پہلو پر بھی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے، ہندوستان پر جتنے خاندانوں نے حکومت کی ان میں سب کے سب ترک، تاتاری اور پٹھان تھے، ان کا مذہب ضرور اسلام تھا لیکن وہ اسلام کے نمایندے نہ تھے، ان میں بعض صالح اور دیندار فرمانروا بھی تھے، جنھوں نے بہت سے مفید مذہبی کام بھی انجام دیے، لیکن ان کی حکومت صحیح معنوں میں اسلامی نہ تھی، اس کا پورا نظام ان کا قومی و ملکی تھا، اس لیے اسکی خرابیاں اسلام کا نہیں بلکہ خود ان کے قومی نظامِ حکومت کی خرابی کا نتیجہ تھیں، اور انکی سیاست مذہب کے بجائے سیاست کے تابع تھی،

دوسرے اگر مسلمان حکمرانوں کے ظلم و زیادتی کے کچھ واقعات ملتے ہیں، تو اس سے کہیں زیادہ ان کے عدل و انصاف، ملک داری، اور رعایا پروری کے واقعات ہیں، مغلوں کی حکومت تو تقریباً سیکولر تھی، انھوں نے ہندو مسلمانوں میں کوئی فرق و امتیاز روا نہیں رکھا، جس کا اعترافت ہندو مورخین تک کو ہے، ممکن ہے بعض ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے مسلمان حکمرانوں سے ان کو اور ہندوستان کو کچھ نقصان بھی پہنچا ہو لیکن ان کے فوائد سے تو انکار کیا ہی نہیں جا سکتا، انھوں نے مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے، متحد کیا، جو ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے، انھوں نے یہاں اجنبیوں کی طرح حکومت نہیں کی، بلکہ اس کو وطن بنا کر یہیں بس گئے، اور ہندوستان کی دولت ہندوستان ہی پر صرف کی، ان سے ہندوستان کو جو گوناگوں فوائد پہنچے اور ان کے زمانہ میں یہاں جو مذہبی و معاشرتی

اصلاحات اور علمی و تہذیبی ترقیاں ہوئیں، اور جس طرح انھوں نے اس صحرا کو گلشن اور ہندستان کو جنت نشان بنایا اس سے ہر پڑھا لکھا واقف ہے، اس لیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں،

(۳) یہ آزاد ہندوستان کی تعمیر کا دور ہے، جس کے لیے قومی اتحاد و یکجہتی سب سے مقدم شرط ہے، اس لیے ایسی تمام چیزوں سے احتیاط ضروری ہے جو تخریب اور مختلف فرقوں میں اختلاف پیدا کرنے والی ہوں، یہ پرانی تاریخ دہرانے کا نہیں بلکہ نئی تاریخ بنانے کا زمانہ ہے، اس کے لیے ایسی تاریخوں کی ضرورت ہے جو قومی وحدت کے لیے مفید ثابت ہوں، اس کا یہ مقصد نہیں کہ صحیح واقعات کو جھٹلایا جائے، یا برائیوں کو بھی خوبی بنا کر دکھایا جائے، بلکہ صرف یہ مقصد ہے کہ جب تاریخ میں اچھے اور برے دونوں قسم کے واقعات ہیں اور خوبیوں کا پہلو غالب ہے جس سے کوئی مورخ انکار نہیں کر سکتا تو ان خوبیوں کو چھوڑ کر برے واقعات کو خواہ مخواہ کیوں اچھالا جائے، کیا قدیم ہندوستان کی تاریخ اس سے خالی ہے، خالص ہندوستانی مذاہب کے ماننے والوں نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا کیا نہیں کیا، برہمنی مذہب نے جینیوں اور بدھوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ آج بھی تاریخ میں محفوظ ہے، لیکن کیا آج کوئی ہندو مورخ اس کو دہراتا ہے، بلکہ اس کی پردہ پوشی کیجاتی ہے، اور قومی مفاد کے لیے یہی کرنا چاہیے، مسلمان بھی اسی ملک کے باشندے ہیں، ان کو یہیں جینا اور مرنا ہے، اس لیے آخر وہ اس سلوک سے کیوں محروم ہیں، اس کے بغیر قومی وحدت اور نئے ہندوستان کی تعمیر کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

یہ بڑی افسوسناک حقیقت ہے کہ ہندو مسلمانوں کا تقریباً ایک ہزار سال سے ساتھ ہے، مگر ان دونوں نے ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھنے کی پوری کوشش نہیں کی، بعض مسلمان علماء نے تو علمی حیثیت سے ہندستان کے مذاہب کا مطالعہ بھی کیا اور اس پر کتابیں بھی لکھیں، مگر ہندو عام طور سے اسلام سے چھوت ہی برتتے رہے، اگر دونوں نے ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو اتنی مذہبی غلط فہمیاں نہ ہوتیں، ان میں بہت سی اخلاقی و روحانی تعلیمات مشترک نظر آئیں گی، اب وقت آگیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مذاہب کو سمجھنے کی کوشش کریں، اس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی،

ابو العلاء معری

از جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

ابو العلاء معری عربی زبان و ادب کا مایۂ ناز ادیب، نامور انشا پرواز، باکمال شاعر اور فلسفہ و حکمت کا امام تھا، مورخین اور اصحاب سیر نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، لیکن اردو میں اس کے حالات اور فلسفہ و حکمت کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے، اس مضمون میں اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نام و نسب احمد نام، ابو العلاء کنیت، رہین المحبسین لقب، معری، تنوخی، قضاعی اور بحرانی وغیرہ نسبتیں ہیں، نسب نامہ حسب ذیل ہے:-

احمد بن عبد اللہ بن سلیمان بن محمد بن سلیمان بن احمد بن سلیمان بن داؤد بن مطہر بن زیاد بن ربیعہ بن حارث بن ربیعہ بن انور بن اسحم بن ارقم بن نعمان بن عدی بن عبد غطفان بن عمرو بن بریح بن خزیمہ بن تیم اللہ بن اسد بن وبرہ بن تغلب بن حلوان بن عمران بن حاف بن قضاعہ

مشہور اور مستند سلسلۂ نسب اسی طرح منقول ہے[1] بعض اصحاب سیر کی روایتوں میں خفیف اختلاف ہے، جو قابل اعتنا نہیں، البتہ سمعانی اور یاقوت نے ۲ کے بجائے ایک سلیمان کا ذکر کیا ہے،[2]

---

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۵۸، تاریخ بغداد ج ۴ ص ۲۴۰ و تاریخ ابن کثیر ج ۱۲ ص ۷۲، [2] کتاب الانساب ورق ۵۳۱ و معجم الادباء ج ۱ ص ۱۶۲ و بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۶

معری: ابو العلاء کے وطن معرۃ نعمان کی طرف نسبت ہے، معرۃ نعمان اور معرہ مصرین شام میں حمص کے علاقہ میں دو مشہور شہر ہیں،[۱]

معرۃ النعمان ایک زمانہ میں علم و فن کا بڑا مرکز رہ چکا ہے، اور بڑے بڑے اصحاب فن اور اہل کمال اس کی خاک سے اٹھے،

خرج منھا جماعۃ من الفضلاء فی کل فن[۲]	یہاں ہر فن کے فضلاء اور اصحاب کمال پیدا ہوئے،

ابو العلاء کا مولد و منشا یہی مردم خیز خطہ ہے، اس کی غیر معمولی شہرت کے سامنے معرہ کے دوسرے ارباب فضل و کمال کا چراغ نہ جل سکا

معری نعمان کی جانب صحیح نسبت معرنی ہوگی، لیکن اہل علم کے یہاں مشہور نسبت معری ہے اور جب اس کو مطلق بولا جاتا ہے تو مقصود معرۃ نعمان ہی کی طرف نسبت ہوتی ہے،[۳]

رہن المحبسین ابو العلاء کا لقب تھا جس کو وہ اپنے لیے بہت پسند کرتا تھا، اس[۴] لقب ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب وہ بغداد سے اپنے وطن معرہ واپس ہوا تو اس نے عزلت اور گوشہ گیری اختیار کرلی، اور گھر سے نکلنا اور لوگوں سے ملنا جلنا بالکل چھوڑ دیا، صرف پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہوگیا، آنکھوں کی روشنی بچپن ہی میں چلی گئی تھی، اس لیے وہ اپنے کو رہین المحبسین یا رہین المحبسین یا رہینا لمحبسین کہتا تھا،[۵] ان دونوں کے علاوہ اس نے اپنے ایک اور حبس کا بھی ذکر کیا ہے،

أرانی فی الثلاثۃ من سجونی	فلا تسأل عن الخبر النبیث
لفقدی ناظری ولزوم بیتی	وکون النفس فی الجسد الخبیث[۶]

[۱] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۰ [۲] کتاب الانساب ورق ۵۳۶ [۳] ایضاً ورق ۵۳۶ [۴] تاریخ ابن خلکان ص ۳۹ و معجم الادباء ج ۱ ص ۱۷۰ و بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۶ [۵] لزومیات ج ۱ ص ۱۴۰

پیدائش | تمام ارباب سیر و تذکرہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ابو العلاء ۳۶۳ھ مطابق ۹۷۳ء میں پیدا ہوا، ابن خلکان وغیرہ نے یہ تصریح بھی کی ہو کہ غروب آفتاب کا وقت جمعہ کا دن تھا اور ربیع الاول[1] (مطابق ۲۷ر دسمبر) کی ۲۷ تاریخ تھی، ابو الفداء نے ۳۶۶ھ سنہ پیدائش بتایا ہے،[2] جو صحیح نہیں ہے،

خاندان | اگرچہ ابو العلاء کا علمی و ادبی مذاق فطری تھا لیکن اس کی علمی شخصیت کو بنانے میں اس کے خاندان اور ماحول کو بھی بڑا دخل تھا، وہ ایک ممتاز علمی گھرانے سے تھا

هو من بيت علم كبير في بلده[3]	وہ اپنے شہر کے ایک معزز اور بڑے علمی خانوادہ سے تعلق رکھتا تھا،

یاقوت نے اس کے خاندان کے علماء، فضلاء اور شعراء کا مفصل تذکرہ کیا ہو، وہ لکھتا ہے:۔

"ابو العلاء کے باپ، دادا، چچا وغیرہ ان سے پہلے اور ان کے بعد اس کے خاندان میں بہت سے علماء، فضلاء اور قضاۃ گذرے ہیں، مجھکو جن لوگوں کے حالات معلوم ہوسکے ان کو لکھتا ہوں تاکہ اس کے خاندان والوں کا بھی علم و فضل واضح ہو جائے[4]"

اس کے دادا، والد اور چچا حمص میں عہدۂ قضا پر فائز تھے، اس کے بھائی اور بھتیجے بھی علم و فضل اور شعر و ادب میں ممتاز تھے،[5]

ننہال بھی علم و ادب کا گہوارہ تھا، ابو العلاء کی نظم و نثر دونوں میں اپنے ننہال والوں کی علمی فضیلت و برتری کا ذکر ہے، جرجی زیدان کا بیان ہے:۔

"اس کا باپ ادیب اور دادا حمص کا قاضی تھا، اس کی ماں بھی ایک ذی وجاہت گھرانے

---

[1] ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰ [2] تاریخ ابی الفداء ج ۲ ص ۱۶۹، [3] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۶ و روضات الجنات ص ۶۰ [4] معجم الادباء ج ۱ ص ۱۶۳ [5] ایضاً ص ۱۶۳ تا ۱۶۹

(آل سبیکہ) سے تعلق رکھتی تھی، اس خاندان کے کئی آدمی علم وادب میں مشہور تھے[1]"

اساتذہ | ابو العلاء کے اساتذہ اور شیوخ کی تعداد بہت کم ہے، نحو، لغت اور ابتدائی تعلیم اپنے والد اور حلب میں محمد بن عبد اللہ بن سعد نحوی سے پائی، حدیث کی روایت اپنے باپ، دادا اور عربیت کی تحصیل اپنے شہر میں بنی کوثر اور ابن خالویہ سے کی، طرابلس کے کتبخانہ سے استفادہ کے لیے جا رہا تھا تو راستہ میں لاذقیہ کے یونانی راہب سے فلاسفۂ یونان کے اقوال سنے، اسی سفر میں ہندوؤں کے فلسفہ سے بھی آگاہی حاصل کی یحییٰ بن مسعر اور ابو الفتح محمد بن حسین سے بھی اس نے سماع کیا تھا،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے صرف قرب وجوار کے بعض علماء سے تعلیم پائی تھی، بعد میں جن لوگوں سے استفادہ کیا اس کو استادی اور شاگردی سے زیادہ تعلق نہیں ہے، ابو الفداء کا بیان ہے:

"وہ ۳۹۸ھ میں بغداد گیا، اور ایک سال سات مہینے وہاں رہ کر علماء سے استفادہ کیا، لیکن در اصل وہ کسی کا باقاعدہ شاگرد نہیں[2]"

ابو الفداء کے الفاظ "ولم یتلمذ ابو العلاء لاحد اصلا" سے تو یہاں تک ظاہر ہوتا ہے کہ اصطلاحی معنوں میں اس کا کوئی استاد ہی نہ تھا، اور اس میں شبہہ نہیں کہ اس نے بہت کچھ اپنی محنت، مطالعہ، ذہانت اور قوت حفظ کی بدولت حاصل کیا تھا، جرجی زیدان لکھتا ہے،

"اس کے باپ نے بچپن میں نحو اور لغت سکھائی، پھر اس نے اپنے شہر کے لوگوں سے تعلیم پائی، جب ۲۰ سال کا ہوا تو علوم و آداب کی طرف اسے خود توجہ ہوئی، اور اس نے اپنے مطالعہ، محنت اور کوشش سے انھیں حاصل کیا، اس کے یہاں جو لوگ رہتے تھے وہ

---

[1] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج۲ ص ۲۴۰ [2] تاریخ ابو الفداء ج ۲ ص ۱۶۹

اس کے سامنے کتابیں اور عربوں کے اشعار و واقعات سناتے تھے جنھیں وہ حفظ کر لیتا تھا، اس کا حافظہ اتنا قوی اور غیر معمولی تھا کہ بمشکل اس کا یقین کیا جا سکتا ہے"[1]

اس کا بڑا ثبوت خود اس کا یہ بیان ہے :-

"ومنذ فارقت العشرین من العمر ما حدثت نفسی باجتداء علم من عراقی ولا شامی من یهد الله فهو المهتدی ومن یضلل فلن تجد له ولیا مرشدا والذی اقدمنی تلک البلاد مکان دار الکتب بها"[2]

تلامذہ | تذکرہ اور تراجم کی کتابوں میں اس کے صرف دو چار شاگردوں کا ذکر ملتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کے شاگردوں کی تعداد اتنی کم نہیں، جس کے کئی ثبوت ہیں،

(۱) ابن خلکان وغیرہ نے اسکے ۲ شاگردوں کا نام لینے کے بعد (وغیرھما) اور سیوطی نے ۳ شاگردوں کا ذکر کرنے کے بعد (وخلق) اور علامہ سمعانی نے ۵ شاگردوں کی تصریح کرنے کے بعد (وجماعة کبیرة) کے الفاظ تحریر کیے ہیں، جو تلامذہ کی کثرت کا ثبوت ہے،

(۲) جب وہ بغداد سے اپنے وطن آیا تو اس کے گھر پر طلبہ اور شائقین علم کا ازدحام رہتا تھا اس کے سوانح نگاروں کا بیان ہے :

وسار الیه الطلبة من الآفاق	اس کے پاس ہر طرف دنیا سے طلبہ آتے اور
وکاتبه العلماء والوزراء	علماء، وزراء اور اصحاب قدر و منزلت
واهل الاقدار[3]	اس سے مراسلت کرتے تھے،

جرجی زیدان کا بیان ہے کہ

"لوگ اس کے پاس آکر اس کے اقوال و اخبار سنتے، خطوط کے ذریعہ اس سے (علمی مسائل)

---

[1] تاریخ آداب اللغة العربیہ ج ۲ ص ۲۶۰ [2] رسائل ص ۳۲ [3] ابن خلکان ج ۱ ص ۵۹ و مرآة الجنان ج ۳ ص ۹۸ و شذرات الذهب ج ۳ ص ۲۸۱

میں استفسار کرتے اور مفت تعلیم حاصل کرتے" (تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ ج ۲ ص ۲۶۱)

ابن عدیم نے لکھا ہے کہ اس سے علم حاصل کرنے والوں میں معرہ، حلب، انطاکیہ، اندلس تبریز، اصبہان، سروج، رقہ، ہکار، بغداد، مصیصہ، ابر، انبار اور نیشاپور وغیرہ کے علماء، امراء، ادباء، محدثین اور قضاۃ سبھی ہوتے تھے، ایک ایرانی سیاح کا بیان ہے کہ دو سو سے زیادہ آدمی ہر وقت اس کے دروازہ پر موجود رہتے، جو اس سے شعر و ادب کی کتابیں پڑھتے تھے۔[1]

اس کے انتقال کے بعد تقریباً ۸۰ شاعروں نے اس کا مرثیہ کہا، جن میں سے اکثر و بیشتر اس کے شاگرد تھے۔ (معجم الادباء ج ۱ ص ۱۷۱)

(۳) اس زمانہ کے عام حالات و واقعات پر اگر غور کیا جائے تو اس کے شاگردوں کی اس مختصر تعداد پر حیرت ہوتی ہے، کیونکہ اس زمانہ میں علمی شوق عام تھا، شائقین علم دور دراز سے مشقتیں اٹھا کر اہل علم کی خدمت میں حاضر ہوتے اور استفادہ کرتے تھے، ایسی صورت میں ابو العلاء جیسے یگانۂ روزگار فاضل کے تلامذہ کی قلت تعداد قابل یقین نہیں ہے، اس سلسلہ میں اس کے ایک مشہور شاگرد خطیب تبریزی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، ان کے تبریز سے ابو العلاء کے پاس معرہ آنے کی تقریب یہ ہوئی کہ انھیں مشہور امام لغت ابو منصور ازہری کی کتاب التہذیب دستیاب ہوئی، تو اس کے مباحث کی تحقیق کے لیے ان کو کسی کامل الفن لغوی کی تلاش ہوئی، لوگوں نے ابو العلاء معری کی نشاندہی کی، خطیب میں سواری کی وسعت نہ تھی، اس لیے وہ بڑی مشقت اٹھا کر تبریز سے معرہ پیدل آئے۔ (الوافی بالوفیات ج ۷ ص ۲۲۳) اس طرح کے اور بھی واقعات ہیں۔

---

[1] بحوالہ ابو العلاء و ما الیہ ص ۲۰۹ - ۲۱۰

(۴) ابو العلاء کا خود بیان ہے کہ بغداد سے معری واپس آنے کے بعد میں نے بہت چاہا کہ خلوت اور گوشہ گیری کی زندگی بسر کروں، لیکن طلبہ کے ہجوم کی وجہ سے میری یہ خواہش پوری نہ ہوئی،

ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابو العلاء کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، مولانا عبد العزیز میمن نے تلاش و تفحص کے بعد اس کے ۳۵ شاگردوں کے نام اور مختصر حالات تحریر کیے ہیں،

نابینائی | ابو العلاء نابینا تھا، اسی لیے اپنے کو رہین المحبسین کہتا تھا، ابو الحسن دلفی مصیصی اسکے حوالہ سے بیان کرتے ہیں،

انا احمد اللہ علی العمی کما یحمدہ	میں نابینا ہونے پر خدا کا اسی طرح شکر گذار ہوں
غیری علی البصر[۱]	جس طرح لوگ بینا ہونے پر خدا کے شکر گذار ہوتے ہیں

اپنے متعدد شعروں میں بھی اس نے اپنے نابینا ہونے کا ذکر کیا ہے، اس سلسلے میں یہ امر قابل تحقیق ہے کہ وہ کس عمر میں اندھا ہوا تھا،

اکثر مورخین اور اصحاب سیر کے بیان کے مطابق وہ بچپن میں اندھا ہوا تھا لیکن ابو الفداء اور ابن عماد نے "قیل" کہکر اس کے پیدایشی اور مادر زاد اندھے ہونے کا ذکر کیا ہے، یعنی ان دونوں کے نزدیک بھی صحیح پہلا قول ہے، ابو الفداء کا بیان ہے

"اس کے اندھے ہونے کے زمانہ میں اختلاف ہے، صحیح قول یہ ہے کہ وہ بچپن میں چیچک سے اندھا ہوا تھا۔"[۲]

ابن الانباری نے مادر زاد اندھا ہونے کی تردید کی ہے، وہ لکھتا ہے:

"وہ اندھا ضرور تھا لیکن مادر زاد نہیں جیسا کہ ناواقف لوگوں کا گمان ہے"[۳]

ان اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ مادر زاد اندھا نہ تھا، اس سلسلہ میں یہ بھی قابل تحقیق ہو کہ

---

۱ تتمہ یتیمۃ الدہر ج ۱ ص ۹ ۲ تاریخ ابو الفداء، جلد ۲ ص ۱۷۰، ۳ نزہۃ الالباء ص ۲۵۸

اندھا ہونے کے وقت اس کی عمر کیا تھی ؟

ایک جماعت[1] کے نزدیک تین سال کی عمر میں اس کو چیچک نکلی اور وہ اندھا ہو گیا، دوسری جماعت[2] کے نزدیک چار سال کی عمر میں اندھا ہوا تھا، ابن کثیر نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ جب وہ سات سال کا ہوا تو آنکھوں کی روشنی جاتی رہی[1]، لیکن یہ اختلافات چنداں لائق التفات نہیں،

حلیہ | وہ نہایت بدشکل تھا، چہرے پر چیچک کے داغ تھے، آنکھیں نہایت بدنما تھیں، ایک آنکھ ابھری اور دوسری بیٹھی ہوئی تھی، جسمانی لحاظ سے بھی بہت کمزور، نحیف اور پستہ قد تھا، اس نے اپنے اشعار میں ان تمام عیوب کا ذکر کیا ہے،

تحنو ابا لکلام واکرموني   علی ما کان من جسد نحیل[2]

سیر و سیاحت | ابو العلاء گو نابینا اور جسمانی لحاظ سے کمزور تھا لیکن اس زمانہ کے عام دستور اور شائقین علم کے معمول کے مطابق اس نے بھی متعدد ملکوں کی سیر و سیاحت کرکے وہاں کے فضلاء اور اہل علم سے استفادہ کیا تھا، حسب ذیل ملکوں اور شہروں میں اس کے جانے کا ذکر ملتا ہے،

حلب: اس زمانہ میں علم و فن کا گہوارہ اور سیف الدولہ کی علم و ادب نوازی کی بدولت اصحاب علم و کمال کا مرکز تھا، اس کی کشش ابو العلاء کو بھی وہاں کھینچ لے گئی، اور اس نے یہاں کے ارباب کمال سے استفادہ کیا۔

انطاکیہ: لزومیات اور بدیعی کی الصبح المنبی سے انطاکیہ جانے اور وہاں کے مشہور کتب خانہ سے استفادہ کا ثبوت ملتا ہے۔[3]

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۷۲ و رضات ص ۹۷، [2] لزوم مالا یلزم ج ۲ ص ۲۰۱، [3] الصبح المنبی ج ۱ ص،

طرابلس میں بھی ایک بڑا کتب خانہ تھا، اور ابو العلاء نے اس سے استفادہ کیا تھا[1]

لاذقیہ۔ یہاں اس نے فلاسفہ کے اقوال معلوم کیے اور ایک دیر کے راہب سے ملاقات کی؛ اس کی باتیں سنیں جس سے وہ شکوک میں مبتلا ہو گیا تھا[2]

ان شہروں کے علاوہ اس نے اس عہد کے سب سے بڑے علمی و ادبی مرکز بغداد میں بھی قیام کیا تھا، سفر بغداد کے متعلق چند باتیں قابل غور ہیں،

ابن خلکان اور ان کی تقلید میں بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ دو مرتبہ بغداد گیا، لیکن اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ ایک ہی مرتبہ بغداد گیا تھا[3] خطیب کی بھی یہی رائے ہے، اور یہی درست معلوم ہوتا ہے،

ابن الانباری کے بیان کے مطابق وہ ایک سال ۹ مہینے[4] اور جمہور کے نزدیک ایک سال سات مہینے بغداد میں رہا،

جن لوگوں کے نزدیک وہ ایک ہی مرتبہ بغداد گیا تھا، ان میں سے اکثر اس کو ۳۹۹ھ کا واقعہ بتاتے ہیں، لیکن جن لوگوں کے نزدیک دو مرتبہ بغداد گیا، جن میں ابن خلکان بھی ہیں، ان کے قول کے مطابق ۳۹۸ھ کا واقعہ ہے، واپسی کے متعلق تقریباً اصحاب سیر کا اتفاق ہے کہ ۴۰۰ھ میں ہوئی،

قفطی اور ذہبی کا بیان ہے کہ ابو العلاء ایک موقوفہ جائداد پر گذر بسر کرتا تھا، امیر حلب نے اس میں مزاحمت کی۔ اس کی اس زیادتی سے تنگ آکر اس نے بغداد کا رخ کیا، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مختلف قسم کی اذیتوں، حکومت اور ملکی سیاست کے فتنوں سے گھبرا کر وطن چھوڑنے اور بغداد میں قیام کرنے کے لیے مجبور ہوا، خواہ یہ واقعات صحیح ہوں، لیکن ان کو

---

[1] روضات الجنات ص ۷۸، [2] بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۶، [3] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۲۴۰، [4] نزہۃ الالباء ص ۴۲۸

سفر بغداد کا اصل اور بنیادی سبب نہیں قرار دیا جا سکتا، اس کا اصلی محرک بغداد کی علمی مرکزیت اور وہاں کے علماء اور اصحاب کمال سے استفادہ تھا، ابن وردی کا بیان ہے کہ وہ بغداد تحصیل علم کے لیے اور ابن عدیم کا بیان ہے کہ وہاں کے کتبخانوں سے استفادہ کے لیے گیا تھا، اس نے خود بھی لکھا ہے کہ میں نے: مال و دولت کے لیے سیاحت کی اور نہ لوگوں سے ملنے کے لیے بلکہ دار العلم میں قیام کرنے اور اہل علم کو ترجیح دیا ہے۔ (رسائل ص۳۴)۔ ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ عراق میں فتنہ و فساد مچا ہوا ہے، اور بغداد علم و ادب اور فکر و فن کا مرکز ہے۔ اس لیے میں نے وہاں جانا پسند کیا، (ایضاً ص ۳۰)

بغداد میں اس کی قدر و منزلت | بغداد جانے سے پہلے ہی اس کی علمی شہرت وہاں پہنچ چکی تھی، بغداد والوں کے لیے اس کی شخصیت اجنبی نہ تھی، وہ اس کے علم و فضل سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ جب وہ بغداد پہنچا تو یہاں کے بعض اصحاب علم نے ابوالعلاء کا امتحان لینے کی کوشش کی، اور اس کے فضل و کمال کا سب کو اعتراف کرنا پڑا، اور بغداد میں اس کی دھوم مچ گئی، ہر وقت اس کے پاس زائرین کا مجمع رہتا، لوگ اس کے اشعار سنتے اور پڑھتے، وہ بھی یہاں کی علمی و ادبی مجلسوں میں شریک اور فقہاء کے مناظروں، فلاسفہ، علماء اور ادباء کے مباحثوں میں حصہ لیتا تھا، اس زمانہ میں بغداد علم و فن اور تہذیب تمدن کا مرکز تھا، ہندوستان سے بھی اس کے علمی تعلقات قائم ہو چکے تھے، اور ہندوستانی علوم بغداد پہنچ چکے تھے، اس لیے یہاں ابوالعلاء کو ہندو مذہب اور ہندوستانی فلاسفہ کے خیالات سے آگاہ ہونے کا موقع ملا،

بغداد سے واپسی کا سبب | ابوالعلاء اپنے وطن کے حالات سے گھبرا کر بڑی تمناؤں کے ساتھ بغداد گیا تھا، لیکن یہاں بھی ایسے حالات پیش آئے کہ اسے بہت جلد واپس آنا پڑا، قدیم مورخین

نے اس کے اسباب نہیں بیان کیے ہیں، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اسلام کے تعزیری قانون حد سرقہ پر اپنے بعض اشعار میں اعتراض کیا تھا، فقہا نے اس کا تعاقب کیا، اس لیے اس کو بغداد سے اپنے وطن آجانا پڑا، [لہ] لیکن حقیقت میں اس کے اسباب دوسرے ہیں،

وہ حلب کے سیاسی انتشار سے گھبرا کر سکون و اطمینان کے ساتھ علمی زندگی بسر کرنے کے لیے بغداد گیا تھا، مگر بدقسمتی سے یہاں بھی سکون نہ ملا، وہ ایک غیرت مند اور خود دار آدمی تھا کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا، اور نہ علم و ادب کو ذریعہ معاش بنایا، اس لیے وہ اپنے وطن میں بھی تنگ حال تھا، بغداد آنے کے بعد اس کی غیرت اور بڑھ گئی، اور یہاں بھی اس کو معاشی اطمینان حاصل نہیں ہوا،

اس کی وحشت اور بیزاری کا دوسرا سبب یہ ہوا کہ بغداد کے کچھ لوگوں کو اس کی غیر معمولی شہرت و کمال دیکھکر حسد پیدا ہوا، وہ اس کے درپئے آزار ہو گئے، اس سے وہ بہت آزردہ خاطر ہوا، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ وہ شریف مرتضیٰ کی مجلس میں گیا، اس سے ایک شخص کو ٹھوکر لگ گئی، اس پر مرتضیٰ نے اس کو کتا کہا، معری نے جواب دیا کہ جسے کتوں کے ستر نام معلوم نہ ہوں وہ کتا ہے، یہ سنکر مرتضیٰ کو حیرت ہوئی، اس نے قریب بلا کر اس کا امتحان لیا، اور اس کے علمی کمال کو دیکھکر اس کی بڑی قدر و منزلت کی لیکن بعد میں پھر ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ متنبی کے بارہ میں شریف مرتضیٰ اور ابو العلاء کی رائے میں بڑا اختلاف تھا، ابو العلاء متنبی کا بڑا قدردان اور مداح تھا، اور اسے اس عہد کے تمام شاعروں سے برتر خیال کرتا تھا، اور مرتضیٰ کو اس سے شدید نفرت تھی، ایک مرتبہ اس کی مجلس میں متنبی کا ذکر ہوا، اس نے اس کی مذمت اور اس کے عیوب بیان کرنا شروع کیے،

لہ البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۷۳،

اس مجلس میں ابو العلاء بھی موجود تھا، اس نے کہا متنبی کا صرف وہ قصیدہ جسکا ایک مصرع

ع لکِ یامنازل فی القلوب منازل ۔ ہے، اس کے فضل و شرف کے لیے کافی ہے،

یہ سنکر مرتضیٰ بہت برہم ہوا، اور ابو العلاء کو گھسیٹ کر مجلس سے نکلوادیا، اور حاضرین سے کہا کہ

متنبی کے اس سے بہتر قصیدے بھی موجود ہیں لیکن اس اندھے نے اس قصیدہ کا اس لیے ذکر

کیا ہے، کہ اس میں یہ شعر بھی ہے :۔

واذا اتتک مذمتی من ناقص فھی الشھادۃ لی بانی کامل[1]

میرے کامل ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ کوئی ناقص شخص تم سے میری مذمت کرے ۔

اسی طرح ایک مرتبہ ابو العلاء، ابو الحسن علی بن عیسیٰ ربعی کے یہاں گیا، اور اندر آنے کی

اجازت چاہی، ابو الحسن نے کہا اصطبل کو آنے دو، اس پر ابو العلاء غضبناک ہوکر واپس چلا آیا،

اور پھر کبھی اس کی مجلس میں نہیں گیا[2] شامی زبان میں اصطبل اندھے کو کہتے ہیں،

اس طرح کے اور بھی دلآزار واقعات پیش آئے، جن کو ابو العلاء کی حساس اور غیرت مند

طبیعت برداشت نہ کر سکی، اور اس کا دل نہ صرف بغداد بلکہ ایک حد تک دنیا سے بھی بیزار ہو گیا،

اور اس نے کامل عزلت نشینی کا عزم کر لیا، اس زمانہ میں اس کو اپنی والدہ کی علالت کی اطلاع ملی

اس لیے اس نے رخت سفر باندھ لیا، لیکن اس کو بغداد چھوڑنے کا شدید قلق تھا جس کا اظہار

اس نے اپنے خطوط[3] اور شعروں میں کیا ہے، اہل بغداد کے بڑے طبقہ کو اس کے وہاں سے چلے جانے

کا سخت افسوس تھا،

والدہ کی وفات ابھی ابو العلاء راستہ ہی میں تھا کہ اس کو ماں کی وفات کی اطلاع ملی، اس سے

وہ بہت متاثر ہوا، اور اپنے رنج و اندوہ کا اظہار اس نے اپنے مرثیوں اور خطوط میں کیا ہے،

---

[1] معجم الادباء ج ۱ ص ۰، ۱ [2] ایضاً ص ۱۶۹ [3] رسائل ابو العلاء ص ۳۰

یہ حادثہ اس کے لیے اتنا جانکاہ ثابت ہوا کہ اس کے بعد اس نے بالکل عزلت نشینی اختیار کر لی، اور دنیا کے تمام عیش و عشرت کو خیرباد کہدیا،

والدہ کی وفات سے بہت پہلے ۳۷۷ھ میں جب وہ چودہ سال کا تھا، اس کے والد کا انتقال ہوگیا تھا، اس عمر میں بھی اس نے والد کا مرثیہ کہا تھا،

عزلت اور گوشہ گیری | بغداد سے واپسی کے بعد اس نے اپنے وطن میں عزلت نشینی اختیار کرلی تھی لیکن طلبہ اور استفادہ کرنے والوں کے ہجوم کی وجہ سے وہ تنہائی کی زندگی نہیں بسر کرسکا، مگر گھر سے نکلنا بند کر دیا تھا، اور تمام دنیاوی علایق سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی اور دنیاوی عیش و تنعم کے سارے اسباب و وسائل بالکل ترک کر دیے تھے، اس کے کئی اسباب تھے،

۱۔ وہ فطرۃً عزلت نشین اور خلوت پسند تھا

۲۔ بچپن میں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی جس سے وہ اکثر محجوب رہتا، بھری بزم میں جب اس سے کوئی غلطی ہوجاتی تو یہ لوگوں کے مذاق و تمسخر کا نشانہ بنتا، اس سے اسکی حساس طبیعت بہت متاثر ہوتی، اس لئے اس نے یہ طے کرلیا کہ وہ لوگوں سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیگا، تاکہ لوگوں کو اس کی کمزوریوں پر ہنسنے کا موقع نہ ملے، یہانتک کہ وہ لوگوں کے سامنے کھانے پینے سے بھی احتراز کرتا تھا، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وہ اپنے گھر کے ایک غار میں تنہائی کی حالت میں کھانا کھاتا تھا، اور کہتا تھا کہ اندھے پن کو شرمگاہ کی طرح مستور رکھنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ وہ فلاسفہ اور حکماء کے خیالات سے متاثر اور خود بھی ایک بالغ نظر فلسفی تھا اس لیے ہر چیز کے اسرار و اسباب سے بحث اور ان میں غور و فکر کیا کرتا تھا، اور اس کے لیے خلوت اور تنہائی کی ضرورت تھی، اور بعض فلاسفہ کی طرح عزلت گزینی اور خلوت نشینی اس کا مسلک بن گیا تھا،

فضل وکمال | ابو العلاء کا ننہال اور دادھیال دونوں فضل وکمال اور علم وادب کا گہوارہ تھا، لیکن وہ فطرۃً بھی نہایت ذہین وطباع اور صاحب مذاق تھا، قدرت نے اگرچہ اسکی ظاہری آنکھوں کو بے نور لیکن ذہن ودماغ کی بصارت کو روشن کردیا تھا، اور حصول کمال وجامعیت کے تمام اسباب اس کے لیے مہیا کردیے تھے، اور اس کے کمالات پر تمام اصحاب علم کا اتفاق ہے۔

علامہ ثعالبی ابوالحسن دلفی کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ "میں نے معرۃ النعمان میں ایک نہایت عجیب وغریب اور حیرت انگیز بات دیکھی کہ ایک اندھا او ظرافت پسند شاعر شطرنج اور نرد کھیلتا ہے، اور اسے ہر فن میں دخل اور مہارت ہے"[1]

یاقوت اور سیوطی لکھتے ہیں:۔

"وہ بڑا صاحب فضل مشہور روزگار، وسیع العلم، عاقل وفرزانہ، لغت وزبان کا ماہر، نحو کا حاذق، اچھا شاعر اور بہترین انشاء پرداز ہے، اور اس کا فضل وکمال توصیف سے بالاتر ہے"[2]

مشہور ادیب اور ابوالعلاء کے معاصر ابوالحسن علی باخرزی لکھتے ہیں،

"وہ ایک اندھا لیکن جامۂ فضل وکمال میں ملبوس اور بے مثال ادیب ہے، اس کا شدید ترین مخالف بھی اس کے سامنے شرمندہ، عاجز اور بے دلیل ہوجاتا ہے"[3]

علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں:۔

"ادیب وانشاء پرداز معری کا علم وفضل محتاج بیان نہیں"[4]

ابن خلکان رقمطراز ہیں:۔

"وہ تمام علوم وفنون میں کامل اور ماہر تھا"[5]

علامہ ابن جوزی جیسے بزرگ کو جو عقیدہ وخیال کی بنا پر اس کے شدید مخالف ہیں، یہ اعتراف

---

[1] تتمۃ یتیمۃ الدہر ص ۹ [2] معجم الادباء ج ۱ ص ۱۶۲ و بغیۃ الوعاۃ ص ۱۳۶ [3] دمیۃ القصر ص ۵۰ [4] کامل ابن اثیر ج ۹ ص ۲۲۲ [5] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰

کرنا پڑا کہ

"اس کے اشعار بہت ہیں، اور اس نے لغت میں تصنیفات املا کرائیں، اس فن میں وہ یکتا تھا" [1]

اس قسم کے بہت سے اعترافات کتابوں میں مذکور ہیں، اس کی فضیلت اور ناموری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مختلف علوم کے شائقین اور طلبہ ہر وقت اس کے گرد جمع رہتے تھے، علماء و وزراء اور اصحاب اختیار خطوط لکھکر اس سے استفادہ کرتے تھے،

ابو العلاء اپنی زندگی ہی میں مشہور و مقبول ہوگیا تھا، اس کے معاصر ابن القارح کا بیان ہے قد شاع فضله فی جمیع البشر وصار غرة علی جبهة الشمس والقمر خلد ذکره فی بدائع الاخبار وکتب بسواد اللیل علی بیاض النهار

ابو العلاء کی شخصیت بڑی جامع تھی، وہ متعدد علوم و فنون میں کامل درک رکھتا تھا، نحو ادب، لغت، شعر اور فلسفہ کا تو امام تھا، ان علوم میں کم لوگ اس کے حریف تھے، مورخین اور اصحاب تذکرہ اس کو اللغوی، النحوی، الشاعر المشهور، الفیلسوف، الادیب، شیخ الادب وافر الادب، غزیر الادب، واسع الاطلاع علی اللغة، عالماً باللغة، جید الشعر، حسن الشعر، حاذقاً بالنحو اور الحکیم وغیرہ کے القاب سے یاد کرتے ہیں، جرجی زیدان لکھتا ہے،

وکان معدوداً من اقطاب العلم والادب والشعر (ج ۲ ص ۲۶۱)

حافظہ | ابو العلاء کا حافظہ غیر معمولی اور یادداشت بے مثال تھی، ایک مرتبہ جس بات کو سن لیتا یا معلوم کر لیتا وہ اس کے ذہن سے کبھی محو نہ ہوتی، اپنی تمام کتابیں حافظہ سے املا کراتا تھا، ابن عدیم کا بیان ہے کہ اس نے ایک شب میں اپنے دیوان لزومیات کے دو ہزار شعر نقل کرائے اس کے حافظہ کے ایسے ایسے واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن کو باور کرنا مشکل ہے۔

---

[1] المنتظم ج ۸ ص ۱۸۴

ابوالعلاء کے مشہور شاگرد ابوزکریا تبریزی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب وہ ابوالعلاء سے استفادہ
کے لیے معرہ آئے تو دو سال تک ان کی اپنے وطن کے کسی آدمی سے ملاقات نہ ہوئی، ایک دن
سجد میں وہ ابوالعلاء سے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے، کہ ان کا ایک ہموطن مسجد میں نماز پڑھنے آیا
اس کو دیکھ کر ان کا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا، ابوالعلاء نے سبب پوچھا تو انھوں نے بتایا
ہ دو سال کے بعد آج ایک ہم وطن نظر آیا ہے، اور ابوالعلاء کے سامنے دونوں میں باتیں
ہیں، ابوالعلاء نے پوچھا تم دونوں نے کس زبان میں گفتگو کی، ابوزکریا نے بتایا کہ آذربائیجان
الوں کی زبان میں، معری نے کہا میں اس زبان سے ناواقف ہوں، اس لیے تمھاری باتیں تو
ہیں سمجھ سکا لیکن اسکے الفاظ مجھے یاد ہو گئے۔ اور گفتگو کے پورے الفاظ نقل کر دیے، یہ دیکھکر
ونوں سخت متحیر ہوئے[1]

یاقوت حموی اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے: "یہ بلا کی قوت ہے، اس سے بہتر
دداشت کی کوئی مثال نہیں ہو سکتی[2]"

صبح منبی میں متنبی کے غیر معمولی حافظہ کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً لکھا ہے:-

اسی طرح کا غیر معمولی اور قوی حافظہ ابوالعلاء معری کا بھی تھا، اسامہ بن منقذ بیان
رتے ہیں کہ انطاکیہ کے کتب خانہ کے نگراں کے یہاں میں گیا تو اس نے کہا کہ میرے یہاں
یک ایسی عجیب چیز ہے، جس کی مثال تاریخوں ہی میں مل سکتی ہے، ایک نابالغ اور اندھا
کا کتب خانہ میں آیا کرتا ہے، اس نے چند روز میں کئی کتابیں یاد کر لی ہیں، میں صرف ایک بار
س کے سامنے پڑھتا ہوں، وہ مجھ سے محض اس چیز کو دریافت کرتا ہے جس میں اس کو کچھ
بہ ہوتا ہے، وہ ایک مرتبہ سنکر اس کو دہرا دیتا ہے، یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ لڑکا آگیا

---
[1] کتاب الانساب ورق ۱۱ء [2] معجم الادباء ج ۱ ص ۱۶۴

وہ نہایت بدصورت، چیچک رو اور اندھا تھا، لیکن ذہانت اس کے بشرہ سے عیاں تھی،
اسے دیکھکر لائبریرین نے کہا عمرت دراز باد، ابھی میں ان صاحب سے تمھارا ذکر ہی کر رہا تھا، انکی
خواہش ہے کہ جس چیز کو وہ کہیں تم اسے یاد کرکے سناؤ، لڑکے نے جواب دیا آپ کا حکم سر آنکھو
پر، چنانچہ میں نے ایک مشکل چیز منتخب کرکے اس کے سامنے پڑھی، جو بات اسے کھٹکتی اسکا
اعادہ کراتا، ایک جزء سے زیادہ میں نے اس کے سامنے پڑھا تھا، اسے سنکر اس کو پورا دہرا دیا
یہ دیکھکر میں دنگ رہ گیا، اور اپنے دل میں کہا

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ناظر کتب خانہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا نام ابو العلاء معری ہے۔[1]

اس سے زیادہ دلچسپ اور عجیب حکایت اس کا ایک شاگرد بیان کرتا ہے، ابو العلا
کے پڑوس میں ایک عجمی رہتا تھا، ایک دن وہ معرہ سے باہر کہیں گیا ہوا تھا کہ اس کے وطن
سے ایک آدمی آیا، ہموطن کو نہ پاکر ابو العلاء سے فارسی زبان میں کچھ پیغام دیکر چلا گیا،
ابو العلاء فارسی زبان نہیں جانتا تھا، لیکن تمام الفاظ اس نے حفظ کر لیے، اور پڑوسی کے واپس
آنے کے بعد اس کے سامنے دہرا دیے، وہ ان کو سنکر رونے پیٹنے اور سر دھننے لگا، ابو العلا
نے سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کے باپ، بھائی اور کسی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے،[2]
ابو العلاء کے اصحاب بیان کرتے ہیں کہ اس کے پڑوس میں ایک آدمی گھی کی تجارت
کرتا تھا، اور معرہ کے ایک آدمی سے اس کی معاملت رہا کرتی تھی، ایک دفعہ پڑوسی نے اس
شخص سے حساب کتاب کا پرچہ لکھایا، ابو العلاء اپنے کمرہ سے اس کو سن رہا تھا، کچھ دنوں بعد
اس کو مضطرب اور پریشان دیکھکر اس کا سبب پوچھا، معلوم ہوا کہ وہ پرچہ کھو گیا ہے اور

---

[1] الصبح المنبی بشرح عکبری لدیوان المتنبی ج اول ص ۷، ۸، ۹ [2] ایضاً ص ۱۰

حساب یاد نہیں رہا، ابوالعلاء نے کہا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، میں تم کو پورا حساب لکھائے دیتا ہوں، کچھ دنوں کے بعد اصل دستاویز مل گئی، اس سے ابوالعلاء کی تحریر کا مقابلہ کیا گیا تو وہ ٹھیک اسی کے مطابق نکلی۔[۱]

ایک یمنی کے پاس لغت کی ایک کتاب تھی، جس کا ابتدائی حصہ پھٹ گیا تھا، متعدد اہل علم سے دریافت کرنے پر بھی کتاب اور مصنف کا نام نہیں معلوم ہو سکا، ابوالعلاء کے پاس یہ کتاب لائی گئی تو اس نے دونوں کا نام اور ضائع ہونے والے حصہ کا املاء کرا دیا۔[۲]

اس قسم کے اور بھی بہت سے دلچسپ اور حیرت انگیز واقعات بیان کیے جاتے ہیں ممکن ہے ان میں کچھ مبالغہ بھی ہو، لیکن اس کی قوت حفظ بہر حال مسلّم ہے، مبالغہ آمیز واقعات بھی اسی وقت منسوب کیے جا سکتے ہیں جب اس میں کچھ حقیقت ہو، حافظ ذہبی کا بیان ہے "یقال عنه انه کان یحفظ ما یمر بسمعه"۔

ذکاوت و فطانت حافظہ کی طرح اس کی ذہانت بھی حیرت انگیز ہے، وہ اپنے دور کا عبقری تھا، مورخین اور اصحاب سیر کا اس کی ذکاوت پر اتفاق ہے، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں: وکان فی غایة الذکاء المفرط، حافظ ابن حجر کا خیال ہے وکان عجبا من الذکاء المفرط۔ ذہبی نے صاحب الذکاء المفرط، یاقوت اور سیوطی نے غایة فی الفهم، صاحب روضات الجنات نے المشهور بالذکاء۔ علامہ بدیعی نے یتوقد ذکاء اور ابن عدیم نے متوقد الخاطر علی غایة من الذکاء تحریر کیا ہے،

اس کے ذہین و طباع ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے ۱۱ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا، اور ۱۵۔۲۰ سال کی عمر میں ایک اچھے اور باکمال شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔

۱؎ الصبح المنبی ص ۳۰ ۲؎ ذکری ابی العلاء ص ۲۲۲

اور اسی زمانہ میں اس نے اپنا دیوان سقط الزند بھی مرتب کر لیا تھا، شاعری کے علاوہ جملہ متداول علوم میں اس نے بیس سال کی عمر میں کمال حاصل کر لیا تھا، اس اعتبار سے اس کا یہ قول، وانی کنت الاخیر زمانہ لآت بما لم تستطعہ الاوائل

صرف شاعرانہ تعلی نہیں بلکہ امر واقعہ ہے۔

تفریحات سے دلچسپی ابو العلاء کی ذہانت و طباعی صرف علمی و ادبی دائرہ تک محدود نہ تھی، شروع میں اس کو مذاق و تفنن اور لطف و تفریح سے بھی دلچسپی تھی، اس میں بھی وہ اپنی ذہانت و طباعی کے جوہر دکھاتا تھا، ثعالبی نے ابو الحسن دلفی کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ میں نے ایک اندھا اور ظریف شاعر دیکھا، جو شطرنج اور نرد کھیلتا، اور جدل و ہزل ہر قسم میں دخل رکھتا ہے[1]، یاقوت نے بھی یہ روایت نقل کی ہے، اور دوسرے مورخین کی تصریحات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شطرنج اور نرد بہت اچھی طرح کھیلتا تھا، جرجی زیدان کا بیان ہے کہ اندھے ہونے کے باوجود وہ اپنے ہم مذاق لوگوں کے مشغلوں اور لطف و تفریح میں شریک ہوتا، اور ان میں ان سے مقابلہ و مسابقت کرتا، نرد و شطرنج نہایت عمدہ کھیلتا تھا، لیکن ڈاکٹر طہٰ حسین نے ابو العلاء کے اندھے ہونے کی بنا پر شطرنج کھیلنے میں شک و شبہ کا اظہار کیا ہے،

فیاضی و سیر چشمی ابو العلاء کی اقتصادی حالت اچھی نہ تھی، اکثر فقر و عسرت میں بسر کرتا تھا، لیکن دل غنی اور طبیعت فیاض تھی، اور اپنی استطاعت کے مطابق لوگوں کی مدد کرتا اور دوستوں کے پاس ہدیے اور تحائف بھیجتا، اس کے یہاں طلبہ اور شائقین علم کا ہجوم رہتا تھا لیکن کسی سے کوئی معاوضہ یا امداد قبول نہ کرتا تھا، اور اپنی ناداری کے باوجود خود ان پر

---

[1] تتمہ یتیمۃ الدہر ص ۹

کچھ نہ کچھ خرچ کر دیتا تھا، ایک مرتبہ اس کے شاگردوں نے حلب کے خربوزوں کی تعریف کی،
تو اس نے ایک آدمی بھیجکر خربوزے منگائے اور انھیں کھلایا۔[۱]

دوسروں کی حاجت روائی | وہ طبعاً عزلت پسند تھا، عام لوگوں سے اس کا زیادہ ربط و تعلق نہ تھا، لیکن شائقین علم، امراء و اعیان دولت سے اس کے علمی تعلقات تھے۔ وہ اس کا بڑا احترام کرتے تھے، اس لیے اکثر ضرورتمند اس سے سفارش کے خواہشمند ہوتے، وہ سفارش کرکے ان کی حاجت روائی کرتا تھا،

عام معمولات | وہ ایک خاموش اور خلوت پسند آدمی تھا، اس لیے ہنگاموں اور سیاسی و ملکی شورشوں سے اس کو کوئی دلچسپی نہ تھی، موٹا جھوٹا کھاتا اور پہنتا اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا، دن میں تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا کام انجام دیتا اور رات غور و فکر، علمی مسائل میں مذاکرہ اور یاد الٰہی میں بسر کرتا، اور ان سے فارغ ہونے کے بعد سوتا، فواحش و منکرات اور بیحیائی کے کاموں سے اس کو کوئی رغبت نہ تھی،

شہرت سے بے نیازی | ابو العلاء خالص علمی و ادبی اور فلسفیانہ مذاق رکھتا تھا، طبعاً بھی عزلت اور خاموشی پسند کرتا تھا، اور گوشۂ عزلت میں زندگی بسر کرتا تھا، لیکن اس کے کمالات اور علم و فضل نے اسے عوام و خواص میں مشہور و مقبول بنا دیا تھا، طلبہ اور شائقین علم کا اس کے یہاں ازدحام رہتا تھا، علماء میں بھی مقبول تھا، اور وزراء و سلاطین کی نگاہ میں بھی اس کی عزت و عظمت تھی،

بغداد سے رخصت ہوتے وقت وہاں کے لوگوں نے جس تعلق اور محبت کا اظہار کیا، وہ اس کی مقبولیت کی دلیل ہے، وہ خود لکھتا ہے، "اللہ تعالیٰ اہل بغداد کو جزائے خیر دے، انھوں نے میری تعریف کی، میں اسکا مستحق نہ تھا، بے علم ہونے کے باوجود انھوں نے میرے فضل کا اعتراف کیا۔"[۲]

۱۔ ذکری ابی العلاء ص ۱۰۲ بحوالہ تاریخ الحکماء قفطی ۲۔ رسائل ص ۳۵

اس کے حاسدین اور مخالفین کو بھی اعتراف تھا کہ قد شاع فضلہ فی جمیع البشر۔

خود اس کا بیان ہے کلمات رغبت فی الخمول قدر لی غیرالمامول[1]

عمر اور صحت | ابو العلاء نے ۸۶ سال کی عمر پائی، اور زندگی بھر صحت مند رہا، جو اس کے تجرد، آسایش اور لذائذ سے کنارہ کشی، قناعت اور سادہ زندگی کا نتیجہ تھا، بڑھاپے میں جب قوی کمزور ہو گئے تھے، ہوش و حواس، قوائے فکریہ اور اصابت رائے میں بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا، ۴۰ - ۵۰ سال کی عمر میں دانت ٹوٹ گئے، بڑھاپے میں بالوں کی سیاہی ختم اور سماعت کم ہو گئی تھی، وہ طویل عمر اور زیادہ بڑھاپے سے بہت گھبراتا تھا، لیکن قدرت نے اس کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی،

وفات | ۳ ربیع الاول ۴۴۹ھ کو جمعہ کے دن معرۃ النعمان میں تین دن کی علالت کے بعد ۸۶ سال کی عمر میں انتقال کیا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی قبر پر یہ شعر لکھنے کی وصیت کی تھی،

هذا جناه ابی علی وما جنیت علی احد

بعض سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ ابو العلاء کی وفات کے بعد اس کی قبر پر ایک ہفتہ کے اندر دو سو مرتبہ قرآن مجید ختم کیا گیا، تبریزی کا بیان ہے کہ ۸۴ شاعروں نے مرثیے لکھکر اس کی قبر پر پڑھے، ابو الحسن علی بن ہمام کے مرثیہ کا یہ شعر مشہور ہے،

ان کنت لم ترق الدماء زهادة فلقد ارقت الیوم من جفنی دما[2]

اگرچہ تم نے زہد کی بنا پر (زندگی بھر) کبھی خون نہیں بہایا لیکن آج (مرنے کے بعد) میری آنکھوں سے خون کے آنسو بہا دیے ہیں۔

شاعر حلب ابو الفتح کا مرثیہ بھی مشہور ہے، اس کا پہلا شعر ہے:

العلم بعد ابی العلاء مضیع والارض خالیة الجوانب بلقع[3]

ابو العلاء کے بعد علم ختم اور زمین ویران ہو گئی۔

ا - ... [illegible]

ابن وردی کا بیان ہے کہ ابن قیروانی متوفی ۴۴۳ھ معرہ گئے، تو ابو العلا کی قبر پر یہ شعر کہا،

نزلت فزرت قبر ابی العلاء فلم ار من قری غیر البکاء

الا یا قبر احمد کم جلال تضمنہ ثراک وکم ذکاء

میں ابو العلار کی قبر پر گیا تو سوائے آنسو ٹپکے اور کوئی سامانِ ضیافت نہ تھا، ابو العلار کی قبر کتنا جلال وعظمت اور کیسی ذکاوت اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔

علاء الدین علی بن مظفر کندی ربیع الاول ۶۹۱ھ میں اس کی قبر پر گیا، تو وہ زمین کے برابر ہو چکی تھی، اور اس کے آثار اور وصیت کے شعر معدوم ہو چکے تھے، انھوں نے یہ دو شعر اس پر تحریر کیے :

قد زرت قبر ابی العلاء المرتضی لما اتیت معرۃ النعمان

وسألت من غفر الخطایا انہ یهدی الیہ رسالۃ الغفران[1]

ابو العلار کی قبر مدتوں ویران و پامال رہی، ابن خلکان، قفطی اور ذہبی جو مختلف زمانوں میں اس قبر پر گئے ہیں، اس کی ویرانی کا ذکر کیا ہے، امیر نورس پاشا نے اپنے زمانہ میں اس کی مرمت کرا کے یہاں ایک مکتب قائم کیا، اور اب شہر کے گوشہ میں ایک شاندار قبر بن گئی ہے، اس پر قدیم خط کوفی میں ایک کتبہ تحریر ہے، اس کے پاس ہی اس کے ایک شاگرد اور شیخ محمد غباری کی قبریں ہیں جس کی زیارت کے لیے لوگ جاتے ہیں[2]۔

(باقی)

---

[1] بحوالہ ابو العلاء وما الیہ ص ۲۵۵ [2] معجم المطبوعات ج اول ص ۳۲۰

سیتاپور کے کتبخانے
اور
ان کے بعض نوادر

از جناب خادم سیتاپوری

سیتاپور (اودھ) اور اس کے مضافات صدیوں علم وادب کے مرکز رہے۔ مخدوم شیخ سعدالدین (المتوفی ۹۱۲ھ) کے پہنچنے کے بعد "خیرآباد" تو "مدینۃ الاولیا" بننا شروع ہی ہوگیا، لیکن ہرگام اور لاہرپور اس سے پہلے ہی "سلسلۂ قلندریہ" سے منسلک ہوچکے تھے، "صدرپور" کے علامہ فنامی اگرچہ عہد شاہجہانی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کا کتب خانہ اس زمانے میں اودھ کا ایک بہترین کتب خانہ تسلیم کیا گیا ہے، جو شاہجہاں نے انھیں عطا فرمایا تھا، مشہور ہے کہ کئی ہزار مخطوطات بڑے بڑے چوبی صندوقوں میں محفوظ کرکے چھکڑوں پر دلی سے صدرپور لائے گئے تھے، مگر آج کنکر کی اینٹوں سے بنے ہوئے اس قلعہ کے تہ خانوں میں مٹی کے ڈھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں، لاہرپور کی خانقاہ "قلندریہ" میں عربی اور فارسی مخطوطات کا جو بیش قیمت ذخیرہ آج بھی کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا ہے، اب سے چند سال قبل تک بڑی اچھی حالت میں تھا، شاہ ولایت احمد صاحب مرحوم ایک بزرگ سیرت عالم تھے، جنھیں کتابوں سے والہانہ عشق تھا، جب تک زندہ رہے اس کتب خانے کے ایک ایک ورق کو سینے سے لگائے رہے۔

خیرآباد کے عظیم الشان کتب خانوں میں علامہ فضل حق خیرآبادی کا کتب خانہ انقلاب ۱۸۵۷ء

ہی میں تباہ ہو چکا تھا، پھر بھی خیرآباد میں چھوٹے چھوٹے کئی کتب خانے اور بھی تھے، جن میں حکیم انوار حسین مرحوم کا کتب خانہ سب سے زیادہ اہم تھا، قدیم طبی مخطوطات کے علاوہ ادب، تصوف، تاریخ، فلسفہ اور منطق کے ایسے ایسے نوادر اس کتب خانے میں موجود تھے کہ شاید ہی کہیں ہوں، علامہ فضل امام خیرآبادی کی "تاریخ ہند" کا منفرد نسخہ اب بھی اس خاندان میں موجود ہے،

خاص سیتاپور میں بھی کئی چھوٹے چھوٹے کتب خانے تھے جن میں سب سے زیادہ گراں بہا لائبریری مترجم "اخوان الصفا" علامہ سیتاپوری مولوی اکرام علی مرحوم کی تھی، علامہ سیتاپوری میرامن دہلوی، حیدربخش حیدری، میر بہادر علی حسینی وغیرہ کے معاصرین میں تھے، اور ایک مدت تک "فورٹ ولیم" میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے دوش بدوش علم و ادب کی خدمت کرتے رہے، ان کا کتب خانہ ان کے پوتے منشی علی محمد نظم کی حیات تک محفوظ رہا، انکی وفات (۱۹۲۹ء) کے بعد یہ بھی تباہ ہو گیا،

اس کے علاوہ خاص سیتاپور میں غالب کے حقیقی بھانجے مرزا عباس بیگ خان بہادر[1]، مولوی مظہر علی (تعلقدار مہیوہ) سرسید کے بھتیجے سید محمد احمد خاں (سب جج)، حکیم مومن خاں مومن کے داماد مولوی عبدالغنی وکیل[2]، سردار محمد ہاشم خاں، آغا عبدالغنی دہلوی (وکیل سیتاپور)

[1] مرزا غالب کی حقیقی بہن چھوٹی خانم زوجہ مرزا اکبر بیگ بدخشی کے منجھلے صاحبزادے، غدر ۱۸۵۷ء سے قبل سیتاپور آبسے تھے۔ خیرخواہی کے صلے میں انگریزوں نے انھیں تعلقہ پڑانگاؤں ضلع سیتاپور عطا کیا تھا، انکے دوسرے بھائیوں کی اولاد بھی غدر کے بعد سیتاپور آگئی تھی، چنانچہ اس خاندان کی ایک شاخ اب بھی یہیں موجود ہے، مرزا عباس بیگ خان بہادر نے ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی۔ [2] مومن کے باقیات الصالحات میں بس ایک صاحبزادی تھیں جو مولوی عبدالغنی وکیل سیتاپور سے منسوب تھیں، اس سے تین سال قبل تک مومن کے ایک نواسے عبدالغنی بقید حیات تھے، مومن کی صاحبزادی اور مولوی عبدالغنی وکیل نے سیتاپور ہی میں وفات پائی، یہیں آسودہ خواب ہیں۔

شاہ محمد صادق مارہروی اور خود میرے خاندان میں مطبوعات و مخطوطات کے بڑے اچھے ذخیرے تھے، سید محمد احمد خاں (سب جج) کی لائبریری اس صدی کے اوائل میں جسٹس سید محمودؒ کے انتقال (۱۹۰۳ء) کے بعد علی گڈھ منتقل ہوگئی تھی، اس کے علاوہ تقریباً اور سب کتب خانے تباہ و برباد ہوگئے، میرے خاندانی کتب خانے میں اب بھی بہت کچھ ہے پھر بھی بہت سے نوادر تلف ہوگئے، خان آرزو کی "موہبت العظمیٰ" کا جو مخطوطہ میرے یہاں ہے، وہ میرے ایک بزرگ میر مردعلی عارف نے خان آرزو کے اصل مسودہ سے نقل کیا ہے، خان آرزو میر مردعلی عارف کے قریبی دوستوں میں تھے، دونوں فیض آباد میں ساتھ رہ چکے تھے،

قصبہ آنٹ (ضلع سیتاپور) کے قطب زمان سید شاہ سلطان جہانگیر صاحب ذکر و فکر عالم تھے، کہا جاتا ہے کہ فلسفہ اور تصوف کی بے شمار کتابیں ان کے یہاں محفوظ تھیں، مگر یہ کتب خانہ اس خاندان کے سیتاپور منتقل ہونے سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا، قطب زماں نواب افضل خاں (بن علامہ ابوالفضل) صوبیدار بنگالہ کے سمدھی تھے، ان کے صاحبزادے سید شاہ مصطفیٰ کی شادی نواب افضل خاں کی صاحبزادی "اولیا بی بی" کے ساتھ ہوئی تھی جن کی نسل اب بھی سیتاپور میں موجود ہے،

چھوٹی چھوٹی لائبریریوں میں اس ضلع کے ہندو اور مسلمان زمینداروں اور تعلقداروں کے یہاں علوم مشرقی کے بڑے اچھے ذخیرے تھے، کملاپور کے ٹھاکر جواہر سنگھ، بابوپور کے حاجی محمد احمد خاں مرحوم، "نیری برگانواں" کے ٹھاکر صاحبان، مچھریٹہ، باڑی، تمبور،

لہ جسٹس سید محمود کا آخری دور حیات سیتاپور ہی میں گذرا، کئی سال تک انھوں نے یہیں بیرسٹری کی، اپنے حقیقی چچازاد بھائی سید محمد احمد خاں (سب جج) کے ساتھ "بیگم باغ" میں رہتے تھے، ۱۹۰۳ء میں یہیں وفات پائی، لاش علی گڈھ لیجائی گئی، میرے بچپن تک اس خاندان کے کچھ افراد سیتاپور میں موجود تھے۔

اورنگ آباد اور قطب نگر میں مطبوعات کے علاوہ قلمی کتابوں کے ایسے ایسے نادر نسخے موجود تھے، جن کا تذکرہ کرتے ہوئے دل دہلتا ہے،

ہندوستان بھر میں اخبارات و رسائل کا جیسا عظیم الشان کتب خانہ اخترالدولہ[1] کا تھا، غالباً شخصی کتب خانوں میں کہیں اور نہ ہوگا، صحافت کا یہ عدیم النظیر کتب خانہ میرے دیکھتے دیکھتے ردی کے بھاؤ بک گیا، اور ہندوستانی صحافت کی سب سے بڑی لائبریری سے اس طرح محروم ہوگیا کہ اب اس کا بدل ممکن ہی نہیں،

ضلع سیتاپور میں سب سے بڑا کتب خانہ ریاست محمود آباد کی لائبریری "سقراط" ہے جس میں کئی ہزار قیمتی مخطوطات اور تقریباً ڈیڑھ دو لاکھ مطبوعات ہوں گی، اس لائبریری میں قلمی کتابوں کا جیسا نادر ذخیرہ کسی وقت تھا، اودھ کیا شاید ہی یو، پی میں کہیں اور ہو! خاتمۂ زمینداری کے بعد یہ لائبریری بھی تقریباً برباد ہی ہو چکی ہے،

اب سے تیس پینتیس سال پہلے "بسوان" (ضلع سیتاپور) میں بھی ایک چھوٹا سا کتب خانہ تھا، جو بحیثیت کتب خانہ کے تو بہت ہی چھوٹا تھا، مگر اسے نسبت ایک بہت بڑی شخصیت سے تھی، اس عظیم شخصیت سے جو علامہ شبلی کے استاد مولوی محمد فاروق چریاکوٹی[2] مرحوم کے استاد بھائی تھے

---

[1] اخترالدولہ حاجی سید محمد اشرف نقوی گذشتہ صدی کی وہ تاریخی شخصیت ہیں، جنھوں نے سب سے پہلے ہندوستانی صحافت اور پریس کی تاریخ اردو زبان میں "اختر شاہنشاہی" کے نام سے لکھی، اس سے قبل ہندوستانی صحافت اور پریس پر کسی زبان میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، اخترالدولہ سادات سیتاپور کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، یہیں پیدا ہوئے اور کم و بیش سو سال کی عمر میں یہیں ۲۰ جولائی ۱۹۲۹ء کو وفات پائی، "اختر شاہنشاہی" صرف ایک بار اخترالدولہ کے اختر پریس میں جون ۱۸۸۸ء میں چھپی تھی، اب تقریباً کمیاب ہے۔ [2] علامہ فدا حسین اور مولوی محمد فاروق چریاکوٹی دونوں شمس العلماء مفتی محمد عباس لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، (تجلیات مؤلفہ مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ،

ان کا اصل نام "محمد سراج الدین ابن عیش قریشی" تھا، کنیت ابو شہاب، لیکن شہرت پائی اپنے گھریلو نام "شیخ فدا حسین" سے، شیخ زادگان لکھنؤ کے تاریخی خاندان کی آخری یادگاروں میں سب سے جلیل القدر بزرگ تھے، ان کے والد ماجد شیخ فدا علی (عرف اچھے صاحب) عیش لکھنوی میر کلو عرش (خلف میر تقی میر) کے ارشد تلامذہ میں تھے، ایک درجن سے زیادہ مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں ان کی یادگار ہیں، عہد واجد علی میں محکمہ "اخبار سلطانی" انہی کے سپرد تھا، ۱۳۱۱ھ میں وفات پائی، وہ نسباً شیخ صدیقی لیکن مذہباً شیعہ تھے، سرسید تحریک کے ابتدائی حامیوں میں تھے، ایک مدت تک "اینگلو محمڈن کالج" میں عربی کے پروفیسر تھے، ۱۳ رنومبر ۱۹۳۳ء میں سیتا پور میں وفات پائی، یہیں سپرد خاک ہوئے، وہ درجن سے زاید مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کے مصنف تھے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:-

(۱) ترجمہ کتاب تیماینوس، یہ کتاب افلاطون کی ہے، اس میں مثل افلاطونیہ پر بحث ہے،

(۲) کتاب الاستشاریہ، الہیات میں ہے،

(۳) مقدمہ نوریہ، اس میں ثابت کیا ہے کہ عوالم اجسام میں ہر ہر ذرہ کو معرفت الٰہی مجازاً نہیں بلکہ حقیقۃً حاصل ہے، وہ سب اپنے نفس سے ناواقف ہیں، اور خدا کو پہچانتے ہیں،

(۴) اثبات النبوۃ۔ اس کتاب میں عرب کے مشہور فلسفی اسحاق کندی عیسائی کے ایک رسالہ کی تردید ہے، جو اس نے خلیفہ مامون عباسی کے مصاحب عبد اللہ بن اسمٰعیل ہاشمی کے نام لکھا تھا، یہ کتابیں نامکمل ہیں،

(۵) تقریب الاسناد۔ اس میں مصنف کے اسناد حدیث کی تفصیل ہے،

(۶) سترالمجسر اس میں عام اور متفقہ رائے کے برخلاف اشتر نخعی کی صحابیت کو ثابت کیا ہے،

(۷) دلیل الصائب۔ اس میں مختار ثقفی پر جو مذہبی اور سیاسی الزامات لگائے جاتے ہیں، انکی تردید

(۸) مجردات عن الموضوعات - اس میں بعض ان حدیثوں کو ثابت کیا ہے، جنھیں محدثین موضوع بتاتے ہیں،

۹. کتاب کشف عن الغاشۃ - صحاح ستہ اور ان کے بعد حدیث کی جو کتابیں مدون ہوئی ہیں، ان پر متن اور سند دونوں حیثیتوں سے تنقید کی ہے۔

(۱۰) یم عجاج - اس میں آپ نے شیوخ حدیث کے سلسلۂ اسناد روایت کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے

(۱۱) عبرات العین - (مقتل ابن عیش) دو حصوں میں ہے، ہر حصہ میں تین تین ہزار اوراق سے زاید ہیں، پہلے حصے میں حسب اصول علمائے جرح و تعدیل روایات اخبار و احادیث پر گفتگو کی ہے، اور امام ذہبی کا رد کیا ہے، جنھوں نے حضرت امام حسینؑ کی بشارت پر گریہ کی فضیلت کی روایت نقل کر کے اس کی صحت سے انکار کیا ہے اور گریہ کی فضیلت ثابت کی ہے۔ دوسری جلد میں حضرت امام حسینؑ کے حالات، اہل بیت کے مدینہ سے نکلنے اور پھر دوبارہ واپسی تک جو جو واقعات گذرے ہیں، اس کی تفصیل ہے،

مرحوم اس صدی کی پہلی دہائی میں لکھنؤ سے ترک وطن کر کے "بسوان" ضلع سیتا پور میں اقامت گزیں ہو گئے تھے، اپنے بچپن اور پھر ہوش میں آنے تک مجھے سیکڑوں بار انکی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، میرے والد ماجد سے ان کے خصوصی تعلقات تھے، اور ایسے عزیزانہ کہ علامہ کی وفات سے تین مہینے قبل جب میرے والد کا انتقال ہوا تو انھیں مرتے دم تک والد کے سانحۂ ارتحال کی خبر نہیں کی گئی، کیونکہ علامہ پر فالج کا ہلکا سا حملہ ہو چکا تھا، اور خطرہ تھا کہ اس حادثہ کا ان کی بیماری پر ابد برا اثر پڑے گا۔

علامہ کے کتب خانے میں عربی، فارسی، انگریزی، سنسکرت، اردو اور ہندی کی جو بیش قیمت

کتابیں تھیں، انھیں پڑھنے اور سمجھنے کا شعور تو مجھ میں نہیں تھا، پھر بھی ان کے ڈرائنگ روم اور بغلی کمروں میں بیشمار کتابوں سے بھری ہوئی الماریاں اب تک میری نگاہوں میں رقصاں ہیں ان کتابوں کی تعداد چار پانچ ہزار سے کم نہ ہوگی،

علامہ کی وفات (۱۳۴۳ھ) کے بعد ان کے خلف اکبر ابوالفضل شیخ بادشاہ حسین اس علمی ترکہ کے بھی وارث قرار پائے، "ابوالفضل" اپنے والد کے صحیح جانشین تھے "سنسکرت" کے اتنے بڑے عالم کہ اس دور کے بڑے بڑے "ودیانت" ان کے سامنے مودب بیٹھتے تھے، فلسفی ایسے کہ ہر وقت استغراق اور محویت کا عالم طاری رہتا تھا، سر مہاراجہ محمود آباد کی حقیقی بہن ان سے منسوب تھیں، اردو، انگریزی اور سنسکرت کی کئی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں ان کی یادگار ہیں، جن میں قرآن پاک کی انگریزی تفسیر ان کا شاہ کار ہے، ۵ راگست ۱۹۳۶ء کو بسوان ہی کے ایک تالاب سے ان کی لاش نکالی گئی، فلسفیانہ استغراق میں نجانے کس طرح ٹہلتے ہوئے تالاب میں چلے گئے، کافی دیر کے بعد لاش برآمد ہوئی۔

علامہ کا کتب خانہ ابوالفضل شیخ بادشاہ حسین کی اچانک موت کے بعد ویران ہو گیا، بہت دنوں تک کس مپرسی کے عالم میں پڑا رہا، بہت سی کتابیں کیڑے چاٹ گئے، آخر میں جو بچ گئیں اس کا کچھ حصہ محمود آباد کی لائبریری منتقل ہوا اور باقی کتابیں شمس العلماء مولوی ناصر حسین کے کتب خانہ ناصریہ (کھجوہ لکھنؤ) میں منتقل کر دی گئیں،

علامہ کے خاندانی کتب خانے کا شمار کسی زمانے میں لکھنؤ کے مشہور کتب خانوں میں تھا، خاندانی ذخیرۂ کتب کے علاوہ اچھے صاحب عیش کے عہد میں بہت سی کتابیں اس کتب خانے میں جمع ہو گئی تھیں، لیکن ۱۹۰۵ء میں اس کتب خانے کا بڑا حصہ آتش زدگی سے تباہ ہو گیا، جو کچھ بچ گیا وہ بعد میں علامہ اپنے ہمراہ بسوان لے آئے تھے،

اسی کتب خانے کی ایک نامکمل اور مختصر سی فہرست مجھے دستیاب ہوئی ہے، جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فہرست ان فہرستوں میں سے کوئی ایک نامکمل فہرست ہے جو (غالباً) ابو الفضل شیخ بادشاہ حسین کی وفات کے بعد مرتب کی جا رہی تھیں، اس مختصر فہرست میں انگریزی اردو، فارسی اور عربی کی تخمیناً ایک ہزار کتابوں کا ذکر ہے، سنسکرت اور ہندی زبان کی کوئی کتاب اس فہرست میں نہیں ہے، جن قلمی کتابوں کی تفصیل اس میں دیگئی ہے، انکی تعداد صرف ستر ہے، جو اصل مخطوطات سے یقیناً بہت ہی کم ہے، اس لیے کہ جہانتک میرے علم میں ہے، اس لائبریری کے مخطوطات ایک ہزار سے کہیں زائد تھے،

اسی نامکمل اور مختصر فہرست کا صرف وہ حصہ اس مضمون میں پیش کیا جا رہا ہے جو صرف عربی اور فارسی مخطوطات پر مشتمل ہے، میں نے اس فہرست کو بغیر کسی ترمیم کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، صرف بعض بعض مقامات پر مکررات کو دور کرنے کے لیے معمولی رد و بدل ضرور کرنا پڑا ہے، اس فہرست کی علمی افادیت کیا ہے؟ اس کا فیصلہ تو ارباب علم ہی کر سکیں گے۔ لیکن اس سے بعض ایسے نادر مخطوطات کی نشاندہی ضرور ہوتی ہے، جو عام دسترس سے باہر ہیں۔

کتاب	کیفیت
۱- بحار الانوار مجلد کتاب السماء و العالم نصف آخر (سنہ ۱۲۰۱ھ)	نہایت خوشخط۔ ناقص الاول، سنہ کتابت تحریر نہیں ہے علامہ غفران مآب سید دلدار علی کی مہر ۱۲۳۱ ہجری الجنوہ ثبت ہے،
۲- ایضاً "	
۳- کتاب السماء و العالم المجلد الرابع من بحار الانوار المجلسی ترجمہ محمد رضی بن محمد	
۴- احوال خود نوشت سلطان طہماسپ ابن اسمٰعیل بن حیدر الصفوی الحسینی (مکتوبہ سنہ ۱۲۱۲ھ)	ابو الفتح سلطان محمد مرزا الصفوی کے حکم سے سنہ ۱۲۱۲ھ میں مرزا غلام علی نے ولی عہد بہادر ابو المظفر محمد اکبر شاہ کے لیے اس نسخہ کی کتابت کی ہے، کتاب نایاب ہے،

کتاب	کیفیت
۵ تا ۷۔ (مجموعۂ کتب) ۱۔ اعراب القاری علی اول باب صحیح البخاری ۲۔ کشف الخدر عن امر الخضر ۳۔ المعرفۃ بالمرتبۃ الشہودیہ فی المنزلۃ الوجودیہ ۴۔ تحقیق الاحتساب فی تدقیق الانتساب ۵۔ النافعۃ للناسک فی فضیلۃ الاشباک کلہم من مصنفات علی بن سلطان محمد الہروی القاری (سنہ ۱۲۹۴ھ)	یہ پانچوں رسائل مولانا ابو الغنا محمد عبد المجید ابن ابو الحیاء محمد عبد العلیم اللکھنوی الفرنگی محلی کے تحریر کیے ہوئے ہیں، کتابوں پر مولانا کی مہر (سنہ ۱۲۹۴ھ) ثبت ہے
۸۔ بدایع وقایع۔ مصنف رائے رایان آنند رائے۔ (مکتوبہ سنہ ۱۲۰۳ھ)	مصنف نے اپنے محمد شاہ کے حالات سنہ ۱ تا ۲۱ جلوس قبل ورود نادر شاہ تک لکھے ہیں، سنہ کتابت ۱۲۰۳ھ ہے، نایاب و نادر نسخہ ہے
۹۔ کتاب الشفاء حکیم بو علی سینا	ناقص، نہایت خوشخط، سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا
۱۰۔ کشکول قلمی (مکتوبہ سنہ ۱۰۶۴ھ)	مختلف خطوط شاہ طہماسپ و شاہ عباس و شہنشاہ اکبر وغیرہم۔ اور مختلف غزلیات اساتذۂ فارسی ادعیہ و تعویذات، نسخہ جات وغیرہ کا مجموعہ ہے، مختلف تحریرات
۱۱۔ بیان واقع (مکتوبہ سنہ ۱۱۹۳ھ)	وقائع و احوالات نادر شاہ مصنف حاجی عبد الکریم خاں یکے از مقربان محمد شاہ یہ کتاب نایاب ہے، مصنف نے اس میں چشم دید حالات از ابتدائے خروج و عروج نادر شاہ و حملہ ہندستان

تا مقتول شدن نادرشاہ ہیں۔ اور اس کے بعد
احمد شاہ بن محمد شاہ رنگیلے کے حالات پر منتہی ہے:
مصنف نادر شاہ کے حملے کے وقت خود دلی میں
موجود تھا اور جب نادر شاہ ایران واپس ہوا تو
حسب ایما محمد شاہ یہ بھی حکیم علوی خاں (نواب
معتمد الملک سید علوی خاں سید ہاشم) کے ساتھ
ایران گیا اور وہاں سے حج بیت اللہ اور زیارات
عتبات عالیات سے بھی مشرف ہوا، یہ لوگ توران،
خراسان، ماژندران کی لڑائیوں میں بھی نادر شاہ
کے ساتھ تھے، قزوین سے بمشکل پیچھا چھڑا کے حج
کے لیے روانہ ہو سکے تھے، اس کتاب میں نادر شاہ
کے حالات کے علاوہ حج و زیارت کے سفرنامے، دیار
و امصار کے واقعات و عجائبات کا دلچسپ تذکرہ
بھی کیا گیا ہے، مصنف مذہب سنت و الجماعت
سے تعلق رکھتا تھا، یہ نسخہ مصنف کے اصل نسخہ کی
نقل ہے، خاتمۂ کتاب پر یہ عبارت درج ہے:
"تمام شد احوال نادرشاہ بتاریخ بست و نہم شہر
ذی الحجہ سنہ ۲۱ جلوس شاہ عالم بادشاہ مطابق سنہ ۱۱۹۳ھ
بروز جمعہ از دست حقیر فقیر عاصی بالتقصیر ٹیک چند کاستہ

بانی پتی بخاطر داشت منشی صاحبان ارجن سنگھ جی و بہادر سنگھ جی منشیان خالصہ شریف۔"

۱۲- المتوسطات

علم ہندسہ واقلیدس میں ہے، سنہ کتابت نہ معلوم ہو سکا،

۱۳- کتاب مکارم الاخلاق الشیخ ابی علی الطبرسی

کتاب مکمل ہے، کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

۱۴- دستور العمل ہندوستان یعنی مجمع التواریخ (سنہ تالیف ۱۱۱۰ھ)

کل ہندوستان کے حالات اختصار کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں، ابتداے کلجگ سے لیکر ظہور اسلام تک نیز امیر تیمور صاحب قران سے لیکر فرخ سیر تک کے حالات تحریر کیے گئے ہیں، مولف دربار عالمگیری سے وابستہ معلوم ہوتا ہے، اس نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا ہے، سنہ تالیف ۴۳ جلوس عالمگیری مطابق سمیت ۱۷۶۲ بکرمی موافق ۱۱۱۰ھ ہے، اور کتابت بھی اسی زمانہ کی معلوم ہوتی ہے، کاتب کا نام نہیں ہے کیونکہ آخری چند صفحات غائب ہیں، کتاب نایاب ہے،

۱۵- تاریخ نزہۃ القلوب حمد اللہ بن ابی بکر ابن حمد اللہ المستوفی القزوینی

مشہور کتاب ہے، کاتب محمد تقی نے نواب امین الدولہ محسن الملک شاہنواز خان مستقیم جنگ کے حکم سے کتابت کی ہے، سنہ کتابت بھی لکھا ہے، (افسوس کہ فہرست میں سنہ کتابت نہیں ہے)

۱۶- مجموعہ قصاید وقطعات ورباعیات عرفی شیرازی (اور) مجموعہ اشعار فارسی از کلام اساتذہ شعراے ایران (مکتوبہ ۱۲۳۳ھ)

ناقص الاول۔ کاتب بہاری لال نے ماہ رمضان ۱۲۳۳ھ میں لکھی ہے۔

۱۷۔ معیار النجم در فن عروض شعر	سنہ کتابت نہیں ہے،
۱۸۔ شرح مختصر الاصول (سنہ ۱۲۰۷ھ)	ناقص الاول و الآخر، سنہ کتابت معلوم نہ ہو سکا، غفرانمآب علامہ سید دلدار علی کی مہر ۱۲۰۷ھ ثبت ہے
۱۹۔ (مجموعہ) احادیث النبیؐ	تینوں کتابیں ایک جلد میں شامل ہیں۔ سنہ کتابت نہیں ہے،
۲۰۔ رسالہ غوث الاعظم	
۲۰۔ مکتوبات محبوب سبحانی (حضرت) شیخ عبد القادر جیلانی	
۲۰۔ کتاب الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ الدینوری	سنہ کتابت نہیں ہے، سرورق پر مہر سلطان العلماء سید محمد لکھنوی ۱۲۳۹ھ ثبت ہے۔
۲۱۔ مناقب مرتضوی	صفحات ۴-۵-۶-۷ اور صفحہ آخر غائب ہے
۲۲۔ مرات المخلوقات[1] (سنہ تصنیف ۱۰۴۱ھ)	مصنفہ شیخ عبد الرحمن چشتی امیٹھی مولفہ ۱۰۴۱ھ عہد شاہجہاں، کاتب مصباح الدین ولد محمد ناظم وتماد لی بموجب فرمایش منصور علی خاں برادر شیر دین خاں عامل پرگنہ مذکور۔ ۱۵ جمادی الثانی ۲۲ سنہ جلوس شاہ عالم مطابق ۱۱۹۴ھ

---

[1] مرات المخلوقات کا اصل نسخہ اب بھی شاہ عبد الرحمن چشتی کے خاندان میں محفوظ ہے۔ یہی شاہ صاحب کے پوتے بھی سید الظفر سب انسپکٹر پولیس کے پاس اسے دیکھا ہے، شاہ عبد الرحمن چشتی کا مزار دریائے گومتی کے کنارے موضع تیرگاؤں ضلع بارہ بنکی میں مرجع خاص و عام ہے، تخمیناً پچاس سال ہوئے جب مرات المخلوقات کا اردو ترجمہ شاہ عبد الرحمن کے پوتے نے کیا تھا، غالباً رائے بریلی کے کسی پریس نے اسے چھاپا تھا، اب کمیاب ہے، ہم نے یہ اردو ترجمہ بھی دیکھا تھا، مترجم اور پریس کا نام اس وقت حافظے سے محو ہو گیا۔

۲۳۔ کتاب در ذکر بعضے انواع حیوان و احکام خواص آن (مکتوبہ ۱۲۵۴ھ)

مصنف شیخ علی خوئینی، ناقص الآخر، ۱۲۵۴ھ میں محمد حنیف اللہ نے کتابت کی۔

۲۴۔ کتاب النجاۃ للشیخ الرئیس ابو علی سینا

کاتب کا نام اور سنہ کتابت نہیں ہے، آخر میں صرف اتنا لکھا ہے "قد تم علی ید الفلسفی الهندی" معلوم نہیں یہ فلسفی ہندی کون بزرگ ہیں ؟

۲۵۔ حلیۃ المتقین

ناقص الاول

۲۶۔ تفسیر بزبان فارسی مکتوبہ ۱۱۳۵ھ

ناقص اصل نام معلوم نہ ہو سکا، غالباً تفسیر حسینی ہے، آخر میں تحریر ہے "پنجشنبہ چہارم شہر جمادی الاول ۱۱۳۵ھ دار الخلافہ شاہجہان آباد"

۲۷۔ کتاب من لا یحضرہ الفقیہ ابن بابویہ القمی (مکتوبہ ۱۲۳۱ھ)

(دوسری جلد) ناقص الاول، کاتب علی صغیر ہمدانی بن علی ور دی ابن کلب علی، یکشنبہ ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۳۱ھ

۲۸۔ تلخیص المقال فی اسماء الرجال (مکتوبہ ۱۰۶۲ھ)

کاتب محمد حسین بن احمد منصور النجفی، سنہ کتابت ۱۱ جمادی الاول ۱۰۶۲ھ

۲۹۔ قصۃ الحسینؓ بن علی رضی اللہ عنہما و سبب خروجہ من مکۃ الی العراق

منقول از تاریخ ابن کثیر شامی، کتابت حال ہی کی ہے تاریخ ابن کثیر سے امام حسینؓ کے حالات کو نقل کیا گیا ہے

۳۰۔ کتاب در ادعیہ اعمال و اوراد عربی (۱۱۲۹ھ)

نامعلوم الاسم، اول و آخر ناقص، اسکے مصنف الشیخ ابراہیم الکفعمی صاحب المصباح معلوم ہوتے ہیں، اکثر صفحات پر محمد جعفر الحسینی کی مہر ۱۱۲۹ھ ثبت ہے

۳۱۔ ذخائر العقبیٰ فی المودۃ اہل القربیٰ لمحب الدین الطبری

اول و آخر ناقص، سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔

۳۲۔ منابر در مواعظ ماہ رمضان المبارک عربی	کاتب و سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا،
۳۳۔ دیوان ظہوری	کرم خوردہ مکتوبہ ۱۱۴۱ھ
۳۴۔ شرح تجرید الکلام	اول و آخر ناقص، کاتب سنہ کتابت کا کچھ پتہ نہیں چلتا،
۳۵۔ الملل والنحل علامہ شہرستانی (مکتوبہ ۱۲۶۳ھ)	سنہ کتابت ۱۲۶۳ھ، معروف و مشہور کتاب ہے،
۳۶۔ ہدایۃ الحکمۃ	کتابت ۱۲۶۵ھ
۳۷۔ مرآت البلاد (فارسی) (سنہ تصنیف ۱۲۳۵ھ)	مولفہ سید ہاشم علی الرضوی الکھنوی جو کہ غفران مآب علامہ سید دلدار علی کے معاصرین میں تھے، انکا سنہ ولادت ۱۱۷۰ھ ہے، سنہ کتابت معلوم نہیں ہو سکا، مگر یہ نسخہ مصنف ہی کے زمانے کا مکتوبہ ہے، ممکن ہے اصل نسخہ ہو، سرورق پر سلطان العلما کی مہر ۱۲۶۱ھ ثبت ہے، مصنف سید ہاشم علی نے بوقت تصنیف ۱۲۳۵ھ میں اپنی عمر پچاسی سال بتائی ہے،
۳۸۔ شرح مواقف دو جلدیں (سنہ تصنیف ۸۰۶ھ)	سیف الدین بن مولانا الشیخ البخاری اس کے کاتب ہیں، جنھوں نے شہر بخارا میں اسکی کتابت کی، ۸۰۶ھ میں جب شہر سمرقند میں اسکی تصنیف کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اس کے بعد ہی کا یہ مخطوطہ ہے، اس لیے باعتبار کتابت نہایت قدیم مخطوطہ ہے، اس کتاب پر "عزیز اللہ" کی مہر ہے، اور مہر کا سنہ ۱۱۲۲ھ ہے۔

۳۹۔ سوانح مولوی عبدالقادر	صاحب سوانح خود ہی اس کے کاتب اور مصنف ہیں، یہ شاہ عبدالعزیز دہلوی کے ہم عصر تھے، سنہ کتابت درج نہیں ہے،
۴۰۔ مصطلحات الشعراء	ناقص الآخر، سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا،
۴۱۔ فواتح	مصنف کے نام کا پتہ نہیں چلتا اور نہ سنہ کتابت کا غالباً یہ "فواتح میبذی" ہے۔
۴۲۔ تذکرۃ الموضوعات، شیخ محمد طاہر گجراتی (مکتوبہ ۱۰۲۲ھ)	اصل نام "الموضوعات فی الاحادیث المرفوعات" ہے سنہ کتابت ۱۰۲۲ھ ہے
۴۳۔ کامل شیخ بہائی علیہ الرحمہ	قدیم ترین نسخہ عہد شاہجہانی کا ہے، خاتمۂ کتاب کی عبارت درج ذیل ہے، "تمام شد کتاب مسمی بہ کامل بہائی روز ہفتہ ہم ماہ محرم الحرام ... سی وچہار در دار السرور برہان پور در حین کہ لشکر ... منلاً ابتلا یافتہ بود وجیو وشہزادہ خرم ومہابت خاں از یک دیگر گذشتہ بودند ونہایت پریشانی خاطر داشت در منزل جناب شوکت وعظمت جناب .... ثانی سلمہ اللہ تعالیٰ وابقاہ وانا العبد الحقیر المحتاج عفو ربہ الباری محمد زمان الحسینی السبزواری رب اغفر ......!"
۴۴۔ اصول کافی	ناکمل وکرم خوردہ
۴۵۔ کتاب بستان الفقیہ الزاہد ابوالليث نصیر بن محمد بن ابراہیم سمرقندی	سنہ کتابت نہیں ہے،

۴۶۔ شرح قصائد السبع المعلقات (مکتوبہ ۱۲۲۲ھ)	غیر مکمل، سنہ کتابت ۱۲۲۲ھ
۴۷۔ درۃ الغواص لاذہان الخواص	نامکمل سنہ کتابت معلوم نہ ہو سکا،
۴۸۔ سورۂ یٰسین و دعائے کمیل	کاتب شمس الدین عرف نواب بہادر، سنہ کتابت ۱۲۹۵ھ
۴۹۔ رسالہ در ظہور مزار شریف حضرت علیؓ در جوار بلخ	سلطان حسین بادشاہ ہرات کے عہد کا ایک مختصر رسالہ تقریباً سنہ ۸۰۰ھ کا مکتوبہ ہے،
۵۰۔ دیوان ابو الطیب المتنبی الشاعر	مکتوبہ ۱۲۱۰ھ (یوم جمعہ، شہر ربیع الاول) کاتب صلاح محمد خان عبد اللہ
۵۱۔ دیوان ابی العلاء المعری المسمی بسقط الزند	سنہ کتابت کا نہیں چل سکا
۵۲۔ زوال الشرح فی شرح منظومہ ابن فرح الاشبیلی	سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا
	(نوٹ) کتب نمبر ۵۰ تا ۵۲ پر مہر قائم آل محمد مدی" ثبت ہے۔
۵۳۔ تاریخ اخبار الاخیار	ہندوستان کے تمام سلاطین و فقرائے ہنود و اسلام کے ذکر پر مشتمل ہے، مصنف کا نام اور سنہ کتابت معلوم نہ ہو سکا یہ کتاب محدث دہلوی شیخ عبد الحق کی کتاب اخبار الاخیار نہیں ہے بلکہ دوسری کتاب ہے
۵۴۔ کتاب در علم طب	مصنف "طب اکبر" کی ایک تصنیف ہے، اول و آخر ناقص، سنہ کتابت اور کاتب کی تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا،
۵۵۔ تذکرۃ الائمہ ملا باقر مجلسی	پہلا صفحہ غائب ہے اور آخر کے چند صفحات بھی، سنہ کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔
۵۶۔ تفسیر خلاصۃ المنہج	ناتمام و نامکمل
۵۷۔ تفسیر عربی	ناقص الاول، دیگر تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔
۵۸۔ کتاب در تصوف و سلوک عربی	ناقص الاول و آخر، سنہ کتابت معلوم نہ ہو سکا۔

۵۹۔ کتاب در ادعیہ و اعمال و وظائف و اذکار و زیارات — نامعلوم الاسم، ناقص الاول

۶۰۔ تاریخ نامعلوم الاسم ضخیم (فارسی) — ایک قدیم مخطوطہ حضرت آدم سے لیکر مصنف نے اپنے عہد تک کے حالات و واقعات تحریر کیے ہیں،

۶۱۔ کتاب عربی (نامعلوم الاسم) — اول و آخر ناقص

۶۲۔ کتاب علم بیان (فارسی) — نامعلوم الاسم۔ اول و آخر ناقص

۶۳۔ کتاب در مطاعن صوفیہ — اول و آخر ناقص، نامعلوم الاسم

۶۴۔ مثنوی حکیم سنائی
۶۵۔ مثنوی نان وحلوا علامہ بہائی
۶۶۔ مثنوی شاہ درویش مولانا ہلالی
۶۷۔ مثنوی گلشن آرا،
۶۸۔ مثنوی ارشاد السالکین
۶۹۔ انتخاب مثنوی مولوی روم منتخبہ مولانا جامی مکتوبہ ۱۰۹۶ھ

— یہ چھ کتابیں ایک شیرازہ میں منسلک ہیں، کاتب کا نام "محمد غیور" اور سنہ کتابت ۲۱ سنہ جلوس عالمگیری مطابق ۱۰۹۸ھ

۷۰۔ تاریخ گلستاں (مکمل) — مصنفہ محمد مستجاب خاں بن حافظ رحمت اللہ خاں سنہ کتابت نہیں ہے، حافظ رحمت خاں کے عہد کے واقعات وحالات پر مشتمل ہے،

محبت خاں محبت

اور

ان کا کلام

از

جناب ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ادیب

(۲)

مثنوی "اسرار محبت" محبت خاں محبت کی مشہور تصنیف ہے، اسی کے ذریعہ تاریخ اردو ادب میں محبت کا تعارف ہوا ہے، اس وقت اسرار محبت کے تین قلمی نسخے محفوظ ہیں، ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے، دوسرا نسخہ سرسالار جنگ حیدر آباد کے کتب خانے میں اور تیسرا انجمن ترقی اردو کراچی کے ذخیرۂ کتب میں، حسرت موہانی نے اس مثنوی کو مثنوی سراپا سوز اور مثنوی طلعت الشمس کے ساتھ طبع کرایا ہے، یہ مثنوی محبت کے دیوان کی طرح غیر معروف نہیں ہے بعض اہل قلم اس کا تعارف کرا چکے ہیں،

اس وقت میرے پیش نظر مثنوی اسرار محبت کا نسخہ رامپور ہے، یہ مخطوطہ دریائے عشق بکٹ کہانی، مثنوی لطعت، مثنوی افوز، قصہ سوداگر بچہ اور بارہ ماسہ کے ساتھ مجلد ہے۔ اس پوری جلد کا نام اسرار محبت رکھدیا گیا ہے، شاید اس لیے ایسا کیا گیا کہ اس مجلد کے سلسلہ مثنویات میں پہلی مثنوی اسرار محبت ہے۔ کتاب پر ایک مختصر تحریر ہے جس کے مطابق

ان مثنویات کو جمع کرنے کی غرض یہ تھی کہ عشقیہ اشعار جمع کیے جائیں، کتاب پر نہ تمہید ہے نہ ترقیمہ، اس لیے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسرار محبت کو کب اور کس نے نقل کیا، کاتب کی لاپروائی کا ثبوت ہر صفحے پر موجود ہے، کتابت نہایت بدنما اور بے زیب ہے، ایسی تحریر کو کتابت کہنا ذوق سلیم پر بار ہے کاتب نے ضمنی عنوانات کے لیے بقدر دو سطر کے جگہ چھوڑ دی تھی، مگر عنوانات نہیں لکھے لیکن مخطوطہ اچھی حالت میں ہے،

مثنوی میں کل پانچسو اکیانوے اشعار پچیس صفحات پر مشتمل ہے، مثنوی کا سنہ تصنیف مندرجہ ذیل مصرعۂ تاریخ کے مطابق ۱۱۹۷ھ مطابق ۸۳-۱۷۸۲ء ہے۔

توقع ہے جو کوئی اہل نظر ہو	محبت سے کرے اس پر نظر دو
کہی تاریخ اس کی یہ بصنعت	عجب قصہ ہے اسرار محبت

۱۱۹۷ھ

اس اعتبار سے یہ مثنوی، سحرالبیان سے دو سال قبل تصنیف ہوئی،

مثنوی محبت میں سسی پنوں کا مشہور قصۂ عشق نظم کیا گیا ہے۔ اصل قصہ نثر میں تھا، مسٹر جانسن (دمتا زالدولہ) کی فرمایش پر محبت نے اسے نظم کا جامہ پہنایا، مندرجہ ذیل اشعار میں جانسن سے تعلقات اور اسرار محبت کی وجہ تصنیف کا ذکر کرتے ہیں ؎

کہ فرمایش ہے یہ اک نکتہ داں کی	شفیق و مہربان و قدرداں کی
وہ مثل جان و عالم جملہ تن ہے	تبھی نام اس کا مسٹر جانسن ہے
کہی القصہ پھر بندے سے یہ بات	اگر ضائع نہ ہووے اس میں اوقات
تو مضمون کرکے اس قصے کا معلوم	یہ ہے منظور کر تو اس کو منظوم
یہ بات اتنے لئے تجھ سے کہی ہے	کہ مشق اس کی بہت تجھکو رہی ہے
سو اس کی رغبت دل کرکے معلوم	کیا میں نے اس افسانے کو منظوم

مثنوی کا آغاز محبت کی تعریف سے ہوتا ہے ؂

محبت نام اور ہر دل نگیں ہے　　محبت سے کوئی خالی نہیں ہے

جو سمجھو ذات مطلق فی الحقیقت　　محبت ہے محبت ہے محبت

محبت بوئے گل رنگ گل ہے محبت　　محبت جزو کل اور کل ہر محبت

محبت باطن اور ظاہر محبت　　محبت اول اور آخر محبت

محبت چشم کو دے اشکباری　　محبت دل کو سونپے بیقراری

اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت میں نو اشعار ہیں ؂

محمد مصطفیٰ رنگِ گلِ عشق　　دو زلف ان کی بہارِ سنبلِ عشق

پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت ہے ؂

اسے ہے عشق جو نفس نبی ہے　　اسے ہے عشق جو مولا علی ہے

اس کے بعد اصل قصے کی طرف گریز ہے۔

بیاں کرتا ہوں اب اسرارِ عشق آہ　　عجائب رنگ کے ہیں کارِ عشق آہ

محبت نے بہت بیجاں کیے ہیں　　کہوں کیا جو جو کارستاں کیے ہیں

انھیں میں سے یہ ایک افسانۂ عشق　　بیاں کرتا ہوں میں دیوانۂ عشق

مثنوی کے قصے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، کیونکہ مصنف نے اس مشہور خاص و عام قصے کو دلچسپ انداز میں پیش نہیں کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیش نظر کوئی نثری قصہ تھا، مگر انھوں نے اس پر مثنوی کی بنیاد رکھدی، اس طرح ان کا قلم مقید ہوگیا، اور وہ اس میں گل نہیں کھلا سکے، اس کے علاوہ ایک بات اور بھی قیاس میں آتی ہے، مصنف کا مقصد محبت کے اسرار بیان کرنا تھا، اس کے لیے انھوں نے سسی پنوں کا قصے کا

انتخاب کیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مثنوی منظر نگاری، عصری، رسوم و طرز معاشرت اور عشقی دلچسپ جذبات سے خالی ہے، اور مثنوی میر حسن کی خصوصیات اس میں نہیں ہیں۔

اس مثنوی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

(۱) سسی کا سراپا (۲) پنوں کا سراپا، (۳) واردات عشق

سراپا، ۹۰ اشعار میں ہے، مصنف نے اس میں پورا زور قلم صرف کیا ہے، اور واسوخت کے انداز میں اشعار لکھے ہیں، پنوں کا سراپا مختصر مگر پر اثر ہے، تیسرا حصہ جسے واردات عشق سے موسوم کیا گیا ہے، مثنوی کی معراج فن ہے، اس میں وصل و فراق کا بیان، اسرار عشق کا اظہار، سسی کے جذبات کی مصوری وغیرہ ہیں جو اس کو اعلیٰ پائے کی مثنویات کی صف میں لے آتی ہیں، مثنوی کے ان تینوں حصوں کی منظر نگاری اور جزئیات نگاری سحر بیانی کی طرح ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے، البتہ میر حسن کی زبان زیادہ بامحاورہ اور ٹکسالی ہے۔ اور اس زمانہ کی زبان کے لحاظ سے مثنوی اسرار محبت کم رتبہ نہیں ہے، اردو مثنوی کے ارتقا میں دونوں کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، اب اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں، سسی کا سراپا:

سراپا کیا لکھوں اس شعلہ رو کا ۔۔۔ کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا
عیاں یوں موئے سر تھے عنبر آلود ۔۔۔ کہ جیسے شمع کے شعلے پہ ہو دود
پریشاں رخ پہ یوں زلفیں تھیں یکسر ۔۔۔ رگ ابر سیہ جیسے ہو مہ پر
ڈوپٹا چاند تارے کا زری بافت ۔۔۔ جو اوڑھے تھی کر اپنی پٹیاں صاف
سماں ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر ۔۔۔ شب دیجور میں چمکے ہیں اختر
گندھی چوٹی نظر اس شکل آوے ۔۔۔ کہ جوں مار سیہ لہریں دکھاوے
بہت سے تھا ولوں کا اس میں مسکن ۔۔۔ اپنبھا ہے کہ اک سانپ لہر گئی ہے

دو کیفی انکھڑیاں تھیں صورتِ جام
ولیکن ان سے کیا ہو نسبتِ جام

نگہ بد ہر فلک کی اس جبیں پہ
کہ اک ابر سیہ جیسے ہو مہ پر

وہ بینی اس مہ دلجو نے پائی
کہ جن سے ان کو خود بینی سکھائی

وہ دنداں آبدار اس سیمبر کے
کہ سوراخ ان سے ہیں دل میں گہر کے

کروں کیا خوبی لب کی میں تقریر
قیامت اس پہ تھی مستی کی تحریر

تبسم میں نظر اس رنگ وہ آئے
کہ غنچہ جیسے نافران کا کھل جائے

زباں کھولوں اگر وصفِ دہاں پر
سخن ہو جائے گم میری زباں پر

کوئے کیا کیا تجھکاوے عشق اس آہ
جسے چاہ زنخ کی اس کے ہو چاہ

نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی
وہ ہے گویا صراحی دار موتی

حنا سے سرخ تھا یوں پنجۂ ماہ
کہ جوں خوشخط لکھیں سرخی سے بسم اللہ

جو وصف اس ساق سیمیں کا سنے ہے
بحسرت شمع رو رو سر دھنے ہے

قدموزوں وہ اپنا جب دکھاجائے
اور اس کو خندقِ پا تک نظر آئے

تو حیرت سے ہوں یہ سب کچھ پہ کہیے
بن شمشاد میں غنچے نہ دیکھے

جھنک خلخال کی تھی کیا قیامت
کہ ہر سو جس سے برپا تھی قیامت

جو ہو وہ رشک فرش گل پہ گرم رفتار
رگِ گل پشت پا سے ہو نمودار

نہ سج دھج اس کی ہو مانی سے تحریر
وہ گویا حسن کی تھی ایک تصویر

مجنوں کا سراپا :

یہ سج دھج اور یہ محبوب صورت
کہ تھا ایسا نہ کوئی خوبصورت

دو زلف و چشم و ابرو و قد و قامت
بلائے فتنہ و آفت قیامت

سسی کے فراق میں پنوں میں حالت ؎

کبھی تو بستر غم پر بلکنا کبھی بالیں پہ سر دے دے پٹکنا
کبھی رو رو کے آہیں سرد بھرنا کبھی کچھ سوچ کر دل ہی دل میں کرنا
غرض دشوار تھا آرام پانا کبھی اٹھنا کبھی پھر بیٹھ جانا
کبھی دو دو پہر آوارہ پھرنا کبھی اٹھنا تو پھر غش کھا کے گرنا
کبھی حیران ہو اک سمت تکنا کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا

ایک موقع پر سسی دل ہی دل میں منصوبے باندھ رہی ہے کہ وہ پنوں سے بوقت ملاقات کیا کہے گی۔

یہ کہتی تھی کہ اب جا کر ملوں گی کل ہی دیکھو تو کیا کیا کچھ کروں گی
کہوں گی میں نہ کچھ غم ضبط کر کے نہ بولوں گی کوئی دم ضبط کر کے
تو پھر یہ سن کے وہ کھاوے گا قسمیں کہے گا میں بھی تھا گویا قفس میں
ندامت ہے نہایت اس کی مجھکو جو آئندہ ہوا ایسا تو قسم لو
یہ سن کے اس سے مل جاؤنگی پھر میں نہ شکوہ منہ پہ کچھ لاؤنگی پھر میں

اصل قصے کے مطابق سسی و پنوں کی موت ہو جاتی ہے اور وہ اس دنیا سے ناکام و نامراد جاتے ہیں۔ محبت نے یہ دردناک منظر صرف دو اشعار میں پیش کیا ہے ؎

نہ دونوں نے کہی آپس میں کچھ بات رہی بس حشر پر موقوف ملاقات
گئے حسرت بھرے دونوں جہاں سے دکیونکر غم ہو ان کی داستاں سے

اس اختصار میں زندگی کے کتنے افسانے پوشیدہ ہیں،

محبت خاں محبت کی وفات لکھنؤ میں ہوئی اور متصل وزیر باغ کشور گنج میں دفن ہوئے، سنہ وفات میں اختلاف ہے، تذکرہ نگاروں کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ ان کی وفات ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء میں ہوئی، ہمارے خیال میں محبت خاں محبت کی تاریخ وفات ۱۳ صفر ۱۲۲۴ھ مطابق ۳۰ مارچ ۱۸۰۹ء زیادہ صحیح ہے جو الطاف علی صاحب نے حیات حافظ رحمت خاں میں درج کی ہے۔

قاضی مبارک اور انکی شرح سلم

از جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب ایم اے استاد شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی

"قاضی مبارک اور ان کی شرح سلم" کے عنوان سے مفتی محمد رضا صاحب انصاری فرنگی محلی کا ایک مضمون شائع شدہ معارف مارچ ۱۹۶۴ء نظر سے گزرا، اسے پڑھ کر تعجب بھی ہوا اور مسرت بھی، تعجب اس لیے کہ اس "عہد تنویر" میں بھی جبکہ قدیم معقولات کو "نامعقولیت" کے اور منطق کو "کج بحثی" کے مترادف سمجھا جاتا ہے، اس متاعِ کاسد کے خریدار باقی ہیں اور مسرت اس لیے کہ

بہر رخے کہ می گیرند کالائے وفا خوب است پس از مدت گزار افتاد برما کاروانے را

اس زمانے میں جبکہ ہم اپنے گذشتہ ثقافتی کمالات سے نامانوس ہوتے جا رہے ہیں، اس قسم کے مضامین کی اشاعت انتہائی مفید ہوگی، ع

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

اس عاجز کا خیال ہے کہ ہماری قدیم معقولات محض "نامعقول" نہیں تھی، بلکہ عقل و دانش کا عنصر بھی اس میں موجود تھا، اور غالباً بڑی وافر مقدار میں، اسی نے ہمارے دو "علامی" [علامی ابوالفضل اور علامی سعد اللہ خاں) نیز علامی افضل خاں پیدا کیے، جن کے حسن تدبیر نے ملک کی عظمت و شوکت میں چار چاند لگا دیے تھے، وہی اس کی مزعومہ کمزوریاں جن کا پچھلی صدی سے مذاق اڑایا جا رہا ہے، تو ہر شے میں افراط و توغل بجائے خود افساد کا باعث بن جاتے ہیں، دور کیوں جایئے، جدید سائنس ہی کو لے لیجیے، جس پر عہد حاضر کی عظمت کا دارو

ہے، اور جس نے آج کے انسان کو "فوق الانسان" بنا دیا ہے، مگر افراط و توغل نے اس کی افادیت کو بھی مشکوک بنا دیا، حالانکہ سائنس کی افادیت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا اس کی تضحیک کا تو سوال ہی کیا۔

مگر قدیم معقولات کے خلاف اس شدت سے پروپیگنڈا کیا گیا کہ آخر اس کا جڑ پیڑ ہی کھود ڈالا، ایسے ہمت شکن حالات میں اس فن شریف کے علمبرداروں کا ذکر واذکار بسا غنیمت ہے۔

۲۔ جناب مفتی محمد رضا صاحب کا مضمون بڑا معلومات افزا ہے، البتہ قاضی مبارک کے سلسلۂ تلمذ کے بارے میں دو کلمے عرض کرتا ہوں۔

مفتی صاحب نے قاضی مبارک کے تلمذ کے دو سلسلے بیان کئے ہیں۔

ا۔ پہلے سلسلے کی رو سے ان کا شجرۂ تلمذ ملا قطب الدین شہید سہالویؒ تک پہنچتا ہے اور اس طرح وہ خاندان فرنگی محل میں منسلک ہو جاتے ہیں، قاضی مبارک شاگرد تھے ملا قطب الدین گوپاموی کے، وہ شاگرد تھے اپنے پدر بزرگوار قاضی شہاب الدین گوپاموی کے اور وہ شاگرد تھے ملا قطب الدین شہید سہالویؒ کے۔

ب۔ دوسرے سلسلے کی رو سے ان کا شجرۂ تلمذ میر زاہد ہرویؒ تک پہونچتا ہے:
قاضی مبارک شاگرد تھے ملا صالح کے، اور وہ شاگرد تھے میر زاہد کے، نیز قاضی مبارک شاگرد تھے، ملا قطب الدین گوپاموی کے، جنھوں نے ملا صالح سے میر زاہد کی کتابوں کی سند اور اجازت لی تھی، اور ملا صالح شاگرد تھے میر زاہد کے۔

لیکن ان دو سلسلوں کے علاوہ ایک تیسرا سلسلہ بھی ہے، جس کی رو سے قاضی مبارک کا شجرۂ تلمذ علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی تک پہنچتا ہے، مگر مفتی صاحب نے دانستہ یا نادانستہ

اسے بیان کرنے کی زحمت نہیں فرمائی، اس معروض کی جرأت اس لیے ہوئی کہ میر غلام علی آزاد کا تذکرہ "مآثر الکرام" مفتی صاحب کے پیش نظر تھا اور اس کا انھوں نے اپنے فاضلانہ مضمون میں حوالہ دیا ہے:

"سلم اور مسلم کے مصنف ملا محب اللہ بہاری حسب تصریح میر غلام علی آزاد بلگرامی (مآثر الکرام)..... ملا نظام الدین فرنگی محلی کے والد ماجد ملا قطب الدین شہید سہالوی کے بھی شاگرد تھے،" [۱]

اور اسی مآثر الکرام میں ملا قطب الدین گوپاموی کے حال میں مرقوم ہے:-

"مولوی قطب الدین گوپاموی..... پدرش قاضی شہاب الدین از علمائے اعلام وقت بود. کسب کمال از خدمت مولوی عبد الرحیم مراد آبادی تلمیذ مولوی عبد الحکیم سیالکوٹی نمود، و در جمیع علوم سیا ہئیت و ہندسہ عدیم المثل بود. وفاتش در عشرہ ثالثہ بعد مائۃ والف واقع شد. مولوی قطب الدین شاگرد پدر بزرگوار و در ہمہ علوم معقول و منقول سرآمد روزگار بود. و بحکم ارشاد در فنون ریاضی رایت مہارت بآسمان می افراخت و اہل مستفیدان را بہ اشعۂ کمال لبریز می ساخت. بست و پنجم رمضان سنہ ۱۱۲۱ احدی و ستین و مائۃ والف در آغوش بہشت آرمید -" [۲]

یعنی قاضی مبارک شاگرد تھے مولوی قطب الدین گوپاموی کے [یہ تلمذ متفق علیہ ہے] مولوی قطب الدین گوپاموی شاگرد تھے اپنے پدر بزرگوار قاضی شہاب الدین گوپاموی کے، قاضی شہاب الدین شاگرد تھے مولوی عبد الرحیم مراد آبادی کے اور مولوی عبد الرحیم شاگرد تھے علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی کے۔

۳- ویسے ان تینوں سلسلوں میں کوئی منافات نہیں ہے، یہ اس عہد کا عام

---

[۱] ملاحظہ ہو معارف مارچ ۹۴ء ص ۱۹۰ [۲] مآثر الکرام ص ۳۰۰

دستور تھا کہ طالب علم

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم

کے قائل اور عامل تھے۔ مثلاً میر سید اسماعیل بلگرامی نے پہلے مفتی عبد السلام دیوی سے کسب فیض کیا، اور پھر علامہ عبد الحکیم سیالکوٹیؒ سے [اور یہ دونوں اپنے عہد کے فحول علما میں سے تھے][1]

ملا فاضل بدخشی نے جو ملا صادق حلوائی کے شاگرد تھے، توران جا کر پہلے مرزا جان شیرازی اور پھر انکے شاگرد رشید ملا یوسف کوسج سے پڑھا، اور پھر ہندوستان آکر ملا جمال لاہوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔[2] اسی طرح میر فتح اللہ شیرازی نے [جنھوں نے ہندوستان میں علماے ولایت کی کتب معقولات کو رواج دیا] پہلے خواجہ جمال الدین محمود سے پڑھا (جو محقق دوانی کے شاگرد تھے) پھر امیر غیاث الدین منصور سے (جو محقق دوانی کے حریف امیر صدر الدین شیرازی کے شاگرد اور صاحبزادے تھے۔[3]

البتہ تذکرہ نگاروں نے تصریح نہیں کی کہ ان حضرات نے فاتحۂ فراغ کس استاد کی خدمت میں پڑھا۔

رہی یہ بات کہ ان تینوں سلسلوں میں کس سلسلے کا رنگ قاضی مبارک نے قبول کیا) کا تعین بہایت مشکل ہے۔ ویسے قرائن اس جانب مشیر ہیں کہ انھوں نے علامہ عبد الحکیم سیالکوٹیؒ کی تحقیقات انیقہ سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔

---

[1] مآثر الکرام ص ۲۴۳ [2] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ص ۳۴۰

[3] مآثر الکرام ص ۲۳۷- ۲۳۶

آثار علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

سیدنا المحترم زید لطفکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

والا نامہ باعث سرفرازی ہوا، جو کچھ جناب عالی نے مولوی محمد یوسف صاحب جالندھری پر مراحم فرمائے اور جو کچھ معروضات کی طرف التفات کو کام میں لایا گیا، ان کا تہِ دل سے شکر گذار ہوں، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی تشریف فرما ہوئے تھے، ان حضرات کی عنایتوں کا بھی شکر گذار ہوں۔

یظن الناس بی خیرا وانی لشر الناس ان لم یعف عنی

یہ نالائق اپنے بزرگوں اور عنایت فرماؤں کی خدمت میں بجز دعا گوئی اور کیا کر سکتا ہے۔ وعلی الدعاء یعول المسکین

لاخیل عندک تھدیھا ولا مال فلیسعد النطق ان لم یسعد الحال

اگر فلک نے کچھ بھی اطمینان دیا تو انشاء اللہ کما ینبغی اصلاحات ظہور پذیر ہونگی، تاہم بہت سی باتوں میں اصلاحات ہو رہی ہیں، امیدوار ہوں کہ دعوات صالحہ اور

خدماتِ لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں گے۔ والسلام

ننگ اکابر ۔ حسین احمد غفرلہٗ

دارالعلوم دیوبند ۔ ۱۷ محرم الحرام ۱۳۷۰ھ

از دیوبند

۲۲ رجب المرجب ۱۳۶۹ھ

محترم المقام زید مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔ مزاج گرامی، والانامہ صادر ہوکر باعث سرفرازی و عزت افزائی ہوا، یاد آوری کا شکریہ، جناب مولانا حمید الدین صاحب مفسرؒ کے وصال کی اطلاع سے افسوس ہوا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دے، آمین ۔ بہرحال صبر کی ضرورت ہے، مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ ۔

آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، مجھکو خود مولانا محمد عرفان صاحب سے بھی معلوم ہو چکا تھا جس سے مجھکو بھی ایک گونہ اطمینان ہوگیا ہے،

دعوات صالحہ وکار لائقہ سے فراموش نہ فرمائیں ۔ والسلام مع الاحترام ،

واقفین و پرسان حال حضرات کی خدمت میں سلام مسنون کہہ دیجئے

ننگ اسلاف

حسین احمد غفرلہٗ

سیدنا المحترم زادت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ ۔ مزاج مبارک، عرصہ سے نعمت ملاقات سے محروم ہوں، اس وقت کتابی ملاقات کو ایک بہانہ مل گیا ہے، اس لیے حاضر ہوتا ہوں۔

گورکھپور کے نوجوان اور سچے جذبات والے طلبہ کا عریضہ منسلک ہے، اصرار یہ ہے کہ غازی مصطفیٰ کمال پاشا کے متعلق ایک مفصل بیان لکھا جائے، میں دنیائے تاریخ اور تحریر و تقریر میں جس قدر لنگ اور عاجز ہوں، آپ کے سامنے بیان کی حاجت نہیں، پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ انتہائی مصروفیت کی بنا پر بالکل ہی فراغت نہیں، غازی مصطفیٰ کمال پاشا ترکی میں جنگ عمومی سے پہلے کوئی امتیازی شان نہیں رکھتے تھے، جب تک جنگ رہی جب تک بھی یہ زود یا خمول ہی میں روپوش رہے، ان کی شہرت جنگ کے بعد ہوئی، اس لیے میں ان کی تاریخ قدیم سے بالکل ناواقف ہوں، اس جنگ کے بعد مجھکو ان دیار میں جانے کی نوبت ہی نہیں آئی، حجاز میں دو مرتبہ جانا ہوا، تو اولاً تو نہایت سرسری طور پر تھا، ثانیاً علائق منقطع ہوچکے تھے، اس لیے کوئی صورت مجھکو بجز ہندوستان کے اخبارات کے ذرائع کے حاصل نہیں ہوسکے ان اخبارات کے دیکھنے کی مجھکو نہ فرصت ملتی ہے، نہ اسفار اور مشاغل ان تک پہنچنے دیتے ہیں، بنا بریں مجھکو پختہ یقین ہے کہ اس مسئلہ میں بھی معلومات کا ذخیرہ جناب کے پاس میری معلومات سے ہزاروں درجہ زائد ہوگا،

ان طلبہ کا حسن ظن یہ ہے کہ اگر میں آنجناب سے درخواست کروں گا تو درخواست ٹھکرائی نہ جائے گی، (خدا کرے کہ یہ حسن ظن صحیح ہو، اور واقعیت کا جامہ رکھتا ہو) بناءً علیہ میں ان کی خواست کو پیش کرتا ہوا پرزور سفارش کرتا ہوں اور امیدوار ہوں کہ اس کو شرف قبولیت سے نوازا جائے گا،

متحدہ قومیت کے متعلق اسی زمانہ میں کچھ قلمبند کیا تھا اور کچھ بعد میں مگر طباعت کی مشکلات وغیرہ سے بہت دیر میں تیار ہوکر شائع ہوسکا، ملاحظہ کے لیے ارسال کرتا ہوں، اگر بوقت فرصت ملاحظہ فرماکر کچھ اصلاحات سے مطلع فرماسکیں تو عین بندہ نوازی ہوگی۔

مولانا مسعود علی صاحب اور مسٹر عزیز صاحب اور دیگر حضرات سے سلام مسنون عرض کردیں۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

وارد حال سلہٹ نئی سڑک، ۲۰ رمضان المبارک ۵۹ھ

محترم المقام زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل کا انتخاب آنجناب کی سپرد ہوا معلوم ہوکر مناسب معلوم ہوا کہ مولانا عبد الحلیم الصدیقی صاحب کی جانب توجہات عالیہ منعطف کراؤں، موصوف کی ذات محتاج تعارف نہیں، ان کی ادبی قابلیت، قومی خدمات سے آپ مجھ سے زیادہ واقف ہوں گے، میں نے جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب بیرسٹرایٹ لا چھپرا کی خدمت میں بھی ایک عریضہ اسی سلسلہ میں لکھا ہے۔ امید ہے کہ جناب والا مولانا عبد الحلیم صاحب کی کامیابی کا خیال فرمائیں گے، اگر خدانخواستہ ان کے لیے کوئی مجبوری ہو تو پھر مولانا اصغر حسین صاحب قائم مقام پرنسپل شمس الہدیٰ کو ترجیح دیجائے جو اس منصب کے اہل ہیں، اور کافی تجربہ رکھتے ہیں۔

مولانا عبد الحلیم صاحب علمی طبقہ میں باوجود اپنی مختلف فنون کی اعلیٰ قابلیتوں کے نہایت تکالیف سے زندگی بسر کر رہے ہیں، آنجناب کی ادنیٰ توجہ سے ان کی مشکلات کا حل ہوسکتا ہے۔ مدرسہ کی خدمات وہ انشاء اللہ باحسن وجوہ انجام دیں گے۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ

صدر جمعیت علمائے ہند وصدر المدرسین دیوبند

۲۵ شعبان ۶۰ھ

سیدنا المحترم زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج مبارک۔ والانامہ انتظار شدید کے ایسے وقت میں باعث سرفرازی ہوا جب کہ میں انتہائی مصروفیت میں تھا، اختتام بخاری شریف تک تو یہ حالت رہی، اس کے بعد ہی متصلاً متعلقین کو ٹانڈہ پہنچانا پڑا، اور راستہ ہی میں ہلال رمضان بھی دیکھا گیا، ان وجوہ سے عریضہ کے ارسال میں تاخیر ہوئی،

محترما! مجھکو اس عرضی کے تحریر میں پس وپیش ہے جس کو آنجناب نے ارشاد فرمایا ہے، یہ امر واقعی ہے کہ عزیزم فرید احمد دارالعلوم میں تحصیل علم کر رہا ہے، اس سال میں اس نے جلالین وغیرہ کا امتحان دیا ہے، اور یہ امر بھی واقعی ہے کہ میرے بڑے بھائی مولوی محمد صدیق صاحب مرحوم کا وظیفہ ریاست کی طرف سے اقامت مدینہ منورہ کی بنا پر بطور دعاگوئی مقرر ہوا تھا، ان کے وفات کے بعد یہ وظیفہ ان کے اکلوتے لڑکے وحید احمد مرحوم کے نام پر جاری ہوگیا، وہ مدینہ منورہ سے طلب علم کے لیے دیوبند بھیجا گیا، اس کا وظیفہ وہاں وصول ہوتا تھا، اور اس کے اخراجات میں صرف ہوتا تھا، وہ طلب علم ہی کے زمانہ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جبکہ وہ ۱۳۳۴ھ میں حجاز جا رہے تھے، مدینہ منورہ گیا، اور واپسی پر انکے ساتھ ہی مالٹا گیا، اور پھر وہاں سے واپسی پر دیوبند میں اس نے کتابیں پوری کیں، اس کو عربی اور ترکی ادبیات سے خصوصی شغف تھا، جرمنی اور فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں بھی اس نے مہارت حاصل کرلی تھی، اس زمانہ طالبعلمی میں اس کا وظیفہ بھوپال ہی سے ملتا رہا، اس کا یہاں ہی فراغت کے بعد رشتہ داروں میں نکاح کردیا گیا، اور وہ کچھ عرصہ کے بعد مدرسہ عزیزیہ بہار میں مدرس ہوگیا، اس عرصہ میں وظیفہ مذکور بھی جاری رہا، مگر اکثر یہ ہوتا تھا کہ مدینہ منورہ میں وصول ہوتا تھا، اور یہاں آجاتا تھا، چند سال

کے بعد جبکہ وہ مدرسہ عزیزیہ میں مدرس تھا وہاں ہی بیمار ہوا اور بیماری کی حالت میں ٹانڈہ آیا اور وفات پا گیا، اس نے پانچ بچے چھوٹے چھوٹے اور بیوہ چھوڑے، ان بچوں کی تربیت اور نگہداشت کا کوئی ذریعہ دوسرا نہ تھا مجھکو ہی سب بار اٹھانا پڑا، واقعہ کی کیفیت حضرت قاضی محمد حسن صاحب مرحوم کے ذریعہ سے سرکار عالیہ ریاست میں پیش کرائی گئی تو یہ عـہ ماہوار عزیزم فرید احمد سلمہ کے نام جاری ہو گئے، اس کی پیدائش اور اسکے تمام بھائیوں بہنوں کی یہاں ہی ہوئی ہے، یہ حجاز ضرور گیا ہے مگر صرف ایام حج میں مع اپنی والدہ اور والد مرحوم قیام کرکے واپس آگیا تھا، اسوقت اسکی عمر بہت تھوڑی تھی، اب یہ لکھنا کہ وہ مدینہ منورہ سے طلب علم کے لیے آیا ہے، بالکل خلاف واقعہ اور کذب ہے، اب آپ ہی فرمائیے کہ رہ گیا ہے، مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ عـہ ماہوار کے لیے جھوٹی عرضی دوں اور دھوکے سے اسکو حاصل کروں، اب تک جو کچھ ہوا مجھکو معلوم نہیں ہے کہ وہ کسی غیر واقعی امر کی بنا پر حاصل کیا گیا ہو، ظاہر ہے کہ جس طرح تمام مصاریف انجام پاتے ہیں باعانۃ اللہ پا جایا کرینگے، یہ عـہ ایسی مقدار نہیں ہیں کہ بغیر انکے زندگی بسر نہ ہو سکے، ابتک میں نے فرید احمد مذکور اور اس کے بھائی بہنوں کا بوجھ دار العلوم پر بھی نہیں ڈالا ہے جس طرح پر ہو سکتا ہے چلا رہا ہوں، اگر بغیر دروغ گوئی کے کام چل سکے فبہا ونعمت، ورنہ میری سمجھ میں تو یہ مضمون جو کہ جنابنے ارشاد فرمایا ہے نہیں آیا، آئندہ جو رائے عالی ہو اس سے مطلع فرمائیں، عنایت ہوگی

مولوی عبد الرحمن منظر صاحب کے معاملہ میں مزید توجہ فرمانے کی ضرورت ہے، بالخصوص جبکہ وہ الزامات جو کہ قادیانیوں نے خلاف واقعات لگاکر ان کو فیل کرایا تھا، اور بالکل خلاف قانون انکو برخاست کرایا گیا، اگر ممکن ہو تو اس میں انکی اعانت فرمائیے واللہ فی عون العبد ما کان العبد فی عون اخیہ المسلم۔ (الحدیث) دعوات صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

دار العلوم دیوبند

۱۳؍ رمضان المبارک سنہ ۶۶ھ

سیدنا المحترم زادت معالیکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج مبارک، عدیم الفرصتی کی بنا پر اب تک کبھی عریضہ پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی، امید وار معافی ہوں

اس وقت چند ضرورتوں کی بنا پر ارسال عریضہ کا شرف حاصل کرتا ہوں،

(۱) میرے بھتیجے وحید احمد مرحوم کے نام پر اسکے والد مرحوم اخوی مولانا محمد صدیق صاحب مرحوم کا وظیفہ منتقل کر دیا گیا تھا جناب کو معلوم ہوگا کہ وحید احمد مرحوم ہمارے مدرسہ عزیزیہ میں تعلیمی فرائض عرصہ تک انجام دیتا رہا، کئی برس کا عرصہ ہوتا ہے کہ اسکا انتقال ہو گیا، اس نے تین لڑکے اور ۲ لڑکیاں اور بیوہ چھوڑا تھا، چونکہ یہ سب نابالغ اور محتاج تعلیم تھے، اسلیے کوشش کی گئی کہ وہ وظیفہ ماہوار مرحوم کے بڑے لڑکے فرید احمد کے نام منتقل کر دیا جائے تاکہ مصارف تعلیم میں فی الجملہ اعانت ہو، چنانچہ کامیابی ہوئی اور وظیفہ عزیز موصوف کے نام جاری کر دیا گیا، حضرت قاضی صاحب مرحوم چھ ماہ یا ۸ ماہ کے بعد مجموعی مقدار بھیجدیا کرتے تھے، مگر اب تقریباً ایک سال سے یہ مقدار نہیں آئی، عزیز موصوف مشکوٰۃ شریف جلالین شریف وغیرہ کتابیں پڑھتا ہے، یہ وظیفہ وظائف مدینہ منورہ کے ماتحت ہے، اس لیے آنجناب کو توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں، اور امید وار ہوں کہ اس کو دریافت فرما کر عزیز موصوف کے نام پر دار العلوم دیوبند میں ارسال فرمانے کا حکم فرما دیں۔

(۲) دوسری چیز نہایت اہم اور بہت زیادہ قابل توجہ ہے کہ مولانا مظہر حسن صاحب مرحوم مکہ معظمہ میں عہدۂ اہتمام وظائف حرمین شریفین پر مقرر تھے، انکے وصال کے بعد مولانا نظیر احمد صاحب ابن مولانا الٰہی بخش صاحب فیض آبادی محشی حمد اللہ وغیرہ مقرر ہوئے، وہ جبکہ زیادہ تر ضعیف ہو گئے تو مولوی عبد اللہ مظہر صاحب جو کہ مولانا مظہر حسن صاحب کے بڑے صاحبزادے ہیں، مقرر کیے گئے مگر ایام جنگ عظیم میں قادیانی سازش کی بنا پر ان کو برخاست کر دیا گیا، پوری تفصیل ان کی تحریر مسلک سے معلوم ہوگی، میں امید وار ہوں کہ آنجناب کی ادنی توجہ اس معاملہ میں تمام مشکلات کو حل دیگی، اس لیے مسلک تحریر پیش کرتا ہوا ملتجی ہوں کہ اس معاملہ میں غیر معمولی توجہ منعطف فرما کر جلد از جلد عبد اللہ مظہر صاحب کو بحال فرمانے کی صورت کرا دیں۔ والسلام۔

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ
دار العلوم دیوبند

ادبیات

آہ جواہر لال

از

یحییٰ اعظمی

خوں بن گئے ہیں صحنِ چمن کے گل و سمن		خنداں جو بزمِ گل میں وہ گل پیرہن نہیں
سرو و سمن فسردہ ہیں پژمردہ روئے گل		غم ہے چمن میں اب وہ بہارِ چمن نہیں
صحنِ چمن میں ہر صف ماتم بچھی ہوئی		پھولوں سے جو سجی تھی وہ اب انجمن نہیں
پہنے ہوئے کفن ہیں گل و لالہ و سمن		پھولوں کی یہ قبا نہیں یہ پیرہن نہیں
جس کی ہر اک نوا میں تھا پیغام زندگی		ہر دا وہ عندلیبِ چمن نغمہ زن نہیں
زینت بنیں گے کس کی قبا کے شگفتہ گل		وہ سیم بر وہ سروِ سمن پیرہن نہیں
شعلہ کی نذر ہو گیا وہ پھول سا بدن		خاکستر اب ہے سامنے وہ گل بدن نہیں
تیری چتا پہ آتشِ گل ہے چمن فروز		صندل کی آگ اے گلِ تر شعلہ زن نہیں
پائیں گے اب وطن کے جواہر کو ہم کہاں		صد حیف اب وہ ہند کا لعلِ یمن نہیں
وہ عزم بے پناہ کا پیکر کہ راہ میں		کوہ گراں بھی ہو تو جبیں پر شکن نہیں
وہ جوششِ طلب کہ تھا ہر دم رواں دواں		وہ سعیِ روز و شب کہ ذرا بھی تھکن نہیں
زیرِ قدم تھیں مشرق و مغرب کی وادیاں		منزل وہ کونسی تھی جہاں گام زن نہیں
رحلت سے اسکی محفلِ ملت ہے بے فروغ		جیسے وطن میں رنگِ جمالِ وطن نہیں
چھائی ہوئی ہے غم کی گھٹا سارے ملک پر		وہ کون گھر ہے آج جو بیت حزن نہیں
آنکھیں وطن کی شدتِ غم سے ہیں دجلہ بار		ہمدم رواں یہ چشمۂ گنگ و جمن نہیں

سونی ترے بغیر ہے اب بزمِ قوم و ملک
رونق تھی جس کی تجھ سے وہ اب انجمن نہیں

زیبا ہے گر کہیں تجھے دُرِ یتیمِ ہند
اٹھا نہ آج تک ترے جیسا زعیمِ ہند

آنکھوں کو ہو نصیب کہاں یہ ترا غبار
سنگم ہے آہ اب ترے پھولوں سے ہم کنار

آغوشِ دیدہ و دلِ دریا تھا کب سے باز
لینے کو دوشِ شوق پہ موجیں تھیں بیقرار

یہ کس عظیم رہبرِ ملت کے پھول ہیں
جس کے جلو میں جمع ہے اک قوم سوگوار

خاکِ وطن کا بیش بہا لعل شب چراغ
جس پر فدا تھی قوم وہ نہرو ئے نامدار

از فرق تا قدم وہ سراپا ب دل ربا
جس کا رخ شگفتہ تھا سرمایۂ بہار

وہ زندگی کہ جوشِ عمل سے تھی حشر خیز
وہ زیست تھی جو شورشِ طوفاں سے ہمکنار

ہر لحظہ جس کا ولولۂ تازہ کا پیام
ہر لمحہ جس کا کارنمایاں سے شاندار

ہر درد و غم میں قوم کا تھا مرکزِ نگاہ
وہ بیکسوں کا دوست غریبوں کا غمگسار

اٹھا جو کوئی سیلِ حوادث تو اسکی ذات
کام آئی بن کے سامنے اک سدِ استوار

ٹوٹا اگر کسی پہ کہیں کوئی کوہِ غم
دل دردمند سینۂ صد چاک تھا نگار

اس دورِ جنگ میں تھا وہی اک نقیبِ امن
دنیا سے تھا خطاب یہی اس کا بار بار

صد حیف آج آتشِ سوزاں کی نذر ہے
وہ صلح و آشتی کا نشاں امن کا منار

تشبیہ جس کو دیتے تھے پھولوں سے کل ملک
وہ جسمِ ناز آج ہے شعلوں سے ہمکنار

تنہا نہیں یہ کشورِ ہندوستاں کا غم
اس ابتلا میں مشرق و مغرب ہیں اشکبار

کس کو ملا تھا دہر میں یہ رتبۂ قبول
حاصل تھا کس کو عالمِ انسانیت کا پیار

وہ ہستیِ عزیز کہ دنیا کو تھی حبیب
وہ پیاری شخصیت کہ تھی محبوبِ روزگار

خاکِ دیارِ ہند سے اٹھا نہ آج تک
ایسا کوئی محاسنِ فطرت کا شاہکار

وہ جس کے دم قدم سے تھی اقوامِ دہر میں
عظمت وطن کی کشورِ آزاد کا وقار

افسوس اب وہ پیکرِ عظمت نہیں رہا
وا حسرتا جواہرِ ملت نہیں رہا

مطبوعات جدیدہ

خانوادہ قاضی بدرالدولہ۔ از افضل العلماء محمد یوسف صاحب کوکن

ضخامت ۳۰۵، کتابت طباعت بہتر، ناشر دار التصنیف مدراس۱۴، قیمت عہ

عرب سے اہل علم کے جو خاندان ہجرت کرکے ہندوستان آئے، ان ہی میں قاضی بدرالدولہ متوفی ۱۲۸۰ھ کا خانوادہ بھی تھا، ان کے مورث اعلیٰ فقیہ عطا احمد شافعی سب سے پہلے بصرہ سے کوکن آئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی، یہ دکن کے مشہور عالم ملا مخدوم علی مہائمی متوفی ۸۳۵ھ کے معاصر تھے، یہ خانوادہ ہندوستان کے ان اہل علم خانوادوں میں ہے جس کا فیض کئی صدیوں سے جاری ہے، اس خاندان کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں بیشتر علماء صاحب تصنیف گذرے ہیں، قاضی بدرالدولہ خود بڑے پایہ کے عالم اور دکن کی ریاست کرناٹک کے ایک مدت تک قاضی رہے، انھوں نے اس دور میں بہت سی علمی و فقہی خدمات انجام دیں، ان کا یہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے کہ ان کے زمانہ میں دکن میں حضرت سید احمد شہید بریلوی اور حضرت اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہما کی تحریک جہاد اور ان کی اصلاحی کتابوں کے خلاف جو شورش پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اس میں قاضی صاحب کا طرز عمل انتہائی متوازن، منصفانہ اور عالمانہ رہا، جس کی وجہ سے یہ فتنہ آگے نہیں بڑھنے پایا،

مولانا محمد یوسف صاحب صدر شعبۂ عربی و فارسی و اسلامیات مدراس یونیورسٹی

نے بیشمار مطبوعہ و قلمی کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ مفید تذکرہ تیار کیا ہے جو کتاب کی پہلی جلد ہے، دوسری جلد زیر ترتیب ہے، یہ کتاب علمی لحاظ سے مفید ہونے کے ساتھ اس لحاظ سے بھی قابل مطالعہ ہے کہ اس میں دکن کی کئی صدی کی علمی تاریخ آگئی ہے۔

موضوعات کبیر } ترجمہ مولانا حبیب الرحمٰن صدیقی، ضخامت ۴۰۸، کتابت، طباعت متوسط، ناشر، قرآن محل، عربی، اردو مولوی مسافرخانہ، کراچی

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کا شمار متاخرین ائمۂ حدیث میں ہوتا ہے، خاص طور پر جرح و تعدیل میں ان کی رائے سند کی حیثیت رکھتی ہے، انھوں نے جو نادر تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، ان میں ایک موضوعات کبیر بھی ہے، اس میں انھوں نے ان احادیث کو جمع کر دیا ہے جو یا تو موضوع ہیں یا ان میں شدید ضعف ہے، شروع کتاب میں موضوع احادیث سے متعلق ایک مفید مقدمہ لکھا ہے، مولانا حبیب الرحمٰن نے عام فائدے کی خاطر اس کا حامل المتن اردو ترجمہ کیا ہے، جا بجا مترجم نے بہت سے فائدوں کا اضافہ کیا ہے، جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے، موضوع اور ضعیف حدیث سے متعلق مترجم نے اگر الگ سے ایک مقدمہ لکھ دیا ہوتا تو حجیت حدیث پر اعتراض کرنے والوں کے لیے یہ شاید کچھ زیادہ مفید ہو سکتا پاکستان میں جس تیزی سے کتب احادیث کے ترجمہ کا کام ہو رہا ہے، اس کی افادیت کو باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر ممتاز علماء کے حواشی اور مقدمے بھی ہوں، ورنہ یہ فائدے سے زیادہ نقصان کا سبب بن جائے گا، ناشرین کو اس کا ضرور خیال رکھنا چاہیے،

خطباتِ ماجدی یعنی سیرت نبوی قرآنی } از مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی، ضخامت ۲۶۴ کتابت و طباعت بہتر، قیمت :- ۱۲ روپیہ، پتہ صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ۔ دار المصنفین، اعظم گڈھ

یہ مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے وہ خطبات ہیں جو انھوں نے سیرت نبوی کے موضوع پر مدراس میں ۱۹۵۰ء میں دیے تھے، جسے صدق جدید بک ایجنسی نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے، اس موضوع پر مصر کے ایک اہل قلم نے عربی میں ایک ضخیم کتاب لکھی ہے، جو کئی سال ہوئے شائع ہو چکی ہے، اردو میں بھی قرآن سے سیرت نبوی کی ترتیب کا خیال متعدد علماء کے ذہن میں آیا اور بعض نے اس پر قلم بھی اٹھایا، لیکن یہ موضوع ابھی تک تشنۂ تکمیل تھا، اس کی تکمیل کی یہ سعادت مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی کے حصہ میں آئی، ان خطبات میں سیرت نبوی کے قریب قریب ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اس میں ان تمام اعتراضات کے جوابات بھی آگئے ہیں جو سیرت نبوی پر کیے جاتے ہیں، اگر بعض اور اہم عنوانات کے تحت کم از کم آیات ہی جمع کر دی گئی ہوتیں تو اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہو جاتا، مثلاً اخلاقِ نبوی، عباداتِ نبوی، معاملات نبوی وغیرہ، اسی طرح شمائل نبوی کا ذکر ضمناً نہیں بلکہ الگ عنوان کے تحت ہونا چاہیے تھا، خصائص سے وہ مفہوم نہیں ادا ہوتا، بلکہ خصائص کا اطلاق تو دلائل و معجزات پر ہوتا ہے، شمائل کا لفظ بھی کچھ ذہن کو کھٹکتا ہے، اس کے بجائے دعوت نبوی، یا پیغمبرانہ فرائض وغیرہ عنوان زیادہ بہتر ہوتا، آیات کی تشریح میں بھی تشنگی محسوس ہوتی ہے، اگر کچھ اور تفصیل ہوتی تو اس کا فائدہ زیادہ ہوتا، مولانا نے خود بعض جدید عربی کتابوں

کی روشنی میں اس پر ترمیم و اضافہ کا وعدہ فرمایا ہے، اس لیے امید ہے کہ طبع ثانی میں یہ اور زیادہ جامع ہو جائے گی،

کتاب موضوع کی اہمیت اور ندرت کے اعتبار سے بار بار مطالعہ کے لائق ہے۔

سرکار دو عالم ۔ از جناب حسین حسان صاحب ندوی جامعی، ضخامت ۱۵۰

کتابت و طباعت بہتر۔ ناشر مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

جامعہ نے بچوں کے ذوق و مزاج کے مطابق ہر موضوع پر درجنوں کتابیں لکھوائیں اور شائع کیں ہیں، بچوں کے لیے سیرت نبوی پر بھی کئی کتابیں اس مکتبہ سے شائع ہو چکی ہیں، سرکار دو عالم بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے،

اس میں بڑے سلیس اور شگفتہ انداز میں سیرت نبویؐ کے ہر پہلو پر مستند واقعات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان واقعات سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں وہ انشاء اللہ بچوں کے ذہن و دماغ پر اچھا اثر چھوڑیں گے۔ بعض معمولی واقعات پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، مثلاً آب زمزم کے سلسلہ میں حضرت ہاجرہؓ نے زمین کھودی اور میٹھے پانی کا چشمہ نکل آیا، اسی طرح پورے صوبہ حجاز میں صرف ۶ آدمی لکھے پڑھے تھے۔

کتاب اسلامیہ مکاتب کے نصاب میں داخل کرنے کے لائق ہے،

جلد ۹۶ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۵ء عدد ۱

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

مطبوعات جدیدہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

مسلم یونیورسٹی کے خلاف جو آرڈیننس نافذ کیا گیا ہے وہ طاقت کا نہایت غلط استعمال ہے، اس لیے اس کے خلاف جس قدر بھی احتجاج کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے لیکن آرڈیننس بہرحال عارضی ہے، یونیورسٹی کے مستقل نظام پر اس کا اثر نہیں پڑتا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ آیندہ حکومت اس کے دستور میں کیا تبدیلی کرتی ہے، اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں، ایک یہ کہ مسلم یونیورسٹی ایک خود مختار تعلیمی ادارہ ہے، دوسرے اس حیثیت سے وہ اسلامی بھی ہے کہ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ اسلامی تہذیب و روایات کے مطابق مسلمان طلبہ کی تربیت کیجائے جس کو موجودہ بحث میں اسلامی کردار سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو لوگ اسلام کے نام سے گھبراتے ہیں وہ اقلیتی کردار سے تعبیر کرتے ہیں، یہ کردار مسلمانوں کا مسلمہ دستوری حق ہے، اس لیے حکومت کو یونیورسٹی میں کسی ایسی تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں ہے جس سے اس کے کردار اور خود مختاری میں فرق آئے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی کردار سے مراد کیا ہے اور اس کے حدود کیا ہیں؟ چھاگلہ صاحب کے نزدیک جیسا کہ ان کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے اس سے مراد اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیقات ہے یعنی مسلم یونیورسٹی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیقات کو اہمیت دیجائے، لیکن یہ اسلامی کردار نہیں بلکہ ریسرچ یا علمی تحقیق ہے جس کو یورپ کی بہت سی یونیورسٹیاں انجام دے رہی ہیں اور انھوں نے اسلامیات پر جتنا کام کیا ہے وہاں تک پہنچنے کے لیے مسلم یونیورسٹی کو ایک مدت درکار ہوگی،

اگر اسلامی کردار اسی کا نام ہے تو پھر ساری یونیورسٹیاں مسلم ہیں، ان میں اور مسلم یونیورسٹی میں فرق کیا ہوا؟

اصل میں جو لوگ اسلامی کردار کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہیں یا انکی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں اور وہ اس کو نام نہاد ترقی پسندی اور قومی وحدت کے انضمامی تصور کے منافی سمجھتے ہیں ان کو اسلامی کردار کی تعیین کا کوئی حق نہیں ہے، ان کو اس کا تو حق ہے کہ وہ یونیورسٹی کے لیے اسلامی کردار کی ضرورت اور اہمیت ہی سے علانیہ انکار کریں لیکن اتنی اخلاقی جرأت نہیں، اس لیے وہ اس کو فرقہ پروری، رجعت اور علحدگی پسندگی کی آڑ لے کر مسخ کرتے رہتے ہیں، اس کی تعبیر و تعیین کا حق ان ہی لوگوں کو ہے جو اسلامی کردار کو مسلمانوں کا سرچشمۂ حیات اور تعمیر ملت کی بنیاد سمجھتے ہیں،

اس کے لئے تنہا اسلام کے بعض ظاہری مظاہر مثلاً دینیات کی رسمی تعلیم، ہوسٹلوں میں نماز کا انتظام، مطعم میں ڈائننگ ہال کی نمائشی بندش، اسلامی تقریبات کا انعقاد، میلاد کے جلسے، اور اسی قبیل کی دوسری ظاہری چیزیں کافی نہیں ہیں، بلکہ اس سے وہ اسلامی روح مراد ہے جس سے مسلمان طلبہ میں دینی احساس، اسلامی شعائر کا احترام، ان کی عظمت، اور ملی غیرت و حمیت کا جذبہ بیدار ہو، یونیورسٹی کے حلقہ کے اندر اس کے کسی متوسل کو اسلامی عقائد و تصورات کی علانیہ مخالفت کی اجازت نہ دی جائے، اسلامی علوم و فنون کی تحقیقات اور دینی تعلیم کو خاص اہمیت دی جائے، یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں خواہ تعلیمی ہوں، یا انتظامی مسلمانوں کی نمایاں اکثریت اور ان کا اقتدار ہو، انتظامی مجالس کے ارکان کی اکثریت کا انتخاب جمہوری طریقہ پر کیا جائے، حکومت کے نامزد کردہ ارکان کی تعداد کم سے کم رکھی جائے، غیر مسلم ارکان ایسے منتخب اور نامزد کئے جائیں جو مسلمانوں کی تہذیب و روایات سے واقف اور یونیورسٹی کے ہمدرد و بہی خواہ ہوں، یہ غیر مسلموں کی حق تلفی نہیں ہے، اس کے بغیر یونیورسٹی کا کردار قائم نہیں رہ سکتا،

یہ چیز نہ رجعت پسندی ہے اور نہ فرقہ پروری، اور نہ قومی وحدت اور سیکولرزم کے خلاف ہے، بلکہ اقلیتوں کا ایک تسلیم شدہ دستوری حق ہے، جس کو نہ حکومت سلب کر سکتی ہے، اور نہ کسی ترقی پسند کو اس کی اجازت دی جا سکتی ہے، خود ہندوستان میں ہندو یونیورسٹی ہندو کردار کا اور عیسائی مشنریوں کے بعض کالج عیسائی کردار کا نمونہ موجود ہیں، درحقیقت اُن کو ان کے کردار کے ساتھ قائم رکھنا ہی سیکولرزم اور جمہوریت ہے، مسلم یونیورسٹی اس معنی میں یقیناً سیکولر اور قومی ہے، کہ اس کے دروازے بلا تفریق مذہب و ملت سب فرقوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور وہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتی، اور آج سے نہیں، بلکہ علی گڑھ کالج کے قیام کے زمانہ سے کر اب تک ہر زمانہ میں یہاں غیر مسلم طلبہ کی خاصی تعداد رہی ہے، جن میں بعض نامور لوگ بھی ہیں، لیکن اس معنی میں یقیناً مسلم ہے کہ اس کی فضا اور اس کا کردار اسلامی اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت اور اس کا اقتدار ہونا ضروری ہے، یہی حقوق ہندو یونیورسٹی کو بھی حاصل ہیں،

اسلامی کردار کے نام سے بھڑکنے کی ضرورت نہیں، یہ چیز قومی وحدت و یکجہتی کے قطعاً منافی نہیں، علٰحدگی پسندگی مسلمانوں کے قومی مزاج کے خلاف ہے، انھوں نے کبھی کسی قوم اور کسی تہذیب سے چھوت نہیں کی، جہاں گئے ملکی باشندوں میں گھل مل گئے، وہاں کی اور اپنی تہذیب کو ملا کر تہذیبی یکرنگی پیدا کرنے کی کوشش کی، خود ہندوستان میں ایک مشترک تہذیب اور مشترک زبان پیدا کی جس میں دونوں تہذیبوں کے یکساں عناصر ہیں، اور ہندوستان کی احیائی ذہنیت سے پہلے یہ زبان اور یہ تہذیب ہندو مسلمانوں کے بڑے طبقہ کی مشترک تہذیب و زبان سمجھی جاتی تھی، مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو ہمیشہ ایک دوسرے سے بر سر پیکار رہتے تھے متحدہ ملک بنایا، قومی وحدت کا تصور پیدا کیا، اس سے پہلے ہندوستان مختلف طبقوں

زقوں میں بٹا ہوا تھا، اور اُن میں باہم اتنا ہی بغض و عناد تھا، جتنا دشمنوں میں ہو سکتا ہے،
اس لئے ہندوستان کی وحدت اور قومی یکجہتی کے پہلے معمار مسلمان ہی ہیں۔ اور علٰحدگی پسندی کے
وہ لوگ مجرم ہیں، جو وحدت کے ان آثار کو مٹانے کے درپے ہیں۔

آزاد مشرب ترقی پسندوں بلکہ تخریب پسندوں کا ایک طبقہ عرصہ سے مسلم یونیورسٹی کے روایات
اور خصوصیات کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہے لیکن وائس چانسلر صاحب ایک ایسے خاندان
سے تعلق رکھتے ہیں، جو پشتہا پشت سے اسلامی تہذیب و روایات کا حامل رہا ہے، اور وہ خود اسی
تہذیب کے پروردہ ہیں۔ ان سے بڑھ کر ان کا واقف کار اور کون ہو سکتا ہے، اس لئے ان
سے توقع یہی ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی خصوصیات کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے، اُن کے سامنے
اُن کے پیشرو بدرالدین طیب جی کی مثال موجود ہے، جن کو اسلامی تہذیب و روایات سے اتنا گہرا
تعلق نہ تھا، جتنا موجودہ وائس چانسلر صاحب کو ہے، اس لئے ان پر اُن سے زیادہ اس کی ذمہ داری
عائد ہوتی ہے۔

ابھی حال میں معلوم ہوا ہے کہ پاکستان کے ایک صاحب احسان بی اے نے سیرۃ النبی کی پہلی دو
دوسری جلد کا خلاصہ کیا ہے، ادارۂ دبستان لاہور نے اس کو شائع کیا ہے، پاکستان کے لوگوں کو معلوم
ہوگا کہ دارالمصنفین کی وارومدار کتابوں کی تجارت پر ہے، اس کو نہ حکومت سے کوئی مستقل ملتی ہے اور
نہ اُس نے کبھی چندہ کیا، اب اگر ارضِ پاک والوں نے اس کی تجارتی آمدنی پر بھی قبضہ کر لیا، تو وہ
کس طرح چل سکتا ہے، اُن کا فرض تو یہ تھا کہ وہ اس کی مشکلات میں مدد کرتے، کجا کہ الٹے وہ اس کے
ذرائع آمدنی پر قبضہ کرکے اس کو تباہ کرنا چاہتے ہیں، جو پاکستان کے لئے انتہائی شرم کی بات

کی بات ہے، بعض اور کتابیں بھی پاکستانی ناشروں نے چھاپ لی ہیں، مگر وہ چنداں اہم نہ تھیں، اس لئے
ہم نے خاموشی سے کام لیا، لیکن سیرۃ النبی دارالمصنفین کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس کو کسی صورت
میں بھی چھاپنا اس کو نقصان پہونچانا ہے، اس سے پہلے بھی ایک ناشر نے سیرۃ النبی جلد اول شائع
کی تھی، اس وقت سردار عبد الرب نشتر مرحوم زندہ تھے انھوں نے دباؤ ڈال کر اس کی اشاعت رکوا دی
تھی، پاکستان کے اخبارات نے بھی اس ناشر کو آڑے ہاتھوں لے لیا تھا، اس لئے اس نے مجبور ہو کر طباعت
کے مصارف لے کر کتابیں دارالمصنفین کے حوالے کر دی تھیں، ہم یہاں سے بیٹھکر کیا کر سکتے ہیں، یہ
فرض پاکستانی اخبارات کا ہے کہ وہ خود غرض ناشروں کو ایسا سبق دیں کہ آئندہ کوئی اس قسم
کی جرأت نہ کر سکے، نوائے وقت اور چٹان سے ہم کو خاص طور سے اسکی توقع ہے،

ہمارے رفیق سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی دو کتابوں پر اس سے پہلے یوپی گورنمنٹ سے انعام مل چکا ہے،
اس سال بھی اُن کی کتاب "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں تمدنی جلوے" پر انعام ملا ہے، اس
سال انشاء اللہ کچھ نئی کتابیں شائع کرنے کا ارادہ ہے، دین رحمت، محدثین اسلام، تبع تابعین جلد دوم،
صاحب مثنوی، مقالات سلیمانی جلد اول، عہد مغلیہ ہندوستانی مورخین کی نظر میں، دارالمصنفین کی جبلی
کی روداد کے لئے شائقین کا بڑا تقاضہ ہے، اس کی مختصر روداد معارف میں لکھی جا چکی ہے، تفصیلی
روداد بھی انشاء اللہ جلد شائع کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے،

مقالات

انسانی عظمت و شرف
اور
مردِ مومن کی ذمہ داریاں

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

انسانی عظمت و شرف اسلام سے پہلے انسانیت کا تصور بہت پست تھا، انسان پیدائشی گنہگار اور اپنے اعمال کے لحاظ سے ادنیٰ ترین مخلوق سمجھا جاتا تھا، وہ ہر طاقت کے سامنے سربسجود ہو جاتا تھا، اور ہر ادنیٰ اعلیٰ کا غلام تھا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے انسان کا درجہ تمام مخلوق میں بلند کیا اور اسکو اشرف المخلوقات قرار دیا، وہ خالق عالم کی صناعی کا شاہکار ہے، خدا نے اس کو حسین ترین خلقت عطا فرمائی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (تین) — اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا

حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی شکل میں پیدا کیا،

خلق اللہ آدم علی صورتہ (بخاری کتاب الاستیذان) — خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا

اس کو پیدائشی طور پر بے داغ ہر نقش سے پاک اور دین فطرت پر قرار دیا، پیدائش کے بعد ماحول

اور سوسائٹی اس پر اچھے برے نقش و نگار بناتی ہے۔

ان الانسان یُولد علی الفطرۃ	انسان دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اسکے
فابواہ یھودانہ او ینصرانہ	والدین اسکو یہودی یا نصرانی بناتے ہیں

حسن ظاہری کے ساتھ جمال معنوی یعنی علم و ادراک اور عقل و دانش کی دولت عطا فرمائی،

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (علق)	انسان کو وہ باتیں سکھائیں جنکو وہ نہیں جانتا تھا،
عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا (بقرہ)	اور خدا نے آدم کو سارے اسماء (حقائق اشیاء) سکھائے

اس کو خیر و شر کی تمیز عطا فرمائی،

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا	اور قسم انسان کی اور اس ذات کی جس نے
وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا	اس کو درست بنایا پھر اس کو بدکاری اور نیکوکاری
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا	کی باتیں سمجھائیں جس نے اپنی روح کو پاک کیا، وہ
(شمس)	کامیاب ہوا اور جس نے اسکو دبایا وہ گھاٹے میں رہا
وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (بلد)	اور ہم نے اسکو (نیکی اور بدی) دونوں کے راستے دکھائے

اعلیٰ درجہ کی عقلی و ذہنی قوتوں سے آراستہ کیا، چنانچہ کلام مجید میں بکثرت انسانی عقل سے خطاب کیا گیا ہے، اور اس کو کائنات پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے، (افلا یتدبرون۔ افلا یتفکرون اور افلا یعقلون اتنی آیتوں میں آیا ہے کہ انکا شمار مشکل ہے،

اس کو ساری مخلوق پر فضیلت عطا کی گئی

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ	اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی اور برتری عطا فرمائی
فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ	اور اس کو دریا اور خشکی میں سوار کیا اور پاکیزہ
الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى	چیزیں اس کو کھانے کو دیں اور اس کو بہت سی

كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (بنی اسرائیل) مخلوق پر فضیلت عطا فرمائی۔

اس کے سر پر خلافت اور نیابت الٰہی کا تاج رکھا، وہ مسجود ملائکہ قرار پایا اور اس کی عظمت سے انکار پر ابلیس ہمیشہ کے لیے مردود قرار دیا گیا،

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ	اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے
جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً قَالُوْٓا	کہا کہ میں تو زمین میں اپنا نائب بنانے والا
اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا	ہوں تو فرشتوں نے کہا کیا تو ایسے شخص
وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ	کو نائب بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ	اور خونریزی کرے اور ہم تیری حمد و ثنا
اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ وَعَلَّمَ	کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں
اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ	خدا نے کہا میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے
عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ	اور آدم کو سب چیزوں کے نام بتائے،
بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ	پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش
قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ	کر کے فرمایا کہ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو
اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ	ان چیزوں کے نام بتاؤ، فرشتے بولے تیری
الْحَكِيْمُ ۔ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ	ذات پاک ہے جو تو نے ہم کو بتایا ہے
بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ	اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے بیشک
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ	تو ہی جاننے والا اور مصلحت کا پہچاننے والا
غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ	ہے، تب خدا نے فرمایا اے آدم تم فرشتوں
مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ	کو ان چیزوں کے نام بتاؤ پھر جب آدم نے

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ

(بقرہ ۴)

فرشتوں کو ان کے نام بتائے تو خدا نے فرشتوں سے فرمایا کیا ہم نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کی سب مخفی چیزیں ہم کو معلوم ہیں۔ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ سب ہم کو معلوم ہے اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے سامنے جھکو تو شیطان کے سوا سب جھک پڑے، اس نے نہ مانا اور غرور میں آگیا اور نافرمان بن گیا۔

اقبال نے تخلیق آدم کے واقعہ سے انسانی عظمت کے بڑے لطیف پہلو پیدا کیے ہیں لکھتے ہیں:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے خودشکنے خودنگرے پیدا شد

آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانے دگرے پیدا شد

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

اس سے بڑھ کر انسانی عظمت تصور میں نہیں آسکتی، اس سے پہلے انسان بدترین قسم کی غلامی میں مبتلا تھا، وہ چاند، سورج، سمندر، پہاڑ، شجر و حجر بلکہ ادنیٰ ادنیٰ جانوروں تک کی پوجا کرتا تھا، اسلام نے بتایا کہ یہ چیزیں اس کی پرستش کے لیے نہیں بلکہ اس کی خدمت اور انتفاع کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا

(بقرہ ۵)

زمین میں جو کچھ ہے سب خدا نے تمھارے لیے بنایا،

پوری کائنات کو اس کے لیے مسخر کر دیا۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي	کیا تم نہیں دیکھتے کہ روئے زمین میں جو کچھ ہے
الْاَرْضِ (حج)	سب کو تمھارے لیے مسخر کر دیا۔

حتی کہ آفتاب و ماہتاب بھی جس کی انسان پوجا کرتا ہے، اس کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَ	اور خدا نے رات اور دن، چاند اور سورج
الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ	کو تمھارے کام میں لگا دیا اور ستارے اسکے
بِاَمْرِهٖ (نحل)	حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

اقبال نے اس کو بڑے مؤثر اور دلکش انداز میں نظم کیا ہے

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کیلئے	جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کیلئے
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں	یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں	تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

اسلام سے پہلے مادی طاقت وقوت، دولت و وجاہت اور نسلی و قومی برتری کی پرستش ہوتی تھی، ہر کمزور طاقتور کا اور ہر ادنیٰ اعلیٰ کا غلام تھا، اسلام نے یہ سارے امتیازات ختم کر کے حسن عمل اور حسن کردار کو عزت و شرف کا معیار قرار دیا،

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ	تم میں خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے
	جو سب سے زیادہ پاکباز ہے۔

آزادی و مساوات کا مسئلہ جو انسانی عظمت کا ایک اہم پہلو ہے اسلام کی نگاہ میں اس درجہ اہم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو آخری خطبہ دیا تھا، اس میں انسانی مساوات

پر بھی زور دیا تھا، آپ کے الفاظ یہ ہیں :

ایھا الناس ان ربکم واحد	لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے تمہارا باپ بھی
وان آباکم واحد کلکم لآدم وآدم	ایک ہی ہے تم سب اولاد آدم ہو اور آدم
من تراب ان اکرمکم عند اللہ	مٹی سے بنے تھے، اللہ کے نزدیک تم میں
اتقاکم ولیس لعربی علی عجمی	سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پاکباز ہے
فضل الا بالتقویٰ	کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔

ایک دوسری روایت ہے جس میں تصریح کے ساتھ نسل و قومیت اور حسب و نسب پر فخر و غرور کو مٹایا گیا ہے،

ان اللہ اذھب عنکم عبیة	اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے غرور اور آباء و
الجاھلیة وفخرھا بالآباء	اجداد پر فخر کو ختم کر دیا، انسان یا مومن
انما ھو مومن تقی او فاجر شقی	پاکباز ہے یا بدکار شقی تم سب اولاد
الناس کلکم بنو آدم وآدم	آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔
خلق من تراب (ابوداؤد)	

یہ اعلان، آزادی و مساوات کا وہ چارٹر ہے جس نے انسانوں کو انسانی غلامی سے آزاد کر کے، ملک و ملوک نسل و قومیت، حسب و نسب، دولت و وجاہت اور ادنیٰ و اعلیٰ کے امتیازات مٹا کر سارے انسانوں کو ایک سطح پر کھڑا کر دیا اور کوئی انسان کسی انسان کا بندہ و غلام باقی نہیں رہ گیا۔

عظمت و شرف کی ذمہ داریاں | لیکن اس عظمت و شرف کے ساتھ اس کی ذمہ داریاں بھی بڑی کٹھن ہیں، یہ فطری قانون ہے جس پر ساری دنیا کا عمل ہے کہ منصب جس قدر جلیل ہوتا ہے اسی قدر اس کی

ذمہ داریاں بھی عظیم اور پابندیاں بھی سخت ہوتی ہیں، صاحب منصب کی ذاتی حیثیت بہت کم باقی رہتی ہے، اس کے اعمال و افعال اور زبان تک پر پابندی عائد ہوجاتی ہے، وہ محض اپنے عہدے اور منصب کے فرائض کا نقیب اور ترجمان بنجاتا ہے، اس کے خلاف ایک لفظ اپنی زبان سے نہیں نکال سکتا، چنانچہ دنیاوی حکومتوں کے سربراہ، وزراء، اور سفراء وغیرہ بھی صرف اپنی حکومت کے ترجمان ہوتے ہیں، ان کی ہدایات اور پالیسی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔

مرد مومن کا مقام اور اس کے فرائض | اسی طرح ایک مومن[1] جو خلیفۃ اللہ فی الارض اور دنیا میں احکام الٰہی کا مبلغ اور ترجمان ہے، خود مختار نہیں، بلکہ احکام خداوندی کا پابند ہو، اس کے خلاف ایک قدم

---

[1] انسانی عظمت و شرف میں پیدائشی طور پر سارے انسان برابر ہیں، اور خلیفۃ اللہ فی الارض بننے کی صلاحیت تمام انسانوں میں مشترک ہے لیکن اس کا وعدہ انہی انسانوں کیلئے ہے جنھوں نے اپنے ایمان و عمل سے انسانی شرف و عظمت کو قائم رکھا ہے اور اپنے کردار سے خلیفۃ اللہ فی الارض کے مستحق ہونے کا ثبوت دیا ہے، چنانچہ کلام مجید میں ارشاد ہے

اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ	میرے نیک بندے زمین کی بادشاہت کے وارث
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	ہوں گے تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ	نیک عمل بھی کرتے رہے، ان کو وہ زمین کی
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	خلافت ضرور عطا کرے گا۔

یہی وہ مرد مومن ہے جس کو دنیا میں سربلندی کی بشارت دی گئی ہے،

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا اَنْتُمُ	اور عارضی حالات سے تم ہمت نہ ہارو اور غمزدہ
الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ	نہ ہو اگر تم سچے مومن ہو تو تمہارا ہی بول بالا ہوگا۔

غیر مومن اور بدکار خدا کا باغی ہے، وہ کس طرح نیابت الٰہی کا فرض انجام دے سکتا ہے، اس لیے وہ اس منصب جلیل کا اہل نہیں۔

نہیں اٹھا سکتا، اسلام کے معنی ہی اپنے کو مکمل طور پر خدا کے حوالے کر دینے کے ہیں، اس کی بڑی اچھی تمثیل حدیثوں میں ہے کہ " دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے"۔ اس حدیث کے مختلف معنی بیان کیے جاتے ہیں، لیکن سب سے دلنشین معنی یہ ہیں کہ قید کی زندگی میں انسان کو اپنے افعال کا مختار نہیں بلکہ دوسرے کا پابند ہو کر رہنا پڑتا ہے، اور ایک مومن اپنے ہر عمل میں احکام الٰہی کا پابند ہے، اس لیے دنیا گویا اس کے لیے قید خانہ ہے، اس کے مقابلہ میں جنت میں کوئی پابندی نہ ہوگی، ہر شخص اپنے عمل میں خود مختار ہوگا، اور کافر بھی احکام الٰہی کا پابند نہیں ہوتا، بلکہ اپنے افعال و اعمال میں آزاد ہوتا ہے، اس لیے دنیا اس کے لیے جنت ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت ایک مومن نہ صرف خود احکام الٰہی کا پابند ہے، بلکہ وہ دنیا میں اس کا مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی عظیم ذمہ داری سے گراں بار ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	لوگوں کی رہنمائی کے لیے جس قدر امتیں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے
(آل عمران)	کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو،

ایک دوسری آیت میں ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى	اور تم میں ایک جماعت ایسی رہنی چاہیے
الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	جو لوگوں کو نیک کاموں کی طرف بلائیں،
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ	اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے
هُمُ الْمُفْلِحُونَ	منع کریں۔

حدیثوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہاں تک تاکید ہے۔

والذی نفسی بیدہ لتامرن	اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے
بالمعروف وتنھون عن المنکر	تم لوگ اچھے کام کرنے کا حکم دیتے رہو اور برے
اولیوشکن اللہ ان یبعث علیکم	کاموں سے روکتے رہو، ورنہ خدا اپنا عذا ب
عذابا من عندہ ثم تدعوا	تم پر نازل کرے گا، اور پھر تم دعا کروگے
ولا یستجاب لکم (ترمذی)	اور تمھاری دعا قبول نہ کی جائے گی

ایک دوسری روایت میں ہے

قال من رای منکم منکرا فلیغیر	تم میں سے جو شخص کوئی بری بات دیکھے تو اس کو
بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ	چاہیے کہ اپنی قوت سے مٹادے، اگر اسکی
فان لم یستطع فبقلبہ وذلک	طاقت نہ ہو تو زبان سے کہکر مٹائے، اگر
اضعف الایمان (مسلم)	اسکی طاقت بھی نہ ہو تو کم سے کم دل سے
	اسکو برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے

نیکی اور خیر کی تبلیغ اور اس کے قیام وتحفظ اور بدی اور شر کے انسداد پر دنیا کا سارا نظام قائم ہے، اس کے بغیر سارا کارخانہ عالم درہم برہم ہو جائے گا، انبیاء علیہم السلام بھی اسی کی تبلیغ اور قیام کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اور دنیاوی حکومتوں کے قوانین کا مقصد ومنشا بھی درحقیقت خیر کا قیام اور شر کا انسداد ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ دنیاوی قانون کا دائرہ انسانوں کے مادی معاملات تک محدود ہوتا ہے، ان کو انسانوں کے اخلاقی اور روحانی معاملات سے صرف اسی حد تک علاقہ رہتا ہے جس حد تک عوام کے نفع ونقصان سے ان کا تعلق ہوتا ہے لیکن احکام الٰہی اور حکومت الٰہیہ کا دائرہ انسانوں کے دینی ودنیاوی اور مادی وروحانی جملہ ضروریات تک وسیع ہے، اس لیے خلیفۃ اللہ فی الارض کی ذمہ داریاں دنیاوی حکومتوں سے زیادہ اہم ہیں۔

وہ انسانوں کے جملہ معاملات میں خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی، اخلاقی ہوں یا روحانی، احکام الٰہی کا ترجمان و مبلغ بھی ہے، اور اس کے قیام و نفاذ کا بھی ذمہ دار ہے، اس اعتبار سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مومن کا فریضہ ہے۔

اس راہ کے شدائد | درحقیقت یہی وہ بار امانت ہے جس کے اٹھانے کی ہمت زمین و آسمان نہ کر سکے اور انسان کی ہمت مردانہ نے ان کو اٹھالیا۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمینوں
وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ	اور پہاڑوں پر پیش کی تو سب اس بار امانت
اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا	کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے
وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ	اور انسان نے اس کو اٹھالیا، بیشک
ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (احزاب-۹)	اپنے حق میں بڑا ظالم اور نادان ہے۔

ع آغاز کا دیوانہ انجام سے غافل تھا

کہ اس بار امانت کے اٹھانے کے معنی خدا کی راہ میں جان و مال کی بازی لگا دینے کے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ	اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور
اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ	ان کا مال خرید لیا ہے کہ اس کے بدلہ میں
لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ)	ان کو جنت ملے گی۔

اس راہ میں طرح طرح کے شدائد سے آزمائش ہوتی ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ	اور ہم تم کو تھوڑے سے خوف سے اور
وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ	بھوک سے اور جان و مال اور پیداوار کی
وَالثَّمَرَاتِ (بقرہ ۱۹)	کمی سے آزمائیں گے۔

چنانچہ بڑے بڑے اولوالعزم انبیاء علیہم السلام کو ایسی سخت آزمائشوں سے گذرنا پڑا کہ وہ بھی بعض اوقات تقاضائے بشری کی گھبرا اٹھے، مسلمانوں کو مخاطب کرکے ارشاد ہوتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ	کیا تم ایسا خیال کرتے ہو کہ بس جنت میں
وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ	داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ تم کو ان لوگوں کے
مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ	جیسے حالات نہیں پیش آئے جو تم سے پہلے
وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ	گذر چکے ہیں کہ ان کو سختیاں بھی پہنچیں اور
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ	تکلیفیں بھی پہنچیں اور جھڑ جھڑائے بھی گئے
اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ	یہاں تک کہ پیغمبر اور جو ایمان والے ان کے
	ساتھ تھے پکار اٹھے کہ خدا کی مدد کب آئیگی
	(اور ہم نے ان کو تسلی دی) کہ بس خدا کی
(البقرہ - ۲۶)	مدد قریب آگئی،

اس کے نتائج خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور دوسرے ارباب عزیمت مومنوں کو کیسے کیسے صبر آزما حالات سے گذرنا پڑا مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی، ان کی قربانیوں اور جانکاہیوں نے خفتہ انسانیت کو بیدار، مری ہوئی قوموں کو زندہ اور گم کردہ راہ قافلوں کو راہ راست پر لگا دیا، اور ایک ایسی امت پیدا کردی جو اپنے اعمال و اخلاق میں دنیا کے لیے نمونہ تھی، اور خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہا

"میرے نیک بندے زمین کی بادشاہت کے وارث ہوں گے، تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے رہے، ان کو روئے زمین کی خلافت (حکومت) ضرور عطا کرے گا جس طرح ان لوگوں کو خلافت دی جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔

اور مسلمانوں کو روے زمین کی سب سے زیادہ وسیع اور طاقتور سلطنت عطا کی گئی جس کا ایک سرا سندھ تھا اور دوسرا فرانس کی سرحد سے ملتا تھا، اس زمانہ میں انھوں نے اقوام عالم کی قیادت اور رہنمائی کی اور ان کے ذریعے دنیا میں دین وایمان، علم وعرفان اور اخلاق وروحانیت، اور تہذیب وثقافت کی روشنی پھیلی، وہ جس صحرا میں نکل گئے اس کو گلشن بنا دیا، دوسری قومیں ان کے علوم اور تہذیب فخریہ سیکھتیں اور اختیار کرتی تھیں، مگر یہ اسی وقت تک تھا جب تک وہ پیغام الٰہی کے علمبردار رہے، اور اعلاء کلمۃ اللہ ان کا شعار رہا، جب سے اس کا سررشتہ انکے ہاتھ سے چھوٹا، اس وقت سے وہ خود ان قوموں کی غلامی میں مبتلا ہو گئے جن کے وہ حاکم و رہنما اور مربی و معلم تھے، اور آج تک ان کی ذہنی غلامی میں مبتلا اور افراد سے لیکر جماعتیں اور حکومتیں تک مغربی تہذیب کے سحر میں گرفتار اور اس کے نقش قدم پر گامزن ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی خوشنودی اور نصرت نے بھی ان سے منہ پھیر لیا اور وہ اس قوت سے محروم ہو گئے جس پر ان کی توانائی کا دارومدار تھا۔

مسلمانوں کا زوال اور اس کے اسباب آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد پچاس ساٹھ کروڑ کے درمیان ہے، اور ان کی بیس پچیس حکومتیں ہیں، اس کے باوجود ان کی کوئی آواز نہیں، اور وہ ایک پس ماندہ قوم بنکر رہ گئے ہیں، ان کی حکومتوں تک میں کوئی جان باقی نہیں ہے، چنانچہ پوری عرب دنیا ملکر بھی اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن اسرائیل کی چھوٹی سی ریاست کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے اوپر ہے، لیکن ان کی کوئی حیثیت نہیں، اس لیے کہ وہ زندگی کی اس قوت سے محروم ہیں جس کے بغیر انسانوں کی حیثیت جانوروں کے گلے اور خس وخاشاک سے زیادہ نہیں، جس کو ایک معمولی چنگاری جلا کر خاکستر کر سکتی ہے

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

ایک مغالطہ کا ازالہ | مغربی قوموں کی تقلید اور اس کے فوائد کی سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ وہ مذہبی قیود سے آزادی اور مادی نظام حیات ہی کی بدولت بام عروج پر پہنچی ہیں، اگر مذہب ترقی میں مانع ہوتا تو مسلمان جو مغربی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ مذہبی ہیں، کیوں پستی اور تنزل کا شکار ہوتے، لیکن یہ سراسر مغالطہ ہے۔ نہ مغربی قوموں نے محض مذہبی آزادی اور مادی تصور حیات کے بدولت ترقی کی اور نہ مسلمان مذہب کی پابندی سے تنزل میں مبتلا ہیں، اور یہ بھی قابل بحث ہے کہ جس مادی ترقی کو دلیل میں پیش کیا جاتا ہے کیا وہ واقعی انسانیت کی صحیح اور متوازن ترقی ہے؟ اور اس سے انسانیت کی ضروریات اور اس کے مطالبات پورے ہو جاتے ہیں، اور کیا واقعی مسلمان مذہب کے پابند ہیں؟

مغربی قوموں کی ترقی کے حقیقی اسباب | مغربی قوموں کی ترقی کا سبب محض مذہب سے آزادی اور مادی تصور حیات نہیں، بلکہ قوموں کی موت و حیات اور ترقی و تنزل کے اصولوں پر ان کا عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے بھی کچھ اصول مقرر کیے ہیں، جو قوم بھی ان پر عمل کرے گی وہ ضرور دنیا میں سربلندی حاصل کریگی، خواہ وہ مومن ہو یا کافر اور جو قوم ان کو چھوڑے گی خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو تنزل کا شکار ہوگی، فطرت کے قوانین سب کے لیے یکساں ہیں، ان میں مومن و کافر کی تخصیص نہیں، جس طرح صحت اور تندرستی کے کچھ اصول و قوانین ہیں، جو بھی ان کی پابندی کرے گا وہ بیماری سے محفوظ اور تندرست رہے گا، اور جو خلاف ورزی کرے گا وہ امراض کا شکار ہوگا اور ہلاکت تک نوبت پہنچ جائے گی۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک کافر صحت کے اصولوں کی پابندی کے باوجود محض اپنے کفر کی بنا پر تندرست نہ رہے، اور ایک مومن ان اصولوں کی خلاف ورزی کے باوجود محض اسلام سے انتساب کی بنا پر امراض و ہلاکت سے محفوظ رہے، یہی حال قوموں کی صحت اور توانائی اور بیماری اور ہلاکت کے اصولوں کا ہے،

قوموں کی موت وحیات اور ترقی وتنزل کے عناصر قوموں کی ترقی اور تنزل اور موت وحیات کے بہت سے عناصر ہیں، مثلاً نصب العین کا تعین، اس کی صحت پر ایمان اور یقین واثق، اس کے حصول کی جد وجہد، اس کے لیے جانبازی وجانفروشی، قومی وحدت، اجتماعی مفاد کے لیے ایثار وقربانی ہمدردی ومواسات وغیرہ، جن قوموں میں بھی یہ اوصاف ہوں گے وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گی، خواہ وہ مومن ہوں یا کافر، اگر اس معیار سے مسلمانوں اور مغربی قوموں کا موازنہ کیا جائے تو مسلمان ان کے مقابلہ میں ہیچ نظر آئیں گے، مغربی قومیں اپنے بعض اخلاقی عیوب اور مادی تصورات کے باوجود ان اصولوں پر سختی سے عامل ہیں، انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین مادی ترقی، سیاسی سربلندی اور دنیاوی عیش وتنعم کو بنالیا ہے، اور اس کے لیے ان کو مال کیا جان تک دے دینے میں باک نہیں ہوتا، یورپ کے بڑے بڑے فضلاء اور سائنٹسٹ اس راہ میں اپنی جانیں قربان کرچکے ہیں، جب قومی اور اجتماعی مفاد کا سوال آتا ہے تو ہر فرد اپنا پورا اثاثہ قومی مفاد کے لیے لٹا دیتا ہے، سلاطین اور امراء اپنے لڑکوں کو بلا تامل میدان جنگ میں بھیجتے ہیں، وہ مادی ترقی اور محدود قومی مفاد کے لیے جتنی قربانیاں کرتے ہیں، آج کے مسلمان اپنے دین وملت کے لیے اتنی قربانی نہیں کرسکتے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے لیے جو اصول بنا لیے ہیں ان پر سختی سے ان کا عمل ہے، اور ان کی پابندی ان کی فطرت میں داخل ہوگئی ہے، اس لیے ان کی ترقی کا سبب مذہب سے آزادی نہیں بلکہ مادی اور قومی ترقی کے اصولوں پر ان کا عمل ہے، اور یہ بھی کلیۃً صحیح نہیں ہے کہ وہ مذہب سے مطلق آزاد ہیں، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

محض مادی ترقی انسانیت کی ترقی نہیں ہے لیکن یہ ترقی درحقیقت انسانیت کی نہیں بلکہ صرف مادی ترقی ہے، جس سے انسانیت کے مطالبات پورے نہیں ہوتے، انسانوں کو صرف مادی سروسامان ہی کی احتیاج نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ اس کو اخلاق، روحانیت کی بھی ضرورت ہے۔

اس کے بغیر محض مادی طاقت انسان کو حیوان بنا دیتی ہے، جو طاقت بھی اخلاق اور انسانیت کے اصولوں کی پابند نہ ہوگی وہ انسانیت کے لیے وبال جان بنجائے گی، اسی لیے آج مغربی قوموں کی ساری طاقتیں اور علم و سائنس کی تمام ترقیاں انسانوں کے لیے سکون و راحت کا سامان فراہم کرنے سے زیادہ اس کی ہلاکت اور تباہی و بربادی کے سامان فراہم کرنے میں صرف ہو رہی ہیں، ان میں اقتدار اور سیاسی برتری کی ایک جنگ برپا ہے، ایسے ایسے اسلحے ایجاد ہو رہے ہیں کہ اگر ان کے استعمال کی نوبت آگئی تو عالم انسانیت کا خاتمہ یقینی ہے، اس ہلاکت آفرینی کو دیکھکر خود یورپ کے بڑے بڑے مفکرین مضطرب ہیں اور انسانیت کے نام پر اخلاق و روحانیت اور عالمگیر انسانی اخوت و ہمدردی کی صدا بلند کر رہے ہیں،

اگر انسان نے فلک شگاف راکٹ ایجاد کر لیے، چاند پر پہنچکر اپنا جھنڈا گاڑ دیا بلکہ اس سے بھی اونچا اڑا تو اس سے مادی طاقت کے اظہار کے سوا کیا حاصل ہوا، انسانیت کی ترقی اور اس کی صحیح خدمت تو یہ ہوتی کہ اس ترقی کے ساتھ قوموں میں خداشناسی، اخلاق فاضلہ اور انسانی ہمدردی و مواسات پیدا کیجاتی، اس کے بغیر محض مادی طاقت ایک شتر بے مہار اور مست ہاتھی ہے جو انسانیت کو کچل کر رکھ دیگی اس لیے یہ ترقی درحقیقت انسانیت ترقی نہیں بلکہ صرف مہلک مادیت کی ترقی ہے۔

کیا مسلمان مذہب کے پابند ہیں اب دوسرے سوال کو لیجئے، کیا واقعی مسلمان مذہب کے پابند ہیں، اور انکی مذہبیت ہی ان کے تنزل اور پستی کا سبب ہے، اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں مذہب کے ظاہری رسوم کی پابندی زیادہ ہے، لیکن وہ مذہب کی اصل روح یعنی اخلاص، خشیت الٰہی، رجوع الی اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اس کے لیے ایثار و قربانی کے جذبہ سے خالی ہیں اور ان کی مذہبیت مذہب کا محض ظاہری خول ہے، اس لیے اس سے وہ نتائج کیسے نکل سکتے ہیں، جن کا خدا نے وعدہ کیا ہے، اور وہ اخلاق فاضلہ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں جو دنیاوی سربلندی کے لیے

ضروری ہیں۔

مسلمانوں نے مذہب کے ایک اہم پہلو یعنی قوموں کے عروج و زوال اور موت و حیات کے اصولوں کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے، اسلام محض روزہ، نماز، حج اور زکوٰۃ کا نام نہیں ہے، اور اس کے بھی کتنے مسلمان پابند ہیں، بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور شوکت و عظمت کے لیے جد و جہد ایثار و قربانی، انفاق فی سبیل اللہ، قومی وحدت، اسلامی اخوت اور اس قبیل کے دوسرے اصولوں کو بالکل فراموش کر دیا ہے، جو عبادات ہی کی طرح ضروری ہیں اور جن پر قوموں کی موت و حیات کا دار و مدار ہے، بلکہ جہاد یعنی اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے ہر قسم کی جانی و مالی قربانی افضل العبادات ہیں، اس جد و جہد میں سائنسی علوم کی تحصیل، ان کی ایجادات و اختراعات، مضبوط نظام حکومت، فوجی قوت وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو موجودہ دور میں کسی قوم کی بقا و استحکام کے لیے ضروری ہیں۔ خود قرآن مجید اس پر شاہد ہے، اور خلفاے راشدین کا اس پر عمل رہا ہے، علم و فن کا درجہ اسلام میں بہت بلند ہے، کلام مجید کی جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم کی عظمت کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

اسلام میں علم و سائنس کی اہمیت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھو جس نے مخلوقات کو پیدا کیا، آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے بنایا، قرآن پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔

عالم اور غیر عالم برابر نہیں ہیں۔

هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (زمر)

کیا جو لوگ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے وہ دونوں برابر ہیں (ایسا نہیں ہے)

بلکہ علما اور اصحاب علم کا درجہ بلند ہے

يَرْفَعُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (مجادلہ)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنکو علم دیا گیا ہے اللہ انکے درجے کو بلند کرے گا۔

علم ہی کی ایک قسم حکمت ہے اور حکمت کو قرآن مجید میں خیر کثیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (بقرہ)

اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی اس نے بڑی دولت پائی۔

حکمت کے جو معنی بھی لیے جائیں اس میں علم و تجربہ اور عقل و دانش کی باتیں ضرور داخل ہونگی۔

دینی نقطۂ نظر سے دنیاوی علوم کی ضرورت اس قسم کی اور بھی آیات ہیں جن سے علم و حکمت کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے، عام طور پر علم و حکمت سے مراد وحی الٰہی، علم دین اور دین کی سمجھ لیجاتی ہے لیکن اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں جبکہ اس کے الفاظ میں عموم ہے، یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ سب سے مقدم دینی علوم اور تفقہ فی الدین ہے، اور ان کو دوسرے تمام علوم پر اولیت اور فضیلت حاصل ہے، لیکن دوسرے علوم خصوصاً ان علوم کو خارج کر دینے کی کوئی وجہ نہیں جو دین کی خدمت اور اسلام اور مسلمانوں کی شوکت و عظمت کے قیام کے لیے اس زمانہ میں ضروری ہیں، اور جن کے بغیر کوئی قوم طاقتور نہیں ہو سکتی بلکہ زندہ نہیں رہ سکتی، خود قرآن مجید کی آیات اس پر شاہد ہیں کہ دنیاوی علوم نہ صرف دنیاوی طاقت کے حصول کے لیے ضروری بلکہ عرفانِ حق کے لیے بھی مفید ہیں، مثلاً کلام مجید میں جابجا کائنات کی تخلیق، اس کے مظاہر، آسمان و زمین، چاند، سورج، پہاڑ اور سمندر، بارش اور ہوا، زمین کی روئیدگی اور انسان کی خلقت پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک مومن کے عرفان کے لیے تو ان کی خلقت اور اس کے ظاہری فوائد ہی کافی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا کمال، اس کی صناعیاں اور اس کے اسرار و حکم ایک محقق اور سائنٹسٹ پر زیادہ منکشف ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک ظاہر بیں کے لیے انسان کا ظاہری

حسن و جمال اللہ تعالیٰ کے کمال تخلیق کے ثبوت کے لیے کافی ہے لیکن تشریح الاعضاء کے ماہر ڈاکٹروں کو انسانی جسم کے ہر عضو میں اللہ تعالیٰ کی بے نظیر صناعی کی ایک پوری کائنات نظر آتی ہے، اسی طریقہ سے آسمان کی رفعت، سیاروں کی گردش، آفتاب کی حرارت اور روشنی، چاند کی ٹھنڈی چاندنی کو ایک عامی بھی دیکھتا اور خدا کی قدرت کو محسوس کرتا ہے لیکن ایک ہیئت داں کو خلا کی لامحدود وسعتوں، سیاروں کے عظیم الشان نظام اور محیر العقول عجائبات میں خدا کی حقیقی عظمت اور اس کا جلال نظر آتا ہے اور اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔ امام غزالی کا مقولہ ہے کہ جو شخص ہیئت سے واقف نہیں وہ معرفت الٰہی میں عنین ہے، اس لیے سائنسی علوم عرفان حق کے لیے بھی مفید ہیں۔

خلافت ارضی کے لیے مادی طاقت ضروری ہے | اس مسئلہ کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھیے، حکومت اور دنیاوی اقتدار کے لیے خود قرآن مجید نے علم کی طاقت اور مادی قوت کو ضروری قرار دیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل نے اس وقت کے موجود پیغمبر سے کسی کو بادشاہ بنانے کی درخواست کی تو انھوں نے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا، بنی اسرائیل نے عذر کیا کہ ان کے پاس مال و دولت نہیں ہے، وہ ہم پر کس طرح حکومت کر سکتے ہیں، ہم ان کے مقابلہ میں حکومت کے زیادہ اہل ہیں، پیغمبر نے طالوت کے استحقاق حکومت کی یہ دلیل دی

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ	اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اور
بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ	انکو علم اور جسم میں زیادہ وسعت عطا کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت و اقتدار کے لیے علم کی قوت اور جسمانی یا مادی طاقت ضروری ہے اس طرح مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے حکم دیا گیا۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ	اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے جتنی قوت
قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ	اور پلے ہوئے گھوڑے جمع کر سکتے ہو،
بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ	ان سے پوری طرح تیار رہو تاکہ انکے ذریعہ
مِنْ دُوْنِهِمْ (انفال)	اللہ کے اور اپنے دشمنوں اور ان کے
	علاوہ دوسروں پر اپنی دھاک بٹھا سکو

یہ آیات اس کا ثبوت ہیں کہ اُس زمانہ میں حکومت کے استحکام اور دشمنوں کے مقابلہ کے لیے جس قسم کی طاقت کی ضرورت تھی اس کی تیاری کا حکم دیا گیا تھا، اور اس زمانہ میں جس قسم کی طاقت کی ضرورت ہے، اس کے لیے بھی وہی حکم ہے، اور اس میں علم و سائنس کی ایجادات، فوجی قوت اور ہر قسم کے جدید اسلحہ سب داخل ہیں، اور ان کے لیے مغربی علوم خصوصاً سائنس کی تحصیل اور اس میں کمال پیدا کرنا ضروری ہے

مسلمانوں کی علم دوستی اور خدمت علم | مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنے دور عروج میں دوسری قوموں کے علوم سے پورا استفادہ کیا، ان کو ترقی دی، سیکڑوں نئے علوم ایجاد کیے، اور علمی میدان میں پوری دنیا کی امامت کی، اگر اس زمانہ میں انھوں نے علم کا پایہ نہ سنبھالا ہوتا تو بہت سے پرانے علوم جن پر موجودہ علمی ترقی کی بنیاد قائم ہے، مٹ گئے ہوتے، اور آج دنیا علم کی روشنی سے محروم رہتی، انہی نے مغربی قوموں کو یونانی علوم سے آشنا کیا۔ طب، فلسفہ، ہیئت، ریاضیات وغیرہ میں مسلمانوں کی تصانیف کے لاطینی تراجم صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہے، یورپ کی نشاۃ ثانیہ انہی کی رہین منت ہے، انہی علوم کی بنیاد پر اس نے علوم و فنون کا عظیم الشان قصر تعمیر کیا، اس لیے مفید علوم کی تحصیل اور ان کی خدمت و اشاعت خواہ وہ کسی قوم کے ہوں مسلمانوں کا خاص ورثہ رہا ہے، جدید علوم خصوصاً سائنسی فنون کی تحصیل نہ صرف مسلمانوں کی دنیاوی ترقی

اور سیاسی استحکام کے لیے ضروری ہیں، بلکہ ان کے بغیر اس زمانہ میں دین کی پوری خدمت بھی نہیں ہو سکتی، لیکن اس بارہ میں نقطۂ نظر بدلنے کی ضرورت ہے، علم و سائنس کی قوت کے لیے اخلاقی حدود کی پابندی ضروری ہے، اس کا مقصد انسانیت کی فلاح و سعادت ہونا چاہیے۔ محض مادی طاقت کا حصول، سیاسی اقتدار، قومی افتخار اور سربلندی اور سامان تعیش کی فراہمی نہیں اگر سائنسی علوم کو صحیح مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ سراسر خیر ہیں، ورنہ سراپا شر، مولانا روم آج سے صدیوں پہلے کہہ گئے

علم را بر تن زنی مارے بود   علم را بر دل زنی یارے بود

اور اس کے لیے سب سے مقدم شرط خداشناسی، خشیت الٰہی اور مواخذہ کا خوف ہے، اس کے بغیر یہ دیو قابو میں نہیں آسکتا۔

مغربی قوموں اور مغربی تہذیب کی خوبیاں | مغربی قومیں اور ان کی تہذیب محض برائیوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس میں قابل تقلید خوبیاں بھی ہیں، ان کی مادہ پرستی کے باوجود ان میں مذہب کا بھی اثر باقی ہے، چرچ اور مشنری کا پورا نظام قائم ہے، جس پر حکومتیں کروروں روپیے صرف کرتی ہیں، مذہب کی تبلیغ، اخلاقی و روحانی تعلیم و تربیت اور رفاہ عام کے کاموں اور انسانوں کی خدمت کے سیکڑوں ادارے قائم ہیں، عیسائی مبلغین اخلاق و انسانیت کا پیکر ہوتے ہیں، اور انسانی ہمدردی اور انسانیت کی خدمت میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سی چیزوں میں مذہب کی روح اور اس کے مقصد پر ہم سے زیادہ ان کا عمل ہے، ان کی دوسری نمایاں خوبی ان کی اصول پرستی اور ان کا ضبط و نظم ہے جو ان کی سرشت میں داخل ہے، سیاست کو چھوڑ کر جس میں وہ چنگیز و ہلاکو کو بھی مات کرتے ہیں، عام زندگی میں اخلاقی اوصاف میں ان کا قدم مسلمانوں سے بہت آگے ہے۔

مغربی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی | لیکن ان کی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی جس نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے، ان کا مادی تصور حیات ہے، اس کی بنیاد تمام تر مادیت اور لادینیت پر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا اثر ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں ہے، ایک طرف مذہب کا پورا نظام قائم ہے، دوسری طرف مادی ترقی اور عیش و تنعم مقصد زندگی بن گیا ہے، اور مغرب کی تمام قومیں عیش و تنعم کی سرمستی میں اور حکومتیں مادی ترقی، سیاسی اقتدار اور قومی برتری کے جنون میں مبتلا ہیں، سیاست میں دین و اخلاق کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ گئی ہے، اور عیش پرستی سے گذر کر بدمستی تک پہنچ گئی ہے، اس کے نتائج سے خود یورپ کا سنجیدہ طبقہ اور بڑے بڑے مفکرین جن میں اخلاقی احساس باقی ہے، مضطرب ہیں اور اس کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں نے صرف انکی برائیوں کی تقلید کی | مسلمانوں نے مغربی تہذیب کی تقلید بھی کی تو انکی برائیوں میں، مغربی قوموں کے اچھے اوصاف اور کمالات میں ان کی تقلید کی توفیق ان کو بہت کم ہوئی، زیادہ تر ان کے عیوب اور ان کی برائیاں ان کے حصہ میں آئیں، اس لیے وہ ان دنیاوی فوائد سے بھی محروم رہے جو مغربی قوموں کے اوصاف کا نتیجہ ہیں، اس طرح دین بھی ان کے ہاتھ سے گیا اور دنیا بھی ان کو حاصل نہ ہوئی۔ مسلمانوں کے اپنے عقائد و تصورات ہیں، اپنا نظام حیات ہے اپنی تہذیب و روایات ہیں، ان کی زندگی کا خاص نصب العین اور مقصد حیات ہے، اس کے مطالبات اور ذمہ داریاں ہیں، اگر وہ ان سب کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھل کر مادی ترقی کے اوج کمال پر بھی پہنچ گئے تو وہ خیر امت کہاں باقی رہے، جن کو نیابت الٰہی اور اقوام عالم کی ہدایت و رہنمائی کا منصب سپرد کیا گیا تھا، اس کے بجائے وہ خود انہی کی برائیوں میں مبتلا ہو کر دوسری مادہ پرست قوموں کی طرح ایک قوم بن گئے، جن کی دنیا میں کمی نہیں ہے،

مسلمانوں کا منصب اور اس کی ذمہ داری

ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ آج پوری دنیا ہدایت الٰہی کو فراموش اور انسانیت کا اصل مقام کھو چکی ہے، ہر قوم مادیت کے سیلاب میں غرق اور مادی ترقی کے جنون میں مبتلا ہے، مسلمان بھی اسی سیلاب میں بہے چلے جا رہے ہیں، حالانکہ وہ خیر امت ہیں، جن کو اقوام عالم کی ہدایت کا منصب سپرد کیا گیا تھا،

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	لوگوں کی رہنمائی کے لیے جس قدر امتیں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ
عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں
(آل عمران)	سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو،

وہ اس منصب کو فراموش کرکے "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق بن گئے ہیں لیکن اب بھی من حیث القوم انکا خصوصیات نہیں بدلا ہے، اور ان کی ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ قرآن مجید اپنی اصل شکل میں موجود ہے، اس لیے اس بجھے ہوئے خاکستر میں بھی ابھی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں، اس لیے آج بھی ان پر حق کا پیغام پہنچانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ہے، اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنے عمل سے خیر امت ہونے کا ثبوت دیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ان کے دلوں میں ایمان کی حرارت، ان کے ہاتھوں میں ہدایت الٰہی کی مشعل، ان کے اعمال و اخلاق میں اسلام کی تصویر، ان کی نگاہ میں حقیقت بینی اور ان کے بازوؤں میں علم و سائنس کی طاقت ہو اس وقت دنیا ان کی طرف توجہ کرنے اور ان کی باتیں سننے پر مجبور ہوگی، ورنہ محض کھوکھلی نقالی سے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گے اور ان کی داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات کا حل

ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مادیت اور لادینیت کے علاوہ ایک بڑا خطرہ اکثریت میں ضم ہو جانے یا کم سے کم انکی تہذیب کے رنگ میں

رنگ جانے کا ہے، گو ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے اور مسلمانوں کو بھی دستور میں وہی حقوق حاصل ہیں جو دوسری قوموں کے ہیں لیکن جمہوریت میں اقتدار ہمیشہ اکثریت کے ہاتھوں میں رہتا ہے، اور اسکی فطرت جارحانہ ہوتی ہے، ہر اکثریت اقلیت کو اپنے میں ضم یا کم سے کم اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتی ہے، جس کی کوشش ہندوستان میں بھی جاری ہے، اس سے بچنے کی صرف یہی صورت ہو کہ وہ اپنے دلوں میں ایمان کی حرارت اور عمل میں اسلامی کردار پیدا کریں، ایک طرف ان کے ایمان میں اتنا رسوخ اور دین میں اس قدر صلابت ہو کہ وہ کسی ایسے اثر کو قبول نہ کریں جو انکے مذہب اور انکی تہذیب و روایات کے خلاف ہو، دوسری طرف اپنے اعمال و اخلاق سے دلوں کو تسخیر کریں، اور ہندوستان کی تعمیر میں ایسا موثر حصہ لیں کہ دوسری قومیں انکی اہمیت ماننے پر مجبور ہو جائیں ہندوستان کو مسلمانوں نے محض تلوار کے ذریعہ فتح نہیں کیا تھا، ورنہ اتنی طویل مدت تک انکی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی، بلکہ انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا اور ہندوستانیوں کے دلوں پر اپنے عدل و مساوات اور ملک کی محبت و خدمت کا سکہ جمایا اور اپنی ساری دماغی و ذہنی صلاحیتیں ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں صرف کر دیں، مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے متحدہ ملک اور علم و فن، تہذیب و تمدن، ہر لحاظ سے اس صحرا کو گلشن بنا دیا، اسلام کی تازہ دم قوت نے ہندوستان کی مردہ رگوں میں ایک نئی روح پھونکی، اس کو توحید خالص سے آشنا کیا، انسانی مساوات کا سبق دیا، بوسیدہ رسوم و روایات اور اوہام و خرافات سے آزاد کر کے حقیقت شناس بنایا، اسلام کے اثر سے ہندو مذہب اور ہندو معاشرہ میں تجدید و اصلاح ہوئی، مسلمانوں نے ہندوستانی علوم سے جسقدر استفادہ کیا اس سے زیادہ انکی خدمت کی، ان کو پنڈتوں کے سینوں اور ہندوستان کی چہار دیواری سے نکال کر دنیا میں ان کا تعارف کرایا، نئے علوم سکھائے، ہر شعبۂ زندگی میں نفاست اور ایک ایسی مشترک تہذیب

پیدا کی جو اپنے حسن و لطافت اور خوبی و پاکیزگی میں مشرق کی تہذیبوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے،
مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام میں آج بھی رہنمائی کی طاقت ہے، اور وہ دنیا کو بہت کچھ
دے سکتا ہے، ان کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے، مگر آج اس کے وہ نتائج نہیں نکلتے جو اس سے پہلے
نکل چکے ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حاملین اسلام خود اسلام کے محاسن سے تہی دامن ہو چکے
ہیں، اس لیے وہ دوسروں پر کیا اثر انداز ہو سکتے ہیں، ان کے اسلاف اپنے عمل سے اسلام کی
تصویر پیش کرتے تھے، اس کو دیکھکر دوسری قومیں اس کی طرف کھینچی تھیں، اگر سلاطین تلوار
سے ملک کو فتح کرتے تو اپنے عدل و مساوات سے اس کو مضبوط کرتے تھے، مبلغین اسلام اور
صوفیائے کرام اپنے اخلاق و کردار سے دلوں کو تسخیر کرتے تھے، مختلف اصناف کے اصحاب
علم و کمال اپنے علوم و کمالات اور اپنی تخلیقی قوت اور تعمیری صلاحیتوں سے ملک کو سنوارتے
تھے، اس لیے مفتوحہ قومیں ان کی قابلیت اور ضرورت ماننے پر مجبور ہو جاتی تھیں، اگر آج بھی
مسلمان اس کا عملی نمونہ پیش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے وہی نتائج نہ نکلیں جو اس سے پہلے نکل
چکے ہیں، ورنہ محض زبانی دعویٰ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتا۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں دینی صلابت و پختگی نہ ہوگی تو وہ رفتہ رفتہ
اکثریت میں ضم ہو جائیں گے، اور اگر وہ ہندوستان میں اجنبی بن کر رہے، اپنے عمل و کردار
سے دلوں کو مائل نہ کیا، اور ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں حصہ نہ لیا تو ملک کا اعتماد حاصل
نہ کر سکیں گے اور احساس کمتری کا شکار ہو کر پسماندہ قوم بن کر رہ جائیں گے۔

ہندوستان میں فارسی کا مطالعہ اور اس کا مستقبل

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی، دہلی یونیورسٹی

(یہ مقالہ دارالمصنفین کی گولڈن جبلی کیلئے لکھا گیا تھا)

اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد عربی اور فارسی دونوں نے اس ملک میں جگہ لی، مگر ان زبانوں کے مصرف الگ الگ رہے ہیں۔ مذہبی تعلیم و تدریس اور دینی علوم کیلئے زیادہ تر عربی سے کام لیا گیا۔ اور ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کے ارتقاء میں جن زبانوں کو سب سے زیادہ دخل ہے، ان میں سے ایک فارسی بھی ہے، جو سینکڑوں برس تک اس ملک کی سرکاری زبان رہی ہے، اور بغیر تفریق مذہب و ملت سب نے اس کو اپنایا، چنانچہ اس دور کی تاریخ کا مطالعہ بغیر فارسی ماخذوں کے ناممکن ہے، اس طویل دور صدیوں کی مدت میں فارسی زبان و ادب نے ہندوستان میں جو ترقی کی اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایرانی محققین نے فارسی ادب کو جن تین سبکوں میں تقسیم کیا ہے، ان میں سے ایک کا نام سبک ہندی ہے۔

شعر، نثر، تاریخ، تذکرہ، انشاء، سلوک، منطق، فلسفہ، اخلاق، سیاست، طب، قصص، ترجمہ، تفسیر، جغرافیہ، قواعد، لغت، بلاغت، عروض و قافیہ، ریاضی، حدیث، کلام، فقہ، قرأت و تجوید، سفرنامہ، ملفوظات، ہیئت، مناظرہ، فتاوی، زیچ، ہندسہ، حرکت معادن، موسیقی، علم الحیوان، کیمیا، نجوم، رمل، جفر، شعبدہ بازی و طلسمات، ادعیہ، اسلحہ، تیراندازی، صید، شروح، نقل، شطرنج، گنجفہ، خطاطی، تعبیر الرؤیا، صنعت و حرفہ

طباخی، مواعظ، نحو، کشکول، قانون و دستور العمل، فرامین، کتبہ جات، آداب حرب وغیرہ فنون میں ہندوستان میں جس قدر کتابیں اور رسالے فارسی میں لکھے گئے، ان کا شمار کرنا اور ان کی فہرست بنانا مشکل ہے، ان میں سے جو کتابیں چھپ گئی ہیں ان کا بھی احصا نہیں کیا جاسکتا، اور اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ایران کے مقابلہ میں یہاں فارسی کتابیں زیادہ شائع ہوئی ہیں، تو غالباً غلط نہ ہوگا۔

گذشتہ زمانہ میں فارسی زبان و ادب میں جو کچھ کام انجام پایا، اس میں ہمارے تخلیقی آرٹ کو بہت زیادہ دخل ہے، اب ہندوستان میں فارسی کے مستقبل کا سوال ہو، اس میں تحقیق و انتقاد کو سب سے زیادہ جگہ ملنی چاہیے، اس دور کا آغاز علامہ شبلی سے ہوتا ہے، ان ہی جیسی ہستیوں کے لیے حافظ نے کہا ہے

برسرِ تربتِ ما چوں گذری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ اربابِ جہاں خواہد بود

اس سرزمین کو فخر ہے کہ اس نے علامہ شبلی جیسی شخصیت کو جنم دے کر صرف ہندوستان کے ادب کو دولت مند نہیں بنایا، بلکہ دوسرے ملکوں کو بھی اس نے استفادہ کا موقع دیا، فارسی کا کونسا ایسا عالم ہوگا جو اس بلند ہستی کو نظر انداز کرسکے اور اس سے واقف نہ ہو، فارسی ادبیات میں نہ صرف ہندوستان بلکہ اس سے باہر ایران، افغانستان، تاجکستان، وغیرہ کے لوگ اور یورپ کے مستشرقین تک ان کے آثار سے برابر استفادہ کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، اور کوئی فارسی ادب پر کام کرنے والا انکی تصانیف سے مستغنی نہیں ہوسکتا،

ایران میں شعر العجم کی پانچوں جلدوں کا فارسی ترجمہ شائع ہو چکا ہے، سب سے پہلے چوتھی جلد شائع ہوئی اور سب سے آخر میں تیسری، اس وقت میں خود وہاں موجود تھا اور مجھے

فخر ہے کہ گو میں علامہ شبلی کی زیارت نہ کر سکا، مگر ان کی کتابوں کے مترجم سید محمد تقی فخر داعی گیلانی سے مل چکا ہوں جن کی عمر ۱۹۵۵ء میں اسّی برس کے قریب تھی، فخر داعی تیسری جلد کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: "چونکہ میں اس ترجمہ کے وقت درد کمر اور درد مفاصل میں مبتلا تھا، اس لیے اس کام میں کافی زحمت اٹھانی پڑی"۔ استاد سعید نفیسی اس جلد کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "اس مفید اور پرمغز کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جسے ایک دانشمند اور روشن بین انسان نے ادبیات فارسی جیسے لافانی خزانہ کے قیمتی موتیوں کے تجزیہ اور تحلیل میں لکھا ہے اور "الفضل للمتقدم" کی بنا پر شبلی کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس سے قبل افغانستان میں بھی شعر العجم کی جلدوں کے ترجمے ہوئے تھے، مگر یہ ترجمہ ایرانیوں کے ذوق کے موافق نہ تھا"۔

چونکہ میں بھی علامہ شبلی کے وطن کا ایک حقیر ذرہ ہوں، اس لیے مجھے اس بلند شخصیت سے جذباتی لگاؤ بھی ہے لیکن میرے جیسے انسانوں کا مطالعہ، جن کا نقطۂ نظر محدود ہے، حضرت شبلی کے مرتبہ کو اچھی طرح اجاگر نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے، اگر مختلف مذاق کے لوگ ملکر ان کا مطالعہ کریں تو شاید اس کا احاطہ کر سکیں، ہمیں چاہیے کہ علامہ شبلی کے نقش قدم پر چل کر اپنی دیرینہ روایات اور ادبیات کا گہرا مطالعہ کریں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ فارسی کی تمام مطبوعہ کتابوں اور رسالوں کی مکمل فہرست بنائی جائے اور ان میں سے اہم چیزوں کو پھر سے اڈیٹ کر کے شائع کیا جائے۔

مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ہندوستان میں اور اس سے باہر فارسی کی بیشمار اہم قلمی کتابیں جو ابتک منظر عام پر نہ آسکیں، اور نفائس المآثر، مجمع النفائس، نظم گزیدہ، باغ معانی، گلدستۂ معانی، ریاض الشعراء، ریاض الافکار، ہمیشہ بہار، نشتر عشق،

طبقات شاہجہانی، جہانگیر نامہ طالب آملی، پنجاکیانہ، سیر المنازل، فتحنامہ نور جہاں بیگم، رقعہ نامہ حسرت، حکایت پادشاہاں، شاہجہاں نامہ امین قزوینی، یحییٰ کاشی، عنایت خاں، ابوطالب کلیم، جلال الدین طباطبائی، قدسی مشہدی، چار چمن برہمن، جنگ اسلام خاں، آثار شاہجہانی، فتح کانگڑہ، تاریخ شاہ شجاع، عرفات عاشقین، خلاصۃ الاشعار، خلاصۃ الکلام، تذکرۃ الشعراء، تذکرہ کاتب، تکملۃ الشعراء، سفینۂ عشرت، صحف ابراہیم، مخزن الغرائب، ید بیضا اور صبح صادق جیسی اہم کتابیں اور تذکرے ابھی تک چند قلمی نسخوں تک محدود ہیں جن تک عام طور سے لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی، ضرورت ہے کہ یہ مآخذ اڈیٹ کرکے شائع کیے جائیں، تاکہ محققین تک آسانی سے پہنچ سکیں،

ہمارے ملک میں بکثرت پبلک اور شخصی کتبخانے ہیں جن میں سے اکثر کتب خانوں کو عام طور سے لوگ نہیں جانتے اور نہ ان تک آسانی سے ان کی رسائی ہوتی ہے، مثلاً مہاراجہ بنارس کا کتب خانہ، بنارس یونیورسٹی کا سر پرام کلکشن، لکھنؤ میں آغا ابو صاحب اور تقی صاحب کے کتب خانے، لکھنؤ کے ایک کتب خانہ کو گورنمنٹ سے ہر طرح کی امداد ملتی ہے، اور ابن حبیب بغدادی کی المنمق کا واحد قلمی نسخہ اسی کتب خانہ میں ہے، چونکہ نظام حیدرآباد کے یہاں سے اس خاندان کو وظیفہ ملتا تھا، اس لیے اس قلمی نسخہ کی نقل دائرۃ المعارف کو مل گئی تھی، مگر ابھی حال میں جب ایک صاحب دائرۃ المعارف کیجانب سے اس کتاب کو اڈیٹ کرنے کے سلسلہ میں لکھنؤ گئے تو کتب خانہ کے مالکوں نے ان کو اصل نسخہ سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں دی، جو بڑا علمی اور اخلاقی جرم تھا، اس لیے حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسے اداروں کو مجبور کرے کہ وہ علمی کاموں میں رکاوٹ پیدا نہ کرسکیں۔

ایسے کتب خانے بھی ہیں جو مشہور ہیں، اور ان میں استفادہ کرنے والوں کو ہر طرح کی

سہولت ملتی ہے، مگر بدقسمتی سے ان کی فہرستیں ابھی تک نہیں چھپ سکیں، رضا لائبریری جیسے اہم کتب خانہ کی مکمل فہرست ابھی تک رامپور سے باہر دستیاب نہیں ہو سکتی۔

اس لیے ضرورت ہے کہ پہلے تمام رسمی اور غیر رسمی کتب خانوں کی مکمل فہرست تیار کیجائے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ ان سے روشناس ہو سکیں، پھر ان کی محققانہ فہرستیں مرتب کیجائیں تاکہ محققین غلطیوں کا شکار نہ ہو سکیں، ابھی الور میوزیم کی فہرست چھپی ہے، جس میں دیوان سرمد کا ذکر ہے لیکن درحقیقت یہ سرمد کا دیوان نہیں ہے، جب میں نے ۱۹۶۱ء میں الور میوزیم کو دیکھا تھا، اس وقت بھی وہاں کی قلمی فہرست میں یہ غلطی موجود تھی، جو مطبوعہ فہرست میں منتقل ہو گئی ہے، مجھکو وہاں ایک آدمی بھی ایسا نہ ملا جو فارسی کا کیا ذکر اردو سے بھی واقف ہو، اس لیے یہ کام بھی اہم ہے، اس قسم کے خزانوں کی نگرانی ایسے لوگوں کے سپرد کی جائے جو علمی طریقہ سے ان کی نگرانی اور خود بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہوں۔

کتب خانوں کی تنظیم کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان تمام مخطوطات کا مطالعہ کیا جائے جو ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ و تہذیب اور آثار قدیمہ کے مطالعہ میں مدد دے سکتے ہوں، ان کے مطالعہ سے بہت سے ایسے گوشے سامنے آئیں گے جن سے ابتک لوگ ناواقف ہیں، رفتہ رفتہ کئی نادر کتابیں تلاش سے نکل رہی ہیں۔

پنچتنترا کا تقریباً دنیا کے تمام متمدن ممالک میں بار بار ترجمہ ہو چکا ہے، اس کے تقریباً ساٹھ زبانوں میں دو سو ترجمے موجود ہیں، اور جاوا سے لیکر آئس لینڈ تک اس کا دائرہ پھیلا ہوا ہے، علماء و محققین نے اس موضوع پر بہت کام کیا ہے، اور تقریباً تمام ترجموں کا پتہ لگایا ہے، پھر بھی ایک بیحد اہم ترجمہ ان کی نظروں سے پوشیدہ رہ گیا، ابھی حال میں اس ترجمہ کا پتہ چلا ہے جس کا نام پنچاکیانہ ہے، اور جسے مصطفیٰ خالقداد عباسی نے شہنشاہ اکبر

کے حکم سے براہ راست سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا۔ اس کا واحد قلمی نسخہ نیشنل میوزیم انئی دہلی میں موجود ہے۔ (نمبر ۶۲۰۱۰۰۵)

ہندوستان کے قرون وسطیٰ کے تاریخی اور تہذیبی مطالعہ کے لیے کچھ محدود کتابیں جنکو لوگ پہلے اصل زبان میں پڑھا کرتے تھے، لیکن اب زیادہ تر ان کے ترجموں سے کام نکالا جاتا ہے، اس سے مطالعہ کرنے والے کتاب کی اصل روح سے دور ہوتے جارہے ہیں، ترجموں میں غلطیوں کے امکانات بھی ہوتے ہیں، جنسے غلط نتیجے نکل سکتے ہیں۔

ان کے علاوہ بیشمار ایسی کتابیں اور تذکرے ہیں، جن کا ابتک کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا ہے، اور ان کے ماخذ سے عام طور پر لوگ محروم رہتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کی اہم کتابوں کا زیادہ سے زیادہ ترجمہ کیا جائے، اور ان کے متن کو معیاری طریقہ سے شائع کیا جائے اور لوگ اصل متن کے پڑھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔

پھر یہ غلط خیال ہے کہ صرف تاریخ کی کتابوں سے مورخین کے لیے مواد مل سکتا ہے، مجھے ڈاکٹر اشرف مرحوم کا کہنا کبھی نہیں بھولتا کہ تاریخ و تہذیب کے مطالعہ کے لیے ادبیات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس سے بڑا مواد مل سکتا ہے۔

چنداین یا داستان مینا و لورک کو مولانا داؤد نے فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں ہندی میں نظم کیا تھا۔ اور مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی دہلی میں اس کے بعض حصوں کو منبر پر پڑھاکرتے تھے جس سے سامعین پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی، اس زمانہ کے بعض علماء نے اس نظم کے پڑھنے کا سبب پوچھا، تو جواب دیا کہ یہ کتاب صاحبانِ عشق کے وجدان اور آیاتِ قرآنی کے مطابق ہے، مولانا داؤد کی چنداین سے شیخ عبدالقدوس گنگوہی اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ فارسی نظم میں اس کا ترجمہ کردیا، بدقسمتی سے اب اس فارسی مثنوی کے صرف سات شعر لطائف قدوسی

میں محفوظ رہ گئے ہیں، عہد جہانگیری میں یہ داستان "عصمت نامہ" کے نام سے منظوم ہوئی ہے۔

اسی طرح نوعی خبوشانی کی ایک مختصر مثنوی "سوز و گداز" ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک حسین دلہن کا شوہر بارات آتے آتے ایک کہنہ مکان کے گرنے سے مرجاتا ہے، وہ ستی ہونا چاہتی ہے، شہنشاہ اکبر کو معلوم ہوتا ہے، تو اسے بلاکر اپنے تخت پر بٹھاتا ہے، اسے رانی کا خطاب دیتا ہے، اور سوائے تخت شاہی کے دنیا کی ہر نعمت اس کے سامنے پیش کردیتا ہے، مگر وہ کسی طرح ستی ہونے سے باز نہیں آتی، اس وقت بادشاہ شہزادہ دانیال کو حکم دیتا ہے کہ وہ خود جاکر شاہزادیوں کی طرح اس کی ستی کا انتظام کرے، اور جب وہ بیچاری کرب و بے چینی کے ستی ہو جاتی ہے تو شاہزادہ روتے روتے غش کھا جاتا ہے، اکبر بھی اس واقعہ سے بیحد متاثر ہوتا ہے، اور نوعی کو بلاکر کہتا ہے کہ تم لوگ کب تک گل و بلبل کے پارینہ افسانے دہراتے رہوگے، اور اس سچے واقعہ کو نظم کرنے کا حکم دیتا ہے۔

دیوان ہجری کا ایک عمدہ نسخہ انڈیا آفس میں ہے، خواجہ ہجری ہمایوں کے ہمعصر مداح اور درباری شاعر تھے، جب اکبر تخت نشین ہوا تو ہجری نے اس نوجوان بادشاہ کو قصیدوں میں نصیحتیں کرنا شروع کیں، ایک قصیدہ میں اکبر کو غلہ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی کی طرف متوجہ کیا ہے، ایک قصیدہ میں اس کی ژولیدہ باتوں پر متنبہ کیا ہے، اور ان کو سلیقہ سے رکھنے کی تعلیم دی ہے، دیوان ہجری میں بہت سے مطالب و جزئیات ہیں جو عام طور سے لوگوں کی نگاہوں سے ابتک پوشیدہ ہیں[1]۔

ہندوستان کی بہت سی داستانیں دنیا کے ادب کا حصہ بن چکی ہیں، لہرام و یوذاسف کا قصہ جو اصل میں بھگوان اور بدھ ہی سے متعلق ہے، دوسری زبانوں کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی

---

[1] مقالہ نگار ہجری پر ایک مستقل مضمون لکھ رہے ہیں جو آئندہ کسی نمبر میں شائع ہوگا۔

کئی مرتبہ ترجمہ ہو چکا ہے، اس قصہ کو "اخوان الصفا" جیسی اہم کتاب میں جگہ ملی ہے، ملا محمد باقر مجلسی نے عین الحیات میں اس قصہ کو خاص طور سے بیان کیا ہے۔

فارسی نے خاص طور سے اس قسم کے قصوں کی مقبولیت میں مدد پہنچائی ہے، اور اس زبان میں ہمارے بیشمار ملکی قصے لکھے جا چکے ہیں، جن میں سے نل دمن، مہابھارت، رامائن، طوطی نامہ، سنگھاسن بتیسی، ہیر رانجھا، پدماوت، کام روپ کام لتا، سسی پنون، منوہر و مدھومالتی، مدھاونل و کام کندلا، سوہنی مہیوال، منکا و منوہر، مہیار و چندر بدن، چتر کرت وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح سے بہت سے ہندوستانی قصے مولانا روم کی مثنوی اور دوسری کتابوں میں ملتے ہیں، ہمارے محققین کے لیے ان میں بڑا خزانہ موجود ہے، جس سے علمی اور تہذیبی ارتقا میں گرانبہا اضافہ ہو سکتا ہے، اور بہت سے ایسے واقعات اور نکتے ہیں جو صرف ادبیات کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

شعر کی مناسبت سے فارسی شعراء کے تذکروں میں ہمیں بہت سے خطاطوں، معماروں، موسیقی والوں، جامہ بافوں، مہر کنوں، قصہ خوانوں، تاجروں، کلالوں، آتش کشوں، کلچہ پیزوں، زعفران فروشوں، مصوروں، طبیبوں، دلالوں، سماروں، حکاکوں، پیشنازوں، خشت پزوں، روغن گروں، زرکشوں، سپاہیوں، مدرسوں، خیاطوں، جوہریوں، نقاشوں، دلالوں، طباخوں، عطاروں، کیمیاگروں، رباب نوازوں، معماروں، نقارچیوں، بقالوں، رفوگروں، واعظوں، حلوہ فروشوں، درویشوں، تعزیہ خوانوں، سیاحوں، کاغذگروں، منشیوں، حجاموں، حاجیوں، کمانگروں، شاہنامہ خوانوں، قپی بافوں، حافظوں، متصدیوں، شطرنج بازوں، مہندسوں، تاجروں، ابریشم کشوں، منجموں، مفردہ نویسوں، سجادہ نشینوں، رنگریزوں، آتش پرستوں وغیرہ کے بھی حالات معلوم ہو جاتے ہیں جن میں سے بعض کو اس لیے گروہ

ولی پیشوں سے تعلق رکھتے تھے، ہم کسی اور ماخذ سے معلوم نہیں کر سکتے۔

فارسی کی فرہنگیں اور گرامر وغیرہ زیادہ تر ہندوستان میں لکھی گئیں، اور آج ایرانیوں کو ضرورت ہے کہ ان کو شائع کریں۔ برہان قاطع، فرہنگ آنندراج وغیرہ ایڈٹ کر کے شائع اور ہماری چیزیں یا ان کے مطبعوں میں چھپکر وہاں کے بازاروں میں فروخت کی جا رہی ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کی بنیادی چیزیں بھی زیادہ سے زیادہ ایڈٹ کر کے شائع کی جائیں، جن کی ہمیں اور دوسروں کو ضرورت ہے۔

فارسی کا رشتہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بھی بڑا گہرا ہے۔ ان زبانوں کے مطالعے کے لیے بھی فارسی میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے بیشتر بڑے کلاسیکی اردو کے شعرا کا یہ اہم پہلو اپنی کمزوری اور کم علمی کی وجہ سے نظرانداز کر دیا جاتا ہے کہ وہ مستقل فارسی کے شاعر اور نثر نویس تھے، غالب نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فارسی بیں تا ببیں نقشہائے رنگ رنگ

بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

نظیر اکبرآبادی کی علمیت میں لوگوں کو شک تھا، اور جب پالمن نے کہا کہ انھوں نے فارسی میں نو رسالے لکھے اور صاحب دیوان تھے، تو لوگوں کو اس کا یقین نہیں آیا تھا۔ یہ رسالے مفقود یاب تھے کہ خود پالمن ساپت بتا سکے۔ شہباز کو ان میں سے صرف پانچ اور نیاز صاحب کو تین رسالے مل سکے، ابھی حال میں مجھے آٹھ رسالے مل گئے ہیں، جن میں سے دو رسالے "مجمع مضامین" اور "انشائے محفل" ایسے ہیں جن کا نام بھی آج تک کسی کو معلوم نہ تھا۔ بہرحال اردو کا صحیح مطالعہ بغیر فارسی کے ناممکن ہے۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ ہندوستانی فارسی شاعری اور ادب تیسرے درجے کا ہے، جس کی شکایت اکثر حضرات کیا کرتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ نئے سبک سے واقف نہیں ہیں، اگر چاہے

اسلاف سعدی و حافظ، عرفی و نظیری وغیرہ سے استفادہ کر سکتے تھے، تو آج کے شعرا نیما یوشیج اور شہریار جیسی عظیم شخصیتوں سے استفادہ کرکے اپنے سرمایہ میں اضافہ کر سکتے ہیں،

کچھ دنوں پہلے فارسی کو زیادہ تر ایک تہذیبی زبان کی حیثیت سے پڑھا جاتا تھا، اب گو اسکے طلبا، کی تعداد کم ہوگئی ہے، مگر تحقیق و انتقاد کے لحاظ سے فارسی میں جو کام ہو رہا ہے اس سے کافی ہمت افزائی ہو رہی ہے، آزادی کے بعد ہندوستان کے پرانے اداروں میں توسیع ہوتی جارہی ہے، اور نئے نئے تحقیقی ادارے قائم ہو چکے ہیں، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز علی گڈھ، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر، ادارۂ مخطوطات حیدر آباد، ریسرچ اینڈ پبلک ڈویژن سرینگر وغیرہ جیسے ادارے روز بروز ترقی کرتے جا رہے ہیں، جن میں نہایت مفید کام ہو رہا ہے۔

ایران و افغانستان وغیرہ سے ہمارے روحانی اور معنوی رشتے قدیم زمانے سے بڑے مستحکم رہے ہیں، ہمیں ان قدیم اور جدید دونوں رشتوں کو استوار کرنا ہے۔

ایران کو ہندوستانی فلسفہ سے اتنا گہرا لگاؤ رہا ہے کہ ستر ہویں صدی عیسوی میں وہاں کے ایک بڑے فلسفی میر ابو القاسم فندرسکی "جوگ بشست" کا فارسی ترجمہ یہاں سے لے گئے اور اس پر حاشیہ لکھا، فرہنگ درست کی اور اس کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس میں فرماتے ہیں

چوں ز قرآں گذشتی و ز اخبار

نیست کس را بہ این نمط گفتار

سمرقند و بخارا وغیرہ کو بھی ہندوستان سے بڑا تعلق رہا ہے، ابھی حال ہی میں تاجکستان میں "منتخبات ملا عبد الرحمن مشفقی" شائع ہوئی ہے، حسام الدین عینی، عبد الغنی میرزایف، ترسون زادہ اور دوسرے تاجکستانی محققین اور علماء نے مشفقی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، ہم جانتے ہیں مصرع

ضرب المثل ہے:

"از بام خانہ تا بثریا از ان تو"

شفقی دو مرتبہ ہندوستان آئے اور جب ۱۵۷۸ء میں شہنشاہ اکبر پاک پٹن شریف شیخ فرید گنج شکر کے مزار مبارک کی زیارت کو گئے تو شفقی کی رسائی ان تک ہوئی۔ وہاں کے محققین نے صرف اپنے یہاں کے منابع سے کام لیکر شفقی کا تعارف کرایا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ آئین اکبری، اکبرنامہ، طبقات اکبری، منتخب التواریخ وغیرہ کی مدد سے اس شاعر کا تعارف کرایا جائے جو ہندوستان اور تاجکستان کو جوڑنے والی ایک بڑی کڑی ہے۔

افغانستان اور ہندوستان قدیم زمانہ سے ایک رہے ہیں، اس زمانہ میں ان دونوں ملکوں کی وحدت کا پتہ اصل سنسکرت کی کتابوں کے علاوہ ان کے ترجموں سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جوگ بششت کے فارسی ترجمہ میں جہاں بہت سی فلسفیانہ، روحانی اور اخلاقی داستانیں ہیں، وہاں ہندوستان کے راجہ سورگھو (Suragha) کا بھی قصہ ہے، جو کبھا (Kubha) یعنی کابل کے راجہ پرگھ (Pragha) یا پرناد (Pranada) کا دوست تھا، اور جب راجہ پرگھ کے ملک میں قحط پڑا تو یہاں کا راجہ اس سے ملنے گیا تھا رگ وید (Rig - Vada) کے سات دریاؤں میں سے ایک کا نام کبھا (Kubha) ہے۔

مہاتا بدھ کے دو عظیم مجسمے سرخ بدھ اور خاکستری بدھ ابتک بامیان میں پرانی عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔

بلخ کو زرتشت سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسی بلخ میں بدھ مذہب کا بہت بڑا مندر نوبہار (Nou Bahara) تھا۔ جہاں کابل، ہندوستان اور چین کے زائرجایا کرتے تھے، بلکہ اصل میں پرمکھ (Pramukh) ہے، یہاں کا سب سے بڑا پجاری تھا جس کے

خاندان کا اسلامی تہذیب کے سنوارنے میں بہت بڑا حصہ ہے۔ کنشکا اور یونانی بادشاہ مینندر (Menandra) دونوں بدھ مذہب کے پیرو تھے، ایران و ہندوستان کے تصوف نے خصوصیت سے بودائی اور ہندی فلسفہ کے زیر اثر نشو و نما پائی ہے، اور یہاں کے نروانا (Nirvana) نے وہاں فنا کی شکل اختیار کی ہے، یہ تصوف مدتوں سرزمین بلخ میں پروان چڑھا جو صدیوں بدھ مذہب کا مرکز رہ چکا تھا، نیز ایرانی تصوف کے بڑے بڑے پیشوا ابو اسحٰق ابراہیم بلخی، ابو علی شقیق بلخی اور عبد الرحمٰن بلخی جیسی شخصیتیں رہی ہیں، سب سے بڑے صوفی شاعر مولانا رومی اسی خاک پاک سے تعلق رکھتے تھے۔

مثل مصوری کا اصل مسکن ہرات ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں خواجہ عبد اللہ انصاری اور ملا عبد الرحمٰن جامی جیسی ہستیاں آرام کررہی ہیں الغرض ان تمام گوشوں پر از سر نو کام کرنے کی ضرورت ہے، جن میں فارسی ادب کا بہت زیادہ حصہ ہے۔

اب فارسی کو صرف ایک مردہ یا کلچرل زبان کی حیثیت سے نہیں پڑھنا چاہیے، بلکہ اس لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ وہ زندہ ملکوں کی زبان ہے، جن سے ہمارے تعلقات روز بروز بڑھتے جارہے ہیں، اس لیے اگر ایک طرف ہمیں گذشتہ تاریخ و تمدن کے مطالعہ کے لیے کلاسیکی ادب کی ضرورت ہے تو دوسری طرف ہمیں ایسی فارسی بھی سیکھنی ہے جو ہمیں ہمسایہ اور دوست ملکوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد دے سکے۔

دہلی یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں میں بی، اے اور ایم، اے کلاسوں کے علاوہ جدید فارسی کے ایسے سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کورس بھی کھولے گئے ہیں جن سے لوگوں کو فارسی بولنے، لکھنے اور جدید لب و لہجہ کے سمجھنے میں مدد مل سکے اور وہ ریڈیو، وزارت، سفارت وغیرہ میں بغیر غیر ملکی امداد کے اپنا کام خود چلا سکیں، آل انڈیا ریڈیو کے فارسی شعبہ میں پہلے بیرونی لوگ کام

کرتے تھے اور انھیں پر بیشتر دارومدار تھا، مگر اب رفتہ رفتہ ہندوستانی ان کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں میں فارسی کے لسانی مطالعہ کا رواج نہیں تھا، فارسی زبان دوسری زبانوں سے نکلی ہے، اس لیے فارسی کا صحیح مطالعہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ان زبانوں کا بھی مطالعہ نہ کیا جائے جنھوں نے اس زبان کے بننے اور سنورنے میں مدد دی ہے، سنسکرت اور اوستا کی ان ایک اور زبان تھی جس کا اب وجود نہیں ہے لیکن ان کی مشابہت اور یگانگت بتلاتی ہے کہ ان کی ماں کیسی رہی ہوگی، اسی طرح فارسی باستان، پہلوی، سغدی وغیرہ بھی اوستا اور سنسکرت سے بہت قریب اور آریائی زبانیں ہیں، اس لیے فارسی کے سائنٹفک مطالعہ کے لیے سنسکرت اور اوستا وغیرہ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

ہماری یونیورسٹیوں میں ابتک سنسکرت اور فارسی کو ساتھ ساتھ نہیں پڑھایا جاتا حالانکہ ان دونوں کے ساتھ تعلیم دینے سے دونوں کے مطالعہ میں مدد ملے گی، پارسیوں کے یہاں اوستا اور پہلوی کا مطالعہ مذہبی حیثیت سے ضروری ہے، اس لیے بمبئی کے اطراف میں ان زبانوں کا رواج تھا لیکن اب شمال میں بھی ان کی طرف توجہ کی جا رہی ہے، دہلی یونیورسٹی میں چند برسوں سے فارسی باستان، اوستا اور پہلوی کو بھی نصاب میں داخل اور ان کے پڑھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہندوستانی محققین اس نکتہ سے غافل نہیں ہیں۔ S. K. Sen کی کتاب Old Persian اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے، مگر اب اس کی طرف باقاعدہ اور منظم طریقہ سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ادب کی تاریخی، لغوی اور اصطلاحی ماہیت

از جناب وقار احمد صاحب رضوی، ایم، اے

ادب کائنات کا علم بھی ہے اور اس کا عرفان تام بھی، وہ علم اور تہذیب کی دولت کو عام کرتا ہے، مادی اور جسمانی دنیا میں حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ اور زندگی کی مادی جدلیت کو اقدار عالی سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ وہ فنی تجربات کی نفسیاتی تشریح کرتا ہے۔ ماورائیت کی لاشعوری توجیہ بھی ہے اور تاریخی روایت پرستی اور انفرادیت کا شعوری امتزاج بھی۔ حیاتیاتی تصور ادب کی نوعیت کو قدر و قیمت کا اندازہ عطا کرتا ہے۔ ادب تحلیل نفسی میں، جبلتوں کے سہارے عمل اور زندگی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ وہ ماضی بعید سے بعید از فہم ابد کی طرف کسی نامعلوم راستے سے سفر کرتا ہے اور اپنے خوش آیند نغموں سے فضا کو مترنم کر دیتا ہے۔

ادب ایک ایسا عمل ترکیب ہے جو ہیئت نامیہ کے منتشر رجحانات میں ربط قائم کرتا ہے، سماجی قدروں اور انسان کی فطری خواہشوں کا تصادم فنکار کو فنی اظہار و ابلاغ کی طرف لیجاتا ہے۔ ابلاغ تخلیقی ادب کا ایک شعبہ ہے، ادب، اظہار کا ایک ڈھنگ ہے۔ وہ ادیب کے احساس کی نمایندگی بھی کرتا ہے اور حسن، لطافت اور رنگینی کو اثر اندازی کی طاقت بھی دیتا ہے۔ وہ فطرت کا اظہار بھی ہے اور خارجی حقائق کے شعور و ادراک کا نتیجہ بھی ہے۔

ادب نفس انسانی میں شایستگی، افکار و خیالات میں روشنی، احساسات میں نزاکت، زبان میں سلاست اور زور پیدا کرتا ہے۔ ادب کا اطلاق ان تصانیف پر بھی ہوتا ہے

جو کسی علمی یا ادبی تحقیق کا نتیجہ ہوں۔ اور ان کتابوں پر بھی جو فکر و فن میں باہمی تاثر اور انشاء و اسلوب نگارش کی بہترین مثال تصور کیجاتی ہیں۔

ادب کی ابتدائی تاریخ اور آغاز کے بارے میں کوئی نص صریح یا برہان قاطع ایسی نہیں ہو جو اس کلمے کی تاریخی حیثیت سے بحث کرے۔ یہ ایک ایسی خبر ہے جس کی مبتدا کا سراغ نہیں ملتا۔ اس لفظ کا وجود نہ سامی زبانوں میں ملتا ہے اور نہ عربوں کی جاہلی شاعری میں۔ عہد جاہلی کی تاریخوں میں کچھ اقوال ایسے ضرور ملتے ہیں، جن کے مطالعہ سے اس سلسلے میں مدد ملتی ہے۔

اس ذیل کا ایک قول تو وہ ہے جو حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر نے کسریٰ کے نام ایک خط میں تحریر کیا تھا۔ اس میں لکھا تھا:

وقد اوفدت ایها الملک!	اے بادشاہ! میں عرب کے ایک گروہ کو آپ کے
رهطا من العرب لهم فضل	پاس وفد بنا کر بھیج رہا ہوں۔ جو حسب و نسب
فی احسابهم وانسابهم و	میں فضیلت رکھتے ہیں، یہ لوگ دانشمند بھی
عقولهم وآدابهم[1]	اور صاحب اخلاق و آداب ہیں۔

اور دوسرا قول وہ ہے جو علقمہ بن علاثہ نے کسریٰ کے سامنے کہا:

فلیس من حضرك منا بافضل	ہم میں جو لوگ آپ کے پاس آئے ان کو
ممن عزب عنك بل لو قست	ان لوگوں پر فضیلت حاصل نہیں ہے جو
کل رجل منهم وعلمت منهم	نہیں آئے، اگر آپ ان کا باہم موازنہ
ما علمنا لوجدت له فی آبائه	کریں اور جتنا ہم کو ان کے بارہ میں
اندادا و اکفاء کلهم الی الفضل	علم ہے اتنا آپ بھی جان لیں تو آپ ان کو

[1] ابن عبد ربہ: العقد الفرید، ج ۱ ص ۱۴۸ (۱۳۲۱ھ)

منسوب وبالشرف التلید ۔۔۔ جو اپنے ہم سر، ہم مرتبہ پائیں گے، وہ سب

موصوف وبالرای الفاضل ۔۔۔ صاحب فضل و شرف ہیں، ان میں سب سے

والادب معروف[1] ۔۔۔ اور وہ اعلیٰ رائے سے موصوف اور ادب سے آراستہ ہیں۔

یہ روایات اور اقوال ہیں، ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، ممکن ہے بعد میں وضع کی گئی ہوں، ان روایات سے جہاں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ جاہلی عربوں کا تصور، ادبی، سیاسی اور اجتماعی زندگی کے متعلق کیا تھا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ عرب نژاد ہے، دخیل نہیں ہے۔ اس لفظ کے عربی الاصل ہونے کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ عربی زبان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں، جو حروف مادہ میں کلمۂ ادب سے مناسبت رکھتے ہیں اور صوتی اعتبار سے قریب المخرج اور قریب المعنی ہیں، جیسے بَدَأَ، أَبْتَدَ، دَأَبَ۔ ان الفاظ میں جنسی معنی سب میں مشترک ہیں، کیونکہ تعلق بالشی اور ارتکاب عادت کا مفہوم سب میں پایا جاتا ہے۔

بعض محققین (جرجی زیدان اور زیات وغیرہما) کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی اور دوسری سامی زبانوں میں سُمیریوں کی زبان سے آیا، جو قدیم زمانے میں جنوبی عراق میں آباد تھے۔ ان سے حملہ آوروں (سامیوں) نے اس لفظ کو اڑا لیا۔ سُمیریوں کے یہاں اس لفظ کے معنی انسان تھے۔ سامی زبانوں میں یہ لفظ ادب سے اَدیم اور ادم سے آدم ہو گیا۔ لیکن عربوں نے اس لفظ کو اپنی اصلی حالت پر محفوظ رکھا۔ عرب صحرائی زندگی بسر کرتے تھے، ان کی زبان دوسری زبانوں سے خلط ملط نہیں تھی، انھوں نے اس لفظ کو آدمیت یا انسانیت کے معنی میں استعمال کیا۔ اور لازم بول کر ملزوم مراد لیا۔ اس میں

---

[1] ابن عبد ربہ: العقد الفرید ج ۱ ص ۱۲۵ (مصر [illegible])

فضائل حمیدہ اور شرافت کا مفہوم پیدا کیا، مگر یہ ایک مفروضہ ہے حقیقت علمیہ نہیں۔

قریش کی زبان اسلام کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زبان ہے، قریش کی زبان نے عرب کی دوسری زبانوں کو بھی متاثر کیا، اور خود بھی ان سے متاثر ہوئی۔ قرآن مجید اسی زبان میں نازل ہوا ہے ادب کے معنی تہذیب تادیب کے لیے جاتے ہیں، یہ کلمہ سبک اور فصیح ہونے کے باوجود اگرچہ قرآن شریف میں بعینہٖ نہیں آیا ہے، لیکن ادب کا معنوی وجود قرآن میں ملتا ہے، قرآن معلم اخلاق ہے، تہذیب نفس اور اخلاق کا مبلغ ہے، اس اعتبار سے قرآن مجید میں الفاظ کی بلاغت یعنی ادب کا لفظی مفہوم اور تہذیب اخلاق کی تعلیم یعنی ادب کا معنوی مفہوم ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ سے عربی زبان میں، لفظ ادب کے وجود کی تائید ہوتی ہے، مشہور حدیث ہے:

ادّبنی ربّی فاحسنَ تادیبی	میرے پروردگار نے میری تربیت کی اور خوب کی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ان هذا القرآن مادبة الله فی	بیشک قرآن اس دنیا میں ایک خوان الٰہی ہے
الارض فتعلموا من مادبته[1]	پس اس خوان سے تم لوگ استفادہ کرو۔

مادبة: ادب سے بطور تشبیہہ اسم مکان ہے۔

حضرت علیؓ کا قول روایت میں آیا ہے:

اما اخواننا بنی امیة فقادة	ہمارے بھائی بنی امیہ دسترخوان والے
ادبة[2]	لیڈر ہیں۔

اس روایت میں اَدَبَۃٌ، آدِبٌ کی جمع ہے، جیسے کاتب کی جمع کَتَبَۃٌ۔ آدب:

---

[1] ابن الاثیر: النہایة، مادہ ادب۔ [2] ایضاً

اس شخص کو کہتے ہیں جو دسترخوان کی طرف بلاتا ہے، مادُبة اس کھانے کو کہتے ہیں جو دعوت کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اس تشریح سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس لفظ کے اصل معنی "کھانا" ہیں، جیسا کہ بعض علمائے لغت کا خیال ہے، ان احادیث اور اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ عہد رسالتؐ، عہد صحابہ اور خود ایام جاہلیت میں جانا پہچانا تھا، صدر اسلام میں اس کے جو معنی تھے، اس میں وسعت پیدا ہوئی، اور وہ اخلاق کریمہ اور ان سے زندگی پر پڑنے والے اثرات کے معنی میں بولا جانے لگا، دعوتِ طعام ہو یا دعوتِ تہذیب جنس بہرحال دونوں میں مشترک ہے۔

ادب کے لغوی معنی دعوتِ ولیمہ اور اصطلاحی معنی دعوتِ تہذیب نفس ہے، جنس کے اشتراک اور فصل کے امتیاز سے دو نوعیں ہیں۔ چونکہ یہ لفظ عہد جاہلیت اور صدر اسلام میں کھانے اور تہذیب و تربیت کے مفہوم میں تھا، اور اب بھی یہی معنی ہیں، اس لیے یہ لفظ منقول ہے، مُرتجل[1] نہیں ہے۔

"لسان العرب" میں ادب کے لغوی معنی دعوت: بلانا ہے، وہ کھانا جس کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے، اس کو مدعاۃ اور مادبۃ کہتے ہیں، وہ لٹریچر جس سے ادیب، متادب ہوتا ہے اس کو ادب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اچھائیوں کی طرف بلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔

"المحیط" میں الادَبُ (متحرک الاوسط) کے معنی لطافتِ طبع اور خوش اطواری کے ہیں۔ ادّبہ: علمہ۔ سکھایا۔ تأدّبَ بہ: تعلّم بہ۔ سیکھا۔ الادْب (بسکون العین) کے معنی تعجب کے ہیں۔ جیسا کہ الادبۃ (بالضم) کے معنی تعجب اور پسندیدگی کے ہیں۔ اور ادب البحر کے معنی پانی کی زیادتی ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ لغوی اور مستعمل فیہ معنی میں جنسی اشتراک ہے، کیونکہ ادب محامد و محاسن کی طرف بلاتا ہے۔

---

[1] معنی موضوع لہ اور مستعمل فیہ میں مناسبت ہو تو منقول ہے، جیسے صلوٰۃ، اور اگر مناسبت نہیں ہے تو مرتجل ہے

اس کے علاوہ لفظ ادب کا ایک اور دلچسپ پہلو ہے، اس کو اٹلی کے مشہور مستشرق کارلو نالینو (متوفی ۱۹۳۸ء) نے بیان کیا ہے، مستشرق مذکور کی رائے یہ ہے کہ ادب، دأب سے نکلا ہے، جس کے معنی عادت کے ہیں، یہ لفظ مفرد سے نہیں بنا بلکہ جمع سے مشتق ہے، دأب کی جمع أدْأب تھی، قلب مکانی سے آداب ہوگیا، جیسے بِئْر اور رِئْم کی جمع أبْآر اور أرْآم تھی، قلب مکانی کے بعد آبار اور آرام ہوگئی۔ پروفیسر نالینو نے اس سے آگے لکھا ہے:

وكثر استعمال الآداب جمعا للدأب	دأب کی جمع آداب کا استعمال اس قدر زیادہ
حتى نسي العرب أصل هذا الجمع و	ہوا کہ عرب اس کی اصل ہی کو بھول گئے، نہ انکو
ما كان فيه من قلب وخيل اليهم	یہ یاد رہا کہ اس میں قلب مکانی ہوا ہے،
انه جمع لا قلب فيه فأخذوا منه	ان کو اس بات کا خیال رہا کہ یہ لفظ جمع ہے
مفردا أدبا للآداب وجرى	اس میں قلب مکانی نہیں ہوا ہے، انھوں نے
استعمال هذه الكلمة بمعنى	اس کا مفرد دأب کے بجائے ادب سمجھا
العادة. ثم انتقل من هذا	دأب کا استعمال عادت کے معنی ہی میں
المعنى الطبيعي القديم الى معانيه	رہا، پھر وہ اس قدیم طبعی معنی سے دوسرے
الاخرى المختلفة[1]	مختلف معنی کی طرف منتقل ہوا ہے۔

لفظ ادب کی اصل تاریخ بنی امیہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے، یہ لفظ بنی امیہ ہی کے زمانے میں رائج اور شائع ہوا اور اسی زمانے سے اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے تعلیم و تربیت کے معنی میں ہوا عہد بنی امیہ میں اساتذہ کی ایک ایسی جماعت تھی جو امراء کے لڑکوں کو تعلیم و تربیت دینے پر مامور تھی، اس جماعت اور اشعار کے راویوں اور تاریخی واقعات بیان کرنے والوں کو "مؤدب"

[1] تاریخ الادب العربیۃ، تالیف کارلو نالینو، ص ۱۱

کہا جاتا تھا، اس جماعت "مؤدبین" میں سے کچھ نام یہ ہیں: (۱) ابوسعید الجبنی (۲) عامر الشعبی۔

(۱) ابوسعید الجبنی (۲) عامر الشعبی۔ یہ دونوں خلیفہ عبدالملک بن مروان کے لڑکوں کو تعلیم دیتے تھے۔

(۳) صالح بن کیسان: خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے لڑکوں کا مؤدب تھا۔

(۴) جعد بن درہم: آخری اموی خلیفہ، مروان بن محمد کا مؤدب تھا۔

اس دور کی تحریروں میں جابجا لفظ ادب کا تذکرہ ملتا ہے، زیاد بن ابیہ اپنے خطبہ "البتراء"[1] میں کہتا ہے:

فادعوا الله بالصلاح لائمتكم	تم خدا سے اپنے ائمہ کیلئے راستی اور خیر کی
فانهم ساستكم المودبون لكم	دعا کرو، کیونکہ وہ تمھارا انتظام کرنے والے
اما والله لأؤدبنكم غير	اور ادب سکھانے والے ہیں، خدا کی قسم
هذا الأدب او لتستقيمن	میں تم کو اس طرز ادب کے سوا ادب
	سکھاؤں گا، ورنہ تم اپنی روش درست کر لو۔

کسی فزاری شاعر نے لفظ ادب کو اپنے اشعار میں اس طرح استعمال کیا ہے،

اكنيه حين انادیه لاكرمه	ولا القبه والسوءة اللقبا

میں محض از راہ احترام اسکو کنیت سے پکارتا ہوں، لقب سے یاد نہیں کرتا، کیونکہ لقب بری چیز ہے

كذاك أدبت حتى صار من خلقی	انی وجدت ملاك الشيمة الادبا

میری تہذیب و تربیت اس طور پر کیگئی ہے کہ اب میری سرشت بن گئی ہے اور میں نے اپنی خصلت کا مدار ادب کو بنا لیا ہے

---

[1] جس خطبے کو حمد و ثنا سے شروع نہ کیا جائے اور جس کا آغاز حمد باری تعالیٰ سے نہ ہو اس کو "البتراء" کہتے ہیں، بتر کے معنی دم کٹے، لاولد کے ہیں، اور جس خطبہ کو قرآن مجید کی آیات اور درود سے مزین نہ کیا جائے اسکو شوہاء کہتے ہیں، شوہاء کے لغوی معنی بد صورت عورت کے ہیں ۳ حماسہ، باب الادب۔

بنی امیہ کے زمانے میں اس لفظ کا اطلاق اس قسم کے علوم پر ہوتا تھا جن کا مذہب اور دینیات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے شاعری، کہانی، انساب، ایام عرب، اخبار و احوال، شرافت اور حسن اخلاق بھی اس سے مراد لیے جاتے تھے۔ پھر جب لغت مدون ہوا تو وہ بھی ادب میں شامل ہو گیا۔

لفظ ادب کا مادہ نہ قریشی زبان میں ملتا ہے، نہ عبرانی اور سریانی میں۔ قرآن مجید نے تمام لغات قریشیہ کا استیعاب نہیں کیا تھا، اس لیے یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ یہ لفظ عہد بنی امیہ میں قریش کی زبان میں کسی ایسی عربی زبان سے منتقل ہو کر آیا ہو جو خود برباد ہو چکی تھی۔

"لسان العرب" نے مادۂ ادب سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

الادب ادبان: ادب النفس و ادب الدرس۔ ادب دو ہی چیزوں کا نام ہے، ایک تہذیب نفسی اور دوسرے تعلیم شعر و نثر۔ تہذیب نفس۔ بردباری، عالی ظرفی، شجاعت، سچائی جیسی خصائل حمیدہ اور اجتماعی خوبیاں پیدا کرنے کی تلقین کو کہتے ہیں، غالباً یہی وجہ ہے کہ عبداللہ ابن مقفع (متوفی ۱۴۲ھ) نے اپنی کتاب کا نام "الادب الصغیر و الادب الکبیر" رکھا، ادب کے دوسرے معنی تعلیم کے ہیں، اس کا تعلق شعر اور نثر سے ہے، پہلی صدی ہجری سے اب تک مادۂ ادب انہی دو معنوں پر دلالت کرتا رہا ہے۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے لڑکوں کے مؤدب سے کہا:

علّمهم الشعر يمجدوا و ينجدوا — انکو اشعار کی تعلیم دو تاکہ یہ شرف حاصل کریں اور دلیر بنیں

یہاں تادیب کے معنی تعلیم و تہذیب یا درست کرنے کے ہیں۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اپنے مؤدب سے پوچھا

---

[1] نقد النثر ص ۷۰

كيف كانت طاعتى اياك و	جب آپ مجھے تعلیم دیتے تھے تو میں آپ کی
انت تؤدبني ؟ قال : احسن	کس طرح اطاعت کرتا تھا، مودب نے جواب
طاعة، قال : فاطعني الآن	دیا، بہتر یں اطاعت، عمر بن عبد العزیز نے کہا
كنت الصبي[1]	تو اب تم میری ویسی ہی اطاعت کرو
	جیسی میں تمہاری اطاعت کرتا تھا

بنی امیہ ہی کے عہد سے ادیب یا مودب، شاعر اور نثر نگار کے درمیان فرق قائم ہوا۔ جس شخص پر ادب اور اس کی تعلیم کا غلبہ ہوتا تھا، اس کو ادیب کہتے تھے، اور جس کا رجحان شاعری کی طرف ہوتا تھا، وہ شاعر کہا جاتا تھا، اور نثر کا مطالعہ کرنے والے کو نثر نگار کہا جاتا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں جب عربی علوم، لغت، نحو، صرف کا نشو و نما ہوا تو ان ناموں نے اصطلاحی شکل اختیار کرلی، اور یہ علوم "ادب تعلیمی" میں داخل ہوگئے، ادب تعلیمی کا مفہوم وسیع ہوگیا۔ لفظ ادب کا اطلاق۔ نثر و نظم، انساب، اخبار، لغت، نحو، صرف اور نقد پر ہونے لگا۔ یہ حالت زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکی، کیونکہ یہ عباسیوں کے زمانے میں سوسائٹی کے اجتماعی ہیئت میں تغیر اور ثقافتی گوشوں میں تنوع پیدا ہوا۔ عباسی تمدن کے ساتھ ساتھ علوم عربی کی ایک ایسی طاقت آئی جس نے مادۂ ادب کو متاثر کیا۔

تیسری صدی ہجری میں ادب پھر اپنے اسی مفہوم کی طرف واپس لوٹا جو پہلی صدی ہجری میں تھا، یعنی ادب فنی اور تہذیب نفس کے معنی دینے لگا۔ اس تعریف میں شعر و نثر اور ان سے متعلقہ علوم۔ اخبار، انساب، ایام عرب اور احکام نقد داخل ہیں، البتہ اس میں فنی نثر اور ادبی تنقید کا اضافہ ہوگیا۔

---

[1] عیون الاخبار لابن قتیبہ ج ۱ ص ۳۰۱ طبع مصر ۱۳۴۳ھ

اس صدی میں اعلیٰ ادب تصنیف ہوا، جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) کی "البیان والتبین" ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) کی "الشعر والشعراء" اور "کامل" للمبرد (متوفی ۲۸۵ھ) جو عربی ادب کی امہات الکتب تسلیم کیجاتی ہیں، اسی صدی میں لکھی گئیں۔

اس صدی میں لفظ ادب کے تہذیب نفس والے معنی میں وسعت پیدا ہوئی، اور اس موضوع پر کچھ کتابیں بھی تصنیف کی گئیں، امام ابو یوسف (متوفی ۱۸۲ھ) کی "ادب القاضی" ابن قتیبہ کی "ادب القرأۃ"۔ ابو العباس سرخسی (متوفی ۲۸۶ھ) کی "ادب النفس" اور کشاجم الشاعر (متوفی ۳۵۰ھ) کی "ادب النديم" اس سلسلے کی اہم کتابیں ہیں۔ صحیح بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) کا "باب الادب" اور حماسہ ابی تمام (متوفی ۲۳۱ھ) کا "باب الادب" بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں، محمد بن سلام الجمحی (متوفی ۲۳۲ھ) کی مشہور کتاب "طبقات الشعراء الجاہلیین والاسلامیین" ابو الحسن الماوردی (متوفی ۴۵۰ھ) کی "ادب الدنیا والدین" اور نیشاپوری (متوفی ۴۶۵ھ) کی "آداب الصوفیہ" اور "آداب البحث والمناظرہ" کا ذکر بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

جاحظ نے لفظ ادب کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

قال عتبۃ بن ابی سفیان لعبد الصمد۔ مؤدب ولدہ: لکن اول ما تبدأ بہ من اصلاح بنی، اصلاح نفسک[1]	عتبہ بن ابی سفیان نے اپنے لڑکے کے مؤدب سے کہا کہ پہلی چیز جس سے تم میرے لڑکوں کی اصلاح کرو، خود تمھارے اپنے نفس کی اصلاح ہے۔

دوسری جگہ لکھا ہے:

وزدنی فی تادیبھم، ازدک فی بری انشاء اللہ تعالیٰ[2]	ان کو ادب سکھانے میں زیادتی کر، میں حسن سلوک میں زیادتی کروں گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

---

[1] البیان والتبیین ج ۲ ص ۱۰ [2] ایضاً

چوتھی صدی ہجری میں لغت، نحو اور صرف ادب سے الگ ہو گئے، نقد، بلاغت، اور بدیع ادب میں شامل رہے۔ ٹھوس ادب میں تنقیدی اور فنی زاویۂ نگاہ سے بحثیں ہوئیں۔ اس صدی میں بحتری (متوفی ۲۸۴ھ) اور ابوتمام (متوفی ۲۳۱ھ) کے ادبی معرکوں اور بعد میں متنبی (متوفی ۳۵۴ھ) کے مخالفین اور موافقین کے مباحث نے فن نقد کو فائدہ پہنچایا، آمدی (متوفی ۳۷۱ھ) نے اپنی "الموازنہ بین الطائیین" اور ابوالحسن جرجانی (متوفی ۳۹۲ھ) نے "الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ" انہی واقعات سے متاثر ہو کر تصنیف کیں، اس طرح تنقید نے مستقل فن کی حیثیت اختیار کرنا شروع کی۔ اور اس کا شمار علٰحدہ ایک علم اور ادبی فن میں ہونے لگا۔

چوتھی صدی ہجری میں جن کتابوں نے فن نقد کو فروغ دیا، اور اس کو مستقل ایک فن کا درجہ دیا، ان میں قدامہ بن جعفر (متوفی ۳۱۰ھ) کی "نقد الشعر" اور "نقد النثر" کے نام سرفہرست ہیں، قدامہ نے سب سے پہلے عربی نقد کے اصول استخراج کیے، ان کے بعد ابوہلال العسکری (متوفی ۳۹۵ھ) نے "الصناعتین"[1] میں اور ابن رشیق القیروانی (متوفی ۴۵۶ھ) نے "کتاب العمدہ" میں انہی کے نقش قدم کی پیروی کی۔ ابوالفرج الاصبہانی (متوفی ۳۵۶ھ) کی "الاغانی" اور ابن عبد ربہ (متوفی ۳۲۸ھ) کی "العقد الفرید" کے نام بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں، "رسائل اخوان الصفا" نے بھی تنقید اور علوم بلاغت کے لیے راستہ ہموار کیا۔

کہا جاتا ہے کہ فن نقد نے علم بلاغت کے ضمن میں مستقل فن کی شکل اختیار کی، اس استقلال کی مظہر شیخ عبدالقاہر جرجانی (متوفی ۴۷۱ھ) کی دونوں کتابیں "دلائل الاعجاز" اور "اسرار البلاغت" تھیں۔

---

[1] اس کتاب میں مصنف نے شعر و نثر سے بحث کی ہے، اور جگہ جگہ ان محاسن کی نشان دہی کی ہے جن سے فنی حسن میں اضافہ ہوتا ہے، اس میں فنی تجزیے کے علاوہ تنقیدی بحث بھی ہے۔ مصنف کی دوسری کتاب "دیوان المعانی" بھی اسی طرز پر لکھی گئی ہے، لیکن اس میں روایتی انداز غالب ہے۔

ان کتابوں کا اثر یہ ہوا کہ ادب بمعنی الخاص سے نقد اور بلاغت کا تعلق نہیں رہا۔ اور ادب محض نثر و نظم کے سرمایہ کو کہنے لگے۔

اس استقلال سے فن تنقید کو یہ نقصان پہنچا کہ اس کے بعد فن تنقید یا علم بلاغت میں کوئی ٹھوس کتاب نہیں لکھی گئی، اگرچہ ابن رشیق القیروانی کی "العمدۃ" اور "قراضۃ الذہب فی نقد اشعار العرب" شیخ کے زمانۂ حیات ہی میں تصنیف کی گئیں۔

پانچویں صدی ہجری کے اختتام تک اہم ادبی علوم نے مستقل علوم کی حیثیت اختیار کر لی، شاید اسی وجہ سے زیات نے لکھا ہے کہ عہد اخوان الصفا کے بعد لفظ ادب کا اطلاق فنون، صنعت و حرفت اور تمام غیر شرعی علوم پر نہیں رہا، لیکن عربی زبان کے علوم جیسے معانی، بیان، صرف، نحو اسکے دائرے میں داخل رہے لیکن اس قسم کی کوئی تحدید نہیں کی گئی۔[۱]

غرض اس صدی میں ادب بمعنی الخاص کی تعریف کو مقبولیت حاصل ہوئی، یہ تحدید اس معنی سے قریب ہے جو قرن اول میں مستعمل تھے۔ اس تعریف سے وہ علوم الگ ہیں جو قرن ثانی میں ادبی تعریف کے جزء تھے۔ اس صدی میں علماء کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس نے قرن ثانی سے زیادہ ان ادبی علوم کی طرف توجہ دی جو ادبی ثقافت کی تعمیر کرتے ہیں۔

ادبی علوم سے مراد کیا ہے؟ وہ کون سے علوم ہیں جو ادب کی تعریف میں شامل ہیں؟ اس بارے میں علماء کا سخت اختلاف ہے، گذشتہ صدیوں سے اب تک ان ادبی علوم کے حصر و تحدید میں بڑے بڑے علماء نے حصہ لیا ہے، ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کے نزدیک علم بارہ[۱۲] ہیں۔ سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) نے "مفتاح العلوم"، یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) نے "معجم الادباء" اور شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ)

---

[۱] اصول الادب ص ۱۱

نے "مقدمۂ شرح المفتاح" میں ان ادبی علوم سے بحث کی ہے، ان کے علاوہ دوسرے علما، نے بھی رائے زنی کی ہے لیکن اس بارے میں ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) کی رائے کو اہمیت حاصل ہے۔

ابن خلدون نے اپنے مشہور مقدمے میں ایک فصل "فی علوم اللسان العربی" کے عنوان سے قائم کی ہے، اس میں علوم بلاغت۔ بیان، لغت، نحو پھر ادب سے بحث کی ہے۔ اور ادب کو زبان عربی کے علوم میں ایک مستقل علم تسلیم کیا ہے، اور اس کو نحو، لغت، معانی، بیان اور بدیع کا حریف ٹھہرایا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ہر علم کا ایک موضوع ہوتا ہے جس میں اس کے عوارضِ ذاتیہ کے سلب وثبوت سے بحث کی جاتی ہے جیسے طب کا موضوع جسم انسانی ہے، اس حیثیت سے کہ امراض، جسم انسانی کو لاحق ہوتے ہیں اور علاج کے ذریعہ ان کا تدارک کیا جاتا ہے، اسی طرح نحو کا موضوع کلمہ ہے، علم نحو، کلمے کے ان عوارض واحوال سے بحث کرتا ہے جو اس کو باعتبار معرب ومبنی پیش آتے ہیں، اسی ضمن میں نواسخ (عوامل) ضمیر عائد، ان پر فتحہ یا کسرہ کے مقامات کا ذکر آتا ہے۔

تعجب یہ ہے کہ ابن خلدون ادب کو علم تو مانتا ہے، مگر اس کا موضوع نہیں بتاتا، اور اس کی غرض وغایت سے بحث کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ ہر علم کی ایک تعریف، ایک موضوع، اور ایک مقصد ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے، ادب کے موضوع سے انکار کرتے ہوئے ابن خلدون نے لکھا ہے۔

ھذا العلم لا موضوع لہ ینظر	علم ادب کا کوئی موضوع نہیں جس کے
فی اثبات عوارضہ اونفیھا	عوارض واحوال سے اثبات ونفی میں
وانما المقصود منہ عند	بحث کی جائے اہل زبان کے نزدیک

اصل الانسان ثمہ تہ د ھی — ادب کا مقصد ادبی سالت ہے، وہ

الاجادة فی فنی المنظوم والمنثور — یہ کہ نثر و نظم کے ذریعہ مافی الضمیر کا اظہار

علی اسالیب العرب و مناحیھم[1] — عرب کے اسلوب اور طریقوں پر کیا جائے،

جب ابن خلدون نے علوم لسانی کی طرح ادب کا کوئی موضوع نہیں پایا تو اس کے موضوع ہی سے انکار کر دیا اگر وہ ادبی نسبت کا اطلاق تمام علوم لسانی پر کرتا تو بات آسان ہو جاتی اور وہ اس اضطراب میں مبتلا نہ ہوتا، جو اس کی حیرانی کا باعث ہوا۔ اس کا یہ فیصلہ منفرد رائے کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے تحیر و اضطراب کا سبب یہ ہے کہ اس نے ادب کو علوم لسانی ہی میں سے ایک علم سمجھا، جو دراصل ادب کوئی علم نہیں ہے، بلکہ ایک کلامی فن ہے، جو ادیب سے صادر ہوتا ہے۔

ابن خلدون کا ادب کو علوم نظری میں شمار کرنا، اس کو طبیعت یا فطرت سے خارج کرنا ہے ادب کا ایک موہبت فنیہ ہے، اس کا براہ راست تعلق طبیعت سے ہے، اس فن کی تحصیل، ادب پاروں، اشعار، نثر، لغوی اور نحوی مسائل کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ادب کا بھی ایک موضوع ہے، اور وہ ہے طبیعت یا فطرت، طبیعت یا فطرت سے مراد واردات (داخلیت) اور تاثرات (خارجیت) ہیں جن سے انسان اس مادی دنیا میں متصادم ہوتا ہے، انسان خارجی حقایق کا مظہر ہے، اور طبیعت داخلی کیفیات کی، ان پر تنقید و تبصرہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ داخلی یا خارجی عوامل کی ترجمانی کا نام طبیعت یا فطرت ہے، یہی ادب کا موضوع ہے،

داخلیت اور خارجیت میں ایک واضح فرق ہے، وہ یہ کہ خارجی اشیاء یا مدرکات حسیہ

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۱۰۴ مطبوعہ مصر

کا تعلق انسان کے حواس ظاہری سے ہے، وجدان سے نہیں۔ انسان خارجی دنیا میں ان کا تجربہ کرتا ہے، اور ان حسیات کو اپنے وجدانی تاثرات یا وجدان سے الگ رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف باطنی اشیا کے کہ وہ تجربوں، ضابطوں اور قاعدے قانون کی پابند نہیں، اندرونی احساسات بدلتے رہتے ہیں، ان کا تعلق طبیعت انسانی اور وجدانی تاثرات وانفعالات سے بلاواسطہ ہے، آج ایک چیز کو دیکھکر دل پر خوشی کا اثر ہوتا ہے۔ کل اسی چیز کو دیکھکر خوشی نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ داخلیت (قلبی کیفیات) بھی تغیر پذیر ہے۔

ادب کی تعریف کرتے ہوئے ابن خلدون نے لکھا ہے۔

ثم انهم اذا ارادوا حد هذا	جب انھوں نے اس فن کی تعریف
الفن قالوا: الادب هو حفظ	کرنا چاہی تو کہا کہ ادب نام ہے اشعار
اشعار العرب واخبارها	اور ادبی تاریخ کے حفظ اور ہر علم سے
والاخذ من كل علم بطرف	تھوڑا تھوڑا حصہ حاصل کرنے کا، وہ
يريدون من علوم اللسان	لوگ علم سے مراد لسانی یا شرعی
او العلوم الشرعية [1]	علوم لیتے ہیں۔

اس عبارت میں ابن خلدون ادب کو فن تسلیم کرتا ہے، اس سے پہلے اسی ادب کو علم سے تعبیر کر چکا ہے، قطع نظر اس بات کے کہ ابن خلدون کے نزدیک ادب علم ہے یا فن۔ اس عبارت پر ایک اور اعتراض وارد ہوتا ہے، وہ یہ کہ ادب کی مذکورۂ بالا تعریف جسکو ابن خلدون نے اس طرح لکھا ہے، جیسے وہ کسی سے نقل کر رہا ہے۔ ثم انهم اذا ارادوا حد هذا الفن قالوا:) ادب کی ہے یا تادب کی۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۱۱

اگر اس سے مراد ادب اور ادبی کتابیں ہیں، جو ہم پڑھتے ہیں اور ادیبوں اور شاعروں سے سنتے ہیں تو یہ تعریف مکمل نہیں، اور اگر اس تعریف سے ان وسائل کا ذکر کرنا مقصود ہو جن کے ذریعہ انسان اپنے ذوق ادبی کی جلا کرتا، انشا پردازی کی طاقت کو اجاگر کرتا اور تنقید و تبصرہ کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، تو یہ تعریف تادب کی ہے، ادب کی نہیں۔ کیونکہ تادب ادب سیکھنے کو کہتے ہیں، جس کا بہترین وسیلہ کتاب ہو، ادب سیکھنے والا، لازمی ثقافت کی تحصیل جن وسائل سے کرتا ہے، انکا ذکر ابن خلدون نے اس تعریف میں کیا ہو، یہ ثقافت متادب کی زبان درست کرتی ہے اور اس کے ذوق ادبی کو نکھارتی ہو، اس لحاظ سے یہ تعریف ادب کے بجائے تحصیل ادب کی ہوئی۔

آرٹ (جمال)، شعر، خیال اور ادب ایسی اصطلاحات ہیں کہ انکی صحیح منطقی تعریف اس وقت تک نہیں کیجا سکتی، جب تک ذہن میں ان کا مفہوم واضح نہ ہو، اسکے برعکس اشیائے حسیہ جیسے مثلث (جیومیٹری)، جزیرہ (جغرافیہ) ٹھوس یا سیال اجسام کی تعریف ممکن ہوتی ہو، ابن خلدون کے تحیر اور اضطرابی کیفیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے ذہن میں ادب کا مفہوم واضح نہیں، یہی وجہ ہو کہ ادب کی کوئی منطقی حد قائم نہیں کر سکا، اور نہ تعریف بالعوارض کرنے میں کامیاب ہوا، جس سے ادب کی وضعی شکل سامنے آجاتی، اس نے جو کچھ تعریف کی ہے وہ جزئی ہے کلی نہیں۔

حاصل اس بحث کا یہ ہو کہ ادب ایک فن کلامی ہے، جو عقل کی تعبیر اور ادراک و شعور انسانی کی ترجمانی کرتا ہے، وہ ایک مدلیل عرضی ہے، اس کا تعلق تہذیب نفس اور انسانی خصائل سے بھی ہے، اور انفرادی اور سماجی زندگی سے بھی۔

ادب کی بنا جذبہ ہے، جو ادب میں خلود پیدا کرتا ہے، اس جذبہ کی دو حیثیتیں ہیں، ایک کا تعلق خلود ادب سے ہے، دوسری کا شخصیت ادیب کی ترجمانی سے۔ مادی اجسام کے مقابلہ میں ادبی عبارتیں قائم بالذات ہوتی ہیں، ان میں باقی رہنے کی ایک ایسی صفت خلود ہوتی ہو کہ نہ اسے زمانہ فنا کر سکتا ہے اور نہ وہ

تحریریں جو عہد میں اس موضوع پر لکھی جاتی ہیں، پڑھنے والے ہر عہد میں ان کو پڑھتے ہیں، ان سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتے، عقل انسانی ترقی پذیر اور بدلنے والی شے ہے، تغیرات، جذبات کی ابدیت میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکے، اس لیے ادب فی نفسہ بقائے دوام کی صلاحیت رکھتا ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ جذبہ جلد زائل ہونے والی چیز ہے، اس لیے وہ ادب کی بقا کا باعث نہیں ہو سکتا، لیکن یہ تناقض وہمی ہے، دراصل جذبے کا زوال ہی ادب کی بقا ہے، وہ عاطفہ ہی کی سرعت زوال ہے، جو ادبی اثر کو خلود اور انفعالات ادبی کو دوام بخشتی ہے،

اس بات کو کلی کے جذبۂ شگفتگی سے سمجھا جا سکتا ہے، جو ایک سادہ خارجی مثال ہے، غنچہ، جذبۂ شگفتگی ہے، وہ ایک لمحۂ مختصر جس میں کلی مسکرائی، کلی کے بقائے دوام کا سبب بنا، اثارت جذبہ نے کلی کو پھول بننے پر مجبور کیا، کلی پھول بنکر کھلکھلائی، پھول زینت انجمن اور محو چمن آرائی ہوا، اگر کلی پھول نہ بنتی تو ہزار تنگی داماں کی شاکی ہوتی، کلی کا کلی رہنا اس کی موت تھا، جذبۂ شگفتگی نے اسکو جمال آگہی دیا اور جہان آب و خاک و باد میں لباس زندگی سے مزین کیا۔

تاثرات کی تعبیر کے وقت ہی ادیب کی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں ادب، فن کی شکل اختیار کرتا ہے، اور ادیب کی مزاجی ہیئت اور طرز ادا کی بھی ترجمانی کرتا ہے، تاثر نفسی کو ادبی خلود اور ادیب کی شخصیت کی ترجمانی میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اس سے ادب اور زندگی کا تعلق ظاہر ہوتا ہے، جو جذبات و واردات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، ان کو اشعار میں منظوم کرتا ہے، وہ جذبات ہم کو اسی طرح متاثر کرتے ہیں جس طرح خود شاعر نے محسوس کیے، اس تعریف کا اطلاق صرف شاعری پر ہی نہیں ہوتا، بلکہ تمام ادب کا یہی حال ہے، ادب تنقید حیات ہے، وہ زندگی کا شعور بھی ہے اور تفسیر حیات بھی۔ ادیب کے لیے سماجی شعور کے بغیر تفسیر حیات مشکل ہے، ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ حیات و کائنات کا مشاہدہ کرکے اپنے اندر سماجی شعور پیدا کرے۔

ادبی تاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ادیب خارجی یا داخلی حیات جمال کی عکاسی اس طور پر کرے کہ تصویر کا حقیقی رخ پڑھنے والے کے سامنے آجائے، اس سے دل متاثر ہو اور ایسا ہی محسوس ہو جیسا کہ اصل تصویر میں ہے، وہ قوت جو اس تصویر کشی کی تکمیل کرتی ہے، اسکو قوت خیالیہ کہتے ہیں۔

جذبہ اور خیال کی طرح فکر بھی ادب کا ضروری عنصر ہے، ادبی موسیقی، جذبہ و فکر کی آمیزش سے نغمے جنم دیتی ہے، اور سروں کو لفظ و معنی کا لباس پہناتی ہے، جو عبارت دل پر اثر کرے وہ ادب ہے اور وہ افکار و حقائق جو ممتزج بالعواطف ہوں وہ بھی ادب ہیں۔ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس کی روشنی میں ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تاریخی کتابیں کب ادب بنتی ہیں۔

صحیح افکار، جذبے کو خلود دیتے ہیں، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم تنقید کی وادی میں قدم رکھتے ہیں، جذبہ نام ہے تاثیر عملی کا۔ شعور، وجدان، حس علم جزئی ہیں، تمام جزئیات سے ایک مشترک مفہوم اخذ کرنے کا کام فکر ہے، شعور جزئی ہے اور فکر کلی۔ اس لیے شعور اور فکر کے درمیان اتصال عین حقیقت ہے، خواہ یہ اتصال کمیت میں ہو یا کیفیت میں۔

جذبہ، فکر اور خیال کی طرح اسلوب بھی عناصر ادبی میں داخل ہے، اسلوب ایک حقیقت خارجیہ ہے جو مواد اور صورت کے امتزاج سے ادب کے خوبصورت مرقعے تیار کرتا ہے، وہ تخیل کو حقیقت اور واقعیت کی طرف لے جاتا ہے، ادب میں صورت و معنی کی ہم آہنگی ہی سے مرحلۂ شوق کی دشوار گذار راہ آسان بنجاتی ہے۔

اسلوب جذبہ بات کو برانگیختہ کرنے کا کام دیتا اور افکار کو لباس جمیل سے آراستہ کرتا ہے۔ اگر معانی متوسط اور خیالات فرسودہ ہوں لیکن اسلوب جاندار ہو تو عبارت میں موسیقی اور دلکشی آجاتی ہے، اسلوب ہی عبارت کو موثر اور خوبصورت بناتا ہے، اسلوب عارضی یا اتفاقی چیز نہیں فطری چیز ہے، جو ذوق سے حاصل ہوتا ہے۔

ہیئت۔ غایتِ ادبی نہیں۔ وہ ادائے معانی یا حقائق کی تعبیر کا ایک ذریعہ ہے
اس لیے نہ تنہا مواد سے کام چل سکتا ہے اور نہ شکل وصورت سے۔ ان دونوں میں تناسب
ہم آہنگی اور ربط ضروری ہے، اسلوب ایک سماجی عمل ہے، اچھا اسلوب شعوری یا غیر شعوری
طور پر زندگی اور ماحول کا ترجمان ہوتا ہے، ہیئت اور اظہار کی سماجی اہمیت یہ ہے کہ وہ ادیب
اور قاری کے درمیان تعلق پیدا کرتا ہے، جمالیاتی اسلوب۔ نثر میں خیال کا آہنگ اور شعر میں
جذبے کا ترنم بن جاتا ہے۔ فنکار اپنے جمالیاتی تجربے یا جذبے کے اظہار میں حسن کی تخلیق کرتا
انسان لاشعور۔ علامتوں اور تمثالوں کا سرچشمہ ہے، علامتی اظہار حسن کاری کو
وجدان اور لاشعور سے قریب کرتا ہے، لاشعور کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے، جسے اشاریت
کہتے ہیں، دروں بینی اور اشاریت اظہار کو ماحول کا داغ اور تہذیب وتمدن کی زبان
ہے، مادی کشمکش سے فنکار کا احساس جمال متاثر ہوتا ہے۔

اشاریت ایک بے ساختہ ذریعۂ اظہار ہے، جو رسمی پابندیوں سے آزاد ہے
اس اعتبار سے ایمائی طرزِ فکر ایک فطری طریقہ ہے۔ وہ نفس کی گہرائیوں سے امنڈ کر نمو
ہوتا ہے، اشاریت، احساس کی ارتقائی منزل ہے، وہ الفاظ کو تصورزائی کی طرف
لے جاتی ہے، تصورزائی ایک لازوال عطیۂ فطرت یا ناقابلِ اعتبار انتقال اسلوب
ہے، جو کتاب یا ادبی عبارت کو قیمتِ خالدہ عطا کرتا ہے۔

شعر الہند حصہ اوّل

اسمیں قدما کے دور سے لیکر دورِ جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات وانقلابات کی تفصیل
کیگئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ ومقابلہ کیا گیا ہے۔
(مؤلفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم) ضخامت ۴۹۰ صفحے۔ قیمت :- ۸ روپے

ہندی شاعری کا ایک تاریخی جائزہ

از جناب زیدی جعفر رضا صاحب شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۸)

چنتامن | چنتامن (चिंतामणि) تکوان پور (کانپور) کے باشندہ رتناکر ترپاٹھی کے بیٹے تھے، بھوشن، مت رام اور جٹا شنکر ان کے بھائیوں کے نام تھے، علامہ آزاد بلگرامی نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے،

"چنتامن ساکن کوڑہ جہان آباد است و دو برادر او بھوکن و متراام نیز شاعر خوش فکر مشہور اند ... در علم سنسکرت سرآمد اقران بود و در سرکار شاہ شجاع بن شاہ جہان بادشاہ با عزت بسری بردہ"[1]

یہ کافی عرصہ تک ناگپور میں سوارج نسی بھونسلہ راجہ مکرند شاہ کے یہاں مقیم رہے، اور ان ہی کے حکم پر انھوں نے اپنی تصنیف پنگل قلمبند کی جیسا کہ ان کی تحریر سے واضح ہے۔

سورج بنسی بھوسلہ لست ساہ مکرند	مہاراج دگپال جم جال سمد سبھ چند
چنتامن کو کو حکم کیو ساہ مکرند	کرو کچھ بچھ لچھن سہت بھاشا پنگل چھند

چنتامن کا سنہ پیدائش ۱۶۰۹ء تسلیم کیا جاتا ہے، ان کی چھ تصانیف کا پتہ چلتا ہے جنکے نام کا بیہ ببیک، کوی کل کلپتر، کا بیہ پرکاش، رس منجری، پنگل اور رامائن ہیں، انکے علاوہ کتب خانہ تیہ میں شرنگار منجری نام کی ان کی ایک اور تصنیف ملی ہے لیکن یہ کتاب دراصل شاہ کم

---

[1] علامہ آزاد بلگرامی۔ سرو آزاد، ص ۳۲۵-۳۲۴

کی آندھرا بھاشا میں لکھی ہوئی تصنیف ہے، جس کا ترجمہ سنسکرت سے ہو کر ہندی میں چنتامن کے ذریعہ ہوا، راماین کو چھوڑ کر بقیہ سبھی تصانیف کابیہ شاستر سے متعلق ہیں، ان کا سب سے زیادہ مشہور و مقبول گرنتھ کوی کل کلپترو (कविकुल कल्पतरु) ہے۔

چنتامن کا شمار شرنگار کال کے اساتذہ میں ہوتا ہے، انھوں نے کیشو کی طرح بھامہ او دنڈی کی تقلید نہیں کی، بلکہ ممٹ اور وشوناتھ کے راستے پر چلے، اور اس کے بعد ریتی کال کے مختلف آچاریوں نے چنتامن کی تقلید کی، رام چندر شکل ایک مقام پر رقم طراز ہیں:

"ہندی ریتی گرنتھوں کا سلسلہ چنتامن ترپاٹھی سے چلتا ہے۔ اسلیے ریتی کال کی ابتدا انہیں سے سمجھنی چاہئے۔"[1]

لیکن ڈاکٹر نگیندر شکل جی کے اس قول کی تردید کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"چنتامن کو بھی یہ فضیلت عطا کرنا ظلم ہے، کیونکہ یہ محض اتفاق تھا کہ ان کے بعد ریتی کال کا دھارا بغیر کسی رکاوٹ کے بہہ نکلا" (ڈاکٹر نگیندر۔ ریتی کابیہ سنگرہ، صفحہ ۱۳-۱۴)

چنتامن کے کلام کے بارے میں ڈاکٹر جگدیش گپت کا یہ خیال ہے کہ آچاریہ ہونے کے باوجود شعریت کے لحاظ سے چنتامن کا مقام کافی بلند ہے، رس وادی شاعر ہونے کی بنا پر ان کے کلام میں شرنگار رس کا بیان تفصیل سے ہے، لیکن اس میں متی رام اور دیو جیسے شعرائے متاخرین کی جیسی معنویت نہیں پائی جاتی البتہ تخئیل کی سادگی اور زبان کی سلاست کے لحاظ سے یہ متی رام کے مقابلہ میں ضرور لائے جاسکتے ہیں، ان کا کلام مجموعی طور سے نہایت صاف ستھرا ہے، اس میں ایک ترنم اور نغمگی پائی جاتی ہے، (ڈاکٹر جگدیش گپت، ہندی ساہتیہ کوش صفحہ ۱۰۳)

نمونہ کلام یہ ہے:

کیسر بارہ بار تارت کیسر انگ لگاون لاگی
آئی ہو نینن چنچلتا دگ کہ کل اپ چھپاون لاگی
دولہ کے اولوکن کو واثان جھوکن آدن لاگی
دوس دو تینک تھے جیا من بھاون کی من بھاون لاگی

---

[1] رام چندر شکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۵۹

دیو دیو کا پورا نام دیودت تھا، سنہ پیدائش ۱۶۷۳ء ہے، یہ اٹاوہ کے باشندے تھے جن کا ذکر انھوں نے بھاو ولاس میں کیا ہے،

> دیو سریا کوی دیو کو نگر اٹایہ باس جودن نول سبھا درس کیھو بھاو ولاس

اس دوہے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کانیہ کبج ([देवनागری]) برہمن تھے کیونکہ دیو سریا کانیہ کبج برہمنوں کو کہتے ہیں۔ دیو کی زندگی کا ابتدائی حصہ مالی اعتبار سے اچھا نہیں تھا، ایک غریب گھر میں پیدا ہونے والا یہ فنکار فکر معاش میں مختلف درباروں کی خاک چھانتا پھرا، کبھی اس نے اعظم شاہ کے سنگ در پر سجدہ کے لیے جبین نیاز خم کی اور بھاو ولاس اور اشٹ یام جیسی تصانیف حصول انعام کے خاطر نذر کیں، کبھی راجہ سیتارام کے بھتیجے سیٹھ بھوانی دت کے لیے بھوانی ولاس لکھی، کبھی ریاست پھپھوند کے راجہ کسل سنگھ کی دلجوئی کے لیے کسل ولاس تصنیف کی، کبھی سیٹھ بھوگ لال کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا اور کبھی راجہ ادیوت سنگھ کے نام پریم چندرکا پیش کی، کبھی دلی کے رئیس پالی رام کے بیٹے سجان من کیلئے سجان ونود لکھی اور کبھی پہانی کے حاکم اکبر علی خاں کی خدمت میں سکھ ساگر ترنگ پیش کیا،

دیو کی تصانیف کا دائرہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے، ان کی تعداد کوئی ۵۲ بتلاتا ہے اور کوئی ۷۲۔ ان میں سے ۸ کتابوں کے قلمی نسخے حاصل ہو چکے ہیں۔ شرنگار کال کے کسی اور شاعر نے اتنی تعداد میں اور اس قدر وسعت نظر کے ساتھ تصنیف نہیں کی، دیو در اصل ایک رومان پرور اور عاشق مزاج شاعر تھے، رومانیت اور تعشق ان کے کلام کا نمایاں حصہ ہے، ان کی منظومات میں سے جس شعر کو بھی اٹھا لیجئے وہ محبت کی چاشنی، رومان کی لذت سے خالی نہ ہوگی۔

دیو کے کلام میں تخیل کو بڑا دخل ہے، وہ تخیل کے سہارے ایسے مجسمے تراشتے ہیں جو حسن کے اعتبار سے بے نظیر ہیں، دیو کی شاعری تاثراتی ہے، اس لیے کشش اور لچک بھی ہے، جذبات کے مطابق زبان میں لوچ پیدا کرنا دیو کا خاص حصہ ہے، قواعد کے اعتبار سے دیو کی زبان میں کچھ کمی ضرور نظر آتی ہے لیکن کسی محبوبہ کی

کے تحت ایسا کیا ہے، اس سے اس کی صلاحیتوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نمونۂ کلام یہ ہے،

دو یں بیس بساویسنیہ کے بھال مرگمسی نبی کے بھا لکھیو کنگلی میں چرپوکر چرپدا لگائی لیو ادھوں اجلا لکھیو
کے کھنول گچھے گینے رس موتی دنن سنگار کے جا لکھیو سانو رے لال کو سانور وپ میں کوجھراکر رکھیو

متیرام | متیرام کی پیدائش سمبت ۱۶۷۴ءیں ضلع کانپور کے ایک گاؤں تکوان پور میں ہوئی، ڈاکٹر بھگیرتھ نے اس گاؤں کا نام ٹکیا پور لکھا ہے جو صحیح ہے، متیرام، چنتامن اور بھوشن کے بھائی تھے، ان کا کلام شیرینی اور حسن کے لحاظ سے بہت خوبصورت ہے، متیرام کی طبیعت کا جھکاؤ رس کی طرف زیادہ ہے ان کی مشہور تصانیف میں للت للام، رس راج، پھول منجری، چھند سار پنگل، ست سئی، ساہتیہ سار لکچھن سنگار اور النکار پنچاشکا ہیں، ان تصانیف میں للت للام اور رس راج زیادہ مقبول ہیں للت للام (ललित ललाम) النکار سے متعلق ہے، اور بوندی کے حاکم بھاؤ سنگھ کی تعریف میں ہے، اس میں چتر کے علاوہ باقی سب النکاروں کو صنعت معنوی یا ارتھالنکار تسلیم کیا گیا ہے انھیں پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صنعتوں کی تعریف میں شاعر نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ چنانچہ اس کی پیش کردہ مثالیں بیشتر مقامات پر صنعتوں کی تعریف سے میل نہیں کھاتیں، تاہم بعض مقامات پر شاعر نے صنعت کی تعریف اور اس کی مثالیں بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہیں، مثلاً اُپما النکار یا صنعت تشبیہ کی تعریف وہ یوں کرتا ہے۔

جاکو ورنن کیجئے سو اپمیہ پرمان جاکی سمتا دیجئے تاہ کہت پرمان
جاں برنئے دہن کو سم چھب کو اُلاس پنڈت کب متیرام تہا اپما کہت پرکاس

اور اس کی مثال پیش کر کے اس کو اور واضح کر دیا ہے۔

متیرام کی دوسری مقبول تصنیف رس راج ہے جس میں عشق کے ذیل میں نائیکاؤں کے اقسام پر تفصیل سے لکھا ہے، متیرام کے نزدیک نائیکا وہ ہے جس کو دیکھ کر قلب کی گہرائیوں میں انبساط یا

رس پیدا ہو سے

ایجبت جاہ ولیک کے چت بیچ رس بھاو

لیکن یہ تعریف ناقص ہے، حریف کو دیکھکر اگر دل میں انتقام کا جذبہ پیدا ہو تو حریف کو نائیکا نہیں کہہ سکتے، رس راج اصلاً کا بیہ گرنتھ ہے، شاستر گرنتھ نہیں، شاستریہ کی کسوٹی پر اس میں کمی پائی جا سکتی ہے، شرنگار اور نائیکا بھید کے بیشتر گرنتھ اسی نوعیت کے ہیں، سکھ دیو مصر کا "رسارنو" بھی نائیکا بھید کا ہی گرنتھ ہے، اس کے علاوہ رام جی کا نائیکا بھید گوپال رام کا رس ساگر بلرام کا رس دیویک کلیان داس کا رس چند وغیرہ گرنتھ بھی اسی طرح کے ہیں۔

نائیکا کے بیان میں متیرام کا ذیل کا سویا بہت مقبول ہے۔

کندن کو رنگ پھیکو لگے جھلکے ات انگن چارو گرائی | آنکھن میں السان چتونی میں منج ولاس کی سرسائی
کو بن مول بکات نہیں متیرام لہے مسکان مٹھائی | جیوں جیوں نہار یے نیرے ہوئیوں تیوں کری دکرے سی نکائی

متیرام کے نائیکا بھید میں اکبر شاہ کی رس منجری کی ہی تقلید کی گئی ہے، سوکیا یعنی عفیفہ کی تین قسمیں مگدھا (صغیرہ) مدھیا (متوسطہ) اور پرو ڑھا (کبیرہ)، صغیرہ کی قسموں میں نووڑھا یعنی نافرہ اور وشرتبہ نووڑھا یعنی راغبہ، مدھیا یا متوسطہ کی قسموں میں دھیرا (صابرہ) ادھیرا (غیر صابرہ) اور دھیرادھیرا (صابرہ غیر صابرہ) اور اسی طرح پرو ڑھا کی بھی دھیرا، ادھیرا۔ اور دھیرا دھیرا قسمیں۔ اور پرکیا یعنی بیتیہ کی قسموں میں گپتا (مختفیہ)، بدگدھا (فاطنہ)، کلٹا (فاسقہ) انوشیانا (ناحشہ) لکچھتا (مستترہ) مدتا (معلنہ) انوڑھا (باکرہ) اور اوڑھا (ثیبہ) کا بیان ہے۔

اس کے علاوہ پریم گربتا، روپ گربتا اور مان گربتا نائیکاؤں کا بیان متیرام نے کیا ہے۔ اس کے بعد پرشت پتکا، کھنڈتا، کلہنترتا، بپرلبدھا، اتکنٹھتا، واسک سجا سوادھین پتکا، ابھسارکا پروتسیت پرسی اور آگت پتکا کا بیان ہے۔ نایک کے اقسام میں متیرام نے پتی، اپ پتی،

اودیپک تین قسمیں درج کی ہیں، اس کے بعد چار طرح کے نایک. انوکول، دکچھن، شٹھ اور دھرشٹ کا بیان ہے، یہ اقسام پتی بھید کے ذیل میں ہیں، اُپ پتی اور ویشک کی قسمیں علحدہ بیان کی گئی ہیں۔

مدھنایک | مدھنایک کا ذکر بھکتی کال کے شعراء کے ساتھ کیا جا چکا ہے لیکن مدھنایک چونکہ اصلاً ریتی اور شرنگار کے شاعر ہیں، اسی لیے یہاں ان کا ذکر کرنا اشد ضروری ہے، بلگرام کے ہندی شعراء میں مدھنایک کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے، کا بیہ شاستر اور موسیقی کے آچاریہ مدھنایک شرنگار کال کے ہندی شعراء کی محفل کا ایک بیش قیمت جوہر ہیں، مدھنایک ایک ہی وقت میں ایک بے مثال موسیقار، ایک کامیاب شاعر، ایک عظیم آچاریہ اور ایک سچے عاشق ہیں۔

مدھنایک (मधनायक) کے تخلص کو ہندی کے محققین نے مختلف انداز سے لکھا ہے، ڈاکٹر بھگیرتھ مصرا سے مدنایک (मदनायक) لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر برج کشور مصر کے یہاں یہ لفظ میرزا مدنایک ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر منشو لعل جوشی نے اسے مدھونایک (मधुनायक) لکھا ہے اور شری گوپال چند رسنگھ اسے مدھنایک لکھتے ہیں۔ مدھنایک کا تخلص دراصل مدھنایک ہی تھا، مدھونایک یا مدھنایک نہیں، چنانچہ شاعر بلگرامی خلف میر عبد الجلیل بلگرامی تبصرۃ الناظرین میں لکھتے ہیں:

> "امّا مدھنایک لفظے است ہندی بمعنی آں واسطۃ القلادہ یعنی جوہر میانہ جمیل کہ بسیار خوب و گزیدہ تر می باشد، چوں سید مشار الیہ تخلص در شعر ہندی ہمی لفظ می کردند لہٰذا باین نام اشتہار یافتند۔" (قلمی حبیب گنج فارسی ۳۳/۱۲ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مدھنایک نے بھی ایک دوہے میں اپنے اس تخلص کی طرف اشارہ کیا ہے۔

> برن جنی جمُ از دھی مدھنایک مدھ جوت   مکٹ مولی تن لال دُت ادے ٹیک مَن جوت

مدھنایک نے اپنی پوری شاعری میں ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے کہ پڑھنے والا انکی نغمگی میں کھو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے، مدھنایک کے اشعار موسیقی کو ساتھ لیکر چلتے ہیں، ذیل میں نمونے دیے جاتے ہیں۔

کو خوبصورت سیج پر محو خواب دکھایا ہے، شاعر کے انداز بیان اور منظر کشی میں کتنی دلکشی ہے۔

سووت سروج کھی سکھ سمیپ سیج ہت اتھکارن سدن سکھ پائی کے

ڈھانکی پٹ آنچر لپیٹ تکھ سکھ موتیں پٹ پیاری نرکھ نرکھ للچا تی کے

پوڑھ ڈھگ سم بھرم سکے آن ہت جان پاوے نہ چپل چل چپڈن چھپاتی کے

چھاتی لائی لائی ہاتی بھانوتی ایندی کیفیں جیئی پیہ جا ہیں لیس سووت جگائی کے

سر سے پاؤں تک بالک ڈوپٹہ میں لپٹی ہوئی نائیکا کو دیکھکر اس کا محب چل اٹھتا ہے، اور آہستہ آہستہ جگا دیتا ہے، جگانے کا انداز بھی خوب ہے، ذیل کے چھند میں نایک کرشن کو زرد رنگ کی پچھوری لپیٹے ہوئے آتا ہوا دیکھکر نائیکا کی آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے آنسوؤں کی زبانی شاعر نے جانے کیا کچھ کہدینا چاہتا ہے

چندن چیر سوتن سانورے کا چھن ھو ہت آوت سوہن

بیت پچھوری پچھا ہن چھاجت نینن رنگ رچیورت چھو ہن

کنڈل منڈت منچل منجری نوتن نوت لت اکری جو ہن

آلسن کی اولی اچھے مدھنایک بال بلوکت موہن

مدھنایک جی نے اپنی تصنیف مدھنایک سنگار میں رس کے بیان اور نائیکا بھید کو اپنا موضوع قرار دیا ہے، مدھنایک جی کا نائیکا بھید قدیم روایتوں کی تقلید کے باوجود انوکھا اور نرالا ہے، کی شاعری میں کہیں کہیں فطرت کے خوبصورت مناظر بھی ہیں لیکن فطرت کا آزاد تصور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ برسات کا ایک منظر یہ ہے:

برکھت بوندن الکھنڈ دھارا دھار اودھر جیوں دھان دمنی لیٹ دامن دامنی

بھرے نیر ساگر امنڈ چلے ندی ندا ری کھوری سیت کھیت پنک پانی جامنی

اودھو دلیسکو نیم اتو پریم کہا موسے آن بھوتن نہ بھائے بھوری بھامنی

آیئے ہیں جو پریمی تو کھی کالی نیمی سکھی سٹے ہوئی ہیں تئی ناگ زیلی کام کامنی

رسلین بلگرامی رسلین ہندی کے ایک مقبول شاعر ہیں، ان کا اصل نام سید غلام علی اور تخلص رسلین تھا، انھوں نے فارسی زبان میں بھی شاعری کی ہے لیکن ہندی کے شاعر کی حیثیت سے ان کا جو مقام ہے وہ فارسی میں نہیں ہے، ہندی کا ایک مشہور دوہا جسے اکثر حضرات بہاری کا سمجھتے ہیں، درحقیقت رسلین جی کا نتیجۂ فکر ہے، وہ دوہا یہ ہے

ای ہلاہل مدبھرے سیت سیام رتنار جیت مرت جھک جھک پرت جہ چتوت اک بار

اس کا اردو منظوم ترجمہ یہ ہے

آب حیات زہر ہلاہل شراب ناب چھلکے ہے چشم سرخ و سیاہ و سپید سے
جی اٹھے جاں ہلاک کرے کھودے عقل و ہوش اک بار جو بھی تیری نگاہوں میں دیکھ لے

رسلین جی سید باقر بلگرامی کے بیٹے تھے، ان کی ولادت بلگرام میں ۱۱۱۱ھ میں ہوئی تھی، ان کی تاریخ ولادت علامہ عبد الجلیل بلگرامی نے یہ تحریر کی ہے

نور چشم میر باقر گفت بامن چوں گل خورشید در عالم دمیدم
سال تاریخ تولد خود بگفتم نور چشم باقر عبد الحمیدم
۱۱۱۱ھ

رسلین کی تصانیف میں رس پربودھ، انگ درپن اور متفرق کتابیں ہیں، رس پربودھ میں ۱۱۵۴ اور انگ درپن ۱۹۰ دوہے ہیں، میر آزاد بلگرامی نے انگ درپن کے دوہوں کی تعداد ۱۰۰ تحریر کی ہے، غالباً انھوں نے آخر کے تین دوہے جو تصنیف کے خاتمے سے متعلق ہیں شمار نہیں کیے ہیں، ان کی کتابوں کی ابتدا شاعر نے حمد و نعت سے کی ہے اس کے بعد فقیر کسی ترتیب کے نایکاؤں کا بیان ہے۔

رسلین سے متعلق عام ہندی محققین کی طرح ڈاکٹر محمد حسن صاحب لکھتے ہیں :

"رسلین نے اپنے کو صرف دوہوں تک ہی محدود رکھا ہے اور اس میں بھی انکی توجہ لفظی صناعی اور نظم کنائی پر زیادہ رہی ہے، داخلی جوش اور سوز و گداز پر نہیں"۔

ڈاکٹر صاحب نے غالباً سرو آزاد کا مطالعہ نہیں کیا ہے، اگر وہ اس کا مطالعہ کر لیتے تو ان کو یہ غلط فہمی نہ ہوتی کہ رسلین کی شاعری صرف دوہوں تک محدود ہے میر آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں رسلین کے کئی کبت درج کیے ہیں، البتہ لفظی صناعی اور اظہار کمال پر ان کی زیادہ توجہ کا خیال ایک حد تک درست ہے لیکن یہ کہنا کہ ان کی توجہ داخلی جوش اور سوز و گداز پر نہیں تھی، بے بنیاد ہے، رسلین کے داخلی جوش اور سوز و گداز کی ایک مثال ملاحظہ کیجیے: نایک نے پردیس جاتے وقت نائیکا سے اپنے واپس آنے کا ایک وقت معین کر دیا تھا، جو گذر چکا ہے، اور نائیکا بالکل مایوس ہو چکی ہے کہ اچانک نایک آ جاتا ہے اور رات بھر نائیکا کے ساتھ رہنے کے بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے علی الصباح چلا جاتا ہے، اس موقع پر رسلین جی نائیکا کی قلبی کیفیت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں کہ جیسے مشعل ایک مرتبہ روشن ہو کر گل ہو گئی اور دوبارہ اس کو کسی نے تیل میں ڈبو کر روشن کر دیا ہو۔

اودھو گئے ہر کے رسلین سو بیتے بہئے دن آکِ تئی ہے
نا ہ سمے ہر آئی اچانک دیکھت ہی سیرا تی گئی ہے
بھوہیں پھیر چلے تن کے اب تو گت ایسی بچھا رئی ہے
مانو مسال بجھی یر کے پھر نیہہ میں بور جگائی دئی ہے

ذیل کے کبت میں بھی نائیکا کہتی ہے کہ جب وقت سے پیتم پردیس گئے ہوئے ہیں ایک پل کیلئے بھی خوشی میسر نہیں ہوئی ہے جدائی کے لمحات قصاب کی طرح جان لینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں، ایسی حالت میں درد دل کس سے بیان کیا جائے، اس وقت کام دیو بھی کمان میں تیر چڑھا کر مسلسل حملہ کر رہا ہے، اے راہ گیر تیرا بڑا احسان ہوگا اگر تو نول کشور یعنی کرشن جی سے صرف اتنا جا کر کہہ دے کہ ان کی عدم موجودگی میں جو مظالم مجھ پر ڈھائے جا رہے ہیں انھیں میں کس طرح برداشت کر سکوں گی۔

جب تیں سدھارے پردیس رتین سپاٹے تب تیں تھک این سکھ کو نہ لہے

برہ کسائی وکھدائی بھیو آوے نت میر و ہان لیں یکا سو ہتا کہے

اپنے پر پنچ بان بان میں گھے کمان مارے تک تک بان کیسے کے نبیے

پتھک نہور کھو فول کسو رجو سوں تم بن جور کون کو ن کون سہے

ریتی عہد کے عظیم شاعروں کا سلسلہ رسلین پر ختم ہو جاتا ہے۔

شرنگار کال کے ساتھ سیاسی اور سماجی حیثیت سے ہندوستان کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب آچکا تھا، نئی سیاسی قوتیں پرانے نظام حیات اور قدیم طرز تمدن کی بساط تہہ کر رہی تھیں، ہندی ادب بڑی تیزی کے ساتھ ارتقائی منزلیں طے کر رہا تھا، وہ ایک ایسے باب میں داخل ہو رہا تھا جسے بہت وسیع معنوں میں دور جدید کہا جا سکتا ہے۔

(باقی)

باب التقریظ والانتقاد

سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری

از سید محمد الحسنی، صفحات ۴۲۴، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، قیمت ۱۲ر

جناب مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

تحریک ندوۃ العلماء کے ایک اہم رکن اور اسکے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی مونگیری کی یہ مفصل سوانحعمری ہے، جسے دار العلوم ندوۃ العلماء نے شائع کیا ہے، اس میں مولانا کی ابتدائی زندگی سے لیکر وفات تک کے حالات بڑے شستہ اور شگفتہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں، ان کی پاکیزہ زندگی کے واقعات پڑھنے سے آج بھی اللہ کی محبت، اتباع سنت کا جذبہ اور، درد مندی اور دلسوزی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مولانا محمد علی، مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کے اجل خلفاء اور ہمعصر علماء و صلحاء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے، انکے ذریعہ ہزاروں آدمیوں کو توبہ و انابت کی سعادت نصیب ہوئی، زہد و اتقاء کے ساتھ وہ ایک وسیع النظر داعی ہفکر اور کامیاب مصنف بھی تھے، انھوں نے چھوٹی بڑی پچاس کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، خاص طور پر رد عیسائیت اور قادیانیت پر انکی کتابیں بہت ہی مقبول ہوئیں، ان ہی خصوصیات کی بنا پر تحریک ندوۃ العلماء کے محرکوں نے جن میں مولانا خود بھی شامل تھے، ان کو اسکا پہلا ناظم مقرر کیا، جس پر وہ عرصہ تک رہے، کئی برس بعد بعض داخلی اور خارجی حالات کی وجہ سے وہ اس سے مستعفی ہوگئے، اسلیے ضرورت تھی کہ مولانا کی ایک مفصل اور پُر معلومات سوانحعمری شائع کیجاتی، اس کتاب سے یہ ضرورت بدرجۂ اتم پوری ہوگئی، کتاب میں کل سات ابواب ہیں، جن میں مولانا کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، مگر کئی وجوہ سے کتاب کا سب سے زیادہ قابل توجہ اور جاذب نظر تیسرا اور چوتھا باب ہے خصوصیت کے ساتھ اہل ندوہ کے لیے۔

مولانا کی زندگی اور اسکے مختلف گوشوں کے بارے میں بعض جزئیات کو چھوڑکر ہو دائیں مشکل سے ہو سکتی تھیں، مگر ان دونوں ابواب میں جن مسائل کو چھیڑا گیا ہے وہ ان سے نہ صرف کتاب کے بارے میں بلکہ ان سے متعلق جو افراد بھی

زیر بحث آگئے ہیں، حتی کہ خود مولانا کی ذات کے بارے میں بھی وہ باتیں کا ہیجانا یقینی ہو، ان ابواب میں جن رازہائے سربستہ سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اس سے ندوہ کی وسیع النظری اور واقعیت ہی نہیں بلکہ خود مولانا کی سیرت کی افادیت بھی قدرے مجروح ہوجاتی ہے، ان ابواب میں واقعات کو ایک خاص انداز سے ترتیب دیکر تحریک ندوۃ العلما اور تاریخ دار العلوم ندوۃ العلماء کے سلسلے میں بعض ایسے نئے پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کیگئی ہے جو نہ حیات شبلی کے مصنف کے علم میں تھے اور نہ ندوہ کے سالانہ جلسوں کی رودادوں ہی میں ان کا ذکر ملتا ہے، ان ابواب کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ مخصوص مزعومات و احساسات کو واقعات کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے ظاہر ہے کہ یہ تاریخ نویسی نہیں بلکہ تاریخ سازی ہے، اس بدعت کی ابتدا انگریزوں نے کی تھی، جسے سیاسی تاریخ نویسوں نے اپنالیا، اور اب مذہبی حلقے بھی ان ہی نقش قدم پر چل رہے ہیں، تاریخ سازی کی سب سے بڑی خصوصیت مبالغہ آمیزی (خواہ مدح میں یا قدح میں) اور جذباتیت ہوتی ہے جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس سے حقیقت اور واقعیت مسخ ہوجاتی ہے، خوب، ناخوب اور ناخوب خوب بنجاتا ہے، ادھر ندوہ سے جتنا لٹریچر نکل رہا ہے، اس میں اس طرح کے عناصر کی کارفرمائی بہت نظر آتی ہے، اور اسی کا ایک مظہر اس کتاب کے دو ابواب بھی ہیں۔

تحریک ندوۃ العلماء کے کارفرماؤں نے اردو کے افسانوی صحافتی اور جذباتی لٹریچر میں الندوہ اور دوسرے ذرائع سے جو انقلاب برپا کیا تھا، اس سے علم و ادب اور فکر و نظر کے تمام گوشے متاثر ہوئے تھے، الندوہ کی روش کو چھوڑنا تحریک ندوہ کی علمی حیثیت اور تاریخیت کی طرف سے ایک بد گمانی کی فضا پیدا کرنے کے مرادف ہے، یوں تو ان ابواب میں بہت سی باتیں قابل بحث ہیں لیکن خصوصیت سے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ان ابواب کے مطالعہ کے دوران میں سب سے پہلی بات جو کھٹکتی ہے وہ یہ کہ تحریک ندوۃ العلماء کو ایک مخصوص ذہن کی پیداوار قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے، حالانکہ یہ تحریک کسی ایک ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ ایک اجتماعی احساس و زیاں تھا، جو انفرادی طور پر بہت سے دلوں میں پیدا ہوا، اور اس نے مدرسہ فیض عام کے جلسہ دستار بندی میں ایک اجتماعی شکل اختیار کرلی، سید صاحب حیات شبلی میں مدرسہ فیض عام کے جلسہ میں شریک علماء کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"مشرق و مغرب کے یہی وہ موزوں مطلع تھے جس سے ندوۃ العلماء کا آفتاب طلوع ہوا۔" (ص ۳۰۲)

پھر آگے لکھتے ہیں:۔ "اس منتخب جلسہ میں یہ طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علماء کی ایک مجلس قائم کیجائے۔" (ص ۳۰۳)

پہلی رُوداد میں مولانا محمد علی کے یہ الفاظ موجود ہیں۔

"جب بہت سے نامور علماء مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی میں رونق افروز ہوئے اس وقت "بعض دوراندیش" علماء نے تحریک کی کہ ایک انجمن علماء کی قائم کیجائے، اس تحریک کو تمام علمائے موجودین نے پسند فرمایا۔" (ص۵)

مولانا خود دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ کسی ایک یا دو چار مخصوص ذہن کی پیداوار نہیں ہے

"ندوۃ العلماء ایسی انجمن نہیں جو کسی ایک شخص کے خیال سے یا دو چار آدمیوں کے مشورہ سے بغیر سمجھے بوجھے قائم کر دی گئی ہو۔" (ص ۲۲)

"بعض دوراندیش" سے ظاہر ہو کہ مولانا نے اپنی ذات تو مراد نہیں لی ہوگی، بلکہ صورت یہ ہوئی کہ موجود علماء میں بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا چونکہ یہ سب کے دل کی آواز تھی اور بہت سے دلوں میں پہلے سے اس کے لیے اضطراب موجود تھا، اسلیے اس پر اتفاق ہو گیا، اور وہ مجلس قائم ہو گئی، مولانا محمد علی اسکے صف اول کے موسسین میں تھے، اس کے بعد مولانا حیدرآباد چلے گئے، پھر دوسرے سال جلسۂ دستار بندی کے موقع پر تشریف لائے، اور اسی کے ساتھ ندوہ کا اجلاس بھی کیا، مولانا نے رُوداد میں یہ بھی لکھا ہے کہ بہت دنوں تک واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا، مگر مدرسۂ فیض عام کے جلسہ کی وجہ سے آنا پڑا۔

اس حصہ کو مصنف کتاب بالکل نظر انداز کر گئے ہیں

اس تفصیل کا مقصد یہ ہو کہ یہ تحریک کسی ایک شخص کے جیسا کہ خود مولانا محمد علی نے تحریر فرمایا ہے، ذہن کی پیداوار نہیں بلکہ بہت سے دردمند اور مضطرب دلوں کی آواز تھی جس نے ایک اجتماعی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔

مولانا اسکے پہلے ناظم ضرور مقرر ہوئے، مگر اس سلسلہ میں مولانا کا کوئی ایسا انقلابی اور انفرادی کارنامہ نظر نہیں آتا، جس کی وجہ سے ندوہ کلاں کو بانی قرار دیا جا۔ اسلیے کہ کسی تحریک یا ادارے کے بانی کا طرز عمل ایک ٹھاکر اور دوسرے کام کرنے والے کا نہیں ہوتا بلکہ وہ اسکو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے، وہ اسکی ساری دلچسپیوں کا مرکز رہتا ہے وہ اسی کی خاطر سوتا اور اسی کی خاطر جاگتا ہے، علم و تقویٰ کے تمام امتیازات کے باوجود یہ چیزیں ہمیں مولانا کی عملی زندگی میں نظر نہیں آتیں، اور نہ کتاب میں کوئی واقعی دلیل فراہم کی گئی ہے، بلکہ مولانا کا بار بار استعفی پر اصرار کرنا اس دعوی کے خلاف دلیل ہے۔

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے خط کا جو جزنقل کیا گیا ہے اسکی تردید خود مولانا کے مذکورہ بالا بیان ہی سے ہوتی ہے، پھر یہ بات خود قابل بحث ہے کہ کسی تحریک یا ادارہ کا بانی قرار دینے کے لیے اسکے انفرادی کارناموں اور بنیادی لٹریچر کے بجائے دوستوں کے ذاتی خطوط سے دلیل فراہم کیجائے۔

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ دار العلوم دیوبند کے بانی نہیں ہیں، مگر انھوں نے جب اسکا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا تو بس اسی کے ہو رہے، اس سلسلہ میں انھیں بہت کچھ سرد و گرم سہنا پڑا مگر اس سے کسی آن جدا نہیں ہوئے، اسلیے انھیں بانی قرار دیدیا گیا، اور یہ بڑی حد تک صحیح بھی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ بزرگوں سے کسی ادارہ کی نسبت اس کے اعتماد کی بڑی سند ہے، مگر اس کو کسی مخصوص طبقہ کے اعتماد کا ذریعہ بنانے کی کوشش کرنا نفسیاتی کمزوری ہے۔

دوسری بات جو ان ابواب میں پڑھنے والے کو کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ کتاب میں قصداً علامہ شبلی کی خدمات کو نظر انداز کرنے اور انکی ذات کو دینی اعتبار سے مجروح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، زہد و اتقار کے اعتبار سے دونوں میں تفاوت ضرور تھا مگر وہ بھی محبت نبوی میں بچشم ہستیں ہزار گوہر تماشا کن اور خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہوا تھا کہنے والا بھی خدا کے یہاں کچھ کم مرتبہ نہ ہوگا۔ جہاں مولانا محمد علی اور علامہ شبلی کی طبیعتوں میں موازنہ کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں انکے خاندانی اثرات کا ذکر کرکے انکی سیمابیت اور انتہا پسندی کا جو بھیانک نقشہ پیش کیا گیا اور اس سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ نہ صرف غلط ہے بلکہ شائستگی قلم کے بھی منافی ہے، غیرت و حمیت کے نتیجہ میں ان کے دادا کا قبول اسلام اگر ایسا عیب ہے کہ کئی پشت تک اسکا اثر نہیں گیا، تو پھر بعض صحابہ جن میں حضرت حمزہؓ بھی تھے، کے اسلام کے بارے میں کیا رائے قائم کیجائے گی۔

ندوہ کا پہلا اجلاس مدرسہ فیض عام کانپور میں ہوا جسمیں علامہ شبلی نے ایک تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک فعال اور سرگرم عنصر کی حیثیت سے حصہ لیا، انھوں نے مدرسہ کے اجلاس کی صدارت کی تحریک کی، پھر ندوہ کے جلسہ کی تحریک صدارت کی بلکہ روداد کے الفاظ تو یہ ہیں کہ "سارے ملک کا کاغذ پڑھکر سنایا"۔ آخر میں ندوۃ العلماء کیلئے دستور کا مسودہ پیش کیا، روداد میں ہے؛

"اسکے بعد شمس العلماء مولوی شبلی صاحب نعمانی نے جناب صدر سے اجازت لیکر دستور العمل پیش کیا اور مولوی نعیم محمد صاحب نے تائید کی"

اس اجلاس میں نصاب تعلیم کی کمیٹی بنی، اس میں ان کا نام موجود ہے، دستور کے مطابق انہی نے مجلس انتظامیہ کی تشکیل کی

تجویز کی، غرض اس اجلاس کے سارے اہم کاموں میں انھوں نے نہ صرف حصہ لیا بلکہ متعدد کام انہی کی وجہ سے انجام پائے، اس اجلاس کی جو رُوداد اس کتاب میں بیان کی گئی ہے، وہ "حیات شبلی" اور ندوہ کی رُوداد سے جو خود مولانا محمد علی مونگیری کی مرتب کردہ ہے مختلف ہے، علامہ شبلی کا صرف اتنا ذکر ہے کہ وہ اس جلسہ میں شریک تھے اور اس کی کارروائیوں میں دلچسپی سے حصہ لیتے رہے (ص ۱۲۷) دستور کے سلسلہ میں حیات شبلی اور رُوداد کے بیان کے خلاف لکھا گیا ہے کہ دستور پیش کرنے کا کام مولانا محمد علی نے مولوی عبدالحق حقانی کے سپرد کیا تھا، لیکن وہ وقت مقررہ پر تشریف نہ لاسکے، چنانچہ مولانا شبلی نے صدر جلسہ کی اجازت سے پیش کیا (ص ۱۲۸) معلوم نہیں کہ ان معلومات کا ذریعہ کیا ہے، پھر مولانا حقانی کا نہ آنا اور علامہ شبلی کا بر وقت دستور پیش کر دینا بالکل سمجھ میں نہیں آتا، اگر مولانا حقانی نے اپنا مسودہ پہلے سے بھیج دیا تھا تو اس کا ذکر رُوداد میں کیوں موجود نہیں ہے۔

مولانا شبلی کو نظر انداز کرنے اور ان کو مجروح کرنے کا جو منصوبہ نوجوان مصنف نے بنایا تھا اس کی تکمیل کی یہی صورت تھی، کہ ندوہ کے سلسلہ میں ان کی تصویر کا صحیح رخ سامنے نہ آنے پائے۔

ندوہ کی پہلے سال کی رُوداد اور حیات شبلی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جن مقاصد کی تکمیل اور جن علمی، تعلیمی اور معاشرتی تبدیلیوں کیلئے تحریک ندوۃ العلماء کا وجود عمل میں آیا تھا ان میں سے کسی ایک کی تکمیل بھی مولانا محمد علی کے عہد نظامت اور مولانا عبدالحئی صاحب کی نیابت یعنی ۱۸۹۶ء سے لیکر ۱۹۰۴ء تک نہیں ہو سکی، ان حضرات کے دلوں میں یہ خواہش ضرور تھی جیسا کہ کتاب سے ظاہر ہوتا ہے، مگر ان سب کی تکمیل اور ندوہ کو اس کے علمی و تعلیمی معیار مطلوب سے قریب سے قریب تر کرنے میں جس نے سب سے زیادہ حصہ لیا وہ علامہ شبلی کی ذات ہے، بلکہ آٹھ برس تک تو صورت حال یہ تھی کہ ندوہ کا دفتر تک گردش میں رہا، وہ کبھی لکھنؤ میں تھا اور کبھی شاہجہانپور میں، اور کبھی کسی اور جگہ اسکے لیے امن تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، مولانا محمد علی کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ

"ندوۃ العلماء کے ماتحت وسیع پیمانہ پر ایک دارالعلوم کے قیام کی تجویز سب سے پہلے مولانا کے ذہن میں آئی اور مولانا نے اس کا ایک خاکہ تیار کر کے ۱۱ محرم ۱۳۱۳ھ کے جلسہ انتظامیہ میں پیش کیا، اسکے بعد یہ خاکہ "مسودہ دارالعلوم" کے نام سے شائع کر کے استصواب رائے کیلئے ممتاز علماء اکابر اور اصحاب علم حضرات کو ارسال کیا گیا" (ص ۱۴۶)

اس بیان کے مقابلہ میں آپ حیات شبلی کے صفحہ کا یہ حصہ اس تاریخ کے بارہ میں تفصیل میلادی میں ملاحظہ کیجئے،

اس سے پہلے ندوہ کے دستور کا ذکر آچکا ہے کہ اسے مولانا شبلی نے مرتب کیا تھا، نصاب تعلیم کی تبدیلی، دارالعلوم کی تجویز اور دوسرے امور کے [illegible]

بارے میں سید صاحب کا بیان ملاحظہ ہو۔

"اسکے بعد علماء کی ایک مجلس ترتیب نصاب کے لیے مقرر کی گئی جس میں ایک نام مولانا کا بھی تھا، ان بزرگوں نے رسالے لکھے، اور مولانا نے دار العلوم کے نصاب کے بجائے دار العلوم کا مسودہ (خاکہ) تیار کیا جس کو پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان کا مسافر قسطنطنیہ کے کسی بڑے شہر میں کھڑا ہے"۔ (حیات شبلی ص ۳۱۰)

سید صاحب آخری جملہ میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دار العلوم کے وسیع تصور کے مطابق اگر اسکا نصاب کوئی تجویز کر سکتا تھا تو وہ مولانا شبلی کی ذات تھی جو بیروت ترکی کی یونیورسٹیوں کا جائزہ لے چکے تھے، اور جنھوں نے حیدرآباد اور دوسرے کئی اداروں کا دینی نصاب تیار کیا تھا۔

مصنف کتابچہ نے لکھا ہے کہ ۲ محرم ۱۳۱۳ھ کو سب سے پہلے مولانا محمد علی نے دار العلوم کی تجویز مجلس انتظامیہ میں رکھی، اور سید صاحب کا بیان ہے کہ اس سے دو سال پہلے مولانا شبلی نے دار العلوم کا خاکہ مرتب کر دیا تھا۔

مجوزہ نصاب کے مطابق ایک الگ دار العلوم کی تجویز کے بارے میں مصنف کتابچہ یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ یہ مولانا محمد علی کا پیش کردہ ہے، مگر روداد اور حیات شبلی کے بیان سے اسکی تردید ہوتی ہے، اس سلسلہ میں سید صاحب کا پورا بیان ملاحظہ ہو: ۔

"۔۔۔ رجب ۱۳۱۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۹۵ء کو کانپور میں نصاب کا جلسہ ہوا ۔۔۔۔ اور مولانا شبلی نے شرکت کی اور کمیٹی کے مباحثہ کے بعد مجوزہ دار العلوم کے نصاب کا خاکہ مرتب ہوا" (حیات شبلی ص ۲۶۱) روداد میں مولانا محمد علی اپنے بارے میں لکھتے ہیں: "مجھکو بھی اس میں حاضر ہونے کی عزت حاصل تھی" (ص ۱۲)

یہی مسودہ ہے جس کو علماء کی مخصوص کمیٹی نے طے کیا تھا جو اجلاس بریلی سے پہلے دوسرے علماء کے یہاں بھیجا گیا تھا، اور اس کو پھر اجلاس خاص نے تجویز کی شکل دی، پھر وہ تجویز اجلاس عام میں پیش ہوئی، اس اجلاس کی تفصیل کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا (شبلی) نے اسکے پہلے ہی اجلاس میں معترضین کے اعتراض سے ندوۃ العلماء کے مقاصد پر ایک تقریر فرمائی، اسی اجلاس کے جلسۂ خاص میں دار العلوم کی تجویز منظور ہوئی"

"دوسرے دن ۵ شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۲۹ اپریل ۱۸۹۸ء کو ندوہ کے اجلاس عام میں مولانا [illegible] نے دارالعلوم کی تجویز پیش کی وہی تجویز جو جلسہ خاص میں منظور ہو چکی تھی جس کا خاکہ علامہ شبلی نے دو سال پہلے بنایا تھا) اور مولانا شبلی مرحوم نے اسکی تائید کی اور اس سلسلہ میں دار العلوم کی ضرورت پر ایک تقریر فرمائی جس میں نئے تعلیم یافتہ اور پرانے علماء دونوں کو مخاطب فرما کر اس مجوزہ عربی مدرسہ کی ضرورت بدلائل ثابت کی۔ یہ بھی طے ہوا کہ مجلس دار العلوم کے نام سے ایک الگ مجلس قائم کیجائے۔ اس مجلس کے قواعد مولانا شبلی مرحوم نے تیار کیے اور وہ ارکان کے پاس بھیجے گئے۔"
(حیات شبلی ص ۳۱۲)

ندوہ کے بنیادی مقاصد دو تھے، ایک موجودہ نصاب تعلیم کی تبدیلی، دوسرے نزاع باہمی کا خاتمہ پہلے مقصد کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ ایک درسگاہ کا قیام تھا، اور دوسرے مقصد کی تکمیل کے لیے جدید و قدیم دونوں جتوں میں اعتماد کی ضرورت تھی، نئی درسگاہ کے قیام کا مقصد محض ایک نئی عربی درسگاہ کا اضافہ نہیں تھا، بلکہ اس میں نئے نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم تھی، درسگاہ تو ۱۸۹۸ء میں قائم ہوگئی، مگر اس کے قیام کے آٹھ برس یعنی ۱۹۰۶ء تک اس میں وہی نصاب تعلیم پڑھایا جاتا رہا جو عام درسگاہوں میں پڑھایا جاتا تھا۔ نصاب میں جدید علوم کے ساتھ انگریزی کا داخلہ بھی پیش نظر تھا جیسا کہ مولانا محمد علی کے سیر نگار نے لکھا ہے، مولانا بھی اسکے حامی اور موید تھے مگر تعجب یہ ہے کہ مولانا اور انکے رفقاء کار اپنے عہد نظامت و نیابت یعنی ۸ برس کی مدت میں کسی ایک جزء میں نہ کوئی تغیر فرما سکے اور نہ کوئی تجویز عملی صورت اختیار کر سکی، مولانا شبلی نے انگریزی کی تجویز کو کئی بار مجلس انتظامیہ اور مجلس عام میں رکھا، وہ منظور ہوئی، مگر اس پر عمل نہ ہو سکا، مولانا شبلی اس کو نافذ کرنا چاہتے تھے لیکن انکو کوئی قانونی پوزیشن حاصل نہیں تھی، اسلیے وہ بار بار ارکان ندوہ کو اسکی طرف توجہ دلاتے تھے، مگر اس وقت جو لوگ دار العلوم ندوہ میں دخیل تھے وہ اس کیلئے آمادہ نہیں تھے بلکہ یہ حضرات تو دار العلوم کی ایک الگ مجلس بھی بنانے کے لیے تیار نہیں تھے، اسی وجہ سے مولانا شبلی کی شرکت ان کو اور زیادہ گراں تھی، غرض یہ کہ مولانا شبلی کی آمد سے پہلے تک ندوہ کے قائم کردہ دار العلوم اور دوسرے عربی مدارس میں کوئی خاص فرق نہیں تھا، علامہ شبلی نے اس کے بارے میں سیکڑوں خطوط دوستوں، بزرگوں اور اپنے خدّام کو لکھے جو آج بھی مکاتیب شبلی میں موجود ہیں، ایک خط میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:-

"آج ایک نقشہ نصاب جاریہ دار العلوم ندوہ آیا، اس میں یہ کتابیں ہیں، ملا جلال، شرح جامی، فصول اکبری، میبذی، شافیہ، کبری! ہم آپ خدا کو کیا جواب دیں گے، کیا ندوہ کا یہی دعویٰ تھا ......"

پھر انھوں نے مولانا شروانی کو دوسرا خط لکھا کہ میں نے (یعنی مولانا شبلی نے) اسی کے متعلق ندوہ میں دل کو لکھا تھا، انکا جواب آیا ہے:

"جدید نصاب ہم لوگوں کو دکھایا تک نہیں گیا۔" (ص ۳۹)

جب عربی کتابوں میں تبدیلی کا یہ حال تھا تو انگریزی کے اجرا میں انکو کیا کیا دقتیں نہ اٹھانی پڑی ہونگی، اس کا کچھ اندازہ ان کے خطوط سے ہوتا ہے، دسمبر ۱۸۹۹ء کو مولانا شروانی کو لکھتے ہیں،

"جلسہ انتظامیہ میں باقاعدہ انگریزی داخل کرنے کی تحریک میں نے کی تھی، اور اصرار کیا تھا کہ تحریک درج تحریر کیجائے .... لیکن اسکی کیا وجہ ہے کہ کارروائی میں میری تحریک لکھی بھی نہ جائے۔"

اس کے جواب میں مولانا شروانی نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، تو لکھتے ہیں:

"بات تو کچھ نہیں لیکن مولوی عبدالحئی کی بہانہ جوئی اور آپکے خارق العادۃ بھولنے پر تعجب آتا ہے، جب میں نے دیکھا کہ انگریزی کے مسئلہ پر گفتگو نہیں ہوتی تو میں نے کسی قدر سختی سے کہا کہ اس سے کیوں گریز کیا جاتا ہے، آپ نے فرمایا کوئی شخص محرک نہیں، میں نے کہا میں ہوں، اور میرا نام لکھا جائے، مولوی یونس خان نے کہا میں تائید کرتا ہوں۔"

ان کوششوں کے باوجود دو سال تک پھر یہ معاملہ ملتوی رہا، مولانا شبلی نے بار بار اسکی طرف توجہ دلائی، ایک خط میں مولانا شروانی کو دوستانہ انداز میں لکھتے ہیں: "ایک ہمارے روشن خیال مولانا شروانی ہیں ..... انکا حال یہ ہے کہ انگریزی کے نام سے انکو لرزہ آتا ہے۔ بڑی مشکل سے مسلمانوں کو پھسلانے کی تجویز پر راضی ہوئے، تو عمل درآمد میں حیران ہیں۔" (ص ۴۱۷)

غرض یہ کہ عربی نصاب کی طرح جدید علوم اور انگریزی کا اجرا بھی باقاعدہ اس وقت ہوا جب مولانا شبلی ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم کے معتمد تعلیم ہو کر آئے، انھوں نے شدید موانع اور رکاوٹوں کے باوجود اس نصاب کو جاری کیا جس کیلئے دارالعلوم قائم کیا گیا تھا۔

اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ ندوہ اور دارالعلوم کے اجرا کے مقاصد کی تکمیل میں نہ صرف یہ کہ مولانا شبلی کا حصہ دوسرے حضرات سے کم نہیں تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ندوے نے جو نمونے بھی پیش کیے اگر ان میں شبلی کا رنگ بھرا نہ ہوتا تو اسکو اور اسکے منتظموں کو عام عربی مدرسوں پر کوئی تفوق نہ ہوتا، خصوصیت سے دارالعلوم کے معاملات میں تو دوسرے حضرات کا طرز عمل نہ تو ندوے کے مقصد سے میل کھاتا اور نہ اس میں کوئی ایسی بلندی نظر آتی کہ علامہ شبلی کو ندوہ کی تاریخ میں کوئی درجہ نہ دیا جائے، اور دوسرے حضرات سارے امتیازات کے مستحق گردانے جائیں،

ان دو پہلوؤں کے علاوہ اس کے بعض اور مندرجات اور بعض دوسرے ایسے واقعات ہیں جو قابل بحث ہیں مگر مقصود انکا احاطہ نہیں ہے بلکہ تاریخ ساز ذہنیت کی نشاندہی ہے۔

مطبوعات جدیدہ

علاج خوف و حزن - از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، ضخامت ۱۰۴ صفحات، کتابت طباعت عمدہ، ناشر مکتبہ دینیہ، دیوبند، قیمت ے

رنج و غم اور حزن و ملال انسانی زندگی کا لازمہ ہیں، اس سے کوئی انسان خالی نہیں ہے، ان سے نجات کی بہت سی صورتیں فلاسفہ، حکما، اور نفسیات کے ماہرین نے بتائی ہیں، مگر اس کا ایک علاج توبہ و انابت اور دعا و عبادت بھی ہے، امام غزالی نے صحیح لکھا ہے کہ جس طرح جسمانی امراض کے لیے معالجات ہوتے ہیں، اسی طرح اس روحانی مرض کا عام علاج بھی دعا و عبادت کے ذریعہ کیا جائے تو اس میں کوئی عقلی استبعاد نہیں ہے، اس موضوع پر بہت سے علما نے کتابیں لکھی ہیں، ان ہی میں امام ابن ابی الدنیا کا رسالہ الفرج بعد الشدۃ بھی ہے، اسی رسالہ کو ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اور جا بجا اپنے مخصوص صوفیانہ انداز میں حواشی لکھے اور اضافے بھی کیے ہیں، اس کتاب کے بعض مندرجات سے اختلاف کی گنجایش ضرور ہے، لیکن مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مفید ہے،

روح اسلام اقبال کی نظر میں - از ڈاکٹر غلام عمر خاں صفحات ۱۱۲، کتابت و طباعت بہتر، ناشر انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز، حیدرآباد، آندھرا۔

علامہ اقبال نے اسلامی تہذیب کے بارہ میں اپنے کلام اور بعض دوسری تصانیف میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کی روشنی میں ان کے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کتاب میں کل پانچ مباحث ہیں، جس میں بدھ مت، عیسائیت، اسلام، مغرب جدید اور اسلام اور مسلک تصوف

کے مابین جو اختلاف ہے، اس کی وضاحت کی گئی ہے، اقبال تصوف کے مخالف نہیں ہیں، مگر انھوں نے رہبانیت اور بدعت کے سلسلہ میں جو اختلاف کیا ہے اس سے بعض لوگ ان کو تصوف کا مخالف سمجھ جاتے ہیں، خود مصنف بھی اس غلط فہمی کا شکار رہے ہیں، ان کے بعض اشعار میں رہبانیت اور تصوف وغیرہ کا جو تقابل اور توافق نظر آتا ہے اس سے وہ تصوف مراد ہے جس کی تمام صوفیائے محققین نے مخالفت کی ہے، جس کا پنجاب اور سندھ میں رواج عام ہے، ان جزئیات کو چھوڑ کر کتاب میں اقبال کے نقطۂ نظر سے قریب پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تھوڑی دیر اہل حق کیساتھ۔ از یونس نگرامی ندوی، صفحات ۸۰، کتابت و طباعت بہتر، ناشر مکتبہ طیبہ سی ۲۰۰/۲ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ۔

اس کتابچہ میں بہت سے اہل حق کے سبق آموز واقعات مختلف کتابوں سے جمع کر دیے گئے ہیں، ان میں موضوع کے اعتبار سے کوئی ترتیب نہیں ہے، مگر ان واقعات کو پڑھکر عبرت و بصیرت دونوں پیدا ہوتی ہے، ان ہی بزرگوں کا طفیل ہے کہ دین اپنی اصلی صورت میں آجتک زندہ ہے، یہ کتاب کا دوسرا حصہ ہے پہلا حصہ اس سے پہلے شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے اگر جواں سال مصنف اس میں کچھ اپنا درد و سوز بھی شامل کر لیتے تو اس کی افادیت میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا۔

صورِ اسرافیل۔ از حبیب پالنپوری، صفحات ۲۹۰، کتابت و طباعت عمدہ، پتہ ادارہ اشاعت دینیات، نظام الدین اولیاء، نئی دہلی ۱۳، قیمت ۳ روپے

یہ ایک گجراتی شاعر حبیب پالنپوری کا مجموعۂ کلام ہے جسمیں غزلیں اور نظمیں دونوں ہیں، غالباً پہلی بار ان کا مجموعۂ کلام سامنے آیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں قدرت نے شاعری کی تمام صلاحیتیں جمع کر دی ہیں، ان کے کلام میں علامہ اقبال کے ذوق حکیمانہ اور جذب عاشقانہ کی جھلک ملتی ہے، امید ہے یہ مجموعہ اہل ذوق میں ذوق و شوق سے پڑھا جائے گا۔

م، ح
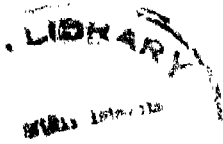
جلد ۹۶ - ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۵ء - عدد ۲

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

حکومت مسلم یونیورسٹی کی تحریک دبانے پر تلی ہوئی ہے، ندائے ملت کے مسلم یونیورسٹی نمبر کی ضبطی اور اس کے عملہ کی گرفتاری اسی کا نتیجہ ہے، ورنہ جو پرچہ پبلک کے ہاتھوں میں پہنچا بھی نہیں تھا محض شبہہ کی بنا پر اس کی ضبطی اور اس کے عملہ کی گرفتاری کا کوئی قانونی جواز نہیں ہو، اشاعت کے بعد اگر اس کا کوئی مضمون قابل اعتراض نظر آتا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کیجا سکتی تھی، اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو خوفزدہ کرکے اولڈ بوائے کنونشن کو ناکام بنایا جائے، لیکن یہ امر قابل اطمینان ہے کہ کنونشن بخیر و خوبی کامیابی کے ساتھ انجام پاگیا، باہر کے ایک ہزار سے زیادہ نمایندوں نے شرکت کی، ایسے اجتماع میں نرم گرم تقریروں کا ہونا ناگزیر ہے، لیکن دونوں نے مل کر کنونشن میں اعتدال پیدا کر دیا تھا، ڈاکٹر سید محمود صاحب کی تقریر بڑی مؤثر اور قومی جذبات سے معمور تھی، کنونشن کے صدر یسین نوری صاحب کا خطبۂ صدارت نہایت متوازن اور مدلل تھا، انھوں نے مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کی روشنی میں بڑی خوبی کے ساتھ مسلمانوں کے دستوری حق کی وکالت کی جس میں یونیورسٹی کے متعلق ان کے تمام مطالبات آگئے ہیں، کنونشن میں جو تجویزیں منظور ہوئی ہیں ان کو عمل میں لانے کیلئے ایک کمیٹی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے، اس کنونشن کی کامیابی کا سہرا منشی احترام علی صاحب صدر استقبالیہ کے سر ہے۔

جب حکومت یقین دلاتی ہو کہ یونیورسٹی کا کردار نہ بدلا جائیگا اور مسلمان یہی چاہتے ہیں تو پھر مسلمانوں کی پُر امن کوشش کو سختی سے دبانے کے کوئی معنی نہیں، البتہ کردار کے مفہوم کی تعبیر و تعیین میں اختلاف ہو سکتا

لیکن اصولاً اس کی تعیین کا حق صرف مسلمانوں کو ہے، اور وہی کردار صحیح مانا جائیگا جو مسلمان متعین کریں، اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا کہ نام کے لیے یونیورسٹی کا نظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے، لیکن کورٹ اور اکزکیٹیو کونسل کو یونیورسٹی کے ملازمین اور حکومت کے نامزد کردہ مسلم اور غیر مسلم ممبروں سے بھر دیا جائے، اور اس کی حیثیت گھٹا کر وائس چانسلر کی مجلس مشاورت کی کر دیجائے، یہ تو محض ایک کھیل ہوگا جس میں بظاہر یونیورسٹی کا نظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے گا لیکن حقیقۃً اس کی باگ حکومت کے ہاتھوں میں آجائے گی اور اس کی خود مختار حیثیت اور اس کا کردار دونوں ختم ہو جائیں گے، اس قسم کے کھیل بہت پرانے ہو چکے جو اس زمانہ میں نہیں چل سکتے۔

اس مسئلہ کے حل کی شکل صرف یہی ہے کہ یونیورسٹی ایکٹ میں کوئی ایسی تبدیلی نہ کیجائے جس سے اس کے کردار اور اس کی خود مختاری میں فرق آئے، اس کے سارے پہلوؤں پر بیانات اور مضامین نکل چکے ہیں، ہم بھی گذشتہ پرچہ میں اپنے خیالات ظاہر کر چکے ہیں، اور کنونشن نے ان مطالبات کو جامع اور مرتب شکل میں پیش کر دیا ہے، اس کے علاوہ جو شکل بھی اختیار کی جائے گی اس سے مسلمان کبھی مطمئن نہ ہونگے، ان میں اور حکومت میں، ایک مستقل کشمکش پیدا ہو جائے گی جو دونوں کے لیے مضر ہوگی، اس قضیہ کے حل کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہندو یونیورسٹی کے کورٹ اور اکزکٹیو کونسل کی جو شکل ہے وہی مسلم یونیورسٹی میں بھی جاری کر دیجائے، گو بعض حیثیتوں سے ان دونوں کا موازنہ بھی صحیح نہیں ہے، اس سے حکومت کے نامزد کردہ ارکان بھی اس کے کردار کے سب سے بڑے محافظ ہوں گے، یہ فخر تو صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کو حکومت کی خوشنودی کے لیے ملت فروشی میں بھی عار نہیں ہوتا، ورنہ ہندو یونیورسٹی میں مسلمانوں کی مؤثر حیثیت کیا ان کی ممبری کا بھی کوئی سوال نہیں ہے۔

گذشتہ مہینے ہم نے پاکستان میں سیرۃ النبیؐ کی پہلی اور دوسری جلد کی تلخیص شائع ہونے پر جو شذرہ لکھا تھا اس کو پڑھ کر ملتان کے ایک مخلص نے خط لکھا ہے کہ "آپ سیرۃ النبیؐ کے خلاصہ کو رو رہے ہیں یہاں شیخ عبد السلام مالک آئینۂ ادب انار کلی لاہور نے آپ کی پوری سیرۃ النبی چھاپ لی ہے، جب میں ملے ان سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے تو کہنے لگے کہ ہم نے ان کی اجازت سے چھاپی ہے، میں نے ان کی دوکان سے کئے فارم پر ان کی قیمتیں بھی لکھوالی ہیں جو روانہ ہیں"۔ یہ اطلاع دینے والے ایک ثقہ اور صاحب علم بزرگ ہیں، اس لیے اس کی صداقت میں کسی شک و شبہہ کی گنجایش نہیں، ابھی لاہور کے ایک معتبر ادارہ نے خبر دی ہے کہ بعض ناشروں نے شعر الہند اور گل رعنا چھاپ لی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس اندھیر کا کیا علاج ہے، اس کے معنی ہیں کہ پاکستان میں دار المصنفین کی تجارت جس پر اس کی آمدنی کا دارومدار ہے بالکل ختم ہو جائے گی، اور تنہا ہندوستان کی آمدنی پر زندہ چل نہیں سکتا۔

گذشتہ مہینہ بھی ہم نے پاکستان کے مخلصین کو اس اندھیر کی طرف توجہ دلائی تھی، ہماری درخواست پر جناب شورش کاشمیری نے دار المصنفین کی ہمدردی کا پورا حق ادا کیا، ان نئی خبروں کے بعد بھی اس کے سوا ہمارے بس میں کیا ہے کہ پاکستانی اخبارات اور وہاں کے اصحاب علم و قلم سے اس کی فریاد کریں کہ پاکستان کے قیام کے طفیل میں ہندوستان کے مسلمان تو تباہ و برباد ہو ہی چکے ہیں، یہاں جو نیم جان اسلامی ادارے باقی رہ گئے ہیں ان کو پاکستان کے خود غرض تاجر تباہ کرنے پر آمادہ ہیں، کاش پاکستان کی حکومت کے کانوں تک ہماری آواز پہنچ سکتی، کیا اب وہاں کوئی سردار عبد الرب نشتر باقی نہیں رہا جو دار المصنفین کو پاکستان کے خود غرض تاجروں سے بچا سکے، پاکستان خصوصاً لاہور میں دار المصنفین کے قدردانوں کا ایک بڑا حلقہ موجود ہے، ہم کو امید ہے کہ وہ اس کے تدارک کی کوشش کرے گا،

مقالات

عربی تحریر کی ابتدا و ترقی

از جناب مجیب اللہ صاحب ایم، اے لکچرار مولانا آزاد کالج کلکتہ

عرب کی تمدنی زندگی میں ادب و زبان کا اتنا بڑا حصہ ہے کہ نہ صرف عرب بلکہ دنیا کا کوئی ملک اس کو فراموش نہیں کر سکتا، عرب نے ادب و زبان میں وہ بلندی حاصل کی تھی جس کی مثال بہت کم ملتی ہے، خصوصاً قلیل مدت میں عربی شاعری کی حیرت انگیز ترویج و اشاعت معجزہ سے کم نہیں ہے' اُس زمانہ میں جبکہ دنیا بڑی حد تک شاعرانہ احساسات سے محروم تھی، عرب کے بادیہ نشینوں میں شاعری کا لطیف احساس پیدا ہوا، محبوب کا تصور اور اس کی یاد ان کے لیے سرمایۂ حیات بن گئی، ویران اور لق و دق بیابانوں میں مکانات کے کھنڈر عشق و الفت کے مرثیہ خواں نہیں بلکہ ان کی پاک اور سچی محبت کی دلیل تھے، جو دیار محبوب تک پہنچنے کی راہ بتاتے تھے، عربی شاعری اپنے ابتدائی دور ہی میں شعر و فن کے کمال تک پہنچ چکی تھی، چھٹی صدی ق،م میں عربوں میں شعری حس پیدا ہوئی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں عرب میں باضابطہ شاعری کا آغاز ہوگیا، اور اسلام سے کچھ پہلے اس اوج کمال پر پہنچی کہ نقادانِ فن حیرت میں پڑ گئے[۱]، عہد عباسیہ میں عربی زبان و ادب انتہائی عروج پر تھا، مگر وہ شعری حسن و لطافت جو بعثت رسول کے وقت حاصل تھی، وہ دور عباسی میں نصیب نہ ہو سکی، اور آج جبکہ یورپ نے ادب و زبان اور شعر و فن میں بے انتہا ترقی کی ہے بعض نقادوں کے نزدیک وہ عربی شاعری کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے،

۱؎ نکلسن: عربوں کی تاریخ ادب، ص ۲۲،

عام طور سے مشہور ہے کہ جس زمانہ میں عربی شاعری انتہائی عروج پر تھی، اُس زمانے میں تحریر اور تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا، شعراء زورِ بیان اور سلاستِ بیان سے بازاروں، درباروں اور جنگ کے میدانوں میں اپنے اشعار سے آگ تو لگا سکتے تھے، مگر اپنے دلی جذبات اور قلبی تاثرات کو کاغذ پر نقش کرنا نہیں جانتے تھے، بعض مورخین اور علماے ادب کا خیال ہے کہ گنتی کے چند لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے[1]، ایک روایت کے مطابق عرب میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے[2]، اس لیے شاعری کا سرمایہ کس طرح محفوظ رہا، اور آیندہ نسلوں تک کس طرح پہنچا، یہ بڑی حد تک صحیح ہے کہ عام طور سے عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا لیکن وہ سرے سے اس سے ناواقف نہیں تھے، اور مختلف شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ فنِ تحریر دورِ جاہلیہ میں کوئی بے معنی لفظ نہیں تھا، کتابت و تحریر کا باضابطہ نہیں تو کم از کم ایک حد تک رواج تھا،

اس سلسلہ میں یہ مسئلہ قابلِ غور ہے کہ عربی خط کب اور کیسے ایجاد ہوا، اس کا یقینی جواب دینا بہت مشکل ہے، تاریخ کے اوراق اس بارہ میں یا تو خاموش ہیں یا افسانوں میں گم ہیں بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدایشِ آدم سے پہلے ہی عربی خط موجود تھا لیکن ایسی روایتوں کو تاریخی استناد کا درجہ حاصل نہیں، اتنا مسلّم ہے کہ عربی زبان سامی زبان کی ایک شاخ ہے، اور اس سلسلے کی تمام زبانوں میں یہ سب سے آخری زبان ہے، ان تمام زبانوں میں ترکیب کلام اور الفاظ وغیرہ کے لحاظ سے بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے[3]، انیسویں صدی میں سچی کتبوں کی تحقیق اور سریانی، بابلی، عبرانی، آرامی، عربی وغیرہ کے تقابلی مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان تمام زبانوں میں مادے سہ حرفی ہیں، زمانے صرف دو ہیں ماضی اور حال (مضارع) گردان کا طریقہ بھی ایک ہی ہے، الفاظ کے جو اجزا ہیں اسمائے ذاتی

---

۱ بلاذری: فتوح البلدان ص ۱۱۴-۱۷، ۴۷۴؛ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۱۱ ۲ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۲، ص ۳۱۵

۳ پروفیسر ہٹی: (P. K. Hitti): تاریخ عرب ص ۰

اسمائے علاقی، واحد و جمع اور اعضائے جسم کے نام بھی بالکل ایک ہیں[۱] ہر زبان میں حروف اصلی بائیس ہیں، عربی میں بھی بائیس ہی حروف ہیں، اخیر کے چھ حروف ثخذ ضظغ (ث، خ، ذ، ض، ظ اور غ) ضرورت کے لحاظ سے بڑھائے گئے ہیں، اس سلسلے کی سب سے پہلی زبان بابلی کے کتبے ۲۲۵۰ ق م میں اور عربی خط میں تقریباً چھٹی صدی عیسوی کے لکھے ہوئے کتبے ملے ہیں، ضرورت کے مطابق زمانے کے ساتھ ساتھ ہر زبان میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ان کے خطوط میں بھی تغیر ہوتا رہا ہے، ابتداءً خیالات و جذبات کو لکیروں، نقوش اور خاکوں کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا تھا، رفتہ رفتہ یہ نقوش بدلتے رہے، اور آخر میں انھوں نے موجودہ حروف کی شکل اختیار کر لی، اس کے برعکس موجودہ عربی حروف قرناً قرن پہلے وجود میں آگئے تھے، اس کے باوجود اس کے موجودہ خط اور خط کوفی میں کافی فرق ہے، خطوط کی تاریخ ارتقا سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی خط بابلی خط تحریر کی آخری ترقی یافتہ شکل ہے یا کم از کم جنوبی عرب یعنی حمیری زبان کا خط موجودہ طرز تحریر کی ابتدائی صورت ہے، چنانچہ حمیری زبان میں ایسے بے شمار کتبے ملے ہیں، ان کتبوں کی تعداد چار ہزار سے اوپر ہے جو ساتو آٹھویں صدی قبل مسیح میں لکھے گئے تھے[۲]

مغربی محققین کے ذریعہ حمیری زبان وغیرہ کے جن کتبوں کا علم ہوا ہے، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں دو بولیاں رائج تھیں، ایک شمالی عرب کی بولی، دوسری جنوبی عرب کی، جنوبی عرب یعنی یمن، سبا، حمیر وغیرہ میں حمیری زبان بولی جاتی تھی، مگر اہل حبشہ نے جب حمیری سلطنت کا تختہ چھٹی صدی عیسوی میں الٹ دیا تو جنوبی بولی مردہ ہوگئی اور شمالی بولی ترقی کر گئی، سبا اور حمیر کے عربی خطوط کے نمونے سنہ عیسوی کی ابتدا ہی میں پائے جاتے

۱۔ انسائیکلوپیڈیا امریکانا Encyclopaedia Americana ۲۔ [illegible]

۵۔ ایضاً ص ۱۵۱

ہیں، بلکہ حجر، اور صنعا کے شمالی عربی خطوط کا پتہ سنہ مسیح کے بھی قبل سے چلتا ہے، اس کے علاوہ دور
کے بعد زبد کے ۵۱۲ء کے سہ زبانی (سریانی، ایرانی اور عربی) کتبوں اور حران کے ۵۶۸ء کے
دو لسانی (یونانی اور عربی) کتبوں کا پتہ چلا ہے[1]، یہ خطوط عموماً پتھر کی دیواروں اور چٹانوں پر پائے جاتے
ہیں، شمالی عرب کے مسافر جب ان کتبوں کے پاس سے گذرتے تو ان کو غور سے دیکھتے اور
پڑھنے کی کوشش کرتے تھے، ہمدانی نے کتاب الاکلیل میں لکھا ہے کہ لوگ اس زبان سے اچھی طرح
واقف نہیں تھے، پھر بھی کچھ نہ کچھ مطلب سمجھ جاتے تھے، ہمدانی خود اس زبان کے علم ہجا سے ناواقف تھا[2]
سبا اور حمیر کی سلطنت کا زمانہ ۸۰۰ ق م سے ۵۲۵ء تک پھیلا ہوا ہے، اور کتبوں ہی سے
ان کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، یمن کے ایک محقق کارسٹن نائیبور (Carsten Neibhur)
نے جس کی کتاب "صفت عرب" (Beschreibung von Arabien) ۱۷۷۲ء میں شائع ہوئی
تھی، بتایا ہے کہ وہ کتبے جن کو حمیر سے منسوب کیا جاتا تھا، در اصل اس دور کے مشہور شہر ظفار میں
موجود تھے، ۱۸۱۰ء میں اُلرخ یاسپر زیٹین (Ulrich Jasper Seetzen) نے ظفار
میں جو مختلف کتبے دریافت کیے تھے ان کی نقلیں بھی کرائی تھیں، اس نے ایک ایسا کتبہ بھی خریدا تھا
جو اس کی سمجھ سے باہر تھا[3]، جنوبی عرب کے وہ کتبے جو سب سے پہلے یورپ میں لائے گئے، ان سے جنوبی مغربی
عرب کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے، جے، آر، ویلسٹڈ (J. R. Wellsted) نے
حصن غراب اور نقب الحجر کے کتبوں کو اپنی تصنیف "عرب میں سیر و سیاحت" (Travels
in Arabia) میں ۱۸۳۸ء میں شائع کیا تھا، اسی زمانے میں ایمل روڈیگر
(Emil Rodiger) کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ برلن کی Royal
Library[4] میں بھی بہت سے کتبے موجود تھے، انگلستان، جرمنی اور فرانس نے بھی

---

[1] آر۔ اے۔ نکلسن: عربوں کی تاریخ ادب ص ۱۷ تا ۲۲ (دیباچہ) [2] ایضاً ص ۔۔ [3] ایضاً ص ۔۔ [4] یہ کتب خانہ دوسری جنگ عظیم کے وقت ٹوبنگن (جرمنی) میں منتقل ہو گیا تھا۔

کتبوں کی دریافت میں حصہ لیا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں Thomas Arnaud نے مآرب کے کھنڈرات قدیم سبائی دارالسلطنت کے کتبے دریافت کیے تھے، ان میں سے ۵۶ کتبوں کو اس نے نقل بھی کیا تھا جو بعد میں جرنل ایشیاٹک (Journal Asiatique) میں شائع ہوئے۔ Joseph Halevy ایک یہودی فاضل نے ۱۸۶۹ء میں جوف کا جو صنعا کے شمال میں واقع ہے سفر کیا، اور بڑی تحقیق اور مشقت کے بعد سات سو کتبوں کی نقلیں اپنے ساتھ لایا۔ اس کے علاوہ ای گلاسر (E. Glaser) اور جولیس ایوٹنگ (Julius Euting) نے بھی کتبوں کی دریافت کے سلسلہ میں بڑی صعوبتوں کا سامنا کیا ہے۔[1]

ان مختلف کتبوں سے عرب کی قدیم تاریخ کا پتہ چلتا ہے، مثلاً قبیلۂ نباط کے لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے حکومت کرتے تھے، اور شہری اور مدنی زندگی بسر کرتے تھے۔ (Petra) کی سلطنت انہی کی کوشش کا نتیجہ تھی، مگر تحریر کے لیے ارامی (Aramaic) خط استعمال کرتے تھے۔ بہت سے کتبوں سے لحیان کے بادشاہوں کی حکومت کا پتہ چلتا ہے، ۳۲۸ء کا ایک کتبہ امرؤ القیس کی حکومت کے بارے میں اہم معلومات بہم پہنچاتا ہے، اس کی حکومت اندرونِ نزار تک پھیلی ہوئی تھی۔[2]

ان کتبوں کے غائر مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حمیری خطوط کے ساتھ ساتھ عربی خط تحریر بھی دورِ جاہلیت ہی میں رواج پا چکا تھا۔ جوزف ہیل نے اپنی جرمن کتاب تمدنِ عرب میں لکھا ہے کہ دورِ جاہلیت میں عربی شاعری کے ساتھ عربی خطوط کی بھی کافی ترقی و اشاعت ہوئی تھی۔[3]

عربی تحریر کا رواج صرف عرب ہی میں نہ تھا، بلکہ اس سے قبل دوسرے مقامات میں بھی

---

[1] [illegible] کے حوالہ تاریخ عرب ص ۵۰-۵۱ [2] جوزف ہیل: تمدن عرب (The Arab civilization) ترجمہ صلاح الدین خدا بخش خاں ص ۸-۹

[3] ایضاً ص ۱۵-۱۶

اس کا رواج ہو چلا تھا۔ بعثت نبوی سے پہلے حیرہ میں عسانی کافی تعداد میں سکونت پذیر تھے جو عباد
یعنی بندگان خدا کہلاتے تھے، ان کا ادبی ذوق بہت ہی ستھرا اور نکھرا ہوا تھا، انھوں نے عربی تحریر
کی باضابطہ تعلیم پائی تھی، ان کے عربی تحریر کے بہت عمدہ نمونے ملتے ہیں، حیرہ کے شاعروں کے
لکھے ہوئے اشعار خصوصاً عدی بن زید کا کلام تحریری شکل میں موجود تھا، مگر اب اس کے بہت سے
حصے ضائع ہو گئے ہیں[1]، حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر کے پاس مشہور شاعروں کی نظموں کا
ایک مجموعہ تھا، جو اس کی اور اس کے خاندان کے افراد کی مدح پر مشتمل تھا، جب اموی برسر اقتدار آئے
تو یہ مجموعہ ان کے قبضہ میں چلا گیا، جب امرؤ بن ہند (حیرہ کا ایک بادشاہ) ۵۵۴ء میں تخت نشین ہوا
تو طرفہ اور اس کا چچا تلاش معاش میں حیرہ پہنچے، طرفہ بڑا زبان دراز اور تنک مزاج تھا، اس لیے امرؤ بن ہند
کی ہجو لکھی اور اس کی بہن پر عاشق ہو گیا، امرؤ بن ہند ان سے برہم ہو گیا اور دونوں کو ایک ایک
سربمہر مکتوب دے کر حاکم بحرین کے پاس بھیجا، جس میں ان کو قتل کرنے کا حکم تھا، اسی لیے طرفہ قتل کر دیا گیا
زہیر بن ابی سلمیٰ اور اس کے لڑکے کعب بن زہیر کے قصیدوں کی شرح سکری میں ہے کہ
زہیر کے خاندان والوں کے منتخب قصیدے بنو غطفان کے پاس محفوظ تھے، اس کے علاوہ جاہلیت
میں عربی زبان کے دوسرے مخطوطات کا بھی پتہ چلتا ہے، زبیر بن بکار کا بیان ہے کہ اکثیر کی لڑکی
جمعہ کے لڑکے نے کہا کہ اس کے والد کی کتابوں میں ایک ایسی کتاب بھی تھی جس میں اکثیر کے
بہت سے قصیدے بھی تھے[2]، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتابیں یا دور جاہلیت کی تصنیف تھیں یا
ابتدائے اسلام کی، اس لیے کہ اکثیر ۱۰۵ھ میں یزید بن عبد الملک کے عہد میں انتقال کر چکا تھا،

اسلام سے پہلے عرب میں جابجا تجارتی منڈیاں قائم تھیں، جن میں حضرموت کی بحرین اور دوسرے
لوازمات ملتے تھے، عکاظ، ذو المجاز اور مکہ بڑے تجارتی مراکز تھے، یہ علاقے نہ صرف تجارتی

---

[1] آر، اے نکلسن عربوں کی تاریخ ادب ص ۱۴۰ [2] نکلسن: ص ۱۰۵ [3] کتاب الاغانی (مصری اڈیشن) مرتب، احمد شنقیطی ج ۸ ص ۲۹ [4] الفتح ج ۸ ص ۲

منڈیوں کے لیے مشہور تھے، بلکہ ان کی ادبی اور شعری معرکہ آرائیوں کی وجہ سے بھی ان کی شہرت تھی، عکاظ میں بیس روز تک میلہ لگتا تھا، جس میں دور دور کے لوگ شریک ہوتے تھے، میلہ میں بڑی رونق رہتی تھی، جو اس کے ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو جاتی تھی، مکہ میں خانہ کعبہ تھا، اس لیے حج بیت اللہ اور میلہ کی وجہ سے رفتہ رفتہ حجاز اور مکہ میں لوگوں نے بود و باش اختیار کر لی تھی، ان میں اسلام سے پہلے کثیر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے جن میں زیادہ تر مکی تھے،[۱] عکاظ میں سال میں ایک مرتبہ شعری معرکہ بھی ہوتا تھا، ملک کے مختلف مقامات کے شعرا اپنی بہترین نگارشات کے ساتھ اس میں شریک ہوتے، اور مقابلہ میں حصہ لیتے تھے، نابغہ ذبیانی عموماً اس بزم مشاعرہ کا صدر ہوتا تھا، اور جو قصیدے اس میں پڑھے جاتے تھے ان میں سب سے بہتر قصیدہ ہونے کا فیصلہ کرتا تھا، جو قصیدہ سب سے بہتر قرار پاتا اُسکو نہایت نفیس چمڑے پر سنہرے حرفوں میں لکھکر کعبہ کی دیوار پر تشہیر کے لیے آویزاں کیا جاتا، ایسے قصیدے معلقہ کے نام سے موسوم ہیں،

معلقہ، مادہ علق سے ہے جس کے معنی بہت ہی قیمتی شے کے ہیں، اور چونکہ قصیدہ کو ایک قیمتی کپڑے یا چمڑے پر لکھکر معلق کیا جاتا تھا، اس لیے اس کا نام معلقہ پڑ گیا، کسی نظم یا قصیدہ کو بغیر ضبط تحریر میں لائے ہوئے کسی دیوار سے معلق کرنا ناممکن ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معلقات بھی لکھے جاتے تھے، بعض لوگوں کے نزدیک ایسے انعام یافتہ قصیدے "مذہبات" کے نام سے مشہور ہیں، اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایسے قصیدے سونے کے پانی سے لکھے جاتے تھے، مخضرم شاعروں میں کچھ لوگ "اصحاب مذہبات" کے نام سے مشہور ہیں، اصحاب مذہبات ایسے شاعر ہیں جن کے منتخب اشعار سونے کے پانی سے لکھے جاتے تھے، اس مذہبہ کہلاتے تھے،[۲] قیس بن الخطیم کے ایک شعر سے معلقات کی اس توجیہ پر روشنی پڑتی ہے وہ کہتا ہے

"کیا تم ذرا کہن کے خلقات کو جانتے ہو جو چمڑے پر سونے کے پانی سے لکھے ہوئے ہیں"

---

[۱] جرجی زیدان، ترجمہ صلاح الدین خدا بخش خان (The Arab civilization) [illegible]

[۲] سعید انصاری: سیر الصحابہ ج ۱۲، ص ۲۲۲

قیس کے اس شعر سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرات سونے کے پانی سے لکھے جاتے تھے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی خوبصورت تحریروں سے لوگ عام طور پر واقف تھے،

آج کل کی طرح خط و کتابت اور تحریری کاموں میں عرب میں کاغذ کا استعمال نہیں ہوتا تھا، بلکہ عام طور سے چمڑے، پتیاں اور کبھی کبھی چپٹے پتھر کا استعمال کیا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ بعض دوسری چیزیں بھی لکھنے کے کام میں آتی تھیں، جن کا واضح اشارہ شاعروں کے کلام میں ملتا ہے، امرؤ القیس ایک شعر میں کہتا ہے:

لمن طلل ابصرته فشجاني كخط الزبور في العسيب اليماني [1]

آخر وہ کھنڈر کس سے تعلق رکھتا ہے جسے میں نے دیکھا اور جس نے مجھے مغموم کردیا ہے اور جو یمن کے کھجور کی پتیوں پر لکھی ہوئی کتاب کی تحریر کی مانند ہے۔

ایسی متعدد مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خط و کتابت عام طور سے عسیب ہی پر ہوا کرتی تھی، چنانچہ بطلیوسی اپنی شرح میں لکھتا ہے کہ عسیب کھجور کی پتیوں کے ٹکڑے کو کہتے ہیں، مسلمان عہد نبوی میں تحریر کے لیے کھجور کے پتے اور چپٹے پتھر استعمال کرتے تھے،[2] مگر امرؤ القیس کے اشعار میں صرف کھجور کے پتے ہی کا ذکر ملتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں چپٹے پتھر استعمال نہیں ہوتے تھے، یا ان کا عام رواج نہ تھا، زیادہ تر کھجور کے پتوں ہی کا استعمال تھا، چنانچہ یمن کے لوگ انہیں پر اپنے کارنامے اور ان میں جو معاملات ہوتے تھے ان کے معاہدے لکھتے تھے،

حاتم طائی کے بیان کے مطابق وہ اور اس کے احباب تحریر سے واقف تھے، فیاض ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھا، اس نے تحریر اور آلۂ تحریر کا ذکر اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے:

أتعرف اطلالا ونؤيا مهدّما كخطك في رقٍّ كتابا منمنما [3]

---

[1] دیوان امرؤ القیس (بتحقیق حسن السندوبی) ص ۱۴۲ شعر نمبر ۱ [2] دیوان [illegible] (قاہرہ والی) ص ۱۰۰
[3] دیوان (بشرح شولتس Schulthess) ص ۴۲

کیا تم میں کوئی دیوان خندق کو جانتے ہو جو ہماری ایسی تحریر کی طرح ہے جو نئے چمڑے پر لکھی گئی ہو

جزیرۃ العرب میں دستیاب شدہ کتبوں، جاہلی شعراء کے کلام اور دیگر مخطوطات سے اتنا بہرحال ثابت ہے کہ اس دور میں کم از کم خواص میں تحریر کا رواج تھا، یہ صحیح نہیں ہے کہ تحریری ادب کی ابتدا قرآن ہی سے ہوئی، اور عباسی دور میں اس کا باضابطہ رواج ہوا، بلکہ اگناس گولڈ سیر (Ignaz Goldziher) نے یہاں تک لکھا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عربی کی نثری کتابیں بالکل ناپید نہیں تھیں، اور عرب بعض کتابوں سے واقف تھے[1]، اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ قصیدے یا دوسری کتابیں اسلام سے پہلے نہیں بلکہ دور عباسیہ میں ضبط تحریر آئیں تو یہ ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ شاعروں کے کلام میں تو عربی تحریروں کے حوالے موجود ہوں، مگر حقیقتاً اس دور میں ان کا وجود نہ ہو، جو منطقی نقطۂ نظر سے بالکل بعید ہے، قوت متخیلہ الہامی طور پر یا خدا کی طرف سے ودیعت نہیں کی جاتی، بلکہ مشاہدات اور تجربات سے یہ قوت پیدا ہوتی ہے جب انسان کے اندر یہ قوت بدرجۂ اتم موجود ہو تو وہ مختلف اسباب اور اشیاء کے اختلاط سے ایک نیا تصور پیش کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، مگر جب ہم ان حوالجات کا بنظر مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ نہ تو ان کی قوت متخیلہ کا کرشمہ تھا اور نہ الہامی نزول کا نتیجہ، بلکہ یہ محض ایک حقیقت کا اظہار تھا، کرنکو (F. Krenkow) اپنے ایک مقالہ میں لکھتا ہے کہ عرب میں تحریر کا عام طور پر رواج تھا، اور ایک حد تک تحریر کمال پر تھی، اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ قدیم شاعر تحریر کی بنیادی باتوں اور حروف کی ساخت سے نابلد نہیں تھے[2] ذیل میں چند واقعات پیش کیے جاتے ہیں، جس سے اس پر مزید روشنی پڑے گی۔

اسلام سے پہلے قیس ابن کلثوم السکونی، سردار جنوبی عرب، حج کعبہ کے لئے مکہ جا رہا تھا،

---

[1] اسلامی مطالعات (Muhammedanische Studien)

[2] مشرقی مطالعات کی ایک کتاب (Volume of Oriental Studies)

ابتدائے اسلام کا ایک شاعر شماخ کہتا ہے

كما خطّ عبرانيةً بيمينه   بتيماء حبرٌ ثم عرّض أسطرا [1]

ٹھیک اسی طرح جیسے تیماء کا ایک یہودی راہب اپنے داہنے ہاتھ سے عبرانی لکھتا ہو اور پھر ڈگے لکھنے کے لیے خط کھینچتا ہے۔

اس سے بہت پہلے حارث بن حلزہ نے اپنے ایک شعر میں ایک دوسرے قسم کے خط کا ذکر کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے :

یہ الجبس کے مکانات کس کے ہیں، جو ویران ہو گئے ہیں، اگرچہ ان کے صاف نشانات دیوانوں کے لکھے ہوئے کارناموں کی طرح ہیں۔ [2]

ابن ندیم نے لکھا ہے کہ مامون الرشید کے کتب خانہ میں ایک دستاویز تھی جو عبدالمطلب بن ہاشم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، وہ یہ تھی :

حق عبد المطلب بن هاشم من	یہ عبد المطلب بن ہاشم (جو مکہ کا باشندہ ہے) کا قرض
اهل مكة على فلان ابن فلان الحميري	فلاں شخص پر ہے جو صنعا کا رہنے والا ہے یعنی حمیری
من اهل وزل صنعاء عليه الف درهم	کے ہزار درہم ہیں جب طلب کیا جائیگا وہ ادا کریگا
فضة كيلاً بالحديدة ومتى دعاه	خدا اور دو فرشتے اس کے گواہ ہیں [3]

بها اجابه شهد الله والملكان (ابن ندیم مطبع مصر)

ربیعہ بن نصر کی موت کے بعد جب حسان بن تبان یمن کا بادشاہ ہوا، تو عرب و عجم کو فتح کرنے کے خیال سے لشکر لیکر روانہ ہوا، جب بحرین پہنچا تو حمیر اور دوسرے قبائل کے لوگوں نے آگے جانے سے انکار کیا، اور حسان کے بھائی عمرو سے کہا کہ وہ حسان کو قتل کر دے، تو وہ ان کو بادشاہ بنا دیں گے، عمرو اس کے لیے تیار ہو گیا، ذو رعین نے اس کو اس فعل سے منع کیا، مگر وہ نہ مانا، ذو رعین نے

---

[1] دیوان شماخ (قاہرہ) ص ۲۲ شعر ۱۰ [2] مفضلیات [3] شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، ج ۱ ص ۱۱

مندرجۂ ذیل دو اشعار لکھے:

آلا من یشتری سھراً بنوم سعید من یبیت قریر عین

فلما حمیر غدرت وخانت فمعذرۃ الالہ لذی رعین

اور اس نے ان کو ایک رقعہ میں لکھکر مہر کر دیا اور اسے عمرو کے پاس امانۃً رکھدیا، یہ ایک ایسی تحریری امانت تھی جس سے وہ آخرکار اپنی جان کی امان پا سکا۔[1]

گو خط وکتابت کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ عرب میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں تھا، اور کتابوں کی تصنیف کا آغاز خلیفہ منصور عباسی کے زمانے سے تقریباً ۱۴۳ھ سے ہوا، لیکن قدیم روایتوں کے مطابق خط کی ایجاد اس سے بہت پہلے ہو چکی تھی، ابن ندیم نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ عربی خط کے موجدوں کے نام ابو جاد، ہواز، حطی، کلمون، سعفص اور قریشات تھے، مگر کعب کے قول کے مطابق عربی خط کی ایجاد حضرت آدمؑ نے کی تھی، بلاذری فتوح البلدان میں لکھتے ہیں کہ قبیلہ طے کے تین اشخاص مرار بن مرۃ[2]، اسلم بن سدرہ اور عامر بن جدرہ ایک مرتبہ مکہ میں اکٹھا ہوئے اور غور و فکر کے بعد خط عربی ایجاد کیا اور سریانی حروف سے عربی حروف کا مقابلہ کیا، حیرہ کے باشندوں نے عربی تحریر انبار کے لوگوں سے سیکھی، دومۃ الجندل کا حاکم بشر بن عبدالملک ایک مرتبہ حیرہ آیا اور یہاں کے باشندوں سے عربی تحریر سیکھی، یہاں سے مکہ گیا، یہاں سفیان بن امیہ اور ابو قیس بن عبد مناف نے اس کو عربی لکھتے ہوئے دیکھا تو اس کے سیکھنے کی خواہش ظاہر کی، بشر نے انھیں لکھنے کے طریقے بتائے، اس کے بعد بشر، سفیان اور قیس تینوں تجارتی سلسلے میں طائف گئے، یہاں غیلان نے ان سے عربی تحریر سیکھی، بشر طائف سے مصر گیا اور یہاں اس نے عمرو بن زرارہ کو عربی تحریر کی تعلیم دی، جو عمرو المنشی کے نام سے

---

[1] السیرۃ النبویہ لابن ہشام الحمیری (بتحقیق مصطفی السقا وغیرہ) ج ۱ ص ۲۰-۲۹۔ [2] امیر علی نے اپنی کتاب مسلمانوں کی ایک مختصر تاریخ (A short history of Saracens) ص ۶۹ میں عربی خط کی ایجاد حیرہ کے قریب انبار کے رہنے والے، مرار بن مرہ سے منسوب کی ہے۔

مشہور ہوا، اس کے بعد شام کے لوگوں نے بھی بشر سے لکھنا پڑھنا سیکھا۔[1]

اسلام سے کچھ پہلے اوس و خزرج کے چند آدمی اور یہودی لکھنا جانتے تھے اور لڑکے ان سے فن تحریر کی تحصیل کیا کرتے تھے، بعثت نبوی کے بعد لوگوں میں عربی تحریر عام ہو گئی۔[2]

بہر حال عربی تحریر کا موجد کوئی بھی ہو مگر یہ مسلم ہے کہ عربی اسلام سے پہلے لکھی جاتی تھی اور اسلام کے بعد بتدریج اس کی ترقی ہوتی رہی، قبل اسلام کا عربی کا تحریری سرمایہ شعروں اور سیاسی و تجارتی معاہدوں پر مشتمل تھا، اسلام کے ظہور کے بعد جب ہر چیز تیزی سے بدلنے لگی اور اسلامی عقائد و اصول کی اشاعت ہونے لگی تو اسلامی ادب عربی تحریر کا موضوع بن گیا، اس دور کے تحریری ادب میں قرآن، حدیث، سیرت اور مغازی خاص اصناف ہیں، اور اس دور کی تحریری ترقی کے اندازہ کے لیے ان پر سرسری روشنی ڈالی جائے گی۔

بعثت نبوی کے بعد قرآن شریف سب سے بڑا تحریری سرمایہ ہے۔ چالیس سال کی عمر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے لگی تھی، آپ اُمّی تھے، وحی الٰہی کو خود تحریر نہیں لا سکتے تھے، اس لیے کتابت وحی کے لیے آپ نے مختلف صحابہ کو مقرر کیا، پہلے زید بن ثابت وحی لکھتے تھے، پھر ابی بن کعب مقرر ہوئے، حضرت معاویہ نے بھی یہ خدمت انجام دی،[3] سب کاتب برابر وحی کی کتابت کرتے تھے، اس لیے ہر کاتب کے پاس قرآن مجید کا نسخہ تیار ہوتا رہا، آگے چل کر ان اصل نسخوں سے متعدد دوسرے نسخے تیار کیے گئے، جن سے دور دراز کے مسلمانوں میں تعلیم قرآن کی اشاعت ہوئی۔

کاتبان وحی میں زید بن ثابت، ابی بن کعب، معاویہ بن ابی سفیان اور عبداللہ بن مسعود زیادہ مشہور ہیں، لیکن مختلف روایتوں کے مطابق کاتبان وحی کی فہرست بہت طویل ہے، ان میں

---

[1] یحییٰ بن یحییٰ البغدادی، فتوح البلدان ص ۴۷۱۔ [2] ایضاً ص ۴۷۳ [3] فتوح البلدان

بیالیس (۴۲) کاتبوں کے نام ملتے ہیں، محدث ابن سید الناس کے بیان کے مطابق اڑتیس (۳۸) کاتب وحی تھے[1]

عہد نبوی میں کتابت وحی باضابطہ فن بن گئی تھی، وحی کے نزول کے فوراً بعد آپ کسی کاتب کو بلا کر اس کو لکھوا دیتے تھے[2]، بعض شواہد ایسے موجود ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم متعدد کاتبوں کو فرداً فرداً وحی لکھوا دیتے تھے[3]، اس طرح ان سب کے پاس قرآن مجید کا ایک ذاتی نسخہ تیار ہو گیا تھا، ان میں سے بعض نسخوں کا ذکر حدیث اور اسماء الرجال وغیرہ کی کتابوں سے ملتا ہے، صحیح بخاری و مسلم کی روایات کے مطابق حضرت معاذ بن جبل، زید بن ثابت، ابی بن کعب اور ابو زید کے پاس قرآن شریف کے نسخے تھے[4]، ان کے علاوہ ایک نسخہ سعد بن عبید[5] اور ایک عقبہ بن عامر الجہنی[6] کے پاس بھی تھا، ابن الندیم کے بیان کے مطابق ایک نسخہ حضرت حفصہؓ کے پاس تھا جس کو حضرت زید بن ثابت کی ادارت میں مختلف نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد مرتب کیا گیا تھا[7]، ان کے علاوہ ابن سعد کے بیان کے مطابق حضرت ابو الدرداءؓ، عثمان بن عفانؓ، تمیم داری، عبادہ بن الصامت، ابو ایوب انصاریؓ، علی ابن ابی طالبؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ نے بھی کتابت وحی کی خدمت انجام دی تھی، اس لیے ان لوگوں کے پاس بھی قرآن شریف کے نسخے تھے[8]، ابن الندیم کے بیان کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بھی قرآن کا وہ نسخہ تھا جس کو زید بن ثابتؓ نے جنگ یمامہ کے بعد مرتب کیا تھا[9]

جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ کاتبان وحی کی تعداد بیالیس (۴۲) تک تھی، اس لیے قیاس ہے کہ ہر کاتب کے پاس ایک ایک نسخہ ضرور رہا ہوگا، اس طرح عہد نبی میں بیالیس (۴۲) نسخوں کا اندازہ ہوتا ہے اس کے علاوہ قرآن مجید کی تعلیم کی توسیع و اشاعت کے لیے اس کی نقلیں مختلف مقامات میں بھیجی

---

[1] عیون الاثر ج ۲ ص ۳۱۵-۳۱۶ [2] جامع الترمذی ج ۲ ص ۱۳۴ [3] صحیح بخاری (طبع مصر) ج ۳ ص ۶۷، دارمی ص ۹۸
[4] ایضاً ص ۲۲، ج ۶ و صحیح مسلم (طبع مصر) ج ۲ ص ۲۰۲ [5] استیعاب ج ۲ ص ۵۵۵ [6] تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۲۴۳
[7] الفہرست (طبع جرمنی) (G. Flugel) ص ۲۲ [8] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۱۲ [9] الفہرست ص ۲۴

جاتی تھیں، موطا امام مالک اور سنن ابی داؤد کی بعض روایتوں سے قیاس ہوتا ہے کہ قرآن کے بکثرت نسخے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں موجود تھے، عورتیں بھی لکھنا جانتی تھیں، ان میں ام کلثومؓ، حضرت عائشہؓ، کریمہ اور شفاء بنتؓ عبد اللہ مشہور ہیں،

مندرجہ بالا شواہد سے یہ صاف ظاہر ہے کہ عہد نبوی میں تحریر کا رواج عام تھا، اس کا ثبوت کلام مجید سے بھی ملتا ہے، مثلاً کلام مجید میں حکم ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم	اے ایمان والو جب تم ایک خاص مدت تک کے لیے
بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ	دو آدمیوں کے درمیان لین دین کا معاملہ کرو
(بقرہ - ۲۸۲)	تو اسے لکھ لیا کرو

یہ اس کا ثبوت ہے کہ اس وقت عرب میں لکھنے پڑھنے کا دستور تھا،

طبقات ابن سعد میں ہے کہ غزوۂ بدر میں قریش کے بہت سے لوگ گرفتار ہو گئے تھے، جو اہل ثروت تھے وہ تو فدیہ ادا کر کے رہا ہو گئے، مگر جو لوگ نادار تھے اور فدیہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، ان سے کہا گیا کہ ان میں سے ہر ایک شخص دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے[1]،

صحیح مسلم اور فتوح البلدان میں ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تو لوگوں نے بتایا کہ وہ لوگ کسی مکتوب کو اس وقت تک نہیں پڑھتے جب تک اس پر مہر لگی ہو، چنانچہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کی ایک انگوٹھی بنوائی[2]،

جس طرح وحی کی کتابت اور اس کی تدوین عہد نبوی میں انجام پائی اسی طرح صحابہ کرام نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں اور آپ کے افعال و اقوال کو بڑے ذوق و شوق اور محنت سے جمع کیا، چنانچہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں بعض صحابہ

---

[1] طبقات ابن سعد، جزو دوم، ص ۱۴، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۰۰ [2] صحیح مسلم ج ۲ ص ۵۰؛ فتوح البلدان

آپ کی اجازت سے آپ کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے، صحیح بخاری باب العلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں یاد نہیں، صرف عبداللہ بن عمروؓ مستثنیٰ ہیں، کیونکہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا، ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ جو کچھ سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے،[1] خطیب بغدادی نے تقیید العلم میں اور ابن الاثیر نے اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ اس بیاض کا نام جس میں عبداللہ بن عمروؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں قلمبند کرتے تھے، 'صادقہ' تھا، اس میں انھوں نے ایک ہزار حدیثیں جمع کی تھیں،[2]

ایک مرتبہ آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت اسلام لا چکے ہیں ان کے ناموں کی فہرست تیار کیجائے، چنانچہ پندرہ سو صحابہ کے نام رجسٹر میں درج کیے گئے،[3] تقیید العلم میں ایک دوسری روایت ہے کہ جب حضرت انسؓ کے پاس حدیثوں کے سننے کے لیے زیادہ لوگ جمع ہو جاتے تو وہ ایک جنگ نکال لاتے اور کہتے تھے کہ یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنکر لکھ لی تھیں،

اسماء الرجال کی کتابوں میں ایسے بہت سے صحابہ کا ذکر آتا ہے جو اپنے پیغمبر کے ارشادات قلمبند کر لیا کرتے تھے، سنن ترمذی کی روایت ہے کہ ایک انصاری کا حافظہ بہت کمزور تھا، انھوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا، آپ نے فرمایا کہ وہ حدیثوں کو لکھ لیا کریں،[4] اسی طرح ابو رافع نے بھی حدیثوں کو قلمبند کرنے کی اجازت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی،

فتح مکہ کے سال ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کر دیا، اس واقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخصوص خطبہ دیا، یمن کے ایک شخص ابو شاہ نے یہ خطبہ سنکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ خطبہ اس کے لیے لکھوا دیا جائے، چنانچہ اس کو لکھ کر دیا گیا،[5] بہت سے صحابہ کرام

---

[1] طبقات ابن سعد، ج ۲ حصہ ۲ ص ۹ [2] اسد الغابہ ج ۳ ص ۲۳۳-۲۳۵، سیرۃ النبی ج ۱ ول [3] سیرۃ النبی ج ۱ ص [4] جامع الترمذی ج ۲ ص ۹ [5] بخاری، جامع الصحیح کتاب العلم، باب کتابت، فتح الباری ۱۵۵

بعض بعض حدیثوں کو لکھ لیا کرتے تھے بعض نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں اور آپ کے ارشادات کو کتابی شکل میں جمع کیا تھا، عہد نبوی میں حدیث کے جو مجموعے مرتب کیے گئے وہ صحیفہ کہلاتے تھے، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی نے اپنی کتاب "ادب حدیث" (Hadith Literature) میں اور گولڈ سیہر نے اپنی کتاب اسلامی مطالعات (محمڈانیشے اسٹوڈین) میں مختلف صحابۂ کرام کے صحیفوں کا ذکر کیا ہے، جو ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے ایک صحیفہ مرتب کیا تھا جو ان کے شاگرد ہمام بن منبہ کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے، ہمام بن منبہ کے اس صحیفہ کو ڈاکٹر حمید اللہ نے تحقیق و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا ہے، حضرت علیؓ کے پاس ایک صحیفہ تھا، جو فقہ کے مسائل پر مشتمل تھا[1]، سمرہ بن جندبؓ نے ایک صحیفہ مرتب کیا تھا، اور ان کے صاحبزادے نے بھی حدیثوں پر مشتمل ایک رسالہ لکھا تھا[2]، جابر بن عبد اللہؓ کے صحیفہ سے بعد میں قتادہ نے حدیثیں روایت کی ہیں[3]، حضرت سعدؓ نے بھی ایک مجموعہ مرتب کیا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت سے متعلق حدیثیں ہیں[4]، عبد اللہ بن اوفیؓ کے پاس ایک کتاب تھی جس کی ایک حدیث کا ذکر بخاری نے اپنے صحیح میں کیا ہے[5]، حضرت ابو بکر صدیقؓ نے پانچ سو احادیث جمع کی تھیں، جن کو بعد میں تلف کر دیا[6]، حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے ابو رافع نے جو حدیثیں سنی تھیں ان کو ایک کتاب کی صورت میں لکھ لیا تھا[7]، قیاس ہے کہ عبد اللہ بن عباسؓ نے کئی کتابیں لکھی تھیں، ترمذی نے کتاب العلل میں روایت کی ہے کہ ایک شخص طائف سے عبد اللہ بن عباسؓ کی ایک کتاب لایا، اور وہ کتاب ان کو پڑھکر سنائی[8]، ابن عبد البر کی روایت کے مطابق حضرت ابن عباسؓ نے اپنے بعد ایک بار شتر کے بقدر اپنی مرتب کتابیں چھوڑیں جن سے ان کے لڑکے علی نے استفادہ کیا[9]۔

---

[1] جامع الصحیح کتاب العلم، باب الکتابت، ج ۱ ص ۲۱ [2] جامع الترمذی (البیین مع الشاہ) ج ۱ ص ۱۰۲ [3] گولڈ سیہر Muhammadanische Studien ج ۲ ص ۱۰ [4] ایضاً ج ۲ ص ۱۰ [5] ایضاً ج ۲ ص ۱۰ [6] تذکرۃ الحفاظ (حیدرآباد) ج ۱ ص ۵ [7] طبقات ابن سعد ج ۲ حصہ ۲ ص ۱۲۳ [8] جامع الترمذی ص ۲۲۲ [9] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۲۱۶

ان صحیفوں کے علاوہ اور بہت صحیفے ضائع ہو گئے ہوں گے جن کے بارے میں ہم کو کوئی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی، بہرحال جن صحیفوں کا یہاں ذکر ہوا ہے، تنہا وہی عہد نبوی میں تحریری ترقی کے ثبوت کے لیے کافی ہیں،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے عہد میں جو خطوط اور ہدایت نامے جاری کیے ہیں وہ عربی ادب میں بہت اہم ہیں، ان سے اس دور کے عربی ادب اور عربی تحریر کی تاریخ دونوں پر روشنی پڑتی ہے، انھوں نے پینتالیسؓ غیر معمولی سرکاری خطوط لکھے تھے، جو حالات پر تبصرے، حاکموں اور سپاہ سالاروں کو مفید مشوروں اور خدا کے احکام و رسولؐ کے ارشادات پر مشتمل ہیں[1]،

حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے اپنے عہد خلافت میں مختلف اہم تحریری احکام اور ہدایتیں جاری کی تھیں، حضرت عمرؓ نے حدیثوں کی تعلیم و اشاعت کی بھی نہایت اہم خدمات انجام دی ہیں، ان سب سے عربی ادب کے تحریری سرمایہ میں اضافہ ہوا،

اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں تحریر و کتابت کا عام رواج تھا، اور لکھنے پڑھنے کی باضابطہ تعلیم کے ساتھ تدوین و تالیف کا بھی آغاز ہو گیا تھا، لیکن تالیف و تصنیف کا سلسلہ صحیح معنوں میں بنی امیہ کے دور میں شروع ہوا، اور عباسی دور میں اپنے عروج کو پہنچا، جب امیہ برسر اقتدار آئے تو انھوں نے اس اہم ضرورت کو محسوس کیا، اور علماء و فضلاء کو تصنیف و تالیف پر آمادہ کیا، اس سے پہلے وہ اس کو فعل عبث سمجھتے تھے[2]،

حضرت امیر معاویہؓ کے عہد میں عبید بن شریہ پہلے مورخ ہیں جنھوں نے قدماء کی مفصل تاریخ مرتب کی اور اس کا نام اخبار الماضیین رکھا، عبد الملک بن مروان ۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، وہ بڑا علم دوست تھا، اس نے علماء سے ہر فن میں کتابیں لکھوائیں، حضرت سعید بن جبیرؓ کو تفسیر لکھنے کا حکم دیا، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ

---

[1] مجلہ برہان، دہلی کے جنوری ۱۹۴۸ء سے فروری ۱۹۴۸ء تک جناب فاروق صاحب نے "ابو بکرؓ کے سرکاری خطوط" کے عنوان سے مسلسل مضمون لکھا ہے جو خطوط کی نقلوں کے ساتھ تشریحی تفصیل بھی ہے۔ [2] کنا نکرہ کتاب العلم حتی اکرہنا علیہ ھؤلاء الامراء (ہم لوگ علم کا قلمبند کرنا پسند نہیں کرتے تھے مگر امراء نے ہم کو اس پر مجبور کیا)

نے اسلامی ممالک میں حکم بھیجا کہ احادیث نبوی مدون اور قلمبند کی جائیں، چنانچہ اسعد بن ابراہیم نے حدیثوں کے بڑے بڑے دفتر جمع کیے اور اس کے بہت سے نسخے تیار کرکے تمام اسلامی ملکوں میں بھیجے گئے، ابوبکر ابن عمرو بن حزم الانصاری نے جو بلند پایہ محدث اور امام زہری کے استاذ تھے، حدیثوں کو قلمبند کیا، مختلف مسائل میں حضرت عائشہؓ کی حدیثیں بہت مستند سمجھی جاتی تھیں، اس لیے عمر بن عبدالعزیز نے عمرہ بنت عبدالرحمٰن سے جو حضرت عائشہؓ کی تربیت یافتہ اور بڑی محدثہ تھیں، ان حدیثوں کو مرتب کرایا۔

فن مغازی پر بہت سی تالیفات لکھی گئیں، امام زہری نے جو اس فن کے امام تھے، ایک مستقل کتاب لکھی، ان کے تلامذہ میں یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح تمار، عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز، موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق نے اس فن میں خاص شہرت حاصل کی، ان میں موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق استاد ہی کی طرح فن مغازی کے امام سمجھے جاتے تھے، اور ان کی کتابیں بہت معتبر اور مستند سمجھی جاتی ہیں،

عروہ بن زبیر حضرت زبیرؓ کے بیٹے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نواسے تھے، صاحب کشف الظنون کا بیان ہے کہ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ فن مغازی میں سب سے پہلی کتاب ان ہی نے لکھی تھی، امام شعبی بھی بڑے پایہ کے محدث تھے۔ ان کے علاوہ اموی دور میں وہب بن منبہ، عاصم بن عمر بن قتادہ الانصاری، محمد بن مسلم بن شہاب الزہری، یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس بن شریق الثقفی اور ہشام بن عروہ بن زبیر فن سیرت کی تدوین و تالیف میں مشہور ہیں۔[1]

ابو قلابہ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ مکحول نے تحصیل علم کے لیے مصر و شام اور مدینہ کے سفر کیے اور سنن پر ایک کتاب لکھی۔[2] ان کے علاوہ بہت سے علماء و محدثین اور مصنفین نے اسلامی ملکوں میں علم کی روشنی پھیلائی، عبدالملک بن عبدالعزیز بن جریج مکہ میں، سعد بن عروبہ دمشق اور کوفہ میں، اوزاعی شام میں، محمد بن عبدالرحمٰن مدینہ میں، زائدہ بن قدامہ اور سفیان الثوری کوفہ میں اور حماد بن سلامہ

---

[1] شبلی نعمانی، سیرۃ النبیؐ ج ۱، ص ۱۰-۱۹ [2] الفہرست ص ۲۲۵-۲۲۶

بصرہ میں علوم و فنون کی شمعوں سے دنیائے اسلام کو بقعۂ نور بنا رہے تھے،[1]

نثری تصنیف کے علاوہ اس زمانہ میں شعر کی تدوین کو بھی ترقی ہوئی، اور وہ سینوں سے سفینوں میں منتقل ہو گیا، اخطل اس دور کا مشہور شاعر تھا، اس کا مجموعۂ کلام اسی زمانہ میں مدون ہو گیا تھا، ایک مشہور شاعرہ لیلیٰ الاخیلیہ اور قبیلۂ جعدہ کے ایک شاعر نابغہ میں شاعرانہ چشمک تھی، لیلیٰ نے نابغہ کے قبیلہ کی ہجو کی، اس پر قبیلہ کے لوگ برہم ہو گئے، اور خلیفۂ وقت (غالباً خلیفہ سے مراد حضرت عمرؓ ہیں) سے شکایت کی، لیلیٰ کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے یہ اشعار کہے :

اتانی من الانباء ان عشیرۃ بشور ان یزجون المطی المذللا

یروح ویغدو وفدھم بصحیفۃ لیستجلدوا لی ساء ذالک معلا[2]

مجھے خبر ملی ہے کہ شوران کے قبیلہ کے لوگ اپنے اونٹوں پر سوار ہو کر جا رہے ہیں اور صبح و شام کی منزلیں کرتے جاتے ہیں، ان کے پاس ایک نوشتہ بیاض ہے جس سے وہ مجھے سزا دلوانا چاہتے ہیں، یہ کتنا خراب کام ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ قبیلہ جعدہ کے لوگ اپنے ساتھ وہ تمام معترضہ قصیدے جو کتاب الاغانی میں مذکور ہیں تحریری صورت میں لے گئے تھے .

ایک مرتبہ بحتری نے ایک قصیدہ لکھ کر ایک بزم ادب میں پڑھا، شاعر عقیلہ بن ہبیرۃ الاسدی[3] نے جو امیر معاویہؓ کے زمانہ تک زندہ تھا، خلیفہ کو اپنے اشعار لکھ کر دیے، شاعر ذوالرمہ نے ایک مجلس میں اپنی ایک نظم پڑھی . اور سامعین سے کہا کہ وہ اس نظم کو لکھ لیں، کیونکہ "ایک کتاب یا لکھی ہوئی تحریر کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ایسے الفاظ اور محاورے جن کو نظم کرنے میں ایک مدت لگی ہے، بدلے جا سکتے ہیں،[4]

---

[1] الفہرست ص ۲۲۵ - ۲۲۶ [2] کتاب الاغانی ج ۴ ص ۱۳۳ [3] خزانہ ج ۱ ص ۳۴۳
[4] نقائض ص ۲۰۰ شعر ۱۸

اخطل کے پاس لبید کا دیوان موجود تھا۔[1] اخطل کمہار تھا، اور مٹی کے برتن بنانے کے دوران اپنے اشعار ان برتنوں پر نقش کرتا جاتا تھا، اور جب کوئی اس سے اس کے اشعار مانگتا تو وہ ٹھیکروں پر لکھ کر دیدیا کرتا تھا،

بحتری نے خلیفہ معتز کی مدح میں چند اشعار لکھے تھے،[2] مگر معتز اس وقت قید میں تھا، اس نے وہ رقعہ لے لیا جس میں اشعار لکھے ہوئے تھے، اور رہائی کے بعد چھ اشعار کے بدلے بحتری کو چھ ہزار دینار عطا کیے۔[3]

ان واقعات سے اموی دور میں نظم و نثر کی کتابت پر روشنی پڑتی ہے، ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایات کے خزانے اس کے کتب خانہ سے منتقل ہوئے تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں،[4] اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں دوسرے مؤلفین اور مصنفین کی تالیفات اور شعری مجموعوں کا کتنا بڑا ذخیرہ رہا ہوگا۔

---

[1] نقائض ص ۷۰۰ شعر ۱۰ [2] یہ اشعار دراصل محمد بن یوسف الثغری کے لیے بحتری نے کہے تھے، الثغری بھی اس وقت مقید تھا، مگر بعد میں یہ شعر معتز سے منسوب کر دیے گئے [3] کتاب الاغانی ج ۵ ص ۱۸۹-۱۹۰

[4] طبقات ابن سعد ج ۲ حصہ ۲ ص ۱۳۶، سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۴

دینور اور مشائخ دینور

از جناب سید شمیم احمد صاحب، ڈھاکہ

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی کے بعد صوفیائے کرام کا جو طبقہ ظہور میں آیا اُن میں خواجہ ممشاد علو دینوری کا نام بڑا محترم ہے، وہ اپنے وقت کے مشائخ کبار میں تھے، اور عرفان و معرفت کی تمام منزلیں طے کر چکے تھے، سید الطائفہ کے خلفاء میں خواجہ ابو محمد رویم، حضرت امام شبلی، خواجہ ابو علی رودباری اور خواجہ ممشاد دینوری کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی، تمام تذکروں میں حضرت ممشاد کا نام نہایت عقیدت و احترام سے لیا گیا ہے، حضرت فرید الدین عطار فرماتے ہیں کہ

"آں ستودۂ رجال آں، بودۂ جلال صاحب دولت زمانہ آں عالی ہمت یگانہ آں مجرد شدہ از کینہ وری شیخ وقت ممشاد دینوری رحمۃ اللہ پیر عہد بود و یگانۂ روزگار و برگزیدہ بہمہ کمال و خصال[1] ......"

نویں صدی ہجری کے اوائل میں سلسلۂ فردوسیہ کے بزرگوں کا ایک تذکرہ "مناقب الاصفیاء"[2] لکھا گیا ہے، اس میں حضرت ممشاد علو دینوری کو سید الطائفہ کا خلیفہ بتایا گیا ہے، خواجہ عطار کی طرح

---

[1] تذکرۃ الاولیاء (مطبع محمدی بمبئی) ص ۲۰۹ [2] یہ کتاب نویں صدی ہجری کے پہلے نصف اول میں بہار کے کسی بزرگ نے لکھی تھی، یوں وہ مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری کے چچازاد بھائی مخدوم شاہ شعیب سے منسوب ہے لیکن یہ غلط ہے، اس سلسلہ میں راقم الحروف کا ایک مضمون معارف کے شمارہ مارچ ۱۹۶۵ء میں شائع ہو چکا ہے، یہ فردوسیہ خانوادے کے بزرگوں کی تاریخ ہے، حال ہی میں اس کا اردو ترجمہ بہار شریف ([illegible]) سے شائع ہوا ہے۔

صاحب مناقب الاصفیا نے بھی نہایت ادب و احترام سے حضرت ممشاد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے،
وہ عارف تھے، عرفان کی منزلوں سے گذر چکے تھے، صدق و صفا کے مرحلوں کی سختیاں جھیل چکے تھے،
میدان طریقت کے سیاح تھے، بحر حقیقت کے غواص، عارفوں میں محترم و مکرم اور احسان والوں میں
محتشم، عشق و محبت کی دیوانگی میں پیش رو، علم و عرفان میں عظیم الشان، میدان مجاہدہ کے شہسوار،
مقامات مشاہدہ کے سربراہ، سقطی و ثوری کے مسلک پر گامزن تھے[1]۔ تذکرۃ الاولیاء اور
مناقب الاصفیا میں آپ کا ذکر کافی تفصیل کے ساتھ ہے، نفحات الانس مولانا عبدالرحمٰن جامی
اور سفینۃ الاولیاء دارا شکوہ میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، مگر احترام و ادب میں فرق نہیں ہے،
حضرت ممشاد کا نام کئی خانوادوں میں آتا ہے، سہروردیہ اور فردوسیہ میں خواجہ جنید بغدادی
کے توسط سے چشتیہ میں خواجہ ہبیرہ بصری کے ذریعہ آپ کو خلافت پہنچی، سہروردیہ اور فردوسیہ
سلسلہ خواجہ ممشاد کے بعد تین واسطوں یعنی خواجہ احمد اسود دینوری، خواجہ ابو محمد عمویہ اور خواجہ
ابو النجیب ابو القاہر سہروردی تک ایک ہے، اس کے بعد شیخ الشیوخ خواجہ شہاب الدین
سہروردی سے جو سلسلہ جاری ہوا وہ سہروردیہ کہلایا، اور شیخ نجم الدین کبریٰ سے جاری ہونے والا
خانوادہ نے دو واسطوں کے بعد فردوسیہ کا نام اختیار کیا، خواجہ جنید بغدادی اور خواجہ
ہبیرہ بصری کے علاوہ حضرت ممشاد کا ایک سلسلہ شیخ کبیر خواجہ عبداللہ خفیف سے بھی ہے،
اس سلسلہ کا ذکر شیخ عبدالرحیم بن شیخ بینا چشتی نے اپنی تصنیف سیر الاقطاب[2] میں کیا ہے،
یعنی خواجہ ممشاد کو خواجہ عبداللہ خفیف سے خلافت حاصل تھی، اور انھیں خواجہ ابو محمد رویم جو سید
الطائفہ کے خلیفہ اعظم ہیں، غرض حضرت ممشاد سلاسل طریقت میں بڑی اہم اور ہمہ گیر حیثیت
کے مالک ہیں، مناقب الاصفیا میں ممشاد کا تلفظ "پہلی میم کے زیر اور دوسری میم کے جزم"[3]

[1] مناقب الاصفیاء ص ۱۹۷ (اردو) [2] سیر الاقطاب ص ۵۰ [3] مناقب الاصفیاء (اردو) ص ۱۹۷

ساقط کیا گیا ہے، حضرت فرید الدین عطار نے وصال کا سال ۲۹۹ھ لکھا ہے، مناقب الاصفیا، نفحات الانس اور سفینۃ الاولیا نے اس سے اتفاق کیا ہے،

حضرت ممشاد علم ظاہر و باطن دونوں سے آراستہ تھے، بڑی محنت و ریاضت سے کمال حاصل کیا تھا، بغداد کے تمام مشائخ آپ کی اقتدا کرتے تھے، توحید اور عشق الٰہی میں غرق تھے، اس سلسلہ میں آپ کے بہت سے کلمات طیبات ہیں، آپ کے وصال کے وقت ایک مرید نے دعا کی بار الٰہا میرے پیر خواجہ ممشاد کی مغفرت فرما، اور جنت الفردوس میں جگہ دے، آپ نے فوراً آنکھ کھول دی اور غضبناک لہجہ میں فرمایا، کیا خرافات بک رہے ہو، تیس برس سے برابر کہا جا رہا ہے کہ یہ دیکھو بہشت ہے، مگر ہم آنکھ اٹھا کر بھی ادھر نہیں دیکھتے، یہ بھی کوئی دعا میں دعا ہے، مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری اس واقعہ کا ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ "اللہ اکبر کیا شان تھی، حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات حقیقی متقی ہیں، پاک عالم سے آئے اور پاک عالم میں جائیں گے، کون عالم جس کو [illegible] صدق ہے، اس حالت میں بہشت و دوزخ کا ذکر کس شمار میں آسکتا ہے، یہ خاص مقام کی بات ہے"[۲] نزع کی حالت میں کسی نے حضرت ممشاد سے پوچھا، اس وقت دل کا کیا حال ہے، فرمایا تیس سال ہو چکے دل کھو چکا ہے، بہت تلاش کیا نہیں ملا، تمام کائنات اور خود اپنی ہستی ذات واحد کے مطالعہ میں گم کر دی، ایک مرید نے سوال کیا، بیماری سے آپ کا کیا حال ہے، فرمایا، بیماری کے بارے میں مجھ سے نہ پوچھو، خود بیماری سے میرے بارے میں پوچھو

علو دینوری ایک اہم سوال یہ ہے کہ حضرت ممشاد دینوری اور حضرت علو دینوری ایک ہیں، یا دو جداگانہ شخصیتیں ہیں، تذکرہ نگاروں کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف ہے۔

---

[۱] تذکرۃ الاولیا، ص ۵۰۳ (طبع محمدی بمبئی)، نفحات الانس ص ۱۰۳۔ مناقب الاصفیا ص ۳۰، سفینۃ الاولیا ص ۱۳۰

[۲] مکتوبات صدی، مکتوب ۲۷، ۱۵۱

ایک طبقہ دونوں کو دو الگ الگ شخصیتیں مانتا ہے، دوسرا دونوں کو ایک ہی مانتا ہے، شجروں اور تذکروں میں کہیں صرف ممشاد ہے، اور کہیں ممشاد علو دینوری، ایک دلچسپ روایت یہ بھی ہے کہ دونوں دو بزرگ تھے، مگر آپس میں بہت اتحاد و ارتباط تھا، دونوں کا ایک ہی دن انتقال ہوا اور ایک ہی قبر میں دفن بھی کیے گئے، تذکرۃ الاولیاء میں صرف ممشاد دینوری کا ذکر ہے، علو دینوری یا کسی اور دینوری بزرگ کا ذکر نہیں، نفحات الانس میں بھی صرف ممشاد دینوری کے نام سے ایک باب ہے، علو دینوری کا کوئی ذکر نہیں، حالانکہ متعدد دوسرے دینوری مشائخ کے حالات ہیں، مخدوم الملک نے بھی مکتوبات صدی کے ۷۰ ویں مکتوب میں صرف ممشاد دینوری[1] لکھا ہے، مناقب الاصفیاء میں خواجہ ممشاد علو دینوری کے نام سے ایک باب ہے جس میں کہیں صرف ممشاد دینوری لکھا گیا ہے، اور کہیں ممشاد علو دینوری، قیاس ہے کہ پورا نام ممشاد علو دینوری ہوگا، جن لوگوں نے اختصار سے کام لیا انھوں نے صرف ممشاد ہی لکھا، اگر واقعی حضرت ممشاد اور حضرت علو دو ہوتے تو تذکرۃ الاولیاء یا نفحات الانس میں علو دینوری کا بھی ذکر ہوتا، مذکورۂ بالا تذکروں کے برعکس دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیاء میں دو الگ شخصیتیں مانا ہے، حضرت ممشاد کا ذکر سہروردیہ خانوادہ کے شیخ کی حیثیت سے کیا ہے، اور حضرت علو دینوری کو چشتیہ سلسلہ کا بزرگ اور حضرت ہبیرہ بصری کا مرید لکھا ہے، لیکن دونوں کا سال وفات ۲۹۹ھ لکھا ہے، اور اس اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے کہ "تذکرۃ الاصفیاء اور مشائخ چشت کے بعض رشحات میں درج ہے کہ شیخ علی دینوری اور شیخ ممشاد دینوری دونوں ایک ہیں، جن کو لوگ شیخ ممشاد علو دینوری کہتے ہیں، لیکن نفحات الانس اور بعض دوسری کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں کی دو شخصیتیں ہیں، شیخ ممشاد کا ذکر سہروردیہ سلسلہ میں کیا جائے گا۔"[2]

---

[1] مکتوبات صدی (اردو ترجمہ، شاہ نجم الدین بہاری مطبوعہ کراچی) ص ۱۵۱، [2] سفینۃ الاولیاء (فارسی) ص ۱۵۱، اردو کراچی ص ۱۳۳

لیکن دارا شکوہ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ نفحات الانس میں کوئی ایسا بیان نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ مولانا جامی نے حضرت ممشاد اور حضرت علو کو دو شخصیتیں سمجھا ہے۔ نفحات میں صرف ممشاد دینوری کا ذکر ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا جامی دونوں کو ایک ہی شخص سمجھتے تھے، محض اختصار کے لیے پورا نام ممشاد علو کی بجائے صرف ممشاد لکھا ہے، ورنہ جہاں انھوں نے مشائخ دینور کا ذکر کیا ہے حضرت علو کا نام کیوں چھوڑتے۔ خزینۃ الاصفیا میں ممشاد دینوری اور علو دینوری کے نام سے دو الگ الگ باب ہیں، حضرت علو کو حضرت جنید، رویم اور نوری کا معاصر بتایا گیا ہے، اور اس سند کا بھی ذکر کیا ہے جس کو سیر الاقطاب میں خواجہ عبد اللہ خفیف کے توسط سے تحریر کیا ہے۔ صاحب خزینۃ الاصفیا[۱] نے دارا شکوہ کے اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "شاید دارا شکوہ کا قول صحیح ہو، مگر چونکہ انھوں نے دونوں کا سال وفات ۲۹۹ھ لکھا ہے، اس لیے شک ہوتا ہے کہ شاید ممشاد علو دینوری ہی ہیں، جن کا ذکر دونوں خانوادوں میں کیا گیا ہے"۔ مولانا معین الدین اجمیری نے اپنی تالیف نثار خواجہ میں خواجہ عثمان ہارونی کا جو شجرہ درج کیا ہے اس میں ممشاد علو دینوری ہے، مولانا حکیم شاہ شعیب پھلواروی نے اعیان وطن میں بجا ارشاد فرمایا ہے کہ "کبھی یہ بات قابل تسلیم ہو سکتی ہے کہ دو شخص ایک ہی نام کے ایک ہی تاریخ اور ایک ہی سنہ میں انتقال کرے اور اسی دن ایک ہی قبر میں دفن بھی ہوں[۲]"۔ ان بیانات کو سامنے رکھنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت ممشاد علو دینوری ایک شخص ہیں، سلسلہ چشتیہ میں خواجہ ہبیرہ بصری کے توسط اور سہروردیہ و فردوسیہ میں خواجہ جنید بغدادی کے توسط سے ان کا نام آتا ہے، ان دونوں کے علاوہ ان کو خواجہ عبد اللہ خفیف سے بھی خلافت حاصل تھی، لیکن زیادہ شہرت جنیدی نسبت سے ہوئی، جو حضرت جنیدؒ کی عظمت کا نتیجہ ہے۔

---

[۱] خزینۃ الاصفیا ج ۱ ص ۳۰ و ج ۲ ص ۱۷۳۔ [۲] اعیان وطن ص ۱۹۳

دینور کہاں ہے؟ یہ تو طے شدہ ہے کہ دینور کسی جگہ کا نام ہے، تحقیق طلب یہ ہے کہ یہ مقام کہاں ہے،
مناقب الاصفیا، نفحات الانس اور سفینۃ الاولیا میں حضرت ممشاد اور دوسرے مشائخ دینور
کے حالات پڑھنے سے اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ جن بزرگوں کے ناموں کے ساتھ دینوری آتا ہے،
ان کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے دینور سے تھا، خواہ وہ خود وہاں کے باشندے ہوں یا وہ ان کے
آبا و اجداد کا وطن رہا ہو، یا پھر انھوں نے دینور میں سکونت اختیار کر لی ہو، تذکرۃ الاولیا میں
حضرت ممشاد کے علاوہ دینور کے کسی دوسرے شخص کا کوئی ذکر نہیں ہے، حضرت ممشاد کے
ذکر میں بھی دینوری کی وجہ تسمیہ ظاہر نہیں کی گئی ہے، لیکن مناقب الاصفیا میں جہاں لفظ ممشاد
کا تلفظ بیان کیا گیا ہے، یہ بھی وضاحت کر دی گئی ہے کہ دینور ان کے جائے سکونت کا نام ہے[1]
اسی کتاب میں حضرت احمد اسود دینوری کی جائے سکونت بھی دینور بیان کی گئی ہے، نفحات الانس
سے بھی واضح ہوتا ہے کہ دینور کسی جگہ کا نام ہے، اصل بحث یہ ہے کہ دینور کہاں ہے؟ مناقب الاصفیا
کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے بھی اس کی تحقیق کا مسئلہ پیدا ہوا تھا، رسالہ قشیریہ میں جہاں خواجہ احمد
سیاہ دینوری کا تذکرہ ہے، وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کوئی دیہات تھا یا شہر[2]
مولانا ابو صالح محمد یونس بہاری نے مناقب الاصفیا کا جو اردو ترجمہ شائع کیا ہے، اس کے ۱۹۰
کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "نفحات الانس کے صفحہ ۹۳ میں لکھا ہے کہ دینور ایک قریہ ہے اور کرمان
کے علاقہ میں ہے" مجھے ڈھاکہ میں نفحات کے تین اڈیشن جو مطبع لیسی کلکتہ ۱۸۵۸ء، مطبع نولکشور
لکھنو اور مطبع سیدی دہلی سے شائع ہوئے ہیں، دیکھنے کا موقع ملا، مگر صفحہ ۹۳ پر کوئی ایسی وضاحت
نہیں ملی، شاید کوئی اور اڈیشن ہوگا، جس کا ذکر مولانا یونس نے کیا ہے، داراشکوہ نے حضرت
ممشاد کے ذکر میں لکھا ہے کہ دینور قزوین کے قریب جبل کے شہروں میں سے ایک شہر کا نام ہے[3]

---

[1] مناقب الاصفیا، ص ۱۹۰ (اردو) [2] سفینۃ الاولیا، ص ۱۴۱ (اردو نفیس اکیڈمی کراچی)

لیکن یہ غلط ہے، دینور ایران اور عراق میں نہیں بلکہ سیلون میں تھا، ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں جزیرہ سیلان (لنکا) کے حال میں نہایت تفصیل و تشریح کے ساتھ دینور کا ذکر کیا ہے،

ابن بطوطہ کا بیان | ابن بطوطہ کو سلطان محمد تغلق نے صفر ۷۴۳ھ میں سفیر خصوصی کی حیثیت سے چین کے حکمراں کے پاس بھیجا تھا، ابن بطوطہ سیاح تھا، اس لیے براہ راست چین جانے کے بجائے جنوبی ہند کے شہروں کی سیر کرتا ہوا گیا، اور وہاں سے جزائر مالدیپ پہنچا، اور لنکا میں حضرت آدم علیہ السلام کے قدم مبارک کی زیارت کا شوق پیدا ہوا، چنانچہ ۱۵ ربیع الاول ۷۴۵ھ کو مالدیپ کے جزیرہ ملوک سے روانہ ہوا، نویں دن لنکا کی بندرگاہ بطالہ پہنچا، یہاں سے قدم مبارک کی زیارت کے لیے غار سبیک کی طرف روانہ ہوا، اس کی زیارت کے بعد دوسرے راستے سے واپس ہوا، اور مختلف مقامات میں ہوتا ہوا دینور پہنچا، وہاں سے اس کی منزل کولمبو پر ختم ہوئی، دینور کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ "..... وہاں سے چل کر ہم دو دن میں دینور پہنچے، یہ شہر بہت بڑا ہے، اور سمندر کے کنارے ہے، اس میں سوداگر رہتے ہیں، ایک بت جس کا نام دینور ہے، ایک بڑے بت خانہ میں رکھا ہوا ہے، اس میں تین ہزار کے قریب برہمن اور جوگی رہتے ہیں، اور پانچ سو دیوداسیاں ہیں، جو ہر روز بت کے سامنے ناچتی اور گاتی ہیں، اس شہر کا کل محصول بت خانہ کے لیے وقف ہے، اہل بت خانہ اور مسافروں کو وہاں سے روٹی ملتی ہے، بت سونے کا بنا ہوا ہے، اور قد آدم کے برابر ہے، اس کی دونوں آنکھوں کی جگہ دو بڑے یاقوت لگے ہوئے ہیں، کہتے ہیں کہ ان سے رات کے وقت قندیل کی طرح روشنی پیدا ہوتی ہے، پھر ہم شہر قالی میں پہنچے، یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے، دینور سے چھ فرسنگ کے فاصلے پر ہے، اس میں ایک مسلمان ناخدا ابراہیم رہتا ہے، اس نے ہماری ضیافت کی، اس کے بعد ہم کولمبو کی[1]

[1] عجائب الاسفار (اردو ترجمہ خان بہادر مولوی محمد حسین) ج ۲ ص ۲۵۹

جانب چلے ، سراندیپ میں یہ سب سے بڑا شہر ہے اور خوبصورت ہے"۔

اس بیان سے دیبور کی مندرجہ ذیل خصوصیات ظاہر ہوتی ہیں :-

(۱) یہ ایک بڑا شہر تھا (۲) سمندر کے کنارے تھا یعنی اس کی حیثیت بندرگاہ کی تھی ، (۳) تجارتی مرکز بھی تھا ، کیونکہ تاجر رہا کرتے تھے (۴) ، مذہبی مقام بھی تھا (۵) قدم مبارک کے راستے پر تھا ۔ اس شہر کے حالات دوسری کتابوں میں بھی ملتے ہیں ، اس کا قدیم نام دیوان ڈیرہ تھا ، اور اب ڈونڈرا کہتے ہیں لیکن اس کی حیثیت شہر کی نہیں رہ گئی ہے ، فقط ایک راس کا نام ہے ، جو سمندر میں نکلی ہوئی ہے ، اور لنکا کا انتہائے جنوبی کنارہ ہے[1]۔

سر ولیم ٹے ننٹ نے اپنی کتاب سیلان جلد اول صفحہ ۱۱۳ میں لکھا ہے کہ ڈونڈرا میں پہلے ایک بہت بڑا مندر تھا ، بودھوں کے قبل بھی اس جگہ ہندوؤں کا ایک مندر تھا ، پھر بودھ مذہب والوں نے بھی سب سے پہلے یہاں اپنا مندر بنایا ، کوہ آدم کے بعد پورے لنکا میں سب سے مقدس جگہ یہی ہے ، مندر اتنا بڑا تھا کہ ایک شہر معلوم ہوتا تھا ، وہاں جو بت تھا ، اس پر سونے کے پتر چڑھے ہوئے تھے ۔ پرتگالیوں نے ۱۵۸۷ھ میں ڈی سوزا کی قیادت میں حملہ کرکے مندر کو تباہ کر دیا ، اس کے اندر گائے ذبح کرائی اور بے شمار جواہرات ، سونا چاندی اور صندل لوٹ میں ان کے ہاتھ لگا ۔ اب اس مندر کے کھنڈرات نظر آتے ہیں ، دیبور کا پتہ چل جانے کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ یہاں اسلام کی اشاعت کب اور کیسے ہوئی ، اور اس کا سہرا کن لوگوں کے سر ہے ۔

لنکا میں اسلام تجارتی تعلقات اور جہاز رانی کی وجہ سے عرب لنکا سے پوری طرح واقف تھے ، وہاں کے ساحلی علاقوں میں ان کی آمد و رفت رہتی تھی ۔ یہ تعلقات مسلمانوں کے دور میں اور بھی بڑھ گئے ، سندھ پر محمد بن قاسم کے حملہ کا سبب اسی لنکا کا ایک واقعہ ہے ، لنکا میں ایک پہاڑ پر

[1] حاشیہ عجائب الاسفار ج ۲ ص ۲۶۰ ۔

ایک نشان ہے، جو آدمی کے قدم کا نشان معلوم ہوتا ہے، اسے ہندو شیو کے قدم کا نشان کہتے ہیں، بودھ مذہب کے پیرو شاکیہ منی مہاتما گوتم بودھ سے منسوب کرتے ہیں، اور مسلمان اسے حضرت آدم علیہ السلام کے قدم مبارک کا نقش سمجھتے ہیں، اس لیے صدیوں سے چین، ہندوستان اور عرب کے لوگ اس جگہ کی زیارت کے لیے آتے ہیں، مسلمان فقرا اور سیاحوں کی جماعت بھی اسی قدم کی وجہ سے لنکا کے اندرونی علاقوں میں پہنچی، اور اسلام کی اشاعت کے لیے راہ ہموار ہوئی، جس زمانہ میں ابن بطوطہ وہاں پہنچا ہے، اس کو مختلف مقامات میں مسلمان اور اسلامی آثار نظر آئے، اس سے پہلے خواجہ معین الدین اجمیری کے ایک خلیفہ شیخ کریم الدین[۱] نے بھی لنکا جاکر تبلیغ کی تھی، اور ان سے چشتیہ کی ایک شاخ کریمیہ جاری ہوئی تھی، خواجہ عبد اللہ خفیف نے بھی اس جزیرہ میں جاکر تبلیغ کی تھی، حضرت عبد اللہ خفیف کا شمار مشائخ کبار میں ہوتا ہے، آپ خواجہ ابو محمد رویم کے خلیفہ اعظم، خواجہ ابو اسحاق شہریار گازرونی کے مرشد اور طریقت و شریعت کے مسلمہ شیخ و عالم اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، انھوں نے لنکا کا دورہ کب کیا تھا، اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا، آپ کا سنہ وفات ۳۳۱ھ[۲] ہے، اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ تیسری صدی کے تیسرے یا چوتھے ربع میں کسی وقت لنکا میں ورود فرمایا ہوگا، اور ان کے اثر سے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہوگا، ابن بطوطہ آپ کی وفات کے چار ساڑھے چار سو سال بعد لنکا گیا ہے، اتنے دنوں کے بعد بھی اس کو ہر جگہ حضرت عبد اللہ خفیف کے غایت عقیدت مند ملے، وہ لکھتا ہے کہ "اب تک لنکا کے لوگ شیخ عبد اللہ خفیف کی نہایت تعظیم کرتے ہیں، اور ان کو شیخ کبیر کہتے ہیں"[۳] ابن بطوطہ کو کئی مقامات ایسے ملے جہاں شیخ کبیر کے آثار تھے، قدم مبارک کی زیارت سے واپسی کے وقت ایک مقام آت کلنجہ[۴] نام کا ملا، جہاں حضرت عبد اللہ خفیف

---

[۱] مرزا غلام دستگیری پلوری، بیان سلسلہ چشتیہ [۲] عجائب الاسفار ج ۲ ص ۲۴۴ [۳] ایضاً ص ۲۵۸

گرمی کے ایام گذارا کرتے تھے۔ راستہ میں ایک دریا خنزاران ملا[1]، یہاں حضرت خفیف کو دو نایاب قسم کے موتی ملے تھے جنھیں انھوں نے راجہ کو دیا تھا، چند مسافات کے بعد ابن بطوطہ ایسے جنگل میں پہنچا جس میں دریا تھے اور بکثرت ہاتھی رہا کرتے تھے لیکن یہ ہاتھی پردیسیوں اور زائرین کو کچھ تکلیف نہیں دیتے اور یہ سب شیخ عبد اللہ خفیف کی برکت ہے[2]"، ہاتھی کے سلسلہ میں حضرت عبد اللہ خفیف کی یہ کرامت بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایک سفر کے دوران پوری جماعت راستہ بھول گئی اور جنگل میں بھٹکتی رہی، کھانے کا سارا سامان ختم ہو چکا تھا، بھوک سے لوگ خستہ حال ہو رہے تھے، اس لیے انھوں نے ہاتھی کا ایک بچہ پکڑ لیا اور اسے ذبح کرکے کھانا چاہا، حضرت عبد اللہ خفیف نے بہت سمجھایا مگر لوگ نہ مانے، رات کے وقت سب سوئے ہوئے تھے کہ جنگل میں ہاتھیوں کا غول پہنچا اور ان تمام لوگوں کو جنھوں نے ہاتھی کا گوشت کھایا تھا ہلاک کر ڈالا، اور ایک ہاتھی نے حضرت عبد اللہ خفیف کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر شہر کے نزدیک لاکر چھوڑ دیا[3]۔ اس کرامت سے اہل لنکا بہت متاثر ہوئے، قدم مبارک تک جانے کا وہ راستہ جس سے ابن بطوطہ گذرا تھا، اول اول شیخ موصوف نے دریافت کیا تھا، اس سے پہلے وہاں کے لوگ مسلمانوں کو اس راستے سے جانے سے روکتے اور ان کو تکلیف پہنچاتے تھے، نہ ان کے ساتھ کھاتے تھے اور نہ ان کے ہاتھ کچھ بیچتے تھے، جب شیخ خفیف کے ساتھیوں نے ہاتھی کے بچے کو مارا اور اس کا گوشت بجز شیخ نے نہیں کھایا اور رات کو ہاتھیوں نے ان سب کو مار ڈالا اور شیخ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ ایک ہاتھی ان کو اپنی پیٹھ پر سوار کرکے آبادی میں چھوڑ گیا، اس زمانہ سے کافر لوگ مسلمانوں کی تعظیم کرتے ہیں، اپنے گھروں میں انکو ٹھہراتے ہیں،

---

[1] عجائب الاسفار ج ۲ ص ۲۰۳ [2] ایضاً ص ۲۰۳ [3] حضرت عبد اللہ خفیف کی اس کرامت کا ذکر دوسری کتابوں میں بھی ملتا ہے البتہ تفصیلات میں تھوڑا اختلاف ہے، مولانا روم نے اپنی مثنوی کے دفتر سوم کے شروع میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، مگر حضرت خفیف ... نام کی صراحت نہیں ... ہے۔

ان کے ساتھ کھانا کھالیتے ہیں، اور اپنے اہل وعیال کو بھی اطمینان کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، کچھ فکر نہیں کرتے، وہ اب تک شیخ عبداللہ خفیف کی نہایت تعظیم کرتے ہیں اور ان کو شیخ کبیر کہتے ہیں"[1]

واضح رہے کہ ابن بطوطہ ۷۴۲ھ میں لنکا گیا ہے، حضرت عبداللہ خفیف اس سے ۳۷۱ سال قبل وفات فرما چکے تھے، اتنی مدت دراز کے بعد بھی جب یہاں کے لوگ آپ سے اس قدر عقیدت رکھتے تھے تو ان کی زندگی میں ان سے عقیدت کا کیا حال رہا ہوگا، اور ان کی تبلیغی مہم کتنی کامیاب رہی ہوگی، دینور چونکہ قدم مبارک کے راستے پر تھا، مذہبی مرکز تھا، بندرگاہ اور تجارتی شہر تھا، اس لیے یقیناً شیخ کبیر کا وہاں گذر ہوا ہوگا، اور وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہوگا، حضرت ممشاد علو دینوری کو حضرت عبداللہ خفیف سے بھی خلافت حاصل تھی، اس سے یہ صریح نتیجہ نکلتا ہے کہ دینوری مشائخ کا تعلق لنکا ہی سے ہے، خواہ یہ نسبت پیدائشی ہو یا رہائشی یا نسلی۔

ابن بطوطہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "..... پھر ہم ایک جگہ پہنچے جس کو بڑھیا کا گھر کہتے ہیں، اس کے آگے آبادی نہیں ہے، اس کے آگے بابا طاہر کا غار آتا ہے، جو ایک ولی تھے"[2] سفینۃ الاولیا میں شیخ ابوبکر بن طاہر دینوری کا ذکر ہے، ممکن ہے یہ غار ان ہی سے منسوب ہو۔

دینور کے دوسرے مشائخ | حضرت ممشاد کے بعد مشائخ دینور میں سب سے[3] ممتاز نام خواجہ احمد اسود دینوری کا ہے، مناقب الاصفیا میں احمد سیاہ تحریر ہے، جو اسود کا فارسی ترجمہ ہے، یہ بزرگ حضرت ممشاد کے خلیفہ تھے، سہروردیہ اور فردوسیہ سلسلے کے بزرگوں میں ان کو اہم مقام حاصل ہے، اپنے دور کے صوفیائے کرام میں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے،

---

[1] عجائب الاسفار ج ۲ ص ۲۴۴ [2] سفینۃ الاولیا (اردو) ص ۱۹۱ [3] مناقب الاصفیا (اردو) ص ۳۰۲ سفینۃ الاولیا ص ۱۸۵ (اردو ترجمہ۔ نفیس اکیڈمی، کراچی)

عبادت و ریاضت میں بلند مقام پر فائز تھے، شیخ عبدالکریم ابن ہوازن قشیری رسالہ قشیریہ میں خواجہ احمد اسود کو مقتدایانِ عصر میں شمار کیا ہے، شیخ قشیری مشاہیر ائمہ میں تھے، اور خواجہ ابوعلی وقاق کے خلیفہ اور حضرت ابو طالب مکی کے مرشد تھے، مناقب الاصفیا میں دینور کو حضرت احمد اسود کی جائے سکونت لکھا ہے، سفینۃ الاولیا نے آپ کی وفات کا سال ۳۶۶ھ تحریر کیا ہے، حضرت محمد بن عبد اللہ عمویہ آپ کے مشہور خلیفہ تھے،

ابوالحسن صائغ دینوری مولانا جامی نے انھیں طبقۂ ثالثہ میں شمار کیا ہے، اصل نام علی بن محمد ابن سہیل تھا، دینور کے مشائخ کبار میں تھے، مصر میں قیام رہتا تھا، ۳۳۰ھ میں وصال فرمایا[1]، دارا شکوہ کا بیان ہے کہ آپ حضرت ابو جعفر صید لانی کے مرید تھے، شیخ ابو الحسن فرقانی اور خواجہ عثمان مغربی آپ کے مشہور خلفاء میں تھے، ۱۵ رجب ۳۳۰ھ یا ۳۳۱ھ میں انتقال فرمایا، مصر میں مدفون ہیں،

ابوبکر کسائی دینوری دینور کے جن بزرگوں کا نام سرفہرست آتا ہے، ان میں حضرت ابوبکر کسائی بھی ہیں، انھوں نے حضرت جنید بغدادی اور اس دور کے دوسرے مشائخ کبار کو دیکھا تھا، عراق میں قیام رہتا تھا، آپ کی عظمت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت جنید فرمایا کرتے تھے، کہ اگر ابوبکر کسائی نہ ہوتے تو میں بھی عراق میں نہ ہوتا، تیسری صدی ہجری کے آخری ایام میں انتقال فرمایا،

ابوبکر بن طاہر دینوری سفینۃ الاولیا میں آپ کا مختصر ذکر ملتا ہے، آپ امام ابوبکر شبلی کے ساتھیوں میں تھے، اور جبل کے مشائخ کبار میں آپ کا شمار تھا، ۳۳۰ھ میں وصال فرمایا،

ابوبکر بن داؤد دینوری ان کا شمار بھی ممتاز مشائخ میں ہوتا ہے، علوم ظاہری و باطنی دونوں میں

---

[1] نفحات الانس (مطبع لیسی کلکتہ) ص ۱۴۲

کمال حاصل تھا، شیخ محمد بن فضل بلخی، خواجہ ابو محمد رویم، شیخ ابو علی جرجانی وغیرہ سے فیض حاصل کیا تھا، ابو محمد کنیت تھی، آبائی وطن رے اور مولد نیشاپور تھا، مگر مشہور دینوری کے نام سے ہوئے، معلوم نہیں دینور سے کیا نسبت تھی، ۳۵۳ھ میں رحلت فرمائی، مولانا جامی کے بیان کے مطابق شیخ ابو بکر بن داؤد شام میں رہتے تھے، بعد میں دینور چلے گئے، اور وہیں ۳۵۰ھ میں ایک سو سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔

ابو العباس دینوری | نفحات الانس میں آپ کو طبقہ پنجم کے مشائخ میں شمار کیا گیا ہے، احمد بن محمد نام تھا، خواجہ ابو محمد رویم اور اس دور کے دوسرے مشائخ کو دیکھا تھا، مختلف ملکوں کی سیر کرتے ہوئے نیشاپور گئے، ایک مدت تک وہاں قیام رہا، وہاں سے ترمذ گئے، ترمذ سے سمرقند کا رخ کیا اور وہیں ۳۴۰ھ میں انتقال فرمایا،

ابو عبد اللہ دینوری | مولانا جامی نے انھیں بھی طبقہ پنجم کے صوفیا میں جگہ دی ہے، محمد بن عبد الخالق دینوری نام تھا، کئی سال تک وادی القریٰ (حجاز) میں قیام رہا، اس کے بعد دینور واپس چلے گئے اور وہیں انتقال کیا،

ابو القاسم واعظ دینوری | دارا شکوہ[1] نے آپ کی بڑی تعریف لکھی ہے، علم فقہ، حدیث، زہد و تقویٰ و مجاہدۂ نفس اور صدق معاملہ میں اپنے وقت کے امام تھے، عطاروں کے یہاں وہ کوٹ چھان کر روزی پیدا کرتے تھے، عبد الصمد بن عمرو بن اسحاق نام، ابو القاسم کنیت اور لقب واعظ تھا، ۲۴ ذی الحجہ ۳۹۷ھ میں وصال ہوا، حضرت امام احمد حنبل کے روضہ کے قریب دفن کیے گئے،

---

[1] سفینۃ الاولیاء اردو صفحہ ۲۰۴

شفیق کی غزلگوئی

از جناب سید حرمت الاکرام صاحب، مرزاپور

شفیق جونپوری کی شاعری کسی ایک صنف سخن پر قانع نہیں تھی، ان کی مملکتِ فن میں جس قدر وسعت غزل کو حاصل تھی نظم کا حصہ اس سے کم نہیں تھا، علاوہ ازیں قصیدہ، نعت، منقبت وغیرہ پر بھی ان کی شاعرانہ گرفت اتنی ہی تھی جتنی غزل یا نظم پر لیکن ان کی سخنوری میں جہاں غزل کو خشت اول کی حیثیت حاصل ہے، وہیں اس کی اندرونی تہوں کا جائزہ لینے کے بعد ذہن اس فیصلہ تک پہنچتا ہے کہ انھیں غزل و تغزل سے جو طبعی و مزاجی مطابقت تھی، اسے نظم یا دوسرے اصنافِ سخن سے مربوط نہیں کیا جا سکتا۔

دلگدازی اور دردمندی زندگی کے سفر میں ہر گام پر شفیق کے ہمرکاب تھی، انکی روح میں ایک دبی دبی آنچ تھی — وہ آنچ جو لطیف جذبوں کو بھڑکاتی ہے۔ وہ رسول عربی کے عاشق زار بھی تھے، اور ایک پُرجوش محبِ وطن بھی، چنانچہ تنگنائے غزل کو بہ قدرِ شوق نہ پاکر انھیں وادیٔ نظم کو بھی اپنے احاطۂ گمشدہ تذ میں شامل کرنا پڑا لیکن ان کی غزلوں میں جذبات و محسوسات نیز حالات و واقعات کی جو پرچھائیاں ملتی ہیں اور ان میں جو تیکھا پن یا بانکپن ہے، وہ انکی نظموں میں کم پایا جاتا ہے، انھوں نے غزل کی رمزیہ زبان میں جو کچھ کہا ہے، اس میں ان کی نظموں کی تشریح و تفصیل سے زیادہ توانائی و معنی آفرینی ہے جس کے پیش نظر انکی

غزلگوئی زیادہ وقیع، اہم اور توجہ طلب ہو جاتی ہے۔

کسی اچھے اور بڑے شاعر کی آواز میں ایک طرف اس کی شخصی زندگی کی مسرتوں اور صعوبتوں، آسودگیوں اور محرومیوں، سیرابیوں اور تشنہ کامیوں، نشاط کوشیوں اور حزن انگیزیوں کی جھلملاہٹ ناگزیر ہے، تو دوسری جانب اس کی لَے پر اس کے گھریلو اور خاندانی احول، اس کے نسبی کوائف و عقائد، نیز اس کے گرد و پیش کے تمام تر نشیب و فراز اور پیچ و خم کی عکس افگنی بھی لازمی ہے، خواہ اس کی شکلیں کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں، چنانچہ شفیقؔ کی غزل گوئی کو فکر و فن کی کسوٹی پر پرکھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ ان کے خاندانی پیش روؤں کی فہرست میں بیشتر نام علماء، حفاظ، اور پیرزادوں کے ملتے ہیں، ان کے گھرانے میں دینی عربی تعلیم کا سلسلہ کافی پہلے سے جاری تھا، خود انھوں نے مدرسہ صدیقیہ قرآنیہ (جونپور) میں حفظ قرآن کا مرحلہ طے کیا، اور پھر اپنے دور کے رواج کے تحت فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی، شاعری و انشا نگاری، تصنیف و تالیف کا مذاق بھی انھوں نے ورثہ میں پایا، لیکن ان کی افتادِ طبع، غزل کی جانب نہایت تیزی سے مڑ رہی تھی، جس کی داد انھیں اپنے والد مولانا انیقؔ صدیقی سے نہیں مل سکی، کیونکہ وہ نعت و منقبت کی جانب مائل تھے، یا مولانا حالیؔ کے رنگ کی قومی نظموں کو پسند کرتے تھے، چنانچہ ابتدا میں مختلف اساتذہ کی رہنمائی میں مشق سخن کرنے کے بعد شفیقؔ کو تحریک خلافت کے دور میں حسرتؔ موہانی سے عقیدت پیدا ہوئی جس کے اسباب میں حسرتؔ کے رنگِ تغزل کی بھی کارفرمائی تھی اور بالآخر وہ حسرتؔ کے دامانِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔

اس کے بعد یہ سوال بھی سامنے آسکتا ہے کہ خود شفیقؔ کا نظریۂ سخن کیا ہے، اور وہ کوئی نظریہ رکھتے بھی تھے یا نہیں؟ وابستگانِ غزل پر بیشتر اور عموماً یہ الزام رہا ہے کہ ادب برائے ادب پر عقیدہ رکھنے کے نتیجہ میں حیات و کائنات سے ان کے ذہن و قلم کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا، یہ الزام کہاں تک صحت ہے، اس سے قطع نظر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ شفیقؔ کی شاعری قدیم فنی و شعری اقدار سے منسلک و متاثر

ہونے کے باوجود جدید میلانات اور زندگی کی نئی قدروں سے بھی اتنی ہی قریب تھی جتنی کسی جدید شاعر کی شاعری ہو سکتی ہے، وہ لکیر کو پیٹنے کے قائل تھے اور نہ انھوں نے تقلیدی شاعری کی روایت کو گلے لگانا پسند کیا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے اخلاقی نظریات نے ان کی شاعری کو مروجہ معنوں میں جدید یا ترقی پسند نہیں بننے دیا، وہ اپنے چوتھے مجموعۂ کلام "شفق" کے دیباچہ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

"میں نہ پرانے ادب کا مذاق اڑانا جائز سمجھتا ہوں اور نہ نئے ادب سے نفرت کرتا ہوں، ادب کی تدریجی ترقی کے لیے اعتدال کی ضرورت ہے، اس لیے درمیانی راستے کو جہاں مشرقی مزاج اپنے عناصر کو محفوظ رکھتے ہوئے تازہ ہواؤں سے انبساط حاصل کرسکے، پسند کرتا ہوں"

شفیق کو قدیم ادب سے اس قسم کی انتہا پسندانہ خوش عقیدگی نہیں تھی، جیسی ان کے بعض ہمعصر غزلگویوں کو تھی، بلکہ مقابلتہً ان کے ذہن کا جھکاؤ تغیر پذیر ادبی اقدار کی جانب زیادہ تھا، جس کی عکاسی نہ صرف ان کی قومی، وطنی اور سیاسی نظموں میں ملتی ہے، بلکہ انھوں نے مذکورۂ بالا دیباچہ میں بھی ایک جگہ نہایت وضاحت کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا ہے:

"قدیم طبقہ کی ہمنوائی اس لیے ناممکن ہے کہ ابھی تک وہ اپنی کہنگی و پامالی پر قانع ہو، فرسودگی کے مقابلے میں کسی تازگی کی گنجایش نہیں۔ جب کچھ نہ کچھ تغیرات ہر دور میں ہوئے ہیں تو عصر نو کے خوشگوار مضامین، جدید تخیل کے قابل قبول اضافے کیوں نظر انداز کیے جائیں، نئے ادیبوں نے ایسے بھی حسین تخیلات کو شعر و سخن کے سانچے میں ڈھالا ہے، جن کی دلکشی سے انکار نہیں کیا جاسکتا، پھر کیوں نہ انتخاب سے کام لیا جائے"

قدیم ادبی اقدار ہوں یا جدید، شفیق نے ان کے ترک و اختیار میں خود اپنے مذاق انتخاب سے کام لیا،

اور بڑی حد تک فراخدلی اور وسیع النظری کا ثبوت دیا لیکن اس کے باوصف ادب جدید یا ترقی پسند ادب نے شفیق سے کیوں تجاہل برتا یا خود شفیق نے کشش و تاثیر کے اعتراف کے باوجود ان ادبی تحریکوں سے وابستگی کو کیوں پسند نہیں کیا، اس کے وجوہ کا تفصیلی تجزیہ کرنے کے بجائے اجمالاً یہ کہدینا کافی ہے کہ اس میں بنیادی طور پر شفیق کے مذہبی اور اخلاقی عقائد کا حصہ زیادہ تھا جس کا اظہار انھوں نے "شفق" کے دیباچہ میں صراحۃً کیا ہے، اگرچہ بعض معنوں میں یہ طریق کار شفیق کے دائرۂ مقبولیت کو محدود کرنے کا باعث ہوا، ایک طرف انھوں نے اپنی شاعرانہ شخصیت کو کسی ایک ادبی فرقہ یا طبقہ کی وابستگی سے بچایا، تو دوسری جانب اس کا ایک نفسیاتی ردعمل اس صورت میں نمودار ہوا کہ ان کے ساتھ کسی گروہ نے اتنی یگانگت نہیں برتی جس کی ضرورت جانبدارانہ توصیف و تشہیر کے اس دور میں قدم قدم پیش آتی ہے، اور جو بعض صورتوں میں شاعر کے رنگ و آہنگ پر بھی براہ راست یا بالواسطہ اثر انداز ہوتی ہے لیکن شفیق کو اس نوع کی کسی کیفیت سے دوچار نہیں ہونا پڑا، اور ان کی شاعری خواہ وہ نظم ہو یا غزل، خود ان کی نشاندہی کے مطابق مولانا انیق جونپوری، حسرت موہانی اور علامہ اقبال سے جس انداز میں اثر پذیر ہوئی، اس میں شفیق کی اپنی پسند یا اپنے مذاق سخن کو زیادہ دخل ہے جس کا انحصار کسی خارجی تحریک کے بجائے خود ان کی افتاد طبع پر ہے، چنانچہ ان کی نظموں میں غزلیہ لہجہ کی جو گھلاوٹ کہیں نمایاں کہیں پنہاں پائی جاتی ہے، اس کے ڈانڈے براہ راست ان کی طبعی کیفیات نیز شعری نظریات سے ملتے ہیں جن کی مشترکہ کارفرمائی ان کو غزل کا شاعر بناتی ہے، اور ان کی غزلوں کو وہ رنگ روپ عطا کرتی ہے جس پر جمالیاتی احساسات کی چھاپ نہایت گہری ہے۔

شفیق کی غزلوں کا پہلا اور بنیادی وصف لہجہ کی وہ سادگی، برجستگی اور شستگی ہے جو کسی شعر کو سماعت کے پردوں سے دل کی منزل تک پہنچانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے، نیز واردات قلب کے بیان میں وہ تاثیر بھر دیتی ہے جس کی لہریں احساس کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی برقی رفتار سے قلب کی

گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں، یہ کیفیت شفیق کی غزلوں میں شدت کے ساتھ نمایاں بھی ہے، اور نہایت عام بھی لیکن ان کی غزلگوئی کا دور اول بعض مقامات پر سادگی بیان کی انتہا پسندانہ مثالیں بھی پیش کرتا ہے، جو مذاق سلیم کے نازک گوشوں سے متصادم ہوتی ہوئی پائی جاتی ہے، اس قبیل کے چند اشعار حاضر ہیں:

وعدۂ وصل و ملاقات تو ہوتا ہو مگر　　　خط میں لکھی نہیں تاریخ کوئی آنے کی

جب بلاتا ہوں تو انکار ہی کردیتے ہو　　　کیا قسم کھائی ہے تم نے مرے گھر آنے کی

کہتے تو ہو کہ صاف کہو دل کا مدعا　　　تم نے اگر زبان سے انکار کر دیا

تم پر کوئی سو جان سے سو جی سے فدا ہے　　　تم بھی اسے چاہو تو محبت کا مزہ ہے

خدا نے حسن بھی ایسا دیا ہے　　　جسے چاہیں وہ دیوانہ بنائیں

ہم قبر میں سوتے ہیں وہ قبر پہ روتے ہیں　　　کیا منظر حسرت ہر کیا گور غریباں ہے

قیامت ایک برپا ہو گئی شہر خموشاں میں　　　ذرا آنا تھا انھیں منھ کھولکر گور غریباں میں

کوئی روتا ہے یہ کہہ کہہ کے سر قبر شفیق　　　میری تقدیر میں لکھا تھا ترا غم کرنا

شفیق جاں بلب ہوتا ہے رخصت　　　کہو اب ان سے آکر دیکھ جائیں

اس کیفیت نے شفیق کی غزلگوئی کو چار چاند بھی لگائے اور بدنما داغ بھی دیے، لیکن تجربات مشاہدات کی راہ پر ان کا ذہن جس قدر آگے بڑھتا گیا، ان کی غزلیں بتدریج معطر ہوتی گئیں، اگرچہ ان کے متذکرہ قسم کے اشعار میں بھی ایک دبی دبی کسک اور تڑپ ضرور ہے، جو ان کے دکھے ہوئے دل کی غمازی کرتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ خواہ وہ کوئی موقع ہو، شفیق کے دل کی چوٹ چھپتی ہے نہ چھپائی جاسکتی ہے، اور ان کے سینہ کا ہر زخم اوپر ہی سے نمایاں رہتا ہے، ان کی غزلوں میں ... دیوانی کا ذکر اکثر مقامات پر پایا جاتا ہے جس میں انتہائی شدت بھی ہے اور انتہائی حسرت بھی، کہیں وہ شباب کے ساز محبت کے رنگین نغمے الاپتے ہیں اور کہیں اسکی گذری ہوئی

تلاطم ساما نیوں کو یاد کر کے تڑپتے ہیں اور حالی کی طرح

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

جیسی کیفیات کے اظہار پر مجبور ہیں، انھوں نے ایک مقام پر خود کہا ہے:

دلِ حزیں کی خرابی کی ابتدایوں ہے کہ ایک دن کسی محفل سے بیقرار آیا

اور دل خانہ خراب نے انھیں کبھی چین نہیں لینے دیا، وہ تا حیات صحرائے جنوں کی باتوں کو یاد کرتے اور گھٹتے رہے اور آخرکار کہہ اٹھے:

چھوڑ و شفیق چھوڑ دکافر بتوں سے ملنا اب ہو چکی جوانی، کیا عاشقی کرو گے؟

شفیق نے "کافر بتوں" سے ملنا ترک کیا یا نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ رفتہ رفتہ ان کے عشق کی شوریدگی، سنجیدگی سے قریب ہوتی گئی، دل کے اضطراب کی جگہ ایک التہاب نے لے لی، وہ اندر ہی اندر سلگتے رہے، اس طرح ان کا غم سنگین تر ہوگیا اور دل کا وہ زخم جو پہلے قابلِ مداوا تھا، ناسور بن گیا عشق کی فتنہ سامانیاں جو ایک کوہستانی آبجو کی طرح ہر بلند و پست اور قریب و دور پر چھائی چلی جارہی تھیں سمٹنے لگیں، چنانچہ اس آبجو کے پھیلاؤ میں کمی ہوگئی، لیکن طوفانی تموج نے مرکزیت اختیار کرکے گہرائی کو بڑھادیا، شفیق کا خمیر ہی عشق سے اٹھا تھا، وہ سرتاپا عشق تھے، لہذا یہ گہرائی انھیں روز بروز زیادہ عزقاب بلا کرتی گئی، ان کے یہاں نشاط پسندی اور لذت کوشی کی لہریں یوں بھی ہلکی ہی ہیں لیکن وقت کے ساتھ یہ لہریں بھی معدوم ہوتی گئیں جن کے پس پشت ایک قسم کا والہانہ پن کارفرما تھا۔ ایسا والہانہ پن جو ارضی محبت کا خاصہ ہوتا ہے۔

ان کی غزلوں کو محض حدیث کاکل و رخسار تک محدود نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ انھوں نے غزل کے موضوعات کو وسعت دینے اور ان میں تنوع پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے، لیکن با ایں ہمہ واردات قلب کے شوخ اور رنگین نقوش اس قدر ابھرے ہوئے ملتے ہیں کہ دوسرے نقوش دخطوط کا

...م پڑھنا لازمی ہے شفیق کے چند عشقیہ اشعار مثالاً حاضر ہیں:

مزاج بوالہوسی کا قصور ہے ورنہ دیارِ عشق کی آب و ہوا خراب نہیں

نصیبِ عاشقاں اس کی خوشی کیسی خوشی ہوگی بنا رکھا ہو جس کے غم کو بھی راحت اساں میں نے

اپنی اداے نیم نگاہی نہ پوچھئے اللہ جانتا ہے جو دل پر گذر گئی

ہم تمنائے ملاقات کیے جائیں گے آپ سو مرتبہ کہیے مرے امکاں میں نہیں

عرض بے سود، التجا بے کار ان نگاہوں کو کیا نہیں معلوم!

عشق میں اس قسم کی گرویدگی دیکھی نہیں میں نے آنکھوں سے تری تصویر بھی دیکھی نہیں

خدا کرے کہ مری آہ بے اثر ہی رہے میں کیا کروں گا، اگر کوئی اشکبار آیا

وہ آئے ہیں تو الٰہی سحر نہ ہو بر سوں خوشی کی رات کو دے زندگی شبِ غم کی

بنی بہارِ نمو دشمن حیات شفیق بڑھا بڑھا کے مری عمر، زندگی کم کی

یا شورِ فغاں میں بھی تھی تاب رسائی یا ہر نفسِ سرد سے بیجا مہری ہے

کہنا ہی پڑا ان کو یہ خط پڑھ کے ہمارا کمبخت کی ہر بات محبت سے بھری ہے

لطف اٹھاتے رہو سنتے رہو افسانۂ عشق یہ کہانی ہے سمجھنے کی نہ سمجھانے کی

دیکھنا ہوگا تماشا مری جانبازی کا تم نے کیوں تذکرۂ تیشۂ فرہاد کیا

زلفِ جاناں! شبِ فرقت کی سحر ہو کہ نہ ہو تیری خوشبو سے ہے شامِ غریباں آباد

روٹھنے والے نے آخر چوٹ کھائی میرے بعد لوگ کہتے ہیں ہنسی منہ پر نہ آئی میرے بعد

کسی نے مسکرا کر کہہ دیا تھا اپنا دیوانہ اسی دن سے مری شوریدگی ہے اور بالیدہ

دمبدم اس رخ پہ اک رنگ بکھرتا ہوں میں ہر نگاہِ شوق کو پہلی نظر پاتا ہوں میں

تم آئینہ اٹھاؤ تو بتاؤں نگاہِ آرزو نے کیا خطا کی

حسرت موہانی کی غزلوں میں بھی یہ کیفیت پائی جاتی ہے جس کا اثر شفیق کی شاعری پر پڑنا ہی چاہئے تھا۔ یوں بھی شفیق کی غزل گوئی خود ان کی فراجی کیفیات وخصوصیات کے تحت حسرت سے قربت اور مشابہت رکھتی ہے، لیکن حسرت اور شفیق کی غزلوں میں جو ہم آہنگی یا یک رنگی ہے، اسے کلی یا اساسی سے زیادہ جزوی کہا جائے گا اور اس کا تعلق ایک طرف طرز ادا کی شستگی و برجستگی، شگفتگی و پرکاری سے ہے تو دوسری طرف عشق کی ان جزئیات یا تفصیلات سے ہے جن کا اظہار دونوں کے یہاں مشترک اور یکساں ہے، اور جن کے تحت اس نتیجہ تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ جس طرح حسرت کی شاعری میں اجلی محبت کی دھوپ چھاؤں کی لطافتیں ہیں، اسی طرح شفیق کی شاعری پر بھی اسی فردوس آب وگل کی کسی حور کے جمال جہاں فروز کا پرتو ہے لیکن حسرت کی شاعری میں نشاط و سرمستی کا پہلو جس قدر غالب ہے شفیق کی شاعری میں اس کی اتنی ہی کمی ہے، اور اس کی جگہ حزن واندوہ کا تسلط پایا جاتا ہے، حسرت صرف تخلص کے حسرت ہیں لیکن شفیق حسرت مجسم ہیں، رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ کہا ہے:

> "حسرت اور جگر دونوں اصلاً حسن وعشق کے شاعر ہیں، لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک محبوب کی موجودگی میں اور دوسرا محبوب کی دوری پر غزلخواں ہوتا ہے، محبوب کی موجودگی وصال کی محرک ہوتی ہے، دوری محبت کی، جگر محبت کے شاعر ہیں اور حسرت محبوب کے۔"

حسرت محبوب کی قربت پر غزلخوان ہوتے ہیں اور یہ قربت ان کی غزلوں کو کیف وسرور کا سرمایہ عطا کرتی ہے لیکن شفیق کا دل محبوب کی قربت کے باوجود اس تڑپ سے خالی نہیں ہوپاتا جو ان کی رگ رگ میں رچی ہوئی ہے، جگر کی شاعری، محبت کی شاعری ہے، اور ان کے عاشقانہ کردار میں بھی سوز وگداز، کرب واضطراب کا نمایاں حصہ ہے، وہ بھی دل وجان سے محبوب کے پرستار ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا عشق ایک نوع کے پندار کا حامل ہے جس میں کسی ترمیم یا کسی لچک کی گنجائش نہیں،

اس کے برعکس شفیق عجز و انکسار کے پتلے ہیں جن کے عاشقانہ مشرب میں سرکشی و پندار کی نہ کوئی گنجائش ہے، نہ اس کے جواز کی کوئی صورت، کیونکہ یہ ان کے آئینِ عشق کے مطلقاً منافی ہے، محبوب سے ان کی محبت اتنی والہانہ اور مجنونانہ ہے کہ وہ اس کی گلیوں کو پلکوں سے بہارنے کے آرزومند ملتے ہیں۔ اس کیفیت کو ایک طور پر نگندگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور یہ بیجا بھی نہ ہوگا لیکن اس کے پس منظر میں انکی سادہ دلی اور اخلاص شیوگی بھی چھپی ہوئی پائی جاتی ہے، وہ حسن کے طلبگار نہیں، پرستار نہیں بلکہ فدائی ہیں جو نیازکیشی کو موجب افتخار تصور کرتا ہے۔

شفیق ذہنی اور فطری کسی لحاظ سے فرسودگی کے حامی نہیں کہے جا سکتے بلکہ اس سے بیزار و گریزاں ملتے ہیں لیکن ان کی غزلوں میں نزع، اجل، نعش، تربت اور اس قبیل کے دوسرے مضامین کی کثرت ہے، اس کا جواز شفیق نے خود پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ موت سے متعلق مضامین کو ترک کر دینا عہد حاضر کی پست مذاقی کے مترادف ہے، ان کی نظر میں اس کا سبب الحاد و بیدینی کی روز افزوں وبا نیز اسلامی معارف سے نئے شاعروں کی ناواقفیت ہے، شفیق اپنے کو اسلامی شاعر کہتے تھے، اور اسلامی ادب کے حامی نیز مبلغ تھے، لہذا ان کا یہ نظریہ قابل تسلیم کہا جا سکتا ہے، اگرچہ یہ امر بجائے خود غور طلب ہے کہ شفیق کی شاعری، اسلامی ادب کے ذیل میں آتی بھی ہے یا نہیں، اور آتی بھی ہے تو کس حد تک ؟ قبر، سفر حیات کی آخری منزل ہے یا اجل، زندگی کا ایک وقفہ جہاں سے انسان تازہ دم ہو کر آیندہ مراحل کی جانب بڑھتا ہے، اس سے قطع نظر یہ درست سہی کہ موت سے دہشت و بیزاری انسانی حوصلوں کے لیے وجہ ننگ ہے، لیکن شعری موضوعات کے لیے موت کے ذکر کو جزو لازم قرار دینا کہاں تک درست ہے ؟ جس طرح اجل کے ذکر سے عمداً احتراز کرنا انتہا پسندی کا ایک پہلو رکھتا ہے، اسی طرح اس کو لازمۂ شعر بنا دینے کا نظریہ بھی انتہا پسندانہ کہا جا سکتا ہے۔

دم آخر وہ خود بالیں پہ ان کا بے نقاب آنا ‏ ‏ ‏ شفیقِ جاں بلب کو آخری دیدار ہو جانا

مرجانے رات سے محشر بپا ہے محشر پر ‏ ‏ ‏ پڑی ہے لاش ترے ناتواں کی بستر پر

قیامت ایک برپا ہو گئی شہر خموشاں میں ‏ ‏ ‏ دہ آنا تھا انھیں منہ کھول کر گور غریباں میں

کہتے ہیں وہ سنکر خبرِ مرگ شفیق، آہ ‏ ‏ ‏ کم بخت کا غم کیا کہ وہ دیوانہ تو تھا ہی

شفیق خانماں برباد کی میت نہ ہو، دیکھو ‏ ‏ ‏ وہ آتی ہے کسی وحشی کی لاش اٹھکر بیاباں سے

ایسی نیند آئی کہ پھر موت کو پیار آ ہی گیا ‏ ‏ ‏ رات بھر جاگنے والے کو قرار آ ہی گیا

کوئی روتا ہے یہ کہہ کہہ کے سر تربتِ شفیق ‏ ‏ ‏ مری تقدیر میں لکھا تھا ترا غم کرنا

نہیں کہا جا سکتا کہ مندرجۂ بالا اشعار کس تعمیری یا اصلاحی پہلو کی نمایندگی کرتے ہیں یا ان سے زندگی کے کس شعبہ کی فلاح و بہتری مقصود ہو سکتی ہے، یہ ضرور ہے کہ ان موضوعات سے متعلق شفیق کے بیشتر اشعار میں فرسودگی اور پامالی نہیں ہے، بلکہ ایک نوع کی تازگی ہے، علاوہ ازیں اس ضمن میں ان کے قلم سے کچھ ایسے شعر بھی نکلے ہیں جن کی اثر انگیزی اور دلپذیری لائق توجہ ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نہیں معلوم یہ گور غریباں کیسی بستی ہے ‏ ‏ ‏ زمیں آباد ہو جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

سفر دراز ہے اور آفتاب ڈوب چلا ‏ ‏ ‏ شفیق تیز اٹھاؤ قدم کہ دن کم ہے

یوں رہے گلشنِ ہستی میں برنگِ شبنم ‏ ‏ ‏ شام کو آئے چلے وقتِ سحر دنیا سے

کتنا مغموم چلا منزلِ ہستی سے شفیق ‏ ‏ ‏ جیسے برباد مسافر کا سفر دنیا سے

روٹھنے والے نے آخر جو شکھائی میرے بعد ‏ ‏ ‏ لوگ کہتے ہیں ہنسی منہ پر نہ آئی میرے بعد

آج لیتی جا مرے غم کا سلام آخری ‏ ‏ ‏ کس کے گھر جائے گی تو شامِ جدائی میرے بعد

ہائے اس حسنِ گلابی چشم و مژگاں کا رنگ ‏ ‏ ‏ پھول جب مہکے کلی جب مسکرائی میرے بعد

بے رخی کی شان میری ناز برداری سے ہے ‏ ‏ ‏ مچل جانے کا کوئی ہے دستائی میرے بعد

اب ساز کا ہر تار ہے مائل بہ خموشی — سن لو مری آواز مرے نغمہ رسو اور

جینے کا نہیں شوق محبت کی دعا ہے — دو چار برس ساتھ رہے ہم نفسو اور

شفیق کی غزلوں میں عصری میلانات کی مبصرانہ ترجمانی کے ساتھ ساتھ طہارت فکر کے عناصر بھی زیادہ ہیں، جو بعض مقامات پر بعید نمایاں ہو کر ایک "مشن" کی شکل اختیار کرتے ہوئے ملتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کوشش ان کی غزلوں کے لیے نئی لطافتوں کا سرمایہ مہیا کرتی ہے، حسرت سے وابستگی نے ان کے تغزل میں ہلکی ہلکی شوخی کی آمیزش ضرور کر دی لیکن شفیق کی فکری لطافتوں نے اس شوخی کو مخصوص حدود سے متجاوز ہونے کا موقع نہیں دیا، اور نہ اس کو حسرت کی لذت پسندی تک پہنچنے دیا، حالانکہ شفیق کے دور اول کے پیش نظر اس کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

شفیق نے اقبال کے بعض موضوعات و خیالات کو بھی اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے، اور نظموں سے زیادہ وہ غزلوں میں اقبال کی پیروی کرتے ہوئے ملتے ہیں، اقبال کے معاصرین کے بعد کے بیشتر شاعروں کی طرح شفیق بھی اقبال سے متاثر ہوئے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ شفیق اپنی شاعری کو زندگی کے صالح و صحت مند قدروں اور اس کے ساتھ اسلام کے آفاقی پیغام کا آئینہ بنانا چاہتے تھے، لہٰذا کسی نہ کسی نہج سے ان کے ذہن و کلام پر اقبال کا پرتو پڑنا ناگزیر تھا لیکن یہ پیروی اقبال کے آہنگ یا لہجہ کی پیروی نہیں، نہ ان میں بازگشت کی کوئی کیفیت ہے بلکہ اس کا تعلق معنی و مواد سے ہے، شفیق نے اس کا اظہار بھی کیا ہے اور اعتراف بھی، وہ "شفق" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"۱۹۳۳ء سے اقبال کا مطالعہ شروع کیا جس میں میرے نظریات ملی اور احساسات قومی کی تائید نظر آئی اور میں علامہ کے فلسفہ، وطنیت وغیرہ کی اتباع میں اشعار نظم کرنے لگا۔"

اپنے ایک اور مجموعہ کلام "فانوس" میں (سلسلۂ مقدمۂ شعر و ادب) انھوں نے علامہ اقبال کی شاعرانہ و مفکرانہ شخصیت کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے:

"علامہ اقبال نے خودی کی حکمت ایمانی کو نازعبدیت کے ساتھ یعنی خدا کے اقرار و بندگی کی روشنی میں سمجھا حالانکہ بندگی عجز و تذلل کا نام ہے، اور عجز و تذلل کے ساتھ گفتگو میں یہ بلند تیور کہاں نصیب ہو سکتے ہیں، لیکن یہ اسلامی تعلیم کا اعتدال ہے، نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام اقوام عالم کو اس دور میں علامہ اقبال کا ممنون ہونا چاہیے کہ بندگانِ خدا کو ان کے مرتبہ سے روشناس کرا دیا اور نکتہ لا نبی بعدی کو حکیم مشرق نے انسانی زندگی کا سب سے روشن اور ترقی یافتہ رخ محسوس کرکے انسانیت کو سمجھنے کا موقع دیا۔"

حالانکہ شفیق اصلاً "خالص غزل" کے شاعر تھے لیکن ماضی سے آگہی اور حال و آیندہ پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، وہ چشم بینا اور دل بیدار دونوں کے مالک تھے، چنانچہ انھوں نے اپنی فکری صلاحیتوں کو روایات کا اسیر ہونے سے بڑی حد تک بچا لیا، اور اپنے عصر کے دوسرے غزل گویوں کی طرح غزل کا دامن محض تغزل تک محدود نہیں ہونے دیا بلکہ اس کو حیات و کائنات کی دوسری قدروں کے خطوط و دائرے دیگر وسیع تر کرنے کی کوشش کی، شفیق نے غزل میں نہ صرف گہرائی پیدا کی بلکہ اس کی گیرائی میں بھی اضافہ کیا لیکن اقبال کی تقلید نے ان کی غزلوں کے حسن کو کہیں کہیں مجروح بھی کیا ہے، اقبال نے غزل کو نظم کے قریب کر دیا جسے انکی فنی بدعت کہا جا سکتا ہے لیکن انھوں نے غزل کو جو آہنگ بخشا، وہ ایک مخصوص وقفہ کے بعد سانچے میں ڈھلتا اور ان کی وضعِ فکر بن کر ابھرتا گیا، اقبال کے یہاں تغزل عموماً مفقود ہے لہذا ان کے لیے اپنی وضع کو نباہنا نسبتاً آسان تھا، مگر شفیق نے جن کے شاعرانہ آہنگ میں "تغزل" کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، بوقلموں موضوعات و مضامین سے جو تصویر بنائی ہے، اس کے بعض رنگ تصویر کی خوشنمائی کو بڑھانے کے بجائے ذوق نظر پر گراں گذرتے ہیں، شفیق کی غزل گوئی تغزل و تفکر سے لیکر اخلاقیات، مذہبیات اور سیاسیات تک ہر موضوع پر مشتمل ہے، اور ان کے یہاں بعض موقعوں پر تبلیغی انداز اتنا تیکھا اور نمایاں ہو جاتا ہے جس کی متحمل اقبال کی غزل گوئی تو ہو سکتی ہے، لیکن شفیق کی غزل گوئی نہیں ہو سکتی، یوں بھی مذہبی اور قومی موضوعات کو برتنے کے لیے غزل پر نظم کے قالب کو ترجیح دی جاتی ہے چنانچہ شفیق نے جہاں کہیں

انتہا پسندی اور بے اعتدالی برتی ہے، وہاں غزل کی فطری لطافت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ہم شفیق کی مختلف غزلوں کے چند اشعار حاضر ہیں، جنھیں غزل سے کوئی نسبت دی جا سکتی ہے نہ یہ غزل کے آہنگ میں کھپتے ہیں:

خصوصیات دیکھو وحدت اقوام کدھر دیکھو　　کہ منزل ایک ہے پھر بھی الگ ہے راستہ میرا

مسلسل دوپہر سے شام تک وہ معرکے لیکن　　جہاں وقت نماز آیا وہیں سر جھک گیا میرا

اشتراکیت کی زیبائش ہے حسن اعتدال　　دلق پوش کاررواں کو رہبر منزل بنا

کیوں حجازی قافلہ بھٹکے نہ ترکستان کو　　راہ سے ناآشنا خضر رہ منزل بنا

ابھی تک یاد ہے ساحل پہ یا حجاج کا نعرہ　　کہ اک مظلوم کی آواز پر پویا جہاز آیا

سلام اے دلی و اجمیر کے خاموش دیوانو!　　پھریں گے پھر تمھارے دن جو کوئی پاکباز آیا

سر پہ گاگر لیے جاتی ہے جو پنگھٹ کی طرف　　میری جانب سے اسی دختر دہقاں کو سلام

یہ ملحدین ندامت کا لطف کیا جانیں　　گناہ کر کے بھی قدر گناہ کر نہ سکے

جنید و بایزید آئے نہ سلمان و بلال آئے　　نظر مشتاق ہے دنیا میں کوئی باکمال آئے

شفیق کے دور آخر کی اکثر غزلیں اسی رجحان کی آئینہ دار ہیں، لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ شفیق کے ذہن کا شعری یا غزلیہ رچاؤ اتنا ہمہ گیر ہے کہ وہ ہر بات کو خواہ اس کا تعلق اخلاقی و مذہبی موضوعات سے ہو یا سیاسی و معاشی مضامین سے، شعریت کی رنگینی و چاشنی بخش دیتے ہیں، ان کے یہاں صناعی اور بلند آہنگی نہیں، لیکن پرکاری اور بلند فکری ضرور ہے۔

شفیق کے متعلق چند اہل نظر کی آرا درج ذیل ہیں۔ جگر مرادآبادی لکھتے ہیں:

"وہ صحیح شعریت کے سرمایہ دار ہیں، سادگی اور پرکاری ان کی خاص صفت شعری ہے، صداقت و واقعیت ان کے ہاتھ سے کسی جگہ نہیں جاتی، یہ ان کے مذاق سلیم کی دلیل ہے، ان کے کلام میں تشنگی کی بھی کوئی کمی نہیں لیکن ایسی تشنگی جو بہت ہی لطیف و پاکیزہ ہو"

اقبال سہیل کی رائے یہ ہے:

"انگریزی زبان کا مشہور ادیب گولڈ اسمتھ روزمرہ کے واقعات اور پیش پا افتادہ واردات کو اس خوبی اور حلاوت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ سننے والا بے اختیار سر دھننے لگے۔ یہی خصوصیت جناب شفیق کی ہے۔"

نیاز فتحپوری، "شفق" کے پیش لفظ میں شفیق کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں:

"ان کے اشعار کے پڑھنے سے شاعر کی نہ صرف اس دردمندی کا پتہ چلتا ہے جو کامیاب زندگی کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جذبات میں کتنی پختگی و ہمواری ہے۔"

جس طرح شفیق کی نظموں میں نوع انسانی کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو کامراں بنانے کی کوشش ہے، اسی طرح ان کی غزلوں میں بھی تعمیر و ارتقاء کے سہانے خوابوں کی خنک روشنی ہے جسے وہ حیات کی تاریک وادیوں میں بکھیر دینا چاہتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ وہ ترقی حاضرہ نیز سائنس کے جدید کارناموں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے، کیونکہ انکی نظر میں ان کارناموں کے نتائج خوشگوار نہیں، انکی خواہش ہے کہ انسان پہلے انسان بنجائے، اسے انسانی حدود سے متجاوز دیکھنا ان کے لیے باعث اذیت ہے۔

شفیق کی غزلیں زبان و بیان کے لحاظ سے جتنی دلکشی رکھتی ہیں، اس سے زیادہ ان میں معنوی جمال آفرینی ہے، غزل کی روایات کا پیکر ان کے یہاں جو کچھ بھی ہو اور جیسا بھی ہو مگر اس میں رعنائی و زیبائی یقیناً ہے، لیکن یہ پیکر بہرحال بے جان نہیں رہتا، بلکہ ان کا تجرباتی شعور اس میں روح پھونکتا اور جان ڈالتا رہتا ہے، یہ شعور انکی عاشقانہ لے کو نشتریت اور گداختگی بھی دیتا ہے، اور ان کے یہاں حرکت و بیداری کا پیغام بھی بنجاتا ہے۔ ان کی غزلوں میں جو پھیلاؤ ہے وہ ان کے رنگارنگ تجربات کی حکاسی کرتا ہے، جن کے دامن میں زندگی کی پہنائیاں سمٹی ہوئی ملتی ہیں، ان کے چند اشعار مثالاً درج ذیل ہیں جن سے ان کے خصائص شعری کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

بے یادِ رفتگاں جا منزل رہی نہ جادہ — تو ڈھونڈھتی پھرے گی گردِ سفر کہاں تک
خود نکہتِ گلستاں غمازِ گلستاں ہے — غنچے چھپا سکیں گے رازِ سحر کہاں تک

کہتا تھا یہ دل، تھام کے کعبہ کا غلاف آج — اے گیسوئے جاناں! مجھے آزاد نہ کرنا

بنا لیتے ہیں پیچھے آنے والے رہنما مجھکو — مسافر کو پتہ دیتی ہے خود بانگِ درا میرا

اپنے غم کے لائق اپنی یاد کے قابل بنا — دل کے خالق! تو مجھے سر سے قدم تک دل بنا
ہوگا اے شانِ کریمی! تیری غیرت کے خلاف — کیوں مجھے بندہ بنا کر غیر کا سائل بنا

ہے آفرینشِ عالم کی داستاں اتنی — کسی نے پردہ اٹھایا کسی کو پیار آیا

ختم کرنے کو بقا اور فنا کا احساس — اک مقام اور بھی ہے منزلِ عرفاں کے قریب

شام آئی اور یاد تری دل نشیں ہوئی — پھر کیا خبر کہ صبح ہوئی یا نہیں ہوئی

لے کے جاتی تو ہے پیغام محبت لیکن — اب وہاں جا کے صبا دیکھئے کیا کرتی ہے
شوخیٔ شوق تو مسرور ہے تنہائی پہ — ان کی آنکھوں کی حیا دیکھئے کیا کرتی ہے

دردمندِ غم نظر آیا نہ جب کوئی مجھے — میری تنہائی پہ کل غربت بہت روئی مجھے
دیکھ میری لاشریکی اے خدائے لاشریک! — عمر بھر کرنی پڑی خود اپنی دلجوئی مجھے

معلوم ہوگی قدرِ محبت ہمارے بعد — بیٹھے رہو گے زلف پریشاں کیے ہوئے

آپ کے بعد اجالے کی ضرورت کیا ہے — شمع جلتی ہے، بجھا دوں تو چلے جائیے گا

دور ہوتی ہے وہ غربت میں کوسوں کی تھکن — جب کسی منزل پہ کوئی ہمسفر پاتا ہوں میں

رہے گی نکہتِ آوارہ عمر بھر برباد — چمن کا راز اسی نے جہاں میں عام کیا

کلی مرجھا گئی مرضی خدا کی — بہت رو رو کے شبنم نے دعا کی

نسیمِ صبح تو کیا سونے والوں کو جگائے گی — ابھی تو صبح خود سوئی ہوئی معلوم ہوتی ہے

سنوارا ہے بجانے کس زلیخا کی جوانی نے / مجھے ہر دور میں دنیا نئی معلوم ہوتی ہے

یہ ہوتا ہے، دیا کرتی ہیں جو پیغام بیداری / انھیں آنکھوں میں اکثر نیند بھی معلوم ہوتی ہے

اللہ اللہ! کعبہ والوں کو بھی رشک آجائے ہے / کس ادب سے میکدے میں پاؤں رکھا جائے ہے

فرش گل ہو یا ہوائے خلد کے جھونکے مگر / آپ یاد آجائیں تو پھر کس سے سویا جائے ہے

تم نے دیوانہ کہا تھا، وہ گھڑی تھی کونسی / میں زمانے میں اسی نام سے مشہور ہوا

وہ بے نقاب سہی، تو نے کیوں ادھر دیکھا / مری نگاہ تجھے بے ادب نہ ہونا تھا

تنبیہ کیجئے نہ غرورِ نگاہ پہ / میں کیا کروں کہ آپ کا جلوہ نظر میں ہے

مسکراتا ہے کوئی پھول تو جی ڈرتا ہے / ڈھونڈھتی ہو نہ اسے گردشِ ایام کہیں

اف! ایک سروِ ناز بہ لمحاتِ انتظار / اک جسم سر سے تا بقدم سوچتا ہوا

شفیقؔ کی غزلوں میں محبت کا گداز بھی ہے، اور حوادثِ روزگار سے آنکھیں ملا کر مسکرانے کا عزم بھی، دل سوزاں ان کی آنکھوں کو اکثر پرنم ضرور رکھتا ہے لیکن ان کا سفینہ آنسوؤں کے طوفان میں ڈوبتا نہیں بلکہ اس کی موجوں سے ٹکراتا ہوا بڑھتا جاتا ہے، ان کی دردمندی اور حزن پسندی فطری ہے مگر مایوس ہونا یا شورشِ حالات کے آگے سپر ڈالنا نہیں جانتے بلکہ ہر نئی افتاد کے سامنے سینہ سپر رہتے ہیں۔ شفیقؔ کا شعور اپنے دور کے ساتھ ساتھ چلا ہے، اور آنے والے دور کا نقیب بھی بنا ہے۔ اسی لیے ان کی لے میں ایک قسم کی توانائی اور حرارت ہے جو حیاتِ انسانی کی صالح اور فعال قوتوں کو بیدار کرتی ہے۔ شفیقؔ کی غزلیات کا سخت سے سخت انتخاب بھی کیا جائے تو اچھے اور بلند پایہ اشعار کی تعداد معمولی نہیں ہو سکتی۔ ان کی غزلگوئی اردو کے شعری ادب میں ایک اہم حیثیت رکھتی ہے جس کا اعتراف مستقبل کی تاریخ یقیناً کرے گی۔

روہیلوں کے دورِ حکومت
میں
اردو شاعری کا فروغ

از جناب ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ادیب بریلوی

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ہندوستان جس ابتری اور بدامنی کا شکار رہا اس سے تاریخ داں واقف ہیں، اس بدامنی کے زمانے میں کٹھیر کے علاقے میں افغانوں نے ایک نئی ریاست کی بنیاد ڈالی جو بعد میں روہیلکھنڈ کہلائی، ابتدا میں اس کا صدر مقام آنولہ تھا، نواب علی محمد خاں اور مکرم الدولہ حافظ الملک نواب حافظ رحمت خاں بہادر نصیر جنگ نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں روہیلکھنڈ کو استحکام بخشا اور ملکی فتوحات کے ساتھ ساتھ ادبی فتوحات کا ماحول پیدا کیا۔ بعض متعصب مورخین نے روہیلوں کو خودسر، جاہل اور غاصب لکھا ہے، جو سراسر خلاف حقیقت ہے روہیلہ خود بھی ادیب شاعر تھے، اور شعرا نواز بھی تھے، انھوں نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں خاصہ سرمایۂ شاعری چھوڑا اور بہت سے شاعروں کی سرپرستی کی، جب ان کی ادبی خدمات پر نظر جاتی ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ اتنے مختصر دورِ حکومت میں ان کی خدمات ادب کتنی زیادہ تھیں، اور اگر ۱۷۷۴ء میں نواب شجاع الدولہ اور ہیسٹنگز نے ان کا استیصال نہ کر دیا ہوتا تو آج اردو شاعری کی تاریخ ان کے ذکر سے خالی نہ ہوتی، روہیلکھنڈ کے پٹھانوں ہی پر منحصر نہیں ہے، اس وقت قوم افاغنہ کے تمام نووارد افراد نے ملکی اقتدار حاصل کرنے کے بعد مختلف علاقوں میں شعر و شاعری کی محفلیں سجائیں، مثلاً

فرخ آباد میں نوابین بنگش اردو شاعری کے بڑے قدردان تھے، نواب احمد خاں بنگش غالب جنگ کے دیوان اور قوم اماغنہ کے ایک فرد نواب مہربان خان رند خود اچھے شاعر اور شاعروں کے مربی تھے، مرزا سودا اور میر سوز ان کے خوان کرم کے زلہ ربا تھے، امیر الامرا، نواب نجیب الدولہ کے لڑکے نواب ضابطہ خاں بھی سخن پرور امیر تھے، گو ان کا زیادہ وقت میدان کارزار میں گذرا مگر انھوں نے شعرا کی قدردانی میں بھی کوئی تاہی نہیں کی، فدوی لاہوری کچھ دن ان کی رفاقت میں رہے، اور ان کی فرمائش سے یوسف زلیخا اردو میں نظم کی جو ناتمام رہی ظہور الدین حاتم کو بھی نواب ضابطہ خاں سے تقرب حاصل تھا، انھوں نے ایک شعر میں نواب صاحب کی تعریف بھی کی ہے ؎

حاتم اس دور کے امیروں میں حاتم اس وقت ضابطہ خاں ہے

روہیلکھنڈ پٹھانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا، ان کے قبضے میں وسیع علاقہ تھا، وہ شمالی ہند کی بساط سیاست پر اہم مہرہ تھے، جب دہلی میں نادرگردی سے شعرا ترک وطن پر مجبور ہوئے اور فکر معاش اور سخن پرور رئیسوں کی تلاش میں نکلے تو ان میں سے دو چار شاعر بریلی و آنولہ بھی آئے کیونکہ ان دونوں مقامات پر نواب علی محمد خاں و نواب حافظ رحمت خاں کے لڑکے شعر و شاعری کی محفلیں جمائے ہوئے تھے، بریلی اور آنولہ میں نو وارد شعرا کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، یہ سب شاعر صرف دہلی ہی کے نہ تھے بلکہ موجودہ روہیلکھنڈ کے مختلف اضلاع کے بھی تھے، روہیلکھنڈ کی تباہی کے بعد ہی نواب آصف الدولہ کے عہد میں دبستان لکھنؤ کی ابتدا ہوئی اور وہاں شعر و شاعری کا بازار گرم ہوا اور بڑی اہمیت حاصل کی، بریلی و آنولہ کے شاعروں کی ۱۸۵۷ء تک کی فہرست کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم روہیلکھنڈ کی اردو شاعری کی تاریخ سخن پرور امیروں کی تاریخ ہے، اس مضمون میں نمایاں سخن پرور امیروں کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان شعرا کا ذکر کیا گیا ہے جو ان سے وابستہ تھے۔

نواب حافظ رحمت خاں (م ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء) پشتو، فارسی، عربی اور اردو میں دستگاہ رکھتے تھے، صاحب علم اور علم پرور تھے، نواب علی محمد خاں کے انتقال (۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء) کے بعد ان کے جانشین ہوئے، ان کی زندگی کا بیشتر حصہ تدبیر سیاست میں گزرا، اس مشغولیت نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ شاعروں کا اجتماع کرتے مگر ان کی علم دوستی اور معارف پروری کے پیش نظر قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعروں کی سرپرستی ضرور کی ہوگی جس کا تذکرہ ہم تک نہیں پہنچ سکا۔ الطاف علی صاحب نے ان کی ادبی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے،

"حافظ الملک پشتو و فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے، وہ شاعر ہی نہ تھے بلکہ صاحب دیوان شاعر تھے۔"[1]

انھوں نے حافظ الملک کے صاحب ذوق اور علم پرور ہونے کے متعلق اسٹریچی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ نواب حافظ رحمت کے پاس ایک بڑا ذخیرۂ کتب تھا جس کو ان کی شکست و شہادت کے بعد شجاع الدولہ لکھنؤ لے گئے اور جو بعد کو شاہان اودھ کے شاہی کتب خانے کی زینت بنا۔[2]

نواب حافظ رحمت خاں کی علم دوستی ان کے صاحبزادوں کے حصے میں بھی آئی، چنانچہ نواب عنایت خاں، نواب محبت خاں محبت، نواب اللہ یار خاں، اور نواب مستجاب خاں سب علم دوست تھے، نواب عنایت خاں اور نواب محبت خاں محبت خاص طور سے شعرا کے سرپرست تھے اور مربی سخن کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔

نواب عنایت خاں - جنگ پانی پت (۱۱۷۴ھ / ۱۷۶۱ء) کے آزمودہ اور شہرت یافتہ سپاہی تھے، (م ۱۱۸۴ھ / ۱۷۷۰ء) ان کی شاعری کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہو سکا، البتہ وہ مربی سخن ضرور تھے، میر حسن نے میر عوض علی رضا شاہجہاں آبادی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ نواب عنایت خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔

"بہ عنایت یزدانی از راہ قدر شناسی و نکتہ دانی خان عالی شان خلف حافظ رحمت خاں، عنایت خان مغفور مصدر پیری دارد۔ چندے در بریلی اقامت داشت۔"[3]

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں ص ۲۰۷ (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۶ء) [2] ایضاً ص ۲۰۹ [3] تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۲۳ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۴۰ء)

یہ وہی مدعا شاہجہان آبادی ہیں جنھوں نے نواب محبت خاں محبت کی شادی کے موقع پر اپنا مشہور قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

پھر ہے یادل شدگاں درپے آزار فلک　　متصل چھڑکے ہے ناسور پہ چھاتی کے نمک

پرانے تذکرہ نگاروں نے اس قصیدہ کی بہت تعریف کی ہے، میر حسن نے لکھا ہے "الحق کہ خوب گفتہ است"۔

نواب محبت خاں محبت[۱] (۱۷۵۵ء – ۱۸۰۸ء)۔ شاگرد جعفر علی حسرت اردو کے نامور شاعر اور نہایت ذکی اور طباع تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور پشتو میں کافی کلام چھوڑا، ان کی ایک مثنوی مسمی اسرار محبت (۱۱۹۶ھ ۸۳-۱۷۸۲ء) بھی بہت مشہور ہے، انھوں نے ایک فارسی آمدنامہ بھی لکھا تھا جو اب نہیں ملتا، الطاف علی صاحب نے اپنی کتاب حیات حافظ رحمت خاں میں ان کی ایک لغت کا تذکرہ کیا ہے جس کا شمار انھوں نے تلف شدہ کتابوں کی فہرست میں کیا تھا لیکن خوش قسمتی سے یہ لغت محفوظ ہے، اور اس کا ایک خطی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے، اس کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوا کہ یہ پشتو زبان کی لغت ہے اور اس کا نام ریاض المحبۃ ہے، پشتو کے چودہ سو دس (۱۴۱۰) الفاظ کے معانی فارسی زبان میں تحریر کیے گئے ہیں، فنی اعتبار سے یہ مکمل لغت ہے، نسخے کی نقل کا کام ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۲۹ھ (مطابق یکم مئی ۱۸۱۴ء) کو تمام ہوا یعنی محبت خاں محبت کی وفات (۱۸۰۹ء) کے پانچ سال بعد۔

نواب محبت خاں محبت ۱۷۷۴ء تک بریلی میں رہے، اس کے بعد ان کا قیام لکھنؤ میں رہا، نواب آصف الدولہ ان کے قدردان تھے، پہلے ان کی سرکار میں جعفر علی حسرت ملازم رہے، ان کی وفات کے بعد قلندر بخش جرأت ملازم ہوئے، جرأت نے ایک شعر میں اپنی ملازمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بسکہ گلچین تھے سدا عشق کے بستان کے　　نوکر ہوئے بھی ہم تو محبت خاں کے

محبت خاں محبت شاعری کے علاوہ موسیقی کے بھی سرپرست تھے اور ان کی سرکار سے موسیقاروں کی بھی مالی مدد کی جاتی تھی،

---

[۱] نواب محبت خاں محبت کے حال میں معارف میں راقم کا ایک مستقل مضمون چھپ چکا ہے، اس مضمون میں بھی ضمناً ان کا مختصر تذکرہ ضروری تھا۔

نواب محبت خاں محبت شاعر کی حیثیت سے بہت ممتاز ہیں، ان کے زمانے میں اردو راہ ترقی پر گامزن تھی، نہ صرف الفاظ کی تراش خراش کا عمل جاری تھا بلکہ خیالات مضمون اور طرز ادا میں بھی تبدیلیاں ہو رہی تھیں، اس وقت انھوں نے سادہ، بے عیب اور دلپذیر اردو میں پراثر غزلیں لکھیں، نمونہ یہ ہے:

کسے خیال ہے ساقی شراب پینے کا — یہ عمر کٹ گئی خون جگر کے پینے سے

درد کس کا مرے پہلو میں خلش کرتا ہے — یا الٰہی مجھے کیوں رات دن آرام نہیں

میں نے چاہا تھا ترے عشق میں کھاؤں غم — لیکن افسوس ترے غم نے ہی کھایا مجھکو

آرام ایک دم کسی پہلو نہیں مجھے — یارب یہ کس کے درد سے بیقرار ہوں

ہم تو شبنم کی طرح رو دینگے — آپ تو مثل گل ہنسا کیجئے

یا وفا کیجئے یا میاں اپنا — ہم کو اتنا نہ مبتلا کیجے

کچھ محبت نے کیا بیزار عالم سے مجھے — کچھ ہوا عالم سے میں بیزار دل کے ہاتھ سے

میں ہی دنیا میں مگر جور و جفا سہنے کو تھا — سارے عالم کے جو ہیں ظلم و ستم میرے لئے

روتے دیکھا مجھے تو دشمن کا — دیدہ بے اختیار بہہ آیا

دل تو ایک مدت ہوئی جاتا رہا سینے سے — جان بھی جاتی ہے اب میری خدا خیر کرے

کبھی روتے گذرتا ہے کبھی آہ و فغاں کرتے — نہ پوچھو کچھ مری اوقات کہنے میں نہیں آتی

محبت خاں محبت کی مثنوی اسرار محبت، میر حسن کی مثنوی سحر البیان سے دو سال پہلے تصنیف ہوئی، مثنوی پانچسو اکیانوے اشعار پر مشتمل ہے، اس میں سسی پنوں کا مشہور قصہ عشق نظم کیا گیا ہے، مثنوی میں سسی کا سراپا اور روداد ذات عشق بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے، زبان سادہ، بامحاورہ اور پراثر ہے، بحیثیت مجموعی اعلیٰ پائے کی مثنوی ہے، طوالت بیان کے خیال سے میں چند شعر ہی نمونۃً پیش کرتا ہوں:

کبھی تو بستر غم پر بلکتا — کبھی بالیں پہ سر دے دے پٹکنا

کبھی رو رو کے آہیں سرد بھرنا — کبھی کچھ ذکر دل ہی دل میں کرنا
غرض دشوار تھا آرام پانا — کبھی اٹھنا کبھی پھر بیٹھ جانا
کبھی دو دو پہر آوارہ پھرنا — کبھی اٹھنا تو پھر غش کھا کے گرنا
کبھی حیران ہو کر اک سمت تکنا — کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا

محبت خاں محبت کے عروج کا زمانہ ان کے قیام لکھنؤ سے وابستہ ہے، جہاں حسرت اور جرأت ان کی معارف پروری سے سرفراز ہوئے، حسرت اور جرأت دونوں اردو ادب میں پوری طرح متعارف ہیں، اس لیے ان کا مزید تعارف غیر ضروری ہے، البتہ نواب محبت خاں کے قیام روہیلکھنڈ کے زمانے میں خواجہ حسن ان کے دوست اور مشیر تھے، جن پر محبت کی بڑی عنایات تھیں، اس لیے ان کا مختصر تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے[1]۔

خواجہ حسن ۔ اردو کے ان گمنام شاعروں میں سے ایک ہیں جو صاحب کمال ہونے کے باوجود شہرت سے محروم رہے، ان کا سلسلۂ نسب خواجہ کمال الدین چشتی مودودی سے ملتا تھا، جو دہلی کے معروف درویش تھے، خواجہ حسن کا مکان محلہ پہاڑ گنج دہلی میں تھا، بعد میں وہ ترک سکونت کر کے بریلی آگئے تھے، خاندان روہیلہ میں ان کی بہت منزلت تھی، نواب محبت خاں سے ان کے تعلقات بہت قریبی تھے، وہ لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی، موسیقی اور درویشی میں بہت مشہور تھے، انھیں علم نجوم میں بھی دخل تھا، تصوف کے رموز سے بھی آشنا تھے،

"صوفی مشرب اکثر مسائل صوفیہ را کہ مراد از وحدت وجود باشد بدلائل دیرایں چنانچہ شیوۂ صوفیاں با فضل دکمال است از روئے نص وحدیث باثبات رسانید"[2]

---

[1] محبت خاں محبت اور ان کا کلام کے عنوان پر ہم ایک مفصل مضمون قلمبند کر چکے ہیں، ھذا محبت پر تفصیلی مطالعے کے لیے دیکھیے معارف مئی ۱۹۶۳ء و جولائی ۱۹۶۳ء [2] تذکرہ ہندی از مصحفی ص ۷ مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) ۱۹۳۳ء

ان کو شاعری کا بھی شوق تھا، ایک ضخیم دیوان مرتب کیا، روہیلکھنڈ کی تباہی کے بعد فیض آباد پہنچے، اور وہاں سے لکھنؤ، لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ نے ان کی آؤ بھگت کی، کچھ دن کے بعد نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں کی سرکار سے منسلک ہوگئے، انھیں ایک زن بازاری سے عشق تھا، جس کا نام بخشی تھا، غزل کے مقطع میں اس کا نام وہ بالالتزام داخل کیا کرتے تھے، کلام کا نمونہ یہ ہے:

یہی شورش عشق ہے تو الٰہی توبہ
اس آغاز کا کیوں انجام ہوگا

ہوئے ہم تو یہ بے قراری وہی ہے
خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا

اگر نزع سے جان بخشی حسن کر
تو اس میں تمھارا بڑا نام ہوگا

یہ تو نے مجھ سے نالۂ شبگیر کچھ نہ کی
یہاں دل جلایا اور وہاں تاثیر کچھ نہ کی

کچھ اور تو ہوا نہیں یہ ساری عمر میں
تقصیر یہ ہوئی کہ میں تقصیر کچھ نہ کی

مرتا ہے جاں کنی میں حسن حیف تم نے رات
اب اس کی جان بخشی کی تدبیر کچھ نہ کی

رام جس محیط و مغموم نے مثنوی حسن بخشی میں ان کے عشق کا قصہ نظم کیا ہے۔

نواب محمد یار خاں امیر (المتوفی ۱۱۹۵ھ)، روہیلکھنڈ کی معروف شخصیت، خوش فکر شاعر اور بڑے مربی سخن گزرے ہیں، وہ نواب علی محمد خاں کے صاحبزادے اور نواب فیض اللہ خاں والی رامپور کے چھوٹے بھائی تھے۔

نواب حافظ رحمت خاں نے ۱۱۶۵ھ میں علی محمد خاں کے لڑکوں کو مستقل جاگیریں دیدی تھیں اور ان کے صغیر السن لڑکوں کو ان کے ساتھ کر دیا تھا تاکہ مناسب تربیت ہو سکے اور باہمی نزاع بھی دور ہو جائے، نواب فیض اللہ خاں کو رامپور، چاچھٹ اور شاہ آباد کا علاقہ ملا تھا اور نواب محمد یار خاں امیر بوجہ صغر سنی ان کی تربیت میں دیے گئے تھے، نواب محمد یار خاں امیر ٹانڈہ آنولہ میں رہتے تھے، انھیں شاعری اور موسیقی سے دلچسپی تھی، انھوں نے ان دونوں فنون کے ماہرین کی سرپرستی کی، اس وقت

محمد قیام الدین قائم بسولی بدایوں میں نواب دوندے خاں کی سرکار میں ملازم تھے، میر سوز اور مرزا سودا فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رند کی محفل سخن سے منسلک تھے، نواب محمد یار خاں امیر نے میر سوز اور مرزا سودا کو ٹانڈہ آنے کی دعوت دی مگر وہ نہیں آسکے، اس کے بعد انھوں نے قائم کو بلایا اور وہ بسولی سے ٹانڈہ چلے آئے، نواب صاحب نے فن شعر میں ان سے تلمذ اختیار کیا اور سو روپیہ ماہانہ ان کی تنخواہ مقرر ہوگئی،

نواب محمد یار خاں امیر کے متعلق مصحفی نے لکھا ہے :

"درعلم موسیقی وستار زدن یگانۂ روزگار و در رعنائی و زیبائی جوانے بود باغ وبہار۔ در ایا کہ بہ تزغیب حکیم کبیر سینلی شوق شعر ہندی دامن دلش را بسوے خود کشید خطی بطلب میر سوز و مرزا محمد رفیع نوشتہ روانہ کرد۔ چوں در ایام ایں ہر دو بزرگ در سرکار مہربان رند تخلص بصیغۂ شاعری عزو امتیاز داشتند از فرخ آباد آمدن ایشاں بہ ٹانڈہ کہ موضع بود و باش نواب بود اتفاق نیفتاد آخر کار میاں محمد قائم کہ در آں ایام در بسولی بودند حسب الارشاد آمدہ شرف ملازمت آں والاجناب دریافت و بدر ماہہ یک صد روپیہ عزو امتیازش دادہ باستادیش برداشت[1]"

اس کے بعد مصحفی نے اپنے متعلق لکھا ہے :

"حقیر مصحفی از حاضران مجلس او بود و ہر وقت کہ غزل طرح می فرمود تدبیر انجام می رسانید[2]"

قائم نے نواب محمد یار خاں امیر کی شان میں لکھا ہے :

تجھ کو قائم رکھے اللہ بہت سال اے امیر	مجتمع سایہ میں ہیں جس کے سخنداں ایسے

نواب امیر کا مجموعۂ کلام نہیں مل سکا۔ پرانے تذکروں میں ان کے اشعار قلیل تعداد میں ملتے ہیں جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ستھرے شعر کہنے پر قادر تھے، ان کے بعض اشعار میں قائم کا رنگ بھی جھلکتا ہے سادگی اور تاثیر ان کے کلام کی خصوصیات ہیں، کلام کا نمونہ یہ ہے :

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۱۳ [2] ایضاً

اس منہ سے آہ کچھ نہ نکلا — جز نالہ و آہ کچھ نہ نکلا

دیکھی جو میں سرنوشت اپنی — جز روز سیاہ کچھ نہ نکلا

کیا تو نے دیا تھا مجھکو ساقی — شیشہ میں تو واہ کچھ نہ نکلا

تیرے گھر جانے سے یاں اپنا تو گھر جاتا ہے — اے مری جان کے دشمن تو کدھر جاتا ہے

اللہ رے سرخی ترے چہرے کی ہنگام عتاب — جتنا ہی بگڑے ہے اتنا ہی سنور جاتا ہے

اس ناز و انداز سے لگ کر کوئی بیٹھی ہے آنکھ — کیوں نہ ہو سوئے قضا منہ وقت دم تحریر کا

سرخ چشم اتنی کہیں ہوتی ہے میخواری سے — لہو اترا ہے تری آنکھوں میں خونخواری سے

وقت رخصت کہے تیرے اے مرے جی کے دشمن — تھام تھام آج رکھا دل کو میں کس خواری سے

بس میں آیا جو تمھارے اسے جا ہو جو کرو — کیا ستم آدمی سہتا نہیں لاچاری سے

کس نے نظروں میں خدا جانے اسے مل ڈالا — نرگس آج آنکھ اٹھاتی نہیں بیماری سے

کیا کہوں ولولۂ شوق کو تیرے میں امیر — گھر میں جاتے ہیں پرائے تو خبرداری سے

کیا عجب بال ملائک بچھیں اس جا کہ فرش — جس جگہ پاؤں رکھے صاحب مسند میرا

جنس طاعت سے کچھ اپنے تو نہیں پاس امیر — مگر احمد کا ہوں میں اور ہے احمد میرا

نواب محمد یار خاں امیر کی عظمت کا راز ان کے مربی سخن ہونے میں پوشیدہ ہے، ان کی محفل سخن میں شاعروں کا خاصہ اجتماع ہو گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی وجوہ کی بنا پر اگر ٹانڈے کی محفل برہم نہ ہوتی تو اس دیار میں اردو شاعری کو غیر معمولی فروغ ہوتا، محمد قیام الدین قائم، غلام ہمدانی مصحفی، حکیم کبیر سنبھلی، سید برہان علی شاہ پروانہ، نعیم اللہ خاں نعیم، فدوی لاہوری ٹانڈے میں مقیم ہوئے، اور نواب صاحب نے ان کی قدر و منزلت کی، قائم و مصحفی جب ٹانڈے آئے تو ان کی شہرت ہمرکاب آئی، یہ دونوں مشہور شاعر تعارف سے مستغنی ہیں، حکیم کبیر، پروانہ، نعیم اور فدوی لاہوری کا مختصر تعارف یہ ہے۔

حکیم کبیر سنبھلی ایک ذی حیثیت شاعر تھے، وہ نواب رو ہیلہ کے پرانے نگوار اور نواب محمد یار خاں امیر کے رفیق تھے، ان ہی کی ترغیب پر امیر نے شعر گوئی شروع کی تھی، ان کے دیوان کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے، مصحفی نے ان کے متعلق لکھا ہے[۱]

"حکیم کبیر سنبھلی شیخ انصاری بودہ و کبیر تخلص می گذاشت۔ فقیر ایشاں را در سرکار نواب محمد یار خاں امیر مرحوم کہ ذکر ایشان گذشت دیدہ بود بسیار بخوبی پیش آمدہ بسبب تمادی ایام یک شعر از ایشان بخاطر است

ایک ہی یار سے جی ناک میں آیا ہے کبیر — زیست معلوم اگر ایسے ہی دو چار ملے

سید پروان علی شاہ پروانہ مراد آبادی، قائم کے توسل سے نواب محمد یار خاں امیر کی بزم سخن میں داخل ہوئے، قلندر وضع اور صاحب کشف تھے، ان کے متعلق گلشن ہند میں ہے[۲]:

"دریں زمانہ کہ عہد عالم شاہ است شنیدہ شد ترک دنیاداری کردہ لباس فقر پوشیدہ"

مصحفی لکھتے ہیں[۳]:

"جوان شوریدہ سر و قلندر وضع بود بنگ و شراب و شدت نیز و کیسب و شغل نفی و اثبات وغیرہ نیز راہے داشت گاہ گاہے از و کشف کہ اہل کمال را باشد مشاہدہ کردم۔ معرفت محمد قائم در سرکار محمد یار خاں کہ ذکر ایشاں گذشت او ہم در سلسلۂ شعرا جا داشت و چیزے کہ موزوں می کرد از نظر ایشاں می گذرانید"

ان کے شعر مندرجۂ ذیل ہیں:-

تیغ ثابت نہ رہی دل نہ کوئی جان درست — اسکی مژگاں نے کیے چھر یہ پیکان درست

ہمت حضرت قائم سے اگر ہو امداد — چند ایام میں کر لیجئے دیوان درست

الفت جو کی ہو تم نے تو میاں اسکا مزا دو — یہ دل جو لے گئے ہو مرا میرے ہاتھ دو

اپنا تو دل زمانہ سے اب اتنا تنگ ہے — جو دم ہے زندگی کا سو شیشہ پہ سنگ ہے

---

[۱] تذکرہ ہندی ص ۱۹۰، [۲] گلشن ہند ص ۹۹، مطبوعہ انجمن ترقی اردو دکن [۳] تذکرہ ہندی ص ۴۵

نعیم اللہ خاں نعیم شاگرد شاہ حاتم، نواب محمد یار خاں امیر کی سرکار میں ایک جوان العمر اور پرگو شاعر تھے، انھوں نے ایک ضخیم دیوان بھی مرتب کیا تھا، ان کے متعلق مصحفی نے لکھا ہے[1]:

"فقیر او را در آنولہ دیدہ بود کہ بعد چندے در سرکار نواب محمد یار خاں نوکر شد چوں ملازمت نواب مؤلف ہم در آں نزدیکی کرد و قصیدۂ مدح بگوش حضار رسانیدہ داخل صحبت کیمیا خاصیت شد لہذا اکثر اتفاق ملاقات می افتاد"

نعیم ٹانڈہ کی محفل اجڑ جانے کے بعد موضع اتر چھینڈی (آنولہ) چلے گئے، جہاں مرض استسقاء میں مبتلا ہو کر وفات پائی، ان کے اشعار یہ ہیں:

آفت کی نشانی ہی رہے ہم تو زمیں پر	جو سنگِ بلا چرخ سے آیا سو ہمیں پر
گر تجھے منظور تھا غیروں سے ہونا آشنا	پھر عبث تو کیوں ہوا ظالم ہمارا آشنا
تیری خاطر کیلئے سنتا ہوں اے بیگانہ وضع	سب مرے دشمن ہیں کیا بیگانہ کیا آشنا
کوچۂ یار سے دل ہم سے اٹھایا نہ گیا	مل گیا خاک میں اس طرح کہ پایا نہ گیا
شتابی عبث تو نے کی جانِ مضطر	ابھی تو ہمیں آرزو تھی کسو کی

فدوی لاہوری شاگرد صابر علی شاہ صابر، اردو شاعری کی تاریخ میں جانی پہچانی شخصیت ہیں، سودا کے ایک ہجو میں ان کی تضحیک کی ہے، وہ سودا سے مباحثہ و مجادلہ کے لیے فرخ آباد بھی پہنچے تھے، میر حسن نے لکھا ہے[2]:

"مردے بود خود غلط برائے مباحثہ و مجادلہ بہ فرخ آباد پیش مرزا رفیع سلمہ اللہ آمدہ ہنگامہ برپا نمود بعد از ذلت بسیار بہ وطن خود برگشت"۔

مصحفی رقمطراز ہیں[3]:

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۲۵۹ [2] تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۹۰ [3] تذکرہ ہندی ص ۱۶۷

"الحاصل چوں ازاں طرف آوارہ شدہ بہ ملک ہندوستان رسیدہ و حوالہ شاعری در دماغش جا داشت وزیادہ از مرتبۂ شاعری قدم در راہ امرد پرستی می گزاشت چند جا نازجنگی ہم کردہ و بہ کودکان حسین عشق ورزیدہ اکثر اعضایش دیدم کہ مجروح بودند۔"

اس کے بعد مصحفی ان کے آنولہ پہنچنے کے متعلق لکھتے ہیں[1]:

در ایامیکہ از شاہ جہان آباد در لکھنؤ آمد دراں روز ہا فقیر در آنولہ بود کہ شورش او بسمع رسید آخر روزے بجائے دیدنش رفتم او باش چند گرد او نشستہ دیدم صحبت شعر میاں آمد۔"

آنولہ میں فدوی کی رسائی نواب محمد یار خاں امیر کے دربار میں ہو گئی لیکن جلد ہی برخاست بھی ہو گئے، مصحفی نے لکھا ہے[2]:

"بعد چند روزے شنیدم کہ بہ سرکار نواب محمد یار خاں کہ ذکر ایشاں گزشت نوکر شد ہرگاہ بعد دو سہ ماہ میاں محمد قائم وغیرہ و فقیر ہم باریاب مجلس ایشاں شدند بسبب برہم زدگی مزاج نواب کہ بیان آں موجب تطویل است برخاستہ رفت۔"

مصحفی نے لکھا ہے کہ ان کی عمر پچاس سے زیادہ تھی، اور وہ مرادآباد میں فوت ہوئے، انکی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مصحفی نے لکھا ہے[3]:

"در گفتن قطعہ طویل در ہر غزل ید طولیٰ داشت و نازش شاعری او اکثر بر ہمیں بود۔"

ان کے چند شعر مندرجۂ ذیل ہیں:

ٹلتے ہیں کوئی ہاتھ چلے یا زباں چلے	ہم وا خوندہ ساتھ ہیں جب تک جہاں چلے
کیا ہمسری ہو تیر کی اس تیر آہ سے	یہ ہی ہو تیر ایک کہ سدا بے کماں چلے
سر پر تو دو کے نقش ہماری کو تا مزار	ہر ایک قدم پہ روتے ہوئے خوشتر ان چلے

[1] تا [3] تذکرہ ہندی ص ۱۶۶

لائے سنے سرِ دوھر کے کس اخلاص ہیں | بس آنکھ اوجھل ہوتے ہی لے ٹستان چلے
یاروں نے اپنا داہ لی قدر کی ہیں رہے | وہ چیز اب کہاں ہو کر پوچھے کہاں چلے

نواب محمد یار خاں امیر کی محفل سخن میں، بروایت مصحفی، ایک بذل گو میاں عشرت بھی ملازم تھے، جن کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں،

مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے نواب محمد یار خاں امیر کے سلسلے میں لکھا ہے، [1]

"نواب محمد یار خاں امیر بھی شعرا کی قدر دانی میں اپنے ہمعصر امرا سے کم نہ تھے......

شاہ حاتم کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب موصوف ان کی قدر دانی بھی کرتے تھے۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

ممتاز کیوں نہ ہووے وہ اپنے ہمسروں میں | حاتم کا قدرداں اب نواب امیر خاں ہے

لیکن ہماری رائے میں حاتم نے اپنے شعر میں عمدۃ الملک نواب امیر خاں انجام کی مدح کی ہو جو قائم چاند پوری کی اطلاع کے مطابق محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں ہفت ہزاری منصب پر فائز تھے اور بعد کو الہ آباد کے صوبیدار مقرر ہوئے [2]، ڈاکٹر ابو رام سکسینہ نے لکھا ہے کہ شاہ حاتم تھوڑے عرصے تک نواب امیر خاں صوبہ الہ آباد کی رفاقت میں رہے [3]، اس لیے شاہ حاتم کا نواب محمد یار خاں امیر کی رفاقت میں رہنا ثابت نہیں ہوتا مصحفی نے بھی شاہ حاتم کے متعلق کہیں نہیں لکھا ہے کہ وہ ٹانڈہ میں نواب محمد یار خاں امیر کی سرکار سے منسلک رہے، اس لیے جن شعراء کا ذکر ہم نے گذشتہ سطور میں کیا ہے وہی ٹانڈہ میں مقیم ہوئے اور نواب محمد یار خاں امیر کی محفل سخن میں باریاب بھی،

نواب محمد یار خاں امیر کی محفل سخن ۱۱۸۵ھ میں درہم برہم ہوگئی کیونکہ امیر الامرا نواب نجیب الدولہ کے لڑکے نواب ضابطہ خاں کو شاہ عالم اور مرہٹوں کی فوج کے مقابلے میں بمقام سکرتال شکست ہوئی،

---

[1] شعر الہند ج ۲ ص ۲۲۴۔ [2] مخزن نکات ص ۲۱۳ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۲۹ء۔ [3] تاریخ ادب اردو ص ۱۰۳

اور یہ خبر اڑ گئی کہ مرہٹے روہیلکھنڈ میں بھی داخل ہونے والے ہیں، مرہٹوں کی تاراجی مشہور تھی، اسلیے حفظ ماتقدم کے لیے آنولہ اور بریلی کے عوام وخواص پہاڑ کے دامن میں چلے گئے، اس افراتفری میں ٹانڈے کی محفل سخن بھی اجڑ گئی، نہ ان کے سخن سنج رہے نہ ان کے مربی ؎

اے مصحفی میں رووں کیا پچھلی صحبتوں کو — بن بن کے کھیل ایسے اکثر بگڑ چکے ہیں

روہیلکھنڈ کی ادبی زندگی کا یہ سانحہ عظیم تھا، روہیلوں کی حکومت مرہٹوں کی یورش کے بعد مزید دو سال قائم رہی لیکن واقعہ یہ ہے کہ نواب محمد یار خاں امیر کی محفل ادب اجڑنے کے بعد اس دیار میں شعر وشاعری کی چہل پہل ختم سی ہو گئی، مصحفی نے ٹھیک چالیس سال کے بعد لکھا:

"واللہ کہ یاد آں صحبت گذشتہ داغ ناکامی بردل درد مندمی گذارد"

متذکرہ بالا سطور میں سخن پرور امراء کا ذکر اور ان شعراء کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے جو انکی سرکار میں ملازم تھے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس وقت شاعری صرف امیروں کے دربار تک محدود تھی، آنولہ اور بریلی روہیلکھنڈ کے صدر مقام تھے، اور اطراف وجوانب کے دوسرے شعراء بھی فکر معاش یا داد سخن کی خاطر ترک سکونت کرکے ان دونوں مقامات میں آ گئے تھے، ان شعراء کا ذکر کیے بغیر روہیلکھنڈ کی دور قدیم کی ادبی زندگی کا جائزہ نامکمل رہے گا، اس لیے ایسے چند شاعروں کے حالات اور ان کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

عشقی مراد آبادی۔ مصحفی نے انھیں آنولہ میں دیکھا تھا، وہ لکھتے ہیں[۱]:

"فقیر او را در آنولہ دیدہ بود شعرے از و بخاطر است" ؎

کوئی تو ہے گچھ کوئی سرو رواں ہے — دیکھا تو یہاں ایک سے ایک آفت جاں ہے

عظیم۔ یہ بھی آنولہ میں مقیم تھے، ان کے متعلق مصحفی نے لکھا ہے[۲]:

"جوانے بود سپاہی پیشہ یک غزل خود در آنولہ پیش فقیر خواندہ بود، سہ شعر از و انتخاب افتاد و نیست"

کارواں اشک کا ہوتا ہے رواں آنکھوں سے — تم کو بھی آہ دفغاں ہم یہ خبر کرتے ہیں

---

[۱] تذکرہ ہندی ص ۱۵۲ [۲] ایضاً

کوئی اگر تم میں سے چلتا ہو تو آجائے شتاب
ورنہ اب یار تو کوئی دم میں سفر کرتے ہیں

کچھ نگہ میں نہیں آتا ہے بجز جلوۂ یار
جب کہ ہم دل میں عظیم اپنے نظر کرتے ہیں

قدرت۔ ان کے متعلق مصحفی نے لکھا ہے[۱]:

"مولوی قدرت اللہ قدرت مؤلف تذکرۂ ہندی گویان کہ بالفعل در رامپور استقامت دارد فقیر او را در ایامیکہ بہ رفاقت نواب محمد یار خاں عز و امتیاز داشت پیش محمد قائم روزے دیدہ بود از دست ـ"

لاکھوں جلا دیے مردۂ صد سالہ آن میں
فیض دم مسیح ہے اس کی زبان میں

نکلی تھی رات دل سے مرے بید ریغ آہ
ہنگامہ ایک پڑ گیا ہفت آسمان میں

انصاف بھی ضرور ہے یہ ظلم تا کجا
لاکھوں کے گھر تو جاتے رہے امتحان میں

مراد علی حیرت مراد آبادی۔ فن شعر میں شہرت یافتہ تھے، میر حسن نے لکھا ہو کہ طبع رسا رکھتے تھے، آنولہ میں ان کا بھی قیام رہا، مصحفی نے ان کے متعلق لکھا ہے[۲]:

"فقیر او را در آوان آبادی کٹھیر روزے در آنولہ دیدہ بود، شعر را بہ پاکیزگی می گفت۔ درہماں ایام شنیدم کہ بطرف کوہ برائے کارے حسب ایمائے رئیسے رفتہ بود کہ آفتاب زندگیش درہماں کوہ بغروب نہادہ۔"

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

سمجھ کے دیکھا تو بیجا ہے سب گلہ دل کا
کہ چشم تر نے ڈبویا معاملہ دل کا

یہ اشک آہ ہے شور جنوں ہے وحشت ہے
عجب جلوس سے جاتا ہے قافلہ دل کا

کہاں ہے شیشہ نے محتسب خدا سے ڈر
مری بغل میں چھلکتا ہے آبلہ دل کا

کیا قافلے یاروں کے آگے کہیں ٹھہرے ہیں
آواز جرس کم ہے یا کچھ ہمیں بہرے ہیں

ہندو امرا میں دیوان امرائے کے فرزند بلاس رائے رنگین ایک معروف شاعر تھے، میر حسن نے انکے متعلق لکھا ہے[۳]:

۱؎ تذکرہ ہندی ص ۶۵، ۲؎ ایضاً ص ۹۱، ۳؎ تذکرہ شعرائے اردو ص ۷۹

"لالہ ہلاس رائے المتخلص بہ رنگین خلف راجہ مان رائے دیوان مدارالمہام پسر محمد علی روہیلہ است طبع موزونے دارد، ہرجاکہ باشد سلامت باشد۔ از دست

اس مصیبت سے جو تو گھر سے نکالے ہی مجھے   یہ تو بتلا میں چلا جاؤں کدھر آخر شب

نواب حافظ رحمت خاں کی اولاد میں نواب اللہ یار خاں اور نواب مستجاب خاں بھی کافی مشہور ہوئے نواب اللہ یار خاں (۱۷۵۱ء تا ۱۸۳۲ء) بھی ادب پرور رئیس تھے، ان کی شاعری کا کوئی نمونہ تو دستیاب نہیں ہو سکا البتہ ان کی ایک پشتو اردو لغت مسمی عجائب اللغات نظر سے گذری جس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے، نواب مستجاب خاں (۱۷۵۸ء تا ۱۸۲۳ء) عربی، فارسی اور پشتو زبان کے ماہر اور اپنے وقت کے بہت بڑے ادیب تھے۔[۱] انھوں نے اپنے والد کے حالات میں ایک کتاب فارسی میں لکھی جس کا نام گلستان رحمت ہے، روہیلوں کی تاریخی کتب میں گلستان رحمت سب سے زیادہ اہم ہے، یہ بیش بہا کتاب کیا باعتبار صحت واقعات اور کیا باعتبار زبان فن انشاء پردازی کا بہترین نمونہ ہے، نواب مستجاب خاں نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف روہیلوں کے نامور سردار بلکہ ایک پوری قوم کو زندہ جاوید کر دیا۔[۲] نواب صاحب کی شاعری کا علم نہیں ہو سکا،

نواب شجاع الدولہ اور نواب حافظ رحمت خاں کی فوجوں کے درمیان ۲۳ر اپریل ۱۷۷۴ء کو لڑائی ہوئی جس میں روہیلوں کو شکست ہوئی اور ان کا آفتاب اقبال غروب ہو گیا، جنگ سکرتال کے بعد اگرچہ نواب محمد یار خاں امیر کی محفل سخن اجڑ گئی تھی لیکن شمع امید بالکل نہیں بجھی تھی، مگر جنگ روہیلہ کے بعد شاعری کا چراغ بالکل بجھ گیا، نہ شعراء رہے نہ شعراء نواز، دربار ختم ہو گئے، اور ان کے ساتھ شعراء کی سرپرستی کی روایت بھی، نواب محبت خاں محبت نے لکھنؤ میں محفل سخن جمائی، وہ چراغ جو بریلی میں روشن تھا، اس کی تنویر سے لکھنؤ جگمگا یا، نواب محمد یار خاں امیر اور محمد قیام الدین قائم

[۱] حیات حافظ رحمت خاں از الطاف علی ص ۲۴۹ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں [۲] ایضاً

رامپور چلے گئے، اور وہیں فوت ہوئے، مصحفی لکھنؤ پہنچے، مولوی قدرت اللہ قدرت نے بھی رامپور میں سکونت اختیار کی۔ دراصل رامپور نے جنگ روہیلہ کے بعد شعراء کی بڑی سرپرستی کی اور سابقہ روایات کو قائم رکھا، اس وقت بریلی کے بہت سے شاعر رامپور پہنچے اور خلعت کامیاب ہوئے، بدقسمتی سے ان کے حالات اور ان کے شعری اکتساب پر ہنوز گرد گمنامی جمی ہوئی ہے، تاریخ ادب میں رامپور کی خدمات کا ذکر ۱۸۵۷ء کے بعد سے کیا جاتا ہے، حالانکہ وہاں شعراء کا اجتماع ۱۷۷۴ء کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا، اور امرائے ان کی سرپرستی بھی کی تھی، شعرائے بریلی میں میر غلام علی عشرت، شاگرد مرزا علی لطف، ایک غزلگو، مثنوی نگار، داستان نویس اور صاحب علم و فن شاعر تھے، نواب فیض اللہ خاں کے داماد نواب محمد عثمان خاں نے انکی سرپرستی کی، عشرت بہت مشہور شاعر تھے، اور رامپور سے ان کا قریبی تعلق رہا، اصل میں روہیلکھنڈ کی نوابی ختم ہونے کے بعد رامپور نے شعر و سخن کی ابتدا ہی سے سرپرستی کی، اور اس باب میں انکی خدمات مفصل تحقیقی مطالعے کی متقاضی ہیں،

۱۷۷۴ء کے بعد بریلی میں شعر و سخن کی جو بنیاد پڑی وہ قدرۃً دربارداری سے مستغنی تھی، نواب حافظ رحمت خاں کے صاحبزادگان، دو ایک کو چھوڑ کر بریلی ہی میں رہے، وہ سب صاحب علم و فن تھے، ان میں نواب اللہ یار خاں اور نواب مستجاب خاں کا ذکر ہم گذشتہ سطور میں کر چکے ہیں، حافظ الملک کے پوتوں میں نواب سعادت یار خاں صاحب، عبدالعزیز خاں عزیز، نیاز احمد خاں ہوش، نواب ظفریاب خاں زخمی، نواب حیدر حسین خاں حیدر، اور نواب بہادر خاں معروف مشہور شاعر گزرے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ ریاست کے ختم ہونے کے بعد بھی نوابین روہیلہ دل و جان سے اردو شاعری کی خدمت کرتے رہے، اور ہم نے اپنی تحقیق کی روشنی میں ایسا محسوس کیا کہ نواب نیاز احمد خاں ہوش کے انتقال (۱۹۴۲ء) تک بریلی کا شعری ماحول ان کے قبضے میں رہا، اس وقت بریلی کے دیگر اساتذہ بھی کسی نہ کسی طرح ان کی تربیت سے سرفراز ہوئے، البتہ بیسویں صدی میں خاندان روہیلہ میں کوئی قابل ذکر شاعر پیدا نہیں ہوا اور انکی روایات شاعری افسوس ہے صدی کے آخر میں ختم ہو گئیں

ادبیات

عالمِ حضوری میں

از جناب پروفیسر نکہت شاہجہاں پوری صدر شعبۂ فارسی و اردو جی ایف کالج شاہجہاں پور

عالم آرا و دل آرا پہ درود اور سلام — اپنی اس جانِ تمنا پہ درود اور سلام
ظلمتِ دہر ہوئی کس کی ضیا سے روشن — ہمہ تن برقِ تجلا پہ درود اور سلام
ساقیِ میکدۂ معرفتِ اہلِ نظر — حاملِ ساغر و صہبا پہ درود اور سلام
شافعِ محشر و محبوبِ خدائے دو جہاں — سرورِ عالمِ بالا پہ درود اور سلام
کس نے توحید کو پھر زندگیِ نو بخشی — جانِ موسیٰ و مسیحا پہ درود اور سلام
رہبرِ خلقِ جہاں بانیِ اصلاحِ امم — شرفِ رتبۂ والا پہ درود اور سلام
جسدِ خاکی و انوارِ خدا کا مظہر! — سر بسر روحِ مصفا پہ درود اور سلام
فاتحِ قلب و نظر، نازِ عرب، فخرِ عجم — رشکِ صد قیصر و دارا پہ درود اور سلام
بزم میں رزم میں اور زیست کے ہر شعبہ میں — صاحبِ سیرتِ اعلیٰ پہ درود اور سلام
وارثِ نورِ محمدؐ، شرفِ بزمِ وجود — اہلبیتِ شہِ والا پہ درود اور سلام
مطلعِ نور ہے یا صبحِ سعادت کا طلوع — جلوۂ گنبدِ خضرا پہ درود اور سلام

خاکِ پا نکہتِ مشتاق نے ہے پھر گرمِ حضور
میرے آقا مرے مولا پہ درود اور سلام

غزل

از جناب سید علی جواد صاحب زیدی

یہ وہم ہے کہ جنوں ہو، یہ لاگ ہو کہ لگن — کسی کا ذکر بھی آیا تو بڑھ گئی الجھن

یہ تجربوں نے بتایا کسی کا دوست نہ بن — مگر وہ زلفِ پریشانِ یار وہ صبحِ وطن؟

قیودِ فن میں کہاں گھر سکے گی روحِ سخن — کہ عشق ہی کوئی فن ہے نہ زندگی کوئی فن

وفائے یار کو اے دل کہیں نظر نہ لگے — بہت ہی چست ہے اس جسم پہ یہ پیراہن

جو دشمنی میں پلے تھے وہ ہیں رفیقِ سفر — جو دوست بننے چلے تھے وہ بن گئے دشمن

خیال و خواب مگر سو حقیقتیں قرباں! — وہ میری کانپتی پلکیں، وہ گوشۂ دامن

وہ تیرے جلوۂ اول کی یاد کا عالم — گلاب جیسے کھلے ہوں کہیں چمن بہ چمن

جفائے دوستاں میں شانِ کرم بھی شامل ہے — خدا نہ کردہ کوئی اور کیوں بنے دشمن

جلا دیے ہیں سرِ شام آنسوؤں نے چراغ — خیالِ یار کی ہر رہگزار ہے روشن

فریبِ فکر تھی دستِ طلب کی کوتاہی — غرورِ ناز میں اس نے بچا لیا دامن

وہ تیری آنکھ کا جادو، وہ چھاؤں مژگاں کی — کماں بدوش کمیں گاہ میں چھپا دشمن

وہ آندھیوں میں گھری غم کی زندگی اپنی — وہ خوشبوؤں میں بسی تیری رہگزر کی پون

یہ کس دیار میں لائی ہے زندگی زیدی
نہ دوستی کا سلیقہ، نہ دلبری کا چلن

غزل

از جناب جوہر ٹونکی

کونین کی ہر شے ہمہ تن ساز بنی ہے — اب قلب کی دھڑکن تری آواز بنی ہے

قربان ترے اے مرحمتِ حسنِ تصور کیا خلوتِ غم جلوہ گہ ناز بنی ہے

محور تھی ہر دم جو نظر مرکزِ دل کی اب وہ بھی نگاہِ غلط انداز بنی ہے

جرأت تھی کسے عرضِ تمنا کی کسی سے وارفتگیٔ شوق سخن ساز بنی ہے

کم کنجِ قفس سے نہیں صیاد گلشن اک جرم جہاں جرأتِ پرواز بنی ہے

کیا تجھکو ہوا ہے مری خاموش نگاہی

کیوں راز غمِ عشق کی غماز بنی ہے

حسنِ تغزل

از ڈاکٹر ماتا پرشاد استھانہ زیب کیلوی

میرے نغموں کے لیے وہ ساز ہو دل کی دھڑکن سے ہم آواز ہو

پہلے پیدا دل میں سوز و ساز ہو پھر نگاہوں سے نیاز و ناز ہو

کیوں جنوں میں انکشافِ راز ہو کیوں شکستِ دل کی پھر آواز ہو

کم سے کم اتنا تو غم سے ساز ہو دل کی بربادی پہ دل کو ناز ہو

ختم ارمانوں کا کیسے ہو ہجوم جب نگاہ دوست ارماں ساز ہو

بال و پر کی پرورش ہو جائیگی پہلے پیدا جرأتِ پرواز ہو

احترامِ چشمِ ساقی فرض ہے میکدے کا در تو لیکن باز ہو

لطف تو جب ہے کہ پیغامِ نظر

دل کے ہر پردے سے ہم آواز ہو

مطبوعات جدیدہ

پاکستانی کلچر - از جمیل صاحب جالبی، صفحات ۲۴۴، کتابت وطباعت اعلیٰ، مع گرد پوش، ناشر مشتاق بک ڈپو، نزد اردو کالج شیلڈن روڈ، کراچی ملا

پاکستان کے وجود میں آتے ہی اس کے مشترک کلچر کا مسئلہ سامنے آیا یعنی اس کا کلچر کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے، بدقسمتی سے پاکستان کے دو حصے ہیں، اور دونوں حصوں میں کسی مشترک کلچر کی تلاش از حد ضروری ہے، پاکستان کے تمام سوچنے والوں نے اس مسئلہ پر اپنی اپنی رائے دی ہے اور اس موضوع پر اردو اور انگریزی میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان ہی میں یہ کتاب بھی ہے چند الحاد پسندوں کو چھوڑ کر تقریباً ہر خیال وطبقہ کے اہل علم اس پر متفق ہیں کہ پاکستان میں مذہب کے علاوہ کوئی دوسری چیز مشترکہ کلچر نہیں بن سکتی۔ ....

...... البتہ مذہب کی تعبیر میں بڑا اختلاف ہے، یہ اختلاف بھی دو نقطے پر سمٹ جاتے ہیں، ایک گروہ یہ کہتا ہے مذہب یعنی کتاب وسنت کی بنیادی تعلیمات اور اساسی قدریں جو دائمی اصول کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کو مشترکہ اصول مسلمہ تسلیم کرلینا چاہیے، دوسرا گروہ قرآن کو اپنی من مانی تاویلات کے ذریعہ مشترکہ کلچر کی اساس قرار دیتا ہے۔

مصنف نے ان تمام گروہوں اور ایک صدی کے ممتاز علماء کے خیالات کا جائزہ لیا ہے اور دکھایا ہے کہ مذہب کی کوئی ایسی تشریح سامنے نہیں آسکی ہے جو پاکستان کلچر کی اساس بن سکے مصنف کا بظاہر رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مادیت اور روحانیت کے امتزاج کو پاکستان

مشترک کلچر بنانے کے خواہشمند ہیں، اگر مذہب کی موجودہ شکل میں یہ امتزاج انھیں کم ہی نظر آتا ہے۔ پھر اس کی عملی تشکیل کی صورتیں انکے ذہن میں واضح نہیں ہیں، مصنف کے تمام خیالات سے اتفاق کرنا مشکل ہے بھی۔ اس میں اختلاف بھی ضروری ہے، اس مختصر تبصرہ میں اس کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اس موضوع پر جس وسعت نظری سے انھوں نے غور کیا ہے، اور ان عوامل کا جائزہ لیا ہے جو دنیا میں نئی تبدیلی لا رہے ہیں وہ قابل غور ضرور ہیں، اس کتاب سے اس موضوع پر سوچنے کا ایک دروازہ کھلتا ہے۔

شہریت کی ابتدائی تعلیم - از مولانا سید ابراہیم عمادی ندوی، صفحات ۱۰۰، کتابت و طباعت بہتر، پتہ: عثمانیہ کتب خانہ، پوسٹ بکس نمبر ۳۱۲۹، محمد علی بلڈنگ بمبئی ۳۔

ہندوستان کے اہم مسائل میں ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ بچوں اور نوجوانوں میں ایک اچھے شہری بننے کا احساس کیسے پیدا کیا جائے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب شہریت کا احساس بچپن ہی سے ان میں پیدا کیا جائے، اور شہری تعلیم کا بھی ایک اہم جز قرار دیا جائے، اس وقت آرٹ اور کلا کے نام سے جنسی اور ذہنی انارکی پیدا کرنے والے پروگرام جو چلائے جا رہے ہیں، اگر ان کے بجائے ان میں مذہبی اور اخلاقی چیزوں کا احساس پیدا کر ان کو شہری تہذیب سے سنوارا جائے تو امید ہے کہ تھوڑے دنوں میں اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے، جیسا کہ سری پرکاش رپورٹ میں اظہار کیا گیا ہے۔

مولانا ابراہیم صاحب نے جو اس سے پہلے اس موضوع پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں، اس کتاب کے ذریعہ اس کمی کو بدرجہ اتم پورا کیا ہے، یہ کتاب یوں تو تمام بچوں کے لیے مفید ہے، مگر خاص طور پر مسلمان بچوں کے لیے تو بے حد مفید ہے، امید ہے کہ بہت سے اسکولوں میں داخل نصاب کر لی جائیگی۔

خلافت بنی امیہ - از مولانا سید رشید الوحیدی صاحب صفحات ۱۳۶، کتابت و طباعت بہترین، ناشر قومی کتاب گھر، دیوبند۔

اس سے پہلے اس موضوع کی دو کتابیں رسول عربی اور خلافت راشدہ چھپ چکی ہیں، یہ تیسری کتاب ہے، جو اسکول کے بچوں کے لیے سلیس زبان میں لکھی گئی ہے، اس کتاب میں اختصار کے ساتھ بنو امیہ کے ۱۴ خلفاء کے حالات اور کارنامے بیان کیے گئے ہیں، کتاب کا انداز بیان سلیس اور دلکش ہے۔ امید ہے کہ کتاب مقبول ہوگی۔

اجماع اور باب اجتہاد۔ از کمال فاروقی صاحب، صفحات ۴۴، ٹائپ عمدہ، ناشر مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی، حیدر علی روڈ، کراچی

اسلامی شریعت کے چار مآخذ میں ایک اہم ماخذ اجماع بھی ہے، پاکستان میں اسلامی دستور کی تحریک نے جب سے زور پکڑا ہے، یہاں کے بہت سے سنجیدہ اہل علم نے اسلامی فقہ اور اس کی وسعت کے ذرائع پر غور کرنا شروع کر دیا ہے، اس غور و فکر کے نتیجہ میں کمال فاروقی صاحب نے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سے مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ کی موجودگی میں اجماع کے بارے میں دس سوالات کیے تھے، مفتی صاحب نے بڑے اختصار مگر جامعیت کے ساتھ ان سوالات کا جواب دیا، یہ سوالات ۱۹۵۳ء میں کیے گئے تھے، اور اسی وقت یہ شائع بھی ہو گئے تھے، اب اسے دوسری بار کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔

کمال فاروقی صاحب نے جو سوالات کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ پر خود بھی غور کیا ہے، یہ سوالات اور ان کے جوابات اس قابل ہیں کہ ان کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کیا جائے، البتہ مفتی صاحب کے جوابات کے بعد پھر کمال فاروقی صاحب نے ایک جوابی مکتوب اور نتائج فکر کے نام سے دو اور ضمیمے کا اضافہ کیا ہے، مصنف کو اجماع کے سلسلہ میں سب سے زیادہ خلش اس بات کی تھی کہ اس سے امت کے معصوم عن الخطا ہونے کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے، مفتی صاحب نے بھی اس کا جواب دیا ہے اور خود مصنف نے بھی اس کی توجیہ کی ہے، ہمیں مصنف کے اس خیال سے پورا اتفاق ہے کہ علم اور

راست کرداری میں کوئی لزوم نہیں ہے، مگر راست کرداری پیدا کرنے کا موثر ذریعہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہے، اس لیے علم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، مصنف کے اس جملہ کا مطلب واضح نہیں ہوتا کہ "حنفی فقہ کے چار فقہی ماخذ یا اصولوں (یعنی قرآن وسنت، قیاس اور اجماع) میں قرآن کو چھوڑ کر صرف اجماع ایک ایسی اصل ہے جو زمانی حیثیت سے کسی دوسرے اصول کی امداد کی محتاج نہیں"۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ماخذ محض حنفی فقہ کے ماخذ نہیں ہیں بلکہ اسلامی شریعت کے ماخذ ہیں، دوسری بات یہ کہ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ اجماع مجرد کوئی ماخذ ہے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کی پشت پر کتاب وسنت، صریح یا غیر صریح دلائل ہوتے ہیں، اور پھر اجماع روح شریعت ہی کا محتاج نہیں ہے، بلکہ بذات خود ایک اجتماعی اجتہاد کا دوسرا نام ہے، مصنف نے بعض جگہ امت کے تواتر عملی کو اجماع سمجھ لیا ہے۔ اس لیے ان کے ذہن میں کچھ مزید سوالات پیدا ہوگئے ہیں، چند قابل بحث باتوں کے باوجود کمال فاروقی صاحب کی یہ کوشش لائق تحسین اور تحقیق و توازن کی حامل ہے،

تنقیدی نقوش۔ از ڈاکٹر عبد القیوم، صفحات ۱۹۲ کتابت وطباعت عمدہ، ناشر مشتاق بک ڈپو، شیلڈن روڈ کراچی ۱

ادھر پچیس تیس برس کے اندر انگریزی ادب کے اثر سے اردو میں تنقید پر درجنوں کتابیں اور بے شمار مضامین نکلے ہیں، مگر اس ذخیرہ میں بہت تھوڑا حصہ ایسا ہے جس میں تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے، ورنہ زیادہ تر حصہ انگریزی ادب کی تقلید یا پھر اشتراکی ادب کی شعبدہ بازی کی نذر ہوگیا ہے، کچھ لوگوں نے ادب کو دماغ تک محدود رکھا، اور کچھ لوگوں نے پیٹ کا غلام بنا دیا، احتشام حسین اور آل احمد سرور وغیرہ نے اس میں کچھ توازن قائم کرنے کی ضرور کوشش کی، مگر ان کی ترقی پسندی نے ان کے توازن کو کہیں کہیں مجروح کر دیا ہے، تنقیدی نقوش

بھی اس سلسلہ کی ایک نئی اور متوازن پیش کش ہے، اس میں ۱۲ تنقیدی مضامین ہیں، اور اسکے مرتب ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب نے ان تمام مضامین پر توازن کے ساتھ تنقید کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے، خاص طور پر سرسید کا اثر عہد جدید کے مسلمانوں پر، اور حالی بحیثیت سوانح نگار، اور حالی کا تنقیدی شعور وغیرہ بہترین مضامین ہیں، البتہ شبلی کے بارے ان کا مطالعہ زیادہ وسیع نہیں ہے، اس لیے وہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے ہیں، سوانح نگار کی حیثیت سے شبلی کا جو مرتبہ ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ سرسید کے اس دیباچہ سے ہوتا ہے، جو انھوں نے سیرۃ النعمان پر لکھا ہے، حیات جاوید کی طوالت کے لیے جو توجیہات انھوں نے پیش کی ہیں وہ حیات شبلی کے لیے بھی کیوں نہ پیش کی جائیں، کلیم الدین نے نیاز فتحپوری کو تنقید نگاروں کی فہرست سے خارج کرکے انتہا پسندی کا نہیں بلکہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے، نیاز کی مذہبی تحریریں ہوں یا رومانٹک، ان میں وزن جذباتی کم اور تعلید زیادہ ہے، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب تنقید کے ذخیرہ میں ایک عمدہ اور متوازن اضافہ ہے، یہ مجموعہ اہل ذوق میں ذوق و شوق سے پڑھا جائیگا۔

مرقع کلامِ اقبال

- از عصمت عارف علوی، صفحات ۴۰، کتابت وطباعت اعلیٰ ناشر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ۔ قیمت عہ

علامہ اقبال کے کلام کی تشریح و تفسیر اور ان کی دینی و فلسفیانہ تلمیحات پر ایک الماری سے زیادہ لٹریچر تیار ہو چکا ہے، مرقع اقبال بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں ان کی بیس مشہور نظموں کی معنویت کو تصویروں کے ذریعہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان میں سب سے پہلی نظم ہمالہ اور آخری نظم "جاوید کے نام" کا انتخاب کیا گیا ہے، یہ مجموعہ ان لوگوں کے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث ہوگا جو آرٹ اور مصوری کے شیدائی ہیں، بہر حال یہ کوشش قابل ستایش اور لائق تحسین ہے۔

برگ نوخیز ۔ از عزیز تمنائی صفحات ۱۱۰، ٹائپ عمدہ۔ ناشر دار التصنیف، مدراس ۱۴

یورپین شاعری میں جو اصناف قبول عام حاصل کرچکی ہیں ان میں ایک سانیٹ بھی ہے، جس کا رواج پندرہویں صدی میں فرانس اور انگلستان میں ہوا، یہ چودہ مصرعوں کی ایک نظم ہوتی ہے، جو دو بندوں میں تقسیم ہوتی ہے، جس میں کوئی جذبہ ایک مسلسل خیال کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے، اردو میں ن م راشد، اختر شیرانی اور بعض دوسرے شعراء نے اس صنف میں کچھ نظمیں لکھی ہیں، مگر عزیز تمنائی نے اس صنف کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے، اور اردو زبان میں غالباً اس صنف میں یہ پہلا مجموعہ ہے جسے انھوں نے پیش کیا ہے،

عزیز تمنائی کو شاعری پر پوری قدرت بھی ہے، اور "جذب دل" سے ان کا سینہ خالی نہیں ہے، اس لیے ان کے کلام میں روانی و برجستگی کے ساتھ تاثیر و معنویت نمایاں ہے، امید کہ ان کی یہ کوشش قبول عام حاصل کرے گی، اور اردو شعراء کو اس سے شاعری کا ایک نیا میدان ہاتھ آئے گا۔

خیالات ۔ مرتبہ مولوی محمد یونس صاحب نگرامی تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۲۸ قیمت عہ

مولوی محمد یونس صاحب نگرامی ندوی نے ملک کے آٹھ ممتاز اصحاب علم و قلم مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا عبد الباری ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا حکیم محمد اسحاق سندیلوی سے مختلف اوقات میں انٹرویو لیے تھے، یہ کتابچہ اسی کا مجموعہ ہے، جو مختلف مسائل کے متعلق ان اکابر کے خیالات اور بہت سے علمی و ادبی، تعلیمی، دینی، اخلاقی اور سیاسی معلومات و فوائد پر مشتمل ہے، جس کے پڑھنے سے بصیرت حاصل ہوتی ہے، انداز بیان بھی دلچسپ ہے۔

"م۔ ع"

جلد ۹۶ - ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۵ء عدد ۳

مضامین

شذرات

رن کچھ کے معاہدے کے بعد امید بندھی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان دوسرے مسائل میں بھی مفاہمت کی راہ ہموار ہوجائیگی لیکن کشمیر میں پاکستان کی مسلح مداخلت نے ہندوستان کو مدافعت پر مجبور کردیا، اس کا لازمی نتیجہ جنگ تھی جس وقت یہ سطریں لکھی جارہی ہیں، دونوں میں گھمسان کی لڑائی برپا ہے، اس وقت سب سے زیادہ نازک پوزیشن ہندوستان کے مسلمانوں کی ہے، ان سے اکثریت کی بدگمانی دور نہیں ہوتی، فرقہ پرور جماعتیں تو ان کو علانیہ پاکستان کا ایجنٹ کہتی ہیں۔ اور جب ہندوستان اور پاکستان میں کوئی آویزش ہوتی ہے تو اس کا نزلہ مسلمانوں پر گرتا ہے، اس جنگ میں بھی اس کا اندیشہ ہے، اس لیے اس بارہ میں تھوڑی سی وضاحت کی ضرورت ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان سے جذباتی لگاؤ ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ کوئی بیرانا اور اجنبی ملک نہیں بلکہ ہندوستان ہی کا کٹا ہوا حصہ ہے، ان دونوں حصوں کے درمیان ہر قسم کے وہ تعلقات رہ چکے ہیں جو ایک ملک کے باشندوں میں ہوتے ہیں، یہ تعلقات محض سیاسی تقسیم سے دفعۃً دور نہیں ہوسکتے، خاص طور سے ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی گھر ایسا نہیں ہے جس کے افراد ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم نہ ہوں وہ ایک دوسرے سے کیسے بے تعلق ہوسکتے ہیں، یہ تعلق بالکل فطری ہے، یہی حالت مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال کے ہندوؤں کی بھی ہے، جو دو ایک پشتوں تک قائم رہے گی اور موجودہ نسلوں کے ختم ہونے کے بعد جاکر ختم ہوگی، اور پھر ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان سے اسی قدر تعلق رہ جائیگا جو دوسرے اسلامی ملکوں سے

لیکن اس جذباتی لگاؤ کو پاکستان سے مسلمانوں کے دلی تعلق اور ہندوستان سے انکی بےتعلقی پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے، اسکے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ جب ہندوستان اور پاکستان کے مقابلہ کا سوال آجائیگا تو وقت بھی وہ ہندوستان پر پاکستان کو ترجیح دینگے، پاکستان سے ان کو صرف جذباتی لگاؤ ہے اور ہندوستان تو انکا وطن ہے، ان کو یہیں جینا اور مرنا ہے، انکا سارا نفع و نقصان اسی سے وابستہ ہے، اسلیے وہ ہندوستان سے کس طرح بےتعلق ہو سکتے ہیں اور اس پر پاکستان کو کیسے ترجیح دے سکتے ہیں، ہندوستان سے متعلق ان کے وہی حقوق و فرائض ہیں جو ہندوستان کے ہر شہری کے ہیں، اور پھر ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ہندو مسلمانوں کی جنگ نہیں بلکہ دو ملکوں کی سیاسی لڑائی ہے، اور دونوں ملکوں میں ہندو مسلمان دونوں رہتے ہیں، اور ان دونوں کا یہ فرض ہے کہ ایسے حالات میں اپنے ملکوں کا ساتھ دیں، اسلیے ہندوستان کے کچھ کروڑ مسلمان بھی پوری طرح حکومت کے ساتھ ہیں، وطن کی مدافعت میں ان کا قدم کسی سے پیچھے نہیں رہے گا اور ان کو کسی قربانی سے بھی دریغ نہ ہوگا، خود واقعات اس کو ثابت کر دیں گے۔

اس وقت کسی طرح قومی اتحاد اور یکجہتی کی اہمیت فوج اور اسلحہ سے کم نہیں ہے، کسی قسم کا انتشار بھی ملک کے لیے سخت مضر ہوگا، اس لیے ایسی تمام چیزوں سے بچنے کی ضرورت ہے جو اس میں رخنہ ڈالنے والی ہیں، تاکہ ہندوستان کے کل باشندے یک دل ہو کر متحدہ قوت سے مقابلہ کر سکیں، لیکن جنگ ایسی چیز ہے جس کی تباہ کاریوں سے کوئی فریق بھی محفوظ نہیں رہ سکتا، اس لیے اس کی دعا کرنی چاہئے کہ دونوں میں مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے تاکہ دونوں ملک تباہی سے بچ جائیں، اقوام متحدہ اور ایشیا و افریقہ کے ملکوں کو ملکر اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ ہندوستان اور پاکستان چین اور مغربی قوموں کا میدان جنگ نہ بننے پائیں، ورنہ دونوں تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔

ہم نے گذشتہ مہینہ ایک معتبر راوی کی اطلاع پر لکھا تھا کہ ادارۂ آئینۂ ادب انارکلی لاہور نے سیرۃ النبیؐ کا پورا سٹ چھاپ لیا ہے، اب اس ادارے کے مالک عبدالسلام صاحب کا خط ہمارے پاس آیا ہے کہ "یہ اطلاع سراسر غلط ہے جن صاحب نے یہ اطلاع دی ہے ممکن ہے ان کو اس لیے غلط فہمی ہوئی کیونکہ ہم نے دارالمصنفین کی مطبوعہ سیرت کی عمدہ جلد بندھوا کر اور گرد پوش لگا دیا ہے، آئینۂ ادب ایسا ادارہ نہیں ہے جو اس قسم کی حرکتیں کرتا ہو۔"

ہمارے پاس جو اطلاع آئی تھی وہ اس قدر واضح تھی کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی، ہم نے اس خط کا ضروری حصہ بھی معارف میں شائع کر دیا تھا، اور اصل خط ہمارے پاس محفوظ ہے، پھر یہ اطلاع ایک ثقہ اہل قلم نے دی تھی، جو کئی کتابوں کے مصنف اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سوانح نگار اور غالباً ان کے متوسلین میں بھی ہیں، اس لیے ان کی اطلاع پر یقین کر کے ہم نے معارف میں اس کا ذکر کر دیا، اتنی فروگذاشت ضرور ہوئی کہ براہ راست آئینہ ادب والوں سے اسکی تحقیقات نہیں کی، اب اس کی تردید کے بعد ہم کو پورا یقین ہے کہ یہ اطلاع کسی غلط فہمی ہی کا نتیجہ تھی، لیکن گل رعنا اور شعر الہند کی اشاعت کی جس کو ایک دوسرے ادارے نے شائع کیا ہے، ابھی تک تردید نہیں ہوئی ہے ہم اس کی تحقیقات کر رہے ہیں۔

مقالات

مسند امام احمد بن حنبل
اور
اس کی خصوصیات

از جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

امام احمدؒ کی شخصیت بڑی جامع اور وہ مجموعۂ کمالات تھے لیکن ان کی شہرت ایک محدث اور صاحبِ مذہب امامِ فقہ کی حیثیت سے زیادہ ہے، اور گو متاخرین ان کو ایک صاحب مذہب اور امام فقہ کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں، لیکن متقدمین میں وہ محدث ہی کی حیثیت سے زیادہ معروف تھے، چنانچہ بعض قدماء نے ان کو صاحب مذہب ائمہ اور فقہاء میں شمار بھی نہیں کیا ہے، اس پر آیندہ چل کر بحث کیجائیگی۔ یہاں یہ دکھانا مقصود ہے کہ قدیم اور اس کے بعد کے دور میں امام صاحب ایک عظیم اور جلیل القدر امامِ حدیث کی حیثیت سے مشہور رہے ہیں، اور متقدمین کے نزدیک وہ اسی خصوصیت کے لحاظ سے زیادہ ممتاز تھے، اس کی وجہ محبت رسول اور اتباع سنت کے علاوہ احادیث سے ان کا غیر معمولی اشتغال و انہماک اور مسند جیسی لازوال اور بے نظیر کتاب کی ترتیب و تصنیف ہے، اس لیے ذیل میں اس شہرۂ آفاق کتاب کا تعارف اور اس کی خصوصیات وغیرہ پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

مسند احمد اور دوسرے مسانید | امام احمدؒ کی تصنیف سے پہلے بھی اس موضوع پر تالیف و تصنیف کا کام

شروع ہو چکا تھا، ائمۂ اربعہ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے مسانید موجود ہیں، لیکن انکی تالیف و ترتیب خود ان بزرگوں نے نہیں کی تھی،[1] اور نہ ان کو مسند احمد کے جیسی شہرت نصیب ہوئی، کیونکہ استقصاء، جامعیت اور استناد ہر لحاظ سے ان کا پایہ اس سے کمتر ہے، دوسرے علماء میں ابوداؤد طیالسی اور بعض دوسرے ائمۂ محدثین کے مسانید بھی مشہور اور اپنے اپنے رنگ میں خوب ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم حدیث کی تاریخ میں جو مسانید کے مجموعے مرتب کیے گئے ہیں، ان میں سے کسی کو بھی مسند احمد کی طرح شہرت و اعتبار حاصل نہ ہو سکا، خالص فنی اور تصنیفی لحاظ سے بھی ان میں سے کسی مسند کو امام صاحب کے مسند کے مقابلہ میں نہیں لایا جا سکتا، اس لیے عام مسانید سے اس کے مقابلہ و محاکمہ کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا،

مسند کی تعریف اور تالیف و ترتیب مسانید کا طریقہ

مسند اُس حدیث کو کہتے ہیں جس کی اسناد اول سے آخر راوی تک متصل ہوں، لیکن اس کا استعمال عموماً ان ہی حدیثوں پر ہوتا ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہوں، صحابہ کرام کی مرویات پر جنکی سند رسول اللہؐ تک نہ پہنچی ہو، اس کا اطلاق نہیں ہوتا، حافظ ابن عبد البر نے اس کی تصریح کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس قسم کی روایت متصل بھی ہو سکتی ہے اور منقطع بھی، جیسے امام مالک نے زہری سے اور وہ عبد اللہ بن عباسؓ کے واسطہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیثیں بیان کی ہیں وہ منقطع ہونے کے باوجود بھی مسند ہیں، اس لیے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کا سلسلہ روایت پہنچ جاتا ہے، لیکن چونکہ زہری کا عبد اللہ بن عباسؓ سے سماع ثابت نہیں ہے اس لیے وہ منقطع ہیں،

حافظ ابن عبد البر نے محدثین کی ایک جماعت کا یہ خیال بھی نقل کیا ہے کہ مسند وہی احادیث کہلاتی ہیں جن کی سند میں کوئی انقطاع نہ ہو اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متصل و مرفوع طریقہ پر ثابت ہوں۔[2]

---

[1] بستان المحدثین ص ۲۰ [2] مقدمہ ابن صلاح ص ۲۱ بحوالہ خطیب بغدادی

کتب حدیث کی قسموں میں ایک قسم مسانید بھی ہے یہ ان کتابوں کو کہتے ہیں جن میں صحابہ کی ترتیب پر حدیثیں مرتب کی جاتی ہیں، یہ ترتیب یا تو حروف تہجی کے اعتبار سے ہوتی ہے یا سبقت فی الاسلام کے اعتبار سے اور کبھی شرافت نسب کے لحاظ سے بھی ہوتی ہے،

حروف تہجی کے لحاظ سے اگر حدیثیں مرتب کیجائیں گی تو حضرت ابوبکرؓ کی حدیثیں پہلے، پھر حضرت اسامہؓ اور انسؓ وغیرہ کی، اور اگر سبقت اسلام کا لحاظ کیا جائے گا تو عشرۂ مبشرہ کی حدیثیں پہلے، پھر شرکائے بدر، اہل حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والے صحابہؓ کی احادیث ہوں گی، پھر صحابیات کی روایتیں، ان میں ازواج مطہرات کی روایتیں سب پر مقدم ہوں گی، اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں سے مروی حدیثیں ہوں گی،

اگر قبائل وانساب کے لحاظ سے ترتیب ہوگی تو سب سے پہلے بنی ہاشم کے مسانید خصوصاً امام حسینؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ کی روایتیں ہوں گی، اس کے بعد ان قبائل کے راویوں کی حدیثیں ہونگی جن کو نسب کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قرب ہوگا، اس صورت میں حضرت عثمانؓ کی روایتیں حضرت ابوبکرؓ کی روایتوں سے پہلے لکھی جائیں گی اور حضرت ابوبکرؓ کی حضرت عمرؓ کی حدیثوں پر مقدم ہوں گی۔[۱]

کتب حدیث کی تدوین میں ایک طریقہ تو ابواب کی ترتیب پر ہوتا ہے، یعنی ہر باب کے تحت اس سے متعلق احادیث ذکر کیجاتی ہیں، اور دوسرا مسانید پر جس کی تفصیل اوپر بیان کیگئی، لیکن کبھی کبھی فقہی ابواب پر مرتب کتابوں کو بھی مسند کہا جاتا ہے، بشرطیکہ ان کی ترتیب حروف و کلمات پر ہو، اور اس میں ہر حدیث کی سند آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مذکور ہو، اس لیے کہ وہ مسند اور مرفوع حدیثوں کا مجموعہ ہوتی ہیں، اسی لیے امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام

---

[۱] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۵۰ بحوالہ العجالۃ نافعہ

"الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ وسننہ وایامہ"، اور امام مسلم نے بھی اپنی صحیح کو اسی اعتبار سے مسند کہا ہے، اور سنن دارمی کو بھی مسند دارمی کہا جاتا ہے۔[۱]

امام احمدؒ کا طریقہ | امام احمدؒ نے اپنی کتاب کو ابواب کے بجائے مسانید پر مرتب کیا ہے، لیکن تالیف مسانید کے جو عام قاعدے بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے کسی قاعدہ کا بھی مسند احمد کے موجودہ متداول نسخہ میں مکمل طور پر لحاظ نہیں کیا گیا ہے، اس کا اندازہ سطور ذیل سے ہو جائیگا۔

تعداد و ترتیب مسانید | حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے مسند احمد میں اٹھارہ مسانید بتائے ہیں، لیکن پیش نظر نسخہ میں ان کی تعداد ۲۹ ہے جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مسند ابوبکرؓ (۲) مسند عمرؓ بن خطاب (۳) مسند عثمانؓ (۴) مسند علیؓ (۵) مسند طلحہؓ بن عبد اللہ (۶) مسند زبیرؓ بن العوام (۷) مسند سعدؓ بن ابی وقاص (۸) مسند سعیدؓ بن زید[۲] (۹) مسند اہل بیت[۳] (۱۰) مسند بنی ہاشم[۴] (۱۱) مسند عبد اللہ بن عباسؓ (۱۲) مسند عبد اللہ بن مسعودؓ (۱۳) مسند عبد اللہ بن عمرؓ (۱۴) مسند عبد اللہ بن عمرو بنؓ عاصؓ[۵] (۱۵) مسند ابی ہریرہؓ (۱۶) مسند ابی سعید خدریؓ (۱۷) مسند انس بن مالکؓ (۱۸) مسند جابر بن عبد اللہ انصاریؓ (۱۹) مسند مکیین (۲۰) مسند صفوان

---

[۱] فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۱۵۸، ۱۵۹ [۲] اس کے بعد بلا عنوان مسند عشرہ مبشرہ میں حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ اور حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ اور پھر عبد الرحمن بن ابی بکرؓ، زید بن خارجہ، حارث بن حزمہ اور سعد مولی ابوبکرؓ کی حدیثیں ہیں، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے ان سب کو صرف ایک مسند شمار کیا ہے اور اس کا عنوان مسند عشرہ مبشرہ و ما معہ رکھا ہے (بستان المحدثین ص ۲۹) [۳] حسنینؓ، عقیلؓ، جعفر (پسران ابو طالب) اور عبد اللہ بن جعفر (نبیرہ ابو طالب) کی حدیثوں پر مشتمل ہے [۴] حضرت عباسؓ اور انکی اولاد کبار فضل، تمام اور عبید اللہ کی حدیثوں پر مشتمل ہے، اسی لیے شاہ صاحب نے اس کا عنوان مسند حضرت عباسؓ و پسران بزرگوار ایشان تجویز کیا ہے (بستان ص ۲۹) [۵] شاہ عبد العزیز صاحب نے ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ اور عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ کے مسانید کو حضرت عباسؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ کے مسانید سے پہلے نقل کیا ہے، مسند عبد اللہ بن عمرو کے ساتھ ہی ابو رمثہ کی حدیثیں بھی ہیں۔

(۲۱) مسند حکیم بن حزام[۱] (۲۲) مسند مدنیین (۲۳) مسند شامیین (۲۴) مسند کوفیین[۲] (۲۵) مسند بصریین[۳] (۲۶) مسند انصار (۲۷) مسند فضالہ[۴] (۲۸) مسند عائشہ[۵] (۲۹) مسند القبائل[۶]۔

ان عنوانات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں تو سبقت و تقدم اسلام کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن پھر اس اصول کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اور کہیں حسب و نسب کی، کہیں ملک و قبیلہ کی رعایت کی گئی ہے، اور کہیں ان میں سے کسی چیز کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، اگر کوشش کی گئی ہوتی تو تعداد مسانید میں بھی اختصار سے کام لیا جا سکتا تھا،

مسانید کے قواعد سے انحراف کے باوجود چونکہ اس میں مسند کی اصل خصوصیت پائی جاتی ہے یعنی ہر ہر صحابی کی حدیثیں الگ الگ لکھی گئی ہیں، اس لیے اس کا شمار بھی ان ہی میں کیا جاتا ہے، لیکن اس اصول کی بھی پوری پابندی مسند میں نہیں ہے، مثلاً مسند ابوبکر میں ایک روایت عبداللہ بن عباس کی آگئی ہے، جس کا حضرت ابوبکرؓ سے کوئی تعلق نہیں[۷]۔ مسند عمر کے بعد حدیث السقیفہ کے عنوان سے آٹھ روایتیں نقل کی گئی ہیں، جن میں صرف ایک ہی طویل روایت کا اس سے تعلق ہے، اور جو روایتیں حضرت عبداللہؓ بن عمر کے واسطہ سے نقل کی گئی ہیں، ان کا نہ تو حضرت عمرؓ سے کوئی تعلق ہے اور نہ واقعہ سقیفہ سے بلکہ وہ سب بیوع سے متعلق ہیں[۸]، مسند عثمان میں بھی دو روایتیں اس طرح کی ہیں

---

[۱] صفوان بن امیہ اور حکیم بن حزام دونوں مکی ہیں، اس لیے پھر مسند کے عنوان کی ضرورت نہ تھی، شاہ صاحب نے صرف مسند مکیین کا ذکر کیا ہے [۲] مسند کوفیین کا دو جگہ عنوان قائم کیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے، شاہ صاحب نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا [۳] شاہ صاحب نے مسند کوفیین و بصریین کے بعد اہل شام کے مسند کا ذکر کیا ہے [۴] حضرت فضالہ بھی انصاری تھے، اس لیے ان کی حدیثوں کو بھی بلا عنوان مسند اور مسند انصار کے ساتھ ذکر کر دینا چاہئے تھا [۵] اسی میں دیگر ازواج و بنات کے مسانید بھی نقل کر دینا مناسب تھا، دوسری صحابیات کی حدیثوں کو اس میں خلط ملط کرنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا [۶] مسند قبائل کے بعد بھی صحابیات کی روایتیں نقل کی گئی ہیں جو ٹھیک نہیں ہے [۷] مسند جلد اص ۸ [۸] ایضاً ص ۵۵

جن کا ان سے کوئی تعلق نہیں،[۱] مسند عبد اللہ بن مسعودؓ میں بھی ایک روایت اسی طرح کی پائی جاتی ہے،[۲] اور مسند عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ میں کئی غیر متعلق روایتیں عمرو بن شعیب عن جدہٖ کے واسطہ سے[۳] اور ایک روایت اعشیٰ شاعر کی بھی ہے۔[۴]

بعض جگہوں میں محض معمولی اور ادنیٰ مناسبت کی بنا پر غیر متعلق روایتیں لائی گئی ہیں، مثلاً حدیث سقیفہ میں انس بن مالکؓ کی ایک روایت جو انصار کے فضائل میں ہے،[۵] مسند ابن عباسؓ،[۶] مسند ابن مسعودؓ اور ابن عمرؓ میں بھی اس طرح کی احادیث ملتی ہیں۔[۷]

ترتیب و تقسیم کی بعض فروگذاشتوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے، مثلاً مسند کوفیین کا دو جگہ عنوان یا مسند النساء کو مسند عائشہ اور مسند القبائل میں خلط ملط کر دینا، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے بھی ترتیب کی ان خامیوں کا ذکر کیا ہے:

> "و امام احمد ایں کتاب بطریق بیاض جمع میکرد و ترتیب و تہذیب او از اں امام بوقوع نیامد بلکہ عبد اللہ پسر او عبد اللہ بترتیب آں پرداختہ لیکن در آنجا خطا ہائے بسیار کردہ مدنیاں را در شامیاں درج کردہ و بالعکس"[۹]

مسند کے عنوانات اکثر تو ناموں کے ساتھ ہیں لیکن بعض جگہ اس قسم کے مبہم عنوان بھی ہیں:

حدیث رجل من اصحاب النبیؐ، حدیث رجال من اصحاب النبیؐ، حدیث بعض اصحاب النبیؐ، حدیث ثلاثین من اصحاب النبی، حدیث رجل سمع النبیؐ، حدیث رجل رای النبیؐ، حدیث من شہد النبی، حدیث رجل ادرک النبی، حدیث رجال من الانصار، حدیث رجل من اہل المدینہ وغیرہ۔

اسی طرح بعض صحابہ کی روایات متعدد جگہوں پر نقل کی گئی ہیں، ایسی ان حدیثوں میں تو کوئی حرج نہیں جن کا تعلق کئی صحابیوں سے ہوتا ہے، لیکن ایک ہی صحابی کے مرویات کو دو مقام پر مختصر و مطول کر کے

---

۱ مسند ج ۱ ص ۲۷، ۳۰، ۲ ایضاً ص ۳۸۴ ۳ ایضاً ج ۲ ص ۱۹۵، ۱۹۶ و ۲۰۳ و ۲۲۵ ۴ ایضاً ص ۲۰۱، ۲۰۲
۵ ایضاً ج ۱ ص ۲۷ ۶ ایضاً ص ۲۲۹ ۷ ایضاً ص ۳۸۴ و ۴۰۰ ۸ ایضاً ص ۱۸۲ ج ۲ ۹ بستان المحدثین ص ۲۶

ترتیب دینا بلا فائدہ تکرار ہے، مرتب نے اس طرح کے مواقع پر زیادۃ ، بقیۃ اور تمام حدیث فلاں کے عنوان قائم کیے ہیں۔

لیکن جیسا کہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے مسند کو مسودہ کی صورت میں چھوڑا تھا اور اس کی ترتیب و تہذیب آپ کے صاحبزادہ نے کی ہے، اس لیے ان سے اس طرح کی غلطیوں کا ہوجانا بعید نہ تھا، کیونکہ وہ خود اصل جامع نہ تھے، ان خامیوں کی ذمہ داری امام صاحب پر عائد نہیں ہوتی۔

اس طریقہ تصنیف کا فائدہ مسند کے جس طریقہ تصنیف کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس طریقہ تصنیف کے مقابلہ میں دشوار اور دقت طلب معلوم ہوتا ہے جس میں ابواب کا لحاظ کیا جاتا ہے، کیونکہ اگر کسی شخص کو کسی حدیث کی تلاش ہو اور اسے صحابی کا نام معلوم نہ ہو تو پوری کتاب پڑھنی پڑے گی، اور اگر صحابی کا نام بھی معلوم ہو لیکن اس صحابی سے بہت زیادہ حدیثیں منقول ہوں جب بھی تلاش میں دقت اور دشواری ہوگی، اور اگر مجرد تلاش مقصود ہو اور کوئی چیز ذہن نشین نہ ہو تو استفادہ میں مزید دشواری ہے، لیکن قدیم زمانہ میں تصنیف کا یہ طریقہ رائج تھا، اور امام احمد سے پہلے بھی اس طرح کے مسانید کے مجموعے پائے جاتے تھے، اس طریقہ تالیف کا مقصد تدوین حدیث تھا، تاکہ حدیثوں کے الفاظ محفوظ ہوجائیں، اور ان سے استنباط احکام کیا جاسکے، قدیم زمانہ کے لحاظ سے یہ طریقہ اس لیے مفید تھا کہ اس وقت لوگوں کو حدیث سے بڑا اشتغال تھا، اور ان کو اکثر حدیثیں حفظ رہتی تھیں، بلکہ سور قرآن کی طرح وہ مسانید صحابہ کو بھی محفوظ اور ازبر کرتے تھے، اس لیے ان کے لیے اس میں کوئی دشواری اور دقت نہ ہوتی تھی بلکہ حافظہ کی قوت کو باقی رکھنے کے لیے یہی طریقہ بہتر سمجھا جاتا تھا مگر اب جبکہ لوگوں کا اعتماد یادداشتوں اور کتابی ضبط و تحریر پر رہ گیا ہے، یہ طریقہ فرسودہ ہو گیا، اس کی وجہ سے مسانید سے استفادہ بھی مشکل معلوم ہوتا ہے، اس لیے بعض علماء نے ابواب پر بھی اس کو مرتب کرنے کی کوشش کی تاکہ استفادہ

میں سہولت ہو، اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی،

زوائد مسند اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امام صاحب نے مسند کو مسودہ کی صورت میں چھوڑا تھا بعد میں اس کو آپ کے صاحبزادے عبد اللہ نے مرتب بھی کیا اور اس میں کچھ اضافے بھی کیے،[1] اسی طرح ابوبکر قطیعی نے بھی اس میں بعض اضافے ہیں،[2] حافظ ابن تیمیہ نے تصریح کی ہے کہ مسند علی میں عبد اللہ کے اضافے بکثرت ہیں۔

امام صاحب نے مسند میں جس قدر احتیاط ملحوظ رکھی تھی اتنی احتیاط اضافوں میں نہیں کی جا سکی، اس لیے ان کا پایۂ اعتبار مسند سے کم ہو گیا ہے، حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ زوائد میں ضعیف اور موضوع روایات بھی شامل ہو گئی ہیں، جن کو ناواقف لوگ امام احمد ہی کی جانب منسوب کرتے ہیں،[3]

مسند کے مرویات کی قسمیں زوائد کے اعتبار سے مسند کی روایتوں کو چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے،

(۱) وہ روایتیں جن کو امام صاحب کے فرزند عبد اللہ آپ کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں، اور یہی اصل مسند احمد ہے، اس میں اس طرح کی روایتیں ۴/۳ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں،

(۲) وہ حدیثیں جن کو عبد اللہ نے آپ سے بھی اور آپ کے علاوہ دوسرے لوگوں سے سنکر روایت کیا ہے، اس طرح کی حدیثیں بہت کم ہیں۔

(۳) وہ حدیثیں جن کو عبد اللہ نے آپ کے علاوہ دوسرے شیوخ سے نقل کیا ہے، اسی قسم کی روایتوں کو زوائد عبد اللہ کہا جاتا ہے، ان کی تعداد پہلی قسم سے کم مگر اور قسموں سے زیادہ ہے۔

(۴) وہ حدیثیں جن کو عبد اللہ نے امام صاحب سے سنا تو نہیں ہے لیکن ان کی آپکے سامنے قرات کی تھی، اس قسم کی روایتیں بہت کم ہیں،

(۵) ایسی حدیثیں جن کو انھوں نے نہ امام صاحب سے سنا اور نہ آپ کے سامنے پڑھا بلکہ آپ کی

---

[1] بستان المحدثین ص ۲۹، احمد بن حنبل والمحنۃ ص ۲۴۳ وکشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۱۴ [2] بستان المحدثین ص ۲۹
[3] منہاج السنۃ

کتاب یا کسی تحریر سے نقل کیا ہے، اس طرح کی روایتوں کی تعداد بھی کم ہے۔

۶۔ ابوبکر قطیعی کے زیادات جن کو انھوں نے عبداللہ اور ان کے والد کے بجائے کسی اور سے بیان کیا ہے، اس طرح کی روایتیں بہت کم ہیں۔

مسند اور زوائد میں امتیاز | جو روایتیں امام صاحب سے مروی ہوتی ہیں ان کی علامت یہ ہے: حدثنا عبد اللہ حدثنی ابی

اور زوائد عبد اللہ کی علامت:۔ حدثنا عبد اللہ حدثنا فلاں (اس میں ابی کا لفظ نہیں ہوتا

قطیعی کے زوائد کی مثال:۔ حدثنا فلاں (یعنی عبد اللہ اور ان کے والد کے نام کے بغیر)

یہ ہے مسند احمد کے موجودہ متداول نسخہ کی ہیئت جس میں تقریباً سات سو صحابہ کی حدیثیں شامل ہیں[۱] اور جن کی تعداد عام طور سے تیس اور چالیس ہزار بتائی جاتی ہے، لیکن ابن خلدون نے لکھا ہے کہ وہ پچاس ہزار ہیں[۲] مگر وہ اپنے قول میں منفرد ہیں، بقیہ دونوں اقوال میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے اس طرح تطبیق دی ہے کہ مسند کی اصل روایات تو تیس ہزار ہی ہیں، دس ہزار کے قریب زوائد عبد اللہ ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ مکررات کے ساتھ ۴۰ ہزار اور حذف مکررات کے بعد تیس ہزار حدیثیں رہ جاتی ہیں[۳]۔

وقف مستنصریہ کے نسخہ کے مطابق مسند احمد بن حنبل ۲۴ جلدوں پر مشتمل ہے[۴]، اور اس میں ۱۶۲ اجزا ہیں[۵]۔ تجزیہ کنندہ کا نام ابو علی حسن بن علی المذہب (م ۴۴۴ھ) ہے جنھوں نے ابوبکر احمد ابن جعفر قطیعی سے مسند کی روایت کی ہے[۶]۔ مسند کے قلمی نسخے یورپ، آستانہ اور خدیویہ مصر کے کتب خانوں میں موجود ہیں[۷]۔ اور ۱۳۱۳ھ میں وہ مطبعہ میمنہ مصر سے ۶ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

۱؎ طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۲ ۲؎ مقدمہ ابن خلدون ص ۴۹۰ ۳؎ بستان المحدثین ص ۳۰ ۴؎ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۴۲

۵؎ بستان المحدثین ص ۲۹ ۶؎ ایضاً ۷؎ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۱۸۱

اس کے حاشیہ پر منتخب کنز العمال بھی ہے[۱]، تمام جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۸۸۰ ہے۔

مسند کی تالیف میں احتیاط امام احمدؒ نے مسند کی ترتیب و تالیف میں غیر معمولی احتیاط اور جانفشانی سے کام لیا ہے، ان کا خود بیان ہے کہ انھوں نے اس کو ساڑھے سات لاکھ سے زائد حدیثوں سے منتخب و مرتب کیا تھا[۲]، علما کا بیان ہے کہ انھوں نے مسند کی تدوین میں صحیح احادیث کی تخریج اپنے اوپر لازم کرلی تھی[۳]، ابو موسیٰ مدینی کا بیان ہے کہ امام صاحب نے مسند میں ان ہی لوگوں سے روایتیں نقل کی ہیں جن کی صداقت و دیانت مسلم تھی، ایسے راویوں کی روایتیں بیان کرنے میں پرہیز کیا ہے جن کی امانت و دیانت میں طعن کیا گیا ہے[۴]۔

امام صاحب کا خود بیان ہے کہ میں نے اس کتاب کو لوگوں کے لیے امام و حجت بنایا ہے تاکہ اختلاف کے وقت وہ اس کی جانب رجوع کریں، اگر اس میں ان کو کوئی حدیث مل جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ وہ کسی ایسی حدیث کو صحیح تسلیم نہ کریں جو اس میں موجود نہ ہو[۵]۔

اسی احتیاط کی بنا پر امام صاحب مسند کے مسودہ میں ہمیشہ کاٹ چھانٹ اور حذف و ترمیم کرتے رہتے، اور متن و اسناد دونوں کے سلسلہ میں پوری احتیاط ملحوظ رکھتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک روایت (یہلک امتی ھذا الحی من قریش الخ) کے متعلق آپ کے صاحبزادے عبد اللہ کا بیان ہے کہ میرے والد نے مرض الموت میں مجھ سے فرمایا کہ اس کو مجموعہ سے خارج کردو کیونکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول (اسمعوا واطیعوا) کے خلاف ہے، حالانکہ یہ روایت ثقہ لوگوں سے مروی تھی لیکن اس کا متن مشہور حدیثوں کے خلاف ہے، اس لیے آپ نے اس کو حذف کرنے کی ہدایت فرمائی[۶]۔

---

۱ معجم المطبوعات ج ۱ ص ۴۱۱ ۲ مسند احمد ج ۱ ص ۴۰۹ ۳ طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۲ و معجم المصنفین ج ۲ ص ۳۳۴
۴ کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۱ و معجم المصنفین ص ۴۳۴ ۵ طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۲ ۶ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۵ و معجم المصنفین ج ۲ ص ۴۳۵ ۷ طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۲ و ۲۰۳

متن کی طرح اسناد میں بھی پوری احتیاط برتتے تھے، عبد اللہ کا بیان ہے کہ میں نے ان سے عبد العزیز بن ابان کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نے مسند میں ان سے کوئی حدیث نہیں لی ہے، کیونکہ وہ حدیث مواقیت کو بیان کیا کرتے تھے، اسی طرح حضرت جابر بن سمرہؓ کی ایک روایت (لأن یؤدب الرجل ولدہ او احدکم ولدہ لاخیر لہ من ان یتصدق کل یوم بنصف صاع) کے متعلق عبد اللہ فرماتے ہیں کہ میرے والد نے اس کو مسند میں اس لیے نہیں نقل کیا کہ اس میں ایک راوی ناصح ہیں جو ضعیف الحدیث ہیں لیکن نوادر میں انھوں نے اس کا مجھے املا کرایا تھا[۲]

احتیاط ہی کی وجہ ہے آخر میں انھوں نے عبد الرزاق سے بھی روایت کرنا ترک کر دیا تھا، عبد اللہ آپ کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ: "ہم نے عبد الرزاق سے شروع دور کے علاوہ اور کبھی کوئی حدیث تحریر نہیں کی[۳]" انہی کا بیان ہے کہ ۲۰۰ھ کے بعد جن لوگوں نے عبد الرزاق سے روایتیں سنیں ان کا سماع ضعیف ہے، میرے والد نے قدیم زمانہ میں ان سے حدیثیں سنی تھیں[۴]"

ان کی احتیاط کا اس سے اندازہ ہوگا کہ باوجودیکہ آپ کو لاکھوں حدیثیں زبانی یاد تھیں لیکن وہ محض اپنی یادداشت سے کوئی حدیث بیان کرنا احتیاط کے خلاف سمجھتے تھے، علی بن مدینی کا بیان ہے کہ "ہمارے رفقاء اور اصحاب میں امام احمد سے بڑا کوئی حافظ نہ تھا لیکن وہ کتاب سے حدیثیں بیان کیا کرتے تھے، ان کے اس طرز عمل میں ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے[۵]، وہ ہم کو بھی تاکید کرتے تھے کہ جب حدیثیں بیان کریں تو کتاب کو پیش نظر رکھیں[۶]"

ابراہیم بن خالد بیان کرتے ہیں کہ "ہم لوگ امام احمد کی مجلسوں میں حدیثوں پر بحث و مذاکرہ اور ان کو یاد کرتے لیکن جب ہم ان کو قلمبند کرنا چاہتے تو وہ جھپٹ کر کتاب لاتے اور فرماتے کہ کتاب

---

[۱] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۲ [۲] حاشیہ الفتح الربانی ج ۱ ص ۹ [۳،۴] احمد والمحنہ ص ۱۸ [۵] تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۰

[۶] شذرات الذہب ج ۲ ص ۹۰ و تہذیب الاسماء قسم اول جزء ۱ ص ۱۱۱

بہترین یادداشت ہے[۱]

کوئی ایسی روایت نہیں بیان کرتے تھے جو صرف ایک ہی سند سے مذکور ہوتی جب تک کہ اس کی نظیر نہ ملجاتی،[۲]

فضائل وغیرہ کی حدیثوں میں تھوڑی بہت نرمی گوارا بھی کر لیتے تھے لیکن احکام، حدود اور کفارات وغیرہ میں ذرا بھی تساہل گوارا نہیں تھا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ " فضائل اعمال اور ان کی ترغیب وجزاء وغیرہ سے متعلق اگر کوئی حدیث ہم کو معلوم ہوتی ہے تو اس میں زیادہ شدت نہیں اختیار کرتے لیکن حدود، کفارات اور فرائض وغیرہ سے متعلق روایتوں میں بڑی چھان بین اور پوری احتیاط اور سختی سے کام لیتے ہیں"[۳]

مسند احمد کی اہمیت مسند کی ترتیب میں امام صاحب نے جس قدر احتیاط ملحوظ رکھی ہے وہ خود اس کی اہمیت کا بڑا ثبوت ہے، ذیل میں اس کی تفصیل نقل کیجاتی ہے۔

محدثین نے مسانید کا درجہ سنن سے کمتر قرار دیا ہے[۴] لیکن مسند احمد کی حیثیت عام مسانید سے مختلف ہے، اسی لیے صحاح ستہ کے ساتھ ساتھ اس کا بھی نام لیا جاتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے کتب حدیث کے درجے بیان کرتے ہوئے اس کو دوسرے درجہ کی کتابوں یعنی سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور مجتبیٰ النسائی کے لگ بھگ قرار دیا ہے، اور تیسرے درجہ کی کتابوں سے جس میں عام جوامع و مسانید کو محسوب کیا ہے، اس کو اہم اور ممتاز قرار دیا ہے،[۵] اس سے ظاہر ہے کہ مسند احمد اگر صحاح کی کتابوں کے برابر نہیں تو قریب قریب ان کے ہم پایہ ضرور ہے۔

دین و شریعت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے امت نے جن کتابوں کو اہم اور بنیادی قرار دیا ہے

۱؎ تہذیب الاسماء، قسم اول جزء ا ص ۱۱۱ ۲؎ طبقات الشافعیہ شعرانی ص ۴۶ ۳؎ شذرات الذہب ج ۲ ص ۹۸
۴؎ التنقیح فی اصول الحدیث ص ۴۰ ۵؎ حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۰۷

ان میں ایک یہ بھی ہے اور اس پر پوری ملت اسلامیہ کا ہمیشہ اعتماد و اعتبار رہا ہے، اور محدثین نے اس سے ہمیشہ اخذ و استناد کا کام لیا ہے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں :

ھو اصل من اصول ھذہ الامۃ[1]	مسند احمد اس امت کی اصولی اور بنیادی کتابوں میں ہے

صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں :-

"وہ بڑی اہم اور منجملہ ان کتابوں میں ہے جو اسلام کی بنیادی کتابیں سمجھی جاتی ہیں[2]"۔

اور ابو موسیٰ محمد بن ابوبکر مدینی کا بیان ہے :-

ھذا الکتاب یعنی مسند الامام	یہ کتاب یعنی مسند احمد ایک اہم اصل اور
ابی عبداللہ احمد بن محمد بن حنبل	محدثین کے لیے قابل وثوق مرجع ہے، اس کو
الشیبانی قدس اللہ روحہ	انھوں نے بیشمار احادیث و روایات سے
اصل کبیر و مرجع وثیق لاصحاب	رہنمائی اور اعتماد کے لیے منتخب و مرتب
الحدیث انتقی من احادیث کثیرۃ	اور نزاع کی صورت میں استناد و رجوع
ومسموعات وافرۃ فجعل اماما	کا ذریعہ بنایا تھا۔
ومعتمدا وعند التنازع ملجأ	
ومستندا[3]	

آپ کے بھتیجے کا بیان ہے کہ "ہمارے چچا نے مجھکو، صالح اور عبداللہ کو جمع کرکے مسند پڑھی، ہم لوگوں کے علاوہ کسی نے اس کتاب کو مکمل طور پر امام صاحب سے نہیں سنا، آپ نے فرمایا کہ میں نے سات لاکھ پچاس ہزار حدیثوں سے انتخاب کرکے اس کو جمع کیا ہے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس حدیث کے بارہ میں مسلمانوں میں اختلاف ہو اس میں اس

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۱ [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۲۴ [3] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۱ و ۲۰۲

کتاب کی جانب رجوع کرو، اگر اس میں مل جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ اس کو حجت نہ سمجھو۔"[1]

علامہ ابن خلکان کی رائے ہے کہ" امام صاحب امام المحدثین تھے، انھوں نے مسند کی تالیف اور اس میں ایسی حدیثیں جمع کیں جن کو جمع کرنا دوسروں کے لیے ممکن نہ تھا۔"[2]

مصر کے مشہور عالم احمد عبد الرحمٰن بنا ساعاتی فرماتے ہیں:" امام صاحب کا امت پر بڑا احسان اور ان کا قابل تعریف کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے لوگوں کے لیے اپنی مشہور کتاب مسند احمد کی تخریج کی جس کی اہمیت کا ہر زمانہ کے محدثین نے اعتراف کیا اور کہا ہے کہ وہ تمام کتب سنت میں صحیحین کے بعد سب سے زیادہ صحیح اور حدیثوں کی جامع ہے، ایک مسلمان کو دنیا و آخرت میں جن چیزوں کی احتیاج ہوسکتی ہے، بلاشبہہ وہ سب اس میں موجود ہیں، اس طرح اس کتاب کا نفع اور اس کی برکت ہمیشہ جاری رہی اور سنت نبوی کے عظمت شناس برابر اس کے قدردان رہے، اور جب تک دنیا میں اسلام اور مسلمان باقی ہیں، ان کا یہ عمل قابل قدر اور مشکور سمجھا جائے گا۔"[3]

علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ:

بل هي ذب عن هذا المصنف	میری اس ناچیز تالیف کا مقصد اس کتاب عظیم
العظيم الذي تلقته الأمة	کی مدافعت ہے جس کو امت میں قبولیت
بالقبول والتكريم وجعله	و عزت حاصل ہوئی اور جس کو امام احمد نے
امامهم حجة يرجع اليه	ایسا رہنما اور حجت بنایا ہے جس کی جانب
ويعول عند الاختلاف[4]	رجوع اور اختلاف کی صورت میں جس پر اعتماد کیا جائے۔

متاخرین علما نے ایک محدث کیلئے جن کتابوں کے مطالعہ اور حفظ کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے،

---

[1] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰۲ [2] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۰ [3] الفتح الربانی ص ۱ تا ۹ [4] القول المسدد ص ۲ و ۳

ان میں ایک مسند احمد بھی ہے۔[۱]

اس قسم کے اقوال و آرا مسند کی اہمیت اور امت میں اس کی مقبولیت کے شاہد ہیں،

کتب حدیث میں مسند احمد کا درجہ یہ صحیح ہے کہ مسانید کا مرتبہ محدثین کے نزدیک کتب سنن کے برابر نہیں ہے کیونکہ ارباب مسانید کی شرط صرف اس قدر ہوتی ہے کہ وہ ہر صحابی کے مرویات و احادیث کو الگ الگ مرتب اور ان کی تمام روایتوں کا استقصاء کر دیں، ان کی نظر نہ تو ابواب پر ہوتی ہے اور نہ قابل احتجاج روایات پر،[۲] لیکن مسند احمد بن حنبل عام مسانید کی طرح نہیں ہے۔ امام صاحب نے اس کی صحت میں بڑا اہتمام اور تالیف میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے، اس لیے علماء و محدثین نے اسکو عام مسانید سے ممتاز اور برتر بتایا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے کتب حدیث کے اقسام و طبقات بیان کرتے ہوئے اس کو کتب صحاح کے قریب قریب بتایا ہے، اور عام جوامع و مسانید میں اس کا شمار نہیں کیا ہے،[۳] اس اعتبار سے اول درجہ کی کتابوں موطا اور صحیحین کے بعد جن کتابوں کا مرتبہ اور درجہ ہے ان میں مسند ابن حنبل بھی ہے،

علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ "وہ انتخاب و تحریر کے لحاظ سے ان کتابوں سے بہتر ہے جن کے مصنفین نے جمع و ترتیب میں صحت کا التزام نہیں کیا ہے، اس میں صحیحین کے مقابلہ میں جو زوائد ہیں وہ ترمذی اور ابوداؤد کے زوائد کے مقابلہ میں کم ضعیف ہیں اور اس کی ہر روایت مقبول اور ضعیف روایتیں بھی حسن سے قریب تر ہیں۔"[۴]

اس کے بارہ میں امت کا فیصلہ یہ ہے:-

فهذه هي الكتب مع موطاء	یہی کتب صحاح ستہ بشمول موطا امام مالک
الامام مالك ومسند الامام	و مسند احمد اصل دائرہ مدار اور اعتماد

---

[۱] تدریب الراوی ص ۶۰ و کشف الظنون ج ۲ ص ۲۴۴۳ [۲] التنقیح فی اصول الحدیث ص ۴۰ [۳] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۴
[۴] بحوالہ الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۸ و الفتح الربانی ص ۸

احمد هی التی علیها المعول و	کی چیزیں ہیں اور جو روز روشن کی طرح
والمدار وهی التی اشتهرت اشتهار	نمایاں اور مشہور ہیں
الشمس فی رابعة النهار[1]	

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ "مسند احمد کی حدیث کی نوعیت عام کتب مسانید کی حدیثوں سے مختلف ہے"[2]۔

ابو الحسن علی بن احمد ہیثمی لکھتے ہیں کہ "وہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور بہتر ہے"[3]۔

مصری عالم عبد العزیز خولی لکھتے ہیں "کتب مسانید کا درجہ کتب سنن سے کمتر ہے، اس لیے کہ ان کے مصنفین ہر صحابی کی مسند میں ان کی تمام روایات کو اکٹھا کر دیتے اور صحیح و سقیم میں امتیاز نہیں کرتے ہیں، اسلیے ان سے مطلق اور بلا قید استدلال جائز نہیں، مگر محدثین نے مسند احمد کو ان سے مستثنیٰ قرار دیا ہے"[4]۔

ان اقوال اور تفصیلات سے مسند کے مرتبہ اور درجہ کا خود بخود تعین ہو جاتا ہے، کہ وہ دوسرے درجہ کی کتابوں یعنی صحاح کے بالکل تو نہیں لیکن قریب قریب برابر اور عام مسانید و جوامع سے جو تیسرے طبقہ میں خیال کیجاتی ہیں بہتر اور اہم ہے، اس لیے موطا، صحیحین اور ابو داؤد، ترمذی نسائی اور ابن ماجہ کے بعد اسی کا درجہ ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں:۔

وکاد مسند احمد یکون من جملة	قریب قریب مسند احمد کا نمبر بھی اسی دوسرے
هذه الطبقة فان الامام احمد جعله	درجہ کی کتابوں میں آتا ہے، اس لیے کہ
اصلا یعرف به الصحیح والسقیم قال	امام احمد نے اس کو صحیح و سقیم میں امتیاز کیلئے
مالیس فیه فلا تقبلوه[5]	اصل قرار دیا اور فرمایا ہے کہ جو روایت
	اس میں نہ ہو اس کو قبول نہ کرو۔

---

[1] مقدمہ تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۱۰۔ [2] تدریب الراوی ص ۵۰۔ [3] ایضاً [4] مفتاح السنہ ص ۳۴
[5] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۰

خصوصیات | مسند کی اہمیت اور درجہ کے تعین کے بعد اس کی خصوصیات پر بھی ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا۔

۱۔ مسند احمد کی سب سے پہلی خصوصیت تو یہی ہے جس کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی یعنی علمائے حدیث نے اس کو بھی حدیث کی اہم اور صحیح کتابوں کے زمرہ میں شامل کیا ہے، اور قریب قریب انہی کی طرح مستند و معتبر قرار دیا ہے،

۲۔ اس وقت حدیثوں کے جو مجموعے موجود ہیں، ان میں صحت و وثوق کے لحاظ سے بعض کتابوں کا پایہ مسند سے بلند ہے لیکن اس سے بڑا اور ضخیم کوئی مجموعۂ حدیث نہیں، علامہ ابن حجر فرماتے ہیں:

قولہ واما مسند احمد الی آخرہ	ان کے اس قول کہ "مسند احمد الی آخرہ"
فکانہ اراد انہ اکثر ھذہ الکتب	سے مراد یہ ہے کہ اس میں ان تمام کتابوں
حدیثا وھو کذلک [1]	سے زیادہ حدیثیں ہیں اور یہ واقعہ بھی ہے۔

حافظ ابن کثیر اور ابوبکر ہیثمی (م ۸۰۷ھ) کا بیان ہے کہ "باعتبار کثرت کوئی اور کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی [2]"

۳۔ تیسری خصوصیت اس کی جامعیت ہے یعنی احادیث کے دوسرے مجموعوں میں جو روایات و احادیث متفرق طور پر پائی جاتی ہیں ان کا بیشتر حصہ اس میں موجود ہے، ایک مرتبہ ابو الحسن علی بن محمد یونینی سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ کو کتب ستہ زبانی یاد ہیں، انھوں نے فرمایا کہ ہاں یاد بھی ہیں اور نہیں بھی لوگوں نے پوچھا یہ کیسے؟ فرمایا کہ مجھے امام احمد کی مسند یاد ہے، جس میں صحاح کی کم ہی حدیثیں نہیں ہیں، یا یہ فرمایا کہ صحاح کے اندر جو کچھ ہے، ان میں سے چند کے علاوہ سب کی اصل مسند میں موجود ہے، اس لحاظ سے گویا میں ان کا بھی حافظ ہوں [3]،

اور بعض علماء کا بیان ہے کہ اگر کسی کو تمام کتابوں کی جامع کسی ایسی کتاب کی ضرورت ہو جس کا

---

[1] تعجیل المنفعۃ ص ۱۰ [2] المصعد الاحمد بحوالہ حاشیہ الفتح الربانی ۳۰ [3] ایضاً

مصنف بھی عظیم و جلیل ہو تو اسے مسند احمد کا مطالعہ کرنا چاہیے۔[۱]

احمد عبد الرحمن البنا ساعاتی رقمطراز ہیں: "مسند احمد کے بارہ میں ہر دور کے محدثین کو یہ اعتراف رہا ہے کہ وہ کتب سنت میں احادیث کی سب سے جامع کتاب ہے اور جن چیزوں کی ایک مسلمان کو دنیا و آخرت میں ضرورت پڑ سکتی ہے، وہ سب اس کے اندر موجود ہے۔"[۲]

۴۔ مسند احمد کی ایک خوبی اس کا تصنیفی حسن اور اخبار و روایات کا مناسب و بہتر انتخاب بھی ہے، مبصرین اور اہل نظر کو اس کا اعتراف ہے کہ وضع و تالیف کے لحاظ سے وہ بے مثال کتاب ہے، حافظ ابن حجر نے علامہ ابن صلاح کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:۔

وھو اکبر المسانید و احسنھا وضعا و انتقاء[۳]	وہ سب سے اہم اور بڑی مسند اور وضع و انتخاب کے لحاظ سے سب سے بہتر ہے۔

علی بن ابوبکر ہیثمی اور علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:۔

لا یوازی مسند احمد کتاب مسندا فی کثرتہ وحسن سیاقا[۴ ۵]	مسانید میں کوئی مسند کثرت و حسن بیان میں مسند احمد کے برابر نہیں۔

۵۔ مسند کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ۳۰۰ ثلاثی روایتیں ہیں، اس خصوصیت میں حدیث کی بہت کم کتابیں اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

۶۔ دقت نظر کے ساتھ مسند کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب نے ہر صحابی کے مسند میں کوئی نہ کوئی ایسی روایت ضرور ذکر کر دی ہے جس سے اس کی شخصیت کا اجمالی خاکہ اور کسی اہم خصوصیت کی تصویر سامنے آجاتی ہے، مثلاً حضرت ابوبکرؓ نہایت رقیق القلب اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے۔[۶] حضرت عمرؓ میں غیر معمولی جرأت و بے باکی تھی، اور وہ خلاف حق بات دیکھ کر سخت

---

[۱] حواشی سندی ص ۵ [۲] الفتح الربانی ص ۸ و [۳] ہادی المسترشدین ص ۲۰۶ [۴] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۰

[۶] مسند احمد ج ۱ ص ۱۲

غضبناک ہوجاتے تھے[۱]، معاملات و مسائل میں رائے و مشورہ (جمہوریت) سے کام لیتے تھے[۲]، حضرت عثمانؓ نرم خو بھی تھے[۳] اور شرم و حیا کا مجسم پیکر بھی[۴]، حضرت علیؓ کے مزاج میں فقر و استغنا[۵] تھا اور انکے پاس ایک صحیفہ تھا[۶]

۷۔ امام احمد کی یہ کتاب گو احادیث کا مجموعہ ہے لیکن اس میں حضرت ابوبکرؓ وغیرہ کے خطبے اور فرامین بھی آگئے ہیں، اسی طرح یہ مسند گو فقہ و احکام کی کتاب نہیں ہے اور نہ امام صاحب کا اسکی تالیف سے بجز خدمت و تدوین حدیث کے کوئی اور مقصد تھا لیکن فقہائے صحابہ کے فتوے، استفتاء، اور بعض فقہی مسائل کا بھی کہیں کہیں ذکر آگیا ہے جسکی وجہ سے اس کو فقہی شان سے بھی یکسر خالی نہیں کہا جا سکتا، اس سلسلہ کی تیسری خوبی یہ ہے کہ بعض بعض واقعات کی پوری اور مکمل تفصیل اس میں آگئی ہے، مثلاً حضرت عمرؓ کے اسلام، حضرت عثمانؓ کی شہادت جس کے لیے انھوں نے مسند عثمان کے آخر میں ایک مستقل باب اخبار عثمانؓ کے نام سے قائم کیا ہے، اسی طرح ہجرت حبشہ، حضرت جعفرؓ اور نجاشی کی گفتگو اور خوارج وغیرہ کے واقعات کی مکمل تفصیل بیان کر دی ہے،

۸۔ مسند کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس سے امام صاحب کے فنون حدیث میں مہارت اور ژرف نگاہی کا پورا اندازہ ہوتا ہے اور اس اعتبار سے وہ متعدد خوبیوں کی جامع معلوم ہوتی ہے، مثلاً تعدد طرق، متابعات و شواہد، لفظی و معنوی اختلافات وغیرہ کا تذکرہ، رواۃ کے ناموں میں ابہام کی توضیح، اشتباہ کا تذکرہ، راوی اور روایت کے متعلق کوئی تفصیل ہے تو اسکا اور اس نے کسی شک و تردد کا اظہار کیا ہو تو اسکی وضاحت، اضافہ اور حذف کی تصریح، امام صاحب کا اپنے خیالات کا بعض بعض مقامات پر تذکرہ، اسی طرح انکے صاحبزادہ عبد اللہ کی متعدد مقامات پر وضاحتیں، راویوں کے مقام و وطن اور خاندان و قبیلہ کی نشاندہی وغیرہ اسی طرح اگر امام صاحب کے کسی استاذ یا استاذ الاستاذ نے کسی روایت کی خصوصیت سے تصویب کی ہے تو اسکا اور کبھی کبھی خود اپنی تصریحات کا بھی ذکر صحابی تک منتہی روایت کی رفعیت و عدم رفعیت کی تصریح اور عبد اللہ کا امام صاحب کی کتاب یا املاء سے نقل روایت وغیرہ کا تذکرہ، ان ساری باتوں کا مسند احمد میں ذکر ملتا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں محدثانہ شان و عظمت پوری طرح موجود ہے۔

(باقی)

---

۱ مسند احمد ج ۱ ص ۶۷ و ۱۴۱، ۲ ایضاً ص ۴۰، ۳ ص ۴۳، ۴ ایضاً ص ۱، و ۲، ۵ ایضاً ص ۷، ۶ ایضاً ص ۱۰۰ و ۱۰۲ و ۱۰۸ و ۱۱۹۔

مقالات طریقت

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے حالات میں ایک نایاب تذکرہ

از محمد عضدالدین خاں صاحب ایم اے ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

محمد شاہ کی دلی ہے، لوٹ مار، قتل و غارتگری کا دور دورہ ہے، سکھ، جاٹ اور مرہٹے ہر طرف تباہی مچائے ہوئے ہیں، نادر شاہ کا قتل عام اسی سرزمین میں ہو چکا ہے، ایرانی و تورانی امراء نے بادشاہ کو اپنے ہاتھوں میں کھلونا بنا لیا ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے، جس دور کی ابتدا محمود غزنوی، ایبک اور التتمش کی رزم آرائیوں سے ہوئی تھی آج وہ بہادر شاہ اول اور محمد شاہ کی بزم آرائیوں اور ہنگامہ ہائے ناؤ نوش میں ختم ہو رہا ہے، اور فلسفۂ تاریخ کے مفکر کی یہ صدا فضاؤں میں گونج رہی ہے ؎

آتجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

اس سیاسی بد امنی اور معاشرتی پستی کا اثر مذہبی زندگی پر بھی پڑنا ضروری تھا، اگر اللہ کے چند بیدار مغز بندے اس ظلمت اور توہم پرستی کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لیے کمربستہ نہ ہو جاتے اور ان تیز و تند ہواؤں میں مذہب و ثقافت کے چراغوں کو نہ بچاتے تو ان کا بھی وہی حال ہوتا،

ان جواں مرد سپاہیوں میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا نام سرفہرست ہے، انھوں نے اور ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں نے ہندوستان میں اسلام کی وہی خدمت کی جو قرون اولیٰ

کے اکابر نے پوری دنیائے اسلام کی انجام دی تھی، افسوس کہ اسلامی ہند کے اس عظیم فرزند کا صحیح اور غیر جانبدارانہ مطالعہ اب تک نہ کیا جا سکا، کسی نے ان کو اپنے ذاتی فلسفے کے لیے آلۂ کار بنایا، کسی نے ان پر صرف عقیدت و محبت کے باسی پھول چڑھائے، کسی نے سب و شتم کی بارش کی، کسی نے ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے، آجکل بعض اشخاص اور اداروں نے کام شروع کیا تو وہ بھی ان کی کتابوں کے ترجمے یا ان ہی پرانی ٹیڑھی ترچھی تصویروں کو دوبارہ سامنے لانے تک محدود رہے۔

متقدمین نے شاہ صاحب کے جتنے بھی تذکرے لکھے، ان میں سے اکثر کا یہی حال ہے، نہ ان میں واقعیت ہے نہ تاریخیت، اس لیے ان کے اکثر بیانات دل کو نہیں لگتے اور تصویر کا صحیح رخ سامنے نہیں آتا، ان تذکروں میں ایک تذکرہ مقالات طریقت معروف بہ فضائل عزیزیہ ہے، جسے عبدالرحیم ضیاء حیدر آبادی نے لکھا ہے، یہ کتاب طبع تو آج سے تقریباً سو سال پہلے ہوئی تھی، مگر ایک طویل عرصے سے نایاب تھی، اور اس کے حوالے بھی بہت کم ملتے تھے، اس لیے اس کے متعلق کسی طرح کا خیال نہیں ظاہر کیا جا سکتا تھا، اتفاق سے یہ کتاب راقم کو حیدر آباد کے ایک ذاتی کتب خانے سے دستیاب ہو گئی، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ یہ تذکرہ قدیم ہونے کے باوجود کسی بھی جدید مفصل اور محققانہ تذکرے سے کم نہیں ہے،

یہ کتاب تین سو تیس صفحات پر مشتمل شاہ صاحب کے انتقال کے باون سال بعد ۱۲۹۱ھ میں حیدر آباد میں لکھی گئی اور اس کے دوسرے سال یعنی ۱۲۹۲ھ میں حیدر آباد ہی سے شائع ہوئی، تذکرے کے مصنف محمد عبد الرحیم ضیاء حیدر آباد دکن کے رہنے والے اور شاہ عبد العزیز صاحب کے خلفاء سے قریبی تعلق رکھتے تھے، وہ شاہ اسحٰق صاحب خلیفہ و نواسہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کے خلیفہ اور شاگرد سید شاہ محی الدین صاحب قادری دہلوی کے مرید بھی تھے، فاضل تذکرہ نگار اس کے علاوہ

اور کتابوں کے مصنف اور صاحب دیوان شاعر بھی ہیں، وہ اس کتاب کے ماخذ کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اکثر روایات اہل ہند ثقات سے کہ بعض ان میں صحبت یافتہ حضرت کے ہیں جمع کرکے جو اوپر کہ اس طریق سے حاصل نہ ہوئے، ان کو بذریعہ تحریر جناب فضیلت مآب .... مولانا حافظ حاجی محمد عبد القیوم صاحب دہلوی سلمہ اللہ العزیز القوی داماد و شاگرد حضرت مولانا محمد اسحق علیہ الرحمہ سے بعد دریافت و تحقیق کے اس کتاب میں لکھا"[1]

یہ کتاب چھ مقالات (ابواب) اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے، پہلے مقالے میں مصنف نے شاہ صاحب کے مفصل حالات از ولادت تا وفات درج کیے ہیں، یہ باب چوالیس ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کتاب کا سب سے اہم اور پُر از معلومات باب ہے، دوسرا باب امور متعلق بعلوم ظاہر و باطن" اٹھاون ۵۸ صفحات میں ہے، تیسرا باب شاہ صاحب کی "تعبیر رویا" سے متعلق سترہ ۱۷ صفحات میں ہے، چوتھا باب جو تین ۳ صفحات کا ہے، شاہ صاحب کے "اجوبۂ اسئلہ" سے متعلق ہے، پانچویں باب میں ان کے مختلف سلاسل طریقت کا ذکر بڑی تفصیل سے پینتالیس ۴۵ صفحات میں کیا گیا ہے، آخری باب میں شاہ صاحب کے اجل و ارشد خلفاء کے تفصیلی حالات ساٹھ ۶۰ صفحات میں ہیں، خاتمے میں اپنے پیر و مرشد سید شاہ محی الدین قادری ولیوری کے حالات چوالیس ۴۴ صفحات میں لکھے ہیں، کتاب کے ضمیمے میں مولانا محمد زمان شہید کا تذکرہ جو شاہ صاحب کے خاندان کے مشہور خلفاء میں ہیں، ۲۳ صفحات میں ہے،

اس اجمالی تعارف کے بعد اس پر تفصیلی نگاہ ڈالی جاتی ہے تاکہ اس کی افادیت اور اہمیت کا صحیح اندازہ ہو سکے،

کتاب کے شروع میں مصنف نے شاہ عبد العزیز صاحب کے سلسلۂ نسب اور آباء و اجداد کے مولد و مسکن وغیرہ کا حال لکھا ہے، اس کے بعد شاہ عبد الرحیم صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کے

[1] مقالات طریقت ص ۲،

حالات کسی قدر تفصیل سے دیے ہیں، اس کے بعد رقمطراز ہیں:

"حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے اول اپنے ماموں کی دختر سے نکاح کیا تھا، ان سے مولوی محمد رحمۃ اللہ علیہ پیدا ہوئے، آپ بڑے ولی کامل تھے، آپ پر جذب ۔ ۔ ۔ ت غالب تھا...... مزار آپ کا مع دونوں فرزند کے بوڈھانہ کی مسجد میں واقع ہے، بعد انتقال والدۂ ماجدہ مولوی محمد صاحب کے شاہ صاحب موصوف نے دختر نیک اختر سید ثناء اللہ صاحب ساکن قصبہ سونی پت مسماۃ بی بی ارادہ رحمۃ اللہ علیہا سے شادی کی۔ ان سے چار فرزند پیدا ہوئے، اولین مولانا شاہ عبد العزیز، دوم شاہ رفیع الدین، سوم شاہ عبد القادر، چارم مولوی عبد الغنی اور ایک دختر مسماۃ بی بی امۃ العزیز۔ دختر مذکورہ کو مولوی محمد فایق بن مولوی محمد عاشق ابن شاہ عبید اللہ بن شیخ محمد پھلتی سے شادی کردی، ان کا سلسلہ اب تک باقی ہے"

اس کے بعد شاہ رفیع الدین صاحب، شاہ عبد القادر صاحب اور شاہ عبد الغنی صاحب کی زندگی کے اہم واقعات لکھے ہیں، جو دلچسپی اور معلومات سے خالی نہیں، مگر اس مضمون میں اصل مقصد شاہ عبد العزیز صاحب کے حالات سے بحث ہے، اس لیے طوالت کے خوف سے ان کو حذف کیا جاتا ہے، مگر اس سلسلہ میں ایک اہم بات فاضل مصنف نے یہ بیان کی ہے کہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر کے بیعت کے معاملہ میں عام طور پر یہ گمان کیا جاتا ہے کہ چونکہ شاہ ولی اللہ صاحب کے انتقال کے وقت شاہ عبد العزیز کے تینوں بھائی کم عمر تھے، اس لیے جس طرح شاہ عبد العزیز صاحب ان حضرات کے ظاہری مربی تھے، اسی طرح باطنی مرشد بھی رہے ہوں گے، مگر عبد الرحیم ضیا کے بیان کے مطابق شاہ رفیع الدین صاحب شاہ محمد عاشق پھلتی صاحب سے بیعت واجازت رکھتے تھے اور شاہ عبد القادر صاحب شاہ عبد العدل دہلوی سے بیعت تھے، جن کا مزار حضرت خواجہ باقی باللہ کے احاطے میں ہے۔

کتاب کا اصل مقصد شاہ عبدالعزیز صاحب کے حالات بیان کرنا ہے، ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں :-

"حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ . . . . . میانہ قد، لاغر اندام، گندم رنگ، کلاں چشم، صاف جسم تھے۔ گرداگرد چہرے کے لحیۂ مبارک خوشنما باعتدال تھی۔ اکثر جبہ اس کے نیچے انگرکہ اور پائجامۂ شرعی، دستار کشتی کلاہ پنبہ دار رومال مینی ایک نیلا اور پاپوش زری اور ہاتھ میں عصا عصائے سبز رکھتے تھے، اخلاق میں تخلقوا باخلاق اللہ کے مصداق تھے، مزاج میں نہایت خوش طبعی اور ہر ایک بات کا مذاق تھا۔"

"ولادت آپ کی شب جمعہ بست و پنجم ۲۵ ماہ رمضان ۱۱۵۹ھ میں ہے اور نام تاریخی آپ کا غلام حلیم ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی شب شب قدر بھی تھی، اور آپ ختم قرآن شریف بھی اسی شب کو کرتے تھے۔ اور ختم میں شیرینی قسم ریوڑی سے تقسیم فرماتے تھے۔ آپ کی عمر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ کے انتقال کے وقت سولہ برس چھ مہینے کی تھی، فاتحۂ سوم شاہ ولی اللہ صاحب کا مکان دوراں خاں کے محل کلاں میں ہوا۔"

"رسم دستار بندی میں تین چار پیچ مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے سر مبارک پر باندھے۔ جناب مرزا مظہر جانجاناں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی شریک تھے، آپ نے علوم ظاہر و باطن اپنے پدر والا قدر سے پڑھا، اور مولوی شاہ عاشق صاحب پھلتی سے اس کی تکمیل کی۔ اور بابا افضل کشمیری سے جو منجملہ ارشد تلامذۂ شاہ ولی اللہ صاحب تھے، بعض کتب حدیث کی سند لی، اور علم فقہ اپنے خسر مولوی نور اللہ صاحب جد مولوی محمد عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہما سے پڑھا، اور اکثر فیوض ظاہر و باطن مزار پر انوار پدر بزرگوار سے حاصل کرتے تھے، تھوڑے وقت ان کی قبر شریف پر مراقب رہتے تھے، کوئی علم و فن ایسا نہ تھا کہ جس میں آپ کو دستگاہ کامل نہ ہو۔ خط شکست و نسخ خوب لکھتے تھے،

علم موسیقی میں ملکہ راسخ تھا کہ استادان فن زانوے ادب تہ کرتے تھے، تیراندازی خلیفہ محمد شاکر سے، گھوڑے کی سواری ملک بڑا افسر جابک سواران محمد شاہ بادشاہ سے سیکھی، تمام ہمعنوں میں برتر اور شناوری میں سب سے بڑھ کر، غرض آپ کی ذات جامع کمالات معاصرین پر فائق بلکہ یکتا زمانہ تھی، اور فیض باطن حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے آپنے پایا ہے ...."

" اور تین موضع آپ کی جاگیر تھی، ان کی سند عالم بادشاہ اور دولت ماؤ سند یہ نے گزرانی تھی حسن پور اور مراد آباد پرگنہ سکندر آباد سے چاروں بھائیوں میں مشترک اور ایک موضع یعنی محل جینہ پرگنہ بوڈھانہ سے بلا شرکت آپ کے تصرف میں تھا، چنانچہ وہ موضع اپنے دونوں نواسے مولانا محمد اسحٰق اور مولانا محمد یعقوب کو عطا کیا تھا، ابتک جاری ہے، مولوی نصراللہ خاں صاحب کہتے ہیں کہ میری عملداری میں محل جینہ کے سالانہ بارہ سو روپئے کلدار ہوتے تھے اور اب بھی وہی ہے سوا اس کے اکثر جا سے فتوحات بلاقید سال و ماہ اللہ تعالیٰ پہنچاتا تھا، جو شخص کچھ گذرانتا تو قبول فرماتے اور نہ دیتا تو ذکر تک بھی نہ لاتے، خدمت طلبا اور فقرا وغیرہ کی بہت کرتے تھے، گویا جود و کرم آپ کا سرشت تھا، جو سائل آتا تھا بے نیل مرام نہ جاتا تھا"

اس کے بعد شاہ صاحب کے درس و تدریس، تربیت باطن اور تصنیف کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

"جاننا چاہیے کہ دنیا میں فیض بخشی کے بہت طریقے ہیں، مگر ان میں تین طریقے مشہور و معروف ہیں، ایک تدریس دوسرا تربیت باطن جسے مریدی کہتے ہیں، تیسرا تصنیف، اور یہ ابواب منجملہ بہترین باقیات الصالحات ہیں، ان امور میں حضرت کا پایۂ بلند اور رتبۂ ارجمند تھا تدریس کا یہ حال کہ ہندوستان وغیرہ میں کوئی عالم کم نکلے گا جس کو حضرت سے واسطہ نہ ہو، کہتے ہیں کہ ایک بدایوں کے عالم نے حدیث شریف پڑھنے کا ارادہ کیا، مگر اس کو نادانی سے یہ خیال آیا کہ

اس شخص سے پڑھے کہ جس کے سلسلے میں شاہ عبدالعزیز نہ ہوں، تمام ہندوستان پھرتے پھرتے حیران ہوا، جہاں گیا وہاں حضرت ہی کا فیض پایا، کوئی ایک واسطے سے کوئی دو تین واسطے سے حضرت کا شاگرد نکلا، یہ بات ایسی ہے کہ جیسے کسی نے انسانوں میں اپنی نسبت کرنی چاہی مگر یہ قید لگائی کہ اس خاندان میں ہو جس میں حضرت آدم علیہ السلام نہ ہوں،"

"مگر آپ نے مستقل بجز چار پانچ شخص کے اور وں کو بہت کم پڑھایا ہے، یعنی اپنے تینوں بھائیوں کو کہ رفیع الدین صاحب والد کے انتقال کے وقت مبتدی اور عبدالقادر صاحب صرف میر پڑھتے تھے، اور عبدالغنی صاحب قرآن شریف حفظ کرتے تھے، تمام علوم پڑھایا اور اپنے داماد مولوی عبدالحی صاحب کو، مولوی عبدالقیوم صاحب، مولانا اسحٰق صاحب علیہ الرحمہ سے نقل کرتے ہیں کہ مولانا صاحب مجھ سے فرماتے تھے، میں نے کسی کو نہ دیکھا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہٗ بعد غلبۂ آشوب چشم کے بھی پڑھائے ہوں مگر تمھارے والد مولانا عبدالحی صاحب کو اور جناب غلام علی شاہ صاحب مجددی علیہ الرحمہ بھی شاگرد ہیں، بخاری شریف پڑھی ہے[1]۔ ان حضرات کے سوا اگر کسی کو پڑھایا ہے تو تین چار سبق سے زیادہ نہیں پڑھایا"

"اور صبح کو جو ایک رکوع قرآن شریف کا قریب طلوع آفتاب ہر روز ایک نفر کے ساتھ سنا کرتے تھے، یہاں تک کہ بروز وفات بھی سنا ہے، اس کے قاری خاص مولانا اسحٰق صاحب ہوتے تھے، .... اور آپ کے برادروں کے ساتھ مولوی مفتی الٰہی بخش صاحب ساکن کاندھلہ اور مولوی قمرالدین صاحب منت تخلص وغیرہ سامع تھے، اسی طریق سے انھوں نے تحصیل کی"

شاہ صاحب کے درس اور شاگردوں سے متعلق اس کتاب کی روایت انوکھی اور عجیب سی ہے، مصنف لکھتے ہیں:-

---

[1] ان حضرات کے علاوہ تذکرہ نگار نے شاہ ابوسعید صاحب کو بھی شاہ صاحب کا شاگرد بتلایا ہے۔

"مولوی عبدالقیوم صاحب فرماتے ہیں، میں نے مولانا اسحٰق صاحب سے پوچھا کہ حضرت اکثر لوگ جو کہتے ہیں
کہ ہم شاہ صاحب کے شاگرد ہیں، شاہ صاحب نے ہمیں تعلیم کی ہے، اس کی کیا حقیقت ہے، آپنے
فرمایا کہ بعد نابینا ہونے کے شاہ صاحب سے پڑھنے کی دو صورتیں تھیں، ایک تو میں صبح کو قرآن شریف
کا رکوع پڑھتا تھا، اس میں لوگ سامع رہتے تھے، دوسرے یہ کہ علماء و فضلاء اور بڑے بڑے
بزرگوار اطراف سے حاضر ہوکر حصول اجازت تیمناً تبرکاً چاہتے تو حضرت شاہ صاحب فرماتے
کہ چہل قدمی کے وقت پڑھیں میں سنوں گا، اس وقت کچھ بیان بھی کرتے تھے، اس قسم کے شاگرد
بے شمار ہیں، سوا اس کے جمعہ اور منگل کو قرآن شریف کا درس بطور وعظ کے ہوتا تھا، اسکی کیفیت
مرزا احمد علی شاہ صاحب قادری چشتی اپنے استاد مولوی یار محمد صاحب مرحوم کی زبانی جو حضرت کے
شاگردوں میں سے تھے، یوں بیان کرتے ہیں کہ آپکے وعظ میں ہزارہا آدمی رہتے تھے، ان میں
جو پڑھے لکھے تھے وہ لوگ ایک ایک تفسیر اپنی اپنی استعداد کے موافق عربی ہو یا فارسی لیکر
بیٹھے رہتے، جب کوئی آیت شروع کرتے تو حضرت ہر ایک سے پوچھتے کہ امام رازی کیا معنی کرتے
ہیں اور شیخ محی الدین ابن عربی کیا فرماتے ہیں اور قاضی بیضاوی کیا لکھتے ہیں، علیٰ ہذا القیاس جس کے
پاس جو تفسیر ہوتی وہ اپنا بیان کرتا، جب سب تفسیریں ہو جاتیں تب آپ فرماتے، خیر یہ سب
بیان ہو چکا، اب جو خدائے تعالیٰ نے اس فقیر کے دل پر القا کیا ہے بیان کرتا ہوں پھر
وہ مضامین فرماتے کہ کسی مفسر کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آئے ہوں، سب لوگ کتابیں بند کرکے
حضرت کا منہ تکتے رہتے اور ششدر ہو جاتے .... مولوی یار محمد صاحب علیہ الرحمہ
مدتوں خدمت فیض درجت میں رہے ہیں اور کئی دورے قرآن مجید کے ان کے روبرو
ہوئے ہیں، ان دوروں کا قرآن مجید شروع سے آخر تک محشیٰ ان کے فرزند مولوی
محمد اسحٰق صاحب کے پاس موجود ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب بھی اسی طرح درس فرماتے تھے،

اخیر درس ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم تھا، وہاں سے حضرت نے شروع کیا اور حضرت کا آخری درس آیۃ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم تھا، حضرت کے بعد وہاں سے مولانا اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شروع کیا۔"

شاہ صاحب کے درس و تدریس کی کیفیت سننے کے بعد ان کے تصوف اور طریقۂ تربیتِ باطن کا بھی کچھ حال تذکرہ نگار کی زبانی سنیے، یوں تو انھوں نے اس کا ایک مستقل باب ہی قائم کیا ہے مگر اس باب میں بھی مختصراً رقمطراز ہیں:

"تربیت باطن کی یہ کیفیت ہے کہ آپ کو تمامی آداب سکون اور اشتغال طریقت میں دستگاہ کامل اور ملکۂ راسخہ تھا، جیسا چاہتے تھے ویسے طالبوں کو خدا تک پہنچاتے تھے، کوئی طریقے کے مقید نہ تھے، کیونکہ اپنے عزیز و اقارب برادروں کی اولاد یعنی مولوی مخصوص اللہ صاحب اور مولوی اسمٰعیل صاحب[1] اور مولوی یعقوب صاحب اور مولانا اسحٰق صاحب وغیرہ سے قادریہ طریقت میں بیعت لی تھی، اور امراء کو سلسلۂ چشتیہ میں اور دوسروں کو سلسلۂ نقشبندیہ میں مرید کرتے تھے، چنانچہ جناب سید احمد صاحب طریقۂ نقشبندیہ میں مرید تھے مگر مولانا عبدالحئی صاحب کو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب سے بیعت تھی، اور شاہ صاحب خود صاحب طریقہ ہیں، کیونکہ آپ نے بعد تکمیل سلوک راہ ولایت اور سلوک راہ نبوت کے خاص ایک طریقہ سلوک راہ ولایت کا برعایت طبائع ابنائے روزگار استخراج کیا ہے، وصول الی اللہ کے واسطے نہایت آسان و سہل ہے، اس ہیچمیرز نے اس خاص سلوک طریقہ علیہ عزیزیہ کو مقالۂ پنجم میں لکھا ہے ...... اور حضرت کی توجہ وغیرہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا، اگر کوئی خواہاں ہو

[1] مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحئی صاحب کے شاہ صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب سے بیعت ہونے میں راقم کو اختلاف ہے، عام روایت کے مطابق یہ بزرگ سید احمد شہیدؒ سے بیعت تھے، ممکن ہے ان میں سے کسی ایک نے تبرکاً بیعت کی ہو اور باقاعدہ تعلیم بعد میں سید احمد شہیدؒ سے حاصل کی ہو، بہرحال یہ بات تحقیق طلب ہے۔

تو فرماتے کہ تم غلام علی شاہ صاحب کے پاس جاؤ کہ وہ صاحب طریقہ اور دکا مدار اور اس کام کے ذمہ دار ہیں، یہ فقیر طریقہ تعلیم علوم ظاہری رکھتا ہے، اس پر بھی کوئی بہت خواہش اور الحاح کرتا اور آپ کے ذہن حالی میں آتا تو اس کے واسطے ایک وقت معین فرماتے اور جاے مقرر کرتے، مثلاً کسی کو بعد نماز مغرب اور کسی کو بعد نماز ظہر یا دوسرے وقت جو مناسب جانتے تعین کرتے، جیسے جناب سید احمد صاحب اور سید اللہ دیا صاحب برہان پوری اور مولانا یعقوب صاحب اور شیخ غلام جیلانی صاحب باغ پتی اور حافظ قطب الدین صاحب پھلتی، یہ اکابر حضرت سے توجہ لئے ہیں اور تکمیل کو پہنچے ہیں۔ ...... "

شاہ عبد العزیز صاحب کی تصانیف کے سلسلے میں بھی اس کتاب کی روایتیں کچھ کم اہم نہیں ہیں، اس سے ان کی بہت سی تصانیف کے بارے میں شبہات اور ابہام دور ہو جاتا ہے، لکھتے ہیں:-

"حضرت کی تصانیف کی تمام زمانے پر ظاہر و باہر ہے، بیان کی احتیاج نہیں، تفسیر فتح العزیز، تحفہ اثنا عشریہ، سر الشہادتین، بستان المحدثین، عجالۃ النافعہ، حواشی قول الجمیل، یہ تمام کتابیں مشہور و مطبوع ہیں، سوا ان کے علم معانی میں ایک رسالہ ہے۔ سوا اس کے صدرہ اور میر زاہد رسالہ پر بھی حواشی ہیں، حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری سلمہ اللہ تعالیٰ مولوی نور اللہ سے روایت کہتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی ایک تفسیر فارسی تمام قرآن مجید کی اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود ہے مگر وہ چھپی نہیں۔ تفسیر فتح العزیز کے لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ آپ کی ایام جوانی میں عادت تھی کہ بعد نماز عصر تفریح رکھتے، اخبار دیار و امصار گوش زد ہوتے، دوسرے سخن و قصص بھی درمیان آتے اور اشخاص اسی قسم کے جمع ہوتے تھے، چنانچہ ایک کالستھ بھی دربار یوں سے بادشاہ شاہ عالم کے اسی وقت حاضر ہو کر قصص دیار عرض کرتا، آخر کار وہ کالستھ فیض صحبت سے مسلمان ہو کر

شیخ مصدق الدین نام پایا، اور کمال کو پہنچا، ان ہی کے حسب استدعا ۱۲۰۱ھ میں تفسیر شروع ہوئی، چنانچہ خود بدولت دیباچے میں تفسیر کے یہ کیفیت مفصل تحریر فرمائے ہیں شیخ مصدق الدین کے فرزند مولوی کرم اللہ صاحب بڑے فاضل اور ولی کامل خلفاء سے غلام علی شاہ صاحب کے ہوئے ہیں"۔

"مرزا عمر علی شاہ صاحب قادری چشتی اپنے استاد مولوی یار محمد صاحب مرقوم الصدر سے روایت کرتے ہیں، تفسیر کے ناتمام رہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و اصحابہ وسلم نے خواب میں جناب شاہ صاحب کو فرمایا کہ تم تفسیر لکھنا موقوف رکھو، اگر تمام کروگے تو اور تمام مفسرین کی محنت بے فائدہ ہوگی، کوئی کسی کی تفسیر نہ دیکھے گا، تمھاری اتنی ہی تفسیر کوئی سمجھے تو تمام قرآن کے مضامین پر حاوی ہوگا، آپ نے حسب الحکم موقوف کیا، سورۂ بقرہ ناتمام رہا واقعی ایسی ہی تفسیر نادر ہے کہ اس کے وصف میں زبان قاصر ہے، باوجود ضوابط علم تفسیر کے صحت روایات و آداب سلوک و اسرار حقایق و نکات معارف ایسے ہیں کہ اور تفاسیر میں کم ہوں گے، جناب امام رازی قدس سرہ نے آیت کا ربط آیت سے دیا ہے، حضرت نے سوا اس کے سورہ کو سورہ سے مربوط کیا ہے، اس کی تحریر کا یہ حال تھا کہ مسودہ کا اتفاق نہ ہوا، اور جو لفظ فرمایا پھر دوبارہ وہ زبان پر نہ آیا، مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو حضرت کے آخر وقت کے مستفیضوں میں سے ہیں، حسب خواہش سکندر بیگم مغفورہ والیۂ بھوپال تفسیر مذکور کا تکملہ ستائیس جلدوں میں کیا ہے، راقم نے دیکھا ہے، بہت خوب لکھا ہے، اس عصر میں ایسی استعداد و لیاقت کی فرد نایاب ہے، دوسرے کا منہ نہیں جو یہ تمت کرسکے۔ مگر دونوں کا فرق کرنے والا اپنے حوصلے کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔[1]

---

[1] (حاشیہ ص ۱۹۵ پر ملاحظہ ہو)

"تحفہ اثنا عشریہ بھی آپ کی زندگی میں یعنی ۱۲۱۵ھ میں طبع ہو کر مشہور ہوئی،
اور وہ بھی ایسی ہی بے ساختہ لکھی گئی[1]۔ کہتے ہیں کہ جب تحفہ اثنا عشریہ چھپ کر شہرت پائی
تو ایک کلکتہ کا کوئی نواب شیعہ مذہب تھا۔ اس کو نہایت شاق گذرا، اس نے وہ کتاب
اور بہت سے روپئے ایران کو روانہ کرکے وہاں کے فضلا اور علماء کو لکھا کہ یہاں
سنیوں کو اس کتاب کی عبارت اور مضمون پر ناز ہے، چاہیے کہ دونوں کا رد ہووے
ایران میں تمام فضلا، اور ارباب انشاء جمع ہو کر مدت دراز تک تمام کتاب بکرات
و مرات دیکھی، کچھ نہ ہو سکا، آخر کو وہ روپئے سب چکھ چکھا کر اس کے جواب میں
ایک نامہ لکھ کر روانہ کیا، اس کا مضمون یہ تھا کہ صاحب تحفہ نے جو اپنے مذہب
کی قدیم کتابوں کا حوالہ دیا ہے، اس ملک میں وہ مذہب صدہا سال سے اٹھ جانے
کے سبب سے وہ کتابیں ہمدست نہیں ہو سکتیں اور جو ہمارے مذہب کی قدیم کتابیں
اس میں مذکور ہیں ہم نے اب تک دیکھا نہیں، مضمون کا رد تو کتابوں کی قدرت پر موقوف
ہے، رہی عبارت ایسی صاف اور بے تعقید کس منشی کا منہ ہے جو لکھ سکے، سبحان اللہ"

"آپ سے نظم و نثر بھی بہت یادگار ہے، اس محل پر برکتاً فقط ایک بیت، ایک
قطعہ اور ایک قصیدے پر اکتفا کیا[2]"

(حاشیہ ص ۱۹۴) شاہ صاحب کی تفسیر فتح العزیز کے سلسلے میں بہت سے شواہد اور نادر و معتبر روایات راقم کو فراہم ہوئے ہیں
جن کی روشنی میں مختلف اور حیرت انگیز نتائج برآمد ہوتے ہیں، چونکہ یہ بحث طویل ہے اس لیے اسے الگ مقالے کی شکل
میں عنقریب پیش کیا جائے گا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [1] تحفہ کا یہ نسخہ بہت ہی اہم ہے، یہ پہلی بار تین سو کی تعداد میں ۱۲۱۵ھ میں کلکتہ سے شائع ہوا،
راقم کی نظر سے اس کے دو نسخے گذرے ہیں [2] اس کتاب میں جو اشعار ہیں وہ اور ان کے علاوہ دیگر مخطوطات و مطبوعات
سے جو اشعار مل سکے ہیں، ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے جو راقم کے پاس موجود ہیں، اس کے علاوہ بعض نادر
ادبی مرقعے و تسخیر یحات ایک الگ مضمون کی شکل میں پیش خدمت ہوں گے۔

فاضل تذکرہ نگار نے شاہ صاحب کی وفات کی بھی جو کیفیت بیان کی ہے، اس کی تفصیلات موجودہ روایات میں بیش قیمت اضافہ ہیں، ان سے اصل واقعات کی تمام کڑیاں مل جاتی ہیں، مصنف رقمطراز ہیں:۔

"آپ بہت قلیل الغذا اور کثیر الامراض تھے، جب وقت قریب آیا تو چند روز سے غذا ترک کی، مرض کی شدت تھی، وعظ کا دن آیا، آپ نے فرمایا مجھکو پکڑے رہو جب بیان شروع کر دوں تو چھوڑ دینا، ویسا ہی کیا یعنی قوت روحانی اور فیض ربانی کا غلبہ ہوا، آپ کو چھوڑ دیا، وعظ فرمانے لگے ہزاروں آدمی جمع ہوئے، اس حال میں بھی جیسا دور والے سنتے تھے ویسا ہی نزدیک والے بھی سنتے تھے بعد ازاں آیۂ شریفہ ذوی القربیٰ والیتمیٰ والمسٰکین وابن السبیل کا بیان کیا، اسکے مطابق نقد اور اسباب سب تقسیم فرمایا، من بعد قریب لاکھ روپئے کے نقد اور دوسرا اسباب بیش قیمت جو رہا تھا اس میں سے چند ہزار روپئے واسطے زاد راہ سفر حجاز اور ادائے مناسک حج وعمرہ وغیرہ کے اپنے نواسے مولانا محمد اسحٰق اور مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہما کو عنایت کیے اور چند ہزار روپئے مصارف مراسم وفات و تعزیت کے لیے دیے، بعد ازاں کچھ اشعار عربی اور فارسی پڑھے، اور بہت شعر ایسے کہ ایک مصرع دوسروں کا اور ایک مصرع اپنا، چنانچہ یہ شعر مشہور قدسی علیہ الرحمہ کا ؎

نہ زقیامت چوں شود ہر کس بگیرد نامۂ	من نیز حاضر میشوم تصویر جاناں در بغل

بجائے مصرع ثانی آپ نے فرمایا

من نیز حاضر میشوم تفسیر قرآں در بغل

پھر فرمایا کہ میرا کفن ایسے کپڑے کا ہو جو میں پہنے ہوں، کرتا آپ کا ادھوتر کا اور پائجامہ گاڑھے کا ہوتا تھا، اور فرمایا کہ جنازے کی نماز باہر شہر کے ہو، اور بادشاہ میرے جنازے پر نہ آوے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، ساتویں تاریخ ماہ شوال روز یکشنبہ ۱۲۳۹ھ وقت طلوع آفتاب کے ذبح پر متوجہ

اس عالم گذران سے جانب عالم جاودانی روانہ ہوئی جس جائے آپ کو غسل دیا گیا تھا؛ خاک معطر ہوئی تھی، بہت لوگوں نے اپنے مکان میں اس کو رکھا تھا، اول بار دروازہ ترکمانی دہلی کے باہر مولانا محمد اسحٰق صاحب نے امام ہوکر نماز پڑھائی، بعد ازاں نصیر الدین صاحب کا کھنو شافعی کے مقبرے میں جماعت سے نماز ہوئی، یہاں تک کہ پچپن بار جنازے کی نماز پڑھی گئی، جوق در جوق آتے تھے اور پڑھتے تھے۔ بعض مقامات میں غائبانہ بھی نماز ہوئی ہے، مزار پر انوار آپ کا شاہجہان آباد کے باہر دہلی دروازے کی سمت مہندیوں کے قریب خوش نزد کے چھتے میں واقع ہے[1]، اصل میں کوشک انور اس جائے کا نام تھا، اب زبان زد عوام خوش نزد کا چھتہ مشہور ہے، اور شیخ عبد الرحیم صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبد القادر صاحب مولوی عبد الغنی صاحب اور مولوی مخصوص اللہ صاحب وغیرہ قدس اللہ اسرارہم، ان سب کے مزار و ہیں ایک ہی احاطے میں ہیں۔"

اس کے بعد شاہ صاحب کی تاریخ وفات کے شاہ رؤف احمد مجددی، ارتضا علی خاں صاحب گوپاموی اور حکیم مومن خاں مومن وغیرہ کے قطعات تاریخ درج کیے ہیں جس سے یہ پوری طرح واضح ہوتا ہے کہ شاہ عبد العزیز صاحب کا انتقال ۱۲۳۹ھ میں ہوا تھا، نہ کہ ۱۲۴۰ھ میں، اصل میں موخرالذکر سال سب سے پہلے سر سید نے شاہ صاحب کے تذکرے میں آثار الصنادید میں غالباً غلطی سے لکھ دیا تھا، اسکے بعد سے متعدد تذکرہ نویسوں، مثلاً رحمان علی[2]، رحیم بخش دہلوی[3] اور اسماعیل گودھوری وغیرہ نے یہی سنہ سر سید سے نقل کرکے لکھ دیا ہے، حالانکہ سر سید کی اس روایت کے خلاف بہت سارے نظائر اور قلمی خطوط [illegible] کرے

---

[1] یہ جگہ میر[illegible] روڈ کے سامنے جیل خانہ اور مولانا آزاد میڈیکل کالج کے پیچھے واقع ہے اور اب قبرستان مہندیوں کے نام سے مشہور ہے، اسی قبرستان میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی مرحوم کو بھی دفن کیا گیا ہے۔

[2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۲۲ [3] حیات ولی ص ۴۴۲

کی شکل میں موجود ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ یہ قدیم تذکرہ اور اس کے ساتھ مختلف ہمعصروں کے قطعات تاریخ وفات سرسید اور ان سے نقل کرنے والے حضرات کی تردید ہوتی ہے۔

تذکرہ نگار نے اس کے علاوہ اور بہت ساری باتیں اس کتاب میں ایسی درج کی ہیں جو کسی اور تذکرے میں اب تک نہیں ملتیں مگر طوالت کے خوف سے ان کو حذف کیا جاتا ہے اور صرف انکی موسیقی کے سلسلے کی چند روایتیں ناظرین کی خدمت میں پیش ہیں[1]

"روایت ہے کہ حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری کا سے وہ روایت کرتے ہیں مولوی وحید الدین صاحب پھلتی سے کہ وہ شاگرد ہیں مولانا اسمٰعیل شہید کے اور خلیفہ ہیں سید احمد صاحب قدس سرہ کے اور تیرہ سال حضرت شاہ صاحب اور مولانا عبدالقادر صاحب قدس سرہا کی خدمت میں رہے ہیں، کہا انھوں نے کہ نواب نصر اللہ خاں والی رامپور کے یہاں ایک قوال مسمی ہمت خاں بڑا صاحب کمال تین سو روپئے ماہوار کا نوکر تھا، تمام گویئے اسکو مانتے تھے ثانی نہیں جانتے تھے، ایک دن اسکو خیال آیا اگر مجھکو تمام لوگ بڑا کمال والا جانتے ہیں، اس کا کچھ اعتبار نہیں، میں اپنے ہنر کو جب تک حضرت کے محک امتحان پر عرض نہ کروں اور ان کی زبان سے سند نہ لوں تو کیونکر اپنے کو کچھ چیز سمجھوں کس لیے کہ اس زمانے میں اس ذات جامع الکمالات کی جیسی کوئی ذات نہیں اور کمال وہی معتبر ہے جو اہل کمال پسند کریں اور داد دیں ...... اسی آرزو میں دہلی کو آیا وہ حضرت کا آخر زمانہ تھا کہ بینائی سلب ہوگئی تھی اور تمام حواس میں ضعف طاری تھا، روبرو حاضر ہو کر سلام کیا، آپنے سلام کا جواب دیا اور فرمایا کہ آؤ ہمت خاں اچھے تو ہو سنتے ہی نہایت حیران وششدر رہوا، اور تمام صاحب متعجب ہوئے کہ یہ شخص تو کبھی یہاں نہیں آیا اور نہ کبھی حضرت نے اس کی آواز سنی اور نہ صورت دیکھی یہ کیا بات ہے کہ اس کا نام لے کر پکارا، اس نے بھی

---

[1] شاہ عبدالعزیز صاحبؒ موسیقی کے بہت اچھے عالم تھے، تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ "شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی ایک نایاب تصنیف" معارف دسمبر ۱۹۶۴ء

استفسار کیا تو فرمایا کہ تمہارے گانے کا لوگ ذکر کیا کرتے تھے کہ ان کی آواز میں یہ بات ہے اور اس طرح کا اتار چڑھاؤ ہے، وہ بات صاف تمہارے گلے سے پائی گئی تو میں نے جانا کہ اس انداز کا تمہارے سوا کوئی نہیں ہے، جب اس نے اپنا مدعا عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں اپنا جوہر حضرت کے روبرو عرض کروں، ارشاد ہوا کہ مناسب، پھر حضرت نے ایک دن حضرت شاہ رفیع الدین صاحب اور مولانا عبدالقادر صاحب وغیرہ بڑے بڑے کملا کو جمع کیا اور کوئی اغیار سے نہ رہا تب اس کی یاد ہوئی، اور وہ گانے لگا، جو جو چیزیں اس کو یاد تھیں سب سنا دیں، تمام حضار کو رقت ہوئی، حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کہ نہایت مستقل مزاج تھے، ان کے بھی اشک جاری ہوئے، چادر منہ پر ڈالے ہوئے بیٹھے رہے، اور حضرت بھی کھنڈ وے پر جنبان تھے، جب وہ سب گا چکا تو فرمایا کہ واقعی تم اپنے کمال میں یکتا ہو مگر اس وقت شاید پر توے ان فقرا کے تمہارے بھی مزاج میں کچھ تغیر واقع ہوا ہوگا کہ فلاں فلاں مقام میں یہ یہ بات رہ گئی در نہ تم کو بخوبی معلومات ہوگی، اس نے عرض کی کہ پیر و مرشد فدوی کو جو کچھ معلوم تھا سب عرض کیا، یہ جو حضرت نے فرمایا ہے اس کا علم نہیں، کچھ حضرت کی طرف سے ارشاد ہو، جب آپ نے جس جس مقام میں جو جو اتار چڑھاؤ رہ گیا تھا اس کو باحسن وجہ سنایا اور سمجھایا وہ نہایت خوش ہوا اور اپنے کو سب کچھ چیز جانا۔

ایک اور جگہ نواب مبارک علی خاں مؤلف کمالات عزیزی کی روایت سے جنھوں نے اپنی کتاب میں بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں :

" دو قوالوں میں ایک راگ کی تشخیص میں بڑا اختلاف تھا، آخر باتفاق ہمدگر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ راقم (نواب مبارک علی خاں) بھی اس وقت قریب موجود تھا، قوالوں کی تقریر سنکر چلا گیا، مگر وہ اپنا سوال عرض کر چکے تھے، حضرت نے ایسی کیفیت اس راگ کی بیان کی

اور اس طرح اس کو سنا دیا کہ دونوں کا اطمینان خاطر ہوا اور دونوں خوش ہو کر دعا دیتے ہوئے چلے گئے۔"

شاہ عبدالعزیز صاحب آخر عمر میں مختلف پریشان کن عوارض میں مبتلا تھے، ان کی طرف بھی مصنف نے کئی جگہ اشارہ کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں: ۔

"روایت ہے مولوی شجاعت حسین صاحب غازیپوری سلمہ اللہ تعالیٰ سے وہ روایت کرتے ہیں اپنے استاد مولوی سخاوت علی صاحب جونپوری کا سے، وہ شاگرد ہیں مولانا اسمٰعیل دہلوی شہید کے کہا انھوں نے کہ حضرت کو شدت حرارت قلب سے دھڑکے کا عارضہ تھا، تو کبھی کبھی شاہراہ عام میں جو روبرو دولت سرا کے تھا، عصر کے وقت واسطے تخفیف عارضہ اور تفریح طبع کے چہل قدمی کیا کرتے تھے۔"

شاہ صاحب کی یادداشت اور انکے کمالات کے سلسلے میں ایک طویل قصہ لکھنے کے بعد آخر میں لکھتے ہیں: ۔

"..... یہ ماجرا اس ایام میں تھا کہ جن روزوں حضرت بسبب قصور ہضم کے دو یا تین تولے غذا اور اسی قدر نمک سلیمانی کھا کر چار ہزار قدم مشی فرماتے تھے۔"

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے حالات میں ایسے متعدد واقعات اور کیفیات مصنف نے بیان کیے ہیں جن کو نقل کرنے کی گنجایش اس مقالے میں نہیں ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب کے بہت سے تلامذہ کے تفصیلی حالات جو اب بالکل نایاب ہیں، اس تذکرے میں ملتے ہیں، خاص طور پر سید احمد شہیدؒ، شاہ اسحٰق، مولانا یعقوب اور مولانا سراج احمد خورجوی کے حالات دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اس مختصر سے تعارف سے ناظرین اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ہندی شاعری کا ایک تاریخی جائزہ

از جناب زیدی جعفر رضا صاحب شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۹)

دورِ ارتقاء | ہندی شاعری کی عمارت زمانۂ شرنگار کے اواخر تک آتے آتے بڑی جاذب نظر ہو گئی تھی، اس کے نقش و نگار اہلِ دل کو متاثر کرنے لگے تھے لیکن یہ تاثر وقتی تھا، ہندی شاعری میں ابتک ذہنوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی صلاحیت نہیں تھی، ادب، خواہ کسی زبان کا ہو جب تک دل و دماغ کو یکساں طور پر اپیل نہیں کرتا زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا، اس لیے زندگی کے حقائق کی ترجمانی ادب کے لیے ضروری ہے، ادب کو زمانے کی روش اور مسائل قوم و ملت کے درد خلوص و محبت کی چاشنی اور ماضی اور حال کی روایات کا آئینہ دار ہونا چاہیے، ہندی شاعری نے اپنے دور ارتقاء میں ان منازل کو درجہ بدرجہ طے کیا ہے، کبھی برج بھاشا کی شاعری سے اپنے رشتے جوڑتی رہی کبھی اس نے اردو زبان کی روز افزوں مقبولیت اس کے نکھرے اور صاف ستھرے روپ کو دیکھکر خود بھی کھڑے ہونے کی کوشش کی، اور جب اس نے اپنے جسم میں کچھ توانائی محسوس کی تو اردو کی رگ حیات کو اپنے اہنسا وادی ہاتھوں سے منقطع کر دینا چاہا، اس سلسلے میں اس نے دانشمندی کا ثبوت بھی دیا لیکن کج فہمی اور نادانی کی مثالیں زیادہ پیش کیں، ہم یہاں پر ہندی ادب کے ارتقائی دور کے ان ہی زینوں کا مطالعہ کریں گے،

پہلا زینہ ۔ برج بھاشا کی شاعری | ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد ملک میں جو سماجی، سیاسی اور مذہبی تبدیلیاں ہوئیں ان کی روشنی میں ادب کے دھارے کا کروٹ لینا لازمی تھا، ہندستانی

ب نے اس بات کو محسوس کیا، انگریزی حکومت نے زمینداروں کو اور ریاستوں کو ختم نہیں کیا تھا اور
ن ریاستوں سے متعلق شعراء اب بھی برج بھاشا کی پرانی دھنوں میں راگ الاپ رہے تھے، اس کے
ناوہ ہندی کے بیشتر شعراء شاعری کے جدید دھارے کو دیکھنے کے باوجود ابھی برج بھاشا کا موہ
ترک نہیں کرسکے تھے۔

ہندی کے قدیم شعراء نے نکھ شکھ (नख-शिख) بارہ ماسا (बारह मासा)
رنائیکا بھید (नायिका भेद) کا بڑا وقیع ادب پیش کیا تھا لیکن ہندی کے نئے دور کی آرزو میں
دھر ضروریات اس سے بالکل مختلف تھے، ادب کو جدید رجحانات قبول کرنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے،
ہندی کے شعراء پر انگریزیت کا مطلق اثر نہ تھا، جو خالص ہندوستانی تمدن اور تہذیب کے خواہاں تھے جنھیں
پنی دیومالاؤں سے بے پناہ عقیدت تھی، جنھیں اپنے وطن سے محبت تھی لیکن ایک ایسے وطن کی آرزو تھی جو
آزاد ہو، جن میں ہند و قوم کی ترقی کے سپنے ہوں، اس لیے ان کی طبیعت ان جدید رجحانات کی طرف
ائل نہ ہو سکی، انگریزی ملک کی قومی زبان بن چکی تھی، اردو کو صوبائی زبان تسلیم کیا جا چکا تھا، جدید طریقہ
تعلیم نے اردو اور انگریزی کو فروغ دیا، ہندی نے جان بوجھ کر تو نہیں لیکن غیر شعوری طور پر ان اثرات
کو قبول کیا، اس سلسلے میں پنڈت کرشن شنکر شکل لکھتے ہیں:۔

"اردو ادب کے تعلق سے پہلا اثر ہماری شاعری پر یہ پڑا کہ گنبھیر ویدنا کی عکاسی کی طرف شعراء مائل ہوئے،
اس کا محرک بھارتیندو جی کو سمجھنا چاہیے۔ وہ نثر نگار (نقش) کو ٹیڑھی ترچھی لکیروں سے نکال کر احساسات
کی سطح تک لائے۔" (آدھنک ہندی ساہتیہ۔ پنڈت کرشن شنکر شکل ص ۳۲)

انگریزی ادب کے اثر سے برج بھاشا میں قدرتی مناظر کی تصویریں پہلے کے مقابلہ میں زیادہ جاندار
روپ میں سامنے آئیں، قدیم ہندی شعراء کی نگاہیں بھگوان کے مختلف روپوں اور نایک نائیکا کے نازوغمزوں
کے گرد ہی طواف کرتی رہی تھیں، انھیں نیچر کا مطالعہ کرنے کا بہت کم موقع نصیب ہوا تھا جس کو

انگریزی ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے، ہندی شعرا میں ہرشچندر نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور پرکرت یا نیچر کو اس کے خالص روپ میں پیش کیا ٹھاکر جگ موہن سنگھ نے آگے چل کر نیچر کے بڑے ہی خوبصورت مناظر پیش کیے، ان کی تخلیقات برج بھاشا کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ثابت ہوئیں، بھارتیندو جی کو برج بھاشا پر قدرت حاصل تھی، ان کے زمانے میں اس زبان میں کوملتا اور حلاوت کی پہلے سے بھی زیادہ آویزش ہوئی، سری کرشن شنکر شکل لکھتے ہیں:

"آدھنک کال کی برج بھاشا کی شاعری کے بارہ میں یہ بات فخر کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ برج کا استعمال جتنا خالص روپ میں اس زمانے میں ہوا اتنا اور کسی زمانے میں نہیں ہوا تھا، بھارتیندو، رتناکر، شری دھر پاٹھک، پنڈت ستیہ نارائن کوی رتن، وِیوگی ہری، رام چندر شکل، پنڈت ایودھیا سنگھ اپادھیا وغیرہ برج کے ذی شعور پرستاروں کے ہاتھوں بھاشا کا بڑا ہی صاف ستھرا اور نکھرا ہوا روپ سامنے آیا۔" (آدھنک ہندی ساہتیہ ص ۳۶)

اس زمانے میں برج بھاشا میں لکھی جانے والی تصانیف میں اُدھو شتک (ज्वयवथतक) گنگاوترن (जंगा वत रण)، بدھ چرتر (बुदच चरित्र) ویرست سئی (वीरसत सई) اور رس کلش (रस कलश) کو خاص اہمیت حاصل ہے، ان کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن زیادہ تر متفرق تخلیقات پیش کی گئیں، کچھ ترجمہ بھی کیے گئے جن میں اُتر رام چرتر، مالتی مادھو، رتن سنہار، رگھوونش، میگھ دوت، اودھیہ گرام، مدرا راکشس وغیرہ قابل ذکر ہیں، ذیل میں دور ارتقا کے برج بھاشا کے شعرا کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے اس زمانے کی برج بھاشا کی شاعری کا صحیح روپ سامنے آسکے گا۔ اس دور کے کچھ قابل ذکر شعرا یہ ہیں:

سیوک | سیوک کاشی کے رئیس بابو ہری شنکر کے سایۂ عاطفت میں تھے، ڈاکٹر محمد حسن نے ہری شنکر کے بجائے ہرشچندر لکھا ہے جو غلط ہے، سیوک کے والد کا نام دھنی رام تھا، انھوں نے اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے:

شری رش ناتھ کو ہوں میں پناتی ادناتی ہوں شری کوی ٹھاکر گیرد
شری دھنی رام کو پوت میں سیلوک سنگر کو نگھو سب دھوجیوں چیرو
مان کو باپ بیا کسیا کو چپا مرلی دھر کرشن ہو ل ہیرو
اسنی میں گھر کا سکا میں ہری سنگر بھوپت رکھپک ہیرو

نائیکا بھید پر ان کا گرنتھ داگ ولاس (वागीश विलास) مشہور ہے، اس کے علاوہ برو ے چھند میں ان کا لکھ شکھ گرنتھ بھی ہے، جو غیر مطبوعہ ہے، ان کا زمانہ سمبت ۱۸۷۲ء سے ۱۹۳۵ء تک کا ہے، انھیں برج بھاشا پر پورا عبور حاصل تھا،

مہاراجہ رگھو راج سنگھ یہ ریواں ریاست کے راجہ تھے، رام کی بھگتی میں ڈوبی ہوئی انکی تخلیقات قابل قدر ہیں، ان کی تصانیف میں رام سویمبر، رکمنی پریتے، آنند اوبندھ، راما شیام وغیرہ مشہور ہیں، نمونۂ کلام یہ ہے:۔

ڈرت ہتو جو بھون ریت پرچھائیں جان تاڈکا بھنکری کون بدھ مار یو ہے
جات جو سم سنی راکچس کہانی کان منی کھ راکھ سونا چر سنگھا ریو ہے
پھنک پھرس کھیلے کبھوں نہ نار کٹ ہی گوتم کی گھنی سوسلا تے تار یو ہے
بھنے رگھو راج سانچ بھا کھو ترھوت دوت بھوت پت دھن میڑیو توڑ ڈاریو ہے

سردار سردار کا زمانۂ شاعری سمبت ۱۹۰۲ء سے ۱۹۴۰ء تک مانا جاتا ہے، یہ کاشی کے راجہ ایشوری پرشاد نارائن سنگھ کے دامن دولت سے وابستہ تھے، مصر بندھوں نے انھیں پدماکر کے درجہ میں رکھا ہے، ان کی تصانیف میں ویبگ ولاس، وشٹ ورت، ہنومت بھوشن، تلسی بھوشن، شرنگار سنگرہ، رام رتناکر، ساہیتہ سدھاکر، رام لیلا پرکاش وغیرہ مشہور ہیں، نمونۂ کلام یہ ہے:

پر پورن پریم میں پاگ سدا پت جام تپی ورت پالتی ہیں
بس باسہ دھیان دھرے تنکو من تے تن نیک نہ ہاتی ہیں

سر دار بنا ہن ہار دہی ہم کرن کلا لکھ لالتی ہیں ۱
نندی یہ تہا رہی سدا ابتیاں نٹ سال لوں جب ضا سالتی ہیں ۱۱

کیشو داس کی کوی پریا اور رسک پریا، بہاری تعل کی ست سئی سور کے درشٹ کوٹ وغیرہ پر سر دار کی شرحیں مشہور ہیں، شرنگار سنگرہ۔ سندری تلک۔ ساہتیہ رتنا کر اور ساہتیہ پربھاکر وغیرہ میں ان کے کبت پائے جاتے ہیں۔

بابو رگھوناتھ داس | یہ ایودھیا کے مہنت تھے، انھوں نے سمبت ۱۹۱۱ھ میں وشرام ساگر، نام سے دوہا اور چوپائی میں ایک ضخیم کتاب نظم کی. گر یہ تصنیف معمولی درجہ کی سمجھی جاتی ہے، بھاشا کے بارے میں ان کا خیال ہے:

سنسکرت پراکرت بھارسی بیدہ دیس کے ایں
بھاشا تاکو کہت کوی تھا کیندہ میں چین

للت کشوری اور للت مادھری | یہ دونوں بھائی لکھنؤ کے بیٹے تھے، جو ورنداین میں بس گئے تھے، ان کا زمانۂ شاعری سمبت ۱۹۱۳ھ سے ۱۹۳۰ھ تک مانا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں زیادہ تر گوپیوں اور کرشن سے متعلق تاثرات ہیں، انھیں اردو سے بھی لگاؤ تھا، ان کی غزلیں بھی ہیں۔

راجہ لکشمن سنگھ | انھوں نے کالی داس کی شکنتلا، میگھ دوت اور رگھو ونش کے ہندی ترجمے بھی کیے ہیں، ان ترجموں پر اصل کا گمان ہوتا ہے، شکنتلا کے ترجمہ کا ایک نمونہ یہ ہے:

ہما نسو جنداسوں کسم سرتوسوں کہت کیوں ۱
نہیں سانچے دواد ان گنن موں سے جنن کوں ۱۱
کھری چھوڑے جوالا وہ کرن پالا سنگ دھری ۱
توہو وجر کاری بچ سمن کو بانن کری ۱۱

لچھمی رام بھٹ ان کی پیدائش امو ڑھا ضلع بستی میں ہوئی تھی، عرصہ تک ایودھیا کے راجہ کے زیر سرپرستی رہے، ان کی تصانیف میں مان سنگھاشٹک، پرتاپ رتناکر، راونیشور کلپ ترو اور کملانند کلپ ترو ہیں، انھوں نے عربی اور فارسی کے سلیس لفظوں کا حسب ضرورت استعمال کیا ہے، بھاشا میں ان کا تخلص لچھمی رام ہی تھا، ان کا سنہ پیدائش سمبت ۱۸۹۸ بتایا جاتا ہے،

بینی دوج ان کی پیدائش سمبت ۱۹۰۱ میں ہوئی، یہ معمولی درجہ کے شاعر تھے۔ بھاشا میں ان کے دو چار سو چھند بتائے جاتے ہیں، لیکن ان کی کوئی تصنیف ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، ان کی رچناؤں کا موضوع شرنگار رہے۔

گووند گلا بھائی یہ گجرات کے باشندے تھے، پیدائش سمبت ۱۹۰۵ میں ہوئی، برج بھاشا پر عبور تھا، ان کی تصانیف میں نیت ونود، شرنگار سروجنی، شٹ رتو، پاوس پیو ندھ، سمسیا پورتی پردیپ، وکر وکتی ونود، شلیش چندرکا وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں،

ہنومان یہ مشہور شاعر من دیو بندی جن کے بیٹے تھے، یہ لحن سے اشعار پڑھتے تھے جس سے خوش ہو کر ہریش چندر جی نے انھیں ایک قیمتی دوشالہ اور ایک ہیرے کے نگ کی انگوٹھی انعام دی تھی، ان کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ سمبت ۱۹۳۶ میں کاشی میں موجود تھے۔

بابو ہریش چندر بابو بھارتیندو ہریش چندر کی پیدائش ایک وشنو خاندان میں ہوئی تھی، ان کے والد کا شمار اپنے دور کے اچھے شعرا میں تھا، بھارتیندو جی نے بچپن ہی سے شاعری شروع کر دی تھی، اردو اور فارسی سے بھی اچھی واقفیت رکھتے تھے، ابتدائی زمانے میں اردو اشعار بھی موزوں کرتے تھے، اور رسا تخلص کرتے تھے، لیکن بعد میں انھیں کھڑی بولی ہندی میں تجربہ کرنے کا شوق پیدا ہوا، اس میں ان کو کامیابی ہوئی، اور اردو کے مقابلہ میں کھڑی بولی ہندی میں شاعری کا

ذوق دن بدن بڑھتا گیا، ہرلیش چندر جی کو اگر بابائے ہندی (کھڑی بولی) کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، برج بھاشا کی شاعری انھوں نے ورثے میں پائی تھی، ان کے ابتدائی زمانے کے کلام ہی سے ان کا مستقبل جھلکنے لگا تھا، ان کا یہ پہلا چھند پڑھنے کے قابل ہے،

ہم تو مول لیے یا گھر کے

داس داس شری ولبھ کل کے چاکر رادھا ور کے

ماتا شری رادھکا پتا ہر بندے داس گن کر کے

ہری چند تمھرے ہی کہاوت نہ بدھ کے نہ ہر کے

ہرلیش چندر جی کے بارے میں ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے کا یہ قول ہے کہ

" بھارتیندو ہرلیش چندر ایک عظیم ادبی سنگم کی حیثیت رکھتے ہیں جہاں ادب کی قدیم دھارائیں مل کر ایک جدید ادبی دھارے کو جنم دیتی ہیں، ان میں جگ نک، کبیر، سور، میرا، دیو اور بہاری وغیرہ سبھی سمٹ کر آگئے ہیں " (آدھنک ہندی ساہتیہ ص ۳۳۱)

بھارتیندو جی نے برج بھاشا کی شاعری کو زمانے کے مسائل سے روشناس کرایا، حب الوطنی کے جذبہ نے ان کی شاعری میں چار چاند لگائے، ہند و مذہب اور ہند و قوم کو زندہ اور بیدار کرنے کے لیے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی، اس کے لیے انھوں نے تاریخ کے اوراق بھی الٹے، وہ کہتے ہیں کہ اے قوم پرتھوی راج اور جے چند کی لغزشوں کے نتیجہ میں یون ہندوستان میں آئے، تیمور لنگ اور چنگیز وغیرہ نے آکر قتل عام کیا، علاء الدین اور اورنگ زیب نے مل کر تمھارے مذہب پر ضرب کاری لگائی اور محمد شاہ رنگیلے نے تمھیں عیش و سرور کے غار میں ڈھکیل دیا، تم اسوقت تک بہت سو چکے کسی طرح تمھاری آنکھیں نہیں کھلیں، اب تو ہندوستان میں ملکہ وکٹوریہ حکومت کر رہی ہے، اے لاڈلو! اب خوفزدہ کیوں ہو اب تو جاگ جاؤ۔

پرتھی راج جے چند کلہہ کری یوں بلا یو

تمر لنگ چنگیز آد بہو نرن کٹا یو

الادین اورنگ زیب مل دھرم نسا یو

بشے باسنا وسہہ محمد سا پھیلا یو

تب لوں بہو سوے وتس تم جاگے نہہ کو او جتن

اب تو رانی وکنٹھ ر یہ جا کہو ست بھئے چہانڑ من

انہی انگریزوں کی حکومت میں اور تو سبھی سکھ کی چیزیں نظر آتی ہیں لیکن اس بات کا بیحد غم ہے کہ ملک کی دولت غیر ملک میں برابر بھیجی جارہی ہے ؎

انگریج راج سکھ ساج سبھے سب بھاری ۔۔۔ پے دھن ودیس چل جات یہے ات کھاری

بھارتیندو کی نگاہ ہندو سماج کی کمزوریوں کی طرف بھی گئی، وہ اس میں سدھار کی ضرورت سمجھتے تھے۔ انھوں نے پنڈتوں کو اس زوال کا ذمہ دار ٹھہرایا، ان کا کہنا ہے کہ تم نے پرانوں میں اپنی طرف سے جلے گرٹھ گرٹھ کر داخل کر دیے اور مذہب کو شو، ساکت اور وشنو وغیرہ مختلف مسلکوں میں تقسیم کر دیا، بیوہ کو شادی کے حق سے محروم کرکے سماج میں عیاشی کو فروغ دیا، غیر ممالک میں جانے کی ممانعت کرکے قوم کو بالکل کوپ منڈوپ بنا دیا، ہزاروں دیوی دیوتاؤں اور بھوت پریت کی پوجا کرا کے ہندو قوم کے ایشور سے منہ موڑ لینے کے سامان مہیا کر دیے ؎

رچ بہو بدھ کے واکیہ پرانن ماہد گھسائے

سیو، ساکت، وشنو انیک مت پرگٹ چلائے

بدھوا بیاہ نشیدھ کیو بھچا ر پرچار یو

روک ولایت گمن کوپ منڈوک بنا یو

اورن کو سنسرگ چھڑائی پرچار گھٹا یو
بہو دیوی دیوتا بھوت پریت آد بچائی
ایشور سوں سب بمکھ کیے ہندن گھبرائی

برج بھاشا کے قدیم شعراء کی طرح کرشن پریم میں ان پر بھی وہ وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے جو سور اور میرا کا حصہ تھی کسی سے صحیح معنوں میں محبت ہوجانے کے بعد اسے کتنا ہی چھپانا چاہو، نہیں چھپ سکتی، آنکھیں اس راز کا انکشاف کرہی دیتی ہیں ؎

چھپائے چھپت نہ نین لگے
اُدھر پریت سب جان جات ہیں گھونگھٹ میں نہ کھگے
کتنو کرو دراؤ درت نہیں جب یہ پریم پگے
نڈر بھئے ادھر سے ڈولت موہن رنگ رنگے

بھارتیندو جی نے کئی ادبی انجمنیں قائم کی تھیں، جن میں اکثر طرحی نشستیں ہوتی تھیں، ان ہی نے شرنگار سے متعلق بڑے ہی دلکش کبت اور سوئے نظم کیے ہیں، جو فحاشی سے بالکل پاک ہیں، پریم مادھری (۱۸۷۵ء) پریم ترنگ (۱۸۷۷ء) پریم پرلاپ (۱۸۷۷ء) پریم پھلواری (۱۸۸۳ء) وغیرہ میں ان کے خوبصورت اور پرمعنی کبتوں، سویوں اور پدوں کا انتخاب ہے، بھارتیندو گرنتھاولی (مرتبہ ناگری پرچارنی سبھا کاشی) میں بھی ان کے منظومات کے اچھے نمونے ملتے ہیں، بھارتیندو جی کی زبان صاف اور نکھری ہوئی ہے، اس میں اغلاط بہت کم ہیں، ان کے رسیلے سویوں میں بول چال کی برج بھاشا کی جھلک ہے، زبان سلیس شیریں اور حلاوت انگیز ہے،

برج چند | یہ ہرِش چندر کے ہمعصر تھے، ان کی کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، متفرق کبت اور سوئے پائے جاتے ہیں، جن کی روشنی میں انھیں ایک باصلاحیت شاعر تسلیم کیا جاسکتا ہے، زبان

ان کی بھی صاف ستھری تھی، انکی بیشتر تخلیقات میں ہریش چندر کا دھوکا ہوتا ہے۔

پنڈت وجیانند | یہ برج بھاشا کے اچھے شاعر تھے، ان کی مدد سے ورما جی نے بھارت جیون اخبار نکالا تھا جس میں بہت دنوں تک ان کا ایک چھپہ روزانہ شائع ہوتا تھا، انھوں نے کالیداس کے میگھ دوت کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا، اور کسی گرنتھ کا پتہ نہیں چلتا۔

پنڈت امبکادت بیاس | سنسکرت کے اچھے عالم تھے، نظمیں اکثر فی البدیہہ کہتے تھے، ۲۴ منٹ میں سو شلوک نظم کر لیتے تھے، اس زود گوئی کی بنا پر انھیں گھٹکا شتک کا خطاب ملا تھا، سنسکرت میں انکی کئی تصانیف ہیں، ہندی میں ان کی شہرت "بہاری بہار" کی وجہ سے ہے، اس میں انھوں نے بہاری کے دوہوں پر کنڈلیاں بنائی تھیں، ان کا زمانہ سمبت ۱۹۱۵-۵۷ کا ہے۔

نونیت لعل چترویدی | یہ خطۂ برج کے باشندے تھے، بھگتی رس سے متعلق ان کی منظومات کے خوبصورت نمونے ملتے ہیں، ان کی زبان میں مٹھاس اور روانی ہے، رتناکر جی ان کے شاگرد تھے، ان کا زمانۂ شاعری سمبت ۱۹۱۵ سے ۱۹۸۹ تک کا ہے۔

رادھا کرشن داس | بھارتیندو ہریش چندر کے پھوپھی زاد بھائی تھے، پیدائش سمبت ۱۹۲۲ میں ہوئی رحیم کے دوہوں پر ان کی کنڈلیاں بہت مشہور ہیں، نظم کا موضوع بھگتی اور شرنگار ہیں، ان کے کلام کا انتخاب بابو شیام سندر داس نے رادھا کرشن گرنتھاولی کے نام سے شائع کرایا تھا، ان کے سویوں میں پوری روانی پائی جاتی ہے، نمونۂ کلام یہ ہے ؎

موہن کی یہ موہنی مورت جیہسے بھولت ناہیں بھلائے

چھوڑن چاہت نیہہ کو ناتو کو اُدھ چھوٹت ناہیں چھڑائے

داس جو چھوڑ کے پیائے بہا ہمیں ادر کے روپ پے جاتی لبھائے

بھول سکے اب کون جیا ان تو ہنس کے پہلے ہی چرائے

پنڈت پرتاپ نارائن مصر | نثر نگار کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، اکثر برج بھاشا میں بھی اشعار موزوں کرتے تھے، بھارتیندو و ہرلش چندر سے کافی متاثر تھے، زمانۂ شاعری سمبت ۱۹۱۳ھ سے ۱۹۵۱ھ تک مانا جاتا ہے، برہمن نام سے اخبار کا اجرا کیا تھا، جس کے اشتہار تک کبھی کبھی منظوم ہوا کرتے تھے، ان کی زبان پر مغربی اودھی کا اثر بھی پایا جاتا ہے، انھیں بھی ہرلش چندر کی طرح ہندی ہندو اور ہندوستان کی دھن تھی،

چہو جو سانچو نج کلیان تو سب مل بھارت سنتان

جپو نرنتر ایک جبان ہندی ہندو ہندوستان

تب ہی سدھر ہیں جنم ندان تب ہی بھلو کریں بھگوان

جب رہ ہے نس دن یہ دھیان ہندی ہندو ہندوستان

پریم گھن | ان کا اصلی نام بدری نارائن اپادھیائے تھا، ہندی میں پریم گھن تخلص تھا، اردو میں بھی کہتے تھے، ملکہ بھارتیندو جی سے ملنے سے پہلے زیادہ تر اردو ہی میں لکھا کرتے تھے، اردو میں غالباً ابرؔ تخلص تھا، بھارتیندو جی سے متاثر ہو کر محض ہندی کے لیے اپنے کو وقف کر دیا، ماہانہ آنند کادمبنی اور ہفتہ وار ناگری نیرد جیسے پرچوں کا اجرا کیا، اپنے زمانے کے مسائل کو ہی اپنا موضوع بنایا، کبھی ہندی کے جائز حق کے لیے آواز بلند کی اور کبھی ہندوستان کی قابل رحم حالت پر آنسو بہائے زمانہ سمبت ۱۹۱۲ھ سے ۱۹۸۰ھ تک کا مانا جاتا ہے۔

جگ موہن سنگھ | برج بھاشا کے ایک اچھے شاعر تھے، زمانۂ شاعری سمبت ۱۹۱۴ھ سے ۱۹۵۵ھ کے درمیان تسلیم کیا جاتا ہے، زبان سلیس، رواں اور شستہ تھی، قدرتی مناظر کے خوبصورت مرقعے انکے یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں، صنائع پر کوئی خاص توجہ نہیں تھی، اکثر منظومات شیاما سوپن میں ملتے ہیں اس کے علاوہ کچھ منتخب کلام شیام لتا اور پریم سمپت لتا میں بھی پایا جاتا ہے، نمونۂ کلام یہ ہے:

کل کان تجی گر و لوگن میں بس کے سب ہین کو ہین سہا
پر لوک سنائی بسے بدھ سوں ان مت کو مارگ جان کہا
جگ موہن دھوتی جارج پاتھن یاتن پالیو ہے پرکیم ہا
سب چھوڑ تمھیں ہم پایو اہو تم چھوڑ سہیں کہو پایو کہا

لالہ سیتارام | پیدائش سمبت ۱۹۱۵ء میں ہوئی، انگریزی اور سنسکرت زبانوں پر اچھی نظر تھی، رگھو ونش، کمار سنبھو اور میگھ دوت کے ترجمے انھوں نے بڑی کامیابی سے کیے ہیں، برج بھاشا پر قدرت تھی منظومات میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں، وفات سمبت ۱۹۹۳ء میں ہوئی۔

ہری اودھ | اصل نام ایودھیا سنگھ اپادھیایہ تھا، پیدائش سمبت ۱۹۲۲ء میں ہوئی، کھڑی بولی ہندی کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہوئے، ابتدا برج بھاشا کی شاعری سے ہوئی، لیکن بعد میں وقت کے دھارے کے ساتھ بہنا پڑا اور کھڑی بولی میں پریہ پرواس لکھ کر امر ہو گئے، وطن نظام آباد ضلع اعظم گڈھ تھا، وہاں سکھوں کے مہنت بابا سمیر سنگھ بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے، انھوں نے کئی ایک ادبی انجمنیں قائم کر رکھی تھیں، ہری اس میں نظمیں پڑھا کرتے تھے، ہری اودھ تخلص اسی زمانے کا ہے، انھوں نے برج بھاشا میں پوربی الفاظ بھی استعمال کیے ہیں، برج بھاشا میں ان رس کلس گرنتھ قابل قدر ہے، اور رسوں کے مطالعہ کے لیے اچھی کتاب ہے، انھوں نے قدیم نائیکاؤں کے ساتھ پر لوار پریمکا، دیش پریمکا، بخا تراگنی، لوک سیویکا، اور دھرم پریمکا وغیرہ جدید نائیکاوں کے نام بھی گنائے ہیں، لیکن یہ نہیں بتایا ہے یہ نائیکائیں کس رس کے ذیل میں آتی ہیں، اپنے زمانے کے دوسرے شعرا کی طرح ان میں بھی مذہب اور قوم کی محبت کا جذبہ تھا، نمونۂ کلام یہ ہے ؎

چھن چھن چھیبت نہ دیکھیئے سماج تن، ہیر تہ نہ دودھوا چھٹوک ہو چھتیان،
جات کو متن الوک ہیں نہ آکل ہوئے، بھول نا ملو کبہ کلنکی ہوت کل مان"

"ہرا ودھ چھنت لکھنؤ نا سلونے لعل، للت نہار ہیں نہ لونی لونی للنان ا
کھوے کچھ کھلیں ہے کہاں ہیں ٹھیک ٹھیک کھلیں ادھ کھلی اجوں ہیں ہماری کھلی انکھیاں ان "

شری دھر پاٹھک | ان کا شمار کھڑی بولی کے ابتدائی زمانے کے عظیم شعرا میں ہوتا ہے لیکن یہ برج کے پرانے پرستار رہتے، انھوں نے انگریزی ادب کا بھی مطالعہ اوراس سے بڑا استفادہ کیا تھا، یہ ادب کو زندگی کی تنقید سمجھتے تھے جیوانات اور نباتات بھی ان کی منظومات کے موضوع ہیں لیکن انکی خاص توجہ نوع بشر کے لیے تھی، قدرتی مناظر میں ہمالیہ، کشمیر اور مختلف موسموں کے بیانات، دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اودی کی زبان سے انھیں بے پناہ محبت تھی، ایک مقام پر لکھتے ہیں ؎

نج بھاشا بولہو لکھنو پڑھہو گنہو سب لوگ　　کر ہو سکل بشین بشین نج بھاشا اپیوگ

انھوں نے برج بھاشا میں سنسکرت سے رت سنھار اور انگریزی سے ڈیزرٹڈ ولج (Deserted Village) کے ترجمے کیے جس سے ان کی قابلیت کا سکہ جم گیا، ہندوستان کے تمام اخباروں نے ان کی تعریف شائع کی، اس ترجمہ کا ایک نمونہ یہ ہے ؎

As sometall cliff, that lifts its awful from ;
Swells from the vale, and midway leaves the storm
Though round its breast the rolling clouds are spread
Eternal sunshine settles on its head,

(ترجمہ)　جیم کو اوپر دت شرنگ تنگ دیرگھ تن ٹھاڑو
اٹھیو کھنڈ سوں رہے بونڈ ریچ ہی جپا نڑو
یدپ تاس وکچھستھل دل بادل کو لاہل
بھال براجے سدا بھان ابھا دت اجول

ان کا زمانہ سمبت ۱۹۱۶ء سے ۱۹۸۵ء تک کا مانا جاتا ہے، ترجمہ کے علاوہ ان کے بہت سے متفرق چھند ملتے ہیں۔

رتناکر: اصل نام جگناتھ داس اور رتناکر تخلص تھا، دوسرے شعرا کے ساتھ یہ کھڑی بولی کے تیز و تند دھارے میں نہیں بہہ سکے، بلکہ کھڑی بولی کے تھپیڑوں میں برج بھاشا کی پرورش کی، اس زبان سے انھیں بڑی محبت تھی، طویل عرصہ تک شاعری کی، زیادہ کہنے کے قائل نہیں تھے، دیگر زبانوں پر بھی اچھی نگاہ تھی، خصوصاً فارسی اور انگریزی پر پوری قدرت تھی، انگریزی ادب سے متاثر ہوکر برج بھاشا کی شاعری میں استعاروں کو جگہ دی، اور اس کو ایک جدید طرز بیان بخشا، اردو زبان کے شیریں اور دلکش محاوروں کی طرف دوسرے شعرا کی نگاہ نہیں گئی، لیکن رتناکر جی نے اس سے استفادہ کیا اور اپنی زبان کو با محاورہ بناکر اس میں اور بھی زور پیدا کر دیا، ان کی زبان کا ایک نمونہ یہ ہے:

جوگن کی بھوگن کی بکل بیوگن کی جگ میں نہ جاگتی جمعیتیں رہ جائیں گی
کہے رتناکر نہ سکھ کے رہے جو دن تو یہ دکھ دوند کی نہ راتیں رہ جائیں گی
پریم نیم چھاڑ گیان چھیم جو بتاوت سو بھیت ہی نہیں کہا چھاتیں رہ جائینگی
گھاتیں رہ جائیں گی نہ کانھ کی کرپاتیں اِت اودھو کہے کو بس اِتیں رہ جائینگی

رتناکر جی نے کابیہ سمبندھنی کے نام سے ایک ماہنامہ کا بھی اجرا کیا تھا، ان کے بارے میں پنڈت رام چندر شکل کے خیالات یہ ہیں: "انکی شاعری بڑے بڑے قدیم شعرا کے ٹکر کی ہے، ان قدیم شعرا میں بھی ان کی سی سوجھ بوجھ بہت کم میں پائی جاتی ہے، ان کی زبان بھی اپنے پیش رو شعرا کے مقابلہ میں زیادہ چست اور گٹھی ہوئی ہوتی ہے، یہ ادب اور برج بھاشا کابیہ کے جید عالم تسلیم کیے جاتے تھے۔"

(ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۵۳۷)

رتناکر جی کی تصانیف میں ہریش چندر، گنگاوترن اور ادھوشتک بہت مقبول ہیں، انکے علاوہ انھوں نے انگریزی شاعر پوپ کے ایسے آن کریٹی سزم (Essay on criticism) کا رولا چھند میں بہت اچھا ترجمہ کیا تھا، ان کے متفرق کبت اور سوتے بے شمار ہیں، ان کا مجموعۂ کلام 'رتناکر' کے نام سے ناگری پرچارنی سبھا کاشی سے شائع ہوا ہے، گنگاوترن میں انھوں نے گنگا کے نزول کی داستان نہایت تاثر انگیز پیرائے میں بیان کی ہے، اسی طرح ادھوشتک میں گوپیوں کے دل کی دھڑکنوں کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، سگن بھگتی کی تحریک میں جو اب بہت پرانی ہو چکی ہے، ادھوشتک نے تھوڑے وقفے کے لیے جان ڈالدی، گوپیوں کی کرشن کی محبت میں ڈوبی ہوئی تصاویر کا اتنا حسین البم برج بھاشا کی شاعری کے چند ہی شعرا نے پیش کیا ہے، رتناکر جی کا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

دھر راکھو گیان گن گور و گمان گوئی گوپن کو آوت نہ بھاوت بھڑنگ ہے،
کہے رتناکر کرت ٹائیں ٹائیں دریتھا سنت نہ کو ادھیاں یہ منھ چنگ ہے،
اور ہو اویا یہ کیسے سہج سڈھنگ اودھو سانس رکیے کو کہا جوگ ہی کڈھنگ ہے
کٹل کٹاری ہے اٹاری ہے آتنگ ان جمنا ترنگ ہے تہار وست سنگ ہے۔

رائے دیوی پرساد پورن | ان کی پیدائش سمبت ۱۹۳۰ میں کانپور میں ہوئی تھی، برج بھاشا کے اچھے شاعر تھے، طبیعت میں قدامت پسندی تھی، لیکن اس کے باوجود جدید رجحانات سے غافل نہیں تھے، ان کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک پرانے طرز کی، دوسری نئے طرز کی، پہلے طرز کی منظومات میں شرنگار، بھگتی، ویدانت اور ریت ورڈن ہیں، اور دوسرے طرز کی کویتاؤں میں حب الوطنی سے متعلق منظومات، ان کی زبان خالص برج بھاشا ہے، الفاظ کے انتخاب میں انھوں نے اپنے کومل اور معصوم دل کو پیش نظر رکھا ہے، ان کی تشبیہات میں ان کے ذاتی تاثرات کو بڑا دخل ہے،

نفتیہ کبت بہت کم لکھے ہیں، ان کا مزاج غالباً اس طرح کی شاعری کو پسند نہیں کرتا تھا، قدرتی مناظر
عکاسی میں مقابلتہً زیادہ کامیاب ہیں، کالیداس کے میگھ دوت کا ترجمہ بھی انھوں نے کیا تھا، اسکے
وہ چندر کلا بھان کمار کے نام سے ان کا ایک ناٹک بھی مشہور ہے، نمونۂ کلام یہ ہے:

کیدھوں اٹکے ہو سبری کے بیر جاکھن میں کیدھوں بھکت برسی کی ہنڈی کے سکارن میں
جوٹے ہوا جال کے گنگے ادھارن میں کیدھون گوتم کی انگنا کو تارن میں
کیدھو سرم کرت ہنت کھر دوکھن کو لاگے کنبھ کرن کیدھوں راونے سنگھارن میں
ہنت ادھارن اھاکرنا جاید ھ ناتھ بار کیوں لگائی میری بپت بدارن میں

ہریش چندر شکل | نقاد کی حیثیت سے ہندی میں بحد مقبول ہیں، برج بھاشا کے اچھے شاعر تھے، بدھ چرت
نے نام سے لائٹ آف ایشیا (Light of Asia) کے طرز پر ایک پربندھ کاویہ لکھا،
بیعت بہت حساس پائی تھی، دوسروں کے دکھ درد پر تڑپ جاتے تھے، ہندی ادب کی ضخیم تاریخ
کر انھوں نے ادب کی ناقابل فراموش خدمت کی ہے، نمونۂ کلام یہ ہے:-

کنچن کی دیوٹ پے دیپک سگندھ بھرے جگمگ ہوت بھون بھیتر اجاس کر
ابھار نگ رنگ کی دکھائی رہیں تاسوں مل کرن مینک کی جھر وکن سوں ڈھر ڈھر
جا میں ہیر زلین کی نکھری نکائی انگ انگن کے دسن گئے ہیں کھوں نیک ٹر
اٹھت ار وج ہیں اساس سوں بار بار سرک پرے ہیں ہاتھ نیچے کھوں ڈھیلے پر

تیہ نارائن کوی رتن | خطۂ برج کے باشندے تھے، کرشن سے بے پناہ عقیدت تھی، بیشتر کوتائیں بھکتی رس
ے ڈوبی ہوئی تی ہیں، کویتا پڑھنے کا انداز بڑا پراثر تھا، بھوبھوتی کے دو مشہور سنسکرت ڈراموں
جن کے نام اتر رام چرت اور مالتی مادھو ہیں انھوں نے ترجمہ بھی کیا ہے، زمانۂ شاعری سمبت
۱۹۴۲ سے ۱۹۷۵ تک مانا جاتا ہے، نمونۂ کلام یہ ہے ۔

متھن شیل کو اودیدنا جات سکل شریر اندریہ گراہک گن ہرت موہ مہا بے پیر

اتکنٹھت چھن چھن پرم اپھنت کو اتھ سمان جرت ہردے تو او بست داپہاری میں پران

بچنیش قدیم برج بھاشا کے شاعر ہیں، کھڑی بولی میں بھی اشعار موزوں کر لیتے تھے، عشقیہ شاعری میں خاص طور سے کمال حاصل تھا، نمونۂ کلام یہ ہے:۔

ہائے ہائے آں کے پرائے گیو پیارے کہاں بھاگی تج گیہہ نہ دیہہ کی سُرت ہے

کھوجے کھوجے کھرک دھرک کل دھاریں نہیں کنج بن کون کچھار ن بھرمت ہے

بوجھے ترپلین اور وجھے مرگ برندن سوں حبت کو ڈلت پات تت ہی کو گت ہے

ٹیرت مراری چونکت ہیرت کھرک مُنی چھانہ سوں سُمت کرُ ردت ہنت ہے

دیوگی ہر یہ برج بھاشا کے شعرا کی آخری کڑی ہے، طبیعت میں بھکتی کوٹ کوٹ کر بھری ہے، زمانۂ بندگی کے شعرا کی طرح ان کے کلام میں بھی جذبات اور محسوسات کو بڑا دخل ہے لیکن یہ دنیا کو بالکل نظرانداز کرکے عبادت کے قائل نہیں، ان کا بھگوان تو گھٹ گھٹ میں موجود ہے، یہ اسے صرف اصنام میں دیکھنا نہیں جانتے، وشنو وں کی جیسی کٹرتا بھی ان میں نہیں پائی جاتی، اچھوت سدھار کی تحریک میں پیش پیش تھے، ان کی عشقیہ نظمیں بھی بہت دلکش ہیں، وہ عشق حقیقی کی شراب سے مدہوش تھے ان کو اس ذات بے ہمتا سے عشق تھا جو ظاہری آنکھوں کی دید سے ماوراء ہے، ان کے نزدیک وہی ستیہ اور وہی جیون ہے،

دیوگی ہر جی کی شاعری میں بیدرس کی بھی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں، سنسکرت آچاریوں کی طرح ویر رس کو انھوں نے بھی دان ویر، دھرم ویر، دیا ویر اور بدھ ویر چار قسموں میں تقسیم کیا ہے، لیکن ان کی زبان میں وہ صفائی نہیں پائی جاتی جو رتناکر جی کے یہاں ہے، انھوں نے اکثر اوقات برج کے ساتھ کھڑی بولی کو بھی ملا دیا ہے، النکاروں کی طرف انکی توجہ نہیں تھی

ان کی تصنیف دیرست سئی پر ہندی ساہتیہ سمیلن نے ۱۲۰۰ روپیے کا انعام دیا تھا،

نمونۂ کلام یہ ہے

پران پریا کو سیس لے پرم پریم ابھار
چلیو ہلس رن مت ہوے جوڑاوت سردار

ماتھ رہلو دانا رہو تجیں نہ ستیہ اکال
کہت کہت ہی چن گئے دھن گرو گووند لال

یہاں تک ہم نے برج بھاشا کے ان شعرا کا ذکر کیا ہے جنھیں اس دور میں ایک خاص مقام حاصل تھا، ان کے علاوہ بھی کھڑی بولی کے سیکڑوں ایسے شعراء تھے جو کبھی کبھی برج بھاشا میں بھی اشعار موزوں کرتے تھے، ایسے شعرا کا ذکر کھڑی بولی کے شاعروں کے ساتھ ہی کیا جائیگا

اس دور میں خالص برج بھاشا کے دو اچھے مسلمان شعرا بھی گذرے ہیں، جن کے نام سید امیر علی اور غلام محمد خاں واصل بلگرامی ہیں، یہ دونوں ہی بہت اچھے شاعر تھے، پہلے کا تعلق بھکتی سے اور دوسرے کا شرنگار سے تھا، غلام محمد خاں فارسی کے بھی اچھے عالم تھے، ان کی ایک نادر کتاب مفتاح الہندی راقم الحروف کے پاس موجود ہے، جس میں انھوں نے برج بھاشا کے قواعد لکھے ہیں،

(باقی)

ٹونک کے کتب خانے
اور
ان کے نوادر

از

جناب صاحبزادہ شوکت علی خاں ایم اے ناظم ادارۂ تحقیقات علوم شرقیہ ٹونک

ٹونک آج گو علم و فن کا مرکز نہ سہی لیکن کسی زمانہ میں وہ گہوارۂ علم و ہنر اور کاشانۂ مذہب و ملت رہ چکا ہے، ہندوستان بھر کے منتخب اور اکابر علماء یہاں جمع تھے، سمرقند و بخارا، کابل و قندھار ایران و ترکستان اور مصر و عرب تک کے طلبا حصول علم کے لیے یہاں آتے تھے، اس کا ذرہ ذرہ علم پروری اور ادب نوازی کا آئینہ دار ہے، یہاں محمود غزنوی کی فوجیں بھی ٹھہری ہیں، اورنگزیب کے رایات ظفر آیات بھی گذرے ہیں، ملکرا اور سندھیا کے ناقوسوں کی آوازیں بھی یہاں کے دشت و جبل میں گونجی ہیں، یہیں سید احمد شہیدؒ کا قافلہ ٹھہرا تھا، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی قدمبوسی کا شرف بھی اسی زمین کو حاصل ہے، اس کی سرزمین پر اب تک ان کے فیضان اور روحانی تجلیات کا اثر باقی ہے، یہاں کے علماء و فضلا سید حیدر علی، سید حکیم دائم علی، علی احمد بہاری، سید انعام اللہ بریلوی، حکیم امام الدین، حکیم مرزا جان خاں، سید حسن خاں محدث، غازی ولی محمد پھلتی، مولوی خیر الدین شیرکوٹی، مولانا نجف علی خاں جھجری، حکیم نازش خیرآبادی، محمود حسن خاں (مصنف معجم المصنفین)، حکیم برکات احمد اور حافظ محمود خاں صاحب شیرانی کے فیض سے ایک عالم سیراب ہوا،

ٹونک کی علمی تاریخ تو اب قصۂ پارینہ بن چکی ہے، لیکن اس کی کچھ یادگاریں اب بھی باقی ہیں اور

وہ اس کے کتب خانے ہیں جو آج بھی اسلاف کے بیش قیمت جواہر پاروں کو اپنے دامن میں لیے بیٹھے ہیں، ان میں سب سے بڑا کتب خانہ سعیدیہ ہے، جو اپنے بیش قیمت نوادر کے اعتبار سے ہندوستان کے ممتاز کتب خانوں میں شمار ہونے کے لائق ہے،

اس میں بہت سے قدیم علماء و مصنفین کی کتابوں کے نادر نسخے ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے، ان میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ صاحب کے تبرکات بھی ہیں، دکن کے قطب شاہی خاندانوں کے نوادر بھی ہیں، مرزا ہمایوں، اکبر اور اورنگ زیب کے مخطوطات بھی ہیں، خود مصنفین کے لکھے ہوئے اور ان کے دستخط شدہ مخطوطات بھی ہیں، خصوصاً چھٹی ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے مشاہیر علماء کے اسناد اور تحریروں کے نہایت نایاب نسخے ہیں،

اس کتب خانہ کے بانی یمین الدولہ نواب محمد علی خاں ہیں جو نواب امیر الدولہ بہادر[1] بانی ٹونک کے پوتے اور نواب وزیر الدولہ کے جانشین تھے، نواب ممدوح خود بھی بڑے عالم اور علم نواز تھے، نواب صاحب نے سیاسی دنیا سے الگ ایک ادبی دنیا بسائی تھی، جو اب تک قائم ہے، گو سیاسی اعتبار سے، ٹونک ریاست ختم ہو چکی ہے لیکن نواب محمد علی خاں کی ادبی مملکت آج بھی قائم ہے، نواب محمد علی خاں بہادر ۱۸۶۴ء میں تخت نشین ہوئے اور چار سال بعد ہی انگریزوں نے معزول کر کے بنارس بھیجدیا، یہاں آنے کے بعد نواب صاحب نے ایک ادبی دنیا بسائی، کاتب و خوشنویس اور علماء و فضلاء کو اپنی

---

[1] ہندوستان میں آزادی کا آخری طاقتور شہباز اور پٹھانوں کے سب سے بڑے لیڈر تھے جنھوں نے ٹیپو سلطان کے بعد وطن کو آزاد کرانے کی جدوجہد کی لیکن اپنے ہی ملک کے اغراض پرست ساتھیوں کے عدم تعاون کی بنا پر ناکام ہو کر انگریزوں سے صلح کر لی اور ٹونک کی ریاست لیکر عہد و پیمان میں جکڑ گئے، (تاریخ سید احمد شہید مصنفہ مولانا غلام رسول مہر، ص ۱۱۰)

محفل میں جگہ دی، دور دور سے علمی جواہر پارے جمع کیے۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، مصر و ایران،
دنیا کے گوشہ گوشہ سے آدمی بھیجکر نایاب نسخے یا ان کی نقلیں منگائیں، خود بھی تصنیف و تالیف
کا سلسلہ شروع کیا، اس طرح جب نواب صاحب نے ۱۸۹۵ء میں انتقال کیا تو ایک
بیش بہا کتب خانہ چھوڑ گئے، یہ کتب خانہ نواب صاحب کے فرزند صاحبزادہ عبدالرحیم خانصاحب[۱]
کو ورثہ میں ملا، جنھوں نے اس کو ٹونک منتقل کرکے اس میں مزید اضافہ کیا، صاحبزادہ عبدالرحیم خانصاحب
کے انتقال کے بعد نواب سعادت علی خانصاحب نے اس کو ریاست کو منتقل کر دیا، اور ۱۹۴۷ء
میں صاحبزادہ عبدالعظیم خاں کا تقرر ناظم سعیدیہ[۲] کتب خانہ کی حیثیت سے کیا، عبدالعظیم خانصاحب
نے بڑی جانفشانی اور تندہی سے اس فریضہ کو انجام دیا، اور کتب خانہ کی از سر نو فہرست مرتب
کرنے کے لیے ۱۹۵۱ء میں مولانا عمران خاں کو مامور کیا، مولانا موصوف علوم شرقیہ کے
نہ صرف فارغ التحصیل ہی ہیں بلکہ اس کے دلدادہ بھی ہیں، اس لیے تین سال کی محنت
اور کاوش کے بعد قلمی اور مطبوعہ کتابوں کی الگ الگ فہرستیں باعتبار فن مرتب کیں، انکی
بدولت قلمی نسخوں کی ندرت اور خصوصیات کا حال بیان کرنا آسان ہوگیا،

۱۹۶۱ء میں حکومت راجستھان نے سعیدیہ کتب خانہ کے تمام نوادر کو نئے ادارہ
تحقیقات علوم شرقیہ میں منتقل کر دیا جس میں ناظم ادارۂ علوم شرقیہ کی حیثیت سے راقم کام کر رہا ہے۔

---

[۱] صاحبزادہ عبدالرحیم خانصاحب نواب محمد علی خاں بہادر کے خلف الصدق تھے، باپ کی طرح خود بھی علم و فن کے شائق اور علوم شرقیہ کے دلدادہ تھے اور اس دنیا میں بڑے عالم کی حیثیت سے مشہور تھے، بہت سی کتابوں کی تالیف و ترتیب بھی کی ہے، اسکے علاوہ موصوف نے مقدس باپ کے اس گرانمایہ ذخیرہ کو اپنی ذاتی کوششوں سے اور زیادہ بڑھایا، یہاں کی ہر کتاب پر موصوف کے حاشی اور دستخط ملتے ہیں [۲] نواب سعادت علی خانصاحب بہادر کا تخلص "سعید" تھا، اسی نسبت سے اس کتب خانہ کا نام سعیدیہ پڑا اور خطاب بھی سعید الدولہ تھا۔

یہ کام حکومت نے مولانا آزاد مرحوم کی اسکیم کے تحت کیا ہے، جو ان نوادر کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے حد درجہ لایق ستایش ہے۔

اس ذخیرہ کے بیشتر نوادر پر نواب محمد علی خاں کے قلم کی تحریریں، حواشی اور نصیر الدولہ، وزیر الدولہ نوابانِ ٹونک کی مہریں اور دستخط ثبت ہیں، مولانا آزاد اس کتب خانہ کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے، خود بھی استفادہ فرماتے اور دوسروں کو بھی استفادہ کرنے کا مشورہ دیا کرتے تھے، چنانچہ سنہ ۱۹۵۱ء میں کتب خانہ سے متعدد کتابیں حکومت راجستھان کے ذریعہ طلب فرمائیں، جو کئی سال تک ان کے زیر مطالعہ رہیں، اسی زمانہ میں آپ نے حکومت راجستھان کو کتب خانہ کی ایک مفصل اور جامع فہرست تیار کرانے کی طرف توجہ دلائی، اور اس کا ایک خاکہ بھی بنا کر بھیجا، اس خاکہ کے مطابق کتابوں کی ایک مکمل فہرست تیار ہوئی جو افسوس ہے کہ اب تک قلمی شکل میں ہے، مگر لائبریری کی دوسری فہرستوں کے مقابلہ میں بہت مفید اور کارآمد ہے۔

اس کتب خانہ کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دوسرے ملکوں کے فضلاء و محققین اس سے استفادہ کے لیے ٹونک آتے ہیں، سنہ ۱۹۵۲ء میں عرب لیگ کی جانب سے جو وفد نادر کتابوں کی تلاش اور ان کا فوٹو لینے کے لیے ہندوستان آیا تھا، اس نے اس کتب خانہ کی بیس کتابوں کے فوٹو لیے، اسی طرح کیمبرج یونیورسٹی کے ایک اسکالر نے جو محقق طوسی پر ریسرچ کر رہے تھے، ٹونک آکر اس کتب خانے سے استفادہ کیا، اور ایک کتاب کا عکس حکومت ہند کے ذریعہ منگوایا، ہندوستان کے علماء و مصنفین تو بکثرت آتے رہتے ہیں اور خط و کتابت کے ذریعہ بھی استفادہ کرتے ہیں، جو مشہور شخصیتیں بھی راجستھان آتی ہیں وہ کتب خانہ دیکھنے کے لیے ٹونک ضرور آتی ہیں، خود مولانا آزاد مرحوم کی دلی خواہش تھی کہ کسی موقعہ پر اس گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے نایاب ذخیرہ کو ملاحظہ فرمائیں لیکن غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے اس ارادہ کو

پورا نہ کر سکے۔

سعیدیہ لائبریری ٹونک بارہ ہزار سے زائد کتابوں پر مشتمل پورے راجستھان میں علوم شرقیہ کا واحد کتب خانہ ہے، جس میں تین ہزار سے زیادہ قلمی کتابیں ہیں جو مختلف خصوصیات کی حامل ہیں کچھ فنی لحاظ سے نادر ہیں، کچھ ادبی لحاظ سے بعض ندرت اور قدامت کے لحاظ سے اہم ہیں، بعض کتابت اور صناعی کے لحاظ سے بے نظیر ہیں، اس کتب خانے میں مختلف ملکوں اور مختلف دور کے خطوط اور خطاطی کے نمونے موجود ہیں، جن سے ان کی تاریخ مرتب کیجا سکتی ہے، مطلا و مذہب نسخوں کا بھی ایک بیش قیمت ذخیرہ ہے، جو صناعی کا بہترین نمونہ ہیں، اب ان نادر نسخوں کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ قرآن کریم کا ایک مطلّی و مذہب نسخہ جو خطاطی کا بہترین نمونہ ہے۔ کاغذ کی ساخت قلم کی کشش، اس کے بیلدار مذہب حاشیے اور سیاہی کی جاذبیت اس نسخہ کی ندرت اور قدامت کی ضامن ہے، یہ حمائل شریف شیراز میں ۸۸۸ھ میں لکھا گیا، کاتب کا نام احمد النذیری، کاغذ نہایت نفیس، نایاب اور باریک ہے، پورا نسخہ مع بین السطور اور حاشیہ مطلّی، مذہب ہے۔ نشانات آیات بھی مطلّی ہیں، جدول انتہائی نفیس، رنگین اور دلکش ہے،

۲۔ کلام مجید کا ایک سی ورقہ نسخہ فن خطاطی کے لحاظ سے بے نظیر ہے، پورا کلام مجید تیس اوراق میں ہے، کاغذ بادامی، باریک، شروع کے دو صفحے کا حاشیہ مطلّی اور میناکاری، کل اوراق مجدول طلائی اور بین السطور مطلاّ ہیں، حاشیہ حسین بیلدار اور مطلا ہے، خط نہایت باریک ...... لیکن حروف ایسے روشن ہیں کہ دور سے بھی واضح اور دلکش نظر آتے ہیں، خطاطی کی ندرت کے علاوہ ماہر فنکار نے اس رعایت سے کتابت کی ہے کہ ایک ورق میں ایک پارہ ختم ہوجاتا ہے، اور ہر سطر الف سے شروع ہوتی ہے،

۳۔ کلام مجید کا ایک نسخہ دور مغلیہ کی یادگار ہے، جو تیموری سلاطین کے کتب خانہ میں رہ چکا ہے لیکن بدقسمتی سے کرم خوردہ اور داغدار ہے، اس کی خطاطی، کاغذ کا رنگ، اس کی قدامت کے شاہد ہیں، آخر میں نامکمل ہونے کی وجہ سے خطاط کا اور تاریخ کتابت کا پتہ نہیں چلتا، صرف شروع میں ایک صفحہ پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے،

"ازکتب خانۂ سرکار مرزا محمد ہمایوں شاہ بہادر ابن مرزا محمد کام بخش عالم بہادر"

۴۔ تقریب النشر۔ یہ کتاب تجوید و قرأت میں ہے، اور کتب خانے کے بہترین نسخوں میں شمار کیجاتی ہے، محمد بن محمد بن محمد الجزری اس کے مصنف ہیں، اور ان کی زندگی کا مکتوبہ ہے، خود مصنف کے ہاتھ کی ایک قلمی اجازت اس نسخہ پر مرقوم ہے، جو انھوں نے اپنے شاگرد شمس الدین نویری کو عطا کی تھی، محمد الجزری مشرقی دنیا کے جید عالم گذرے ہیں، سلطان بایزید شہنشاہ روم تک آپ کی قدر کرتے تھے، ان کی تحریر نے اس نسخہ کی قدر و قیمت بہت بڑھا دی ہے، یہ نایاب نسخہ اورنگزیب عالمگیر کے کتب خانہ کی بھی زینت رہا ہے، کتاب کے دوسرے ورق پر اورنگزیب کی مہر کندہ ہے، تاریخ کتابت ۸۲۹ھ / ۱۴۲۵ء درج ہے، چونکہ مصنف کی قلمی عبارت اس پر مرقوم ہے، اس لیے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مصنف کے عہد کا مکتوبہ ہے،

۵۔ زاد المسیر (تفسیر) عبد الرحمن ابن جوزی۔ یہ نسخہ خلفاے عباسیہ کے کتب خانوں کی زینت رہ چکا ہے، ۶۵۶ھ میں جب ہلاکو خاں نے مستعصم باللہ کو قتل کرکے خلافت کا خاتمہ کر دیا اور بغداد کا کتب خانہ برباد ہوا تو یہ نسخہ کسی شخص کے ہاتھ لگ گیا، کتاب کے آخر میں جو عبارت درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۹۵۶ھ میں یہ نسخہ کسی صاحب کے ملک میں آیا، اس کا نام محو شدہ ہے، البتہ سنہ کتابت واضح ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ مصنف ابو الفرج عبد الرحمن بن علی بن جوزی کی زندگی یا اس کے کچھ ہی دن بعد کا لکھا ہوا ہے، اس لیے کہ

مصنف کا انتقال ۹۵۹ھ میں ہوا تھا، نسخہ ہذا کے پہلے صفحہ پر ایک طلائی مرصع مربع بنا ہوا ہے، پورا نسخہ بہت دیدہ زیب محشی، مجدول اور خطاطی و قدیم عربی رسم الخط کا بیش بہا نمونہ ہے، خلفاء کے دور کی عبارتیں جگہ جگہ ہیں جو صاف سمجھنے میں نہیں آتیں،

۶۔ تفسیر جلالین۔ سنہ کتابت درج نہیں ہے لیکن مصنف کی زندگی کا نسخہ ہے، اس پر خود مولانا جامیؒ کے جگہ جگہ حاشیے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ مولانا جامی کی زندگی کا ہے، جامیؒ کا انتقال جلال الدین سیوطی سے تیرہ سال قبل ہوا تھا، اس لحاظ سے نسخہ نہایت قابل قدر ہے[1]،

۷۔ سواطع الالہام فیضی کا یہ بیش بہا نسخہ نہایت خوشخط مطلّی، مذہب اور طلائی مجدول ہے اس نسخہ کے کاتب اور سنہ کتابت کا کچھ پتہ نہیں چل سکا لیکن خطاطی، کاغذ کی ساخت اور قلم کی حسین گلکاریوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ دسویں یا گیارھویں صدی کا مکتوبہ ہے،

۸۔ تلخیص فی التفسیر۔ ابوعباس احمد بن یوسف الکواشی ۶۸۰ھ کا قابل دید نسخہ ہے، جو مشہور خطاط عبد القادر بن صالح بن محمود کے سحر کار اشہب قلم کی گلکاریوں سے مزین ہے یہ نسخہ مصنف کی زندگی کا ہے، اور انہی کے نسخہ سے تصحیح شدہ ہے اور اس پر خود مصنف کے ہاتھ کی ایک تحریر بھی ہے جو اس کا ثبوت ہے کہ یہ نسخہ مصنف کی نظر سے گذر چکا ہے، کتاب کے آخر میں جگہ جگہ "عرض دیدہ شد" مع سنین مرقوم ہے، ان میں سے کوئی نویں صدی سے بعد کا نہیں ہے، کتاب کے صفحہ نمبر ۱۳۰ اور نمبر ۱۴۱ پر مہریں ثبت ہیں، جن میں یہ کندہ ہے،

"جاوداں بادنشان خاتم محمود شاہ۔ تا بلوح آسماں باشد منور مہر و ماہ"

۹۔ الفوز الکبیر۔ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی۔ الفوز الکبیر سے کون واقف نہیں ہے،

---

[1] علامہ جلال الدین سیوطی کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے، جو ۹۹۴ھ کا مکتوبہ ہے۔

مزید دیکھئے براکٹ ۱۲۵ / ۲ / ۱۶۹ / پٹنہ ۹۵-۳-۱۸

لیکن اس نسخہ کی اس لیے زیادہ اہمیت ہے کہ اس میں خود شاہ صاحب کے قلم سے وہ اجازت درج ہے جو انھوں نے ایک اپنے شاگرد عبد الہادی کو دی تھی، اسی نسخہ سے ان کو درس بھی دیا تھا، جو اس کے مستند ہونے کا ثبوت ہے،

حدیث کے نادر نسخوں کا بھی اس کتب خانے میں معتد بہ ذخیرہ ہے، اس میں سے دو اہم مخطوطات کا ذکر کیا جاتا ہے،

۱۰- اختیار اعتماد المسانید - امام شرف الدین اسمٰعیل بن عیسیٰ[1]، اس مخطوطہ پر کتاب کا نام نہیں ہے لیکن کشف الظنون نے اختیار اعتماد المسانید لکھا ہے، خود مصنف کے قلم کا مکتوبہ ہے، مصنف نے اس کو ۸۹۰ھ میں مدینہ منورہ میں تالیف کیا، کتاب کے پہلے صفحے پر ایک مربع دو مدور اور ایک شش پہل مہریں ثبت ہیں، جن کی عبارتیں مٹی ہوئی ہیں۔

۱۱- اشعۃ اللمعات فی شرح مشکوٰۃ شیخ عبد الحق محدث دہلوی، اسکے متعدد قلمی نسخے ہیں، لیکن ایک نسخہ بہت اہم ہے، یہ شیخ کی وفات کے چند ہی سال بعد کا مکتوبہ ہے، انکی وفات ۱۰۵۲ھ میں ہوئی اور اس نسخہ پر ۱۰۶۰ھ سے پہلے کی تحریریں درج ہیں، یہ غوری سلاطین کے کتب خانے میں رہ چکا ہے، اس کے پہلے صفحہ پر ۱۲ مہریں اور آخر کے صفحہ پر ایک مہر ہے، ان مہروں میں ایک مہر شہزادہ اورنگزیب کی ہے، جو بہت واضح اور نمایاں ہے، ان میں مختلف امیروں کی مہریں بھی ہیں، دو مہریں لطف اللہ خان کی ہیں، وہ شاہجہانی وزیر سعد اللہ خاں کا لڑکا اور خود بڑا صاحب علم تھا، کئی جگہ "عرض دیدہ شد" مرقوم ہے۔

۱۲- کف الدماغ عن محرمات اللہ والسماع ابن حجر ہیثمی المتوفی ۹۷۳ھ

کاتب کا نام درج نہیں، سنہ کتابت ۹۵۸ھ، اس اعتبار سے یہ نسخہ مصنف کی زندگی ہی کا لکھا ہوا ہے، بلکہ بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مصنف کے قلم کا ہے، یا کم سے کم

---

[1] مصنف کے حالات کے لیے دیکھئے الضوء اللامع ج ۲ ص ۳۰۴-۳۰۵

مصنف کے لیے لکھا گیا تھا، اس حیثیت سے یہ نسخہ نہایت اہم اور تاریخی ہے

۱۳- منظومۃ النسفی (فقہ) نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد (المتوفی ۵۳۷ھ) مکتوبہ ۷۸۳ھ قدامت کے علاوہ اس نسخہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ محمود بن محمد بن شمس الدین مراقی برحلالی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور اس پر ان کے حواشی ہیں۔

۱۴- نقایہ مختصر الوقایہ، عبداللہ بن مسعود محبوبی حنفی المتوفی ۷۴۵ھ مکتوبہ ۹۹۷ھ، شیخ ابوبکر گجراتی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہایت خوشخط اور مطلی و مذہب نسخہ ہے، شاہی کتب خانہ میں رہ چکا ہے، کتاب پر اورنگ زیب کی مہر ثبت ہے۔

تصوف کی کتابوں اور بزرگوں کے تذکروں کے بہت سے نسخے ہیں ان میں حسب ذیل نسخے زیادہ اہم ہیں

۱۵- جوامع الکلم- ملفوظات و مواعظ خواجہ گیسو دراز جس کو ان کے مرید خاص خواجہ اکبر حسینی نے مرتب کیا تھا، اس کے نسخے نادر و نایاب ہیں، یہ نسخہ شاہی کتب خانوں میں رہ چکا ہے، اس پر انکی مہریں ثبت ہیں، خواجہ گیسو دراز کی خانقاہ میں جو نسخہ ہے وہ اسی نسخہ کی نقل ہے۔

۱۶- نقد النصوص فی شرح الفصوص، مولانا جامی- مصنف کے عہد کا نسخہ ہے، جا بجا انکے قلم کے حواشی ہیں، اس لحاظ سے یہ نسخہ نہایت اہم ہے، داراشکوہ کے مطالعہ میں رہ چکا ہے، اس پر اسکی مہر ثبت ہے۔

۱۷- مروج الذہب مسعودی (تاریخ) یہ کتاب بار بار طبع ہو چکی ہے، مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے لیکن یہ قلمی نسخہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ عبدالرحیم خانخاناں کے کتب خانہ میں رہ چکا ہے۔ اور اس پر اس کی تحریر موجود ہے۔

۱۸- تلقیح فہوم الاثرہ فی التاریخ والسیرۃ ابن جوزی، مکتوبہ [illegible]ھ، اپنی قدامت کے اعتبار سے اہم ہے، اس کے ساتھ دو اور کتابیں زاد المسیر اور تلقیح بھی ایک جلد میں مجلد ہیں، تلقیح پر سلاطین اور امرا کی مہریں اور تحریریں ثبت ہیں۔

۲۰- فہرست ابن ندیم و وفیات الاعیان، ابن خلکان، مکتوبہ سنہ ۱۰۴۲ھ

۲۰- نظم الدرر و المرجان فی سیر سید الانس و الجان مولانا احمد بن مرزا جان ابرکی، قدیم نسخہ ہے، اس کو شاہ ولی اللہ صاحب کے بھائی شاہ اہل اللہ نے ایک مستند نسخے سے نقل کیا تھا،

۲۱- اخلاق محمدی (سیرت) مولانا سید جعفری تیاری، خود مصنف کے قلم کا مکتوبہ ہے، اسکو اورنگزیب کے حضور میں پیش کیا گیا تھا، اس پر مختلف تحویلداروں کی دس مہریں ثبت ہیں، ایک مہر اورنگزیب کی بھی ہے،

۲۲- روضۃ الاحباب فی سیر النبی والاصحاب (فارسی) جلال الدین عطاء اللہ شیرانی، المتوفی سنہ ۱۰۰۰ھ، یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، قدیم نسخہ ہے، شاہ عبد العزیز صاحب کے مطالعہ میں رہ چکا ہے، اس پر ان کے دستخط اور مہر ثبت ہے، اس کا ایک دوسرا نسخہ بھی ہے جس کی ایک جلد سنہ ۱۰۰۰ھ اور دوسری سنہ ۱۰۶۳ھ کی مکتوبہ ہے، اور اس پر بہت سی مہریں ہیں،

۲۳- سیرت گازرونی (عربی) مولفہ سعید محمد بن مسعود گازرونی، مکتوبہ سنہ ۸۲۹ھ، اصل کتاب فارسی میں ہے، اس کا عربی ترجمہ مصنف کے بیٹے ملا عفیف الدین نے کیا تھا،

۲۴- معارج النبوۃ فی مدارج الفتوۃ، مولانا معین الدین ہروی، مکتوبہ سنہ ۱۰۱۱ھ، قدامت کے علاوہ خطاطی کا بھی بہترین نمونہ ہے۔

۲۵- تکملہ صولت فاروقی۔ فتوحات واقدی کو محمد مرزا خاں ترکمانی نے صولت فاروقی کے نام سے فارسی میں نظم کیا تھا، نادر کا انقلاب میں اس کا ایک حصہ ضائع ہو گیا تھا، باقی ماندہ حصہ نواب محمد علی خاں کو ملا، تو انھوں نے متعدد علماء سے اس کی تکمیل کرالی، اس نظم کا نام فتوح الاسلام بھی ہے۔

فارسی تاریخوں خصوصاً اسلامی ہند کی تاریخ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، اکبر نامہ، جہانگیر نامہ، تزک جہانگیری، امیر نامہ، تیمور نامہ، تاریخ نادری، اور اسی کے ساتھ یہ رکھی ہیں، تاریخ تاج محل، چہار گلشن، خلاصۃ التواریخ، سیر المتاخرین، طبقات اکبر شاہی، شاہجہاں نامہ، بادشاہ نامہ، ظفر نامہ تیموری

عالمگیر نامہ، مرآت آفتاب نامہ، واقعات عالمگیری اور عالم آرائی عباسی وغیرہ کے قلمی نسخے ہیں، ان میں تاریخ احمدی مصنفہ مولوی سید جعفر علی کا بھی ایک نایاب نسخہ ہے، وہ سید احمد صاحب بخاری نکوی کے مرید تھے، اور حضرت سید احمد شہید بریلوی کے سفر جہاد میں میر منشی تھے، اس نسخے کی صرف جلد اول ہے، دوسرا نسخہ مولانا سید حیدر علی رامپوری ثم ٹونکی نے لکھا، پہلا فارسی زبان میں ہے، اور دوسرا اردو میں، تاریخ احمدی کا ایک حصہ دوم بھی ہے، جو میاں فتح علی کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے، اور ۱۲۹۶ھ میں نواب یمین الدولہ محمد علی خاں صاحب بہادر، والی ریاست ٹونک کے حکم سے لکھا گیا، یہ بھی اردو میں ہے، اور تاریخ احمدی کا تتمہ معلوم ہوتا ہے، یہ تینوں مخطوطات مولانا آزاد مرحوم نے طلب فرمائے تھے، جن سے مولانا غلام رسول مہر نے بھی استفادہ کیا ہے[1]، تاریخ احمدی ایک مرد مومن کی مجاہدانہ سرگذشت ہے، اس میں خونچکان کفن کی لالی بھی ہے، اور جہاد فی سبیل اللہ کی سرشاری بھی، سیاسی بحران کی کشاکش بھی ہے اور اس کا علاج بھی لیکن افسوس کہ یہ گرانقدر سرمایہ اب تک طبع نہیں ہوا ہے، اگر طبع کرادیا جائے تو دنیا کے سامنے تحریک آزادی کی ایسی تاریخ آجائے گی جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب تھی، جس کی یاد آج بھی مسلمانان ہند کے لیے موجب خیر و برکت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح سید صاحب نے تائید غیبی سے سردار امیر خاں بانی ریاست ٹونک[2] کے لشکر میں خدمات انجام دیں کیسے ان سے الگ ہوئے اور پھر کس طرح انگریزوں اور سکھوں کے خلاف جہاد شروع کیا، سید صاحب کے جہاد کی پوری تاریخ نگاہ کے سامنے آجاتی ہے،

امیر نامہ ایک روہیلہ پٹھان کی سرگذست اور انگریزوں کے مقابلہ میں اس کی جنگوں اور دلیرانہ جہات کی داستان ہے، اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس پٹھان نے اپنی شجاعت

---

[1] تاریخ سید احمد شہید، غلام رسول مہر، ص ۵۰۰،۹ [2] ایضاً ص ۸۲

اور دلیری کا سکہ جما لیا تھا، یہ سردار بھی تھا اور امیر بھی، سپاہی بھی تھا اور سالار بھی، تاریخ ہند کا کوئی ایسا طالب علم نہ ہوگا جو امیر خاں کے نام سے واقف نہ ہو، انگریزی مورخین نے تو اس کو ایک جابر اور سفاک پنڈاری لیڈر کی شکل میں دکھایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر خاں تاریخ ہند کا ایک جانباز سپوت اور مجاہد تھا، ڈاکٹر قانونگو نے لکھا ہے کہ امیر خاں کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا، وہ ہندوستان کا سب سے آخری بڑا فوجی مدبر[۱] اور آزادی ہند کا سب سے بڑا شہباز تھا،[۲] امیر نامہ[۳] اسی مرد مجاہد کی سچی کہانی اور اس کی جنگی روداد ہے۔ جب گورنر جنرل بنٹنک نے ۱۸۳۲ء میں تمام رؤسائے راجستھان کو اجمیر میں بلایا تو انگریز مترجم پرنسپ کے قول کے مطابق نواب امیر خاں کی بے باکانہ گفتگو اور دلیرانہ طرز تخاطب سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور تمام رئیسوں سے زیادہ وقت نواب امیر خاں کے مجاہدانہ قصے سننے میں صرف کیا۔ پرنسپ کا کہنا ہے کہ امیر نامہ امیر خاں کے حالات کی سچی تصویر ہے۔ اس لیے کہ امیر خاں نے کبھی شکست کو فتح نہیں بتایا جہاں[۴] فتح ہوئی وہاں فتح لکھی اور جہاں شکست ہوئی بڑی صفائی سے شکست ہی بتائی ہے۔[۵] ایک انگریز مورخ کے قول کے مطابق امیر نامہ ایک مستند تاریخی کتاب ہے[۶] جو اب تک غیر مطبوعہ ہے، گو اس کا انگریزی ترجمہ لارڈ بنٹنک کے حکم کے مطابق ۱۸۳۲ء میں شائع ہو چکا ہے مگر اب نایاب ہے۔ فارسی تواریخ میں دیوان شمس الدین[۷] کے "ہفدہ سالہ امیر و بست سالہ وزیر" کے نایاب نسخے

۱؎ دیکھئے Historical Essays by Professor Qanungo. P. 172 ۲؎ تاریخ سید احمد شہید ص ۸۴

۳؎ امیر خاں نے خود اپنے حالات زندگی لالہ بساون لال شادان نائب میر منشی سے قلمبند کرائے تھے۔

۴؎ Memoirs of Puthan soldier of fortune by Henry Prinsep, P. [illegible] ۵؎ ایضاً

۶؎ دیوان شمس الدین یوں تو ریاست ٹونک کے نامور دیوان تھے لیکن ایک متبحر عالم مورخ اور محقق بھی تھے، اس ذخیرہ کی ہر کتاب پر موصوف کے حواشی اور دستخط ملتے ہیں، موصوف نے وزیر الدولہ، یمین الدولہ اور امین الدولہ کا زمانہ پایا تھا۔

کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، جو ابتک غیر مطبوعہ ہے۔ اس میں امیر خاں بانی ریاست ٹونک اور ان کے جانشین نواب وزیر الدولہ کے سیاسی اور انتظامی حالات بڑے منصفانہ طریقہ سے قلمبند کیے گئے ہیں، امیر خاں پر تحقیق کرنے والے تمام اسکالرس اس سے استفادہ کرتے ہیں، اس لیے اس کا ترجمہ مولوی سعید احمد بی اے اردو میں کر رہے ہیں۔

صرف میں شرح صرف میر مصنفہ مولوی نور محمد بن شیخ فیروز، اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ خود مصنف کے قلم کی نوشتہ ہے۔ اس کو مصنف نے اورنگزیب کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لکھا، اس لیے عالمگیر کے نام کا خطبہ بھی اس میں شامل ہے، اس نسخہ پر عالمگیری کتب خانہ کے تحویلدار کی مہر ثبت ہے،

صرف و نحو کا ایک دوسرے سے تعلق ہے، اس لیے ان کے مخطوطات بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں، نحو میں "الاعراب عن قواعد الاعراب" مصنفہ شیخ جمال الدین ابو محمد عبداللہ، خط کوفی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، نسخہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کسی اصل نسخہ سے نقل کیا گیا ہے، خط کوفی پانچویں صدی ہجری میں متروک ہونے لگا، اس لیے کہ ہروی کی کتاب الابنیہ نوشتہ ۴۴۷ھ ایرانی کوفی میں مرقوم ہے[1]، لیکن اس نسخہ میں خط کوفی کا اثر بہت نمایاں اور واضح ہے، اور ایسی حسین قلمکاری ہے کہ قسلم کی کشش بال سے زیادہ باریک ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کل نہیں ملتی، اس کے فنی نکات اور خطاطی کے کمال کا صرف دیکھکر ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے، اسی کے ہمراہ اسی رسم الخط میں ایک اور رسالہ شامل ہے، جس کے نام اور مصنف وغیرہ کا پتہ نہیں چلتا، یہ بھی نحو کی چھوٹی سی کتاب ہے، لیکن قدیم اور نادر معلوم ہوتی ہے، اس فن میں حاشیہ سید علی المتوسط سید شریف بھی قابل ذکر ہے، جو ہرات میں ۸۵۸ھ میں لکھا گیا، اور قدیم عربی خط کا بہترین نمونہ ہے، "الفوائد الضیائیہ" شرح کافیہ

---

[1] "قرآن پاک کی ایک قدیم تفسیر" از پروفیسر محمود شیرانی (۱۹۳۳ء)

معروف بہ شرح جامی، مکتوبہ ۱۰۵۱ھ۔ "منہل صافی" فی شرح وافی مکتوبہ ۹۵۵ھ۔ "شرح الفیہ" ابن مالک مصنفہ شمس الدین محمد بن احمد کا نسخہ اس لحاظ سے بہت قابل قدر ہے کہ ۷۹۸ھ کا نوشتہ ہے۔ یعنی مصنف کی وفات کے کل آٹھ سال بعد اس کے ایک ہم عصر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے بھی قدیم نسخہ "الموسوم بہ قواعد لمطارحۃ" ابو محمد جلال الدین حسین بن بدر بن ایاز النحوی (جو نحو کے امام مانے جاتے ہیں) کا ہے، جو ۷۱۱ھ کا نوشتہ ہے، اس پر محمد علی جرجانی کے حواشی بھی ہیں،

لغت کی کتابوں کے بھی بہت سے نایاب نسخے ہیں، ان میں "الغربیین" مکتوبہ ۵۴۲ھ۔ "الدرالنثیر" جلال الدین سیوطی ۱۰۶۸ھ[1] کے قبل کا مکتوبہ۔ "شمس العلوم" مصنفہ نشوان بن سعیدی ساتویں یا آٹھویں صدی کا مکتوبہ ہے، نہایت نفیس اور نادر نسخہ ہے، اس کا عکس مصری مصنفین نے کیا تھا۔ شرح نصاب الصبیان مکتوبہ ۹۷۰ھ، فرہنگ جہانگیری فتح المثانی نوشتہ ۱۰۹۲ھ۔ لطائف اللغات مرتبہ مولوی شیخ عبداللطیف، نوشتہ ۱۱۷۷ھ اور "دستور اللغۃ"[2] مکتوبہ ۱۱۰۱ھ بھی قابل دید ہیں،

معانی اور بلاغت کے مخطوطات میں "حاشیہ مطول" ابوالقاسم بن ابی بکر سمرقندی اپنی ندرت اور قدامت کے لحاظ سے اہم ہے، گو یہ نسخہ ناقص ہے، بہت سے اوراق مقدم و موخر ہیں لیکن مصنف کے عہد کا نوشتہ ہے، اس لیے کہ کتاب کا سنہ تصنیف ۸۸۸ھ اور یہ نسخہ ۸۹۴ھ

---

[1] چونکہ اس میں ۱۰۶۸ھ تک کی عبارتیں مرقوم ہیں، اس لحاظ سے اس کی کتابت یقیناً سنہ مذکورہ سے پہلے کی ہونی چاہیے، حالانکہ کتاب کی ہیئت اور کاغذ کی ساخت سے بھی یہ اندازہ لگانا بعید از قیاس نہ ہوگا کہ دسویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے۔

[2] کاتب اور مصنف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

کا لکھا ہوا ہے، اسی کے ہمراہ مطول شرح تلخیص المفتاح علامہ سعید الدین تفتازانی ہے، مکتوبہ ۸۹۰ھ یہ بھی اول الذکر کی طرح نادر ہے،

شرح دیوان ابوتمام ابوزکریا بن علی تبریزی، خط کتابت اور قدامت کے اعتبار سے یہ اس قدر اہم ہو کہ مصری وفد نے اس نسخہ کا بھی عکس لیا تھا، تاریخ کتابت کا پتہ نہیں چلتا لیکن چھٹی صدی یا ساتویں صدی میں اس کا لکھا جانا قیاس کیا جاتا ہے،

فارسی ادبیات کے یوں تو بے شمار مخطوطات ہیں لیکن بوستان سعدی اپنی تذہیب و تزئین کے اعتبار سے اور دیوان آصفی شاہی کتب خانہ میں رہنے کی وجہ سے اہم ہیں، دیوان آصفی کے اول صفحہ پر محمد شاہ بادشاہ کی مہر ثبت ہو، اسکے علاوہ دیوان ثنائی (مطلی) دیوان اسیر، دیوان زائر اور دیگر دواوین قاسم، واقف، مظہر، ناصر علی سرہندی، صفدر و صائب، عطار وغیرہ کے بھی اچھے قلمی نسخے ہیں، "۔ ۔ ات پدم" اس لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے کہ اس میں نرمی داسی[1] نے پدمنی کے قصہ کو بڑے دلچسپ اور رومان انگیز میں فارسی زبان میں لکھا ہے یہ نسخہ شاہی کتب خانہ میں رہ چکا ہے، شرح قصائد خاقانی نوشتہ ۱۰۵۰ھ " صحیفہ شاہی از حسین علی کاشفی نوشتہ دسویں صدی ہجری، قصائد کمال خجندی نوشتہ ۱۰۳۳ھ۔ قصائد عرفی نوشتہ جلوس ۱۲ شاہ عالم بادشاہ بھی اچھے نسخے ہیں، قصائد حسن غزنوی کا نسخہ نہایت مذہب و مطلی اور دیدہ زیب اور شاہجہاں کے عہد زریں کی یادگار ہو، گو کاغذ آب رسیدہ اور بوسیدہ ہو چکا ہو لیکن پورا نسخہ رنگین اور جگہ جگہ مینا کاری اور بچا کاری کی گلکاریاں ہیں، تاریخ کتابت نسخہ کے ناقص ہونے کی وجہ سے نہیں معلوم ہو سکی، لیکن اول صفحہ پر ایک مہر محمد خان حسینی سبزواری کی ثبت ہو، جو شاہجہانی امراء میں سے تھے، اسی لیے یہ کہا جا سکتا ہو کہ یہ نسخہ شاہجہانی دور سے قبل کا ہو۔

معقولات میں حاشیہ ملا غیاث الدین بر قطبی، نویں صدی کے اواخر یا دسویں صدی کے اوائل کا مکتوبہ ہے، حاشیہ پر کسی صاحب کی تحریر مرقومہ ۹۹۶ھ ہجری لکھی ہوئی ہے، حاشیہ ملا جلال الدین دوانی نوشتہ ۹۹۰ھ

---

[1] عہد جہانگیری کے منصب داروں میں سے تھے جنھوں نے پدماوت کو فارسی میں نظم کیا ہے، اور خطبہ کو جہانگیر کے نام سے معنون کیا ہے۔

بھی نادر ہے۔ "تحریر القواعد المنطقیہ مشہور بہ قطبی" مکتوبہ ۱۰۰۱ھ، شرح ایسا غوجی مشہور بہ "قال اقول" حسام الدین مکتوبہ ۸۹۹ھ نایاب، نادر اور قابل مطالعہ نسخہ ہے، جس پر شاہان اودھ کی متعدد مہریں ہیں۔

ہیئت میں تشریح الافلاک ملا عصمت اللہ سہارنپوری، خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا نسخہ مکتوبہ ۱۰۸۰ھ ہے۔ طوسی کی "تحریر اقلیدس" مکتوبہ ۷۳۱ھ، اس اعتبار سے یہ نسخہ اور بھی اہم ہے کہ اس پر تاج الشریعۃ منصور بن محمد کے حواشی ہیں، اس کے علاوہ دو ایک مہریں بھی ثبت ہیں، پہلی میں "اللہ ولی التوفیق" ۱۰۸۰ھ اور دوسری میں "محمد بن جعفر الشریفی نقش ہے۔" "فی تحویل سنی الموالید" ابو معشر جعفر بن محمد المنجم" مکتوبہ ۷۰۲ھ، قدیم عربی رسم الخط کے بہترین نمونے کی حیثیت سے نایاب اور نادر نسخہ ہے۔ "احکام العوامل" علی شاہ کا نسخہ بھی عمدہ ہے، فن جفر میں "رموز الاسرار" "رسالہ در جفر" اور دیگر رسائل کے علاوہ ایک رسالہ مرتبہ مولوی عبد المجید خانصاحب[1] ٹونکی، بہترین اور قابل قدر نسخہ ہے، یہ کل ۸۰ صفحات کا رسالہ ہے لیکن جفر میں حروف کے متعلق اس سے اچھی بحث مشکل ہی سے ملے گی، اس لیے فنی نقطۂ نظر سے یہ رسالہ قابل قدر ہے۔

طبی کتابوں کے بھی بہت سے قلمی نسخے ہیں، لیکن ان میں "اختیار بدیعی" علی بن حسین انصاری معروف بہ حاجی عطار، اپنی خطاطی اور تزیین و آرائش کے اعتبار سے بے نظیر نسخہ ہے، پوری کتاب گلکاری اور مینا کاری کا بہترین نمونہ ہے، جو غالباً کسی شاہی کتب خانہ کی زینت کے لیے بنایا گیا ہوگا، ۱۰۶۶ھ المطابق ۱۶۵۵ء کا مکتوبہ ہے، بہت حسین اور خوشخط، مطلی اور مذہب، دو صفحے مطلی، بین السطور، لوح کتاب بہت ہی حسین اور مینا کار ہے، پورا نسخہ طلائی مجدول اور دیدہ زیب ہے، یہ نسخہ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کے کتب خانہ میں رہ چکا ہے،

---

[1] موصوف حافظ اور حاجی ہونے کے علاوہ بہترین خوشنویس بھی تھے، انکی متعدد تصانیف ہیں جن میں ایک اہم تالیف نعل شریف حضرت سید السادات سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ہے۔

اس کے اوائل جلوس میں شاہی کتب خانہ میں داخل ہوئی، اس سے پہلے صفحہ پر اورنگزیب عالمگیر کی ایک مہر اور چند عبارتیں ہیں، ایک عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ منعم بیگ خانہ زاد بادشاہ عالمگیر کی تحویل میں رہی ہے، آخر صفحے پر بھی کئی عبارتیں درج ہیں، لیکن پیوند اور مرمت شدہ ہونے کی وجہ سے صاف سمجھ میں نہیں آتیں،

اسی فن میں "تقویم الادویہ" محمد بن علی، مکتوبہ ۹۰۱ھ اور " فرح جمالی" ابوبکر۔۔۔۔ نوشتہ ۹۵۵ھ بھی دیدنی ہیں،

یوں تو اس کتب خانے میں ۳۱ فنون میں اور بھی بیسیوں کتابیں ہیں، ان سب کا ذکر طویل ہوتا، لیکن چند ایسے نادر اور نایاب نسخے ہیں، جن کا تعارف اہل علم کے سامنے ضروری تھا، اور جو اس کتب خانہ کی زینت ہیں۔

سلسلۂ مقالات شبلی

(حصۂ پنجم)

یہ مولانا شبلی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو اکابر اسلام کے سوانح و حالات سے متعلق ہیں، اس میں علامہ ابن تیمیہ، ابن رشد اور زیب النسا کی سوانح عمری وغیرہ جیسے اہم اور مفید مضامین ہیں۔

ضخامت ۱۳۶ صفحے قیمت ۴ / طبع سوم

(حصۂ ششم)

ان تاریخی مضامین کا مجموعہ جو مولانا مرحوم نے اہم تاریخی مباحث پر لکھے، اور جن کو رسائل شبلی اور مقالات شبلی سے یکجا کیا گیا ہے۔

ضخامت ۲۴۲ صفحے قیمت : ۔ ۶ /

منیجر

ادبیات

نذرِ اقبال

از جناب سید خورشید افسر بسوانی

جلوہ گہِ عرش و فرش کشتۂ پائے حیات
یہ بھی مری کائنات، وہ بھی مری کائنات

اے دلِ سدرہ نشیں، اے خردِ بے صفات
آ کہ بتادوں تجھے عشق و وفا کے نکات

میری خودی کو ہے آج تیرا تغافل عزیز
بارِ طبیعت نہ ہو مجھ پہ ترا التفات

آہ وہی قوم ہو قعرِ مذلت نصیب
جس کا فسانہ کہیں دجلہ و نیل و فرات

آج پئے کائنات رقص کناں ہے وہی
جس کے اشاروں پہ تھی رقص کناں کائنات

میری خرد بت نواز، میرا جنوں بت شکن
میں کہ خرد کا حریف مجھ میں جنوں کے صفات

کاشفِ سرِ نہاں نغمہ زنِ لا الٰہ
مخزنِ علم و فنون، منبعِ ذات و صفات

گاہ زمیں کا امام گاہ فلک پر قیام
فاتحِ ارض و سما صرف بشر ہی کی ذات

میرے ہر اک شعر میں خونِ جگر کی نمود
میرے سخن سے عیاں رازِ دلِ کائنات

غزل

از جناب سید علی جواد صاحب زیدی

بری لگی ہے انھیں اہلِ دل کی بات کھری
کہ عیش بزم سے بہتر ہے لطفِ دربدری

مرا خیال ہے اک موجِ تلخ کامیِ عشق
ترا خیال ہے جادوگری کی لال پری

اٹھا لیا شبِ تاریک کے جھروکوں سے
مری بلند نگاہی نے گریۂ سحری

قریب دار بلی عزم خندہ گر کو مرے
ہر ایک آنکھ محبت کے آنسوؤں سے بھری

یہی نگاہ کہ جس نے چبھوئے ہیں نشتر
اسی نگاہ کو پھر ہو گی فکر بخیہ گری

ہمیں میں تاب تماشا نہیں رہی ورنہ
وہی زمانہ ، وہی زندگی کی جلوہ گری

پلک سے خار چنے جائیں گے بیاباں میں
ذرا بلند تو ہو لے مذاقِ در بدری

کسی کے جلوۂ معصوم کا عطیہ نہ ہو
وہ پہلی چوٹ کہ مدت کے بعد بھی ہے ہری

کہاں ملے گا وہ رقص و رباب و مستی میں
دیا ہے زخمِ جگر نے جو ذوقِ نغمہ گری

یہ کون جانے گا زیدی ہم اہلِ دل کے سوا
کتابِ عشق میں اکثر مقام ہیں نظری

غزل

از جناب سید حرمت الاکرام صاحب

دماغ و دل کی کشاکش میں مبتلا ہوں میں
کبھی نہیں کبھی اپنے کو ڈھونڈھتا ہوں میں

نفیرِ وقت سے کہہ دو سمیٹ لے مجھکو
کسی رباب کی بکھری ہوئی نوا ہوں میں

اسی تضاد سے روحِ نمو ہے پائندہ
قتیلِ زیست ہوں پروردۂ فنا ہوں میں

میں کس سے پوچھنے جاؤں یہ کیا ہوا مجھکو
کہ اپنے سائے سے بچ بچ کے چل رہا ہوں میں

انھیں سمجھ نہ سکا میں تو کوئی بات نہیں
یہ کم نہیں ہے کہ اپنے کو جانتا ہوں میں

ہے بندگی کا یہ پہلو بھی کتنا معنی خیز
خود اپنے سجدے میں سر کو جھکا رہا ہوں میں

پکار دے کہ زمانہ سنوار لے چہرہ
حیات! تیرے حقائق کا آئینہ ہوں میں

نظر اٹھاؤ کہ کھوئی ہوئی کڑی مل جائے
بہت دنوں سے اک افسانہ کہہ رہا ہوں میں

ٹھہر گیا ہوں کہ پیچھے ہے قافلہ مجھ سے
نہ خستہ پا ہوں نہ حرمت شکستہ پا ہوں میں

مطبوعاتِ جدیدہ

فتاویٰ فرنگی محل (۱) فتاویٰ موسوم بہ فتاویٰ قادریہ } از مفتی عبد القادر مرحوم، مرتبہ محمد رضا انصاری صاحب، صفحات ۲۶۴، کتابت و طباعت عمدہ، پتہ فرنگی محل کتاب گھر، فرنگی محل لکھنؤ نمبر ۳ قیمت للعہ

یہ مولانا مفتی عبد القادر صاحب فرنگی محلی مرحوم کے فتاوے کا انتخاب ہے، جسے مولانا محمد رضا صاحب انصاری نے جو اس وقت ان کی جگہ مفتی کے فرائض انجام دیتے ہیں، مرتب کیا ہے، مفتی صاحب مرحوم کے تقریباً چالیس سالہ فتووں کا یہ نچوڑ ہے جس میں عقائد و علم سے لیکر نکاح و طلاق اور عبادات کے تقریباً سبھی اہم مسائل آگئے ہیں، مفتی صاحب نے اپنے فتووں میں اس بات کا پورا التزام رکھا ہے کہ کوئی فتویٰ اپنے علمی اعتماد کی بنا پر بغیر دلیل نہ لکھا جائے، چنانچہ وہ عام باتوں کے جواب میں بھی فقہ و فتویٰ کی کتابوں کا حوالہ ضرور دیتے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو جواب کے ساتھ فقیہانہ بصیرت بھی ہوتی ہے، مفتی صاحب کا انداز بیان بھی بڑا سنجیدہ اور عالمانہ ہوتا ہے، اس لیے مطالعہ میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے، محمد رضا صاحب کی یہ کوشش قابلِ ستائش ہے،

علمائے پھلواری اور فرنگی محل مختلف فیہ مسائل میں عموماً اعتدال پسندی سے کام لیتے ہیں، مگر مفتی صاحب نے اپنے فتاوے میں خود ان کی اصطلاح کے مطابق بعض "مباحات" کو مدلل کرکے مباحات سے آگے بڑھا دیا ہے جس سے ہمیں مودبانہ اختلاف ہے، مثلاً عہد نبوی اللہ عہد صحابہ

کی مجلس وعظ سے مروجہ محفل میلاد پر استدلال کرنا، قیام میلاد کے ساتھ عوام کے عقائد کو نظرانداز کرکے قرآن کی آیت سے استدلال کرنا، حقیقت ایمان کے سلسلہ میں عام محدثین کے مسلک کو نظرانداز کردینا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب اور حضرت علیؓ کو مولائے کائنات کہنا، جماعت کی امامت پر تراویح کی اجرت کو قیاس کرنا وغیرہ اس طرح کے اور بھی مسائل ہیں جن میں مفتی صاحب نے تحقیق سے زیادہ عام مسلک کو مدلل کرنے کی کوشش کی ہے، بلکہ بعض مسائل میں خاتم علمائے فرنگی محل مولانا عبدالحئی صاحب کی رائے کو بھی مولانا نے نظرانداز کردیا ہے، مثلاً مروجہ فاتحہ، اجرت پر سیوم میں قرآن مجید پڑھوانا، قبر پر شیرینی چڑھانا وغیرہ، شیرینی کے سلسلے میں مولانا عبدالحئی صاحب لکھتے ہیں:

"اگر بہ نیت تقرب وخوشامد وچاپلوسی نہادہ شود وغرض تصدق نہ باشد حرام است والا خالی از کراہت نیست"

مولانا کا مقصد یہ ہے کہ "ریبہ" اور مشتبہات حدیث نبوی کے مطابق عموماً تحریم تک لیجاتے ہیں، اس لیے ان سے بھی عوام کو بچانا ضروری ہے، ان اختلافی مسائل سے قطع نظر کرنے کے بعد یہ مجموعہ فتاوی قادری فتاوی کے ذخیرہ میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

العلاقات الدولیہ فی الاسلام۔ از شیخ محمد ابوزہرہ صفحات ۱۱۶ ٹائپ اعلیٰ، ناشر وزارت ثقافت وارشاد القومی جمہوریہ عربیہ قاہرہ (مصر)

اسلام ایک عالمگیر اور بین الاقوامی دین ہے، اسی نے انسان کی شخصی زندگی سے لیکر اس کی اجتماعی زندگی اور بین الاقوامی معاملات تک ہر پہلو کے بارے میں احکامات دیے ہیں، اور ان احکام پر مسلمانوں نے صدیوں تک عمل کیا، اور دوسری قوموں نے بھی اس رحمت عامہ سے فائدہ اٹھایا، مگر یہ بدقسمتی ہے مسلمانوں کی کوتاہی سے یہ نظام کئی صدی سے مغربی نظاموں کے مقابلہ میں شکست کھا کر رہ گیا ہے،

اور اب دلوں ہی سے نہیں بلکہ آنکھوں سے بھی اس کی ساری خوبیاں اوجھل ہوتی جارہی ہیں، جس طرح اس کے دوسرے گوشے مادی نظاموں کے گرد و غبار میں ڈھک گئے ہیں اسی طرح اس کے بین الاقوامی احکامات پر بھی دبیز پردہ پڑ گیا ہے، ضرورت تھی کہ اس موضوع پر اسلامی ہدایات کو سامنے لایا جاتا کہ آمادۂ جنگ دنیا کو امن و سکون کی کوئی کرن دکھائی دے سکے،

اس سلسلہ میں اردو میں بھی کچھ کام ہوا ہے، خود راقم نے بھی ۱۹۵۸ء میں اس موضوع پر ایک مضمون مسلم یونیورسٹی میں پڑھا تھا، مصر کے مشہور عالم اور مصنف شیخ ابوزہرہ نے عربی کا یہ رسالہ لکھ کر اسکے تمام گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، کتاب میں تین ابواب ہیں، انھوں نے پہلے باب میں اسلام کے بین الاقوامی تصورات کی اساس پر گفتگو کی ہے، مثلاً انسان کی عظمت، امت واحدہ کا تصور، انسانی ہمدردی، آزادی و انصاف، محبت، رفع فساد، عہد کی پابندی وغیرہ، دوسرے باب میں امن کے زمانہ میں ... اسلام کی بین الاقوامی ہدایات اور تیسرے باب میں زمانۂ جنگ میں اسلام کی ہدایات کی تفصیل کی ہے، شیخ ابوزہرہ جو کچھ لکھتے ہیں عالمانہ و محققانہ انداز میں لکھتے ہیں، چنانچہ اس کتاب میں بھی انھوں نے وہ انداز باقی رکھا ہے، امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے نہ صرف اسلام کا بین الاقوامی پہلو سامنے آجائے گا بلکہ اس سے بہت سی غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں گی،

موضح القرأت - از مولانا قاری محمد حبیب اللہ خاں صاحب، صفحات ۱۰۰ سے زیادہ، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر قاری محمد عنایت اللہ، مدرسہ تجوید القرآن، فاروقی مسجد میری ویدر ٹاور کراچی ۲

اردو میں فن تجوید و قرأت پر متعدد رسالے شائع ہو چکے ہیں، ان میں یہ کتاب بھی ہے، اس میں تقریباً ۵۰ صفحات تک تجوید و قرأت کے عام قاعدے اور قراء سبعہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں، پھر پورے پارہ اول کو نقل کر کے اس کے اعراب اور رسم قرأت پر گفتگو کی گئی ہے، اور قرأت سبعہ کے تمام اختلافات کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ رسالہ بہت مفید ہے۔

م، ش،

جلد ۹۶ - ماہ جمادی الثانی ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۶۵ء - عدد ۴

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

بالآخر مسلم یونیورسٹی کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا، نئے ایکٹ نے اس کی خود مختاری اور اس کی روح دونوں کا خاتمہ کر دیا، جس یونیورسٹی کی اگزکیٹو کونسل اور کورٹ کے سارے ممبر حکومت کے نامزد کردہ ہوں وہ خود مختار کہلانے کی کہاں تک مستحق ہے، اس کی روح اور اس کا کردار اس طرح ختم ہوا کہ اکاون[۵۱] ممبروں میں گیارہ[۱۱] غیر مسلم ہیں، چالیس[۴۰] مسلمان ممبروں میں اکثریت وابستگان حکومت اور سیکلر مسلمانوں کی ہے، جن کو اسلامی کردار سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں اور اس کو وہ سیکلرزم کے خلاف سمجھتے ہیں، جن ممبروں کو حکومت سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے وہ بھی اس کے اثر سے آزاد نہیں ہیں، صرف چند ممبر مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں، لیکن یونیورسٹی کی موجودہ فضا میں اس کی جرأت کون کرے گا اور اس کی آواز کا کیا اثر ہو سکتا ہے، ایسی حالت میں یونیورسٹی کے اسلامی کردار کے باقی رہنے کا کیا امکان رہ جاتا ہے، سیکلر مسلمانوں کو مبارک ہو کہ انھوں نے مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع کو سیکلر بنا کر چھوڑا، یہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایسا المیہ ہے جس کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

پرانے نیشلسٹ مسلمانوں کو اپنے مذہب و ملت اور اپنی تہذیب و روایات کا بھی لحاظ تھا، اس لیے اب وہ نئے ترقی پسند نیشلسٹوں کے مقابلہ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں، اور سیکلر مسلمانوں کا نیا طبقہ پیدا ہوگیا ہے جس نے پوری زندگی کو سیکلرزم کے دائرے میں داخل کر لیا ہے اور اپنی تہذیب

و ثقافت کو بھی سیکلر بنانا چاہتا ہے، اور اس میدان میں ان میں مسابقت شروع ہو گئی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ سیکلرزم کی انتہا کہاں جا کر ہوتی ہے، اور اس میدان میں بازی کن خوش قسمتوں کے ہاتھ رہتی ہے، ہمارے خیال میں "سیکلر مسلمان" کی اصطلاح میں بھی فرقہ پروری کی بو آتی ہے، مسلمان کو بھی اڑا دینا چاہیے، تاکہ بغیر کسی آمیزش کے خالص سیکلرزم باقی رہ جائے۔

مسلم یونیورسٹی کی قلب ماہیت بھی انہی سیکلر مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔ انھوں نے اپنے گمان میں مسلم یونیورسٹی کی روح ختم کرکے اپنی سیکلرزم کا ثبوت دیا ہے، اور ملک و قوم کی بڑی خدمت انجام دی ہے لیکن حقیقۃً ان دونوں کو نقصان پہنچایا ہے، یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ چند نام نہاد مسلمانوں کے سوا پوری مسلمان قوم نے۔ آرڈیننس اور یونیورسٹی بل کی ایسی متفقہ مخالفت کی جس کی نظیر ہندوستان کی آزادی کے بعد نہیں ملتی، اور ان کو یونیورسٹی کی قلب ماہیت کا انتہائی دکھ ہے، اور اس کے اثر کو وہ اپنے دل سے کبھی نہیں مٹا سکتے، اس لیے ایسے حالات میں جب کہ ملک کے تمام فرقوں میں زیادہ سے زیادہ اتحاد و یکجہتی کی ضرورت ہے، آٹھ کروڑ مسلمانوں کو حکومت سے بددل کرنا ملک کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے مخالفین سیکلر مسلمانوں نے جو کچھ کیا اس پر ہم کو تعجب نہیں ہے، ان کا تو کام ہی یہی ہے، البتہ شاستری جی کی خاموشی پر حیرت ہے، اتنا بڑا واقعہ ہو گیا مگر اس کے بارہ میں انھوں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا، وہ مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات سے پوری طرح واقف ہیں، بلکہ ہمارا حسن ظن تو یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ان کا نقطۂ نظر مسلمانوں کے جذبات سے زیادہ قریب ہوگا، انھوں نے ایسا ایکٹ کیوں بننے دیا، جو نہ صرف مسلمانوں کے جذبات

بلکہ حکومت کے مصالح کے بھی خلاف ہے، اگر پنڈت جواہر لال زندہ ہوتے تو مسلم یونیورسٹی کا یہ حشر نہ ہونے پاتا، اس لیے شاستری جی کو مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں بھی ان کی جانشینی کا حق ادا کرنا چاہیے، اسکی تلافی اب بھی ہو سکتی ہے آیندہ جو مستقل ایکٹ بننے والا ہے، اس کو جلد سے جلد بنایا جائے۔ اس میں کورٹ کو با اختیار ادارہ رکھا جائے، اس کے ممبروں کی تعداد بڑھائی جائے ان کا انتخاب جمہوری طرز پر کیا جائے، مسلمانوں کی تمام اہم جماعتوں کو نمایندگی دیجائے تاکہ کورٹ میں ان کے اصلی نمایندے جا سکیں، جو حکومت کی نامزدگی کے ذریعہ ممبری قبول کرنا پسند نہ کرینگے، اس کے بغیر یونیورسٹی کا کردار اور اس کی خود مختاری قائم نہیں رہ سکتی۔

رام پور کا کتب خانہ مشرقی علوم خصوصاً عربی اور فارسی کے نادر مخطوطات کا مخزن ہے، اس کی عربی کی مطبوعہ اور قلمی کتابوں کی اردو فہرست عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے۔ اب اسکے لائق ناظم مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے کلام مجید، تفسیر، حدیث اور ان سے متعلقہ علوم کے عربی کے مخطوطات و نوادر کی فہرست اس کے جملہ لوازم کے ساتھ انگریزی میں مرتب کی ہے، جو تین جلدوں میں ہوگی، ابھی اس کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے، اس میں ۲۰۴ مخطوطات کا ذکر ہے، ان میں ۱۰۴۲ صرف کلام پاک کے نسخے اور بعض ایسے نوادر ہیں جو دوسرے کتب خانوں میں نہیں مل سکتے، فاضل مرتب کی دوسری کتابوں کی طرح یہ فہرست بھی انکی وسعت و دقت نظر اور تلاش و تحقیق کا نمونہ ہے، عرشی صاحب نے یہ بڑی مفید علمی خدمت انجام دی ہے، اور یہ ان کا ایک علمی کارنامہ ہے، اس جلد کی قیمت تیس روپئے ہے۔ رضا لائبریری رام پور سے ملے گی۔

مقالات

امام ابن ماجہؒ اور ان کی سنن

خصوصیات کی ایک جھلک

از جناب مولوی تقی الدین صاحب ندوی مظاہری استاد حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

نام و نسب سلسلۂ نسب یہ ہے: ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ الربعی بالولاء القزوینی[1]، کنیت ابو عبد اللہ، نام محمد، الربعی القزوینی نسبت اور ابن ماجہ عرف ہے، شاہ عبد العزیز صاحب نے ان کے دادا کا نام عبد اللہ لکھا ہے، ماجہ کے بارے میں اختلاف ہے، شاہ صاحب کے نزدیک یہ آپ کی والدہ کا نام ہے، فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ ماجہ آپ کی والدہ تھیں، اسلیے ابن میں الف لکھنا چاہیے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ابن ماجہ محمد کی صفت ہے، نہ کہ عبد اللہ کی۔[2] مگر عجالۂ نافعہ میں شاہ صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ "ماجہ لقب پدر ابو عبد اللہ است نہ لقب جد او نہ نام مادر"[3] علامہ ابن کثیر نے حافظ خلیل قزوینی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ماجہ یزید کا لقب ہے[4]، چونکہ قبیلۂ ربیعہ سے ان کا رشتۂ موالات تھا، اس لیے ان کو ربعی اور مولیٰ ربیعہ کہا جاتا ہے، جس طرح امام بخاری کو جعفی کہا گیا ہے،

قزوینی قزوین کی طرف نسبت ہے، جو ایران کا مشہور شہر ہے، اسی کو امام صاحب کے مولد و مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔

پیدائش و ابتدائی حالات امام ابن ماجہ ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے[5]، انھوں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں

---

[1] وفیات الاعیان ج ۳ ص ۴۰۰ [2] بستان ص ۱۱۲ [3] عجالۂ نافعہ ص ۳۰ [4] البدایۃ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲ [5] بستان ص ۱۱۲

اس وقت قزوین میں بڑے بڑے علما مثلاً علی بن محمد ابو الحسن طنافسی م ۲۳۳ھ، عمرو بن رافع ابو حجر بجلی م ۲۳۷ھ، اسمعیل بن ابو سہل قزوینی م ۲۴۷ھ، ہارون بن موسیٰ تمیمی م ۲۴۸ھ، محمد بن ابی خالد ابو بکر قزوینی[1]، وغیرہ مسند درس وافتا، پر جلوہ افروز تھے، امام صاحب نے پہلے ان سے استفادہ کیا، افسوس ہے کہ امام صاحب کی ابتدائی زندگی کے حالات معلوم نہ ہو سکے، بظاہر اسی عمر سے سماع حدیث کا آغاز کیا ہوگا،

سماع حدیث کے لیے سفر | قیاس ہے کہ امام صاحب نے ۲۳۰ھ کے بعد سفر کا آغاز کیا ہوگا، اس وقت عمر کا تیسواں سال تھا، یہ وہ زمانہ ہے کہ علم حدیث انتہائی عروج پر تھا، امام صاحب نے طلب حدیث میں مختلف شہروں کی خاک چھانی، مورخ ابن خلکان کا بیان ہے

ارتحل الی العراق والبصرۃ و الکوفۃ وبغداد ومکۃ والشام ومصر والری لکتب الحدیث[2]	حدیث کے لیے عراق، بصرہ، کوفہ، بغداد، مکہ، شام ومصر اور رے کا سفر کیا۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

سمع بخراسان والعراق والحجاز ومصر والشام وغیرھا من البلاد[3]	خراسان، عراق، حجاز، مصر وشام اور دیگر بلاد میں سماع حدیث کیا،

وغیرھا من البلاد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ اور شہروں کا سفر بھی کیا تھا جس کا ثبوت ان کے شیوخ کے ناموں سے بھی ملتا ہے،

شیوخ و تلامذہ | ان کے شیوخ کا استقصا دشوار ہے، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب فرماتے ہیں، کہ جبارہ بن المغلس وابراہیم بن المنذر وابن نمیر وہشام بن عمار اور اس طبقہ کے دوسرے حضرات سے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۰ [2] وفیات [3] تہذیب

علم حدیث حاصل کیا، خصوصیت سے ابوبکر بن شیبہ سے زیادہ استفادہ کیا[۵]، ان کے شیوخ میں امام مالک اور لیث کے تلامذہ بھی ہیں[۶]، ان کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے، علی بن سعید بن عبداللہ العسکری، ابراہیم بن دینار الجرشی الہمدانی، احمد بن ابراہیم قزوینی جد ابویعلی خلیلی، ابوطیب احمد بن روح شعرانی، اسحق بن محمد قزوینی، جعفر بن ادریس، حسین بن علی، سلیمان بن یزید قزوینی، محمد بن عیسیٰ صفار، ابوالحسن علی بن ابراہیم بن سلمہ قزوینی، ابوعمرو احمد بن مدنی اصبہانی وغیرہ ان کے علاوہ اور بھی ہیں[۳]۔

علما کا اعتراف کمال | امام صاحب کے فضل و کمال اور جلالت شان، حفظ حدیث کا اعتراف ہر دور کے علما و تذکرہ نویسوں نے کیا ہے، مورخ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ کان اماماً فی الحدیث عارفاً بعلومہ وجمیع ما یتعلق[۴]۔ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں: "ھو ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ صاحب کتاب السنن المشھورۃ وھی دالۃ علی عملہ وعلمہ وتبحرہ واطلاعہ واتباعہ للسنۃ فی الاصول والفروع[۵]"۔ محدث ابویعلی خلیلی کے الفاظ ہیں: "ابن ماجہ ثقۃ کبیر متفق علیہ محتج بہ لہ معرفۃ بالحدیث وحفظہ[۶]"۔ علامہ ذہبی کی رائے ہے "قد کان ابن ماجہ حافظاً صدوقاً واسع العلم[۷]"۔ حافظ ابن حجر نے احد الائمہ حافظ لکھا[۸]۔

مسلک | امام صاحب کا مسلک متعین طور پر معلوم نہیں ہوتا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک امام احمد کے مسلک کی طرف میلان تھا[۹]، مگر مولانا انور شاہ کی تحقیق ہے کہ شاید امام ابن ماجہ شافعی تھے[۱۰]، علامہ طاہر جزائری فرماتے ہیں کہ ابن ماجہ وغیرہ علما و ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے مقلد نہیں تھے بلکہ ائمہ حدیث امام شافعی، احمد، اسحق اور ابوعبیدہ کے قول کی طرف میلان رکھتے تھے یعنی اہل عراق کے مذہب کے مقابل میں اہل حجاز کی طرف زیادہ مائل تھے[۱۱]، جس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے بھی ہوتا ہے۔

---

[۱] بستان ص ۱۲۵، [۲] مرقاۃ ج ۱ ص ۲۳ [۳] تہذیب بحوالہ مذکور [۴] وفیات ج ۳ ص ۳۰۰ [۵] البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲ [۶] تہذیب [۷] سیر اعلام النبلاء [۸] تقریب ج ۹ [۹] الانصاف [۱۰] معارف السنن ج ۱ ص ۲۲ [۱۱] توجیہ النظر ص ۱۸۵

وفات حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ میں نے قزوین میں امام ابن ماجہ کی تاریخ کا نسخہ دیکھا تھا، جو عہد صحابہ سے لیکر ان کے زمانہ تک کے رجال اور امصار کے حالات پر مشتمل ہے، اس تاریخ کے آخر میں امام صاحب کے شاگرد جعفر بن ادریس کی یہ تحریر ہے کہ ابو عبد اللہ محمد بن یزید نے دو شنبہ کے دن انتقال فرمایا، اور سہ شنبہ ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۳ھ کو دفن کیے گئے، میں نے خود ان سے سنا ہے، وہ فرماتے تھے کہ میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوا تھا، اس حساب سے وفات کے وقت ان کی عمر ۶۴ سال کی تھی، ان کی وفات پر علماء نے مرثیے لکھے۔

تصنیفات مورخین نے امام صاحب کی تین کتابوں کا ذکر کیا ہے، التفسیر والتاریخ والسنن۔ تفسیر کے متعلق علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں "لابن ماجہ تفسیر حافل"۔ علامہ سیوطی نے الاتقان میں اس کو ابن جریر کے طرز کی تصنیف بتایا ہے۔ التاریخ، اس کو مورخ ابن خلکان نے تاریخ ملیح اور حافظ ابن کثیر نے تاریخ کامل سے تعبیر کیا ہے۔

سنن ابن ماجہ اور اسکی خصوصیات ان میں سنن ابن ماجہ سب سے اہم کتاب ہے، جس پر ہم آیندہ صفحات میں تفصیل سے گفتگو کریں گے، اس کتاب کی افادیت واہمیت پر علماء ومحدثین کا اتفاق ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں

وکتابہ فی السنن جامع جید[1] انکی کتاب سنن (احکام) میں ایک عمدہ جامع ہے

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ یہ کتاب نہایت مفید ہے اور مسائل فقہ کے لحاظ سے اسکی ترتیب وتبویب ہے[2]۔ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے اس اجمال کی یہ تفصیل فرمائی ہے:۔

"وفی الواقع از حسن ترتیب وسرد احادیث بے تکرار واختصار آنچہ ایں کتاب دارد ہیچ یک از کتب ندارد"[3]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ [2] الباعث الحثیث ص ۹۰ [3] بستان ص ۱۲۵

۲۔ اس کی "دوسری" نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ بہت سی ایسی نادر حدیثوں پر مشتمل ہے جن سے صحائے خمسہ خالی ہیں، علامہ ابو الحسن سندی فرماتے ہیں کہ مصنف نے بہت سے ابواب میں ایسی حدیثوں کو نقل کیا ہے جو پانچوں مشہور کتابوں میں نہیں ہیں، اگرچہ وہ ضعاف ہیں، لیکن اسی مضمون کی دوسری حدیثیں بھی ہیں جن کو دوسرے محدثین نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

۳۔ مصنف نے مختلف شہروں کی مخصوص روایات کی نشاندہی بھی کی ہے مثلاً "باب کل مسکر حرام" کے تحت دو روایتوں کو نقل کیا ہے

(۱) حدثنا یونس بن عبد الاعلی ثنا ابن وھب اخبرنا ابن جریج عن ایوب بن ھانی عن مسروق عن ابن مسعودؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کل مسکر حرام الخ اس کے بعد فرماتے ہیں "ھذا حدیث المصریین" (یہ مصریوں کی حدیث ہے)

(۲) حدثنا علی بن میمون الرقی ثنا خالد بن عیان عن سلیمان بن عبد اللہ بن الزبرقان عن یعلی بن شداد بن اوس سمعت معاویۃ یقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول کل مسکر حرام، ھذا الحدیث الرقیین (یہ رقہ والوں کی حدیث ہے)

۴۔ مختلف احادیث کے ذیل میں بعض ایسے واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے حدیث نبویؐ سے اس عہد کے مسلمانوں سے تعلق کا پتہ چلتا ہے، مثلاً باب ما جاء فیما یستحب من التطوع بالنھار" کے تحت حبیب بن ثابت کی روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے اس حدیث کے راوی ابو اسحٰق بلعی کو مخاطب کرکے فرمایا "ما أحب ان لی بحدیثک ھذا ملاء مسجدک ذھبا" مجھکو تم نے جو حدیث سنائی اس کے بدلے میں تمھاری مسجد کے برابر بھرا ہوا سونا لینا بھی پسند نہیں کرتا۔

(۵) پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پانچ ثلاثی حدیثیں بھی ہیں، جب کہ امام مسلم و امام نسائی کی سب سے عالی روایات رباعیات ہیں جو سنن ابن ماجہ میں بکثرت موجود ہیں، البتہ صحیح بخاری میں ۲۲ اور سنن ابی داود و جامع ترمذی میں ایک ایک ہے،

یہ پانچوں روایات ایک ہی سند سے مروی ہیں، اگرچہ امام ابن ماجہ کے طبقہ کے لحاظ سے بہت عالی ہیں، مگر سند کے اعتبار سے ان کا کوئی خاص وزن نہیں ہے۔ اس کے ایک راوی کثیر بن سلیم پر محدثین نے جرح کی ہے، وہ روایات حسب ذیل ہیں:

۱۔ حدثنا جبارۃ بن المغلس ثنا کثیر بن سلیم سمعت انس بن مالک یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احب ان یکثر اللہ خیر بیتہ فلیتوضا اذا حضر غداءہ واذا رفع[1] باب الوضوء عند الطعام

۲۔ حدثنا جبارۃ المغلس ثنا کثیر بن سلیم عن انس بن مالک قال ما رفع من بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فضل شواء قط ولا حملت معہ طنفسۃ[2]

۳۔ حدثنا جبارۃ بن المغلس ثنا کثیر بن سلیم عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الخیر اسرع الی البیت الذی یغشی من الشفرۃ الی سنام البعیر۔[3]

۴۔ حدثنا جبارۃ بن المغلس ثنا کثیر بن سلیم سمعت انس بن مالک یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما مررت بلیلۃ اسری بی بملأ الا قالوا مر امتک بالحجامۃ[4]

۵۔ حدثنا جبارۃ بن المغلس ثنا کثیر بن سلیم عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ہذہ الامۃ مرحومۃ عذابہا بایدیہا فاذا کان یوم القیامۃ دفع الی کل رجل من المسلمین رجل من المشرکین فیقال ہذا فداءک من النار[5]

---

[1] باب الشواء [2] باب الضیافت [3] باب الحجامۃ [4] باب صفۃ امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

سنن ابن ماجہ کے متعلق امام ابوزرعہ رازی کا ارشاد

عبد اللہ بن عبد الکریم بن یزید بن فروخ رازی المتوفی ۲۶۴ھ علم حدیث کے مشہور امام ہیں، جن کے متعلق امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ابو حاتم، ابوزرعہ، ابو داؤد یہ تین رستے ہیں ایسے اشخاص ہیں جن کی نظیر اس وقت روئے زمین پر موجود نہیں[1]۔ علامہ ذہبی ابوزرعہ کے متعلق خود فرماتے ہیں "کان من افراد الدھر حفظا وذکاءً ودینا وعلما وعملا"[2] یہ حفظ حدیث ذکاوت، دینداری اور علم و عمل کے لحاظ سے ان لوگوں میں سے تھے جو یکتائے زمانہ ہوئے ہیں، انھوں نے سنن ابن ماجہ کو دیکھ کر یہ سند عطا فرمائی "اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تو فن حدیث کی اکثر جوامع اور مصنفات بیکار و معطل ہو کر رہ جائیں گی"[3]۔

حافظ ابوزرعہ کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، آج ہمارے سامنے بہت سی حدیث کی کتابیں ہیں، جو صحت و قوت اسناد کے لحاظ سے اس سے کہیں فائق ہیں، مگر ان کو وہ قبولیت حاصل نہیں جو سنن ابن ماجہ کو ملی، مثلاً جیسے صحیح ابن حبان جس کے متعلق مورخ ابن العماد حنبلی نے تصریح کی ہے کہ "واکثر النقاد علی ان صحیحہ اصح من سنن ابن ماجہ"[4]

سنن ابن ماجہ کا صحاح ستہ میں شمار

حافظ ابن السکن نے اسلام کی بنیادی کتابیں چار بتائی ہیں، حافظ مندہ نے بھی مخرجین صحاح میں امام بخاری، امام مسلم، ابو داؤد اور امام نسائی ہی کے ذکر پر اکتفا کیا ہے بعد میں ابو طاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی مذکورہ بالا چاروں کتابوں کے ساتھ شمار کیا اور فرمایا کہ ان پانچوں کتابوں پر علماء مشرق و مغرب کا اتفاق ہے[5]، شیخ ابن صلاح م ۶۴۳ھ اور علامہ نووی م ۶۷۶ھ تک نے ان ہی پانچ کتابوں کے مصنفین کی وفیات بیان کی ہیں[6]، ان دونوں بزرگوں نے امام ابن ماجہ کو نظر انداز کر دیا ہے اس لیے علامہ سیوطی نے علامہ نووی پر تدریب الراوی میں استدراک کیا ہے کہ "لم یدخل المصنف سنن ابن ماجہ فی الاصول وقد اشتھر فی عصر المصنف وبعدہ جعل الاصول ستۃ باد خالہ فیھا"[7]۔

۱؎ تذکرہ ج ۲ ص [illegible] ۲؎ ایضاً ۳؎ بستان ص ۱۲۲ ۴؎ شذرات ترجمہ ابن حبان ۵؎ شروط الائمہ ۶؎ مقدمہ ابن صلاح ص ۳۸۶
۷؎ تدریب ص ۳۰

مصنف (علامہ نووی) نے سنن ابن ماجہ کو بنیادی کتابوں میں داخل نہیں کیا ہے، حالانکہ خود مصنف کے عہد میں اور ان کے بعد سنن ابن ماجہ کو چھ بنیادی کتابوں میں شمار مشہور ہو چکا تھا[۱]، سب سے پہلے حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی م ۵۰۷ھ ہیں جنھوں نے سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں داخل کیا، ان کے بعد تمام مصنفین نے ان کی پیروی کی ہے[۲]، ان کے بعد حافظ عبد الغنی مقدسی م ۶۰۰ھ نے الاکمال فی اسماء الرجال میں ان چھ کتابوں کے رجال کو یکجا کیا،

اس کے بعد حافظ ابن طاہر کے معاصر محدث رزین م ۵۲۵ھ نے کتاب التجرید للصحاح والسنن میں کتب خمسہ کے ساتھ سنن ابن ماجہ کے بجائے موطا امام مالک کی حدیثوں کو درج کیا اور انھیں کی اقتدا علامہ ابن الاثیر جزری م ۶۰۶ھ نے جامع الاصول میں کی ہے، اس کے برخلاف علامہ ابو سعید خلیل بن کیکلدی العلائی م ۷۶۱ھ نے جو سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے سنن دارمی کو چھٹی کتاب قرار دیا ہے، شیخ محمد عابد سندی نے شیخ علائی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "انہ قال لو قدم مسند الدارمی بدل ابن ماجہ فکان سادسا لکان اولیٰ"[۳] یعنی اگر سنن ابن ماجہ کے بجائے سنن دارمی کو چھٹی کتاب قرار دیا جائے تو زیادہ مناسب رہے گا، حافظ ابن حجر نے بھی شیخ علاء کی ہمنوائی کی، علامہ سیوطی لکھتے ہیں" قال شیخ الاسلام ولیس ای الدارمی دون السنن الاربعۃ فی الرتبۃ بل لو ضم الی الخمسۃ فکان اولیٰ من ابن ماجہ فانہ امثل منہ بکثیر"، شیخ الاسلام (حافظ ابن حجر) فرماتے ہیں کہ دارمی کی کتاب رتبہ میں سنن اربعہ سے کم نہیں ہے، بلکہ اگر اس کو کتب خمسہ کے ساتھ ملا دیا جائے تو ابن ماجہ کی بہ نسبت یہ اولیٰ ہے، کیونکہ وہ سنن ابن ماجہ سے کہیں فائق ہے[۴]، محدث عبد الغنی نابلسی نے اپنی کتاب ذخائر المواریث فی الدلالۃ علی مواضع الاحادیث میں لکھتے ہیں کہ چھٹی کتاب کے متعلق اختلاف ہو، پس اہل مشرق کے

---

[۱] تدریب ص ۵۶ طبع جدید [۲] ایضاً ص ۹۴ [۳] لامع ص ۲۷ [۴] تدریب

نزدیک ابو عبد اللہ محمد بن ماجہ قزوینی کی کتاب کتاب السنن ہے، اور اہل مغرب کے نزدیک امام مالک ابن انس کی موطا ہے۔

لیکن علامہ سندی کا فیصلہ ہے کہ عام طور پر علماء متاخرین سنن ابن ماجہ کو حدیث کی چھٹی کتاب مانتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ جہاں تک قوت و صحت کا تعلق ہے، موطا کا مقام اس سے بہت بلند ہے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تو صحیحین پر اس کو ترجیح دی ہے، سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ میں شمار کرنے کی وجہ اس کی افادیت ہے، اس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جو موطا میں نہیں ہیں، علامہ سیوطی فرماتے ہیں: "درج اهل العلم بالاثر والمقدمون فيهم وكثير من محققي المتاخرين وعلماء أنه بعضهم كتابا مفيدا اقوى النفع فى الفقه وكان من كثرة زوائده على الموطا ادرجه على وهذه على الاصول"[1]

اسی طرح سند دارمی کی اہمیت جو بھی ہو لیکن صحاح ستہ کی جگہ مدت ہوئی سنن ابن ماجہ سے پُر ہو چکی ہے، مؤرخ ابن خلکان ۶۸۱ھ امام ابن ماجہ کے ترجمے میں لکھتے ہیں وكتابه في الحديث احد الصحاح الستة" حدیث میں ان کی کتاب صحاح ستہ میں ایک ہے"[2]

سنن ابن ماجہ کا صحاح ستہ میں مرتبہ | امام ابو القاسم رافعی المتوفی ۶۲۳ھ فرماتے ہیں کہ حفاظ حدیث امام ابن ماجہ کی کتاب کو صحیحین یا سنن ابی داؤد و سنن نسائی کے برابر سمجھتے ہیں اور اسکی روایات سے سند لاتے ہیں[3]، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں" کلها جیاد سوی الیسیرة[4]" (سب حدیثیں اچھی ہیں سوائے چند کے) علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ سنن ابن ماجہ بہت اچھی کتاب ہے، کاش اس میں چند واہی حدیثیں نہ ہوتیں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے[5]

---

[1] الیانع الجنی حاشیہ کشف الاستار [2] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۵۴ [3] التبس بہ الحاجہ ص ۳۲۵
[4] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۵۶ [5] تذکرہ ج ۲ ص ۱۸۹

ابوزرعہ کا بیان ہے کہ میں نے ابوعبداللہ ابن ماجہ کی کتاب کا مطالعہ کیا، اس میں چند معمولی احادیث پر کلام ہے، جن کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہوگی، باقی کتاب میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے
مگر علامہ ذہبی نے ابوزرعہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس میں شاید تیس حدیثیں ایسی ہوں جن کی اسناد میں ضعف ہے[۲]، اس طرح امام ابوزرعہ کے دو قول ہوگئے ایک دس کا دوسرا تیس کا،
ممکن ہے ان تیس حدیثوں سے مراد وہ حدیثیں ہوں جن کو علامہ ابن الجوزی نے کتاب الموضوعات میں داخل کیا ہے، جس پر "التعقبات علی الموضوعات" میں تفصیلی بحث ہے، علامہ سیوطی نے ابوعبداللہ رشید کے واسطے سے یہ نقل کیا ہے کہ امام ابن ماجہ نے ایسے لوگوں کی حدیثوں کی تخریج کی ہے جو کذب سے متہم ہیں، ان کی بعض احادیث صرف ان ہی کے واسطے سے مروی ہیں، شارح ابن ماجہ اپنی شرح میں فرماتے ہیں وبالجملة فهو دون الكتب الخمسة في المرتبة[۳]

سنن ابن ماجہ کے متعلق ایک اہم غلط فہمی

سنن ابن ماجہ کی ان ضعیف روایتوں کی وجہ سے یہ کلیہ مشہور ہوگیا ہے کہ "کل ما انفرد به ابن ماجه فهو ضعيف"، حافظ ابن حجر نے بھی تصریح کی ہے "في السنن جامع جيد كثير الابواب والغرائب وفيه احاديث ضعيفة جدا"[۴]
مگر علامہ مزنی نے کلیہ سے اتفاق نہیں کیا ہے" وليس الامر في ذلك على اطلاقه باستقرائي وفي الجملة ففيه احاديث كثيرة منكرة" یعنی میرے استقرار کے مطابق یہ حکم علی الاطلاق نہیں لگایا جاسکتا ہے، اگرچہ فی الجملہ اس میں منکر احادیث کی تعداد زیادہ ہے، اور مزنی کی تصریح کو رجال پر محمول کرنا اولیٰ ہے، حدیثوں پر محمول کرنا صحیح نہیں ہے[۵]،
جن روایات میں ابن ماجہ منفرد ہیں ان میں صحیح حدیثیں بھی ہیں اور حسن بھی، مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی کی تحقیق میں رجال کے متعلق بھی کلی طور پر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا، اور اپنی کتاب ابن ماجہ و

---

[۱] شروط الائمہ ص ۱۶، [۲] تذکرہ ص ۱۸۹ ج ۲، [۳] الیانع الجنی ص ۵، [۴] تہذیب التہذیب [۵] ایضاً

علم حدیث میں اس کو مثالوں کے ذریعہ واضح فرمایا ہے،

ان وجوہ کی بنا پر ابن ماجہ کا مرتبہ سب سے آخیر میں رکھا گیا ہے، علامہ ابوالحسن سندی شارح ابن ماجہ اپنی شرح کے مقدمہ میں لکھتے ہیں وبالجملۃ فھو دون الکتب الخمسۃ فی المرتبۃ۔

تنبیہ | شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں" درین کتب آنچہ (ق) حدیث است از صحاح وحسان وضعاف ہمہ موجود است وتسمیہ آں بصحاح بطریق تغلیب است (۱۵)
ان کتابوں (صحاح ستہ) کی جتنی حدیثیں موجود ہیں ان پر صحاح کا اطلاق تغلیبا کیا جاتا ہے۔
یہ واضح رہے کہ صحاح ستہ میں صحت کے لحاظ سے فرق مراتب مجموعی حیثیت سے قائم کیا گیا ہے
یہ مطلب نہیں ہے کہ صحاح خمسہ کی ہر حدیث سنن ابن ماجہ کی ہر روایت پر صحت میں فوقیت رکھتی ہو۔

تعداد ابواب واحادیث | سنن ابن ماجہ میں بتیس (۳۲) کتابیں، پندرہ سو ابواب اور چار ہزار حدیثیں ہیں[۱]، جو چند کے سوا سب کی سب عمدہ ہیں[۲]،

سلسلہ روایت | ابن ماجہ کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے، اور متعدد لوگوں نے اس کتاب کو امام صاحب سے روایت کیا ہے، لیکن سب سے زیادہ جس کی روایت کو حسن قبول حاصل ہوا، وہ شیخ ابوالحسن قطان ہیں، ان کے نسخے میں بہت سی روایتیں خود ان کی سند سے بھی منقول ہیں، مطبوعہ نسخوں میں قال ابوالحسن حدثنا سے یہی مراد ہیں، یہ اپنے زمانے کے بڑے عالم اور محدث تھے، ان کی ولادت ۲۵۴ھ اور وفات ۳۴۵ھ میں ہوئی، سنن ابن ماجہ کی اہمیت کی بنا پر مختلف زمانوں کے علماء نے اس کی جانب اعتنا کیا، اس کی شرحیں، حواشی اور دوسرے متعلقات پر کتابیں لکھیں، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے،

شروح ومتعلقات | ۱۔ شرح ابن ماجہ: امام حافظ علاء الدین مغلطائی بن قلیج بن عبداللہ الحنفی م ۷۶۲ھ

۱؎ تذکرہ ص ۱۸۹ ۲؎ بستان المحدثین ص ۱۲۵

سب سے پہلی شرح ہے، جو جامعیت کے باوجود نا مکمل رہ گئی، صرف ایک حصہ کی شرح پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔

۲- شرح ابن رجب حنبلی م ۷۹۵ھ

۳- ماتمس الیہ الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ، شیخ سراج الدین عمر بن علی الملقن م ۸۰۴ھ، یہ صرف زوائد یعنی ان روایات کی شرح ہے جو کتب خمسہ میں موجود نہیں ہیں۔

۴- الدیباجہ: شیخ کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری م ۸۰۸ھ۔ یہ شرح پانچ جلدوں میں ہے۔

۵- نور مصباح الزجاجہ: شیخ علی بن سلیمان مالکی مغربی، علامہ سیوطی کی شرح مصباح الزجاجہ شرح سنن ابن ماجہ کا اختصار کیا ہے، مصر میں طبع ہو چکی ہے۔

۶- شرح ابن ماجہ: ابو الحسن محمد بن عبد الہادی سندی حنفی المتوفی ۱۱۳۸ھ اس میں ضبط الفاظ، حلِ غریب اور بیان اعراب پر زیادہ توجہ کی گئی ہے۔

۷- انجاح الحاجہ شرح سنن ابن ماجہ۔ شیخ عبد الغنی بن ابی سعید مجددی م ۱۲۹۵ھ، یہ ایک مختصر تعلیق ہے۔

۸- حاشیہ بر سنن ابن ماجہ، مولانا فخر الحسن گنگوہی؛ یہ مشہور و متداول حاشیہ ہے، اس میں علامہ سیوطی اور مولانا عبد الغنی مجددی دونوں کی شرحوں کو مع مزید اضافہ کے جمع کیا ہے۔

۹- مفتاح الحاجہ، شیخ محمد علی؛ یہ حاشیہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

۱۰- المجرد فی اسماء رجال ابن ماجہ کلہم سوی من اخرج منہم فی احد الصحیحین: امام ذہبی۔ اس کا قلمی نسخہ کتبخانہ ظاہریہ میں موجود ہے۔

۱۱- ماتمس بہ الحاجہ اور ابن ماجہ و علم حدیث۔ یہ دونوں کتابیں مولانا عبد الرشید صاحب نعمانی کی تصنیف ہیں، ان میں علم حدیث اور سنن ابن ماجہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے، حدیث کے طالبعلموں کے لیے ان کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

یہود کی تصویر قرآن و بائبل میں

از جناب مولوی حبیب ریحان ندوی استاد جامعہ اسلامیہ لیبیا

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب خلافت ختم ہوگئی اور اس سامراجی سازش کا انکشاف ہوا کہ ایک طرف اتحادیوں نے عربوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کی ایک متحدہ حکومت بنا دیں گے، دوسری طرف سے ہی معاہدہ سائکس پیکو" کی رو سے یہود سے یہ وعدہ کر لیا کہ ان کے لیے ارض فلسطین میں ایک یہودی وطن بنا دیں گے، اور یہ ہونا بھی تھا، کیونکہ "بحبل من الناس" لوگوں کے سہارے کے بغیر اس کا قیام ممکن بھی نہ تھا، یہ کام جنگ عظیم میں ٹرکی کی شکست کے بعد ہی ممکن تھا، کیونکہ اس سے قبل سلطان عبدالحمید نے جس جرأت سے سامراجی طاقتوں سے فلسطین کو یہود کا وطن بنانے سے انکار کیا تھا، اس کے بعد اس کی توقع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ٹرکی کی خلافت کے جیتے جی یہ یہود کی آرزو پوری ہو سکتی ہے،

۱۹۱۷ء میں بالفور نے وعدہ کیا کہ وطن یہود کا قیام ہو کر رہے گا، عربوں نے اس کے خلاف احتجاج اور مظاہرے کیے، مگر جنگ کے بعد فلسطین پر برطانوی انتداب قائم ہوگیا اور یہود کے لیے جو جو آسانیاں بہم پہنچائی گئیں اور جس طرح ان پر ہجرت کے دروازے کھولے گئے، وہ سب کو معلوم ہیں، اور بالآخر وہ منحوس گھڑی آگئی کہ ۱۹۴۸ء میں اسرائیل نے اپنی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا، عرب ممالک متحدہ محاذ بنا کر لڑے مگر شکست کھائی، اس کے کئی اسباب تھے، جن کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں، بین الاقوامی طور پر جنگ بندی کے حدود قائم ہوئے، مگر اقوام متحدہ

لی قرار دادوں تک کو اسرائیل نے بڑی حد تک ماننے سے انکار کر دیا، اور سامراجیوں کی امداد غضب، فریب اور انسانی لاشوں پر یہ نام نہاد حکومت قائم ہو کر رہی۔

یہود کی دولت کی وجہ سے ان کا اثر بین الاقوامی سیاست پر بہت گہرا ہے لیکن کسی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یہ اثر اتنا بڑھ جائے گا کہ یہود کی تمام تاریخی مخالفتوں، حضرت مسیحؑ کے انکار، ان کے ساتھ گستاخیوں اور مسیحیت کے متعلق یہود کے خیالات سے قطع نظر کر کے "نائب مسیح" پوپ مصلوبیت مسیح سے یہودیوں کی برأت کا وثیقہ نکال دینگے،

مسیحیت کو گرجا والوں نے عجائب و غرائب کا دین بنا دیا ہے، وحی الٰہی اور یہودیوں کی کتب مقدسہ کے مقابلہ میں مجمع مقدس ایجاد کیا گیا ہے، اس کا جو جی چاہتا ہے فتویٰ صادر کر دیتا ہے، حضرت مسیحؑ کی وفات کے ۳۲۵ سال کے بعد آریوس کی وحدانیت کے جواب میں مسیح کی الوہیت کا فتویٰ دیدیا، ۳۸۱ء میں قسطنطنیہ کے مجمع اول نے روح القدس کی الوہیت کا پروانہ نکال دیا، ۴۳۱ء میں مجمع افسس نے فتویٰ صادر کر دیا کہ مریمؑ نے اللہ پیدا کیا جس کی دو طبیعتیں ہیں، لاہوتی و ناسوتی، قسطنطنیہ کے مجمع دوم نے ۶۸۰ء میں پاس کر دیا کہ وہ طبیعتیں اور دو مشیتیں ہیں، ۸۹۶ء میں مجمع دوم نے اعلان کیا کہ روح القدس ب اور ابن سے مشتق ہے، ۱۲۱۵ء میں گرجے کو مغفرت بانٹنے کا حق دیا گیا، اور ۱۸۶۹ء میں پوپ کی شخصیت کو بھی اس طرح معصوم قرار دے دیا جس طرح انبیاء و رسل معصوم تھے، اس طرح حرام و حلال اور حق و ناحق کے سارے اختیارات پطرس کے خلیفہ پوپ کو مل گئے،

"جس کو وہ زمین پر باندھتے ہیں وہ آسمان پر بندھا ہے"۔ (متی ۱۶ : ۱۹)

ان عجائب نے اس دور ترقی میں گرجے پر جو مصیبتیں نازل کیں ان کو کنیسہ کی تاریخ کا ہر واقف کار جانتا ہے،

بہرحال پوپ کا یہ وثیقہ تاریخ اور منطق کی رو سے مسیحیت اور یہودیت کی دوستی اور تعلقات کی حیران کردینے والی نشانی ہے، یہ وثیقہ پوپ نے اس وقت یہود کو بخشا جب وہ اسرائیل تشریف لے گئے، اور حکومت اسرائیل کی انتہائی کوشش کے باوجود یہود کے علما نے پوپ کا استقبال تو الگ رہا ان سے ملاقات تک کرنا گوارا نہ کیا کیونکہ یہود مسیحیوں کو مرتد اور مشرک سمجھتے ہیں۔

بین الاقوامی خبررساں ایجنسیاں چونکہ یہود کے قبضہ میں ہیں، اس لیے انھوں نے اس وثیقہ کا نام "یہود کو خون مسیح سے بری کرنے والا وثیقہ" رکھا حالانکہ یہ وثیقہ صرف یہود سے متعلق نہیں بلکہ دوسری اقوام پر بھی مشتمل ہے، اور وہ پوری قوم یہود کی برأت نہیں کرتا، بلکہ حضرت مسیحؑ کے عہد کے عوام کو بری کرتا ہے،

اس وثیقہ میں اس کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ یہود کو ایک خود مختار قوم ثابت کیا جائے اور ان پر جو ظلم و ستم ہوئے ان پر افسوس کا اظہار کیا جائے، اس وثیقہ پر تفصیلی بحث انشاء اللہ ہم آئندہ کسی مضمون میں کریں گے، اس مضمون میں صرف قرآن اور بائبل سے یہودی قوم کی زندگی پر مختصر تبصرہ مقصود ہے، جس سے یہ واضح ہوجائے گا کہ قوم یہود کیا تھی اور کیا ہے، اس سلسلہ میں ہم قرآن پاک کی آیات انہی جگہوں پر نقل کریں گے جہاں اس کی نظیر تورات وانجیل سے ملے گی۔

حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام سرزمین عراق میں پیدا ہوئے، اللہ تعالیٰ نے اپنی نگرانی اور رحمت کے زیر سایہ ان کی تربیت فرمائی تھی، اس لیے ان کے مومن قلب سے یہ صدا اٹھی

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ	میں نے اپنا منہ اسکی طرف کیا جس نے آسمان
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا	اور زمین بنائے، ایک طرف کا ہوکر

اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (انعام ۸۰) اور میں مشرکین میں سے نہیں۔

یہ نامانوس آواز سنکر مشرکین ان سے بحث کرنے لگے۔ انھوں نے جواب دیا

اَتُحَاجُّوْنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ (انعام ۸۱) کیا تم مجھ سے اللہ پر جھگڑتے ہو اور اس نے مجھکو ہدایت دی

سفر تکوین میں ہے

"تو میں تجھکو عظیم امت بنا دوں گا، اور تجھے برکت دوں گا، اور تیرا نام بڑا کرونگا اور تو برکت بن جائے گا، اور تجھے برکت بھیجنے والوں کو برکت اور تجھے لعنت بھیجنے والوں کو لعنت دوں گا، اور تجھ سے زمین کے سارے قبائل برکت حاصل کرینگے۔" (۱۲: ۲-۳)

یہ وعدۂ الٰہی پورا ہوا، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں اسحاقؑ، یعقوبؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، الیاسؑ، اسماعیلؑ، یسعؑ، یونسؑ اور لوطؑ پیدا ہوئے۔ (انعام ۸۵ - ۸۹)

اور توراۃ کی یہ بشارت پوری ہوکر رہی،

"اور تیری نسل کو زمین کی مٹی کے برابر کردوں گا۔" (تکوین ۱۲: ۱۶)

اسحاقؑ ابراہیمؑ کے بیٹے تھے، اور یعقوبؑ اسحاقؑ کے لخت جگر اور دونوں کو اللہ تعالیٰ نے نبوت و حکمت سے نوازا تھا، اور یعقوبؑ نبی تھے اس لیے معصوم اور ہر قسم کے گناہ سے پاک تھے، لیکن یہود کی کتابوں میں ان کی جو تصویر ہے، اس کے اعتبار سے ان کی حکومت کی بنیاد ہی مکر و فریب پر پڑی ہے۔ توراۃ میں ہے:-

"جب اسحٰق بوڑھا ہوگیا اور اس کی آنکھیں بینائی سے عاجز ہوگئیں، تو اس نے بڑے بیٹے "عیسو" کو بلایا اور اس سے کہا اے بیٹے۔ اس نے کہا میں یہ ہوں، تو اس نے

کہا میں بوڑھا ہوگیا اور اپنی موت کا دن مجھے نہیں معلوم، اس لیے اس وقت تو اپنا
تیر و کمان لیکر جنگل میں نکل اور میرے لیے شکار کر اور جو کھانا مجھے محبوب ہے وہ بنا،
وہ میرے پاس لا تاکہ میں کھالوں، اور میرا دل موت سے پہلے تجھے برکت دیدے،
رفقہ یہ باتیں سن رہی تھی، عیسو جنگل شکار کرنے گیا، رفقہ نے یعقوب سے گفتگو کی یہ کہتے ہوئے
کہ میں نے تیرے باپ کو تیرے بھائی "عیسو" سے گفتگو کرتے سنا کر میرے لیے شکار لا، اور
کھانا بنا، تاکہ میں اسے کھا کر رب کے سامنے تجھے برکت دوں وفات سے پہلے، اس لیے
اس وقت اے لڑکے میری بات سن جو میں تجھے حکم دیتی ہوں، بکریوں کے پاس جا
اور میرے پاس دو چھوٹے بچے بھیڑ کے لے آ، میں تیرے باپ کا محبوب کھانا بنادوں
تو تو اسے اپنے باپ کے پاس لے جا تاکہ اسے کھالے اور تجھے برکت دیدے، یعقوب
نے رفقہ سے کہا، عیسو کے بال ہیں اور میں بلا بال کے ہوں، اگر باپ نے مجھے چھولیا تو
میں ان کی نگاہوں میں مجرم بن جاؤں، اور اپنے لیے لعنت لے لوں، برکت کے بجائے،
اس کی ماں نے کہا، تیری لعنت میرے اوپر ہے اے میرے بچے، میری بات سن،
اور جاکر مجھے لادے، وہ گیا اور ماں کو لادیا، ماں نے باپ کا محبوب کھانا پکایا،
اور رفقہ نے اپنے بڑے لڑکے عیسو کے فاخر کپڑے یعقوب کو پہنائے" (تکوین ۲۷: ۱-۱۵)
اس طریقے سے یعقوب نے (توراۃ کے بیان کے مطابق) باپ کی برکت حاصل کی،
اور جب "عیسو" جنگل سے واپس آیا اور اس نے یہ سب سنا تو

"بڑی زور دار اور کڑوی چیخ سے رویا اور کہا اے باپ مجھے بھی برکت دیجئے تو اس نے
کہا، تیرا بھائی مکر سے تیری برکت لے گیا" (تکوین ۲۷: ۳۴-۳۵)

غور کیجئے، کیا نبی کی یہ شان ہوسکتی ہے؟ اور کیا برکت دینے والا خدا بھی دھوکہ

کھا سکتا ہے؟ اور کیا برکت خدا کے پاس اتنی محدود ہے کہ وہ دوسرے بھائی کو نہیں دے سکتا؟ یہود کے مکر و فریب کا تقاضا یہی تھا کہ سیدھی بات کو اتنا الٹ دیں۔ یحرفون الکلم عن مواضعہ

یوسف علیہ السلام یعقوبؑ کے بیٹے تھے، انھوں نے خواب دیکھا (تکوین ۳۷: ۵-۱۰) (یوسف ۴) تو بھائیوں کو آتش حسد نے جلا دیا، انھوں نے ان کو دھوکہ سے لیجا کر کنویں ڈالدیا (یوسف ۱۵) اور وہاں سے نکلنے کے بعد دوبارہ فروخت بھی کر دیا (تکوین ۳۷: ۲۵) مصر پہنچنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو بڑا عروج حاصل ہوا، بنی اسرائیل بھی مصر میں بہت پھولے پھلے اس لیے مصریوں کو ان کے غلبہ کا خوف ہو گیا، تو انھوں نے ان کا زور توڑنا شروع کیا اور ان کی حالت غلامی کی ہو گئی،

"یہ بنی اسرائیل کی قوم ہم سے زیادہ اور عظیم ہے، ہم یہ حیلہ کریں کہ یہ بڑھیں نہیں کہ جب جنگ ہو تو ہمارے دشمنوں سے مل جائیں، اور ہمارے خلاف جنگ کریں اور زمین چھوڑ کر چلے جائیں، تو ان پر سردار مقرر کیے، جو ان کو مسخر کریں اور محنت کے بھاری کام دیے کہ ان کو ذلیل کریں۔" (خروج ۱: ۹-۱۱)

قرآن پاک کا بیان ہے:

يَسُومُونَكُمْ سُوءَ الْعَذَابِ	چکھاتے تھے تم کو سخت عذاب، تمھارے
يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ	بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور زندہ
نِسَاءَكُمْ وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ	رکھتے تھے تمھاری عورتوں کو اور
رَبِّكُمْ عَظِيمٌ	اس میں بڑی آزمائش تھی تمھارے
(بقرہ - ۴۹)	رب کی طرف سے۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کو غلامی سے چھڑانے کیلئے بھیجا۔

"رب نے کہا میں نے اپنی قوم کی ذلت مصر میں دیکھ لی، اور ان کی آواز ان کے مسخر ینکے لیے سن لی، میں نے ان کے دردجان لیے، تو میں اترا ہوں تاکہ ان کو مصریوں کے ہاتھ سے بچاؤں، اور اس زمین سے نکال کر ایسی اچھی زمین میں لیجاؤں جہاں دودھ وشہد بہتا ہے (خروج ۳ : ۷)

حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے کہا :

انی رسول رب العلمین حقیق	میں رب العالمین کا رسول ہوں، قائم
علی ان لا اقول علی اللہ الا	ہوں اس پر کہ نہ کہوں اللہ کی طرف سے مگر
الحق قد جئتکم ببینۃ من	سچ، میں لایا ہوں تمھارے پاس نشانی
ربکم فارسل معی بنی اسرائیل	تمھارے رب کی تو بھیج دے میرے ساتھ
(اعراف - ۱۰۵)	بنی اسرائیل کو۔

فرعون کو موسیٰؑ کی یہ بات بری معلوم ہوئی، اس نے بنی اسرائیل کے ساتھ اور سختی شروع کردی، حضرت موسیٰؑ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا

استعینوا باللہ واصبروا ان	مدد مانگو اللہ سے اور صبر کرو، بیشک زمین
الارض للہ یورثھا من	اللہ کی ہے، وارث کرتا ہے اس کا
یشاء من عبادہ (اعراف - ۱۲۸)	جس کو چاہتا ہے۔

لیکن بنی اسرائیل سخت دل اور نا احساس شناس تھے، کہنے لگے

اوذینا من قبل ان تأتینا	ہم کو تکلیف دی گئی قبل اس کے کہ تم آؤ
ومن بعد ما جئتنا (مائدہ - ۱۲۹)	اور تمھارے آنے کے بعد بھی۔

موسیٰؑ نے نرمی سے سمجھایا

عسیٰ ربکم اَن یھلک عدوکم	قریب ہے تمھارا رب ہلاک کرے تمھارے دشمن
ویستخلفکم فی الارض فینظر	کو اور نائب کرے تم کو زمین میں تاکہ دیکھے
کیف تعملون (اعراف -)	تم کیسے عمل کرتے ہو۔

فرعون حضرت موسیٰؑ کے معجزات دیکھنے کے بعد بھی اپنی سرکشی پر قائم رہا، اس وقت آپ نے بددعا فرمائی

ربنا اطمس علیٰ اموالھم واشدد	اے ہمارے پروردگار ان کے مال و متاع
علیٰ قلوبھم فلا یومنوا حتیٰ یروا	کو ملیامیٹ کردے اور ان کے دلوں کو
العذاب الالیم (یونس - ۸۸)	سخت کردے کہ وہ دردناک عذاب دیکھے
	بغیر ایمان نہ لائیں۔

اور آدھی رات کو اپنی قوم کو ساتھ لیکر مصر سے چل کھڑے ہوئے، فرعون کو خبر ہوئی تو وہ غصہ سے آگ ہو گیا اور ان کے تعاقب کا حکم دیا، جب بنی اسرائیل نے فرعون کو قریب آتے دیکھا تو اپنی کج فطرت پر آگئے اور حضرت موسیٰؑ پر برہمی ظاہر کرنے لگے۔

"اے موسیٰ کیا مصر میں قبریں نہیں تھیں کہ اس صحرا میں لاکر ہمیں مارنا چاہا، ہم نے تیرا کیا بگاڑا تھا جو تو ہم کو مصر سے نکال کر لایا، کیا یہ بات ہم نے نہیں کہی تھی کہ ہم سے باز رہ کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کیونکہ یہ بہتر ہے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں اس سے کہ صحرا میں مریں۔" (خروج ۱۴ : ۱۱ - ۱۴)

موسیٰ علیہ السلام نے ان کا خوف کم کرنا چاہا اور فرمایا

"رب" تمھاری طرف سے لڑے گا اور تم خاموش رہوگے۔" (خروج ۱۴ : ۱۴)

قرآن پاک نے اس کی تعبیر ان بلیغ الفاظ میں فرمائی ہے :

فلما تراء الجمعان قال اصحاب	اور جب مقابل ہوئیں دونوں جماعتیں
موسیٰ انا لمدرکون قال کلا	تو اصحاب موسیٰ نے کہا ہم تو پکڑے لیے گئے،
ان معی ربی سیهدین (الشعراء ۶۱-۶۲)	موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں، رب میرا ساتھ ہے جو راہ بتائیگا،

اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ سے فرمایا

اضرب بعصاك البحر (شعراء ۶۳)	مار اپنے عصا سے دریا کو

حضرت موسیٰؑ نے عصا مارا، دریا پایاب ہوگیا اور بنو اسرائیل سلامتی اور امن کے ساتھ گزر گئے اور فرعون اور اس کا لشکر غرق ہوگیا،

وانجینا موسی ومن معه اجمعین	اور بچا دیا ہم نے موسیٰ کو اور جو اس کے
ثم اغرقنا الآخرین (شعراء ۶۵-۶۶)	ساتھ تھے سب کے سب، پھر غرق کردیا
	دوسروں کو۔

توراۃ میں ہے

"اپنا عصا اٹھا کر سمندر کے اوپر ہاتھ پھیلا اور اس کو پھاڑ۔ تو بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں خشکی پر چلیں گے۔" (تکوین: ۱۴-۱۶)

"موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر پر بڑھایا تو سمندر صبح کے آتے آتے اپنی ہمیشہ کی حالت پر لوٹ آیا، اور گویا مصری اس کی ملاقات کے لیے بھاگ رہے تھے، تو رب نے مصریوں کو وسط سمندر میں دھکیل دیا، ان میں سے ایک بھی نہ بچا۔" (تکوین ۱۴: ۲۷-۲۸)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر رحم فرمایا اور ان کو فرعون کی غلامی سے آزادی بخشی۔

واورثنا القوم الذین کانوا	اور وارث کیا ہم نے اس قوم کو جو کمزور
یستضعفون مشارق الارض	تھی زمین کے مشرق و مغرب کا جس میں

ومغاربها التی بارکنا فیها	ہم نے برکت رکھی اور پورا ہوا
وتمت کلمة ربك الحسنیٰ علیٰ بنیٓ	نیکی کا وعدہ بنی اسرائیل پر ان کے
اسرائیل بما صبروا (اعراف - ۱۳۷)	صبر کی وجہ سے۔

ان انعامات الٰہیہ کا تقاضہ تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی تعظیم اور ان کا احترام کریں، لیکن ابھی تھوڑی مدت بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ وہ پانی نہ ملنے پر غصہ میں خدا اور موسیٰ علیہ السلام کو برا کہنے لگے اور موسیٰؑ سے یوں گویا ہوئے۔

"تم نے ہم کو مصر سے کیوں نکالا کہ ہم کو ہماری اولاد اور مویشی کو پیاس سے مارڈالا تو موسیٰ چلایا یا رب کی طرف کہتا ہوا، میں اس قوم کا کیا کروں؟ تھوڑی دیر بعد یہ مجھے سنگسار کر دے گی، (خروج ۱۷ : ۳ - ۵)

اللہ نے ان کے لیے حوریب کی چٹان سے پانی نکالا اور موسیٰ سے اس طرح کہا

"میں تیرے سامنے حوریب کی چٹان کے پاس کھڑا ہوتا ہوں تو چٹان کو مار تو اس میں سے قوم کے پینے کے لیے پانی نکل آئے گا۔" (خروج ۱۷ : ۶)

قرآن نے اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے،

وَاِذِ اسْتَسْقیٰ مُوْسیٰ لِقَوْمِهٖ	اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کیلیے تو ہم نے کہا
فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ	اپنے عصا سے پتھر کو مار تو بہہ نکلے اس سے
فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ	بارہ چشمے، ہر قوم نے جان لی اپنی
عَیْنًا قَدْ عَلِمَ کُلُّ اُنَاسٍ	گھاٹ، کھاؤ اور پیو اللہ کی روزی
مَّشْرَبَهُمْ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا	سے اور نہ پھرو زمین میں فساد مچاتے،
مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی	

الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ (البقرہ - ۶۰)

بہر حال جب وہ خدا کی ناشکری اور اپنی کجی کا اظہار کرتے ہوئے صحرائے سینا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے پھر ان کو سمجھایا اور اپنی اطاعت پر مزید انعام کا وعدہ فرمایا

"اب اگر تم نے میری آواز سنی اور میرے عہد کی حفاظت کی تو تم تمام قوموں میں سے میرے لیے خاص ہو جاؤ گے، کیونکہ میرے پاس خاص زمین ہے، اور تم میرے لیے کاہنوں کی حکومت اور امت مقدسہ بن جاؤ گے۔" (خروج: ۱۹: ۵-۶)

کلام مجید میں ہے

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ
لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ (بقرہ: ۸۳)	اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے

اور اس عہد و میثاق کی بدولت ساری امتوں پر ان کو فضیلت بخشی گئی،

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ	اے بنی اسرائیل یاد کرو میری نعمت کو
الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ	جو تم پر کی اور میں نے تم کو دنیا والوں پر
عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (بقرہ ۴۷-۱۲۲)	فضیلت دی تھی۔

اور موسیٰؑ نے ان کو وصایائے عشرہ دیں، ان وصایا کا نچوڑ اور لب لباب یہ وصیت تھی،

"میں تیرا رب ہوں، جس نے مصر کی غلامی کی زندگی سے تجھکو نکالا، تیرے لیے میرے سوا کوئی معبود نہ ہو، نہ تو اپنے لیے پتھر سے کاٹا ہوا بت بنا اور نہ کوئی تصویر جو انسان میں سے ہو، اوپر یا زمین میں سے ہو، نیچے یا پانی میں سے ہو، زمین کے اندر، نہ تو ان کو سجدہ کر اور نہ ان کی عبادت کر۔ (خروج ۲۰: ۲-۵)

لیکن بنی اسرائیل اس عہد پر قائم نہیں رہے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں ان کی غیر حاضری کے ایام میں بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی،

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ — موسیٰ تمھارے پاس نشانیاں لایا، پھر
ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ — تم نے بچھڑا بنالیا اس کے پیچھے
وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ (بقرہ - ۹۲) — اور تم ظالم ہو۔

توریت میں ہے:

"رب نے موسیٰ سے کہا جا اتر (پہاڑ سے) کیونکہ تیری قوم جس کو میں نے مصر سے نکالا تھا۔ فاسد ہو چکی بہت جلد گمراہ ہوگئی، اس راستہ سے جس کی میں نے اس کو وصیت کی تھی، انھوں نے اپنے لیے سونے کا بچھڑا بنالیا، اور اس کے لیے قربانی کی، اور کہا کہ یہ تیرا معبود ہے، اے اسرائیل جس نے تجھکو مصر کی سرزمین سے نکالا تھا" (خروج ۳۲ : ۷ - ۸)

جب اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو اس جرم اور بدعہدی کی سزا دینی چاہی تو موسیٰ گڑگڑائے، رب الارباب کے سامنے اور کہا اے رب کیوں اپنی قوم پہ تیرا غصہ گرم ہوتا ہے، وہ جن کو تو نے مصر کی سرزمین سے نکالا تھا عظیم قوت اور زبردست ہاتھ کے ذریعہ" (خروج ۳۲ : ۱۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس سفارش پر اللہ تعالیٰ نے ان کا قصور معاف کر دیا۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ — پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کردیا
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (بقرہ - ۵۲) — کہ شاید تم شکرگزار ہو۔

لیکن وہ اپنی تندخوئی اور عناد کی وجہ سے حضرت موسیٰ بلکہ اللہ تعالیٰ سے بھی ذرا سی بات پر برہم ہو جاتے تھے، جب وہ شہد اور دودھ والی سرزمین میں داخل ہونے کے لیے چلے جن کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا تو حضرت موسیٰ نے ان کو کنعان کی سرزمین میں داخل ہونے کے لیے

آمادہ کیا اور خبریں لانے کے لیے جاسوس بھیجے، بعض جاسوسوں نے جھوٹی خبریں اڑادیں اور بنی اسرائیل کو ان سے ڈرایا اور کہا یہ سرزمین دودھ و شہد بہاتی ہے لیکن قلعوں سے بھری ہوئی ہے، وہاں کے لوگ دیو ہیں، بعض شاہدوں نے اطمینان دلایا اور کہا کہ ہم ضرور فتحیاب ہونگے لیکن بنی اسرائیل کو اس کا یقین نہیں آیا، چنانچہ توراۃ میں ہے:

"پوری جماعت نے آواز اٹھائی، اور چیخی اور روئی رات کو اور موسیٰ و ہارون پہ پوری جماعت بنی اسرائیل غصہ ہوئی اور دونوں سے کہا، کاش ہم مصر میں مرجاتے، یا اس صحراء میں، اور کیوں رب ہم کو یہاں لایا کہ اس زمین پر ہم تلوار سے کٹ کر گریں، ہماری عورتیں اور اولاد غنیمت بن جائیں، کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ مصر لوٹ چلیں"۔ (عدد ۱۴: ۱-۲)

موسیٰ علیہ السلام نے عاجز آکر خدا کو پکارا تو خدا نے بنی اسرائیل کی مسلسل سرتابی کی سزا یہ دھمکی دی کہ،

"موسیٰ و ہارون سے رب نے کہا میں کب تک اس شریر اور تندسر جماعت کو معاف کرتا رہوں، میں نے بنی اسرائیل کا میرے بارے میں غصہ دیکھ لیا، کہہ دے اُن سے کہ زندہ میں رب کہتا ہوں کہ وہی کروں گا تمھارے ساتھ جیسا کہ تم نے میرے کان میں کہا، اس صحرا میں تمھارے جسم گریں گے تمام گنے ہوئے تم میں سے اپنی گنتی کے موافق ۲۰ سال اور اس سے زیادہ عمر والے جنھوں نے مجھ پر غصہ کیا"۔ (عدد ۱۴: ۲۶-۲۹)

قرآن پاک میں یہ واقعہ کسی قدر تفصیل سے بیان ہوا ہے،

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ	اے قوم داخل ہو پاک زمین میں جو لکھ دی
الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا	اللہ نے تمھارے لیے، اور الٹے پیٹھ پھیر کر
عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ	مت جاؤ تو لوٹو گے تم نقصان میں، تو انھوں نے

قَالُوا يَا مُوسَىٰ إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ
وَإِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا
مِنْهَا فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ قَالُوا
يَا مُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا
مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ
وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا
قَاعِدُونَ .....
قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي
وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ
الْفَاسِقِينَ، قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ
عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ
فِي الْأَرْضِ فَلَا تَأْسَ عَلَى
الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ (مائدہ - ۲۱ : ۲۶)

کہا، اے موسیٰ، اس زمین میں زبردست قوم
ہے، اور ہم اس وقت تک داخل نہ
ہوں گے جب تک وہ نہ نکلیں، کہا اے
موسیٰ ہم اس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے
جب تک کہ وہ اس میں ہیں، تو جاؤ
تیرا رب اور دونوں لڑو ہم یہاں
بیٹھے ہیں،
موسیٰ نے کہا اے اللہ میرے اختیار میں
صرف میری جان ہے اور میرا بھائی
تو تفریق کر دے ہم میں اور فاسق قوم میں
کہا وہ زمین ان پر حرام کر دی گئی،
چالیس برس سر مارتے پھریں گے زمین میں
افسوس نہ کرنا فاسق قوم پر۔

اس عذاب خداوندی سے گذرنے کے بعد جب بنی اسرائیل جبل ہود پہنچے تو پھر اللہ تعالےٰ نے تنبیہ فرمائی کہ

"رب نے اس قوم پر جلانے والے سانپ بھیجے جس نے ان کو ڈسا تو بہت سی قوم اس سے مرگئی۔" (عدد ۲۱: ۶)

اللہ تعالیٰ نے وصایا میں ان کو بتوں کی پرستش اور زنا (خروج ۲۰: ۱۴) سے روکا تھا لیکن انھوں نے شطیم میں جاکر

"قوم نے مواب کی لڑکیوں کے ساتھ زناکاری شروع کر دی تو ان زانیات نے قوم کو

اپنے معبودوں کے لیے قربانی کرنے کو کہا، تو قوم نے کھایا اور ان کے معبودوں کو سجدے کیے اور اسرائیل بعل فغور سے متعلق ہو گیا، تو خدا کا غصہ اسرائیل پر گرم ہوا، اور موسیٰ نے اسرائیل کے قضاۃ سے کہا کہ ہر ایک اپنی قوم کو قتل کرے، جو بعل فغور سے متعلق ہو گئے تھے" (عدد ۲۵ : ۱ - ۵)

اس کفر و نفاق اور ظلم و طغیان نے ان کے دل کو پتھر جیسا بنا دیا، اور وہ لعنتِ خداوندی کے مستحق ہو گئے،

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَالِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً (بقرہ - ۷۴)	پھر سخت ہو گئے تمھارے دل تو وہ پتھر کی طرح ہو گئے، اس سے بھی سخت۔
فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً (مائدہ - ۱۳)	ان کے پیمان توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دل سخت کر دیے۔

بائیبل میں ہے

"ان کے چہرے سخت ہو گئے چٹان سے زیادہ (ارمیا ۵ : ۳)

اب ان کا تمرد اور ان کی سرکشی اتنی بڑھ گئی کہ انبیاء کو جھٹلانا اور قتل کرنا شروع کر دیا،

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ (بقرہ - ۸۸)	کیا جب جب کوئی پیغمبر تمھارے پاس ایسے احکام لائے جنکو تمھارا دل نہ چاہتا تھا تو تم نے تکبر کرنا شروع کر دیا، سو بعضوں کو تو تم نے جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو قتل ہی کر ڈالا
لِمَ تَقْتُلُونَ أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِنْ قَبْلُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (بقرہ - ۹۱)	.... کیوں قتل کرتے تھے انبیاء کو اس سے قبل اگر تم مومن تھے،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے ان اعمال قبیحہ پر ان الفاظ میں ملامت کی ہے:

"اے سانپو! اے افاعی کی اولاد! تم کیسے جہنم کے عذاب سے بچ سکتے ہو، اس لیے کہ میں تمھارے پاس اپنے انبیاء، حکما، اور کتب ارسال کرتا ہوں، ان میں سے بعض کو تم قتل کرتے ہو، بعض کو پھانسی دیتے ہو، بعض کو محفل میں کوڑے لگاتے ہو، اور ایک شہر سے دوسرے شہر پھراتے ہو، تاکہ تم پر ہر طاہر خون جو زمین پر بہایا گیا، ہابیل صدیق کے خون سے زکریا بن برخیا کے خون تک جس کو تم نے ہیکل اور مذبح کے درمیان قتل کیا تھا، آ جائے"۔ (انجیل متی ۲۳: ۳۳-۳۶) (لوقا ۱۱: ۴۷-۵۱)

انبیاء کا قتل ان کا مشغلہ بن گیا، اور ان کا شہر اورشلیم (بیت المقدس) انبیاء علیہم السلام کا مقتل بن گیا، اس لیے حضرت عیسیٰؑ نے اورشلیم کو یہ بد دعا دی۔

"اورشلیم اورشلیم انبیاء کے قاتل، رسولوں کو سنگسار کرنے والی کتنی دفعہ میں نے چاہا کہ تیری اولاد کو اس طرح جمع کر لوں جس طرح مرغی اپنے بچوں کو کرتی ہے اپنے پروں کے نیچے لیکن انھوں نے نہیں چاہا، لو یہ تمھارا گھر خراب ہونے جا رہا ہے"۔ (متی ۲۳: ۳۷-۳۸) (لوقا ۱۳: ۳۴-۳۵)

ان بد اعمالیوں کے بعد بھی بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے فرزند ہیں "نحن ابناء اللّٰہ و احباءہ" کیونکہ ہم ابراہیمؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ کی اولاد ہیں، اس لیے قرآن مجید نے اس کی تردید کی اور فرمایا:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا (آل عمران - ۶۷)	ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ حنیف و اطاعت گذار تھے۔

اور حضرت مسیح نے زیادہ صراحت کے ساتھ ارشاد فرمایا:

" بہت سے مشرق و مغرب سے آئیں گے اور ابراہیم و اسحٰق و یعقوب کے ساتھ ملکوت آسمانی میں بیٹھیں گے لیکن ملکوت کے بیٹے تو وہ خارجی ظلمت میں پھینک دیے جائیں گے اس وقت رونا ہوگا۔ اور انسان کی آواز۔ (متی ۸: ۱۱-۱۲)

ان کو جو فضیلت بخشی گئی تھی وہ عہد الٰہی کی حفاظت سے مشروط تھی، جب انھوں نے میثاق کو توڑ دیا تو ان پر لعنت کی گئی (مائدہ - ۱۳) اور ان سے وہ عہد چھین کر اس امت کے حوالے کر دیا گیا جو اس پر قیامت تک چلتی اور انسانیت کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ — تم بہترین امت ہو نکالی گئی ہو لوگوں کے لئے
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ (آل عمران) — ان کو اچھائی کا حکم دو

اس کی خبر حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو بہت پہلے دیدی تھی۔

" کیا تم نے کتابوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ وہ پتھر جس کو عمارت بنانے والوں نے رفض کر دیا تھا وہ زاویے کا سر ہو گیا۔ رب کی طرف سے یہ ہوا لیکن ہماری نگاہوں میں یہ عجیب بات ہے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ ملکوت الٰہی تم سے چھین لیا جائے گا، اور ایسی امت کو دیا جائے گا جو اس کے مطابق کام کرے۔" (متی ۲۱: ۴۲-۴۳)

انھوں نے مسیحؑ سے حجت کے انداز میں یہ کہا کہ ہم تو ابراہیمؑ کی اولاد ہیں، ہماری توہین کیسے کی جائے گی۔ حضرت مسیحؑ نے کہا

" اگر تم ابراہیم کی اولاد ہوتے تو ابراہیم جیسے عمل کرتے (یوحنا ۸: ۳۹)

قرآن مجید کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی اس درخواست پر کہ "ومن ذریتی" فرمایا تھا۔ کہ ان میں سے جو ظالم ہوں گے وہ میرا عہد نہیں پا سکتے (بقرہ ۱۲۴) کیونکہ ظلم کا تعلق شیطان سے ہے اور شیطان کی خطا معاف نہیں ہو سکتی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے

صاف صاف فرما دیا کہ

"تم ایک باپ سے جو ابلیس ہے، اور اپنے باپ کی شہوات کو پورا کرنا چاہتے ہو، وہ شروع سے قاتل تھا لوگوں کا، اور حق پر جم نہ سکا تھا، کیونکہ اس کے پاس حق نہیں۔" (یوحنا ۸ : ۴۴)

اللہ تعالیٰ نے قبول حق کے لیے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی	اللہ نے مہر لگا دی ان کے دلوں
سَمْعِھِمْ وَعَلٰی اَبْصَارِھِمْ	اور کانوں پر اور نگاہوں پر پردہ
غِشَاوَۃٌ (بقرۃ - ۷)	ڈال دیا تھا۔

اور نبی اشعیا کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی

"سنیں گے سننا اور سمجھیں گے نہیں، اور دیکھیں گے دیکھنا اور دیکھیں گے نہیں کیونکہ اس قوم کا دل موٹا ہو چکا ہے، اور کان بھاری ہو چکے ہیں" (متی ۱۳ : ۱۳-۱۵)

تو اس لیے وہ اللہ کی رحمت سے دور ہوں گے۔ اور "یوم الدین" میں ظلمت خارجہ میں پھینک دیے جائیں گے۔" (متی ۸ - ۱۱)

اور اللہ ان سے کہے گا

میں نے تم کو کبھی نہیں جانا تھا، مجھ سے دور ہو جاؤ اے گناہ کے کرنے والو۔" (متی ۷: ۲۲)

اور وہ اپنی بد اعمالیوں کی سزا میں ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ قرار پائے اور ذلت ان کی قسمت میں لکھ دی گئی،

ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ	ان پر ڈال دی گئی ذلت و مسکنت
وَبَاؤُ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ذٰلِکَ	اور وہ اللہ کے غصہ کا شکار ہوئے

بِاَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِاٰيَاتِ اللّٰهِ	اس لیے کہ وہ اللہ کی نشانیوں کو جھٹلاتے
وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّيْنَ بِغَيْرِ حَقٍّ	اور انبیاء کو بغیر حق کے قتل کرتے تھے
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ	یہ اس لیے کہ وہ عاصی تھے، اور زیادتی
(بقرہ - ۶۱)	کرتے تھے

نبی ارمیا نے بنی اسرائیل کے حق میں دعا کرنا چاہی تو

"رب نے کہا کہ اس کے لیے بھلائی کی دعا نہ کر، کیونکہ جس وقت یہ چلاتے ہیں تو میں ان کی آواز نہیں سنتا، اور جس وقت قربانی کرتے ہیں تو میں ان کی قربانی قبول نہیں کرتا، بلکہ تلوار، بھوک اور وبا سے میں ان کو فنا کردونگا"۔ (ارمیاہ ۱۴: ۱۰-۱۳)

بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کے اتنے قصے قرآن اور بائیبل میں موجود ہیں کہ اگر ان کو جمع کیا جائے تو پوری ایک کتاب بن جائے،

کتب مقدسہ کے اس سرسری مطالعہ سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہود کیا ہیں؟ اور تاریخ میں ان کا اخلاق اور کردار کیا رہا ہے،؟

(باقی)

ارض القرآن

(حصہ اول)

عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد و ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے تائید و تصدیق ثابت ہو جاتی ہے،

ضخامت ۳۱۵ صفحے، قیمت للعہ/ "منیجر"

مناقب الاصفیاء

از

یکے از خاکپائے فردوسیاں، بہار شریف، پٹنہ

مارچ ۱۹۶۵ء کے معارف میں مناقب الاصفیاء پر جناب سید شمیم احمد صاحب کا مضمون نظر سے گذرا، اس کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ مضمون مناقب الاصفیا کی تنقید ہے یا تنقیص یا تقریظ، یا مضمون نگار نے اپنے دل کے اندر کچھ چھپی ڈھکی باتوں کو تحقیق کے پردے میں ظاہر کرکے اپنے نفس کو مطمئن کر لیا ہے، معارف کے عام ناظرین اس کو ایک تحقیقی اور علمی مضمون سمجھے ہوں گے لیکن فردوسیہ سلسلہ کے معتقدین کو یہ مضمون بالکل پسند نہ آیا، اگر یہ مضمون معارف جیسے بلند رسالہ کے علاوہ کسی اور رسالہ میں شائع ہوتا تو اس کو نظر انداز کر دیا جاتا، لیکن معارف میں اس کی اشاعت سے ذیل کی سطریں قلم سے خود بخود نکل آئی ہیں،

مضمون پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ فردوسیہ سلسلہ کے مشائخ پر مستند اور قدیم تذکرہ مناقب الاصفیاء کے جو مصنف حضرت مخدوم شاہ شعیب فردوسی سمجھے جاتے ہیں، وہ دراصل اس کے مصنف نہیں ہیں، یہ ثابت کرکے مضمون نگار نے اپنے کو موجودہ دور کے ان محققین کی صف میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے جو یہ ظاہر کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ ملفوظاتِ خواجگانِ چشت میں انیس الارواح حضرت شیخ عثمان ہرونی، دلیل العارفین حضرت شیخ معین الدین چشتی، فوائد السالکین حضرت شیخ قطب الدین

[illegible] اسرار الاولیا حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ، افضل الفوائد حضرت شیخ نظام الدین
اولیاؒ، الخ کے ملفوظات نہیں ہیں، بلکہ یہ سب کے سب جعلی اور فرضی ہیں، اور کچھ ایسے محققین بھی
ہیں جو شیخ فرید الدین عطارؒ کی تذکرۃ الاولیاء کو ان کی تصنیف ماننے کے لیے تیار نہیں،
محققین کے اسی قبیلہ میں زیر نظر مضمون نگار کا بھی اضافہ ہوا ہے، جنھوں نے مناقب الاصفیاء
کو محض اپنے قیاسات کی بنا پر حضرت مخدوم شاہ شعیب فردوسیؒ کی تصنیف تسلیم کرنے
سے انکار کیا ہے، اگر تحقیق کے پردے میں اسی قسم کی قیاس آرائیوں کی مہم جاری رہی
تو پھر ہمارے اسلاف کی ساری کمائی ان ہی محققین کی غارتگری کے نذر ہو جائے گی

اگر مضمون نگار نے پوری وضاحت کے ساتھ ثابت کر دیا ہوتا کہ مناقب الاصفیا،
حضرت مخدوم شاہ شعیب فردوسیؒ کی نہیں ہے، اور ان کے بجائے اصل مصنف کا نام لکھ دیتے
تو اس کو تسلیم کرنے میں نہ صرف معارف کے ناظرین بلکہ فردوسیہ سلسلہ کے معتقدین کو بھی تامل
نہ ہوتا لیکن وہ لکھتے ہیں کہ

"بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ یہ کتاب مخدوم شاہ شعیبؒ کی تالیف ہے۔"

دیانتداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ "بعض لوگوں" کو لکھتے وقت ان کے نام بھی لکھ دیے جاتے،
یا جس طرح مضمون نگار نے اپنے مضمون کے حاشیہ میں جابجا حوالے دیکر اس کو بظاہر موقر بنانے
کی کوشش کی ہے، اسی طرح ان لوگوں یا ان ماخذوں کا بھی حوالہ دینا لازمی تھا، جہاں سے اس شبہ کی
سراغ رسانی کی ہے لیکن "بعض لوگوں کو شبہ ہے" لکھ کر کتاب اور کتاب کے مصنف سے سوء ظن
پیدا کرنا علمی تحقیق کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے، مضمون نگار نے اپنی غلط تحقیق کو موثر بنانے کیلئے لکھا ہے:

"بعض وجوہ سے اس شبہ کو تقویت ملتی ہے، مؤلف نے کہیں اپنا نام نہیں لکھا ہے، علاوہ
کسی [illegible] تصنیف سے کوئی ثبوت ملتا ہے، مخدوم الملک کے خلفاء کی حالات نہایت مختصر

اور غیر واضح ہیں، مناقب الاصفیاء سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف کو مخدوم الملکؒ سے فیض اٹھانے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا، اور یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب شیخ حسن بلخی کی لطیف المعانی مرتب ہو چکی تھی، جو مخدوم شعیب متوفی ۸۰۰ھ کے بعد کی کتاب ہے، مناقب الاصفیاء سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت حسین بلخی کے کسی مرید کی تالیف ہے...... اگر مخدوم شعیب کی تالیف ہوتی تو شیخ حسین بلخی کے بجائے مخدوم الملکؒ کو بنیاد بنا کر تمام بزرگوں کا ذکر کیا جاتا کیونکہ حضرت شعیبؒ.... مخدوم الملکؒ کے بھائی اور ہم عصر ہونے کے علاوہ مرید بھی تھے،

اگر مناقب الاصفیا واقعی مخدوم شعیبؒ کی تالیف ہے تو وصال کا سال ۸۰۰ھ غلط معلوم ہوتا ہے، اور یہ روایت محض افسانہ معلوم ہوتی ہے کہ مخدوم الملکؒ نے مولانا مظفر بلخی کو وصیت کی تھی کہ برادرم شعیب کو میرا عمامہ و خرقہ بھجوا دینا۔ اس کے بجائے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مخدوم شعیبؒ کو ارادت شیخ بلخی سے اور خلافت و اجازت شیخ حسن بلخی سے حاصل تھی"

اس اقتباس کا ہر ٹکڑا گمراہ کن ہے جس سے محققانہ انداز کے بجائے بھٹکے ہوئے ذہن کی غمازی ہوتی ہے، پہلا اعتراض یہ ہے کہ

"مؤلف نے کہیں اپنا نام نہیں لکھا ہے"

بزرگان دین کتابیں آج کل کے مصنفوں کی طرح نام و نمود کیلئے نہیں لکھا کرتے تھے مشائخ کرام تو اپنی ذات پر گمنامی اور اخفا، کا پردہ ڈالنے ہی میں اپنی اخروی نجات سمجھتے تھے، اس لیے مناقب الاصفیا کے مصنف نے اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کیا تو کوئی تعجب کی بات نہیں، اور یہ دلیل کہ اس میں حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کا اسم گرامی نہیں، اس لیے یہ ان کی تصنیف نہیں، اسی وقت مؤثر ہو سکتی ہے جب اس میں ان کے بجائے کسی اور کا نام ہوتا، اور پھر ارباب نظر کا تو یہ دعویٰ ہے کہ اس کے دیباچہ میں حضرت شعیبؒ کی تصنیف ہونے کا ثبوت موجود ہے، مطبوعہ نسخہ کے ص ۲ پر ہے:

"ایں بیچارہ ہلاک وادی من تشنعیت بہ الہموم بسعادت جمعیت ذکر ایشاں راہ یابد"

"تشنعبت" سے حضرت شعیب کے نام کا اشارہ بھی ہے اور فردوسی سلسلہ کی گمنامی، اخفاء استتار کی روش اور مشرب حزن کی روایت کی پابندی بھی ہے، اس کی وضاحت مناقب شعیبؒ بھی کردی گئی ہے جس کا حوالہ مضمون نگار نے جابجا دیا ہے لیکن مناقب شعیبؒ میں جہاں مناقب الاصفیا کے مصنف کے نام کی وضاحت کی گئی ہے وہاں مضمون نگار کی نظر نہیں گئی، اور اگر گئی تو اس کو اپنے مطلب کے خلاف بات تصور کیا۔ اس لیے معارف کے ناظرین کو غلط فہمی میں ڈالنے کی خاطر نظر انداز کر دیا، مناقب شعیبؒ میں حضرت شاہ رکن الدین کی ڈائری کا حسب ذیل اقتباس درج ہے :

"حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے مناقب الاصفیا کے نام کے متعلق استفسار تھا کہ کیونکر یہ سمجھا جائے کہ مناقب الاصفیا حضرت مخدوم شعیبؒ کی تصنیف ہے، آپ نے فرمایا کہ اگر غور سے دیکھو گے تو معلوم ہو جائے گا، مقدمۂ کتاب کی عبارت سے نام ظاہر ہے، چنانچہ میں کتاب مناقب الاصفیا لایا اور آپ نے یہ عبارت پڑھی

ایں بیچارہ ہلاک وادی من تشنعبت بہ الہموم بسعادت جمعیت ذکر ایشاں راہ یابد "

فرمایا اس عبارت میں صیغۂ "تشنعبت" سے شعیب نام کا اشارہ ظاہر ہے، نیز گمنامی حزن جو خاص روش مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، وہ بھی ظاہر کی گئی ہے، ہموم ہم کی جمع ہے، یعنی حزن، اس عبارت کا مطلب یہ ہوکہ یہ بیچارہ نام کے اظہار کی پیچیدگی میں حزن کی وادی میں ہلاک ہے، اتنا بھی جو اظہار نام کا خیال ہوا، یہ بھی مشائخ کی روش سے دوری ہے، اس پیچ کی بات ہے لیکن انھیں مشائخ کرام کے ذکر کی سعادت سے راہ پا جانے کا امیدوار ہے۔"

مضمون نگار کو اس وضاحت سے تسلی نہیں ہو سکتی ہے تو پھر اور دلائل پیش کرنا بیکار ہے، اور ابتک تمام ارباب نظر دیباچہ کے اسی تحریر کو سامنے رکھ کر مناقب الاصفیاء کو حضرت شعیبؒ ہی کی تصنیف سمجھتے رہے ہیں، اسی لیے اس کے مطبوعہ نسخہ کے ٹائٹیل پر مصنفہ حضرت مخدوم شاہ شعیب فردوسی قدس سرہٗ لکھا ہوا ہے، فردوسیہ سلسلہ کے تمام بزرگوں کو گذشتہ صدیوں میں بھی یقین کامل رہا کہ یہ حضرت مخدوم شعیبؒ کی تصنیف ہے، عوام الناس میں اس کی شہرت اس کی طباعت کے بعد ہی ہوئی، فردوسیہ سلسلہ کے معتقدوں کے یہاں اس کے قدیم نسخے موجود ہیں اور وہ اس کو حضرت شعیبؒ ہی کی تصنیف سمجھکر حرز جان بنائے ہوئے ہیں، ہندوستان کے مشہور لکھنے والوں میں ابتک سیرۃ الشرف، وسیلۃ الشرف، بزم صوفیہ، تاریخ دعوت وعزیمت کے مصنفین مناقب الاصفیاء کو حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ ہی کی تصنیف سمجھ کر اپنی اپنی قابل قدر تصانیف میں اس کے حوالے دیتے رہے، اور ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ گئی کہ یہ حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کی تصنیف نہیں ہے، موجودہ دور میں تحقیق کا ایک رنگ یہ بھی ہے کہ ایک مصنف یا مقالہ نگار دعویٰ کرتا ہے کہ یہ اس کی کتاب یا اس کا مضمون ہے، لیکن بعض محققین اس کی زندگی ہی میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اس کی کتاب یا اس کا مضمون نہیں ہو سکتا، مثلاً مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا کہ الہلال میں بعض مضامین ان کے ہیں لیکن بعض محققوں نے یہ ثابت کرنے میں آسمان وزمین کے قلابے ملادیے کہ یہ ان کے نہیں ہیں،

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بو العجبی ست

معترض کو حضرت شعیبؒ کے مصنف ہونے میں شبہہ اس لیے بھی ہے کہ

"نہ کسی پرانی تصنیف سے ثبوت ملتا ہے"

ی پرانی تصنیف سے ثبوت نہ ملنا حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کے مصنف نہ ہونے کی
ہو سکتی ہے، یہ اسی وقت صحیح ہو سکتی ہے جبکہ مناقب الاصفیا کے فوراً ہی بعد فردوسیہ
بزرگوں پر کوئی کتاب لکھی گئی ہوتی، تین چار سو سال پہلے کوئی ایسی تصنیف نہیں ہوئی
موجودہ دور میں جس کسی نے فردوسیہ سلسلہ کے بزرگوں کے حالات لکھے، اس نے مناقب الاصفیا
حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ ہی کی تصنیف سمجھکر دیا،

ربے مقالہ نگار کو مناقب الاصفیا کو حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کی تصنیف سمجھنے میں اسلیے
ہے کہ اس میں

"مخدوم الملک کے خاندانی حالات نہایت مختصر اور غیر واضح ہیں"

اعتراض محض طفلانہ ہے، کیونکہ اس کتاب میں تمام تفصیلات کا لکھنا پیش نظر ہی نہ تھا،
ر کو جن ظاہری احوال کی تلاش ہے، اس سے کہیں زیادہ حضرت مصنف کی نظر میں
ب کی اہمیت تھی جو قلمبند کی گئی ہے، احوالِ زندگی کے اختصار کے متعلق کتاب کے مقدمہ میں
ہے کہ خداوند قدوس کے ان محبوب صدیقوں نے اپنے رب کی محبت کا معاملہ پردۂ توحید
ہے، اور غیرت الٰہی کا منشا یہ ہے کہ یہ نازنینانِ توحید اپنے خلوت کدۂ راز و نیاز سے
ہونے پائیں تاکہ اغیار کی نظر نحوست اثر ان کے سامنے نہ آئے، مقدمہ کی اصل عبارت یہ ہے

"چہ آں صدیقان خداوند تعالیٰ را در قبۂ خلوت و پردۂ وحدت پوشیدہ و سلطان
غیرت الٰہی ان نازنینان حضرت را در سراپردہ تواری پنہاں داشتہ تا از نظر اغیار
مستور مانند" (ص ۳)

پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ ہر ایک بزرگ کا ذکر اور ان کے شجرۂ طیبہ کا تذکرہ طوالت سے
، اگر تفصیل کے ساتھ لکھا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے۔

"ذکر ہر یک بزرگوار و اسناد جملہ بریں شجرہ طیبہ اطالتے وارد کہ بہ شرح مجلد گردد" (ص)

اس معذرت کے بعد مضمون نگار کا یہ ظاہر کرنا کہ حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ اس کے مصنف ہوتے تو حضرت مخدوم الملکؒ کے خاندان کے حالات غیر واضح نہ ہوتے، محض ناظرین کو اپنی فریب دہی سے بدظن کرنا ہے، اس کے علاوہ حضرت مخدوم جہاںؒ کے حالات زندگی میں جو ایجاز و اختصار ہے وہ دوسرے کے اطناب و تفصیل پر حاوی ہے، اگر بدگمانی کی عینک اتار کر اس کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں وہ سب کچھ ہے جو ہونا چاہیے، البتہ موجودہ مقالہ نگار کی طرح خواہ مخواہ کی طوالت نہیں ہے،

معترض کا بیان ہے کہ

"مناقب الاصفیا سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف کو مخدوم الملک سے فیض اٹھانے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا"

معلوم نہیں مضمون نگار مناقب الاصفیا کی کس عبارت سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں؟ شاید یہ لکھکر مضمون نگار نے اپنے ناظرین کو مغالطہ میں ڈالدینے کی کوشش کی ہے، اور وہ اس طرح کہ چونکہ مناقب اصفیا کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف کو مخدوم الملکؒ سے فیض اٹھانے کا کبھی موقع نہیں ملا، اس لیے مولف حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ نہیں ہو سکتے ہیں، جو حضرت مخدوم الملکؒ کے رشتہ دار اور ہمعصر ہونے کے علاوہ مرید بھی تھے، اور اگر حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ اسکے مؤلف ہیں تو ان کو حضرت مخدوم الملکؒ سے فیض اٹھانے کا موقع نہیں ملا، یہ دلیل مغالطہ آمیز ہے، حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ حضرت مخدوم الملکؒ سے فیض برابر اٹھاتے رہے، کیونکہ خود مضمون نگار کو تسلیم ہے کہ وہ حضرت مخدوم الملکؒ کے رشتہ دار، ہم عصر اور مرید تھے، مولانا آمون حضرت مخدوم الملکؒ کے پرانے باعظمت خلیفہ تھے، ان کا ذکر حضرت مخدوم الملکؒ کے ملفوظات میں بکثرت آتا ہے، مولانا کے ملفوظات رسالہ تحقیقات المعانی میں (جس کا ملفوظ مبارک بھی نام ہے) ہے

"اکثر اوقات گذرد و اتفاق تشریف آوری قدوۃ الواصلین زبدۃ العارفین حضرت مخدوم جہاں دام شرفہ' بدیدار محرم اسرار غیب مخدوم شاہ شعیب و بندگی شاہ اسحاق مغربی بدین نواحی می افتاد (ملفوظ مبارک مولانا آمون مجلس دوم)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مخدوم الملکؒ کی ملاقاتیں حضرت شیخ شعیبؒ سے برابر ہوتی رہی، اور پھر جتنی تفصیلات حضرت مخدوم الملکؒ سے متعلق مناقب الاصفیا میں درج ہیں، وہ کسی اور تذکرہ میں نہیں، اور بعد میں ان ہی تفصیلات سے حضرت مخدوم الملکؒ کے حالات زندگی مرتب ہوتے رہے، اور ان حالات کے بین السطور میں جو والہانہ کیفیات ہیں، ان کو اہل نظر ہی سمجھ سکتے ہیں۔

ان کیفیات کو مضمون نگار نے محسوس نہیں کیا، اسی لیے وہ لکھ گئے ہیں کہ مناقب الاصفیا سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف کو حضرت مخدوم الملکؒ سے فیض اٹھانے کا موقع نہیں ملا، ان کو یہ پتہ اس وقت چلتا جب حضرت مخدوم شاہ شعیب حضرت مخدوم الملک سے اپنی ذاتی وابستگی اور قلبی شیفتگی کا اظہار جابجا کھلے الفاظ میں کرتے، یہ نہیں کیا تو یہ ان کی خاکسارانہ عظمت کی دلیل ہے، جس کی قدر نہ کرکے مضمون نگار نے دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے،

معترض کا کہنا ہے

"یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب شیخ حسن بلخی کی لطیف المعانی مرتب ہو چکی جو مخدوم شعیب متوفی سنہ ۸۲۴ھ کے بعد کی کتاب ہے"

معترض کے سامنے مناقب شعیبؒ بھی جس کا حوالہ انھوں نے اپنے مضمون میں دیا ہے، پھر تعجب ہے کہ انھوں نے حضرت مخدوم شعیبؒ کا سنہ وصال سنہ ۸۲۴ھ کیسے لکھ دیا ہے، حضرت مخدوم شعیبؒ کے مزار مبارک کے سنگی کتبہ پر لکھا ہوا ہے۔

"وصال محرم اسرار غیب مخدوم شاہ شعیب قدس سرہ ۸۲۴ھ"

پھر مناقب شعیب میں ہے

مادہ سنہ وصال محرم حق شعیب ولی ۸۲۴ھ

مادہ سنہ وصال جس میں پانچ (۵) کا تخرجہ ہے

قلب مہر از جہاں بجنت شد رحمۃ اللہ علیہ

(شاہ شعیب — سنہ ایشاں ۸۲۴ھ — وفات ۸۲۴ھ)

معترض کا یہ لکھنا کہ مناقب الاصفیا اس وقت لکھی گئی جب شیخ حسن بلخی کی لطیف المعانی مرتب ہو چکی تھی، معلوم نہیں یہ اعتراض ہے یا ایک امر واقعہ کا اظہار ہے، حضرت شیخ حسن کے صاحبزادے مخدوم احمد لنگر دریا بلخی اپنے ملفوظات مونس القلوب کی اڑتالیسویں مجلس میں اپنی پیدائش کا سال ۸۲۶ھ لکھا ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کے آخری زمانہ میں حضرت شیخ حسن پورے بالغ اور صاحب اولاد ہو چکے تھے، اس لیے صاحب تصنیف ہونے اور لطیف المعانی کے تصنیف کرنے میں کیا قباحت پیدا ہوتی ہے، اور پھر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ چونکہ لطیف المعانی کے بعد مناقب الاصفیا لکھی گئی اس لیے حضرت شیخ شعیبؒ اس کے مصنف نہیں ہو سکتے ہیں

مضمون نگار کا دعویٰ ہے کہ

"مناقب الاصفیا سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت حسین بلخی کے کسی مرید کی تالیف ہے"

مضمون نگار کا یہ بھی بیان ہے کہ

"مخدوم شعیب کو ارادت شیخ حسین بلخی سے اور خلافت و اجازت شیخ حسن بلخی سے حاصل تھی"

اس طرح اگر کتاب کے آغاز میں حسب ذیل عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت شیخ حسین بلخی کے کسی مرید کی تالیف ہے تو پھر حضرت شیخ مخدوم شاہ شعیبؒ اس کتاب کے مصنف ہونے

کی سعادت سے کیسے محروم کیے جا سکتے ہیں، جب کہ وہ حضرت حسین بلخیؒ کے مرید تسلیم کر لیے جاتے ہیں،

"امابعد چوں شجرہ پیران بندگی مخدوم شیخ الاسلام والمسلمین ہدالحق والحقیقت والدین شیخ حسین معز شمس بلخی متع اللہ المومنین بطول بقائہ وادام علیہم نعمۃ بقایہ کرسبب دلیل ہدایت مرید انست ...."

اس عبارت سے جو یہ ظاہر ہے کہ یہ کتاب حضرت شیخ حسین کے مرید نے لکھی، اس کو تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں، لیکن اس سے حضرت شعیب مرید شیخ حسین کے مصنف ہونے میں کہاں سے تنقیص پیدا ہوتا ہے،

مضمون نگار لکھتے ہیں :

"اگر مخدوم شعیب کی تالیف ہوتی تو شیخ حسین بلخی کے بجائے مخدوم الملک کو بنیاد بنا کر تمام بزرگوں کا ذکر کیا جاتا، کیونکہ حضرت شعیب مخدوم الملک کے بھائی اور ہمعصر ہونے کے علاوہ مرید بھی تھے۔"

معلوم نہیں مضمون نگار نے یہ بات کیسے لکھدی، اس میں حضرت شیخ حسین کے مناقب تو لکھے بھی نہیں گئے، ان کو بنیاد بنانا کیا معنی ؟ اور خود مؤلف کا بیان ہے کہ اس کتاب کا آغاز حضرت شرف الدین قدس سرہٗ اور شیخ مظفرؒ کے بیان سے ہونا چاہئے تھا، مگر ذکر رسالت کا ادب مانع ہوا، اس لیے ان بزرگوں کے تذکرہ میں پہل کرنے کی جرأت نہ ہو سکی وہ یہ بھی لکھتے ہیں، پیغمبر علیہ السلام کے ظاہری احوال میں بزرگوں نے بہت کچھ لکھا ہے ان کے نقل و ترجمہ سے نجات کا وسیلہ ہے، اس لیے پہلے حضرت رسول اللہ، پھر اہل بیت، پھر مشائخ کا بیان ہوگا، تاکہ ان خیرالوسائل کی پناہ میں تمام بزرگوں کے تذکرے آسان ہو جائیں اور ذکر پاک حضرت مخدوم مرحوم اور شیخ جاب (یعنی حضرت مظفر) کا ذکر پاک بھی ان اذکار کے واسطے منظور ہوا ہے، فارسی کی اصل عبارت یہ ہے :

"مولف بیچارہ را باتباع سخن این شجرہ مبارکہ بذکر مرحوم شیخ مظفر و شیخ جہاں شرف الحق والدین قدس اللہ سرہ ہم بدایت می بایست کرد، اما تحریر مناقب و آثار ایشان اول جرأت نمودن نتوانست و زہرہ نداشت کہ ابتدا بذکر، احوال پاک ایشان سخن تواند پرداخت، و در احوال ظاہر پیغمبر علیہ السلام بزرگان سخن بسیار گفتہ کتابہا ساختہ بودند نقل و ترجمہ آنرا وسیلہ ساختہ بذکر مصطفیٰ و اہل بیت و مناقب سلف مشائخ بدایت کردہ تا در پناہ این خیر الوسائل جملہ از کار آسان شود و ذکر پاک مخدوم مرحوم و شیخ جہاں ہم بر سخن از کار ایشان منظور گردد۔"

مضمون نگار لکھتے ہیں:

"یہ روایت محض افسانہ معلوم ہوتی ہے کہ مخدوم الملک نے مولانا مظفر بلخی کو وصیت کی تھی کہ برادرم شعیب کو میرا عمامہ و خرقہ بھجوا دینا، اس کے بجائے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مخدوم شعیب کو ارادت شیخ حسین بلخی سے اور خلافت و اجازت شیخ حسن بلخی سے حاصل تھی۔"

مضمون نگار یہ تسلیم کرانا چاہتے ہیں کہ حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کو ارادت شیخ حسین بلخیؒ سے تھی، گویا وہ کسی اور کے مرید نہ تھے، لیکن وہ خود لکھتے ہیں کہ حضرت شعیبؒ مخدوم الملکؒ کے بھائی اور ہم عصر ہونے کے علاوہ مرید بھی تھے۔ ان کی تحریر میں جو ژولیدگی ہے، اس سے وہ خود شاید بے خبر ہیں، یہ تسلیم کرانے کی ضرورت نہیں کہ حضرت مخدوم شاہ شعیب صرف شیخ حسین بلخی کے مرید تھے، وہ حضرت مخدوم الملک اور حضرت شیخ حسین بلخی دونوں کے مرید تھے، اور پھر خلافت و اجازت شیخ حسن سے بھی ملی، ایک شیخ کو مختلف واسطوں سے ارادت کا حاصل ہونا اور سند خلافت کا ملنا کوئی انوکھی بات نہیں، یہ طریقہ ہمیشہ سے رائج رہا ہے جو مناقب الاصفیاء کے دیباچہ سے بھی ظاہر ہے:

"بدانکہ سند صحبت و خرقہ مشائخ رضوان اللہ علیہم طرق بسیار در بسیار پیوستہ و اسناد و شجرہائے مشائخ کرام بمناہج مختلفہ بہ حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم می رسد۔" (ص ۴)

اس وضاحت کے بعد یہ لکھنا کہ مناقب الاصفیا اگر حضرت مخدوم شاہ شعیب کی تالیف ہوتی تو شیخ حسین بلخی کے بجائے مخدوم الملکؒ کو بنیاد بنا کر تمام بزرگوں کا ذکر کیا جاتا، کہاں تک صحیح ہے، خود ناظرین فیصلہ کریں، مضمون نگار نے اس کتاب کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا تو ان کو پتہ چلتا کہ اس میں حضرت مخدوم الملکؒ کے حالات ۱۲ صفحے میں درج ہیں، اتنے صفحے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے بعد کسی اور بزرگ کے مناقب میں نہیں لکھے گئے ہے، یہ گویا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت مخدوم الملکؒ ہی کو بنیاد بنا کر تمام بزرگوں کا ذکر کیا گیا حضرت مخدوم الملکؒ کے بعد حضرت شاہ مظفر شمس بلخی کے حالات ہیں، جن کو قلمبند کرنے کے بعد کتاب ختم کر دی گئی ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کتاب لکھنے کا مقصد فردوسی سلسلہ کے بزرگوں کے حالات پیش کرنا تھا، اس میں مخدوم حسین نوشہ توحید اور مخدوم حسن کے حالات نہیں ہیں، حالانکہ حضرت مخدوم شاہ شعیب کو ارادت مخدوم حسین سے تھی اور خلافت مخدوم حسن سے ملی تھی، ان دونوں بزرگوں کے حالات نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مؤلف نے جب یہ کتاب لکھی تو دونوں بزرگ بقید حیات تھے، اس لیے ان کے بزرگوں کے حالات لکھنے ہی پر مؤلف نے اکتفا کیا، اور خود مضمون نگار نے تسلیم کیا ہے کہ مناقب الاصفیا فردوسیہ سلسلہ کے بزرگ خصوصاً مخدوم الملک اور مولانا مظفر بلخی کے حالات میں ایک مستند و قدیم ترین تذکرہ ہے، اس کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ یہ کتاب مخدوم الملکؒ کو بنیاد بنا کر نہیں لکھی گئی،

اسی طرح حضرت مخدوم شاہ شعیب کو مخدوم الملکؒ کا عمامہ و خرقہ بھجوانے کی روایت کو محض افسانہ سمجھنا بھی ایک عجیب بات ہے، اگر اس روایت کی تردید موثر دلائل سے کی جاتی تو اور بات تھی، مگر اس کو محض ایک جنبش قلم سے افسانہ قرار دیکر لوگوں کو

اس کو تسلیم نہ کرنے پر آمادہ کرنا تحقیقی جیرہ دستی ہے، اگر یہ روایت محض افسانہ ہے تو ہندوستان
کے تمام صوفیۂ کرام کے حالات میں اس قسم کی جو روایتیں ملیں گی وہ بھی مضمون نگار کی نظر میں افسانے
ہوں گے، اور پھر ان روایتوں کو افسانہ سمجھنے والوں کو کوئی حق نہیں ہے کہ ان بزرگوں کے
حالات کا مطالعہ کریں، ان کو پہلے ادب شناس ہونا چاہیے، تب وہ کوئی تحریری گلفشانی
کرکے علم و ادب کی خدمت کی جرأت کریں، مذکورۂ بالا روایت حضرت مخدوم شعیب کے
حالات زندگی کا ایک ضروری جزو ہے جس کو حضرت مخدوم شاہ شعیب کے تمام معتقدین
صحیح سمجھتے ہیں، اور تذکرہ نویس بھی اس کو بیان کرتے رہے ہیں، مثلاً حضرت جلال الدین شطاری
نے ۱۲۷۹ھ میں تذکرہ شعیب لکھی تو اس میں اس روایت کی پوری تفصیل لکھی ہے جس کا
ایک ٹکڑا ہدیۂ ناظرین ہے، مخدوم حسین نے حضرت مخدوم الملکؒ کے تبرکات کو اپنے صاحبزادے
مخدوم حسن کے حوالہ کیا، اور کہا کہ تم مخدوم شعیبؒ کے پاس پہنچا آؤ، اس ٹکڑے کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو،

"مجھے اس وقت معذوری ہے، میں نہیں جا سکتا، آپ جائیں اور حضرت مخدوم شیخ شعیب
کی امانت ان تک پہنچا آئیں، اس بنا پر یہ غریب حضرت کی زیارت کا احرام باندھ کر روانہ ہوا،
یہ بہت بہتر ہوا کہ حضرت یہاں تشریف لے آئے ہیں، چنانچہ خرقہ، عمامہ، پٹی اور قینچی کو
حضرت مخدوم شیخ شعیب کی خدمت میں پیش کیا، حضرت مخدوم شیخ شعیب بصد ادب و
تعظیم و اعتقاد سروقد کھڑے ہوگئے، ان کو سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا اور چند بار بوسہ دیا،
اپنی مخصوص کسر نفسی کی بنا پر بے انتہا عذر خواہی کی اس بندہ کی کیا قدرت و لیاقت ہو کہ
وہ اپنے پیر شرف العالمین کا خرقہ پہنے لیکن جب آقا کا حکم اور نوازش یہی ہے تو کیا مجال
کہ عذر کرے لیکن جس طرح حضرت مخدوم جہاں نے باطناً اس حقیر کو ارادت، خلافت
اور اجازت سے مشرف فرمایا ہے، حضرت بھی ظاہراً اس خرقہ و دستار کو بطریق خلافت

اجازت اپنی جانب سے عنایت فرمائیں، حضرت مخدوم شیخ حسن حضرت مخدوم شعیب سے حضرت مخدوم جہاں کے بھائی ہونے کی وجہ سے بڑا اعتقاد رکھتے تھے، اس لیے تواضع اور اعتقاد کی بنا پر معذرت کرکے کہا کہ آپ پیر دستگیر حضرت مخدوم شرف العالمین کی جگہ پر ہیں، میری کیا قدرت ہے کہ آپ کے سامنے خلافت پیش کروں، حضرت مخدوم شعیب نے فرمایا کہ جو کچھ آپ فرماتے ہیں میری کیا مجال کہ میں بھی کہوں کہ ایسا ہی ہے، آپ خلافت و اجازت تربیت اور وصیت کے مطابق حضرت مخدوم جہاں کی جگہ پر ہیں، اگر اپنی طرف سے مجھے خلافت و اجازت عطا فرمائیں تو میں حضرت مخدوم شرف العالمین کے خرقہ معظمہ سے مشرف ہوں، جب شیخ الاسلام شیخ حسن نے حضرت مخدوم شیخ شعیب کا اصرار بہت دیکھا تو الرضا فوق الادب (تعمیل حکم ادب پر مقدم ہے) کہتے ہوئے اپنی خلافت و اجازت سے مشرف فرمایا، پھر یہیں سے حضرت شیخ حسن بہار کی جانب روانہ ہوئے اور حضرت مخدوم شعیب شیخپورہ کی طرف تشریف لے گئے، اس طور پر یہ تین واسطے حضرت مخدوم جہاں پناہ تک پہنچے ہیں"۔

اس روایت میں کون ایسی افسانویت ہے جس کو قبول کرنے سے انکار ہے، تمام سلاسل کے بزرگوں کے حالات زندگی میں ایسی روایتیں بھری پڑی ہیں جن کو رد کرنا اپنی طبیعت کا خاص رنگ ظاہر کرنا ہے، اسی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ شعیب کو شیخ حسن سے خلافت و اجازت ملی جس کو مضمون نگار نے بھی تسلیم کیا ہے، اگر مذکورہ بالا روایت رد کردی جاتی ہے تو شیخ حسن سے خلافت و اجازت کے ملنے کا ماخذ ختم ہوجاتا ہے، اور کسی حال میں بھی کہنا صحیح نہیں کہ یہ خلافت و اجازت نہیں ملی،

ایک جگہ مناقب الاصفیا پر اعتراض کرتے ہوئے مضمون نگار لکھتے ہیں

"مناقب الاصفیا میں سید السادات ظہیر کو مرحوم لکھا ہے حضرت سید ظہیر کے نام مولانا مظفر بلخی کے خطوط ملتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نویں صدی ہجری میں مرتب کی گئی"۔

مضمون نگار نے یہ بات عدم واقفیت کی بنا پر لکھی ہے، مولانا مظفر بلخی کے خطوط سید السادات ظہیر کے بجائے مولانا ظہیر الدین کے نام ہیں۔ مونس القلوب (ملفوظ مخدوم احمد لنگر دریا بلخیؒ) کی مجلس سوم میں سید ظہیر الدین کا ذکر پہلے تو اس طرح آیا ہے

"ہم در اثنائے این ذکر سید ظہیر الدین کہ مشرف بوقت اندافتاد"

پھر مجلس پنجاہ و دوم میں ہے

"حاضرے عرض داشت خدمت امیر سید ظہیر الدین کہ بود؟ فرمود ہم چنیں شنیدہ شدہ است، ابو مسلمہ نام مردے از مریدان بندگی شیخ تقی الدین رحمۃ اللہ علیہ بندگی امیر را ارادت بر دبود (الی آخرہ)

اس سے ظاہر ہے کہ امیر سید ظہیر الدین کوئی اور بزرگ ہیں، جن کا ذکر مناقب الاصفیا میں ہے، مولانا مظفر بلخیؒ کا مکتوب اول اور مکتوب ۶۹ مولانا ظہیر الدین کے نام ہیں، جو امیر سید ظہیر الدین سے مختلف ہیں، اس وضاحت کے بعد مضمون نگار کو اپنی رائے بدلنی ہوگی، اور جب حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ کے وصال کی تاریخ ۸۲۴ھ ہے تو پھر یہ لکھ کر کوئی نکتہ پیدا کرنا فضول ہے، کہ یہ کتاب نویں صدی ہجری میں لکھی گئی۔

ان باتوں کے علاوہ مضمون نگار نے اپنے مضمون میں کچھ ایسی باتیں بھی لکھی ہیں جن کے لکھنے کا مقصد صاف نہیں، مثلاً، مناقب الاصفیا کے مطبوعہ اور قلمی نسخہ میں فرق صرف یہ دکھایا ہے کہ ایک قلمی نسخہ میں ہے کہ سنارگاؤں میں حضرت مخدوم الملکؒ کو ایک مرض ہوگیا تھا جس کے دفع کیلئے ایک جاریہ رکھی، لیکن مطبوعہ نسخوں میں ہے کہ اس مرض کے دفع کیلئے نکاح کیا، مضمون نگار کو قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں صرف یہی ایک فسق نظر آیا جسکو انھوں نے اپنی تحقیق سے ناظرین کے سامنے پیش کیا، بزرگان دین کے حالات لکھنے میں اگر کسر نفسی کے بجائے بدنفسی یا اخلاص کے بجائے بدنیتی ہو تو پھر اس راہ میں قدم رکھنا انتہائی سوء ادب ہے، اس طرح کی

چھپا ن بین کے بعد " نکاح کرد" ہی مستند سمجھا گیا، اسی لیے مناقب الاصفیا کے مطبوعہ نسخہ میں بھی یہ لکھا گیا، پھر اس کو تسلیم نہ کرکے فرق کو ظاہر کرنا محض چاند پر خاک ڈالنے کی سعی لاحاصل کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

مضمون نگار کو اعتراف ہے کہ مناقب الاصفیا، ایک مستند اور قدیم ترین تذکرہ ہے اور جہاں تک واقعات اور ان سے متعلق تاریخ و سال کا تعلق ہے، مؤلف نے احتیاط سے کام لینے کی کوشش کی ہے، لیکن وہ یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ

"مولف نے اپنے خانوادہ کے پیروں کے ساتھ مبالغہ کی حد تک عقیدت کا اظہار کیا ہے۔"

معلوم نہیں مضمون نگار کا مطلب مبالغہ سے کیا ہے، پیروں کے ساتھ انتہائی عقیدت کا اظہار کرنا آداب سلوک میں داخل ہے، خود مناقب الاصفیا کے مؤلف نے دیباچہ میں فرمایا ہے۔

"روشن ظاہر بزرگان ایشان آنست کہ پیر را خلیفۃ اللہ و قائم مقام رسول اللہ تصور کنند و حسن آداب کہ مرنبی را باید کرد مرا ورا بجا آرند۔"

ہر مسلمان حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جملہ انبیا و رسل پر فضیلت دیتا ہے، جو اس کے حضورؐ سے محبت کی خاص دلیل ہے لیکن اس فضیلت کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ دوسرے انبیا کو کمتر سمجھتا ہے، اسی طرح اگر صاحب مناقب الاصفیا نے پیروں کے مناقب بیان کرتے میں انتہائی عقیدت کا اظہار کیا ہے تو اس پر اعتراض کرنا اس راہ سے محض ناواقفیت کا اظہار کرنا ہے، پیر کو خلیفۃ اللہ اور قائم مقام رسول اللہ سمجھ کر نبی کی طرح احترام کرنا محض تعلیم و تربیت کی خاطر ہے، جس کے بعد ہی اس راہ کے احوال و مقامات طے ہوتے ہیں، اس سے کوئی مرید اپنے پیر کو صاحبِ وحی نبی نہیں سمجھتا، اگر کوئی یہ تصور کرتا ہے کہ مرید اپنے پیر کو واقعی نبی سمجھتا ہے، تو ایسا تصور کرنے والا تصوف کا قدر دان نہیں بلکہ ناقد اور معاند ہے۔

مضمون نگار نے اس کتاب کو مجروح کرنے کے سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات لکھنے میں تاریخی حقائق سے زیادہ غلو سے کام لیا گیا ہے، نہر سادہ کے خشک ہو جانے، ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر پڑنے، آتشکدۂ ایران کے سرد ہو جانے وغیرہ کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے۔" ان واقعات کا ذکر سیرت نگار برابر کرتے آئے ہیں، مثلاً قاضی عیاض (المتوفی ۵۴۴ھ) نے اپنی مشہور کتاب شفاء میں لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی رات تعجب خیز باتیں ظاہر ہوئیں، کسریٰ کے محل میں زلزلہ آ گیا، اس کے کنگرے گر گئے، بحیرۂ طبریہ میں جوش آ گیا، اور فارس کی وہ آگ بجھ گئی جو ایک ہزار سال سے نہیں بجھی تھی۔ (ص ۳۶۶)

مولانا شبلی کی سیرۃ النبی سب سے زیادہ مستند سمجھی جاتی ہے، اس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارک کا ذکر ظہور قدسی کے عنوان سے کرتے ہیں، تو اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں،

"ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے، آتشکدۂ فارس بجھ گیا، دریائے سادہ خشک ہو گیا ۔۔۔۔"

اب صاحب مناقب الاصفیا نے بھی لکھا تو اس پر اعتراض کرنا کہاں تک صحیح ہے۔

مضمون نگار کا اعتراض ہے کہ

"مولف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی تاریخ دوشنبہ ہفتم ماہ ربیع الاول لکھی ہے لیکن کسی تاریخ، سیرت یا حدیث کی کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے۔"

مولانا شبلی سیرۃ النبی جلد اول میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت پر پوری بحث کی ہے، اس میں ہے کہ

"تاریخ ولادت میں اختلاف ہے لیکن اس قدر متفق ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا، اور تاریخ ۸ سے لیکر ۱۲ تک منحصر ہے۔" (سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۱۱)

مختلف فیہ روایت میں اگر کسی مصنف نے کسی روایت کو لکھا تو اس پر اعتراض کیا ہے،
مضمون نگار لکھتے ہیں کہ

"صاحب مناقب الاصفیا.... کا اعتقاد ہے کہ حضرت آمنہ دوبارہ زندہ ہو کر اسلام لائیں"۔

یہ صریحاً مضمون نگار کی فریب دہی ہے، صاحب مناقب الاصفیا نے حضرت عائشہؓ کی ایک حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار خداوند تعالیٰ سے دعا کی کہ آپ کی والدہ حضرت آمنہ زندہ ہوجائیں اور ایمان لے آئیں، خدا نے دعا قبول کی لیکن اس حدیث کو لکھنے کے بعد امام نووی نے اس حدیث کی تردید میں خود دلائل لکھے ہیں، وہ بھی نقل کر دیے گئے پھر صحیح مسلم کی یہ حدیث بھی لکھ دی گئی ہے کہ

"میں نے اپنے پروردگار سے اپنی ماں کی مغفرت کی دعا کے لیے اجازت چاہی، اللہ تعالےٰ نے اجازت نہیں دی، پھر میں نے اس سے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کرنے کی اجازت مانگی تو اس کی اجازت دیدی"۔

اور پھر وہ کلام پاک کی اس آیت کو بھی لکھتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ نبی اور مسلمانوں کے لیے مشرکوں کی مغفرت کے لیے دعا مانگنا مناسب نہیں"، اس آیت پر یقین کامل رکھنے کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح مسلم کی روایت اور کلام پاک کی آیت بالکل درست ہے، لیکن حضرت آمنہ کا شمار عام مشرکوں میں نہیں، اس لیے ممکن ہے کہ حضرت آمنہ رسول اللہ کی دعا سے زندہ ہوگئی ہوں، وہ اس پر اعتقاد نہیں رکھتے، بلکہ محض امکان کا اظہار کرتے ہیں، جو "بعضے گویند" اور "عجب نیست" کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ سے ان کا جذبۂ محبت ظاہر ہوتا ہے، اور وہ عام مسلمانوں کی طرح ان کی مغفرت کے خواہاں ہوتے ہیں، اس کا تعلق اعتقاد سے نہیں۔

آخر میں مضمون نگار سے یہ کہنا ہے کہ وہ اپنی مضمون نگاری سے محض اپنی شہرت چاہتے ہیں تو ان سے کوئی شکایت نہیں لیکن اگر وہ واقعی صوفیائے کرام سے عقیدت رکھتے ہیں اور ان سے متعلق مفید معلومات فراہم کرنا چاہتے ہیں تو پہلے وہ مخدوم الملکؒ کی اس نصیحت پر عمل کریں کہ کسی کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ صوفیوں کی راہ میں داخل ہو جب تک کہ وہ ان کے عقیدوں اور ان کے آداب ظاہری کو یعنی جو معاملات ظاہر سے تعلق رکھتے ہیں، اور ان کے باطن کو یعنی جو معاملات دل سے تعلق رکھتے ہیں، اور اطلاقات کو نہ جان لے کیونکہ ان حضرات کی باتیں زیادہ تر رموز و اشارات میں ہیں،

"درست نیست مریکے راکہ در آید در راہ صوفیان مگر پس از آن کہ بداند عقیدت ہائے ایشان را و آداب ہائے ایشان در ظاہر ایشان یعنی انچہ تعلق بہ معاملات ظاہر دارد و باطن ایشان را یعنی انچہ تعلق بمعاملات دل ایشان دارد و فہم کند اطلاقات ایشان را در کلمات ایشان از بہر آں کہ سخن ایں طائفہ بیشتر رموز و اشارات است"

(شرح آداب المریدین)

امید ہے کہ آئندہ جب وہ صوفیائے کرام پر قلم اٹھائیں گے تو اس نصیحت کو پیش نظر رکھیں گے۔

دیوان ہجری

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی، دہلی یونیورسٹی

دربار اکبری کو زینت دینے والی جہاں بہت سی لافانی اور اہم ہستیاں تھیں، وہاں بیشمار ایسے فنکار، ادیب اور شعراء بھی ہیں جن کو زمانہ تقریباً بھول چکا ہے۔ انہی میں ایک ہجری بھی ہیں، جن کے متعلق مؤلف فہرست کتبخانہ انڈیا آفس نے لکھا ہے کہ غالباً یہ وہی خواجہ ہجری ہیں جن کا ذکر بدایونی نے کیا ہے، اور جو شیخ احمد جام نامکی[1] کی اولاد میں تھے، یہ بھی لکھا ہے کہ سفینہ میں ہجری کو فرغانہ کا بتایا گیا ہے، صاحب مجمع النفائس نے ہجری بخاری لکھا ہے، اور کہا ہے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ وہ اندجانی تھے، اور کچھ دنوں حصار میں بھی رہے تھے، مگر صاحب عرفات عاشقین نے ان کو ہجری الجامی تحریر کیا ہے۔

بدایونی نے لکھا ہے کہ "ہجری ایک صالح، پاک باطن اور فرشتہ خصلت انسان تھے"[2]۔ صاحب عرفات نے ہجری کی بڑی تعریف کی ہے کہ "نجابت اور بلند ہمتی کی علامتیں ان کے وجود کی پیشانی سے نمایاں تھیں اور وہ انتہائی لطیف طبیعت کی وجہ سے ظرافت اور مزاح

---

[1] احمد بن ابی الحسین ابن محمد ابن جریر ابن عبداللہ ابن لیث ابن جریر ابن عبداللہ البجلی الجامی الخراسانی النامکی بہ ابو نصر ملقب بہ زندہ پیل و شیخ اسلام و شیخ جام متوفی بسال ۵۳۶ھ یا ۵۳۶ھ (۱۱۳۱-۳۲ یا ۴۲-۱۱۴۱ء)

[2] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۵۲۲

کی باتیں کہتے تھے صحبتوں کی آن سے زینت ہوتی اور ان کی زندگی پاکیزہ تھی[1]۔ اور ان کو مرزا محمد ہنداِل[2] کا مداح بتایا ہے، مؤلف مخزن الغرائب لکھتے ہیں: "بڑے صاحب فضیلت اور صاحب تقوی و طہارت اور فرشتہ خصلت انسان تھے، اور علوم ظاہری میں ان کو کمال حاصل تھا" وہ "ظریف" خوش طبع اور خوش خلق تھے کبھی کسی نے ان کو غمگین نہیں دیکھا، ایک سے لیکر کروڑ تک جو بھی ان کے ہاتھوں میں آتا، ایثار کر دیتے تھے، اور کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے، اور چھوٹے بڑے سب کے ساتھ ایک طرح سے پیش آتے تھے"[3]

منتخب التواریخ اور مخزن الغرائب میں ان کے دیوان میں پانچ ہزار بیتیں بتائی گئی ہیں، دیوان ہجری کا ایک عمدہ نستعلیق میں لکھا ہوا قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے[4]، جس پر شاہجہاں[5]، حمیدہ بانو بنت علی اکبر، سید یوسف علی، امانت خاں[6] (۱۰۴۲ھ) عظمت اللہ خاں وغیرہ کی مہریں ہیں، اور ان مہروں کے ساتھ یہ عبارت ہے:-

" دیوان ہجری سرکار نواب صاحب ممتاز الدولہ مفتخر الملک حسام جنگ مسٹر رچارڈ جانسن صاحب بہادر دام اقبالہ"

اس نسخہ میں دس قصیدے[7] شہنشاہ اکبر[8] کی مدح میں ہیں، اور ہر قصیدہ کے پہلے کوئی رباعی یا قطعہ یا کوئی عبارت ہے، جس سے اس قصیدہ کی تقریب معلوم ہو جاتی ہے، ہجری کے قصیدے عام طور سے اچھے، مرصع سلیس اور رواں ہیں، ان میں بظاہر کوئی جھول نظر نہیں آتا، سلاست کے ساتھ زور کلام، زندگی اور جوش بھی ہے، ان قصیدوں میں تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں

---

[1] عرفات و ۸۰ [2] ۹۲۴ھ — ۹۵۸ھ (۱۵۱۸ء — ۱۵۵۱ء) [3] مخزن الغرائب ص ۱۰۱۵ [4] نمبر ۱۴۲۱ [5] ۱۰۳۷ھ — ۱۰۶۸ھ (۱۶۲۸ء — ۱۶۵۸ء) [6] امانت خاں ثانی، میر حسین، پسر سوم امانت خاں خوافی متوفی بسال ۱۱۱۱ھ (۱۷۰۰ء — ۱۶۹۹ء) [7] ۹۹۹ھ [8] ۹۶۳ھ — ۱۰۱۴ھ (۱۵۵۶ء — ۱۶۰۵ء)

کے لیے بھی اچھا خاصہ مواد ہے،

ان میں پہلا قصیدہ[۱] اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کی تشبیب میں ہندوستان، اور ہندوستانی عورتوں، جوگیوں، بتخانوں اور اشنان کرنے والوں کی تصویر کشی اور دہلی کی توصیف کی گئی ہے :-

ملک ہندوستاں کہ پر خوبانِ زنگی پیکر است	اصل آں خاک و زمین گویا ز مشک و عنبر است
از سیہ چشمانِ سبز از رنگ شیریں طلعتش	عقل حیران و خیال صورتِ صنعت گر است
جای آں دارد اگر گردد کسی زنّار بند	در چنیں جائی کہ پُر از دلبران کافر است
ہر طرف بتخانہا پُر از بتان دلربا	کز لطافت ہر بتی رشکِ بتانِ آذر است
روی سینہ رشتۂ زنار ہندو تار تار	در کتاب بت پرستی راستی را سطر است
جوگی اندر پرستش بین کز آتش دوستی	رو بخاک نیستی غلطیدہ در خاکستر است
شیوۂ مہر و وفا بین در زن ہندو کہ او	خویش را افگندہ در آتش ز عشق شوہر است
غوطہ در پای سیاہی ہندواں ہنگامِ غسل	ہر لبِ دریا نگہ گوئی کہ رگا دعنبر است
حضرت دہلی سواد اعظمش کز روی قدر	پای تخت شاہ عالی شاہ فخر اکبر است

دوسرے قصیدے[۲] میں استعارۃً بیرم خاں[۳] کے زوال اور وفات کا ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے :-

این نظم باستعارہ گشت ہست بیاں	از بہر زوال دولت بیرم خاں
این طرفہ کہ با قصیدہ گردید تمام	ایام حیات و دولتش دریک آں

یہ قصیدہ ۹۶۸ھ / ۱۵۶۱ء میں لکھا گیا تھا، جس سال بیرم خاں کی وفات ہوئی تھی،

---

[۱] ۱۵ شعر ہیں جن کے بعد ایک رباعی پر ۲ شعر ہیں، جن کے علاوہ ایک رباعی بھی ہے،
[۲] متوفی بسال ۹۶۸ھ (۱۵۶۱ء)

قصیدہ یہ ہے :-

شد وقت آنکہ باز جہاں گلستاں شود | باغ از گل و شگوفہ جواہر فشاں شود
افسردہ شکل پیر زلیخای روزگار | در دورِ حسنِ یوسفِ گل نوجواں شود
گلہای تازہ بشگفد از گلشنِ بہار | دلہا شگفتہ ہمچو رخِ دلستاں شود
ہر سو بطرفِ باغ سہی سرو گلرخاں | در ناز و جلوہ آمدہ دامن کشاں شود
ز یبندہ ہمچو سنبلِ نو رستۂ بہار | شاخِ بنفشہ بر گل تر سایہ باں شود
تاریکی ضلالتِ ناپاک مذہباں | پاک از رخِ مالکِ شاہ جہاں شود

تیسرا قصیدہ[۱] دو دو شمنوں، بہادر[۲] اور علی قلی خاں کے مقتول ہونے اور ان کے سر لائے جانے کے موقع پر کہا گیا تھا، جو اس طرح شروع ہوتا ہے ،

باز از نسیمِ فتحِ تو بشگفتہ بوستاں | وقتِ گل است و موسمِ گلگشتِ گلستاں

اس قصیدہ اور دوسری نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہجری دراصل ہمایوں[۳] کے مقرب درباری تھے، اس لیے جب اکبر تخت نشین ہوا تو وہ اس سے بھی اسی التفات کے متمنی ہوئے،

نسبت بحالِ بندہ بسی التفات داشت | فردوس بارگاہ شہ جنت آشیاں

ان کو یہ شکایت تھی کہ اکبر نے ہمایوں کے دوسرے درباریوں کی طرح ان کی طرف توجہ نہ کی، اسی قصیدے میں ملنہ خاں خواجہ سرا نے ان کی جاگیر کے سلسلے میں جو حق تلفی کی تھی، اس کا ذکر کیا ہے،

ہر کس ز بندگانِ شہنشہ کہ ماندہ بود | از دولتِ تو یافت دو صد گونہ قدر و شاں
غیر از منِ فقیر کہ در دورِ شہریار | سودی ز بختِ خویش ندیدم گمرز یاں

---

[۱] ۷۲ شعر کے علاوہ ۳ شعر کا ایک قطعہ بھی ہے [۲] بہادر پسر سعید بدخشی، متوفی بسال ۹۷۴ھ (۱۵۶۶ء)
[۳] ۹۳۷ھ-۹۴۷ھ / ۹۶۲ھ-۹۶۳ھ / ۱۵۳۰ء-۱۵۴۰ء — ۱۵۵۵ء-۱۵۵۶ء

حالا زیک لکی کہ بود نصف حاصلش | چون بگذرد معاش من و جمع ناتوان
از ضعف طالع ار نشود بیشتر ز پیش | وز لطف شہریار شود بندہ شادمان
شاہا کرم نمای ہمان جاگیر را | فرمای تا دہند بہ ہراورنگ نشان
گرفتہ است حاصل یک فصل بی حساب | از جاگیر بندہ بنا خن لمبند خان
ظلمی کہ کردہ خواجہ سرا در دیار ہند | آن ظلم در ہرات نکردہ است ترکمان

چوتھا قصیدہ[1] زیادہ طولانی ہے جس کی تشبیب میں بڑے لطف اور روانی سے بہار اور مے نوشی کے جزئیات کا ذکر کیا گیا ہے :-

باز وقت است کہ گل پردہ ز لخ برگیرد | صحبت مرغ سحر خیز بگل درگیرد
پی رندان در خمخانہ کشاید خمّار | وز سر دختر از مقنع و معجز گیرد
ز آستین ساعد سیمین بدر آرد ساقی | پنجہ در مرغ صراحی زدہ ساغر گیرد
ہمہ گیرند قدح از کف ساقی و دلم | بوسہ از ساعد آن سرو سمنبر گیرد
ذکر گویان بہوای قد دلجوی حبیب | آشیان فاختہ بر شاخ صنوبر گیرد
قمری عاشق شیدا بتماشا گہ سرو | میوۂ وصل ز نخل قد دلبر گیرد

ہجری مذہبی آدمی تھے اور اکبر کے دور کی بعض بدعتوں کو پسند نہ کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ شاہی حکم سے مسجدوں اور مدرسوں سے تصویریں ہٹائی جائیں :

مسجد و مدرسہ مپسند کہ از صورت کفر | نقش و تصویر چو بتخانۂ آذر گیرد

ہجری اکبر کو موقع موقع سے نصیحتیں کرتے رہتے تھے ، اسی قصیدہ میں شہنشاہ کو غلہ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور اس کے اسباب کی طرف متوجہ کیا ہے :-

---

[1] ۱۲۱ اشعر ہیں ان کے علاوہ ایک شعر عنوان میں ہے۔

پیلبان تو اگر غلہ ز دہقان نکشد غلہ قیمت ز چہ رو در دہ و کشور گیرد

نیز اکبر کو اس کے ژولیدہ بالوں پر متنبہ کیا ہے کہ سر کے بالوں کو مناسب طرح سے رکھے اور ان کو زیادہ بڑھنے نہ دے، اور ممکن ہے یہ نکتہ اس قصیدہ کی امتیازی خصوصیت ہو :

بر سر سرو تو کز ناز سمن بر گیرد موی ژولیدہ چرا جای چو افسر گیرد

بر سر شہ کہ گل و تاج مرصع زیبد موی ز اندازہ نکو نیست کہ سر بر گیرد

از سر ت موی بپاکی و لطافت تبر اش کہ صفا از مہ و خورشید نکو تر گیرد

دور کن موی سر از گوہر پاکی و گداز کز خط آئینہ حسن تو جوہر گیرد

دو قصیدے[1] گجرات کی دوسری فتح[2] اور بنگال کی فتح[3] پر کہے گئے تھے۔

ہجری کے قصیدوں سے چند سلیس و رواں اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے قصیدہ کی شان ٹپکتی ہے :

روز اول کرمی و دیر مغاں ساختہ اند روزی در دکشاں رطل گراں ساختہ اند

چشم مستان صبوحی زدۂ عاشق را بر گل عارض ساقی نگراں ساختہ اند

قدسیان پیر زلیخای جہاں را بستہ عقد با یوسف حسن تو جواں ساختہ اند

ترا چو سبزۂ تر بر گل عذار آمد ز باغ حسن تو بوی بنفشہ زار آمد

بنفشہ سجدہ کناں از سر نیاز رسید شگوفہ نسیم بکف از پی نثار آمد

ایک مفصل ترکیب بند[4] ہے جس میں ہمایوں کا مرثیہ ہے، اور اسی کے ساتھ اکبر کی تخت نشینی پر اظہار مسرت کیا گیا ہے، اس مرثیہ کے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں جن سے ہجری کے زور بیان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

له ۶۰ شعر اور ۵۰ شعر کے ۔ ٹه ۹۸۰ھ (۱۵۷۳ء) ۳ ۹۸۲ھ (۱۵۷۵ء) ۴ ۱۲۹ شعر ہیں جنکے پہلے ایک رباعی بھی ہے

دی چمن یاد ز سرمنزلِ جاناں می داد — خندۂ گل خبری زاں گلِ خنداں میداد

دوش با غمزدگان شب تاریک فراق — مژدۂ صبح طرب مرغ خوش الحاں می داد

ای جہاں دیدہ نگر گردش ایام چہ کرد — چہ رخ بی مہر بآں سرو گل اندام چہ کرد

دوش نالان غزلی مرغ خوش الحاں می خواند — ظاہرا مرثیۂ خسرو دوراں می خواند

رفتی و از تو بدل حسرت بسیار بماند — داغہا بر جگر و سینۂ افگار بماند

کہ جدا ای رخِ تو در گل و نسریں بینم — دور از آں جعد سیہ سنبلِ مشکیں بینم

چوں کنم بی قد رعنای تو نظارۂ سرو — بی رخ پر عرقت درمہ و پروین بینم

اس کے بعد ایک قطعہ ہمایوں کی تاریخ وفات میں ہے، مگر تعجب ہے کہ اس دیوان میں ہجری کا کوئی اور قصیدہ یا کلام ایسا نہیں ملتا جس میں ہمایوں کی مدح کی گئی ہو، اور یہ معلوم ہو کہ وہ اس کا درباری شاعر تھا،

اس کے بعد پندرہ ذیل غزلیں ہیں، جن میں قصیدہ کا انداز ہے، اور جن کو کسی نہ کسی تقریب میں کہا گیا ہے، مثلاً ایک میں ولادت کی مبارک باد ہے، بعض اور دلکش اشعار یہاں بطور نمونہ کے نقل کیے جاتے ہیں؛

ہمرہ قافلۂ عشق بسودای رخت — جاں بکف ماندہ باین مرحلہ گاہ آمدہ ایم

باندر بزم شہ دوراں خروش دگر است — بادہ را در ساغر و پیمانہ جوش دگر است

غزلوں کے بعد بارہ قطعے[1] اور سات رباعیاں ہیں، ان میں سے ایک قطعہ کسی مکان کی تعمیر کے موقع پر کہا گیا تھا، زیادہ تر قطعوں میں ہجری نے اپنی جاگیر میں اضافہ کی خواہش اور اپنی تنگی معاش کی شکایت کی ہے اور بتایا ہے کہ .... ان کا سالانہ خرچ

---

[1] ۴۰ شعر ہیں

تین چار لاکھ ہے، اور آمدنی صرف پچاس بدرہ[1] ہے، وہ بھی جب فصل ٹھیک ہو، مگر مصیبت یہ ہے کہ قحط اور بارش کی کمی کی وجہ سے فصل خراب ہو جاتی ہے، ہجری نے اپنی جاگیر میں ایک عمارت اور کنواں بنوایا تھا، اور ایک مسجد اور خانقاہ بنانا چاہتے تھے، ان کے دشمنوں نے ان کی زندگی میں بادشاہ کو ان کی موت کی خبر دیدی، بیماری کی وجہ سے ان کے بال گر گئے تھے، منافقوں نے شکایت کر دی کہ وہ دربار میں بغیر سر کے بالوں کے آتے ہیں، ان کے قطعوں سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے ان کی جاگیر زیادہ تھی، پھر کم ہوتے ہوتے صرف ایک گاؤں تک محدود رہ گئی، اور وہ جس خدم و حشم سے رہتے تھے، اس کے لیے یہ آمدنی کافی نہ تھی، اس گاؤں کا نام ملک پور تھا جو پرگنہ کھری میں تھا، اس کی آمدنی صرف چالیس بدرہ تھی، اور ان کا سالانہ خرچ تین لاکھ روپیہ کے قریب تھا، وہ تقریباً دو سو آدمیوں کے کفیل تھے، جن میں زیادہ تر مومن بندے تھے، اس پرگنہ پر بھی حاکم کی نظر تھی، غالباً کسی موقع پر ہجری کو حکم ملا تھا کہ وہ ملک پور کی جاگیر مظفر خاں[2] کے حوالہ کر دیں جس سے انھیں بڑی تکلیف ہوئی، بہرحال انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ اگر یہ جگہ نہیں ملتی تو پھر کوئی دوسری جگہ مل جائے، ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے "بڈہانہ"[3] کو جس کی آمدنی پچاس بدرہ تھی فقرا کے لیے وقف کر دیا تھا، مگر دو سال ہوئے کہ خواجہ جہاں[4] نے اس کو لے لیا جس کی وجہ سے ان کے چالیس سال کے تعلقات خراب ہو گئے۔

---

[1] فرہنگوں میں ہے کہ ایک بدرہ میں دس ہزار درہم یا سات سو اشرفیاں ہوتی ہیں، مگر پتہ نہیں چلتا کہ یہاں بدرہ سے کیا مراد ہے۔ [2] مظفر خاں تربتی، خواجہ مظفر علی، دیوان بیرم خاں، متوفی بسال ۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء) [3] Budhana یوپی کے مظفر نگر ضلع میں ایک تحصیلی قصبہ ہے، جو دریائے ہنڈن (Hindan) کی داہنی طرف واقع ہے [4] خواجہ جہاں ہروی، خواجہ امین الدین محمود مشہور بامین، متوفی بسال ۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء)

مآخذ

۱۔ تقی الدین محمد اوحدی : عرفات عاشقین ، نسخۂ خطی شمارہ ۶۸۵ ، خدابخش لائبریری پٹنہ ،

۲۔ سراج الدین علی خاں آرزو : مجمع النفائس ، نسخۂ خطی شمارہ ۶۹۵ ، خدابخش لائبریری پٹنہ ۔

۳۔ نواب صدیق حسن خاں : شمع انجمن ، مطبع رئیس المطابع شاہجہانی ۔

۴۔ غلام علی آزاد : ید بیضا ، نسخۂ خطی شمارہ ۶۹۱ ، خدابخش لائبریری پٹنہ ۔

۵۔ امجد علی ہاشمی سندیلوی : مخزن الغرائب ، نسخۂ خطی شمارہ ۷۱۳ ، خدابخش لائبریری پٹنہ ۔

6. Mulla Abdul Qadir Badayuni : Muntakhab-ut-Tawarikh, translated by George S. A. Ranking, Baptist Mission Press, Calcutta. Vol III

7. Hermann Ethe : Catalogue of Persian Manuscripts in The Library of India Office Oxford, 1903

8. Vincent A. Smith : Akbar The Great Moghul Second Edition, S. Chand & Co 1962.

دینور اور مشائخِ دینور

از جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی

معارف (اگست ۱۹۶۵ء) میں جناب سید شمیم احمد صاحب، ڈھاکہ کا ایک مقالہ مذکورۂ بالا عنوان سے شائع ہوا ہے، جس میں موصوف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دینور جس کی طرف حضرت ممشاد، اور حضرت احمد اسود وغیرہ منسوب ہیں، سیلون کا ایک شہر تھا، انھوں نے اپنے اس خیال کی بنیاد یہ بتائی ہے کہ ابن بطوطہ نے جزیرہ "لنکا" کے حال میں نہایت تفصیل و تشریح کے ساتھ دینور کا ذکر کیا ہے،

اس سلسلہ میں مجھے یہ کہنا ہے کہ صرف اتنی سی بات کہ لنکا کے نواح میں ایک دینور پایا جاتا ہے، یہ خیال قائم کرنے کے لیے کہ حضرت ممشاد وغیرہ اسی دینور کی طرف منسوب ہیں، کافی نہیں ہے، اس خیال کی صحت کا امکان اُس وقت تھا، جب اس دینور کے علاوہ کسی دوسرے دینور کا ذکر کہیں نہ ہوتا، یا ہوتا مگر کسی مستند کی یہ تصریح پائی جاتی کہ حضرت ممشاد وغیرہ لنکا ہی والے دینور سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی صحیح اور متحقق نہیں ہے۔

پہلی بات، یعنی یہ کہ "لنکا کے دینور کے علاوہ کسی دوسرے دینور کا کہیں ذکر نہیں ہے" اس لیے صحیح نہیں ہے کہ خود مقالہ نگار کو تسلیم ہے کہ

"دارا شکوہ نے حضرت ممشاد کے ذکر میں لکھا ہے کہ دینور قرمیسین[1] کے قریب جبل کے شہروں میں سے ایک شہر کا نام ہے[2]"

اگرچہ مقالہ نگار نے اس بیان کی نسبت بالکل بے وجہ اور بلا دلیل یہ لکھدیا ہے کہ "یہ غلط ہے، دینور ایران اور عراق میں نہیں بلکہ سیلون میں تھا"

مگر واقعہ یہ ہے کہ دارا شکوہ کا بیان ایک تاریخی حقیقت ہے، اس کا انکار مکابرہ اور اس کی تغلیط ناممکن ہے،

(۱) سب سے پہلے تاریخ کے ایک طالب علم کو عراق و ایران کی اسلامی فتوحات کے سلسلے میں دینور کا نام ملتا ہے، تیسری صدی ہجری کا مشہور مورخ بلاذری (المتوفی ۲۷۹ھ) اپنی کتاب فتوح البلدان میں لکھتا ہے:-

"قالوا انصرف ابوموسیٰ الاشعری من نهاوند، وقد كان سار بنفسه اليها على بعث اهل البصرة ممد النعمان بن مقرن فمر بالدينور، فاقام عليها خمسة ايام قوتل منها يوما واحدا ثم ان اهلها اقروا بالجزية والخراج وسألوا الامان على انفسهم واموالهم واولادهم فاجابهم الى ذالك وخلف بها عامله فی خیل، ثم مضى الى ماسبذان فلم يقاتله اهله، وصالحه اهل السيروان على مثل صلح الدينور وعلى ان يؤدوا الجزية والخراج[3]۔

[1] معارف میں یونہی چھپا ہے، مگر صحیح "قرمیسین" ہے۔ [2] معارف ص ۱۱۱

[3] فتوح البلدان، ص ۳۱۵

اس عبارت کو بغور پڑھیے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (۱) نہاوند سے بصرہ واپس ہوتے ہوئے حضرت ابو موسیٰ کو درمیان میں دینور ملا تھا، (۲) دینور کے بعد وہ ماسبذان گئے (۳) ماسبذان کے بعد ان کو سیروان ملا تھا، اور ہر جغرافیہ دان جانتا ہے کہ یہ سارے مقامات ایران میں ہیں، اور اسی لیے یہ سب نام فتوحات عراق و ایران کے سلسلے میں آئے ہیں۔

(۲) مورخ ابن الاثیر نے بھی کامل میں اسی کے قریب لکھا ہے، ملاحظہ ہو واقعات ۲۱ھ۔ زیر عنوان ذکر فتح الدینور [۱] الخ

(۳) یاقوت حموی معجم البلدان میں لکھتے ہیں:

"دینور مدینة من اعمال الجبل قرب قرمیسین ینسب الیها خلق کثیر و بین الدینور و همذان نیف و عشرون فرسخا و من الدینور الی شهرزور اربع مراحل۔

دارا شکوہ کا بیان، یاقوت کے ابتدائی فقرہ کا لفظ بلفظ ترجمہ ہے، یاقوت نے اس عبارت میں دینور کا محل وقوع بھی بتادیا ہو کہ وہ ہمدان (مشہور ایرانی شہر) سے بیس فرسخ (۶۰ میل) سے کچھ زیادہ دوری پر واقع تھا۔ اور ہمدان کی نسبت لکھا ہے کہ وہ چوتھے اقلیم میں ۷۳ درجہ طول بلد اور ۳۶ درجہ عرض البلد شمالی پر واقع ہے۔

(۴) سمعانی کتاب الانساب میں، اور ابن الاثیر اللباب میں لکھتے ہیں:۔

"الدینوری .... هذه النسبة الی الدینور، وهی بلدة من بلد الجبل [۲] عند قرمیسین [۳]"

---

[۱] کامل لابن الاثیر ج ۳ ص ۷، [۲] بلد الجبل یا بلاد الجبال ایران کے ایک حصہ کو کہتے تھے۔ [۳] اللباب ج ۱ ص ۴۴۰

یاقوت، سمعانی، اور ابن الاثیر نے دینور کو قرمیسین کے قریب بتایا ہے، اور قرمیسین کی نسبت سمعانی وغیرہ نے لکھا ہے:

هی مدینة بجبال العراق علی ثلاثین فرسخا من همذان عند الدینور، ویقال لها کرمان شاه۔"[1]

(یعنی قرمیسین جبال عراق کا ایک شہر ہے، ہمذان سے تیس فرسخ کے فاصلہ پر دینور کے پاس واقع ہے)

قرمیسین کی نسبت یہی بات یاقوت نے بھی اس اضافہ کے ساتھ لکھی ہے کہ وہ ہمذان اور حلوان کے درمیان اس شاہراہ پر واقع ہے، جس سے ایرانی حجاج کا قافلہ گذرتا ہے۔

اور صاحب قاموس نے لکھا ہے

"قرمیسین بالکسر بلدة قرب الدینور معرب کرمان شاهان"

(باب السین فصل القاف۔

دینور کی نسبت ایسا ہی بیان دوسری بہت سی کتابوں میں ملتا ہے، آخر میں ہم صاحب المنجد کا بیان پیش کرتے ہیں۔ وہ المنجد فی الادب والعلوم کے صفحہ ۲۰۶ پر لکھتا ہے:۔

"دینور مدینة من امهات مدن الجبال فی مادی، دخلها العرب (۶۴۲) بعد واقعة نهاوند والبصرة، وسموها ماه الکوفة کانت عامرة غنیة علی ایام الامویین والعباسین

---

[1] اللباب، ج ۲ ص ۲۵۵

ضربت فی حروب مرداویج الجیلانی ، اجھز علیھا تیمور (۱۴۰۰)

اس میں صاحب منجد نے تصریح کی ہے کہ دینور کوہستان میں ایک اہم شہر تھا، عباسیوں کے عہد تک نہایت آباد تھا۔ مرداویج جیلانی کی جنگوں میں تباہ ہوا اور اس کی تباہی میں رہی سہی کسر تیمور نے پوری کر دی، صاحب منجد نے یہ تصریح بھی کر دی کہ وہ (Media) میں تھا۔

ان تصریحات کے بعد یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ لنکا کے علاوہ ایران (یا یوں کہیے کہ بلاد جبال یا کوہستان عراق) میں بھی ایک دینور تھا، اور وہ نہایت مشہور ایک تاریخی مقام تھا۔ لنکا والے دینور کی شہرت اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں تھی، بلکہ ابن بطوطہ سے پہلے غالباً کسی عرب مورخ نے اس کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔

رہا مقالہ نگار کا مناقب الاصفیاء کے حوالہ سے یہ لکھنا کہ رسالہ قشیریہ میں جہاں خواجہ احمد سیاہ دینوری کا تذکرہ ہے، وہاں یہ لکھا ہے کہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کوئی دیہات ہے یا شہر (معارف ص ۱۱۱) تو یہ بات قرین صواب نہیں معلوم ہوتی رسالہ قشیریہ مطبوعہ مصر ۱۲۸۴ھ کے صفحہ ۴۰ پر احمد اسود دینوری کا ذکر ہے، اور وہاں ایسی کوئی بات مذکور نہیں ہے۔ اگر کسی دوسری جگہ یہ بیان تو مقالہ نگار اسکی نشاندہی فرمائیں۔

بہرحال ان حالات میں لنکا والے دینور کو تسلیم کرنا، اور ایران والے دینور کا انکار کرنا تحقیق اور ریسرچ کی کوئی قابل تعریف مثال نہیں ہے۔

اس کے بعد دوسری بات کو لیجئے، تو جہاں تک ہمارے معلومات کا تعلق ہے

مقالہ نگار کے سوا کسی مورخ یا تذکرہ نگار یا کسی محقق نے حضرت ممشاد دینوری وغیرہ کو لنکا والے دینور کی طرف منسوب نہیں بتایا ہے، اس کے برخلاف کثرت محققین نے ان لوگوں کو ایران والے دینور کی طرف منسوب قرار دیا ہے۔

ممشاد دینوری کے باب میں دارا شکوہ کا بیان آپ پڑھ چکے ہیں، ان سے پہلے شیخ الاسلام ہروی کا بیان طبقات الصوفیہ (مطبوعہ کابل) میں ہے:-

"ممشاد الدینوری سید و شیخ مشائخ عراق از عیانِ مشائخ است"

طبقات کا محشی لکھتا ہے:-

"منسوب است بہ دینورکے از بلاد جبال نزدیک کرمانشاہ"[1]

مولانا جامی نفحات الانس کے منہیہ میں ممشاد دینوری کے حال میں لکھتے ہیں:

"الدینوری منسوب الی دینور بکسر الدال وسکون الیاء آخر الحروف وفتح النون والواو وفی آخرھا الراء وھی بلدۃ من بلاد الجبل عند قرمیسین معرب کرمانشاہ"[2]

مولانا یونس بہاری نے اسی عبارت کا حوالہ دیا ہے، مگر مقالہ نگار کو یہ عبارت اس لیے نہیں مل سکی کہ ان کے پاس نفحات مطبوعہ نولکشور پریس ۱۹۰۵ء موجود نہیں تھی، اگرچہ مولانا یونس نے مولانا جامی کی عبارت کا صحیح ترجمہ نہیں کیا ہے۔

مقالہ نگار نے ابوبکر کسائی دینوری کا تعلق بھی لنکا سے بتایا ہے[3]، مگر شیخ الاسلام ہروی فرماتے ہیں:-

---

[1] طبقات الصوفیہ، ص ۳۰۹ [2] نفحات الانس ص ۹۳ [3] معارف ص ۱۱۶، ۱۱۷

"بوبکر کسائی دینوری از قہستان عراق بودند بدینور۔"[1]

اور مولانا جامی نفحات الانس میں لکھتے ہیں:

"ابوبکر کسائی دینوری از قہستان عراق بوده بدینور۔"[2]

مقالہ نگار نے ابوعبد اللہ دینوری کا تعلق بھی لنکا سے بتایا ہے، مگر طبقات الصوفیہ کا محشی ان کے حال میں لکھتا ہے:

"منسوب است بہ دینور کہ شہریست از جبال نزدیک کرمان شاہ، و بسا از اہل علم بداں منسوبند۔"[3]

ان حضرات کے علاوہ جن لوگوں کے نام مقالہ نگار نے دیے ہیں وہ سب بھی اسی مشہور دینور سے تعلق رکھتے تھے، اور ان کے ماسوا بھی بکثرت علما، و مشائخ کا تعلق اسی دینور سے ہے، مثلاً ابوبکر ابن السنی دینوری (شاگرد امام نسائی) ابوعبد اللہ بن فنجویہ دینوری (راوی سنن نسائی) اور یہاں دینوری وغیرہ۔

یہ تمام حضرات یا ان میں سے کوئی لنکا والے دینور کی جانب منسوب ہوتا تو لازمی طور پر مورخین اس کی تصریح کرتے، مورخین کی مستمر عادت ہے کہ ایک نام کے دو شہر ہوتے ہیں، اور ان میں ایک زیادہ مشہور ہو، دوسرا کم، تو جو شخص غیر مشہور شہر کی طرف منسوب ہوتا ہے، اس کے باب میں صراحت کر دیتے ہیں کہ یہ اس غیر مشہور شہر سے تعلق رکھتا ہو، جیسے صنعا، نام کے دو شہر ہیں، ایک یمن میں، دوسرا شام میں تو جو آدمی صنعا، شام کا رہنے والا ہوتا ہے، اس کی نسبت بتا دیتے ہیں کہ ھو من صنعاء الشام۔ اس کی اور بھی متعدد مثالیں موجود ہیں۔

---

[1] طبقات الصوفیہ، ص ۲۶۸ [2] نفحات الانس ص ۸۳ مطبوعہ نولکشور ۱۸۶۴ء ونسخہ قلمی ورق ۵۸،

[3] طبقات الصوفیہ ص ۴۹۹

اس مقالہ میں مذکورۂ بالا امور کے علاوہ اور بھی بعض اوہام ہیں، مثلاً خواجہ ممشاد دینوری کو خواجہ عبد اللہ خفیف کا خلیفہ بتایا گیا ہے[1]

اس میں دو وہم ہیں، ایک تو عبد اللہ خفیف کے بجائے ابو عبد اللہ خفیف ہونا چاہئے، دوسرے ممشاد کو ابو عبد اللہ خفیف کا خلیفہ بتانا بالکل خلاف واقعہ ہے، ممشاد دینوری، ابو عبد اللہ خفیف کے مشائخ کے طبقہ میں تھے، ان کی وفات بتصریح مقالہ نگار ۲۹۹ھ میں ہوئی ہے، اور ابو عبد اللہ خفیف کی ۳۷۱ھ میں، تذکروں میں یہ ذکر تو آتا ہے کہ ابو عبد اللہ خفیف نے ممشاد کو خواب میں دیکھا، لیکن بیداری میں دونوں بزرگوں کی باہمی ملاقات کا ذکر ہمارے علم میں کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا ہے۔

مقالہ نگار کا ایک وہم یہ بھی ہے کہ انھوں نے ابو عبد اللہ خفیف کا سال وفات ۳۳۱ھ بتایا ہے اگر اس میں غالباً انھوں نے مولانا جامی کا اتباع کیا ہے، نفحات الانس میں مولانا جامی نے معلوم نہیں کس طرح یہی سال وفات لکھدیا ہے، حالانکہ ان کے علاوہ ہم نے جہاں دیکھا سب نے ۳۷۱ھ لکھا ہے، چنانچہ ابو عبد اللہ خفیف کے شاگرد و سیرت نگار ابو الحسن دیلمی نے سیرت شیخ میں، ابو عبد الرحمن سلمی نے طبقات الصوفیہ میں، اسی طرح شیخ الاسلام ہروی نے طبقات ص ۵۵۴ میں، ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء ج ۱۰ ص ۳۸۵ میں، ابن الجوزی نے منتظم ج ۷ ص ۱۱۲ میں، یافعی نے مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۳۹۷ میں، ذہبی نے العبر میں، سبکی نے طبقات شافعیہ ج ۲ ص ۱۵۴ میں، عبد الحی بن العماد نے شذرات الذہب ج ۳ ص ۷۷ میں، اور داراشکوہ نے سفینۃ الاولیاء ص ۱۱۱ میں ۳۷۱ھ ہی لکھا ہے،

---

[1] معارف ص ۱۰۷ و ۱۱۶

ادبیات

شانِ مصطفائی

از
جناب وارث القادری

جنتِ چشمِ تر نہیں ملتی — یعنی وہ رہگذر نہیں ملتی
جب تک ان کی نظر نہیں ملتی — نگہِ حق نگر نہیں ملتی
خلق کی کچھ خبر نہیں ملتی — آپ سے بیشتر نہیں ملتی
نعمت، اللہ کی وہ کونسی ہے — جو محمدؐ کے گھر نہیں ملتی
مشرق و مغرب و جنوب و شمال — ان کی رحمت کدھر نہیں ملتی
منزلِ حق بغیر عشقِ رسولؐ — بخدا عمر بھر نہیں ملتی
اہلِ طیبہ کی شام ہے جیسی — ہم کو ویسی سحر نہیں ملتی
شبِ معراج جبرئیلؑ کو بھی — ان کی گردِ سفر نہیں ملتی
واہ کیا شانِ مصطفائی ہے — جو بہ ذاتِ دگر نہیں ملتی

رحمتِ مصطفیٰ کہاں وارث
ہو بہو، سربسر نہیں ملتی

ساقی!

از جناب قمرؔ سنبھلی

وہ پہلا سا سماں اگلی سی وہ باتیں کہاں ساقی
زمیں ہم سے پھری بدلا ہے یکسر آسماں ساقی

وہ دورِ میکشی وہ جام، وہ بادہ کہاں ساقی
کہ رندانِ قدح کش آج ہیں فاقہ کشاں ساقی

یقیناً منتشر ہوگی مثالِ کہکشاں ساقی
ابھر کر مطلعِ عالم پہ میری داستاں ساقی

نشیمن کے بنانے میں حوادث تو نہیں حائل
غضب یہ ہے مخالف ہوگیا ہے باغباں ساقی

ہمیں کیا گردشِ دوراں مٹائے گی زمانے سے
ہمارا تذکرہ ہے داستاں در داستاں ساقی

بزعمِ جہل اسے راحت کدہ سمجھے ہیں دیوانے
یہ دنیا درحقیقت ایک ہے خوابِ گراں ساقی

نشانِ راہِ منزل رہ گیا چھپ کر غباروں میں
زمیں سے تا فلک اڑتی ہے گردِ کارواں ساقی

نظامِ میکدہ برہم کیا دورِ زمانہ نے
نہ وہ میخوار ہیں باقی نہ وہ پیرِ مغاں ساقی

بھرے گلشن پر اب تو دور دورہ ہے بلاؤں کا
ستم ہے فتنہ پرور گلستاں در گلستاں ساقی

یہ کیسا سرخ جوڑا مادرِ گیتی نے بدلا ہے
فضائے دہر سرتاسر ہوئی ہے خونفشاں ساقی

جہاں میخانۂ ہستی کے رہبر راہ زن نکلیں
سلامت کیوں بھلا منزل پہ پہنچے کارواں ساقی

کہاں قرآں چھپے جا کر کدھر ایماں اماں پائے
تُلے ہیں دیں فروشی پر حرم کے پاسباں ساقی

اسی کا عکسِ رخ ہے مہر و مہ کلیوں میں پھولوں میں
منور ہے اسی کے نور سے سارا جہاں ساقی

قمرؔ کیا کوئی بھی مقصد کو اپنے پا نہیں سکتا
مخالف جس کے ہو جائیں زمین و آسماں ساقی

غزل

از

جناب محمد منشاء الرحمٰن خاں صاحب منشاء

سطحی علم کے فیضان سے ہم باز آئے
اے خرد چل ترے احسان سے ہم باز آئے

جس کا مقصود نظر صرف ہوس ناکی ہو
ایسی رنگینیٔ وجدان سے ہم باز آئے

اور ہیں وہ سر و سامان پہ جو مرتے ہیں
آرزوئے سر و سامان سے ہم باز آئے

کسی صورت بھی سکون دل کو نہیں ہے حاصل
زیست کے نت نئے ہیجان سے ہم باز آئے

"سانس لیتے ہیں تو زخموں سے لہو رستا ہے"
اپنے اس حالِ پریشان سے ہم باز آئے

رنگ و بو کے لیے ترسیں تو کہاں تک ترسیں
بس بہارِ گل و ریحان سے ہم باز آئے

آس ہی آس پہ جینے کی بھی حد ہوتی ہے
آپ کے وعدہ و پیمان سے ہم باز آئے

اپنی ہستی سے بھی ہم ہونے لگے بیگانے
تم کو اپنانے کے ارمان سے ہم باز آئے

شعر ہی جان ہو منشاؔ، تو کوئی بات بھی ہے
صرف الحان ہی الحان سے ہم باز آئے

مطبوعات جدیدہ

کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ - از امام محمد بن حسن الشیبانی - صفحات ۵۸۸ -
ٹائپ عمدہ، ناشر لجنۃ احیاء المعارف النعمانیۃ حیدرآباد دکن

دوسری صدی ہجری میں حدیث و آثار کے جو مجموعے مرتب ہوئے ان میں امام محمد کی کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ بھی ہے، اس موضوع پر امام محمدؒ نے کئی کتابیں لکھی ہیں، مگر اسی کتاب کو ایک خاص خصوصیت حاصل ہے، یہ کتاب اس سے بہت پہلے ہندوستان میں چھپ چکی ہے، اب اسے متعدد نسخوں کی مدد سے لجنۃ احیاء النعمانیہ نے دوبارہ شائع کیا ہے، اصل متن تو ایک جلد سے زیادہ نہیں ہے، مگر اس پر مفتی مہدی حسن صاحب نے مفصل حاشیہ لکھا ہے، اس لیے اب اس کو تین جلدوں میں شائع کیا جا رہا ہے، یہ پہلی جلد ہے جس میں طہارت، صلوٰۃ، صوم اور زکوٰۃ کے ابواب ہیں،

امام محمدؒ امام مالکؒ کی خدمت میں تین برس تک رہے، اس مدت میں انھوں نے ان سے اور مدینہ منورہ کے دوسرے شیوخ حدیث سے پورا استفادہ کیا، امام مالک سے تقریباً نوسو سے زیادہ حدیثیں سماع کیں، جنھیں انھوں نے موطا میں جمع کر دیا ہے، یہ چونکہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کی صحبت سے فیضیاب ہو کر امام مالکؒ کی خدمت میں گئے تھے، اس لیے درس میں امام مالک سے اہل مدینہ کے مسلک کے بارے میں بہت سے عالمانہ سوالات کرتے تھے، اور امام مالکؒ ان کا جواب دیتے تھے، درس سے باہر بھی مدینہ کے دوسرے شیوخ سے ان کے مباحثے ہوتے رہتے تھے، وہ اہل مدینہ کے مسلک کے دلائل بیان کرتے اور یہ اہل کوفہ کے مسلک کی وکالت کرتے تھے، انھی مباحثوں اور

دلائل کو امام محمد نے کتاب الحجۃ میں جمع کر دیا ہے، کتاب کے راوی ان کے مشہور شاگرد عیسیٰ بن ابان ہیں، کتاب میں وہ سب سے پہلے امام ابو حنیفہ کی رائے نقل کرتے ہیں، پھر امام مالک یا اہل مدینہ کی رائے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ پھر امام صاحب کے مسلک کے دلائل حدیث و آثار لاتے ہیں، پھر اہل مدینہ کے دلائل لاکر اس پر اپنا رد و مناقشہ پیش کرتے ہیں، اس کتاب کی اشاعت سے ایک طرف یہ پتہ چلتا ہے کہ امام صاحب کی نظر حدیث و آثار پر کتنی وسیع اور گہری تھی، دوسری طرف ان کے دلائل کا علم براہ راست راوی اول کے ذریعہ ہوتا ہے، جس سے پورا اطمینان پیدا ہوتا ہے، اس کتاب میں امام محمدؒ نے سَو سے زیادہ شیوخِ حدیث کی روایتوں سے استدلال کیا ہے، اس لیے اس کی اشاعت ایک دینی خدمت بھی ہے، جس سے فقہ حنفی کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں،

المنتخب - از عبد الرحمٰن بن حمد بن زید المغزی، صفحات ۳۱۶ ٹائپ عمدہ، ناشر المکتبۃ الاسلامیہ للطباعۃ و النشر دمشق۔

عبد الرحمن بن حمد المغزی نے مختلف کتابوں سے انتخاب کرکے تمام مشہور قبائل کے انساب کو جمع کر دیا ہے، اسی کے ساتھ ایک اور رسالہ اسی میں شامل کر دیا گیا ہے، شروع میں حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کی اولاد کا تذکرہ ہے، پھر مملکت سبا کا ذکر ہے، اس کے بعد حجاز، یمن، حضرموت، مہرہ، نجد وغیرہ کے قبائل کی تفصیل ہے، تاریخ اور انساب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب بڑی دلچسپی کا سبب ہوگی۔

ترجمان القرآن - از مولانا ابو الکلام آزادؒ، صفحات ۵۵۴، ٹائپ متوسط کاغذ معمولی، ناشر ساہتیہ اکاڈمی نئی دہلی، قیمت :- عنہ۲۰

مولانا ابو الکلام آزادؒ کی تفسیر ترجمان القرآن کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے، مگر اب بہت کم ملتی ہے۔

اس لیے ساہتیہ اکیڈمی نے اس کو تصحیح، ترتیب اور تہذیب و تحشیہ کے جملہ لوازم اور مکمل انڈکس کے
ساتھ بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، پہلے اڈیشنوں میں پہلی جلد سورۂ انعام تک کی تفسیر
پر مشتمل تھی جس میں سورہ فاتحہ کی تفسیر جو مولانا کا شاہکار اور اس تفسیر کی جان ہے کئی سو
صفحوں میں تھی، اسی لیے ساہتیہ اکیڈمی نے اس کو ایک مستقل جلد بنا دیا ہے، اور پہلی جلد اسی
پر مشتمل ہے، نفس تفسیر پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس لیے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں،
ٹائپ اور کاغذ میں اس سے زیادہ اہتمام ہو سکتا تھا، تاہم یہ بھی غنیمت ہے، مولانا کی تصنیف
کی اشاعت کا مقصد افادۂ عام ہے، اس لیے قیمت کم رکھنا چاہیئے تھا تاکہ شائقین زیادہ سے
زیادہ استفادہ کر سکیں، ساہتیہ اکیڈمی ترجمان القرآن کی اشاعت پر قابل مبارکباد ہے
کہ اس نے اردو زبان کے اس خالص اسلامی لٹریچر کو عام کرنے کی کوشش کی ہے۔

انوار بردہ۔ از پروفیسر فضل عارف صاحب، صفحات ۲۸۸، کتابت و طباعت
متوسط، ناشر علمی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور، قیمت ۳ ؎

نعت نبوی ایک مستقل صنف شاعری ہے، اس کی ابتدا قرآن کے نزول کے ساتھ ہی
ہوئی، اس صنف میں عہد نبوی سے اب تک عربی، فارسی، اردو اور دوسری زبانوں میں بیشما
نعتیہ قصیدے اور نعتیہ غزلیں لکھی گئی ہیں، عربی زبان میں جن نعتیہ قصائد کو شہرت دوام حاصل
ہوئی ان میں کعب بن زہیر اور بوصیری کے قصیدے سرفہرست ہیں، خاص طور سے بوصیری
کا قصیدہ میمیہ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کاغذ کی سیاہی سے نہیں بلکہ خون دل سے لکھا گیا ہے
کہ سات صدی گذرنے کے بعد بھی اس کا درد و سوز اور اس کی کشش اور تاثیر کم نہیں ہوئی ہے
سوز و دروں کے ساتھ اس میں زبان کی جو سلاست، بیان کی حلاوت اور ترکیب، محاورہ کی رعایت
ہے وہ کم قصیدوں کو نصیب ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ قصیدہ ہمارے نصاب تعلیم کا ہمیشہ

جزبا ہے، اس کی عربی، فارسی اور اردو میں بکثرت شرحیں لکھی گئیں، پروفیسر فضل عارف صاحب جو اس سے پہلے فلسفۂ دعا اور استخارہ حکمت جیسی کتابیں لکھکر اہل علم اور اہل دل سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں، بوصیری کی اس داستان عشق نبوی کی شرح لکھکر انھوں نے اپنے عشق و درد دل کا ایک مزید ثبوت فراہم کیا ہے۔

تجلیات کعبہ و تجلیات مدینہ - از مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی، صفحات ۳۱۵ و ۲۵۴، کتابت و طباعت بہتر، ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی، ہر ایک کی قیمت عہ

مولانا احتشام الحسن صاحب متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جو تبلیغی حلقوں میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں، مولانا چونکہ بہت سے بزرگوں، خاص طور پر مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی صحبت اٹھائے ہوئے ہیں، اس لیے ان کی تحریروں میں ایک خاص طرح کی کیفیت و تاثیر ہوتی ہے، یہ دونوں کتابیں ان کی اس کیفیت باطنی کا مظہر ہیں، پہلی کتاب میں انھوں نے کعبہ مکرمہ کے آداب، اس کے فضائل اور حج کے ارکان وغیرہ کی بڑی والہانہ انداز میں تفصیل کی ہے، اور دوسری کتاب میں حرم نبوی کے آداب و کوائف کا بڑے پُرسوز انداز میں ذکر کیا ہے، یہ دونوں کتابیں عام مسلمانوں اور خاص طور پر حاجیوں کے مطالعہ کے لائق ہیں۔

اخلاق محسنی (اردو ترجمہ) - از ملا حسین واعظ کاشفی، ترجمہ قاضی سجاد حسین صاحب، صفحات ۴۰۴، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر سب رنگ کتاب گھر، دہلی، قیمت للعہ

نصف صدی پہلے تک اخلاقی و مذہبی کتابوں کو ہمارے نصاب تعلیم میں بنیادی حیثیت حاصل تھی اور انھیں ہندو مسلمان سب پڑھتے تھے، مگر رفتہ رفتہ اب یہ کتابیں نصاب سے خارج ہوتی جارہی ہیں، جس کی وجہ سے ہماری نوجوان نسل میں اخلاقی قدریں کم سے کم ہوتی جارہی ہیں، انہی کتابوں میں ملا حسین واعظ کاشفی متوفی سنہ ۹۱۰ھ کی فارسی کتاب اخلاق محسنی بھی ہے؛

برسوں نصابِ تعلیم کا جز رہی ہے، فارسی کا مذاق اب بالکل باقی نہیں رہا، اس لیے اس کے اردو ترجمہ کی ضرورت تھی، اس ضرورت کو مولانا قاضی سجاد حسین صاحب نے پورا کر دیا ہے، اس سے پہلے قاضی صاحب گلستاں، بوستاں اور دیوان حافظ وغیرہ کا ترجمہ بھی کر چکے ہیں، ترجمہ نہایت سلیس اور معنی خیز ہے۔

چند ادبی مسائل۔ از پروفیسر شاہ مقبول احمد صاحب، صفحات ۱۷۵، کتابت و طباعت معمولی، ناشر مکتبہ صنم، سبزی باغ، پٹنہ عہ۱۲

پروفیسر شاہ مقبول احمد صاحب اردو ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، ان کو زندگی کے نشیب وفراز سے بھی سابقہ رہا ہے، اس لیے ان کی تحریروں میں واقعیت ہوتی ہے، وہ آغاز جوانی یعنی سنہ ۱۹۴۰ء سے سنہ ۱۹۶۰ء تک برابر ادبی ولسانی موضوعات پر مضامین لکھتے رہے ہیں، جن میں کئی مضمون اردو کے مشہور رسالوں مثلاً اردو وسہاہی وغیرہ میں بھی شائع ہو چکے ہیں، اب ان ہی مضامین کو "چند ادبی مسائل" نام سے کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، اس مجموعے میں کل ۱۳ مضامین ہیں اور تقریباً ہر مضمون دلچسپ اور پُرمعلومات ہے، خاص طور پر اردو یا ہندوستانی، اردو ہندی اور بہار کے دیہاتی محاورے وغیرہ ان کے بہترین مضمون شمار کیے جا سکتے ہیں، امید ہے کہ یہ مجموعہ عام اور باذوق اور خاص طور پر بہار کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خاصا مقبول ہوگا۔

حکیم الاوقات۔ از مولوی عبدالحکیم صاحب ایم اے سی سی، صفحات ۱۶، کتابت و طباعت عمدہ، پتہ فہیم الدین انصاری، قصبہ سرائے میر، اعظم گڈھ، قیمت ۴ر

جناب مولانا عبدالحکیم صاحب لکچرر شعبۂ تعلیمات شبلی کالج کو علم ہیئت سے فطری مناسبت ہے، انھوں نے قدیم وجدید دونوں ہیئتوں کا مطالعہ کیا ہے، ہندوستان کی رصدگاہوں سے ان کی خط وکتابت بھی رہی ہے، اس موضوع پر وہ علمی وعملی کام بھی کرتے رہے ہیں، انھوں نے اس کتاب

اوقات طلوع وغروب اور صبح صادق اور نصف النہار کی پوری تفصیل بڑی تحقیق سے کی ہے، انھوں نے شروع میں دو تین صفحے کا جو مختصر دیباچہ لکھا ہے وہ بہت ہی عمدہ اور مؤثر ہے، اس کے پڑھنے سے وقت کی قدر و قیمت دل میں پیوست ہو جاتی ہے، نمازیوں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔

اوراق مصوّر - از سکندر علی وجد، صفحات ۲۰۸، ٹائپ اعلیٰ، کاغذ عمدہ، مع گرد پوش

ناشر مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، قیمت : معثر

سکندر علی وجد اس دور کے نامور شعراء میں ہیں، اس سے پہلے ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، یہ تیسرا مجموعہ ہے، اس مجموعے کی ترتیب اصناف شاعری کے اعتبار سے نہیں بلکہ مسلسل ہے، یعنی ایک غزل پھر اس کے مقابلہ میں ایک نظم اس طرح پورا مجموعہ غزلوں اور نظموں کا مرقع بن گیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ "شاعری میں نئے تجربے کرنے کی مجھے فرصت نہیں ملی"، غالباً یہ عدیم الفرصتی ہی ان کی شاعری کا حسن ہے، انھوں نے جدت و ترقی پسندی کی سب وادیوں کی سیر کی ہے، مگر صرف اس کی خوبیوں کو لیا ہے، اور اس کے نقائص و عیوب سے بڑی حد تک اپنی شاعری کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے، اس لیے ان کا کلام اردو شاعری کی ادبی روایات کے اعتبار سے بھی بلند پایہ ہے، ان کو نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے، اور ان کے کلام میں دونوں کے بہترین نمونے ملتے ہیں، خاص طور پر ان کی بعض نظمیں مثلاً اجنتا، الیورا، اورنگ آباد، جگنو، وغیرہ تو شاہکار ہیں، اردو دواوین کے ذخیرہ میں اس سے ایک عمدہ اضافہ ہوا ہے۔

'م - ج'

جلد ۹۶ ماہ رجب المرجب ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۶۵ء عدد ۵

مضامین

شذرات

جمعیۃ علمائے ہند کی بنیاد بڑی مقدس ہستیوں کے ہاتھوں پڑی تھی اور ان کے کارناموں کی ایک شاندار تاریخ ہے، لیکن اس کا "شاندار ماضی" حال کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے، جمعیۃ کی آخری شخصیت مولانا حفظ الرحمن مرحوم تھے جنھوں نے اس کے وقار اور روایات کو قائم رکھا، ان کے بعد کوئی ایسی مضبوط شخصیت نہیں رہ گئی جو اس بار کو پوری طرح سنبھال سکتی، اس لیے ان کی آنکھ بند ہوتے ہی جمعیۃ میں انتشار، پارٹی بندی، حصول اقتدار کی جنگ اور ایک دوسرے کے خلاف بیانات اور پمفلٹ بازی کا مستقل سلسلہ شروع ہو گیا، اور علمائے کرام کی جماعت نے اس کے لیے ایسے ایسے نمونے پیش کیے جن کو دیکھ کر دنیا دار بھی انگشت بدنداں رہ گئے، اس بارہ میں ہمارا خیال ہمیشہ یہ رہا ہے کہ

رموز مملکت خویش خسرواں دانند گدا سب وادیوں کی روش

لیکن جمعیۃ کی خانہ جنگی اور اس کے وقار کو ختم ہوتے دیکھ کر ضبط نہ ہو سکا، اس لیے اس کے محترم اراکین کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کی، دور کے تماشائی اس کا فیصلہ تو نہیں کر سکتے کہ کون فریق حق پر ہے اور کون ناحق پر، کس کا بیان صحیح ہے کس کا غلط، لیکن دو باتیں غیر جانبدار لوگوں کی نگاہ میں بھی کھٹکتی ہیں، ایک مفتی عتیق الرحمن صاحب کے ساتھ نئی جمعیۃ کا سلوک، دوسرے مجلس مشاورت سے اس کی برأت، مفتی عتیق الرحمن صاحب کی شخصیت اور ان کے قومی اور ملی خدمات سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا، وہ جمعیۃ کے کاموں میں مولانا حفظ الرحمن مرحوم کے دست راست تھے اور اس کے پرانے رکن رکین ہیں، اس لیے ان کی وفات کے بعد وہ سب سے زیادہ ان کی جانشینی کے مستحق تھے، اس لیے جمعیۃ سے ان کو اکھاڑ پھینکنا صریح زیادتی ہے، اس سے بڑھ کر بدنما حرکت ان پر خیانت کا الزام اور اس کی تشہیر ہے جس کا تصور بھی کوئی شریف انسان مفتی صاحب کے متعلق نہیں کر سکتا، اور جس کی اصل حقیقت ان کے بیان سے ظاہر ہو گئی ہے، کیا ارباب جمعیۃ اس بارہ میں

حسن ظن اور تاویل سے کام نہیں لے سکتے تھے، اگر خدا نخواستہ یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو کیا ستر مومن کا تقاضا یہی تھا کہ ایک محترم شخصیت کو بدنام کرنے کے لیے مجلس میں اس پر بحث اور اخبارات میں اس کا اعلان کیا جائے، اس سے مفتی صاحب کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا، البتہ الزام لگانے والوں کی سیرت ظاہر ہو گئی،

دوسرا غلط اقدام مجلس مشاورت سے جمعیۃ کی تبری اور جمعیۃ کے ارکان پر اس میں شرکت کی بندش ہے مجلس مشاورت کوئی فرقہ وارانہ اور جمعیۃ کی حریف تنظیم نہیں، بلکہ ہر مکتب خیال کے مسلمانوں کی مشترکہ جماعت ہے جس میں قوم پرور مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے۔ ان میں ڈاکٹر سید محمود صاحب اور نسیم نوری جیسے پرانے اور پکے کانگریسی ہیں، جن کی قوم پروری پر کوئی حرف نہیں رکھا جا سکتا اور جن کی خالص قومی و وطنی خدمات جمعیۃ کے موجودہ اراکین سے کہیں زیادہ ہیں، اس کے اغراض و مقاصد میں کوئی چیز بھی قوم پروری کے خلاف نہیں بلکہ اس کا ایک بڑا مقصد قومی اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینا بھی ہے، اگر بالفرض جمعیۃ کے نقطۂ نظر سے اس میں کوئی بات قابل اعتراض ہے تو اس میں رہ کر اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیئے۔ نہ کہ اس پر فرد جرم لگا کر اس سے علیحدگی اختیار کی جائے، حکومت اور اکثریت کی نگاہ میں اسکو مشکوک بنایا جائے، اور ارکان جمعیۃ کے لیے اس کو شجر ممنوعہ قرار دیا جائے، حیرت ہے کہ جمعیۃ نے ایسا غلط فیصلہ کس طرح کیا، جمعیۃ کا وقار اور اس کی عظمت مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی ان کی خدمت اور ان میں مقبولیت سے وابستہ ہے، اگر وہ اس فیصلہ پر قائم رہی تو ممکن ہے اس کو ایک خاص طبقہ کی داد و تحسین اور حکومت کی خوشنودی حاصل ہو جائے، لیکن مسلمانوں کی نگاہوں سے اس کا وقار بالکل ختم ہو جائے گا، ابھی ۵ نومبر کو اخبار مدینہ نے دار العلوم دیوبند کے بارہ میں جمعیۃ والوں کے جس منصوبے کی خبر دی ہے اگر وہ صحیح ہے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے سوا اور کیا کہا جائے کاش ارباب جمعیۃ کو اسکا احساس ہو جائے کہ ان کی یہ روش ان کو کس منزل کی طرف لیجا رہی ہے۔ ہم نے یہ باتیں بڑے دکھ لیکن اخلاص کے ساتھ لکھی ہیں بشرطیکہ جمعیۃ کے محترم ارکان کی نگاہ میں بھی قابل توجہ ٹھہریں۔

یہ سطریں لکھی جا چکی تھیں کہ جمعیۃ کے اختلافات کو ختم کرنے کیلئے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا اسعد مدنی
کی اپیل نظر سے گذری، یہ خوشخبری ہر مسلمان کے لیے باعث مسرت ہے، اس سے بڑھ کر مبارک خیال اور کیا
ہو سکتا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فریقین کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، اور جمعیۃ کا وقار مسلمانوں میں باقی رہ جائے۔
مگر اس کا افسوس بھی ہے کہ علمائے کرام کے اختلاف کو دور کرنے کے لیے حکومت کے وزراء، مسٹر ہمایوں کبیر، جنرل شاہ نواز
اور جناب نور الدین احمد کو درمیان میں آنا پڑا، بہر حال اصلاح ذات البین ہر مسلمان کا فریضہ ہے، اگر ان کے
ذریعہ بھی اصل مقصد حاصل ہو جائے اور ارباب جمعیۃ میں پائیدار مفاہمت کی کوئی شکل نکل آئے تو بھی غنیمت ہے۔

سیکولر یا سیکولرزم ایک علمی و سیاسی اصطلاح ہے جس کے معنی غیر مذہبی یا عقلی انداز فکر کے ہیں اور اس کا
اطلاق عام طور سے حکومت اور اس کے اداروں پر ہوتا ہے۔ سیکولر حکومت وہ کہلاتی ہے جس کا خود کوئی
مذہب نہ ہو، وہ سارے مذاہب کو ایک نظر سے دیکھتی ہو اور مذہب کی بنا پر اپنے کسی شہری کے ساتھ کوئی فرق
و امتیاز نہ کرتی ہو، اس اعتبار سے جن ملکوں میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بستے ہوں ان کے لیے سب سے بہتر
سیکولر نظام حکومت ہے، چنانچہ ہندوستان کی حکومت بھی سیکولر ہے لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے ایک طبقہ نے
سیکولر کے معنی میں اتنی وسعت پیدا کر دی ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں رہ گیا ہے مثلاً
سیکولر مسلمان، سیکولر ہندو، سیکولر یونیورسٹی، الفاظ کے بے محل استعمال کی ایسی مثالیں بھی کم ملیں گی، اگر
سیکولرزم کی وسعت کا یہی حال رہا تو کھانا اور پانی بھی سیکولر اور غیر سیکولر کہلانے لگیں گے۔ ترکاری سیکولر
کھانا ہے اور گوشت غیر سیکولر، اگر سیکولر کو مذہبی بے تعصبی اور رواداری کے معنی میں استعمال کیا جائے
تو یہ اصطلاح پہلے سے موجود ہے، سیکولر کو جا و بیجا استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے، لیکن مطلب سعدی
دیگر است، ہندوستان کی آزادی کے بعد "الناس علی دین ملوکہم" (اب بادشاہت کے بجائے جمہوری
حکومت ہے) کے اصول پر مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس نے سیکولر حکومت کے ساتھ
یکرنگی پیدا کرنے کے لیے سیکولر مسلمانوں کی ایک قسم ایجاد کی ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہمیشہ
سے ہوتی چلی آئی ہے، لو ایان اودھ کے زمانہ میں "حسینی ہندو" تھے، جن کے باقیات شاید اب بھی
کہیں موجود ہوں۔ "سیکولر مسلمان" بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مقالات

امام محمدؒ کی کتاب الحجۃ علیٰ اہل المدینہ[1]

از

جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد نے بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے مخلص بانی اور صدر حضرت مولانا ابوالوفا صاحب افغانی کے تعاون سے ائمہ احناف کی امہات کتب کو پہلی بار شائع کرکے حدیث و فقہ کے ذخیرہ میں بڑا قابل قدر اضافہ کیا ہے، اور کہنا چاہیے کہ فقہ حنفی کو براہ راست اس کے بانیوں اور اماموں کی کتابوں سے معلوم کرنے اور سمجھنے کی راہ پیدا کی ہے، ورنہ عام طور سے علمائے احناف نے اپنے اصلی ماخذوں سے ہٹ کر متاخرین علمائے عجم خصوصاً فقہائے ماوراء النہر کی کتابوں ہی کو سب کچھ سمجھ لیا تھا جس سے اس الزام کو بڑی مدد ملی کہ فقہ حنفی احادیث و آثار سے ہٹ کر قیاس اور رائے پر مبنی ہے، قدیم علمائے حجاز و عراق کی معاصرانہ چشمک اور بعض متاخرین کی الزام تراشی کے بعد فقہ حنفی پر سب سے بڑا ظلم خود احناف نے کیا ہے کہ انھوں نے امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ وغیرہ رحمہم اللہ کی ان تصانیف و کتب کو بہت کم ہاتھ لگایا، جن میں دوسرے مکاتب فقہ کی طرح حنفی فقہ کے اصول و فروع کو کتاب و سنت اور آثار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے، اور صرف ضرورت کی حد تک قیاس اور رائے سے کام لیا گیا ہے۔

---

[1] قیمت ۔۔۔ ملنے کا پتہ: لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ۔ ۶۵ ہم جلال کوچہ، حیدرآباد دکن

لجنۂ احیاء المعارف النعمانیہ نے ۱۳۳۰ھ سے دنیائے اسلام اور یورپ وایشیا کے مختلف کتب خانوں کو کھنگال کر ائمۂ احناف کی گیارہ اہمات کتب شائع کی ہیں، امام ابو یوسفؒ کی کتاب الآثار، کتاب الرد علی سیر الاوزاعیؒ، کتاب اختلاف ابی حنیفہؒ وابی لیلیٰؒ، امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی الجامع الکبیر، کتاب النکت للسرخسی شرح زیادات الزیادات للامام محمد، مختصر الطحاوی فی الفقہ، اور اخیر میں کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ للامام محمدؒ جیسی بیش بہا اور نادر ونایاب کتابیں دنیا کو پہلی بار اسی ادارے کی بدولت نصیب ہوئیں، اس کے صدر محترم اور ارکان اپنی اس خاموش اور ٹھوس علمی ودینی خدمت پر پوری دنیائے اسلام کے شکریہ کے مستحق ہیں، خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اس ادارہ کے پاس نہ کوئی خاص سرمایہ ہے، نہ اس کا کوئی پروپیگنڈا ہے، اور نہ اس کے ممبروں اور بہی خواہوں کی کوئی جماعت ہے، صرف توکل اور خدمت اس کا سرمایہ ہے۔

لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ کا تازہ شاندار کارنامہ حضرت امام محمد بن حسن شیبانی متوفی ۱۸۹ھ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ کی اشاعت ہے، اس کا پہلا حصہ حال ہی میں چھپ کر شائع ہوا ہے، حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور فقہ حنفی کے ثالثہ الاثافی امام محمدؒ کوفہ میں امام ابو حنیفہؒ سے تعلیم حاصل کر کے مدینہ منورہ گئے، تاکہ وہاں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ائمۂ مدینہ سے فقہ وحدیث کی تعلیم حاصل کریں، مدینہ منورہ میں تین سال رہ کر امام مالکؒ سے مؤطا کا سماع کیا، اور اس دوران میں ان سے اور اہل مدینہ سے فقہی مسائل پر جو بحثیں ومناظرے ہوئے ان کے نتائج ودلائل کو قلمبند کر کے اس مجموعہ کا نام کتاب الحجۃ علی اہل المدینۃ رکھا، جب مدینہ سے عراق واپس ہوئے تو ان کے تلامذہ نے ان سے اس کتاب کی روایت کی، جن میں قاضی بصرہ امام عیسیٰ بن ابان ابن صدقہ متوفی صفر ۲۲۱ھ کی روایت زیادہ مشہور ہے، علمائے کوفہ نے اس کتاب کو بڑی اہمیت دی، اور اس سے نفع اٹھایا، اور مدتوں عالم اسلام میں اس کا چرچا رہا، مگر ائمۂ احناف کی بہت سی

کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی متاخرین کی لاپروائی کی ایسی نذر ہوئی کہ اہل علم کی تلاش کے باوجود اس کا پتہ نہیں چلتا تھا، مگر اب لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ کی سعی مشکور سے فقہ اسلامی کا یہ عظیم الشان ذخیرہ علمائے امت کے سامنے آگیا ہے،

اب سے بیس سال پہلے لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ نے اس کتاب کو اپنے اشاعتی نظام میں سرفہرست رکھکر اس کی تلاش و جستجو شروع کی تھی، اور صرف مدینہ منورہ کے کتب خانہ محمودیہ میں اس کا ایک ناقص، نامکمل اور سقیم مخطوطہ مل سکا تھا، مزید تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ اس کے دو قلمی نسخے اور ہیں، ایک آستانہ کے کتب خانہ نور عثمانیہ میں، دوسرا حیدرآباد کے جامعہ نظامیہ کے کتب خانہ میں جسے مولانا انوار اللہ صاحب نے اپنے لیے مدینہ منورہ کے نامکمل نسخہ سے نقل کرایا تھا، آستانہ کے نسخہ کا فوٹو منگایا تو معلوم ہوا کہ یہ بھی مدینہ منورہ کے نسخہ ہی کی نقل ہے، اس طرح کتاب الحجۃ کے یہ تینوں نسخے درحقیقت ایک ہی تھے، مولانا انوار اللہ صاحب حیدرآبادی کے نسخہ کو اصل قرار دے کر اس کی تحقیق و تعلیق کی خدمت جناب مولانا مفتی مہدی حسن صاحب شاہجہانپوری کے سپرد کی گئی، موصوف دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم اور فقہ حنفی کے اہل نظر علماء میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں، مفتی صاحب نے اپنے علمی و دینی، تعلیمی اور تصنیفی مشاغل کے ساتھ اس کتاب کی تصحیح و تعلیق کو بھی جاری رکھا اور کامل بیس سال میں یہ شاہکار مکمل کیا، اور حق یہ ہو کہ مفتی صاحب نے اپنے ذوق و شوق سے اس عظیم فقہی ذخیرہ کی خدمت کا پورا حق ادا کیا ہے، یہ تعلیق و تحشیہ درحقیقت مکمل شرح ہے، مستقل شرح شاید اس سے بہتر نہیں ہو سکتی تھی، اس حاشیہ یا شرح کی وجہ سے کتاب بہت طویل ہوگئی ہے، اور ایک جلد کے بجائے تین چار جلدوں میں مکمل ہوگی، لیکن اس طول بلا غیر مخل نے کتاب کی اہمیت و افادیت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے، جگہ جگہ حضرت مولانا ابوالوفا صاحب افغانی نے بھی اپنے محققانہ حواشی سے اسے مزین فرمایا ہے، اس طرح ہندوستان کے دو طبقہ یا حنفی محقق علماء کی توجہ سے کتاب الحجۃ علم و تحقیق کی بزم میں شمع فروزاں بن گئی ہے، خوشی کی بات ہے کہ حکومت ہند

کی وزارت تعلیم نے بھی اس کی اشاعت میں اعانت کی ہے، اس لیے وہ بھی شکریہ کی مستحق ہے،

اس کتاب کی پہلی جلد مع تعلیقات کے ۴۹۵ صفحات میں آئی ہے، اوپر کتاب الحجۃ کا متن جلی حروف میں اور نیچے اس کی تعلیق و تحقیق باریک حرفوں میں ہے، طباعت بہترین مصری ٹائپ میں کی گئی ہے،

اس جلد میں طہارت، صلوٰۃ، صوم اور زکوٰۃ کے مباحث ہیں، آئندہ جلدوں میں مناسک، بیوع، مضاربہ، وقف، شفعہ، نکاح، طلاق، مساقات، مزارعت اور فرائض کے ابواب ہوں گے، قصاص و دیت کا تکملہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الام سے لیا گیا ہے، امام شافعیؒ نے کتاب القصاص والدیۃ میں امام محمدؒ کا رد کرنے کے لیے ان کے اقوال نقل کیے ہیں، وہیں سے یہ حصہ لیا گیا ہے،

اس کتاب میں امام محمدؒ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر مسئلہ میں پہلے اپنے شیخ امام ابوحنیفہ کا قول نقل کرتے ہیں، پھر اس کے مقابلہ میں اہل مدینہ کا قول نقل کرکے امام ابوحنیفہ کے قول کی تائید میں اپنے طُرق سے احادیث و آثار بیان کرتے ہیں، اور اہل مدینہ پر ان ہی کے اصولوں کے مطابق حجت قائم کرتے اور احادیث و آثار اور قیاس کی رو سے فقہ و حدیث کی باریکیوں کو بیان کرتے ہیں، مگر اس علمی و دینی مباحثہ میں حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اور بہت سے مسائل میں اہل مدینہ کی تائید کی ہے، اور ان کے مسلک کو اپنا مسلک قرار دیکر امام ابوحنیفہ سے اختلاف کیا ہے، اس کتاب میں امام محمدؒ فقہائے اہل الحدیث کے صدر نشین نظر آتے ہیں، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر امام محمدؒ اور امام ابویوسفؒ اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ساتھ نہ ہوتے تو یہ دونوں حضرات بھی امام ثوری، امام اوزاعی، اور امام حسن بصری کی طرح اپنے مستقل کمتبِ فقہ کے مالک ہوتے، اور ان کا فقہی مسلک بھی دنیائے اسلام میں اسی طرح صدیوں جاری رہتا، جس طرح فقہ اوزاعی، فقہ ثوری اور فقہ حسن بصری کا رواج رہا ہے،

کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ سے فقہ حنفی کا یہ اصول پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ حدیث ضعیف

اور خبر مرسل کے ہوتے ہوئے قیاس سے کام نہیں لیا جا سکتا، اور ایک صحابی کا قول و فعل بھی جب تک صحابہ میں سے کوئی مخالف نہ ہو قیاس سے اولیٰ ہے، امام مالکؒ اور اہل مدینہ حدیث مرسل، حدیث منقطع بلاغات (بلغنا و بلغنی) اور قول صحابی کو قیاس پر مقدم کرتے ہیں، اور ان کی موجودگی میں قیاس سے کام نہیں لیتے۔

ائمۂ اربعہ میں امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ رائے اور قیاس میں زیادہ مشہور ہیں، اور دونوں اپنے شرائط کے مطابق شدید ضرورت کے وقت قیاس سے کام لیتے ہیں، یہ دونوں فقہی مکاتب صحابۂ کرامؓ میں فقہائے سبعہ (حضرات عمرؓ، علیؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، زیدؓ، عائشہ رضی اللہ عنہم) کے فقہی مسلک کے آئینہ دار ہیں، امام ابوحنیفہ قرآن و حدیث اور اجماع کے بعد حضرت علیؓ اور عبد اللہ ابن مسعودؓ کو حجت مانتے ہیں، اور امام مالکؒ قرآن و حدیث اور اجماع کے بعد حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کو،

امام محمدؒ نے کتاب الحجہ میں ان دونوں مسلکوں سے ان کے اصولوں کو پیش نظر رکھکر بحث کی ہے، چنانچہ باب افتتاح الصلوٰۃ و ترک الجہر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں امام ابوحنیفہ کا قول نقل کرنے کے بعد اہل المدینہ کا قول نقل کیا ہے کہ حسب روایت ابن عمرؓ افتتاح صلوٰۃ کی طرح رکوع، قومہ اور سجدہ کے وقت بھی رفع یدین کرنا چاہیے، پھر لکھتے ہیں :-

وقال محمد بن الحسن: جاء الثبت	امام محمد بن حسن فرماتے ہیں، ثقہ و ثابت
عن علی بن ابی طالب، وعبد اللہ	ات حضرت علیؓ اور عبد اللہ بن مسعودؓ
بن مسعود، انهما کانا لا یرفعان	کے متعلق یہ ہے کہ یہ دونوں تبرک
فی شیٔ من ذلك الا فی تکبیرة	صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے
الافتتاح فعلی بن ابی طالب	تھے اور ان دونوں حضرات کو رسول اللہ

وعبد الله بن مسعود كانا اعلم
برسول الله صلى الله عليه وسلم
من عبد الله بن عمر لانه بلغنا
ان رسول الله صلى الله عليه وسلم
قال اذا اقيمت الصلوة فليلينى
منكم اولوا الاحلام والنهى،
ثم الذين يلونهم، ثم الذين
يلونهم، فلا نرى ان احدا كان
يتقدم على اهل بدر مع رسول الله
صلى الله عليه وسلم اذا صلى فنرى
ان اصحاب الصف الاول و
الثانى اهل بدر ومن اشبههم
فى مسجد المسلمين، وان عبد الله
بن عمر رضى الله عنهما دونه
من فتيانهم خلف ذلك. فنرى
ان عليا وابن مسعود رضى الله عنهما
ومن اشبههما من اهل بدر
اعلم بصلوة رسول الله صلى الله عليه
لانهم كانوا اقرب اليه من غيرهم

صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں حضرت عبداللہ
ابن عمرؓ سے زیادہ علم و واقفیت حاصل تھی،
کیونکہ ہم کو خبر ملی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب
نماز کھڑی ہو تو عقل و فراست رکھنے والے
لوگ میرے قریب رہیں، پھر اسی طرح درجہ بدرجہ
لوگ کھڑے ہوں۔ ایسی صورت میں ہم
کسی طرح باور نہیں کر سکتے کہ جو لوگ
آپ کے ساتھ غزوۂ بدر میں شریک تھے
ان سے اس وقت جب آپ نماز
پڑھاتے تھے، کوئی شخص آگے رہتا رہا
ہوگا، اس لیے ہمارا خیال ہے کہ مسجد کی
پہلی اور دوسری صف کے اندر شرکائے
اور ان کے ہم پایہ اشخاص ہی ہوتے
تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور دوسرے
نوجوان صحابہ کی صفیں ان کے بعد ہوتی
تھیں، اس لیے حضرت علیؓ، عبداللہ
ابن مسعودؓ اور ان جیسے دوسرے بدری
صحابہ کو رسول اللہ کی نماز کے متعلق
زیادہ آگاہی تھی، کیونکہ یہ لوگ دوسروں

وانما اعرف بما یاتی من ذلک	کے مقابلہ میں نماز کے اندر آپ سے زیادہ
وما یدع مع ان فقیہھم مالک	قریب رہتے تھے اور ان باتوں کی زیادہ
بن انس قد روی عن نعیم بن	خبر رکھتے تھے جن کو آپ نماز میں اختیار یا
عبد اللہ المجمر و ابی جعفر	ترک فرماتے تھے، اسکے علاوہ خود اہل مدینہ کے
القاری انما اخبراہ ان ابا ہریرۃ	فقیہ امام مالک بن انس نے نعیم بن عبداللہ مجمر
رضی اللہ عنہ کان یصلی بھم	اور ابو جعفر قاری سے روایت کی ہے کہ ان لوگوں نے
فیکبر کلما خفض ورفع، قالا	بتایا کہ حضرت ابوہریرہؓ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے
وکان یرفع یدیہ حین یکبر	تو اٹھتے بیٹھتے ہر موقع پر تکبیر کہتے تھے مگر وہ
لیفتتح الصلوٰۃ فھذا حدیثکم	صرف نماز کی ابتدا میں تکبیر تحریمہ کے وقت
موافق لعلی وابن مسعود رضی اللہ عنہما	رفع یدین کرتے تھے، اس طرح خود تمہاری حدیث
لاحاجۃ بنا معھما الی قول	بھی حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ کے مسلک کے
ابی ھریرۃ ونحوہ ولکنا	مطابق ہے، گو کہ ہمارے لیے ان دونوں بزرگوں
احتججنا علیکم بحدیثکم (از ص ۹۴ تا ۹۶)	کے مسلک کی موجودگی میں حضرت ابوہریرہؓ
	وغیرہ کے قول کی کوئی ضرورت نہیں رہجاتی
	تھی، تاہم ہم نے تمہارے خلاف خود تمہاری
(از صفحہ ۹۴ تا ۹۶)	ہی حدیث سے حجت و دلیل فراہم کردی ہے۔

اسی طرح "باب الذی یفوتہ بعض الصلوٰۃ" کے تحت امام محمدؒ نے امام ابو حنیفہؒ کا قول نقل کیا ہے۔ اس کے بعد اہل مدینہ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر مصلی کو گمان ہو کر صف تک جاتے جاتے امام رکوع سے سر اٹھالے گا تو صف کے پیچھے ہی رکوع میں چلا جائے، پھر آہستہ آہستہ کھسک کر

صف میں مل جائے، اہل مدینہ نے فقہائے عراق پر الزام دیتے ہوئے کہا ہے کہ بلغنا ان عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کان یدب راکعاً" ان کے اس استدلال پر امام محمد نے لکھا ہے،

قیل لهم: ما اسرعکم الی حدیث ابن مسعود رضی اللہ عنہ اذا کانت لکم منہ حجۃ وما ابطأکم عنہ اذا خالفکم، انا نحن اعلم بأمر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ منکم کیف دبّ حتی وصل الصف انہ خرج من دارہ ومعہ اصحابہ فکبرو کبروا معہ فصاروا صفاً ثم دبوا حتی لحقوا الصفوف ولم یخرج عبداللہ من دارہ وحدہ، ولم یبلغنا انہ دبّ وحدہ (ص ۲۱۶)

اہل مدینہ سے یہ کہا جائیگا کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث تمہاری تائید میں ہوتی ہے تو کس قدر جلد اس سے استدلال کرتے ہو لیکن جب وہ تمہارے خلاف ہوتی ہو تو اس سے استدلال کرنے میں پس و پیش اور گریز سے کام لیتے ہو، دراصل ہم لوگ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے طرز عمل سے تم لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ واقف ہیں کہ وہ کس طرح آہستہ آہستہ چل کر صف میں شامل ہوئے تھے، حقیقت یہ ہو کہ جب وہ اپنے گھر سے نکلے تو ان کے ہمراہ انکے اصحاب بھی تھے چنانچہ جب انھوں نے تکبیر کہی تو رفقاء نے بھی تکبیر کہی، اس طرح وہ لوگ ایک صف میں ہوگئے اور آہستہ آہستہ چلکر نماز کی صفوں سے جا ملے، اس سے ظاہر ہو گیا کہ عبداللہ بن مسعودؓ اپنے گھر سے تنہا نہیں نکلے تھے، اور نہ ہم کو اس کی خبر ملی کہ وہ تنہا آہستہ آہستہ چلکر نماز کی صف میں شامل ہو گئے تھے

امام محمدؒ نے جگہ جگہ اہل المدینہ کو الزامی جوابات دیے ہیں اور ان کے اصول و مرویات کی روشنی میں ان کے اقوال کو مرجوح قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں فقہ حنفی کے احادیث رسول اور آثار صحابہ سے قریب تر ہونے کے واضح دلائل ملتے ہیں، چنانچہ مسح علی الخفین کی بحث میں اہل مدینہ کے مقابلہ میں لکھتے ہیں:

وقال محمد بن الحسن، الآثار فی المسح للمقیم یوماً ولیلۃً، و للمسافر ثلاثۃ ایام ولیالیھا کثیرۃ معروفۃ، وما کنت اظن ان احداً ممن نظر فی الفقہ یشکل علیہ الآثار فی ھذا (ص ۲۴)	امام محمد بن حسن فرماتے ہیں کہ مقیم کے لیے ایک شب و روز اور مسافر کے لیے تین شب و روز کے مسح کی روایتیں اور آثار اس قدر زیادہ اور مشہور ہیں کہ میرے خیال میں فقہ پر نظر رکھنے والے کسی شخص کو ان کے بارہ میں کوئی اشکال نہیں ہو سکتا ہے۔

اسی بحث میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

وکیف قال ھذا اھل المدینۃ فما نعلم احداً ابصر شیئاً یتکلم بمثل ھذا فقد جاء الحدیث المعروف عن عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ الخ	حیرت ہے کہ اہل مدینہ نے یہ بات کیسے کہی، اور ہم نہیں سمجھتے کہ کوئی معمولی بصیرت رکھنے والا بھی اس قسم کی بات کہتا ہو، کیونکہ حضرت عمر بن الخطابؓ کی اس سلسلہ میں مشہور روایت موجود ہے۔

ایک جگہ فرماتے ہیں:

فھذا قول عروۃ بن الزبیر وھو کان افقہ واعلم بالروایۃ	یہ عروہ بن زبیر کا قول ہے جو روایت و سنت کے معاملہ میں ابن شہابؒ سے زیادہ صاحب علم و فقہ

والسنة من ابن شهاب فكيف تركه هذا امام مالك بن انس وغيره وهم الذين رووه وعنوا الى رأى ابن شهاب مع ما قد جاء فى هذا من الآثار، اخبرنا الخ (ص ۳۰)

تھے، آخر امام مالکؒ بن انس وغیرہ نے اس کو کیسے ترک کر دیا ہے، جبکہ انھوں نے اس کی روایت بھی کی ہے، اور اس کے متعلق اور آثار بھی موجود ہیں، پھر بھی وہ ابن شہابؒ کے قول کی جانب مائل ہوگئے،

اس کتاب میں احناف کے اس مسلک کی پوری ترجمانی موجود ہے کہ احادیث و آثار کے ہوتے ہوئے قیاس نہیں کیا جا سکتا، اور فقیہ کی نظر روایت و درایت پر کس قدر زیادہ ہونی چاہیے، وتر میں حضرت ابن عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت سعیدؒ بن جبیر کے مسلک کے خلاف ابن مسیبؒ کے مسلک کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فهؤلاء احق ان ناخذ بقولهم من سعيد ابن المسيب (۱۷۳)

ان لوگوں کے قول پر عمل کرنا سعید بن مسیبؒ کے قول کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور مناسب ہے،

باب الضحك فى الصلوة میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

وقال محمد بن الحسن: لولا ما جاء من الآثار كان القياس على ما قال اهل المدينة ولكن لا قياس مع اثر، وليس ينبغى الا ان ينقاد للآثار (۲۰۴)

امام محمد بن حسن فرماتے ہیں کہ اگر آثار نہ ہوتے تو قرین قیاس اہل مدینہ ہی کا مسلک تھا، لیکن اثر کی موجودگی میں قیاس کا کوئی سوال نہیں اور اثر و حدیث کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے،

"باب المرور بين يدى المصلى" میں اہل مدینہ کو ان کی احادیث سے دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

فهذه احاديث اهل المدينة

یہ اہل مدینہ کی حدیثیں ہیں، جو ان کے

يحتج عليهم بها، وهم يأخذون بخلافها، وممن اخذ بخلافها مالك بن انس، وهو الذي رواها فكيف يكونون اصحاب آثارهم يدعون عيانا ما يروون، ولو اردنا ان نحتج عليهم باحاديث كثيرة من الاحاديث في هذا او نحوه لاحتججنا بها عليهم لكن احتجاجنا باحاديثهم اوجب في الحجة عليهم، وهذا مما يدل على غيره من اقوالهم انما تركوا فيه الآثار، واخذوا فيه بما استحسنوا بالرأي لا اثر ولا سنة (ص ۲۲)

خلاف حجت قائم کیجائیگی، کیونکہ ان لوگوں کا مسلک ان کے خلاف ہے، امام مالک بھی ان ہی لوگوں میں ہیں جو ان حدیثوں کی مخالفت کرتے ہیں، درانحالیکہ وہ ان کے راوی بھی ہیں، ایسی صورت میں اہل مدینہ کو صاحب آثار کس طرح کہا جا سکتا ہے جبکہ علانیہ وہ اپنی ہی مرویات کو ترک کر دیتے ہیں اور اگر ہم چاہتے تو اس مسئلہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل میں متعدد حدیثوں سے ان کے خلاف حجتیں قائم کرتے لیکن ہمارا ان ہی کی حدیثوں سے ان کے خلاف استدلال کرنا زیادہ موثر اور موجب حجت ہوگا، یہ اور انکے دوسرے اقوال اس کی دلیل ہے کہ انھوں نے ان میں آثار کو ترک کر کے ان چیزوں کو اختیار کر لیا ہے جن کو وہ پسند کرتے تھے، اور اپنی تائید میں کوئی سنت واثر نہیں پیش کر سکے۔

"باب المسح علی الخفین" میں ایک مقام پر اہل مدینہ کو خطاب کرتے ہوئے یوں قیاس کی بحث کرتے ہیں:-

قيل لهم: فانما يقاس ما لم يأت فيه اثر على ما جاءت فيه ... الآثار فقد رويتم اثرين في مسح الراس في المسح

اہل مدینہ کے خلاف یہ کہا جائیگا کہ جس چیز کے بارہ میں کوئی اثر نہ ہوتا تو اسکو اس چیز پر قیاس کیا جاتا ہے جس کے متعلق آثار

علی الخفین ولم تقیسوا علی واحد منھما فلای شیء اختلف ھذا وغیرہ من مواضع الوضوء وقد زعمتم انہ لا اثر عندکم فی غیر ھذا من الاعضاء فینبغی لمن قاس علی السنۃ والآثار ان یقیس علی السنۃ مالم یات فیہ اثر لما قد جاءت فیہ الآثار مما یشبھہ (ص ۳۲ و ص ۳۳)

وارد ہوتے ہیں، پس تم نے مسح راس اور مسح علی الخفین کے متعلق دو اثر بیان کیے ہیں، لیکن ان میں سے کسی پر بھی قیاس نہیں کیا آخر اس میں اور دوسرے وضو میں فرق واختلاف کا سبب کیا ہے، جبکہ تم لوگوں کا خود خیال ہے کہ اس کے علاوہ کسی عضو کے بارہ میں تمھارے پاس کوئی اثر و حدیث نہیں ہے، اس بنا پر سنت پر قیاس کرنے والے کو چاہیے کہ وہ ایسی چیز کو سنت پر قیاس کرے

[illegible]

کسی ایک صحابی کی روایت کو مشہور احادیث و آثار کے مقابلہ میں حجت قرار نہیں دیا جاسکتا،

اس پر بحث کرتے ہوئے "باب الخطاء والنسیان والسھو" میں لکھتے ہیں:

قیل لھم: لم یات فیما قلتم من الاحادیث الاحدیث واحد حدیث عبد اللہ بن بحینۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قام من الرکعتین ولم یجلس فسجد سجدتین وھو جالس قبل السلام، قالوا نعم ھذا احدثنا عبد اللہ بن بحینۃ ربہ اخذ

ان لوگوں کے خلاف یہ دلیل دیجائیگی کہ تم لوگوں نے جو کچھ کہا ہے اس کے متعلق صرف ایک ہی حدیث ہے، اور وہ یہ کہ عبد اللہ بن بحینہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ دوسری رکعت میں کھڑے ہوگئے اور قعدہ نہیں کیا اس لیے آپ نے آخری قعدہ میں سلام سے پہلے دو سجدے کیے، اہل مدینہ کا بیان ہے کہ یہ

۳

قيل لهم فهل رويتم عن
عبد الله ابن بحينة او روى
فقيه قط حديثا غير هذا الحديث
قالوا لا نعلم انه قد جاء
عنه حديث غير هذا، قيل لهم
أفنقبل هذا ابتراك السنة
والآثار المعروفة بقول
رجل لا يروى عنه غير حديث
واحد، وقد روينا حديث
رسول الله صلى الله عليه وسلم هذا
بعينه عن امام كان من ائمة
المسلمين يأمنه عمر بن الخطاب
رضي الله عنه على الامصار
ويستعمله عليها اعرف
بالرواية واعلم بها واشهر
بصحبة رسول الله صلى الله عليه وسلم
من عبد الله ابن بحينة وذلك
المغيرة بن شعبة رضي الله عنه
انه صلى باهل الكوفة فقام

عبد اللہ بن بحینہ رضی کی حدیث ہو اور اسی پر انکا
عمل ہو، لیکن جب ان سے یہ پوچھا جائے کہ
تم لوگوں یا کسی اور فقیہ نے بھی ان سے اسکے
علاوہ کبھی کوئی اور حدیث بیان کی ہو تو وہ
کہیں گے کہ ہم کو کسی روایت کا علم نہیں ہے
ایسی صورت میں ان سے کہا جائیگا کہ کیا
ہم لوگ مشہور سنن و آثار کو محض ایک ایسے
شخص کے قول کی بنا پر ترک کر کے جس سے
اس کے علاوہ اور کوئی بھی حدیث مروی نہیں ہے
اسکو قبول کرلیں جبکہ ہمارے پاس رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی بعینہ یہی حدیث مسلمانوں کے
ایک امام کے واسطہ سے موجود ہے جن کو
حضرت عمر بن الخطاب رضی نے امصار و بلاد میں
امین مقرر کیا تھا، اور جو روایات و آثار کے
بہت بڑے عالم اور عبد اللہ بن بحینہ رضی کے مقابلہ
میں صحبت رسول میں زیادہ شہرت بھی
رکھتے تھے، یہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی ہیں،
جنھوں نے کوفہ والوں کو نماز پڑھائی،
اور دوسری رکعت میں بغیر قعدہ کیے

من ركعتين، ولم يجلس فلما
تشهد سلّم، ثم سجد سجدتين
للسهو، ثم روى ان رسول الله
صلى الله عليه وآله وسلم فعل هذا
بعينه، فلو كان الرجلان كلاهما
ثقة وكلاهما مؤتمن على ما رويا
لكان الذي قال سمعت رسول الله
صلى الله عليه وآله وسلم فعله فهو
احق أن يؤخذ بقوله من الذي
قال لم اسمعه يسلم حتى سجد
سجدتين لان من قال لم اسمعه
يسلم حتى سجد سجدتين ليست
تقبل شهادته في الاشياء
على مثل هذا، وانما تقبل الشهادة
اذا قال سمعت ورأيت فاما من
قال لم اسمع ولم ار فليس يؤخذ بقوله
وعندنا فيما قلنا بعينه آثار
على خلاف ما روى عبد الله ابن
بحينة (ص ۲۲۵ ـ ۲۲۶ ـ ج ۲)

اٹھ کھڑے ہوئے اور آخری قعدہ میں تشہد
کے بعد سلام پھیرا اور سہو کے دو سجدے
کیے، اس کے بعد کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے بھی بعینہ ایسے ہی کیا تھا، اس لیے اگر دونوں
ہی آدمی اپنی روایت میں ثقہ و مامون ہوں
جب بھی اس شخص کا قول جو کہتا ہے کہ
اس نے اس کو رسول اللہ سے سنا ہے، اس
شخص کے مقابلہ میں زیادہ قابل قبول
ہوگا جو کہتا ہے کہ اس نے یہ نہیں سنا کہ
آپ نے دو سجدے کرنے سے پہلے سلام
نہیں پھیرا، اس لیے کہ اس قسم کے
مسائل میں ایسی شہادت قبول نہیں
کیجاتی، جو یہ کہتا ہے کہ میں نے نہیں سنا کہ
آپ نے دو سجدے کرنے سے پہلے سلام پھیر دیا ہو
بلکہ اسکی شہادت قبول کیجاتی ہے جو کہتا ہے کہ
میں نے سنا اور دیکھا، اس شخص کے قول کا اعتبار نہیں
کیا جاتا جو یہ کہتا ہے کہ میں نے نہ سنا اور نہ دیکھا اور ہمارے
پاس تو ہمارے قول و مسلک کی تائید میں اسی طرح کے اور
بھی آثار ہیں اور وہ عبد اللہ بن بحینہ کی روایت کے خلاف ہیں۔

احادیث رسول اور آثار صحابہ کے مقابلہ میں تابعین یا ان کے بعد کے اہل علم کا قول و فعل حجت نہیں بن سکتا اور اسلاف کے مقابلہ میں اخلاف کا قول مرجوح ہے، اسے "باب صلوٰۃ الجمعہ" میں مسجد سے متصل مکانات میں نماز جمعہ پڑھنے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

قیل لھم: وکیف جاز ھذا فی ذالک الزمان، ولم یجز فی ھذا الوقت؟ ما جاء غیر الاول (؟) او جاء قوم افقہ من الاولین ما العلم الا علم الاولین الذین رخصوا فی ذلک، وما الفقہ الا فقھھم، وھم کانوا اعلم بامر رسول اللہ صلے اللہ علیہ واقرب بہ عھدا منا. فلو رأوا ذالک قبیحا ما فعلوہ (ص ۲۹ ج ۱)

اہل مدینہ کے خلاف یہ کہا جائیگا کہ یہ اس زمانہ میں کیسے جائز تھا اور اس زمانہ میں یہ کیوں جائز نہیں ہے؟ کیا پہلے کے مقابلہ میں کوئی اور روایت ہے، یا سلف سے زیادہ صاحب فقہ لوگ پیدا ہوگئے ہیں؟ فقہ و علم تو در اصل انہی اسلاف ہی کا معتبر سمجھا جائیگا جنھوں نے اس کی رخصت و اجازت دی ہے، کیونکہ ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملات سے زیادہ واقفیت تھی اور اس لیے سعی و کوشش میں ہم سے زیادہ قریب تھے، پس وہ اگر اسکو برا سمجھتے تو کبھی نہ کرتے۔

احادیث و آثار کے ہوتے ہوئے حنفیہ کے یہاں قیاس جائز نہیں ہے، "باب قیام الرجل حین ینہض الی الصلوٰۃ" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

وقال محمد بن الحسن: السنۃ والآثار فی ھذا معروفۃ مشھورۃ لا یحتاج معھا الی

اس سلسلہ میں سنن و آثار بکثرت اور معروف ہیں، اور ان کی موجودگی میں نظر و قیاس کی کوئی ضرورت

نظر وقیاس (ص۳۲۵) ہی نہیں

حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو غلط قرار دیتے ہوئے کتاب الصوم کے "باب الرجل یاکل اویشرب ناسیاً" میں لکھتے ہیں،

وقال محمد بن الحسن: کیف	محمد بن الحسن بیان کرتے ہیں کہ اہل مدینہ یہ
قال اهل المدینۃ هذا القول	کس طرح کہتے ہیں کہ ہم نے کوئی ایسا شخص
ما سمعنا ان احدا یزعم انه	نہیں سنا جو یہ خیال کرتا ہو کہ اگر کوئی شخص
من اکل اوشرب ناسیاً ان	بھول کر کھا پی لے تو اس پر روزے کی قضا
علیه القضاء، ولقد جاءت	لازم ہوگی، کیونکہ اس بارہ میں جو حدیثیں
الاثار فی ذالك والناس	وارد ہیں اور جن پر لوگوں کا اجماع ہے وہ
یجمعون علیها ان من اکل	یہ ہے کہ جس نے بھول کر کھا پی لیا تو اس کو
ناسیا اوشرب ناسیا فانما	اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا اور اہل مدینہ
ذلك طعمة اطعمها الله	اس سے خوب واقف ہیں کہ ان حدیثوں
ایاه وسقاه، وان اهل المدینۃ	اور آثار کے مقابلہ میں جن کی تردید کوئی شخص
لیعلمون ان هذا لا ینبغی	نہیں کرتا رائے اور قیاس کو اختیار کرنا
ان یوخذ بالرأی للاثار التی	کسی طرح مناسب نہیں ہے، اسی لیے امام
جاءت مما لا یقدر علی رده	ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ اگر اس
احد، وقال ابوحنیفة لولا	بارہ میں حدیث و آثار نہ ہوتے تو
ماجاء فی هذا من الاثار لامرت	میں بھی قضا کا حکم دیتا۔
بالقضاء (ص۳۹۲)	

یہ اقتباسات اگرچہ طویل ہو گئے ہیں، مگر ان سے معلوم ہو سکتا ہے کہ فقہ حنفی کی بنیاد احادیث و آثار پر ہے، اور روایت کے ساتھ درایت سے بھی بھرپور کام لیا گیا ہے، اور یہ کہ قیاس کو بدرجۂ مجبوری خاص حالات میں بقدر ضرورت کام میں لایا گیا ہے۔

اوپر کی مثالوں میں، روئے سخن چونکہ اہل مدینہ کی طرف ہے، اس لیے ایک گونہ مقابلہ کی شکل معلوم ہوتی ہے، مگر اس مقابلہ میں حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پایا ہے، بلکہ بہت سے مسائل میں امام محمدؒ نے اپنے استاذ امام ابو حنیفہؒ کے مقابلہ میں اہل مدینہ کا ساتھ دیا ہے اور ان کے مسلک کو راجح قرار دیکر اپنا مسلک بتایا ہے، چنانچہ امام جالس کی امامت کے بارے میں لکھتے ہیں:

قال محمد بن الحسن: قول اهل المدينة فى هذا احب الى من قول ابى حنيفة وان كنت احتججت لابى حنيفة بحجة ثابتة لم تر اهل المدينة بحجة منها ولكنه بلغنا عن النبى صلى الله عليه وسلم قال: لا يؤمن الناس احد بعدى جالسا، ولم يبلغنا ان احدا من ائمة الهدى ابى بكر ولا عمر وعثمان ولا على ولا غيرهم أموا جلوسا فاخذنا	امام محمدؒ بن حسن کہتے ہیں کہ اس بارہ میں میرے نزدیک اہل مدینہ کا قول امام ابو حنیفہؒ کے قول سے زیادہ پسندیدہ ہے، گو میں نے ان کی تائید میں ایسی قاطع دلیل پیش کر دی ہے جس کے بعد اہل مدینہ کے لیے مفر کی کوئی صورت نہیں رہ گئی ہے، لیکن چونکہ ہم کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ خبر ملی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میرے بعد کوئی شخص بیٹھکر نماز نہ پڑھائے اور ہم کو ائمہ ہدیٰ ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ وغیرہ میں سے کسی کے بارہ میں یہ نہیں معلوم ہوا کہ انھوں نے بیٹھکر نماز پڑھائی ہو، اسلیے ہم نے اسکو

بھذا الاثر اوثق الخ (ص۱۲۰) انتخاب کر لیا ہو قابل وثوق و اعتماد ہے۔

صلوٰۃ کسوف میں امام ابوحنیفہؒ اور اہل مدینہ کے اقوال نقل کرکے لکھتے ہیں

وقال محمد بن الحسن: قد جاءت	محمد بن حسن فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے
فی قول ابی حنیفۃ آثار علی ما قال	قول کی تائید میں جیسا کہ ان کا بیان ہے
وجاءت فی قول اھل المدینۃ	آثار وارد ہیں اور اہل مدینہ کا بھی خیال ہے
آثار علی ما قالوا (ص۳۱۹)	کہ انکی تائید میں آثار و روایات موجود ہیں۔

"باب ما یقسم للمصدق من الورق" میں ایک مقام پر لکھتے ہیں

وقال محمد بن الحسن: القول	محمد بن الحسن کا بیان ہے کہ دونوں اقوال
الاول احسن القولین وھو	میں پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اور وہی
المعول الذی اجمع علیہ	زیادہ قابل اعتماد بھی ہے اور اسی پر
اھل الکوفۃ واھل المدینۃ (ص۱۹۲)	اہل کوفہ اور اہل مدینہ کا اجماع ہے۔

باب زکوٰۃ اموال الیتیمی میں امام ابوحنیفہؒ کا قول نقل کیا ہو کہ جب یتیم بچے پر نماز فرض ہوتی ہے تو اس کے مال میں زکوٰۃ بھی فرض ہوتی ہے۔ اور اہل مدینہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یتیم کے مال کی زکوٰۃ نکالنی چاہیے، اس پر امام محمدؒ لکھتے ہیں:

وقال محمد بن الحسن: قد جاءت	امام محمد بن حسن کا ارشاد ہو کہ اس کے بارہ
فی ھذا آثار مختلفۃ واحبھا	میں مختلف روایات ہیں، لیکن میرے
الینا ان لا تزکی حتی یبلغ (ص۱۵۲)	نزدیک زیادہ بہتر مسلک یہ ہو کہ بلوغ سے پہلے

زکوٰۃ نہیں (حاشیہ)

ایام تشریق میں تکبیرات میں اپنے استاذ امام ابوحنیفہؒ کے قول کو یوں مرجوح قرار دیتے ہیں:

وقال محمد بن الحسن: وھذا	محمد بن الحسن کہتے ہیں کہ یہ قول ہمارے نزدیک

القول احب الینا من قول ابی حنیفۃ (ص۳)	امام ابو حنیفہؒ کے قول سے زیادہ عمدہ ہے۔

باب زکوٰۃ النخل والحبوب میں ایک مقام پر کھل کر اپنے استاذ امام ابو حنیفہؒ کے قول کا یوں انکار کیا ہے:

ولسنا ناخذ بھذا من قول ابی حنیفۃ وابراھیم ولکنا ناخذ بما روی عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہ قال الخ (ص۵۰۲-۵۰۳)	ابراہیم اور امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول ہمارے نزدیک قابل اختیار نہیں بلکہ ہم اس کو اختیار کرتے ہیں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

اسی باب میں ایک جگہ اہل مدینہ کی موافقت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وکذالک قولنا، ونحن نری ایضا ان توخذ الصدقۃ الخ (ص۵۱۲)	یہی ہمارا بھی مسلک ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ لیجائے گی۔

الغرض پوری کتاب فقہ اسلامی کے نکات و اسرار سے معمور ہے، اور امام محمدؒ کو اسلامی تفقہ و تشریع میں جو مقام حاصل ہے، اور ان کی دوسری کتابوں میں جو بالغ نظری پائی جاتی ہے، وہ اس کتاب میں بھی موجود ہے، اسلامی قوانین و تشریعات کے سلسلے میں اسلام کا یہ قدیم ترین ماخذ دور حاضر کی فقہی جد و جہد میں بڑے کام کی چیز ہے، اور فقہ اسلامی پر کام کرنے والے اہل علم و تحقیق کے لیے ایک قدیم ترین دستاویز ہے۔

یہود کی تصویر قرآن و بائبل میں

از

جناب مولوی حبیب صاحب ریحان ندوی استاذ جامعہ اسلامیہ لیبیا

(۲)

گذشتہ مضمون میں یہ بات معلوم ہو چکی کہ یہود کی تاریخ اور ان کا کردار کیا تھا، اس کی روشنی میں انبیاے بنی اسرائیل نے حضرت مسیح علیہ السلام کے آنے کی پیشنگوئیاں بھی کی تھیں، لیکن جب وہ تشریف لائے تو یہود نے ان کو نہیں مانا۔

حضرت مسیحؑ خود یہودی تھے، اس لیے آپ نے فرمایا کہ میں کوئی نیا دین نہیں لایا بلکہ یہودی مذہب کو مکمل کرنے آیا ہوں، اور یہودی علماء کے اعزاز و اکرام کی طرف عوام کو بلایا،

"یہ نہ سمجھنا کہ میں ناموس کو توڑنے آیا ہوں یا انبیاء کو بلکہ میں پورا کرنے آیا ہوں" (متی ۵ : ۱۷)

اور آگے چل کر فرمایا

"اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمھاری اطاعت کنیسہ اور علماء سے نہ بڑھی تو تم ملکوتِ آسمانی میں داخل نہیں ہو سکتے۔" (متی ۵ : ۲۰)

لیکن یہود نے آپ کے بارہ میں وہ افترا پردازیاں کیں اور اتنا جھوٹا پروپگنڈا کیا کہ دل پر جبر کیے بغیر ان کو نقل نہیں کیا جا سکتا، جس کی تفصیل ہم آگے پیش کریں گے،

آپ کے معجزات کا مذاق اڑایا، شیاطین کا سردار آپ کو کہا" (متی ۱۲ : ۲۴) جھوٹا مدعی اور مجدد

ثابت کیا (متی ۲۶ : ۶۵) گمراہ اور گمراہی کا پھیلانے والا بتایا (متی : ۲۷ : ۶۳)۔ اور اس غصہ وغضب کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہود کے علمار وفقہار اور کینہ نے دین کی صحیح تعلیمات کو چھوڑ کر تقلید پر دین کی بنیاد رکھی تھی، اور بھولے بھالے عوام میں خدا کی رحمت ومغفرت کے نام پر تجارت کا کاروبار پھیلا رکھا تھا، معبد کو جو عبادت اور طہارت کا گھر ہے، نجس بنا دیا تھا، اس لیے مسیحؑ نے کھل کر ان کے کردار پر تنقید کی اور عوام کو بتایا کہ ان کے کہنے پر عمل کریں لیکن ان کی جیسی بداعمالیاں نہ کریں۔

"پھر یسوع نے مجمع سے کہا اور شاگردوں کو خطاب کیا کہ موسیٰ کی مسند پر کینہ اور فقہار بیٹھے ہیں تو جو بھی وہ کہیں اس کو یاد کرو، محفوظ کرو اور اس پر عمل کرو لیکن ان کے اعمال کے مطابق کام نہ کرو، کیونکہ وہ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔" (متی ۲۳ : ۱-۴)

یہودی علمار کی برملا توبیخ کی اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ خدا کے احکام کی طرف متوجہ ہوں،

"تم پر ہلاکت ہو اے کتبہ وفقہار ریاکارو کہ تم ملکوت آسمانی کو لوگوں کے سامنے بند کرتے ہو، نہ تم خود داخل ہوتے اور نہ دوسروں کو داخل ہونے دیتے ہو۔" (متی ۲۳ : ۱۳)

"اے اندھو جو مچھر کو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔" (متی ۲۳ : ۲۴)

"یہ مکتوب تھا کہ میرا گھر نماز کا گھر ہو تمام امتوں کے لیے اور تم نے اس کو چوروں کا غار بنادیا ہے۔" (مرقس : ۱۱)

تاریخ شاہد ہے کہ خود حضرت مسیحؑ کے تبعین اور رجال دین نے گرجے کی قوت کے زمانے میں کس طرح دین کو تجارت کا ذریعہ بنایا، اور خدا کے گھر میں بیٹھ کر کس طرح "خدا کے بیٹے" کے نائب پوپ مغفرت کے پروانے بانٹا کرتے اور عیش وتنعم کی زندگی گذارتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے نام سے لوگ گھبرا گئے۔ لوتھر، زونگل اور کلفن نے گرجے کے خدائی کا طلسم توڑ دیا، اور عیسائیوں کو حریت فکر ونظر کی دعوت دی،

یہود اور ان کے علماء سے مخاطب ہو کر ہیکل میں مسیحؑ نے کہا تھا:

"تم پر ہلاکت ہو کہ تم انبیاء کی قبریں بناتے ہو اور صدیقین کے مدافن کو مزین کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادا کے زمانے میں ہوتے تو انبیاء کے خون میں شریک نہ ہوتے، اس طرح تم اپنے آپ پر یہ ثابت کرتے ہو کہ تم انبیاء کے قاتلین کی اولاد میں سے ہو، اس لیے تم ان کا پیمانہ بھرو۔ اے سانپو اے افاعی کی اولاد ایسے تم جہنم کے قرض سے بچ سکتے ہو" (متی ۲۳ : ۲۷ - ۳۳)

"تم پر ہر وہ خون پڑے گا جو ہابیل الصدیق سے لیکر زکریا بن برخیا تک کا ہے جس کو تم نے ہیکل اور مذبح کے درمیان قتل کیا تھا" (متی ۲۳ - ۳۵)

یہود کی خیانتوں اور علمائے یہود کے وسائس سے عاجز آکر حضرت مسیحؑ نے ان کے ندس شہر اورشلیم (بیت المقدس) کے متعلق فرمایا کہ

"اے اورشلیم اے اورشلیم انبیاء کی قاتل، رسولوں کو پتھر مارنے والی کتنی دفعہ میں نے چاہا کہ تیری اولاد کو اس طرح جمع کروں جس طرح مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے کرتی ہے لیکن تو نے یہ نہیں چاہا، اس لیے اب یہ تیرا گھر برباد ہونے جا رہا ہے۔"

(متی ۲۳ : ۳۷ - ۳۹) (لوقا ۱۳ : ۳۳ - ۳۵)

حضرت مسیحؑ کے وعظ و نصائح سے عاجز آکر انھوں نے ان سے پوچھا کہ یہ بتاؤ تم کو حق کس نے دیا ہے کہ تم اس قدر بلندی سے باتیں کرو، لوگوں پر حکم کرو اور سب کو برا بھلا کہو، اور بادشاہت کرو؟ اس سوال کا مقصد یہ بھی تھا کہ ممکن ہے اس کے جواب میں مسیحؑ کوئی ایسی بات کہہ دیں جو رومی حکومت کے خلاف ہو، اور ان کے خلاف مقدمہ قائم کرنے کا موقع مل جائے،

یہودیوں نے ان سے پوچھا

"کس قوت سے تم یہ کام کرتے ہو اور کس نے تم کو یہ سلطان دیا ہے؟"

مسیحؑ نے جو ان کے خبث سے واقف تھے، یہ جواب دیا:

"میں تم سے ایک بات پوچھوں گا، اگر تم نے اس کی بابت مجھے بتادیا تو میں بھی تم کو یہ بتادوں گا کہ میں کس کے سلطان سے یہ کرتا ہوں۔ یوحنا کی معمودیت کہاں سے تھی، آسمان سے یا لوگوں سے؟ تو انھوں نے اپنے دلوں میں سوچا کہ اگر یہ کہا کہ آسمان سے تو وہ کہے گا، پھر تم اس پر ایمان کیوں نہ لائے۔ اور اگر کہا لوگوں سے تو لوگوں کا ڈر ہے۔ کیونکہ یوحنا سب عوام کے نزدیک نبی کی طرح تھے۔ تو انھوں نے یسوع کو جواب دیا کہ ہم نہیں جانتے۔ تو اس نے کہا کہ اس لیے میں بھی تم سے یہ نہ کہوں گا کہ میں کس کے سلطان سے کرتا ہوں۔" (متی ۲۱: ۲۳-۲۷)

علماء و فقہاء کا یہ کردار تھا، اور حضرت عیسیٰؑ کی پاکیزہ زندگی، ان کی پُرحکمت باتیں سن کر اور ان کے معجزات دیکھ کر عوام ان کی طرف مائل ہوتے تھے، ہیکل میں بھی عوام علمائے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں ان کی گفتگو سنتے تھے، اس لیے علماء نے اس کی کوشش شروع کی کہ یسوعؑ کو اس طرح ختم کر دیا جائے کہ عوام میں برہمی نہ پیدا ہو، کیونکہ مسیحؑ کی تعلیم سے ان کی سرداری، کہانت کی مسند اور دین کے نام پر تجارت خطرہ میں پڑ گئی تھی، چنانچہ انھوں نے ان کی گرفتاری کا ایک حیلہ سوچا لیکن مسیحؑ اس کو سمجھ گئے۔

"انھوں نے اپنے شاگردوں کو ہیرودیوں کے ساتھ بھیجا، انھوں نے کہا کہ اے معلم آپ سچے ہیں، اللہ کا راستہ سچائی سے دکھاتے ہیں، اور کسی انسان کی پرواہ نہیں کرتے کیونکہ آپ انسانوں کے چہرے نہیں دیکھتے، اس لیے ہم سے کہیے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔

کیا یہ جائز ہے کہ جزیہ قیصر کو دیا جائے یا نہیں۔ تو یسوع نے ان کی خباثت کو جان لیا،
وہ کہا اے ریاکارو مجھے کیوں تجربے میں ڈالتے ہو، مجھے جزیہ کا مسئلہ دکھاؤ تو آپ کو
دینار پیش کیا گیا، آپ نے کہا کس کی یہ تصویر ہے اور کس کی تحریر، انھوں نے کہا قیصر
کی، تو آپ نے کہا جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو اللہ کا ہے وہ اللہ کو دو۔" (متی ۲۲: ۱۹-۲۱)
اس جواب سے ان کو اندازہ ہوگیا کہ مسیح کو اس قسم کے الزام میں پکڑنا مشکل ہے، ان پر
کوئی تہمت لگائی جائے۔

حضرت مسیح پر ایک بڑا الزام یہ بھی تھا کہ آپ یہود کی مذہبی تعلیمات کی مخالفت کرتے ہیں،
ایک دوسرا الزام یہ تھا کہ مسیح ناموس الٰہی یعنی نبوت کا سلسلہ بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل میں منتقل
ہو جانے کی دھمکی دیتا ہے، اس کو وہ اپنی زبان سے تو نہیں کہتے تھے، اس لیے کہ اس سے عوام
اور رومی حکومت کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی، برنابا کی انجیل میں ہے کہ

"اور سب سے سخت بات تو یہ کہ وہ کہتا ہے کہ مسیا، رسول، نسل داؤد سے نہ آئیگا۔
(جیسا کہ ہم نے اس کے ایک خاص شاگرد سے سنا) بلکہ کہتا ہے کہ وہ نسل اسمٰعیل سے ہوگا۔
اس لیے اگر ہم نے اس انسان کو زندہ چھوڑ دیا تو بنی اسمٰعیل رومیوں کے نزدیک بہت درجہ
والے بن جائیں گے اور ان کو ہمارا ملک دے دیں گے۔" (برنابا فصل ۱۴۲: ۱۷-۱۹)

انجیل متی میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے

"ایک شخص گھر کا مالک جس نے انگور بوئے اور باغ کے گرد بہاڑ لگائی، اور رس
نکالنے کی مشین لگا دی، اور "انگور والوں" کے سپرد کر دیا [یعنی دوسرے شخص کو دے گیا]
اور جب پھلوں کا وقت قریب آیا تو اس نے اپنے نوکر ان انگور والوں کے پاس بھیجے
کہ پھل لائیں، تو انھوں نے اس کے نوکروں کو قتل کر دیا، کوڑے لگائے اور بعض کو

سنگسار کر دیا، پھر اس نے اپنے دوسرے نوکر بھیجے تو ان کے ساتھ بھی یہی کیا، آخر میں اپنے لڑکے
کو یہ سمجھ کر بھیجا کہ اس سے ڈریں گے لیکن انگور والوں نے جب لڑکے کو دیکھا تو آپس میں کہا کہ
یہی وارث ہے، آؤ اس کو قتل کریں، اور اس کی میراث پر قبضہ کر لیں، اس کو پکڑا اور
باغ کے باہر قتل کر دیا، تو باغ والا آئے گا تو انگور والوں کے ساتھ کیا کریگا، تو لوگوں نے
کہا ان نا ہنجاروں کو بری طرح ہلاک کریگا، اور باغ کو دوسرے انگور والوں کو دیگا
جو اس کے پھل وقت پر ادا کریں گے، اس وقت یسوع نے کہا کہ کیا تم نے کتابوں میں
کبھی نہیں پڑھا کہ وہ پتھر جس کو عمارت بنانے والوں نے رفض کر دیا تھا وہ زاویے
کا سر ہو گیا، آپ کی طرف سے یہ ہوا لیکن ہماری نگاہوں میں وہ عجیب بات ہے، اس لیے
میں تم سے کہتا ہوں ملکوت اللہ تم سے چھین لیا جائے گا اور ایسی امت کو دیا جائے گا جو
اس کے مطابق کام کرے۔ (متی ۲۱ : ۳۳ - ۴۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ نے بنی اسمٰعیل میں نبوت و امامت کے منتقل ہو جانے کی
پیشین گوئی خدا کی طرف سے کر دی تھی، جو پوری ہو کر رہی، کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ بنی اسرائیل سے
ملکوت الٰہی لے کر بنی اسمٰعیل کو دیا گیا اور رفض شدہ پتھر سے صریح اسمٰعیل مراد ہیں جن کو سارہ نے

"بچے اور ماں کو نکلوا دیا تھا اور کہا کہ اس لونڈی کا بچہ میرے بچے کے ساتھ وارث
ہوگا" (تکوین ۲۱ : ۱۰)

"لونڈی کی اولاد کو بھی امت بناؤں گا، کیونکہ وہ تیری نسل سے ہے۔" (تکوین ۲۱ : ۱۳)

اور جب پیاس سے رویا تو

"بچہ کی آواز رب نے سن لی اور کلک الٰہی نے آسمان سے ہاجرہ کو پکارا اور
کہا تجھے کیا ہے، اے ہاجرہ خوف نہ کر کیونکہ اللہ نے بچے کی آواز سن لی، کھڑی ہو کر

بچے کو اٹھالے اور اپنے ہاتھ اس کے مضبوط کرلے کیونکہ میں اس کو عظیم امت بنادوں گا۔" (تکوین ۲۱: ۱۶-۱۸)

اور "راس الزاویہ" سے سب سے اشرف و افضل رسول مراد ہیں، اس طرح امت اسلامیہ کی افضلیت کا اعلان کیا گیا، اس کا مصداق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کون ہوسکتا ہے، اور بنی اسمٰعیل میں آپ کے علاوہ اور کون پیغمبر پیدا ہوا، اس کی مزید توضیح اس حدیث سے ہوتی ہے،

مثلی ومثل الانبیاء من قبلی	میری اور مجھ سے قبل کے انبیاء کی مثال
کمثل رجل بنی بیتا فاحسنه	یہ ہے کہ جیسے ایک شخص نے گھر بنایا اسکو
واجمله الا موضع لبنة فی	حسین وجمیل کیا لیکن ایک اینٹ کی جگہ
زاویة من زوایاه فجعل	ایک کونے میں باقی ہے تو لوگ اس کے
الناس یطوفون به ویعجبهم	گرد طواف کرنے لگے اور عمارت ان کو
البناء فیقولون الا وضعت	پسند آئی تو انھوں نے کہا کہ یہاں پر اگر
ھاھنا لبنة فیتم البناء قال	اینٹ رکھ دی جائے تو عمارت پوری ہو جائے
صلی اللہ علیہ وسلم فانا اللبنة	حضورؐ نے فرمایا تو میں وہ اینٹ ہوں
جئت فختمت الانبیاء (مسلم شریف)	آیا ہوں تاکہ انبیاء کا خاتم ہوں۔

مسیح کا ایک بڑا جرم ان کی نظر میں یہ بھی تھا کہ وہ بنی اسرائیل سے ملکوت الٰہی کے چھن جانے کی دھمکی دیتا ہے، بنی اسرائیل جس قدر نسلی تعصب کے حامی تھے اور ہیں' اس کو پیش نظر کوئی تعجب نہیں کہ حضرت مسیح کا سب سے بڑا جرم یہی ہو لیکن یہ ایسا جرم تھا کہ نہ تو رومی حکام کے سامنے اس کو بیان کیا جاسکتا تھا، اور نہ عوام الناس کے لیے اس میں کوئی کشش تھی، اس کو اپنی نجی مجلسوں یا

دل کی سیاہ تاریکیوں میں بھی سوچا اور دہرایا جاتا تھا،

معصومیت مسیح اور یہود | حضرت مسیحؑ کے اس جرم میں یہودیوں نے ان کو سولی دلانے کی کوشش کی جس میں ان کو ناکامی ہوئی، قرآن مجید نے تصریح کی ہے

وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن	اور انھوں نے نہ تو اس کو قتل کیا نہ سولی
شُبِّهَ لَهُمْ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا	چڑھایا لیکن ان پر مشابہ ہو گیا اور جو لوگ
فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُم بِهِ	وہ اختلاف کرتے ہیں، اس میں شک نہیں
مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا	جس کا ان کو علم نہیں سوائے گمان کی
قَتَلُوهُ يَقِينًا بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ	اتباع کے، اور یقیناً ان کو قتل نہیں کیا
إِلَيْهِ (نساء - ۱۵۶)	بلکہ اللہ نے اس کو اوپر اٹھا لیا۔

حضرت مسیحؑ کے آسمان پر جانے کا مسیحی بھی عقیدہ رکھتے ہیں لیکن تین دن بعد، یہود اس کے بھی قائل نہیں انجیل برنا باصاف کہتی ہے کہ یہودا کو آپ کے بدلے قتل کیا گیا، قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ یہود کا یہ دعویٰ ہے کہ انھوں نے مسیحؑ کو قتل کیا،

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ	اور ان کا کہنا کہ ہم نے مسیح ابن مریم
عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ (نساء ۱۵۶)	رسول اللہ کو قتل کیا ہے،

اسلامی عقیدہ کے اعتبار سے ان مسائل میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، اس لیے انکی تفصیل کی ضرورت نہیں لیکن یہود و نصاریٰ کے عقیدہ کے بارہ میں ہم ان ہی کی کتابوں سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں گے کہ حضرت مسیحؑ کا قتل یا اس کی تمام کوششیں یہودیوں نے کی تھیں، قرآن پاک کو یہود و نصاریٰ نہیں مانتے جس طرح اناجیل کو یہود نہیں مانتے اور انجیل برنا باکے بارے میں علما کی رائیں مختلف ہیں، اسلیے ہم صرف بائبل کی ان آیات سے استدلال کرینگے

جن کو ہر مسیحی صحیح مانتا ہے۔

پہلے ہم اس واقعہ کی تفصیل انجیل متی سے نقل کرتے ہیں، جن چیزوں میں تعبیر کا اختلاف ہے ان کو دوسری انجیلوں سے بعد میں واضح کر دیں گے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ خود حضرت مسیحؑ نے پیشین گوئی کی تھی کہ میں پکڑ کر یہودا کے کتبہ، فقہا، کے سپرد کیا جاؤں گا۔

"ہم اس وقت اورشلیم میں چل رہے ہیں اور ابن انسان کہنہ و کتبہ کے سپرد کیا جائے گا۔ اور وہ اس پر موت کا حکم لگائیں گے اور اس کو امتوں کے سپرد کریں گے کہ وہ اس کے ساتھ استہزا کریں اور کوڑے لگائیں اور سولی پر چڑھائیں۔" (متی ۲۰ : ۱۸ - ۱۹)

اس کے بعد اب تاریخی ادوار دیکھئے :

"یسوع نے اپنے تلامیذ سے کہا تم جانتے ہو کہ دو دن کے بعد عید فصح ہوگی اور ابن انسان کو گرفتار کیا جائے گا تاکہ سولی دیجائے۔" (۲۶ - ۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کو سولی کا پہلے سے علم تھا۔

"اس وقت کہنہ اور کتبہ کے رئیس اور عوام کے سردار رئیس الکہنہ کے گھر میں جمع ہوئے جس کا نام قیافا تھا اور مشورہ کیا کہ کس طرح یسوع کو مکر کے ساتھ پکڑیں اور قتل کریں لیکن انھوں نے کہا کہ یہ عید میں نہ ہو کہ کہیں عوام میں کھلبلی نہ مچ جائے۔" (۲۶ : ۲ - ۵)

پھر یہ پیشین گوئی تھی کہ

"میں سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک مجھکو پکڑوائے گا۔ ابن انسان کے لیے یہ مقدر ہو چکا ہے، لیکن ہلاکت ہو اس شخص کے لیے جو ابن انسان کو سپرد کرے، اس شخص کے لیے بہتر تھا کہ وہ پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔" (۲۶ : ۲۱ - ۲۴)

پھر باغ میں جاکر

"یسوع، پطرس اور زبدی کے دو بیٹوں کے ساتھ بیٹھا، اور اسے رنج و شکایت شروع ہوئی اور اس نے کہا کہ میرا نفس موت تک بہت غمگین ہے، یہاں ٹھہرو اور میرے ساتھ جاگو پھر تھوڑا سا آگے بڑھ کر منہ کے بل گر کے دعا اس طرح شروع کی، اے باپ اگر ممکن ہو تو یہ جام مجھ سے پار کر دے لیکن اس طرح نہیں جس طرح میں چاہوں بلکہ جس طرح تو چاہے۔" (۳۷-۳۹)

اے باپ اگر اس جام کا پار رہنا ناممکن ہو تو پھر تیری مشیت پوری ہو کر رہے۔" (۲۶: ۴۲)

اس دعا کے بعد

"وہ گفتگو میں تھا کہ یہودا بارہ میں کا ایک آیا اور اس کے ساتھ بہت سا مجمع تھا، تلواریں اور لاٹھیاں لیے ہوئے، کاہنوں کے سردار اور عوام کے رؤسا کی جانب سے، اور ان کو یہ نشانی بتائی تھی کہ جس کو میں پیار کروں وہی مسیح ہے، اس کو پکڑ لینا، تو اس وقت یسوع کی طرف بڑھا اور کہا سلام اے میرے سردار اور بوسہ دیا، یسوع نے کہا اے ساتھی! یوں آئے ہو، اس وقت وہ بڑھے اور یسوع پر دست درازی کی اور اس کو پکڑ لیا، تو اس وقت تلامیذ میں سے ایک نے اس کے ہاتھ میں جو تلوار تھی کھینچ لی اور کاہنوں کے سردار کے غلام کو مارا جس سے اس کا کان کٹ گیا، تو یسوع نے کہا کہ تلوار اپنی جگہ پر لوٹا دے کیونکہ وہ سب جو تلوار سے لیتے ہیں تلوار ہی سے ہلاک کیے جاتے ہیں، کیا تو سمجھتا ہو کہ میں نہیں کر سکتا کہ اپنے باپ سے طلب کروں تو وہ میرے لیے بارہ زستوں کے لشکر ارسال کر دے تو پھر کیسے لکھا پورا ہوگا کہ ایسا ہی ہونا تھا۔" (۲۶: ۴۸-۵۴)

"اس وقت یسوع نے مجمع سے کہا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تلواریں اور لاٹھیاں لیکر کسی چور پر نکلے ہو تاکہ مجھے پکڑو، ہر دن میں ہیکل میں بیٹھکر تم کو سکھاتا تھا تو یوں نہیں پکڑتے تھے۔" (۲۶: ۵۵)

ب) اس قسم کے مقدمات دینی عدالت میں جس کے حکام کاہن اور مذہبی پیشوا تھے، پیش ہوتے تھے،

اس کے فیصلہ کے بعد، رومی حاکم کی عدالت کی تصدیق کے بعد اس کو نافذ کیا جاتا تھا۔ اس لیے حضرت مسیح کو گرفتار کرنے کے بعد پہلے کہنہ کی عدالت میں پیش کیا گیا اور ان کے خلاف شہادت تلاش کی جانے لگی جس کا ملنا بہت دشوار ہوا لیکن

"آخرکار دو جھوٹے گواہ مل گئے جنھوں نے کہا کہ اس نے یہ کہا تھا کہ مجھے یہ قدرت ہے کہ ہیکل الٰہی کو توڑ دوں اور پھر تین دن میں بنا دوں، رئیس کہنہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ کیا تو کسی بات کا جواب نہ دے گا، یہ دونوں کس چیز کی گواہی دے رہے ہیں، لیکن یسوع خاموش رہا، کہنہ کے سردار نے کہا، زندہ اللہ کی قسم کھا کر پوچھتا ہوں کہ بتا کیا تو مسیح ابن اللہ ہے، تو یسوع نے کہا تو نے کہدیا اور یہ بھی تجھ سے کہتا ہوں کہ اس وقت سے ابن انسان قوت کے داہنی طرف بیٹھے گا اور آسمان کے بادلوں پر آئے گا، تو کہنہ کے سردار نے اپنے کپڑے پھاڑ لیے اور کہا کہ یہ جھوٹ ہے اس کے بعد ہم کو گواہی کی ضرورت نہیں تم نے اس کی ڈینگیں سن لیں تمھاری کیا رائے، تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ موت کا مستحق ہے، اس وقت اس کے چہرے پر لوگوں نے تھوکا، کے مارے اور بعض نے چانٹے لگائے یہ کہتے ہوئے کہ بتا ہم کو اے مسیح کہ کس نے مارا۔" (۲۶ : ۶۰-۶۷)

اس سزا کے بعد یہوداہ کو پشیمانی ہوئی، انجیل متی کا بیان ہے کہ

"اس کو سپرد کرنے والے یہوداہ نے دیکھا کہ ان کو مجرم ٹھیرایا گیا تو نادم ہوا اور لوٹا دیے چاندی کے تیس سکے، رؤساء کہنہ اور شیوخ کو یہ کہتے ہوئے کہ میں نے غلطی کی جب کہ ایک بری خون کو پکڑوایا، تو انھوں نے کہا کہ ہم پر کیا ہے، تو دیکھ تو اس نے چاندی ہیکل میں پھینک دی اور چلا گیا، پھر چلا اور اپنا گلا گھونٹ لیا۔" (۲۷ : ۳-۵)

یہ واقعہ متی کی انجیل کے علاوہ دوسری انجیلوں میں نہیں ہے، کاہنوں کے فیصلہ کے بعد حضرت مسیح رومی حاکم کے سامنے پیش کیے گئے،

"یسوع والی کے سامنے کھڑا ہوا، والی نے پوچھا کیا تو یہود کا بادشاہ ہے، یسوع نے کہا تو نے کہدیا اور جب کہ کاہنوں کے سردار اور عوام کے شیوخ اس کی شکایتیں کر رہے تھے، اس نے کسی چیز کا جواب نہیں دیا، بیلاطس نے کہا کیا تو نہیں سنتا کہ تجھ پر الزام لگائے جاتے ہیں تو اس نے کسی کلمہ کا بھی جواب نہیں دیا جس سے والی کو تعجب ہوا، اور والی کی یہ عادت تھی کہ عید کے دن لوگوں کے لیے ایک قیدی چھوڑتا تھا۔"

رومی حاکم حضرت مسیحؑ کو بے گناہ سمجھکر چھوڑنا چاہتا تھا، لیکن یہودیوں نے اصرار کرکے رومی حاکم کو سولی سزا دینے پر آمادہ کیا

"وہ جمع تھے تو ان سے والی نے پوچھا تم کس کو چاہتے ہو کہ میں چھوڑ دوں، باراباس[1] کو یا مسیح کو کیونکہ وہ سمجھ گیا کہ انھوں نے حسد کی وجہ سے اس کو پکڑا ہے، اور والی جب کرسی عدالت پر بیٹھا تو اس کی بیوی نے کہلا بھیجا کہ باز رہنا اس نیکو کار سے کیونکہ میں اس کی وجہ سے آج بہت پریشان ہوئی خواب میں لیکن کاہنوں اور عوام کے سرداروں نے عوام سے اصرار کیا کہ باراباس کو مانگ لیں اور یسوع کے لیے ہلاکت۔"

"بیلاطس نے پوچھا مسیح کے ساتھ کیا کروں جو مسیح ہونے کا مدعی ہے سب نے کہا پھانسی دیجائے" (۲۷: ۱۱-۲۲)

"والی نے پوچھا اس نے کیا برائی کی تو لوگوں نے چیخ چیخ کر کہا پھانسی دیجائے، جب بیلاطس نے دیکھا کہ کوئی چیز فائدہ مند نہیں رہی بلکہ فساد ہو رہا ہے، تو پانی لیا اور اپنے دونوں ہاتھ مجمع کے سامنے دھوئے اور کہا میں اس نیکوکار کے خون سے بری ہوں تم جانو تو سب عوام نے کہا اس کا خون ہم پر اور ہماری اولادوں پر ہوگا، اس وقت یسوع کو کوڑے لگائے گئے اور سولی دی گئی۔" (۲۷: ۲۳-۲۶)

---

[1] باراباس قاتل تھا جو شہر کے کسی ہنگامہ میں پکڑا گیا تھا۔

یہودیوں اور عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق، اس کے بعد حضرت مسیحؑ کو سولی پر چڑھا دیا گیا
راہگیر آپ کو دیکھ کر اس طرح مذاق اڑاتے:

"اے ہیکل کو توڑ کر تین دن میں بنانے والے اپنے آپ کو چھٹکارا دلا دے اگر تو ابن اللہ ہے
تو صلیب پر سے اتر آ، کاہنوں کے سردار بھی شیوخ و کتبہ کے ساتھ مذاق کر رہے تھے، اور
کہتے تھے کہ دوسروں کو چھڑاتا تھا لیکن اپنے آپ کو چھڑانے پر قادر نہیں۔ اگر وہ اسرائیل کا بادشاہ
تھا تو اب صلیب پر سے اتر آئے ہم اس پر ایمان لے آئیں گے۔ اس نے اللہ پر تہمت لگائی
تھی اس لیے اب اس کو اللہ اگر چاہے تو بچالے۔" (۲۷: ۴۰ - ۴۳)

"۲ بجے ساری زمین پر اندھیرا چھا چکا تھا، ۹ بجے تک ۹ بجے یسوع بڑی زور سے چلایا
ایلی ایلی (الٰہی الٰہی) تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔" (۲۷: ۴۵ - ۴۶)

مسیحیوں کے عقیدہ کے مطابق سولی دینے کے بعد حضرت مسیحؑ کی لاش دفن کر دی گئی اور دوسرے دن

"رؤسا، کہنہ اور فقہاء پیلاطس کے پاس گئے اور کہا اے سردار ہم کو یاد آتا ہے کہ اس
گمراہ نے کہا تھا کہ وہ تین دن بعد قبر سے اٹھے گا۔ اس لیے حکم دیجئے کہ تین دن تک قبر کی نگرانی
کی جائے، تاکہ اس کے شاگرد اسے چرا نہ لیں اور عوام سے کہیں کہ وہ مردوں میں سے اٹھ گیا،
تو آخری گمراہی پہلی گمراہی سے بھی زیادہ سخت ہو۔" (۲۷: ۶۳ - ۶۴)

اس کے بعد مسیحی معتقدات کے مطابق تین دن بعد حضرت مسیحؑ قبر سے نکل کر فرشتوں کے درمیان
آسمان پر چلے گئے،

ان بیانات سے پوری طرح ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں ہی نے حضرت مسیحؑ کو سولی دلوائی،
جس سے کوئی عیسائی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اب ہم اس واقعہ کے متعلق جزئی اختلاف یا تشریح دوسری اناجیل سے مختصر طور پر درج

کرتے ہیں، انجیل مرقس سے پتہ چلتا ہے کہ یہود کو قتل مسیح کا خیال پہلی بار کب آیا

"وہ یروشلم آیا، جب یسوع ہیکل میں داخل ہوا تو اس نے لوگوں کو نکالنا شروع کیا جو وہاں خرید و فروخت کرتے تھے، اور صرافوں کی میزیں اور کبوتر بیچنے والوں کی کرسیاں الٹ دیں، اور وہ یہ کہکر ان کو سکھا رہا تھا کہ لکھا ہوا تو یہ تھا کہ میرا گھر نماز کا گھر ہو تمام امتوں کے لیے اور تم نے اس کو چوروں کا غار بنا دیا ہے، کتبہ اور کاہنوں کے سرداروں نے یہ سنا تو چاہا کہ اس کو ہلاک کر دیں لیکن وہ اس سے ڈرے کیونکہ مجمع سب کا سب اس کی تعلیم سے مبہوت ہو گیا۔" (مرقس ۱۱: ۱۵-۱۸)

انجیل لوقا کے بیان کے مطابق حضرت مسیحؑ کو ہلاک کرنے کا ارادہ اور ان کی مشکلات

"وہ ہر دن ہیکل میں تعلیم دیا کرتا تھا، اور کہنہ کے سردار کتبہ اور عوام کے لیڈر چاہتے تھے کہ اس کو ہلاک کر دیں لیکن جو چاہتے تھے اس کو کر نہ پاتے تھے کیونکہ سارے عوام اس سے جڑے ہوئے تھے، اور اس کی سنتے تھے۔" (۱۹: ۴۷-۴۸)

لوقا کی روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ جب یہوذا نے پیار کیا تو مسیحؑ نے کہا

"کیا پیار کے ذریعہ ابن انسان کو پکڑوایا جاتا ہے۔" (۲۲: ۴۸)

یہ واقعہ بھی ہے کہ جب ایک شاگرد نے رئیس کہنہ کے غلام کو تلوار ماری اور اس کا کان کٹ گیا تو مسیحؑ نے

"اس کا کان چھو دیا اور وہ اچھا ہو گیا۔" (۲۲: ۵۱)

رؤسا و کہنہ کے محاکمہ کی تفصیل اس طرح ہے۔

"انھوں نے کہا اگر تو مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے۔ اس نے کہا کہ اگر میں تم سے کہوں گا تو سچ نہ مانوگے، اور اگر میں سوال کروں گا تو جواب نہ دوگے اور نہ مجھے چھوڑ دوگے اس وقت

سے ابن انسان قوتِ الٰہی کے داہنی طرف بیٹھے گا۔ تو لوگوں نے پوچھا کیا تو خدا کا بیٹا ہے،
تو اس نے کہا کہ تم کہہ رہے ہو تو انھوں نے کہا کہ اس کے بعد ہم کو گواہی کی ضرورت نہیں
ہم نے اس کے منہ سے سن لیا" (۲۲: ۶۶-۷۰)

بیلاطس کے سامنے محاکمہ کے سلسلہ میں لوقا کی روایت تینوں اناجیل سے مختلف ہے،
اس کی رو سے جب بیلاطس نے سنا کہ

"یہ شخص جلیلی ہے اور ہیرودس کی سلطنت کا فرد ہے تو اس کو ہیرودس کے پاس بھیجدیا
کیونکہ وہ بھی اس زمانہ میں اورشلیم میں تھا" (۲۳: ۶-۷)

"ہیرودس نے جب یسوع کو دیکھا تو بہت خوش ہوا کیونکہ وہ بہت زمانے سے چاہتا
تھا کہ اس کو دیکھے، کیونکہ اس نے اس کے متعلق بہت سی باتیں سنی تھیں، اور چاہتا تھا کہ
اس کی کوئی نشانی اپنی آنکھ سے دیکھے، تو اس نے بہت سی باتوں کے سوال کیے تو اس نے
کچھ جواب نہ دیا، کاہنوں کے سردار اور کتبہ اس کی پذور لہجہ میں شکایت کر رہے تھے،
تو ہیرودس نے اپنے لشکر کے سامنے اس کو حقیر سمجھا اور مذاق اڑایا، اور چمکدار لباس پہنایا
اور بیلاطس کے پاس واپس بھیجدیا۔ اور بیلاطس و ہیرودس دونوں اسی دن سے
دوست بن گئے، کیونکہ اس سے پہلے ان میں دشمنی تھی" (۲۳: ۸-۱۲)

"بیلاطس نے رؤسائے کہنہ اور عظمائے شعب کو بلایا اور ان سے کہا کہ تم نے میرے
پاس اس شخص کو اس طرح پیش کیا ہے جیسے کہ یہ عوام کو خراب کر رہا ہو اور میں نے تمھارے
سامنے اس کو جانچا اور اس انسان میں کوئی وہ علت نہیں دیکھی جس کی تم شکایت کر رہے ہو
اور نہ ہیرودس نے اور نہ کوئی ایسی بات جس کی وجہ سے موت کا مستحق ہو، میں اس کی تادیب
کر کے اس کو چھوڑ دیتا ہوں" (۲۳: ۱۳-۱۶)

"لیکن وہ بڑی بڑی آواز سے چیخ رہے تھے کہ سولی دیجائے تو ان کی آوازیں اور کہنے کے سرداروں کی آوازیں بھاری پڑیں اور پیلاطس نے ان کی طلب قبول کی۔" (۲۳: ۲۳-۲۴)

ہیرودیس کا قہقہہ لگانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کو حضرت مسیحؑ سے جو عقیدت تھی اور وہ ان سے جو باتیں پوچھنا چاہتا تھا اس کا جواب وہ نہ دے سکے کیونکہ وہ مسیح نہیں بلکہ یہود! تھا، برناباؔ نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے (فصل ۲۱۷: ۵۹-۶۴) بہرحال اس بات کے انکار یا اثبات کا یہ موقع نہیں،

صرف انجیل یوحنا میں اس تہمت کا کچھ اثر پایا جاتا ہے، جو یہودیوں کے مذہبی طبقہ نے حضرت مسیحؑ پر لگائی تھی یعنی ہیکل کا قصہ

"تو یسوع نے کہا تم اس ہیکل کو ڈھادو اور تین دن میں میں اس کو کھڑا کردوں گا تو یہود نے کہا کہ ۴۶ سال میں یہ ہیکل بنا تو کیا تو اس کو تین دن میں بنادے گا لیکن وہ اپنے جسم کے ہیکل کے متعلق کہہ رہا تھا، اور جب وہ مردوں میں سے اٹھ کھڑا ہوا تو شاگردوں نے یہ بات یاد کی۔" (۲: ۱۸-۲۲)

یوحنا میں یہ بھی ہے کہ صلیب کے قصے سے پہلے بھی حضرت مسیحؑ نے یہود سے کہا تھا کہ تم مجھکو کیوں قتل کرنا چاہتے ہو۔

"کیا موسیٰ نے تم کو ناموس نہیں دیا تھا اور تم میں سے اب کوئی ناموس پر عمل پیرا نہیں، تم مجھے قتل کرنا کیوں چاہتے ہو۔" (۷-۱۹)

دوسری جگہ ہے

"میں جانتا ہوں کہ تم ابراہیم کی اولاد ہو لیکن تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو، کیونکہ میری بات کی جگہ تمہارے پاس نہیں، میں وہ گفتگو کرتا ہوں جو میں نے اپنے باپ کے پاس

دیکھا ہے اور تم وہ کرتے ہو جو تم نے اپنے باپ کے پاس دیکھا ہے۔ انھوں نے جواب دیا ہمارا باپ ابراہیم ہے تو یسوع نے کہا اگر تم ابراہیم کی اولاد ہوتے تو ابراہیم والے کام کرتے لیکن تم اب میرا قتل چاہتے ہو اور میں وہ انسان ہوں کہ جس نے تمھارے سامنے حق کہا جو اللہ سے سنا تھا۔ یہ کام ابراہیم نے نہیں کیا تھا۔" (۷: ۳۷-۴۰)

یوحنا میں قتل کی سازش کے سلسلے میں اس طرح وارد ہے کہ

"رؤسائے کہنہ اور فقہا نے جلسہ بلایا اور کہا ہم کیا کریں، یہ انسان بہت سی نشانیاں لاتا ہے، اور اگر اس کو ہم چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے اور رومی آکر ہماری جگہ اور امت پر قبضہ کر لیں گے، تو ان میں سے ایک نے کہا اور وہ جو اس سال کا رئیس کہنہ تھا، تم کچھ نہیں جانتے اور یہ نہیں سوچتے کہ ہمارے لیے کیا بہتر ہے کہ ایک انسان مر جائے سب عوام کی طرف سے اور پوری امت ہلاک ہو۔ پھر اسی دن سے وہ مشورہ کرنے لگے کہ اس کو قتل کر دیں۔" (۱۱: ۴۸-۵۳)

گرفتاری کے سلسلے میں یوحنا نے بوسہ وغیرہ کا تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن ایک نئے طریقہ پر روایت کی ہے جس سے بہت سے عقدوں کی گرہ کشائی ہوتی ہے۔

"یہوذا، لشکر، رؤسائے کہنہ اور فقہا کے خدام لیکر آیا اور مشعلیں، دیے اور ہتھیار ان کے ساتھ تھے، تو یسوع نکلا اور وہ جانتا تھا کہ اس پر کیا واقع ہوگا۔ اور ان سے پوچھا تم کس کو چاہتے ہو، انھوں نے جواب دیا یسوع الناصری کو، یسوع نے کہا میں وہ ہوں اور اس کو پکڑنے والا یہوذا بھی ان کے ساتھ وہاں کھڑا تھا، پس جب اس نے کہا کہ میں وہ ہوں تو لوگ پیچھے کی طرف لوٹے اور زمین پر گر پڑے اور پھر دوسری بار پوچھا اور گرفتاری عمل میں آئی۔" (۱۸: ۳-۹)

اس روایت میں رومی لشکر کا وجود، رات کی تاریکی، لشکریوں کا زمین پر گر پڑنا وغیرہ نئی باتیں ہیں جو اور کسی روایت میں نہیں اور "شُبّہ لہم" کی مؤید ہیں،

رئیس کہنہ کے سامنے محاکمہ کے سلسلے کی روایت بھی یوحنا کی روایت سے قدرے مختلف ہے نیز رئیس کہنہ کے پاس باندھ کر بھیجنے والے کے نام کی بھی تصریح ہے

"رئیس کہنہ نے یسوع سے سوال کیا اس کے شاگردوں اور تعلیمات کے متعلق تو یسوع نے جواب دیا، میں نے عالم سے کھل کر بات کی ہے میں نے ہر وقت لوگوں کو مجمع میں اور ہیکل میں تعلیم دی ہے، جہاں ہمیشہ یہود جمع ہوتے ہیں، اور چھپ کر کبھی کوئی بات نہیں کی، مجھ سے کیوں پوچھتے ہو، ان سے پوچھو جنھوں نے سنا ہے کہ میں نے کیا کہا ہے، جب یہ کہا تو یسوع کو ایک خادم نے طمانچہ مارا۔ اور وہ کھڑا ہوا یہ کہہ رہا تھا کہ کیا اس طرح رئیس کہنہ کو جواب دیتا ہے کی گواہی دے اور اگر اچھی بات کہی تو مارتا کیوں ہے۔ اور حنان نے اس کو باندھ کر قیافا رئیس کہنہ کے پاس بھیجا تھا۔" (۱۸: ۱۹-۲۴)

بلاطس کے سوال و جواب کو بھی یوحنا نے اسے مختلف انداز میں نقل کیا ہے جس سے آسمانی مملکت کا پتہ چلتا ہے۔

"کیا تو یہود کا بادشاہ ہے، تیری امت اور رؤسائے کہنوت نے تجھے میرے پاس بھیجا ہے تو نے کیا کیا ہے، یسوع نے کہا میری حکومت اس دنیا میں نہیں اگر میری مملکت اس عالم میں ہوتی تو میرے خادم جہاد کرتے کہ میں یہود کے ہاتھ نہ آؤں لیکن اس وقت میری مملکت یہاں نہیں ہے" (۱۸: ۳۵-۳۶)

بیلاطس کو برأت کا یقین تھا اس لیے اس نے

"یہود سے کہا کہ اس کو تم لے لو اور پھانسی دو کیونکہ میں تو اس میں کوئی برائی نہیں دیکھتا، تو یہود نے کہا ہمارے پاس ناموس ہے اور اس ناموس کے مطابق واجب ہے کہ یہ مرے کیونکہ اس نے اپنے آپ کو

اللہ کا بیٹا بتایا ہے۔ یہ سن کر بیلاطس اور خوف زدہ ہوا" (۱۹: ۶-۸)

اس نے بار بار سوال کیا لیکن مسیحؑ نے کوئی جواب نہیں دیا، پھر بھی

"بیلاطس نے چاہا کہ اس کو چھوڑ دیں لیکن یہود نے چیخ چیخ کر کہا کہ اگر تم نے اس کو چھوڑ دیا تو تم قیصر سے محبت نہیں کرتے کیونکہ جو بھی اپنے کو بادشاہ کہے وہ قیصر کے خلاف ہے" (۱۹: ۱۲)

"پھر زور زور سے پکار کر یہودنے کہا اس کو لیکر پھانسی دیدو، بیلاطس نے ان سے کہا کیا تمھارے بادشاہ کو سولی دیدوں تو رؤسا کہنہ بولے کہ قیصر کے سوا ہمارا کوئی بادشاہ نہیں، اس وقت پھانسی کے لیے حکم دیدیا" (۱۹: ۱۵-۱۶)

سولی کے بعد کی تفصیلات سب جگہ اس طرح بیان ہوئی ہیں کہ ہیکل ٹوٹ گیا، مردے نکل پڑے، خدانے کپڑے تقسیم کیے، حضرت عیسیٰؑ قبر سے نکل کر آسمان پر چلے گئے۔

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مسیحی عقائد کے مطابق مصلوبیت مسیح کی ذمہ داریاں اور اسلامی عقائد کے مطابق صلب مسیح کی کوشش کی ذمہ داری یہود پر عائد ہوتی ہے۔

قبل اس کے کہ دوسرے موضوع پر گفتگو کیجائے، مختصر طور پر یہ بتادینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب مسیحی علماء کی رائیں بھی حضرت مسیحؑ کی مصلوبیت اور الوہیت کے سلسلے میں بدل چکی ہیں اور وہ ان کو قدیم قصص واساطیر میں سمجھنے لگے ہیں، یہاں سر آرتھر فنڈلی کی کتاب "ثمرۃ الحق" کے اس اقتباس سے اس کا اندازہ ہوگا، وہ لکھتے ہیں

"شہر بابل میں ایک اثری لوح کا انکشاف ہوا ہے جس سے ثابت ہوا ہے کہ ان کا معبود بعل انہی صفات سے متصف تھا جو عیسیٰ کی طرف منسوب کی گئی ہیں اور یہ لوح عصر مسیح سے سینکڑوں سال قبل تقریباً ۱۲۰۰ پہلے لکھی گئی تھی"

پھر ان دونوں کا موازنہ اس نقشہ سے کیا ہے۔

بابلی اصول جو اثری لوح پر سے اتار کر لکھے گئے ہیں	مبادی مسیحی جو انجیل متی کے باب نمبر ۲۷ و ۲۸ سے لیے گئے ہیں
۱۔ بعل کو قید کیا گیا	۱۔ عیسیٰ کو قید کیا گیا
۲۔ بعل کا محاکمہ عدالت کے ہال میں ہوا	۲۔ عیسیٰ کا محاکمہ بیلاطس کے ہال میں ہوا
۳۔ بعل کو مارا گیا	۳۔ عیسیٰ کو کوڑے لگائے گئے
۴۔ بعل کو پہاڑ پر لے جایا گیا	۴۔ عیسیٰ کو جمجمہ پر لے جایا گیا
۵۔ ایک مجرم کو چھوڑا گیا اور اس کے ساتھ دو مجرم لیے گئے	۵۔ ایک مجرم کو چھوڑا گیا (بار اباس) اور دو مجرم لیے گئے
۶۔ بعل کو لینے کے بعد شہر ڈھا گیا	۶۔ عیسیٰ کی موت کے بعد ہیکل ٹوٹ گیا مردے نکل کر شہر میں داخل ہو گئے۔
۷۔ بعل کے کپڑے لیے گئے	۷۔ فوجوں نے اس کے کپڑے تقسیم کر لیے اور لباس کے لیے قرعہ ڈالا
۸۔ بعل پہاڑ پر گیا اور زندگی سے پوشیدہ ہو گیا۔	۸۔ عیسیٰ قبر سے نکل کر عالم اموات میں چلے گئے۔
۹۔ ایک عورت قبر کے پاس روتی ہوئی آئی	۹۔ مریم مجدلیہ قبر کے پاس روتی ہوئی گئی،
۱۰۔ بعل دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آیا	۱۰۔ عیسیٰ قبر سے نکل کر زندہ آسمان پر چڑھ گیا۔

ابن رشیق قیروانی

(عربی تنقید کا شارح و مدون)

از جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے پی ایچ ڈی (علیگ) پروفیسر شعبہ عربی کالیکٹ یونیورسٹی آندھرا

پانچویں صدی ہجری میں عربی تنقید اپنے اوج کمال کو پہنچ گئی تھی، اس کے بعد پھر اس میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا، بلکہ انحطاط و جمود شروع ہو گیا، اس دور میں دو بڑے ناقد پیدا ہوئے، ایک ابن رشیق قیروانی اور دوسرے عبد القاہر جرجانی، ابن رشیق اس حیثیت سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے پہلی بار گذشتہ ناقدوں کے تنقیدی افکار کا جائزہ لیا اور ان کو حسن ترتیب سے ایک کتاب میں جمع کر دیا، اسی کے ساتھ جا بجا اپنے ذاتی خیالات کا اظہار بھی بڑے سلیقہ سے کیا ہے، جس سے ان کے علم کی وسعت، فکر کی پختگی، ادبی تنقید کے پہلوؤں پر گہری نظر اور طبیعت کی جولانی کا بھی پتہ چلتا ہے، ان خوبیوں کے باوجود ابن رشیق نے عربی تنقید میں کسی نئے نظریہ کا اضافہ نہیں کیا، ان کی حیثیت عربی تنقید میں ایک شارح کی ہے جس نے بڑی خوبی سے تمام عرب ناقدوں کے تنقیدی افکار کو شرح و بسط کے ساتھ پیش کر دیا ہے، ان کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھایا ہے، اور اپنی ذوقِ سلیم رایوں سے ان کے نظریات میں توازن پیدا کیا ہے، اس کے برعکس عبد القاہر جرجانی کے یہاں ایک نیا پن ہے اور ان میں ایک مجددانہ شان نظر آتی ہے، انکی دونوں کتابیں دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغہ نئے اسلوب اور نئے طرز فکر کی حامل ہیں جن میں ادبی تنقید کے نفسیاتی نقطۂ نظر کی ترجمانی ملتی ہے جس سے اس وقت تک عربی تنقید کا دامن خالی

ابن رشیق کی کتاب "العمدۃ فی محاسن الشعر وآدابہ ونقدہ" ایک جامع اور مفصل کتاب ہے، جس میں عربی تنقید کے صدیوں کے سرمایہ کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے، اور عربی شاعری کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے، اور نہ صرف شعر کی تنقید سے بحث کی گئی ہے بلکہ وہ تمام ادبی روایتیں جو عربی شاعری سے وابستہ تھیں، اس میں موجود ہیں، شعراء کے بارے میں قبائل کے اختلافات کی بھی داستان دہرائی گئی ہے جن قبائل میں شعر و شاعری کا چرچا رہا ہے ان کی فہرست دی گئی ہے جنگوں کے متعلق عربوں نے جو رزمیہ نظمیں لکھی ہیں ان کی تفصیل بھی ہے، اور ان مقامات کی جن کا ذکر عربی شاعری میں کثرت سے ہے، ان کی تشریح بھی کی گئی ہے، اس طرح ابن رشیق کے دور تک شعر اور اس کی تنقید کے بارے میں جس قدر سرمایہ عربوں کے پاس تھا کتاب عمدہ میں اسکا پورا خلاصہ موجود ہے، اسی جامعیت کو دیکھکر ابن خلدون نے لکھا ہے:

"اہل افریقہ میں سے جن لوگوں نے علم بدیع (جس میں تنقید بھی اس دور میں شامل سمجھی جاتی تھی) پر لکھا ہے، ان میں ابن رشیق کی کتاب العمدۃ مشہور و ممتاز ہے جن لوگوں نے ان کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھایا ان سب نے ابن رشیق کی تقلید کی اور ان کے طرز کو اختیار کیا"[1]

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعد کے ناقدوں پر ابن رشیق کے اثرات نمایاں ہیں، چنانچہ ابن اثیر نے "المثل السائر" میں جمع و تطبیق کی وہی راہ اختیار کی ہے جو ابن رشیق نے "عمدہ" میں پیش نظر رکھی تھی، مگر ان دونوں کے بعد عربی تنقید ختم ہو گئی اور خود ان میں بھی سوا تدوین کی کوششوں کے کوئی جدت اور اپج نہیں ہے، البتہ اسی دور میں عبدالقاہر جرجانی نے عربی تنقید میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی مگر وہ آگے نہ بڑھ سکی اور چھٹی صدی ہجری شروع ہوتے ہی جمود و انحطاط کا شکار ہو گئی اور صدیوں کا یہ سناٹا عصر جدید میں جب انگریزی اور فرانسیسی تنقید کے فیض سے

---

[1] مقدمہ ابن خلدون مکتبہ تجاریہ کبری مصر، ص ۵۵۲

عربی تنقید کو ایک نئی زندگی عطا ہوئی ختم ہوا

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب العمدہ کے بعض مباحث کو پیش کیا جائے تاکہ اس سے عربی تنقید اور ابن رشیق کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے،

ابن رشیق لکھتے ہیں کہ شعر کے پرکھنے کے لیے ناقدوں کی ایک جماعت ہوتی ہے جو اس کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ کرتی ہے، شعر وہ شخص بھی پرکھ سکتا ہے جو خود شاعر نہ ہو، جیسے بزاز کپڑے میں تمیز کی صلاحیت رکھتا ہے، حالانکہ اس نے اس کو بنا نہیں ہے، اسی طرح صراف سکہ کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا فیصلہ کر دیتا ہے، حالانکہ خود اس نے سکہ کو ڈھالا نہیں ہے، ناقد بھی شعر کی تنقید میں ایک مخصوص صلاحیت کا حامل ہوتا ہے،[1]

شعر کا حسن ایک صفت ہے، جو ناقد کے دل میں احساس حسن کو جنم دیتا ہے، جیسے تلوار کی چمک یا چہرہ کی ملاحت کو طبیعت محسوس کر لیتی ہے، اسی طرح ناقد کی طبیعت حسنِ شعر کو تاڑ لیتی ہے۔[2]

شاعر کو شاعر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اشیاء و امور کو دوسروں سے پہلے محسوس کر لیتا ہے، اگر کوئی شاعر نہ نئے معانی پیدا کرتا ہے نہ نئی فکر پیدا کرتا ہے، نہ نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں استعمال کرتا ہے، اور کوئی جدت اس کے کلام میں نہیں ہوتی تو لفظ شاعر کا اطلاق اس پر مجازی ہوگا حقیقی نہیں، اس کو صرف وزن کی خوبی حاصل ہے جو ایک بیکار سی شے ہے۔[3]

ابن رشیق کا خیال ہے کہ شاعری کی چار بنیادیں ہیں، لفظ، معنی، وزن اور قافیہ[4] اسکی مثال ایک گھر کی سی ہے، شعر ایک عمارت ہے، اس کا مقام طبیعت ہے، اس کی بلندی روایت ہے (یعنی وہ ادبی روایتیں جو ہر ادب میں ہوتی ہیں) اس کا دروازہ مشق و ممارست ہے،

---

[1] العمدہ ج ۱ مؤلفہ ابن رشیق قیروانی، مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۹۰۷ء ص ۱۱۰، [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۱۹ [3] ایضاً ص ۱۱۶

[4] ایضاً ص ۱۲۱ ۵

اس عمارت کا مکین "معنیٰ" ہے اور اس گھر میں کوئی خوبی نہیں جس میں کوئی رہنے والا نہ ہو،[1]

شعر کے سلسلہ میں بلاشبہہ یہ ایک وقیع رائے ہے، اور عمارت سے اس کی تشبیہ نہایت مناسب ہے، ان کے اس خیال سے ایک اور نظریہ کی تائید ہوتی ہے، عربوں میں الفاظ و معانی کی اہمیت کے بارہ میں جو اختلافات تھے ان میں معنی کی اہمیت کا اندازہ ابن رشیق کی اس رائے سے ہوتا ہے کہ بغیر ساکن کے مسکن بے کار ہے، انھوں نے اس مسئلہ پر اپنی مستقل اور وقیع اور متوازن رائے کا اظہار کیا ہے، جس کا ذکر آئندہ سطور میں تفصیل سے کیا جائیگا۔

ابن رشیق کی رائے میں شاعری خطابت سے بلند تر چیز ہے، اس لیے کہ شاعری کے اثرات صدیوں رہتے ہیں، شاعری کی عظمت کا پتہ ابتدا ہی سے چلتا ہے مگر اس کی اہمیت اس وقت سے کچھ کم ہوگئی ہے جب سے شعرا نے شاعری کو ہجو کا ذریعہ بنا لیا، ان کا کردار خراب ہوگیا، وہ لوگوں کی عزت و آبرو پر حملہ کرنے لگے، اور انھوں نے شاعری کو ذریعۂ معاش بنا لیا، ان وجوہ سے خطابت کو شاعری پر فوقیت حاصل ہوگئی[2]

ابن رشیق کی یہ توجیہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتی، اگر شاعری فی نفسہٖ خطابت سے افضل ہے تو بعد میں وہ کیسے اس کے مقابلہ میں غیر اہم ہو سکتی ہے، اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شعرا کا اخلاق و کردار بلند نہ رہ گیا تھا، مگر فن شاعری کو اس کی وجہ سے غیر اہم قرار نہیں دیا جا سکتا، واقعہ یہ ہے کہ زندگی میں خطابت و شاعری دونوں کی اپنی اہمیت مسلم ہے، اور دونوں کا میدان مختلف ہے، لہذا یہ موازنہ ہی صحیح نہیں ہے۔

ابن رشیق کا خیال ہے کہ نثر کا آغاز نظم سے پہلے ہوا ہے، اور عربوں میں نثر زیادہ اور نظم کم ہے، لیکن اچھی نثر محفوظ نہیں رہ سکی، اور اچھے اشعار عربوں نے پوری طرح محفوظ رکھے، کیونکہ

---

[1] العمدہ ج ۱ ص ۲۰۰۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۸۲-۸۳

شعر میں وزن و قافیہ کی معمولی زینت بھی اس کو اچھی نثر سے قریب تر کر دیتی ہے[1]۔

شاعر کو چند ایسی باتیں حاصل ہیں جن کو سوسائٹی دوسروں کے لیے جائز نہیں رکھتی، پہلی بات یہ ہے کہ شعراء کو جھوٹ بولنے کی اجازت ہے، کسی سے شعراء کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا تمھارا اس جماعت کے بارے میں کیا خیال ہے جس میں اعتدال و میانہ روی غیر مستحسن ہو اور جھوٹ اس کے لیے ہنر سمجھا جائے، دوسرا جواز شعراء کے لیے یہ ہے کہ وہ اپنی تعریف دل کھول کر کر سکتے ہیں، اگر عام لوگ اپنی تعریف اپنی زبان سے کریں تو اس کو معاشرہ میں مذموم سمجھا جائے گا[2]،

شاعری کے بہت سے آداب ہیں جن کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے، مثلاً شاعر کو اخلاقی اقدار کا حامل اور عمدہ خصائل سے متصف ہونا چاہیے کہ ذہن میں پاکیزگی پیدا ہو، اسکی زندگی اچھے کردار کا نمونہ ہونا چاہیے، طبیعت کی شرافت، حس کی لطافت اور لباس کی خوبی وغیرہ بھی ایسے صفات ہیں جن سے سوسائٹی میں انسان کی قدر ہوتی ہے[3]۔

گذشتہ آثار اور تاریخ کا مطالعہ شاعر کے افق کو وسیع کرتا ہے، اخبار و روایات اور گذشتہ انسانی تہذیبوں کا مطالعہ ایک اچھا شاعر بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں، اسکے علاوہ عام علوم قواعد، لغت، فقہ اور حساب وغیرہ بھی بقدر ضرورت جاننا ضروری ہے۔

اصمعی کا خیال ہے کہ کوئی شاعر بلا اشعار کا راوی بنے بغیر صف اول کا شاعر نہیں بن سکتا، عربوں میں یہ بڑی خوبی تھی کہ ہر عظیم شاعر کے "راویہ" ہوتے تھے، جو اس کے اشعار کی نشر و اشاعت کرتے تھے، ان کو بے شمار اشعار حفظ ہوتے تھے، وہ اپنے استاد کے رنگ شاعری کا جیتا جاگتا اشتہار ہوتے تھے، اور لوگوں کو اس کی شاعری سے متعارف کراتے تھے۔

---

[1] کتاب العمدۃ ج ۱ ص ۲۰ [2] ایضاً ص ۲۵ [3] ایضاً ص ۱۹۶

استادی اور شاگردی کا یہ سلسلہ پورے عرب میں پھیلا ہوا تھا چنانچہ اموی دور کا مشہور شاعر فرزدق حطیئہ کا راوی تھا، حطیئہ زہیر کا راوی تھا، زہیر اوس بن حجر کا راوی تھا[۱]

شاعر کے لیے سب سے ضروری اور مقدم مقاصد کلام کا علم ہے یعنی شاعر کو اپنے اندر ایسی قوت و صلاحیت پیدا کرنی چاہیے کہ جب وہ غزل کہے تو خاکساری، خلوص اور محبت کا پیکر بن جائے، جب مدح کرے تو لوگوں کو اپنی جانب مائل کرلے، جب ہجو کرے تو متعلق شخص کے دل میں خلش پیدا کردے۔ مقصود یہ ہے کہ شاعر کو "مخاطب" کے اغراض سے باخبر ہونا چاہئے کہ کس موقع پر کونسا اسلوب اختیار کرنے کی ضرورت ہے، ہر جگہ مناسب حال کلام پیش کرنا ہی فن کے عرفان کی دلیل ہے[۲]

اسی بنا پر شاعر کے وہ اشعار جو غزل، مزاح اور خمریات وغیرہ سے متعلق ہوتے ہیں وہ اس کے ذاتی جذبات و عواطف ہونے کے سبب سے داخلی کیفیت کے حامل ہوتے ہیں، اور جو قصائد وہ برسر عام مجمعوں میں سناتا ہے، ان کو زیادہ اہتمام سے پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، شاعر کا مخاطب اگر بادشاہ، امیر، وزیر یا قاضی ہے تو ہر ایک کے مرتبہ کے لحاظ سے مدح کا اسلوب اور اس کے الفاظ بدل جائیں گے[۳]

شعر کہنے کے بعد اس کو جانچنا چاہیے، یہ امید ہرگز نہ رکھنی چاہیے کہ اس کے کہے ہوئے تمام اشعار ہمیشہ باقی رہ جائیں گے، اس لیے بطیب خاطر معیار سے گرے ہوئے کلام کو خود خارج کردینا چاہیے[۴]

ایک بڑی دلچسپ بحث عرب ناقدوں نے اس سلسلہ میں یہ کی ہے کہ اشعار کہنے کے خاص اوقات اور طریقے ہیں، کبھی شاعر ایک معمولی شعر کہنے پر بھی قادر نہیں ہوتا، کبھی

---

[۱] العمدۃ ج ۱ ص ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸ [۲] ایضاً ص ۱۹۹ [۳] ایضاً [۴] ایضاً ص ۲۰۰

شعار اشعار کہہ ڈالتا ہے۔ اس سلسلہ میں ابن رشیق نے بہت سے شعراء کے تجربات نقل کیے
یں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ انسانی طبیعت مشق و ممارست سے کھلتی اور آگے بڑھتی ہے، انسان
م کرنے ہی سے زیادہ بہتر کام کے لائق ہوتا ہے، اگر کسی میں شاعری کا جذبہ موجود ہے لیکن
ہ اس کو کام میں نہیں لاتا تو وہ خود بخود ختم ہو جائے گا، لیکن اگر محنت کی جائے، دوسرے
شعار کا غور سے مطالعہ کیا جائے، ان کے اسلوب بیان پر نظر رکھی جائے تو امید ہے کہ
بیعت میں روانی پیدا ہو جائے گی اور فکر کا چشمہ جاری ہو جائے گا۔

کبھی شاعر کو شعر کہنے میں دقت محسوس ہوتی ہے، مگر تنہائی میں جا کر طبیعت میں قوت
سوس کرنے لگتا ہے کبھی وہ بہتے ہوئے دریا، خوشنما باغ، اونچے ٹیلوں، پہاڑ اور دوسری
جگہوں پر جا کر اپنی طبیعت میں امنگ پیدا کرتا ہے، جس سے شعر کہنے میں آسانی محسوس
ہوتی ہے، صبح سویرے کا وقت شاعر کے لیے بہت مناسب ہے، گو شام کا وقت بھی
معتدل ہوتا ہے، مگر اس میں دو خرابیاں ہیں، ایک تو آدمی دن بھر کا تھکا ہوتا ہے، دوسرے
روشنی ختم ہونے اور تاریکی پھیلنے لگتی ہے، اس لیے طبیعت کو تحریک نہیں ہوتی، اس کے
مقابلہ میں رات بھر آرام کرنے کے بعد صبح کو بالکل تر و تازہ ہو جاتا ہے، اس لیے رات اور دن
بہترین وقت یہی ہے، اور شاعری کے لیے اس سے بہتر دوسرا وقت نہیں۔[۱]

شاعری میں تطویل اچھی چیز نہیں، ابن المعتز سے پوچھا گیا کہ تم کم شعر کیوں کہتے ہو؟
س نے جواب دیا، اگر کم اشعار ہوں تو زیادہ آسانی سے سنے جاتے ہیں، اور اگر عمدہ بھی
ں تو محفل پر چھا جاتے ہیں، مجاز سے پوچھا گیا تم زیادہ اشعار کیوں نہیں کہتے؟ جواب دیا
س لیے کہ فضول باتیں حذف کر دیتا ہوں۔[۲]

۱۔ العمدۃ ج ۱ ص ۲۰۸ ۲۔ ایضاً ص ۱۸۷

"قصیدہ" میں سات اشعار سے کم نہ ہونے چاہئیں، بعض دس یا اس سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، اشعار کی تعداد طاق ہونا مستحسن ہے، ابن رشیق کا خیال ہے کہ جس حد تک طبیعت ساتھ دے اسی حد تک بہتر ہے[1]، بعض شعراء پہلے سے قافیے تلاش کرکے ذہن میں رکھ لیتے ہیں اور بعض تحریر بھی طے کر لیتے ہیں کہ فلاں قافیہ چوتھے شعر میں استعمال ہوگا، ایسا کرنا شاعری کے لیے مضر ہے، اور اس سے تکلف کے سوا کچھ حاصل نہیں[2]، البتہ اگر بہت سے قوافی لکھ لیے جائیں اور ان کا استعمال اچھے انداز سے مناسب جگہ پر کیا جائے اور بار بار نظر ثانی کرکے ان کی صحت کو جانچ لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں[3]۔

مشکل پسندی شعر و شاعری کے لیے سم قاتل ہے، اس سے کلام میں تعقید پیدا ہوتی ہے اور تعقید ایک ایسا عیب ہے جو الفاظ و معانی دونوں کو خراب کر دیتا ہے، اچھے معنی کے لیے اچھے الفاظ کی ضرورت ہے، مشکل الفاظ کلام میں حسن ہرگز پیدا نہیں کر سکتے، بشر بن معتمر کا خیال ہے کہ الفاظ سبک اور شیریں ہونے چاہئیں اور معنی صاف اور واضح انداز میں پیش کرنا ضروری ہے، اگر شاعر خواص کے ذوق کے معانی کو اچھے اسلوب اور ترتیب سے اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان کو عوام بھی سمجھ جائیں تو یقیناً وہ ایک بلیغ شاعر ہے[4]۔

شعر کہنے کے لیے شاعر کو طبیعت میں سکون پیدا کرنے کے لیے فضول اشغال سے بچنا چاہیے، کھانا پیٹ بھر کھانے سے غلط اثرات پیدا ہوتے ہیں، غربت و مفلسی شاعری کے لیے آفت ہے، تونگری سے شاعری کو قوت ملتی ہے، آسودہ حال شاعر سکون و اطمینان سے اپنی شاعری پر نظر ثانی کر سکتا ہے، مگر مفلس کی امیدوں کو افلاس ختم کر دیتا ہے لیکن ان چیزوں میں فطرت اور عادت کو بھی دخل ہوتا ہے[5]۔

---

[1] العمدة ج ۱ ص ۱۸۹ [2] ایضاً ص ۲۱۰ [3] ایضاً ص ۲۱۱ [4] ایضاً ص ۲۱۳ [5] ایضاً ص ۲۱۴

شاعری کے چار اہم مصادر ہیں، خوف، رغبت، خوشی اور غصہ۔ رغبت سے مدح اور شکر کے جذبات پیدا ہوتے اور شعر کا قالب اختیار کرتے ہیں، خوف سے عذر اور طلب عفو پیدا ہوتا ہے، مسرت سے شوق اور غزل کی زمین ہموار ہوتی ہے، غصہ سے ہجو وجود میں آتی ہے۔[۱]

بعض ناقدوں کا خیال ہے کہ سب سے کم درجہ کی شاعری مرثیہ ہے، اس میں نہ ڈر ہوتا ہے اور نہ رغبت۔[۲]

ابن رشیق نے لفظ اور معنی کے مسئلہ پر بہت وقیع رائے کا اظہار کیا ہے، یہ مسئلہ بہت مختلف فیہ رہا ہے کہ عبارت میں حسن کا مرجع الفاظ ہیں یا معانی، اکثر عرب ناقدوں کا خیال تھا کہ معانی کے مقابلہ میں الفاظ زیادہ اہم ہیں، ابن رشیق کہتے ہیں کہ لفظ جسم ہے اور اسکی روح معنی ہے، لفظ کا معنی سے بالکل وہی تعلق ہے جو جسم کا روح سے ہوتا ہے، اگر ان میں سے کسی میں بھی خرابی ہو تو شعر کے لیے عیب ہے جس طرح بعض جسم کانے، لنگڑے اور گونگے وغیرہ ہوتے ہیں، اسی طرح الفاظ کے نقائص وعیوب ہوتے ہیں، اور جس طرح بعض آدمی روحانی ونفسیاتی امراض میں مبتلا ہوتے ہیں، اسی طرح معنی میں بھی خلل واقع ہوتا ہے اور اگر معانی بالکل فاسد ہوں تو الفاظ مردہ ہو جائیں گے اور ان سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ الفاظ خواہ کتنے ہی شاندار ہوں، بغیر معنی کے مردہ کے جسم کی طرح ہیں جس میں بظاہر ہر عضو ہے مگر بالکل بے جان۔[۳]

شاعری کے لیے کچھ الفاظ مخصوص ہوتے ہیں، اور روایتی طور پر اسی میں استعمال ہوتے ہیں، ان کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح شاعرانہ طرز سے ہٹی ہوئی چیزوں کا استعمال بس ایک حد تک ہی جائز ہے، مثلاً فلسفہ کو شاعری کی جگہ مل سکتی ہے مگر ایسا کرنا صحیح نہیں کہ پوری شاعری ایک خشک فلسفہ بن کر رہ جائے۔[۴]

عرب ناقدوں نے شاعری کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے، ایک تو وہ شاعری جو آمد سے ہوتی ہے، دوسری وہ جو آورد کا نتیجہ ہوتی ہے، مگر عربوں میں آمد و آورد[1] کی اصطلاح ذرا مختلف معنی میں استعمال ہوتی ہے، وہاں آمد کا مقصد یہ ہے کہ شاعر کی طبیعت میں جوش پیدا ہو اور بغیر کسی محنت اور توجہ کے شعر ڈھل کر نکل آئیں، اس کو ان کی اصطلاح میں شعر "مطبوع" یعنی فطری شاعری کہتے ہیں، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ شاعر ایک بار نہیں بلکہ بار بار شعر کہتا ہے، پھر کاٹتا ہے، نوک پلک درست کرتا ہے، اور ایک غزل یا قصیدہ حک و اصلاح کے بعد مہینوں میں تیار کرتا ہے، اسکو اصطلاح میں "مصنوع" کہتے ہیں، یہ کوئی مذموم چیز نہیں ہے، بلکہ شعر میں حسن پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے، البتہ اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس محنت کے بعد جو اشعار کہے جائیں ان میں تکلف کے اثرات نمایاں نہ ہوں، زہیر اور نابغہ جو صف اول کے شعرا ہیں اسی زمرے سے تعلق رکھتے تھے، اور اپنے اشعار کانٹ چھانٹ کر منظر عام پر لاتے تھے، اگرچہ بعضوں نے ان کو "شاعری کا غلام" بتایا ہے، مگر عرب ان کو صف اول کے شعرا میں شمار کرتے ہیں، اور بہتیرے تو سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں[2]، ابن رشیق کہتے ہیں کہ فطری شاعر کو وزن و بحر سے واقفیت کی ضرورت پیش نہیں آتی، اس میں اس کی صلاحیت فطری ہوتی ہے، کمزور طبیعتیں اوزان و بحور کی محتاج ہوتی ہیں[3]۔

عرب ناقدوں نے ایک اور دلچسپ بحث کی ہے، وہ یہ کہ کلام کی ابتدا اور انتہا کیسی ہونی چاہیے، ان کا کہنا ہے کہ اگر ابتدائی اشعار اچھے نہ ہوں گے تو پورے کلام پر اس کا اثر پڑے گا، سننے والے اس سے متاثر نہ ہوں گے، خواہ بعد کے اشعار کتنے ہی اعلیٰ درجہ کے کیوں نہ ہوں، اگر آخری اشعار معیاری نہ ہوں گے اور صرف شروع کے شعر اچھے ہوں گے تو آخری اشعار کی بدمزگی طبیعت کو مکدر کر دے گی، ابن رشیق کہتے ہیں کہ شعر ایک تالا ہے جس کا پہلا حصہ

---

[1] ایسے شعرا جن کے یہاں آورد ہے، ان کو عرب "المتکلف" کہتے ہیں [2] ایضاً [3] العمدة ج ۱ ص ۱۲۹ تا ۱۳۰ [4] ایضاً ص ۱۳۰

اس کی کمی ہے۔ شاعر کو ابتدا حسین انداز سے کرنی ضروری ہے،[1]

قصائد میں سب سے اہم مسئلہ "گریز" کا ہے، یعنی تغزل سے مدح کی جانب کس طرح گریز کیا جائے، اس میں اکثر بڑے بڑے شعرا تک ٹھوکریں کھا جاتے ہیں، چنانچہ متنبی جیسے شاعر کے یہاں مطلع اور مقطع کے نامناسب ہونے کی مثالیں کثرت سے مل جاتی ہیں،[2]

قصائد کو ختم کرتے وقت دعا کرنا اہل نظر کے نزدیک پسندیدہ نہیں، اگرچہ بادشاہوں کیلئے دعا کرنا برا نہیں ہے، مگر دعا پر قصیدہ ختم کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا،[3]

بلاغت کیا ہے؟ بعضوں نے کہا کہ وہ کلام جس میں بہت کچھ سمجھا جائے، مگر اکتا ہٹ پیدا نہ ہو، ایک دوسرے شخص نے کہا بلاغت وہ ہے جس میں الفاظ بھوکے رہیں اور معانی کا پیٹ بھر جائے، تیسرے نے کہا کہ بہت سے معانی تھوڑے الفاظ میں پیش کرنا بلاغت ہے، ایک اور صاحب کا خیال ہے کہ معانی کی خوبی اور الفاظ کا اختصار بلاغت ہے، اس طرح پچاسوں اقوال ابن رشیق نے نقل کیے ہیں، سب کا مفہوم یکساں معلوم ہوتا ہے کہ کلام سلیس ہو، آسانی سے سمجھ میں آجائے اور طبیعت کو بھلا معلوم ہو،[4]

ایجاز ایک مستحسن چیز ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تھوڑے الفاظ میں بات قرینہ سے کہدی جائے، اس طرح کہ دل میں اتر جائے،[5]

ابن رشیق کے نزدیک ہر شعر اپنی جگہ ایک وحدت ہے، اور اس کو دوسرے اشعار سے آزاد اور مستقل ہونا چاہیے، سوا قصوں اور حکایات کے جن میں تسلسل ہونا ضروری ہے،[6]

"مخترع" ایسا مضمون جو کسی شاعر کی اختراع ہو، اس سے پہلے اس کو کسی نے نہ پیش کیا ہو۔[7]

"تولید"، ایک شاعر ایک مضمون پیش کرتا ہے، دوسرا شاعر اس میں جدت پیدا کر کے

---

[1] العمدہ ج ۱ ص ۲۲۴ [2] ایضاً ص ۲۳۹ [3] ایضاً ص ۲۴۱ [4] ایضاً ص ۲۴۲ [5] ایضاً ص ۲۵۰
[6] ایضاً ص ۲۷۱ [7] ایضاً ۲۶۲

اور ترقی دیتا ہے، اس کو "تولید" کہتے ہیں۔[1]

"ابداع" اور "اختراع" میں فرق ہے، "اختراع" کے معنی ہیں نئی چیز پیدا کرنا، اور "ابداع" کا مطلب ہے کہ ایسی چیز پیدا کرنا جو عام حالات میں نہ ہوتی ہو اور عادۃً نہ پائی جاتی ہو، مثلاً کبھی شاعر ایسی چیزیں بھی پیش کر دیتا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔[2]

"مجاز" عربوں کے کلام کی خصوصیت ہے، "حقیقت" میں وہ لطف کہاں جو "مجاز" میں ہے، مجاز بلاغت کا سرمایہ اور فصاحت کی دلیل ہے، تشبیہ اور استعارہ بھی مجاز میں داخل ہیں،[3] مجاز حقیقت سے الگ کوئی چیز نہیں، بلکہ اسی کی ایک بلیغ شکل ہے، اسی طرح "کنایہ" بھی مجاز میں داخل ہے، استعارہ مجاز کی اعلیٰ قسم ہے، استعارہ میں جس سے تشبیہ مقصود ہے، وہ اس شے سے بہت زیادہ مختلف نہ ہونی چاہیے جس سے تشبیہ دی جا رہی ہے یعنی مشبہ و مشبہ بہ میں صفات کے لحاظ سے نہ بہت زیادہ دوری ہونی چاہیے اور نہ بہت زیادہ قربت۔[4] عربوں کے یہاں الفاظ زیادہ اور معانی کم تھے، اس لیے وہ ایک معنی کو دوسرے معنی میں مستعار لیتے تھے، اس سے استعارہ پیدا ہوا، یہ بات کسی اور زبان کو حاصل نہیں۔[5]

تشبیہ اور استعارہ میں فرق ہے، تشبیہ یہ ہے کہ مثلاً کہا جائے کہ وہ آدمی شیر جیسا ہے یہاں "جیسا" حرف تشبیہ ہے، آدمی مشبہ ہے اور شیر مشبہ بہ۔ اور وجہ شبہ بہادری ہے، استعارہ یہ ہے کہ میں نے ایک شیر دیکھا جو تیر پھینک رہا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ تشبیہ میں حرف تشبیہ ہوتا ہے اور استعارہ میں حذف کر دیا جاتا ہے اور مشبہ کو عین مشبہ بہ قرار دیا جاتا ہے،[6] تشبیہ اور استعارہ دونوں کا مقصد یہ ہے کہ وہ مبہم اور غامض چیزوں کو واضح کر دیتی ہیں۔[7]

---

[1] العمدۃ ج ۱ ص ۲۶۳ [2] ایضاً ص ۲۶۵ [3] ایضاً ص ۲۶۶ [4] ایضاً ص ۲۷۱ [5] ایضاً ص ۲۷۴ [6] ایضاً ص ۲۸۶

بہت بڑا شاعر وہ ہے جو تمام اصناف شاعری پر قدرت رکھتا ہو، اور ہر میدان میں اس کی عظمت مسلم ہو، ایسے شعرا میں ابو نواس اور بشار بن برد کا نام سرفہرست آتا ہے[1]۔

شعر کی تنقید میں اکثر ناقدین ایک مخصوص میدان ہی میں کامل نظر آتے ہیں، باقی دوسرے موضوعات میں وہ صفر ہوتے ہیں، جاحظ کہتے ہیں کہ میں نے بڑے بڑے ناقدوں کو آزمایا تو معلوم ہوا کہ اصمعی غریب اشعار کی تنقید پر صاحب نظر ہیں، اخفش اعراب کی تنقید اچھی کرتے ہیں، ابو عبیدہ روایات و اخبار کے ماہر ہیں[2] اس سے یہ معلوم ہوا کہ ناقدوں کی ایک مخصوص نظر ہوتی ہے، جو ان کے خاص دائرے تک محدود رہتی ہے، اس لیے جو شاعری کی تنقید پر نظر رکھتا ہو، یہ ضروری نہیں کہ وہ افسانے اور ناولوں کی بھی تنقید کے فرائض انجام دے سکے۔

ابن رشیق کا خیال ہے کہ ادبا زیادہ اچھے شاعر ہوتے ہیں، کیونکہ لطیف الطبع ہوتے ہیں، الفاظ کا ذخیرہ ان کے پاس کافی ہوتا ہے، معانی پر ان کو قدرت ہوتی ہے، اور مختلف طرز و اسلوب سے واقف ہوتے ہیں[3]۔

ابن رشیق کا یہ نظریہ دوسرے عرب ناقدوں سے بالکل مختلف ہے، ان کا خیال ہو کہ اکثر اچھے نثر نگار اور ادیب اچھے شاعر نہیں ہوتے۔

غزل کا حق یہ ہے کہ اس کے الفاظ شیریں اور معانی واضح ہوں، کلام میں صفائی و سادگی ہو اور اتنا موثر ہو کہ غمگین آدمی میں بھی مسرت کی لہر پیدا کر دے۔

اگر تغزل تشبیب کے طور پر ہے تو اس کے فوراً بعد مدح یا ذم آ جانا چاہیے، تغزل اور اس کے بعد کے مضامین میں ربط ضروری ہے، کیونکہ قصیدہ انسان کے جسم کے مانند ہے جس کے تمام اعضا میں گہرا ربط ہوتا ہے، اگر جسم میں کہیں بھی کوئی خلل واقع ہو تو

---

[1] العمدۃ ج ۲ ص ۱۰۴ [2] ایضاً ص ۱۰۵ [3] ایضاً ص ۱۰۶

اس کے اثرات پورے جسم پر مرتب ہوتے ہیں، یہی حال قصیدہ کا بھی ہے، بے ربطی اس کے لیے عیب اور حسن ارتباط اس کی خوبی ہے۔[۱]

مدح اور تشبیب میں توازن ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ پورا قصیدہ مدح یا تغزل بنجائے[۲]

مدح میں الفاظ کا استعمال اور طرز تخاطب اس شخص کے رتبہ کے مطابق ہونا چاہیے جس کی مدح کیجارہی ہے، اگر بادشاہ ہے تو کلام اس کی شان کے مطابق ہونا ضروری ہے، اگر ممدوح قاضی یا ادیب ہے یا عوام الناس میں سے ہے تو ان کی ان خصوصیات کا جو ان کے دائرے میں قابل تعریف ہوں ذکر کرنا چاہیے۔[۳]

مدح کے سلسلہ میں ابن رشیق قدامہ کے خوشہ چیں ہیں، انھوں نے بھی سب سے بہتر مدح اسی کو قرار دیا ہے جس میں "فضائل نفیسہ" یعنی انسان کے کردار کی خوبیوں کا ذکر ہو، یہ خوبیاں چار قسموں میں منقسم ہیں، عدل، عفت، عقل اور شجاعت۔ جو شاعر ان میں سے کسی صفت کا بھی ذکر کرتا ہے، وہ اس شاعر سے بہتر ہے جو جسمانی یا نسبی مفاخر کو بیان کرتا ہے۔ تمام انسانی صفات کا مرجع یہی چار صفتیں ہیں، ان کو ملانے سے کچھ مزید صفتیں وجود میں آتی ہیں، عقل اور شجاعت سے صبر کی صفت پیدا ہوتی ہے اور وفا کی بھی۔ عقل کو عفت کے ساتھ ملانے سے سوال سے نفرت اور قناعت پیدا ہوتی ہے، عقل کو سخاوت کے ساتھ ملانے سے ایفائے عہد پیدا ہوتا ہے، شجاعت کو سخاوت کے ساتھ ملانے سے فیاضی اور سیر چشمی وجود میں آتی ہے، شجاعت کو عفت کے ساتھ ملانے سے فواحش سے نفرت اور غیرت وحمیت پیدا ہوتی ہے، عفت اور سخاوت سے ایثار نفس اور بڑے کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔[۴]

ابن رشیق کے نزدیک مذکورۂ بالا فضائل نفس کے علاوہ ممدوح کے جسمانی صفات

۱؎ العمدة ج ۲ ص ۱۱۷ ۲؎ العمدة ج ۲ ص ۱۲۳ ۳؎ العمدة ج ۲ ص ۱۲۸ - ۱۲۹ ۴؎ ایضاً ص ۱۳۱

اور مادی خصوصیات کا بیان کرنا بھی جائز ہے، گو افضل یہی ہے کہ انسان کی تعریف اس کے اخلاقی فضائل سے کی جائے، وہ اس بارے میں قدامہ کی اس رائے کے خلاف ہیں کہ "فضائل نفیسہ" ہی تک محدود رہنا چاہیے[1]

ابن رشیق ہجو میں سب سے اعلیٰ اس ہجو کو سمجھتے ہیں جس میں "فضائل نفیسہ" کا سلب کیا جائے، یہ بھی قدامہ کے نظریے سے ماخوذ ہے، البتہ ان کے نزدیک جسمانی اور نسبی عیوب سے بھی ہجو ممکن ہے مگر افضل نہیں ہے[2]

مدح اور مرثیہ میں ابن رشیق کے نزدیک کوئی فرق نہیں، بجز اس کے کہ مدح میں حاضر کا صیغہ ہوتا ہے اور مرثیہ میں ماضی کا۔

یہ خیال بھی قدامہ بن جعفر سے مستعار ہے، قدامہ سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی تھی، البتہ ایک بڑی کمی قدامہ کے یہاں یہ ہے کہ انھوں نے مرثیہ کی بنیادی خصوصیات کا ذکر نہیں کیا ہے، غالباً یہ سمجھ کر اس کو چھوڑ دیا ہے کہ "فضائل نفیسہ" جو مدح کی بنیاد ہیں، وہی مرثیہ کی بھی ہیں، حالانکہ مرثیہ میں فضائل نفیسہ کے علاوہ ایسے سوز و گداز کا ہونا بھی ضروری ہے، جس سے میت سے مرثیہ نگار کا قلبی تعلق اور اس کی پریشانی خاطر ظاہر ہو، اس خلا کو ابن رشیق نے پر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مرثیہ میں رنج و غم اور حسرت و الم کا اظہار ضروری ہے[3]

یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ عربوں کے پاس الفاظ کا ذخیرہ زیادہ اور معانی کم ہیں، اگر ان کو کوئی گننا چاہے تو گن سکتا ہے[4] ابن رشیق کہتے ہیں کہ عربوں کے یہاں زمانہ کے امتداد کے ساتھ ساتھ معنی بڑھتے رہے، مثلاً اسلام نے جاہلیت کے مقابلہ میں بہت سے نئے معانی پیش کیے، پھر امویوں کے زمانہ میں نئے نئے معانی اشعار میں داخل ہوئے، اسی طرح

---

۱ العمدہ ج ۲ ص ۱۳۵ ۲ ایضاً ص ۱۴۷ ۳ ایضاً ص ۱۴۷ ۴ ایضاً ج ۲ ص ۲۳۷-۲۳۸

عباسی عہد میں ابو نواس، ابن الرومی اور بشار بن برد وغیرہ نے ایسے ایسے معانی پیش کیے کہ کسی کے دل میں ان کا خیال بھی نہ گذرا ہوگا۔ ابن الرومی اس بارہ میں تمام شعراء سے ممتاز ہے[1]۔

شعراء کی غلطیوں پر بھی ابن رشیق نے ایک باب قائم کیا ہے۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ خطاء و نسیان انسان کی سرشت میں داخل ہے، بڑے سے بڑا شاعر بھی بڑی بڑی غلطیوں کا مرتکب ہو سکتا ہے، لیکن شاعر وہی ہے کہ جب اس کو اپنی غلطی کا علم ہو جائے تو اس کو تسلیم کر لے اور غلطی پر اصرار نہ کرے، ورنہ مزید لغزشوں میں مبتلا ہو جائے گا[2]۔ پھر ابن رشیق نے تمام اہم شعراء کے معائب کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ کس طرح ابو نواس، مسلمہ، متنبی، بحتری، ابو تمام، کعب اور زہیر وغیرہ سے غلطیاں ہوئی ہیں۔

"وحشی" کلام وہ ہے جس سے طبیعت بھاگے اور کان اس کو سننا پسند نہ کریں۔ "رکیک" وہ ہے جس کی بنیادیں کمزور ہوں اور اس میں کوئی فائدہ نہ ہو، رکیک کے لفظی معنی بہت کمزور بارش کے ہیں، رکیک ضعیف العقل کے معنی میں بھی مستعمل ہے[3]۔

شعرا کو وزن اور قافیہ کی پابندیوں کی بنا پر بعض مخصوص قسم کی رعایتیں دی جاتی ہیں، مثلاً وہ الفاظ کو توڑ کر پیش کریں یا کوئی چیز حذف کر دیں یا بڑھا دیں، اس کو "ضرورت شعری" کہا جاتا ہے، مگر اس رخصت سے فائدہ اٹھانا اچھا نہیں، اونچے درجہ کے شعراء کو اس سے بچنا چاہیے[4]۔

تعجب ہے کہ ابن رشیق نے ابن فارس کا ذکر اس سلسلہ میں نہیں کیا، ابن فارس نے ایک رسالہ "ذم الخطاء فی الشعر" لکھا ہے، جس میں یہ بتایا ہے کہ یہ فن کی کمزوری کی دلیل ہے

---

[1] العمدۃ ج ۲ ص ۲۴۴ [2] ایضاً ص ۲۴۵ [3] ایضاً ص ۲۶۵ [4] ایضاً ص ۲۶۹

اس لیے کسی شاعر کو اس قسم کی اجازت نہیں دیجا سکتی، ورنہ پھر ادبا، کو بھی دینی ہوگی۔

سرقات کے ذکر میں ابن رشیق لکھتے ہیں کہ اس سے مبرا ہونے کا دعوی بہت مشکل ہے، یہ بڑی مبہم اور الجھی ہوئی چیز ہے۔ اصل میں ادبی سرقہ اسی مضمون میں ممکن ہے جس کو کسی شاعر نے اپنی ذہانت سے پیدا کیا ہو، اور پھر اس کو دوسرا شخص چرالے، جو مضامین مشترک ہیں اور روزمرہ استعمال ہوتے ہیں ان میں سرقہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بعض متاخرین کا قول ہے کہ جو کسی معنی کو اس کے الفاظ کے ساتھ لے لے وہ سارق ہے، اگر الفاظ کچھ رد و بدل کر دے جب بھی سرقہ ہے، لیکن اگر وہ مضمون کو بدل دے یا اس کا رخ موڑ دے تو یہ اس کی فنی مہارت کی دلیل ہے[1] بدترین سرقہ وہ ہے کہ کوئی شاعر ادنیٰ درجہ کا مضمون پیش کرے اور دوسرا شاعر اس کو چرالے[2]

اگر کوئی شخص کسی معمولی مضمون کو ترقی دے کر پیش کرے یا طویل کو مختصر اور مبہم کو واضح کر دے یا اس کو اس طرح پیش کرے جس سے شعر کا حسن بڑھ جائے تو وہ سرقہ نہیں ہے۔[3]

وصف شاعری کا ایک خاص پہلو ہے، عربی شاعری کے تھوڑے حصہ کو چھوڑ کر کل کی کل وصف سے متعلق ہے، وصف عربی شاعری میں اس کثرت سے ہے کہ اس کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ وصف اور تشبیہ میں یہ فرق ہے کہ وصف حقیقت شے کی خبر دیتا ہے اور تشبیہ اس کو مجاز و تمثیل کے انداز میں پیش کرتی ہے، سب سے بہتر وصف یہ ہے کہ کسی چیز کو اس طرح بیان کیا جائے کہ سننے والا یہ سمجھے کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے، ابونواس، امرؤ القیس بحتری اور ابن الرومی وغیرہ کا سارا سرمایہ وصف ہی ہے۔[4]

---

[1] العمدة ج ۲ ص ۲۸۱ [2] ایضاً ج ۲ ص ۲۹۱ [3] ایضاً ج ۲ ص ۲۹۰ [4] ایضاً ج ۲ ص ۲۹۴-۲۹۵

ابن رشیق کا خیال ہے کہ اکثر شعراء ایسے اشعار کہتے ہیں جن میں تاویل کی بڑی گنجائش ہوتی ہو اور ہر ناقد اس کا ایک نیا مفہوم پیش کرتا ہے[1]، جو شاعری کی عظمت کی دلیل ہے۔

ابن رشیق حشو یعنی اس لفظ کے خلاف ہیں جو بلا ضرورت اور بے فائدہ محض شعر کا وزن قائم رکھنے کے لیے استعمال کیا جائے، وہ صرف ان ہی الفاظ کے استعمال کو جائز قرار دیتے ہیں جن سے کوئی نفع شعری وابستہ ہو[2]۔

ابن رشیق شاعری کو ذریعۂ معاش بنانا برا سمجھتے اور اس کو تہذیب نفس کا ذریعہ تصور کرتے ہیں، ان کی رائے ہے کہ عربوں میں شاعری کو ذریعۂ معاش بنانے کا رواج بعد کی چیز ہے، سب سے پہلے نابغہ ذبیانی نے اس کو رائج کیا[3]۔

ابن رشیق کی رائے میں بہترین کلام وہ ہے جو حقیقت پر مبنی اور جھوٹ اور مبالغہ سے خالی ہو، سب سے بہتر کلام وہ ہے جس پر کتاب اللہ سے کوئی دلیل مل جائے[4]۔ ابن رشیق نے اپنے اس نظریہ میں درحقیقت قدامہ بن جعفر کے خیال کی مخالفت کی ہے کہ مبالغہ سے کلام میں حسن واثر پیدا ہوتا ہے اور کوئی شاعر اس کے بغیر عظمت حاصل نہیں کرسکتا، شاعری میں میانہ روی اور اعتدال کو قدامہ نے بہت نامناسب قرار دیا ہے، اس کے برخلاف ابن رشیق کہتے ہیں کہ مبالغہ کو وہ قبولیت ممکن نہیں جو اعتدال کو حاصل ہے، اس لیے کہ شاعری کے مقاصد میں اظہار اور وضاحت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

ابن رشیق شاعر کو صرف اتنی اجازت دیتے ہیں کہ وہ کسی شے کے وصف میں انتہا تک پہنچ جائے، مگر ان کے نزدیک مبالغہ جائز نہیں[5]۔

اس بحث کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ عربوں کے دو مکاتب فکر پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

---

[1] العمدة ج ۲ ص ۳۰۹ [2] ایضاً ص ۹۶ [3] ایضاً ص ۸۰ [4] ایضاً ص ۶۰ [5] ایضاً ص ۵۵

حضرت حسانؓ کا ایک شعر ہے

ان احسن بیت انت قائله بیت یقال اذا انشدته صدقا

بہترین شعر وہ ہے جس کو سنکر لوگ کہیں کہ سچا ہے

اس کے برعکس بحتری کہتا ہے؛

کلفتمونا حدود منطقکم والشعر یغنی عن صدقه کذبه

تم ہم کو اپنے منطق حدود کا مکلف بناتے ہو حالانکہ شاعری میں جھوٹ سچائی سے بے نیاز کردیتا ہے

واقعہ یہ ہے کہ عربوں میں یہ دو مکاتب فکر ہمیشہ سے رہے ہیں، کچھ ناقد شاعری کو حقیقت پسندی کا مظہر بنانا چاہتے تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ کا مشہور قول ہے کہ زہیر بہترین شاعر ہے، اس لیے کہ وہ آدمی کی اتنی ہی تعریف کرتا ہے جس کا وہ واقعی مستحق ہوتا ہے، قدامہ نے یہ خیال دراصل ارسطو کی "کتاب الشعر" سے حاصل کیا تھا، اور اس سلسلہ میں انھوں نے ایک مشہور قول نقل کیا ہے کہ

احسن الشعر اکذبه بہترین شعر وہ ہو جو زیادہ جھوٹا ہو

اس کے برعکس یہ قول بھی ملتا ہے کہ

احسن الشعر اصدقه بہترین شعر وہ ہے جو زیادہ سچا ہو

یہ فرق درحقیقت عرب ناقدوں کے طرز فکر کے اختلاف کا ہے، ابن رشیق اس مکتب فکر کے ہیں جو "صدق" کو شعر کی جان سمجھتا ہے۔

گذشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مسائل کو پیش کرنے میں ابن رشیق کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اختصار کے ساتھ ان کا خلاصہ کر دیتے ہیں، بعض نظریات کی تشریح بھی کرتے جاتے ہیں اور اگر کہیں کوئی خلا ان کو نظر آتا ہے تو اس کے پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شاعری کے بارے میں ان کو جو معلومات بھی حاصل ہوئے ان سب کو انھوں نے اپنی کتاب

میں جمع کر دیا ہے، مثلاً انھوں نے عربوں کی تمام لڑائیوں کا بھی مختصر ذکر کر دیا ہے، اس لیے کہ ان کا ذکر اکثر اشعار میں آتا ہے، اسی طرح ان عرب قبائل کے نام بھی دیدیے ہیں جن کو عربی شاعری میں امتیاز حاصل رہا ہے، عربوں کے نسب ناموں کا بھی ذکر کر دیا ہے اور مشہور قبائل کی تفصیل بھی دیدی ہے۔ بحور و اوزان پر مفصل بحث کی ہے، غرض کتاب العمدۃ میں عربی شاعری کے متعلق ہر قسم کے ضروری معلومات جمع کر دیے ہیں، اور ان کی مجی تلی رائے اور اختصار و جامعیت نے کتاب العمدۃ کو عربی تنقید میں ایک ممتاز مقام عطا کر دیا ہے۔

ضروری اعلان

ساہتیہ اکیڈمی نے مولانا ابو الکلام آزادؒ کی تصانیف اور تحریروں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ترجمان القرآن کی پہلی جلد وہ شائع کر چکی ہے۔ اب مولانا کے خطوط شایع کرے گی۔ جن لوگوں کے پاس ان کے خطوط ہوں وہ مالک رام صاحب ساہتیہ اکیڈمی رابندر بھون نئی دہلی کے پتہ سے بھیجدیں۔ ان کی نقل لینے کے بعد اصل خطوط حفاظت کے ساتھ واپس کر دیے جائیں گے۔

فارسی میں نثر رنگین کا رواج

[پروفیسر براؤن کے نظریے کا جائزہ]

از جناب سید نیر مسعود رضوی ایم اے، ڈی فل

پروفیسر براؤن نے اپنی تالیف لٹریری ہسٹری آف پرشیا میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ فارسی میں نثر رنگین کی ابتدا اور ترویج بیرونی اثرات کے ماتحت ہوئی، ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ

"تیرھویں صدی عیسوی میں ایران پر مغلوں کے حملے سے پہلے فارسی نثر عام طور پر سادگی اور سلاست کی حامل تھی، اور ایجاز و اختصار میں فارسی کی نثری تالیفیں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ مغلوں، تاتاریوں اور ترکوں کے اثر سے فارسی نثر میں تصنع، آورد اور رنگینی نے دخل پایا، تاتاری، ترک، ہندوستانی اور دوسرے غیر ایرانی سرپرستوں کے زیر سایہ خاص طور پر نثر کا یہ مصنوعی اور رنگین اسلوب پروان چڑھا، مورخ وصاف [عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی] جن کی تاریخ ["تزجیۃ الامصار و تجزیۃ الاعصار"] ۱۳۱۲ء میں مغل بادشاہ الجائیتو کی خدمت میں پیش کی گئی تھی [نثر رنگین کے رواج کا] "پہلا بڑا مجرم" (first great offender) تھا۔ تاریخ وصاف نے بعد کے بہت سے مورخوں کے لیے نمونے کا کام کیا، اور ایران میں لکھی جانے والی بہت سی تاریخی کتابیں اس کے اسلوب سے متاثر ہوئیں۔ ایران کے رنگین نگار نثار خاص طور پر پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں شمال مشرقی ایران اور ماوراء النہر کے تیموری

بادشاہوں کی سرپرستی میں پھولے پھلے۔ ان کے انداز نگارش کی "بدترین شکل کی مکمل ترین نمایندگی" [ملاحسین واعظ کاشفی کی تالیف] "انوار سہیلی" کرتی ہے۔ فارسی نثر کا یہ اسلوب [ظہیر الدین محمد] بابر اپنے ساتھ ہندوستان لے گیا اور "مغلان اعظم" کے دربار میں اس اسلوب نے مزید ترقی کی اور یہی امر اس عام غلط فہمی کا محرک ہوا کہ یہ مخصوص اسلوب اصلاً ایران کی پیداوار ہے، لیکن یہ بات حقیقت سے بعید ہے، اس لیے کہ اس سے قبل اور بعد میں بھی بہت سی فارسی نثر کی کتابیں نہایت سادہ اور سنجیدہ اسلوب میں لکھی گئیں"۔

پروفیسر براؤن کی یہ رائے نظر ثانی کی محتاج ہے، کیونکہ تاریخی حقائق کی روشنی میں یہی ثابت ہوتا ہے کہ فارسی نثر کا یہ مخصوص اسلوب اصلاً ایرانی ہے، اور اس کی ابتدا اور ترویج کسی بیرونی محرک کے زیر اثر نہیں ہوئی، ذیل میں تفصیلات سے قطع نظر کرتے ہوئے اس نظریے پر مختصر بحث کی جاتی ہے۔

ایران میں نثر رنگین کی ابتدا اور مقبولیت تین کتابوں سے ہوئی: "مقاماتِ بدیعی"، "مقاماتِ حریری" اور "مقامات حمیدی"۔ بدیع الزماں ہمدانی (متوفی ۳۹۸ھ/۱۰۰۷ء) جس نے سب سے پہلے "مقامات" لکھے، ہمدان کا رہنے والا ایرانی تھا۔ اس کی عمر ایران ہی میں گزری۔ اس نے مقامات ایران کے شہر نیشاپور میں تصنیف کیے۔ مورخ ابن خلدون کہتا ہے کہ جو شخص بدیعی کے مقامات کو نمونہ بنائے اور انھیں زبانی یاد کرلے اس کا طرز تحریر ان لکھنے والوں سے بہتر ہوگا جو بعد کے یعنی بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے مصنفوں کی تقلید کرتے ہیں۔

بدیع الزماں کے یہ مقامات صرف حریری کے مقامات سے کم درجے کے سمجھے جاتے ہیں، باقی نثر رنگین کی تمام دوسری کتابوں سے بہتر مانے جاتے ہیں۔

حریری کے مقامات رنگینی، لفاظی اور عبارت آرائی میں مقامات بدیع سے بھی آگے ہوئے ہیں، حریری کا سرپرست بھی ایک ایرانی تھا یعنی سلطان محمود بن محمد بن ملک شاہ کا ذی علم اور فیاض وزیر اور مورخ انوشروان بن خالد کاشانی (متوفی ۵۳۲ھ ۱۱۳۸ء) اس کی فرمائش پر حریری نے اپنے مقامات لکھے، جو مدت دراز تک نثر نگاری کا بہترین نمونہ سمجھے گئے۔ نثر کا یہ مخصوص اسلوب بدیع الزمان نے ایجاد کیا اور حریری نے اس کو مکمل کیا۔ دونوں کی بدولت نثر رنگین کو مقبولیت حاصل ہوئی لیکن ان دونوں کتابوں کی زبان عربی تھی، اس اسلوب کی مقبولیت دیکھ کر قاضی حمید الدین ابوبکر بلخی کو خیال ہوا کہ فارسی ادب کا دامن ایسی رنگین نثر سے خالی ہے اور محض فارسی جاننے والے اس کے لطف سے محروم ہیں، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس نے مقامات بدیعی اور مقامات حریری کے طرز میں اپنے مقامات لکھے۔ یہ فارسی مقامات ایرانیوں میں بے حد مقبول ہوئے، جیسا کہ انوری کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے جن کا ملخص ترجمہ حسب ذیل ہے:

"قرآن اور حدیث کے سوا جو قول ہو وہ مقامات حمیدی کے سامنے پوچ گوئی ہے، مقامات بدیعی اور مقامات حریری آب حیات کے اس سمندر [یعنی مقامات حمیدی] کے مقابلے میں اندھے کے آنسو ہیں۔ محمودی شعراجسم ہیں تو قرآن کی روح ہے۔ تو اس عہد کا محمود ہے اور ہم لوگ سومنات کے بت ہیں، اگر میں ایک مقامہ اعدا کے سامنے پڑھ دوں تو حجر اصم میں گویائی آجائے عقل کل اس کی ایک ایک سطر پڑھ کر پکار اٹھتی ہے یا للعجب کیا یہ عالم قاضی الفاظ کی قلب ماہیت کر سکتا ہے؟"

انوری قاضی حمید الدین مصنف مقامات فارسی کا ہم عصر تھا۔ اس کے ایک دوسرے ہمعصر نظامی عروضی نے اپنی کتاب "چہار مقالہ" مقامات حمیدی کی تصنیف کے کوئی سال بھر بعد

اس کا پہلا مقالہ فن انشا پردازی پر ہے، اس مقالے کی ابتدا ہی میں وہ عربی و فارسی نظم و نثر کی ان کتابوں کے نام تجویز کرتا ہے جن کا مطالعہ منشی یا دبیر کے لیے ضروری ہے، اس فہرست میں فارسی نثر کی صرف ایک کتاب شامل کی گئی ہے، اور وہ یہی مقامات حمیدی ہے۔

ان تینوں مقامات کی تصنیف میں کوئی بیرونی محرک شامل نہیں تھا، مقامات بدیعی ایک ایرانی نے لکھے، مقامات حریری ایک ایرانی نے لکھوائے، مقامات حمیدی ایک ایرانی نے ایرانیوں کی زبان میں لکھے اور ایران ہی میں انھوں نے بیحد مقبولیت حاصل کی۔ ان حقائق کی موجودگی میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ فارسی میں نثر رنگین ایران کے باہر کہیں سے آئی تھی۔ مقامات حمیدی بھی ایران پر مغلوں کے حملے سے پہلے کی تصنیف ہے، اور اس خیال کی تردید کرتی ہے کہ نثر کا یہ رنگین اسلوب ایران میں مغلوں کے ساتھ آیا۔

عوفی نے اپنی مشہور کتاب لباب الالباب ہندوستان کے سلطان ناصر الدین قباچہ کے وزیر عین الممالک کے نام معنون کرکے لکھی۔ لباب الالباب کا اسلوب نہایت رنگین ہے لیکن اسی عوفی نے ہندوستان ہی کے ایک اور بادشاہ سلطان شمس الدین التتمش کے نام اپنی کتاب جوامع الحکایات معنون کی اور اس جوامع الحکایات کی نثر اتنی ہی سادہ ہے جتنی لباب الالباب کی نثر رنگین ہے، اس لیے یہ حتمی فیصلہ کیونکر کیا جاسکتا ہے کہ نثر رنگین ہندوستانی حکمرانوں کی سرپرستی میں پھیلی۔

شمس قیس رازی نے اپنی کتاب "المعجم فی معاییر اشعار العجم" اتابک ابوبکر بن سعد زنگی کے نام معنون کی۔ اتابک ماوراءالنہری تھا لیکن معجم کی نثر سادہ اور سلیس ہے۔

ہلاکو خاں کے جانشین ایلخانی مغلوں کا دربار پروفیسر براؤن کے نزدیک نثر رنگین کی سب سے بڑی افزائش گاہ تھا۔ اور ایلخانی حکمراں اس کے خاص قدردان تھے، لیکن تاریخ کچھ اور بتاتی ہے۔

ایلخانیوں کا عہد فارسی تاریخ میں تاریخ نویسی کا عہد ہے۔ اس زمانے کی اہم تاریخی تصنیفوں میں صاحب دیوان عطا ملک جوینی کی "تاریخ جہاں کشا" رشید الدین فضل اللہ کی "جامع التواریخ" حمد اللہ مستوفی قزوینی کی "تاریخ گزیدہ" اور فخر بناکتی کی "تاریخ بناکتی" ہیں ــــ یہ سب سادہ اور صاف نثر میں لکھی گئیں۔ حالانکہ ان کے لکھنے والے ایلخانیوں کے دربار سے وابستہ اور اکثر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز تھے، اور ان میں سے بیشتر نے اپنی اپنی کتابیں بادشاہ کے حکم اور ہدایت کے مطابق لکھی تھیں۔

عہد ایلخانیان کی اہم تاریخوں میں صرف تاریخ وصاف رنگین نثر میں لکھی گئی۔ اسی بنا پر اسکو سب سے زیادہ ادبی عظمت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ جہاں کشائے جوینی اور جامع التواریخ کی سی اہم کتابیں تک قریب قریب مفقود ہو چکی تھیں لیکن تاریخ وصاف کے نسخے آسانی سے دستیاب ہو سکتے تھے، وصاف نے یہ تاریخ کسی مغل بادشاہ کے کہنے پر نہیں بلکہ اپنی مرضی سے اپنے پسندیدہ اسلوب میں لکھی تھی۔ جب یہ کتاب مغل ایلخان الجا تیو کی خدمت میں پیش کی گئی تو اس نے اسے جا بجا سے پڑھوا کر سنا اور بالآخر اس بات کا اعتراف کر لیا کہ یہ طرز انشا اس کی سمجھ سے باہر ہے، لیکن چونکہ اہل زبان ایرانیوں نے اس تاریخ کو بہت قدر کی نظروں سے دیکھا اور اس کو فارسی نثر کا شاہکار قرار دیا تھا اس لیے عبد اللہ بن فضل اللہ کو "وصاف حضرت" کا خطاب اور مغل دربار میں تقرب حاصل ہوا۔

مغلوں کی سلطنت کو امیر تیمور گورگان نے اکھاڑ پھینکا، اور ایران پر تیموریوں کا جھنڈا لہرانے لگا۔ پروفیسر براؤن نے تیمور اور اس کے جانشینوں کو بھی نثر رنگین کے سرپرستوں اور رواج دینے والوں میں شمار کیا ہے، لیکن تیموری عہد کے نثری تالیفات کا ایک سرسری جائزہ ہی اس خیال کو باطل کر دیتا ہے، تیمور کے زمانۂ سلطنت میں شمس فخری نے "معیار جمالی" جیسی نہایت

سلیس زبان میں لکھی، اسی زمانے میں معین الدین یزدی نے "مواہب الٰہی" کے نام سے آل مظفر کے حالات لکھے، مواہب الٰہی کی نثر نہایت رنگین اور پیچیدہ ہے اور تاریخ وصاف کی یاد دلاتی ہے، شمس فخری اور اور معین الدین کے ایک اور ہم عصر شیخ شرف الدین شیرازی نے اسی زمانے میں "شیراز نامہ" کے نام سے اپنے وطن کی تاریخ لکھی اور مواہب الٰہی کے برخلاف اس کا اسلوب سادہ ہے۔

خود تیمور نے نظام الدین شامی سے اپنے حالات میں ایک کتاب "ظفر نامہ" لکھوائی، تیمور نے نظام کو خاص طور پر ہدایت کی کہ اس کتاب کو سادہ نثر میں لکھے اور رنگینی اور عبارت آرائی سے کام نہ لے، چنانچہ نظام نے اس ہدایت کا خیال رکھا، اور اپنے ظفر نامے میں انشاپردازی کو دخل نہیں دیا، اس کے کوئی تینتیس برس بعد شرف الدین علی یزدی نے تیمور کی تاریخ لکھی اور اس نے بھی اپنی کتاب کا نام "ظفر نامہ" رکھا، شرف الدین نے اپنی کتاب کے لیے تقریباً سارے تاریخی حقایق نظام شامی کے ظفر نامے سے مستعار لیے ہیں، دونوں میں خاص فرق بس یہ ہے کہ پہلا ظفر نامہ سادہ نثر میں لکھا گیا تھا، اور دوسرے ظفر نامے میں شرف الدین نے دل کھول کر انشاپردازی کی داد دی ہے، اور اپنے قلم کو بلاغت اور رنگینی کے میدان میں بے تکان دوڑایا ہے، نظام الدین کا ظفر نامہ بالکل مقبول نہ ہو سکا اور بہت جلد کمیاب ہو گیا۔ شرف الدین کے ظفر نامے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ دولت شاہ اس کی تعریف میں مبالغے کی حدوں تک پہنچ گیا ہے، ہفت اقلیم کے مصنف کی رائے میں بھی فن تاریخ میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ شرف الدین کو جو شہرت اور بزرگی حاصل ہوئی وہ اس کے علم و فضل کے علاوہ بہت کچھ اس کی اعلیٰ انشاپردازی کی بھی مرہون منت تھی، یہ اس بات کی واضح مثال ہے کہ ایک ماوراء النہری بادشاہ سادہ نثر کا شایق تھا، اور ایران کے پڑھے لکھے لوگ رنگین نثر کے دلدادہ تھے۔

تیمور اور اس کے جانشینوں کے عہد میں لکھی جانے والی چند اور کتابوں کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ حافظ ابرو نے "زبدة التواریخ" صاف اور سادہ نثر میں لکھی، فصیحی کی "مجمل" کی بھی خاص خصوصیت

اس کے اسلوب کی سادگی ہے، عبدالرزاق سمرقندی کی "مطلع السعدین" بھی رنگینی اور لفاظی سے معرا ہے، معین الدین محمد اسفزاری نے "روضۃ الجنات فی تاریخ مدینۃ الہرات" کے نام سے ہرات کی تاریخ اپنے سرپرست اور تیموری بادشاہ سلطان حسین کے لیے لکھی، اس کی نثر بھی رنگین نہیں ہے، ان تمام سادہ نگار مصنفوں کو تیمور یا اس کے جانشینوں کی سرپرستی حاصل تھی، ان کے مقابلے میں خواندمیر نے اپنی ضخیم تاریخ "روضۃ الصفا" رنگین نثر میں لکھی، یہ کتاب تاریخ کی حیثیت سے چنداں اہم نہیں اور اس کی مشتملات کچھ بہت مستند نہیں، لیکن محض رنگینی زبان کی بنا پر روضۃ الصفا کو عرصۂ دراز تک وہ مقبولیت حاصل رہی جو اس زمانہ کی کسی دوسری تاریخ کو حاصل نہ ہو سکی۔

بعد کے تیموری بادشاہوں کے عہد میں لکھی جانے والی تذکرہ و سوانح کی کتابوں میں ملا عبدالرحمن جامی کی "نفحات الانس" سادہ نثر کا نمونہ ہے، مگر دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں عبارت آرائیاں کی ہیں، اور ملا حسین واعظ کاشفی نے "روضۃ الشہدا" میں رنگین نثر کو ذریعۂ اظہار بنایا ہے، اور روضۃ الشہدا اسی وجہ سے بہت پسند کی گئی، اور مدت تک اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں کے لیے نمونہ کا کام دیتی رہی۔

اسی عہد کی دوسری کتابوں میں حسین واعظ کاشفی کی دو تفسیریں "جواہر التفسیر" اور "مواہب علیہ" سادہ نثر کا نمونہ پیش کرتی ہیں، مگر ان ہی کی دوسری تصنیف "اخلاق محسنی" اور ملا جامی کی "لوائح" اور "اشعۃ اللمعات" رنگینی کی طرف مائل ہیں، جلال الدین دوانی کی "اخلاق جلالی" بہت ہی رنگین نثر میں لکھی گئی ہے، مگر واعظ کاشفی کی "انوار سہیلی" نے اسے بھی مات کر دیا ہے، اور انوار سہیلی کی مقبولیت کو ان میں سے کوئی کتاب بھی نہیں پہنچ سکی، اس مقبولیت کا سبب محض اس کی رنگین نثر ہے، ورنہ کلیلہ و دمنہ کے قصے ایران میں پہلے سے موجود تھے، خود

پروفیسر براؤن نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ انوار سہیلی اپنی رنگین نثر کے باعث مقبول ہوئی۔

یہ رائے بھی محل نظر ہے کہ نثر کا یہ رنگین اسلوب بابر اپنے ساتھ ہندوستان لایا، ہم دیکھ چکے ہیں کہ بابر سے پہلے ہی عوفی کی لباب الالباب کے ذریعہ یہ اسلوب ہندوستان پہنچ چکا تھا، خود بابر کی مشہور و معروف ترکی تصنیف "بابرنامہ" [تزک بابری] زبان اور اسلوب کے لحاظ سے رنگین نہیں بلکہ بہت سادہ اور بے ساختہ انداز میں لکھی گئی ہے، بابر کے پرپوتے جہانگیر نے بھی اپنی تزک بہت صاف فارسی نثر میں لکھی ہے، یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ہندوستان کے مغل بادشاہ ذاتی طور پر سادہ زبان کو ترجیح دیتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ کہ" ان "مغلانِ اعظم" کے دربار سے کچھ رنگین نگار نثار بھی وابستہ تھے۔

اس مختصر بحث کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ فارسی میں نثر رنگین کا رواج کسی بیرونی اثر کا نتیجہ نہیں تھا، اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ Essentially Persian نہ سمجھا جائے۔ نثر رنگین کی جو خصوصیتیں ہیں، اس میں طرز ادا کے جو جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، الفاظ کے انتخاب اور صنائع و بدائع کے استعمال میں جیسی جیسی کاوشیں کی جاتی ہیں، غرض عبارت کو سجانے کے لیے جن جن صورتوں سے کام لیا جاتا ہے وہ تمام و کمال فارسی نظم میں بھی موجود ہیں، بلکہ نثر رنگین کا عیب ہی قرار دیا جاتا ہے کہ وہ منثور شاعری معلوم ہوتی ہے، اور اس کے لکھنے والے اس مواد سے بھی کام لینے لگتے ہیں جو نظم کے لیے مخصوص ہے، اب جب کہ فارسی شاعری کا مزاج ایرانی مان لیا گیا ہے تو بالکل اس سے مشابہ اور بعینہٖ اسی کے خواص رکھنے والی فارسی نثر کا مزاج ایرانی کیوں نہ مانا جائے۔

یہ سمجھنا بھی ٹھیک نہیں ہے کہ کوئی خاص بادشاہ یا کسی خاص قوم اور خاندان یا کسی خاص جغرافیائی علاقے کے بادشاہ ادب کی کسی صنف کو اپنی پسندیدہ شکل دے کر رائج کر سکتے ہیں، یہ تو ممکن ہے کہ ایک بادشاہ کسی ادیب کو حکم دے کر اس سے جو چاہے اور جیسا چاہے لکھوا لے،

لیکن یہ اس کے امکان میں نہیں ہے کہ اس طرز کو عوام سے بھی پسند کرا سکے۔ پسند عام کسی سعی و سفارش یا جبر و قہر سے متاثر نہیں ہوا کرتی، اور اگر بالفرض اس ناممکن کو ممکن مان بھی لیا جائے تو فارسی کی نثر رنگین کے معاملے میں حقایق اس کی تکذیب کر دیتے ہیں، ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس اسلوب نثر کا بانی بدیع الزماں ہمدانی کا رہنے والا ایرانی تھا جس کے طرز نگارش کو قاضی حمید الدین ابوبکر نے فارسی میں منتقل کر لیا اور وہ اسی زمانے میں خوب مقبول ہو گیا۔ اس صورت میں پہلا بڑا مجرم "وصاف کو نہیں بلکہ اس کے پیش رو حمید الدین ابوبکر کو بلکہ اس کے بھی پیش رووں حریری اور بدیع الزماں کو سمجھنا چاہیے اور بفرض محال یہ فرد جرم وصاف پر عائد کر بھی دیجائے تو بھی 'ارتکاب جرم' کے بعد اس نے جن بادشاہوں کے دربار میں پناہ لی، انھیں اس جرم کی بنیاد کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟

عوفی اور ملا کاشفی کی تصنیفات میں ایک ہی مصنف کبھی نہایت رنگین نثر لکھتا ہے، کبھی بالکل سادہ، عوفی کی کتابوں لباب الالباب اور جوامع الحکایات کے اسلوب میں زبردست تفاوت ہے۔ یہ دونوں کتابیں جو ہندوستان کے دو بادشاہوں کے نام معنون کی گئیں کسی طرح یہ فیصلہ نہیں کرنے دیتیں کہ نثر کا کونسا اسلوب ہندوستان کے نام کے ساتھ وابستہ کیا جائے۔

تیمور کے حالات میں لکھے جانے والے نظام الدین شامی کے ظفر نامے، تیموریوں کے دربار سے وابستہ نثر نگاروں کی تصنیفوں اور اس عہد کے دوسرے نثر کی تالیفات پر نظر کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان بادشاہوں کو نثر رنگین سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا عقل عامہ بھی یہ تسلیم کرتے ہچکچاتی ہے کہ وہ لوگ جن کی مادری زبان فارسی نہیں تھی، وہ سادہ اور سریع الفہم اسلوب کو چھوڑ کر ایسا رنگین اور پیچیدہ انداز بیان پسند اور رائج کریں جس کو سمجھنے میں اچھے اچھے زبان دانوں کی عقل کے پاؤں لڑکھڑانے لگیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ آسان سے آسان زبان رائج کرنا چاہتے جیسا کہ ہندوستان میں انگریزوں نے کیا، انھوں نے فورٹ ولیم کالج کی طرف سے بہت بڑے پیمانے پر ترجمہ و تالیف کا کام شروع کرایا

جس کے لیے مترجموں اور مولفوں کو خاص ہدایت تھی کہ رنگینی سے دامن بچا کر آسان ترین زبان استعمال کریں)۔

رنگین نثر کے بانی اصلاً ایرانی تھے، لیکن کسی اسلوب کی ترویج و تقلید صرف اس کی عام مقبولیت پر منحصر ہوتی ہے، تاریخ وصاف، ظفرنامۂ شرف الدین، روضۃ الصفا اور انوار سہیلی وغیرہ کی عام مقبولیت کا انکار نہیں کیا جا سکتا، یہ کتابیں وجود میں آتے ہی محض اپنے اسلوب کی رنگینی کے بل پر مشہور اور مقبول ہوگئیں۔ اور ان کو پسند کرنے والے ایرانی اہل زبان تھے۔

مختصر یہ کہ فارسی میں نثر رنگین کی ابتدا، اس کی ترویج اور مقبولیت ایران اور ایرانیوں ہی کی مرہون منت ہے، اور اس سلسلے میں مغلوں، ترکوں یا ہندوستانیوں کی حیثیت ایسی نہیں ہے کہ ان کے سر یہ سہرا باندھا یا یہ جرم منڈھا جا سکے۔

شعر العجم حصہ چہارم

اس حصہ میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایران کی آب و ہوا اور تمدن اور دیگر اسباب شاعری پر کیا اثر کیا، کیا تغیرات پیدا کیے، اور شاعری کے تمام انواع و اقسام میں سے مثنوی پر بسیط تبصرہ۔

ضخامت ۲۹۰ صفحے قیمت:- ۸ روپے

شعر العجم حصہ پنجم

اس میں قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقیدی تبصرہ ہے۔ ضخامت ۲۳۸ صفحے قیمت:

ادبیات

غزل

از جناب تسخیر فہمی جامعہ طبیہ کالج دہلی

جہاں بھی نقشِ قدم ان کے پائے ہیں میں نے
وہیں خلوص کے سجدے لٹائے ہیں میں نے

ہزار تیرِ ستم دل پہ کھائے ہیں میں نے
صلے یہ اپنی وفاؤں کے پائے ہیں میں نے

بقیدِ فطرتِ خود دار اپنے ہاتھوں سے
بنا بنا کے نشیمن جلائے ہیں میں نے

سرِ نیاز جھکایا ہے اس عقیدت سے
درِ حبیب کے رتبے بڑھائے ہیں میں نے

نجوم و مہر و مہ و گل کے استعاروں میں
تجھی کو تیرے فسانے سنائے ہیں میں نے

سجا رہا ہوں میں پہلوئے گل میں خاروں کو
نئی بہار کے خاکے بنائے ہیں میں نے

جہاں کے فتنۂ گردوں سے گلہ بجا فہمی
مگر وہ حشر، جو خود ہی اٹھائے ہیں میں نے

غزل

از جناب نیاز لکھنوری

ملا ہے درد مگر حسرتِ قرار کے ساتھ
خزاں کی بات بھی ہے عشرتِ بہار کے ساتھ

گزارنی ہے شبِ غم اب انتظار کے ساتھ
سنا تھا کیوں ترے وعدے کو اعتبار کے ساتھ

بھرم مٹانا بھی چاہا وفورِ غم نے مگر
دلِ غریب کو جینا پڑا وقار کے ساتھ

وہ جنوں میں کہیں پھینک آیا دیوانہ
غمِ خودی بھی گریبان تار تار کے ساتھ

بنائیں آشیاں گلشن میں چار تنکے سہی
اسی بہانے سے نسبت تو ہے بہار کے ساتھ

کہاں کہاں نہیں پہنچی لیے ہوائے جنوں
بڑے سلوک کیے ہیں مرے غبار کے ساتھ

ہمارا کون بھرا اس اجنبی دیار میں تھا
نہ لائے غم بھی جو ہستیٔ مستعار کے ساتھ

سکون و صبر کی منزل تلاش کرنا ہے
نیاز یاس و تمنا کے خلفشار کے ساتھ

غزل

از جناب جوہر ٹونکی

ترانہ مرغِ گلشن کا فقط صحنِ چمن تک ہے
رسائی نالۂ بیباک کی دار و رسن تک ہے

بیاباں میں بھی بجلی نے نہ چھوڑا چار تنکوں کو
میں سمجھا تھا کہ اس کی دست رس صحنِ چمن تک ہے

کہیں کیا بجلیوں نے جشنِ فصلِ گل منایا ہے
یہ کیسی روشنی صیاد صحرا سے چمن تک ہے

بجھی جاتی ہے کیوں اے شمع مرجھائے ہو کیوں پھولو
کہ ساتھ اپنا تو بزمِ عیش سے گور و کفن تک ہے

زمیں پر پھول ہیں آنسو فلک پر چاند تارے ہیں
تعلق چشمِ تر کا کہکشاں سے نسترن تک ہے

ہے مرگِ عشق جوہر خوگرِ رنج و محن ہونا
کہ دردِ عشق میں لذت ہی احساسِ محن تک ہے

مطبوعات جدیدہ

الرسائل القشیریہ مع ترجمۂ اردو از امام قشیریؒ، صفحات ۲۰۰، مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی، پوسٹ بکس نمبر ۳۱۰۰، حیدر علی روڈ، کراچی ۵

امام ابوالقاسم القشیری متوفی ۴۶۵ھ ایک محقق صوفی کی حیثیت سے معروف ہیں، سلوک و تصوف میں ان کی بعض کتابیں بھی ہیں، مگر اس حیثیت کے ساتھ ان کی عالمانہ حیثیت بھی کم نہیں ہے، جس کا اندازہ ان کی تصانیف سے ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف سلوک و تصوف کے علاوہ تفسیر، حدیث اور علم کلام وغیرہ میں بھی ہیں، الرسائل القشیریہ ان کے تین رسالوں کا مجموعہ ہے، پہلا رسالہ شکایت اہل سنت، دوسرا کتاب السماع، تیسرا ترتیب السلوک۔

ان میں پہلا رسالہ سب سے زیادہ ضخیم ہے، اس رسالہ میں ان الزامات اور اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے جو حنابلہ کی طرف سے اشاعرہ اور خاص طور پر امام ابوالحسن اشعری پر کیے گئے تھے، امام قشیری کے معاصر خواجہ عبداللہ انصاری متوفی ۴۸۱ھ نے بھی ایک رسالہ "ذم الکلام واہلہ" لکھا تھا، جس میں امام اشعری پر سخت حملے کیے تھے، امام قشیری نے ان کا اور دوسرے لوگوں کا نہایت سنجیدہ اور عالمانہ انداز میں جواب دیا ہے، دوسرے رسالہ میں سماع کے شرائط اور اس کے حدود سے بحث کی گئی ہے، اور تیسرے میں سلوک کا طریقہ اور اس کے احوال سے بحث رہی ہے، یہ تینوں رسالے نہایت ہی مفید اور قیمتی ہیں، ادارۂ تحقیقات اسلامی اس کی اشاعت پر قابل مبارکباد ہے۔ اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے کیا ہے۔ آخر میں

صوفیہ کی اصطلاحات کی توضیح کے ساتھ کتاب کا پورا انڈکس دے دیا گیا ہے جس سے استفادہ کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی ہے۔

آئینۂ عقل ۔ از پروفیسر نکہت شاہجہانپوری، صفحات ۲۹۶، کتابت وطباعت متوسط، ناشر ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ۔ قیمت :- للعہ

پروفیسر نکہت شاہجہانپوری نہ صرف ادیب و شاعر بلکہ ایک سنجیدہ اور صاحب فکر اہل قلم بھی ہیں، آئینۂ عقل ان کی ایک علمی تصنیف ہے، اس میں سوال وجواب کے پیرایے میں ذہنی تربیت اور دماغی نشوونما کا مواد فراہم کیا گیا ہے، اور متعدد مذہبی اور اخلاقی مسائل کو عقلی استدلال اور نفسیاتی انداز میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، علامت کے طور پر ہر باب کو کسی نہ کسی مغربی یا مشرقی حکیم و فلسفی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس دور میں جب کہ لوگ مذہب خصوصاً الٰہیات کے بارے میں طرح طرح کے اوہام اور وساوس کا شکار ہیں اس طرح کی کتابوں کی شدید ضرورت ہے، ان کی بعض تعبیرات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر مصنف کی یہ کوشش ہر طرح لائق ستایش ہے۔

عروس نیل ۔ از سلطانہ آصف فیضی، صفحات ۲۱۴، کتابت وطباعت عمدہ، ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔

آصف فیضی صاحب ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء تک مصر کے سفیر رہے ہیں، ان کی بیوی سلطانہ آصف بھی ان کے ساتھ تھیں، سلطانہ فیضی صاحب نے اپنے مصر کے قیام کے زمانہ میں مصر اور مصریوں کے ذہنی رجحانات اور ان کی مذہبی، معاشرتی اور اقتصادی حالت کو سمجھنے کی پوری کوشش کی ہے، اسی مدت میں انھوں نے لبنان، شام اور شرق الاردن کا بھی سفر کیا اور وہاں کے حالات سمجھنے کی کوشش کی۔ عروس نیل کے ذریعہ انھوں نے ان ملکوں اور خاص طور پر مصر کے بارے میں اپنے انھی تاثرات اور معلومات کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے، اسے ان کا سفرنامہ

یا ذاتی ڈائری سمجھنا چاہیے۔

سلطانہ آصف مذہبی مزاج کی خاتون معلوم ہوتی ہیں، اس لیے جب ان سے مصری عورتیں تعجب سے بار بار یہ سوال کرتی تھیں کہ تم ہندوستانی بھی ہو اور مسلمان بھی تو وہ اسکے ثبوت میں قرآنی آیات سنا کر اور اپنا نام بتا کر ان کو مطمئن کرتی تھیں، انھوں نے قاہرہ کے رمضان المبارک کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی ان کی مذہبیت کی دلیل ہے، البتہ انکی بعض معلومات صحیح نہیں ہیں، مثلاً نیل میں ہر سال دوشیزہ لڑکی کی قربانی کی رسم کو ممنوع قرار دینے کو خلفائے فاطمیین کا کارنامہ قرار دیا ہے، حالانکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ ہی میں یہ رسم ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ سلطانہ آصف کو اردو لکھنے پر اچھی خاصی قدرت ہے، اس لیے کتاب بہت ہی دلچسپ اور پُر معلومات بن گئی ہے۔

اسلامی قانون اجرت کا ایک باب ترجمہ ملیالم } از مجیب اللہ ندوی، صفحات ۱۳۲ ٹائپ عمدہ، ناشر اردو پرچار سبھا وائی

ایم، سی۔ رنے، روڈ۔ کالی کٹ ۱؎

تبصرہ نگار نے کئی سال پہلے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا، جو معارف کے ۵ نمبروں میں شائع ہوا تھا، اس کو پہلے کتابی شکل میں پاکستان میں شائع کیا گیا تھا، اب اس کے ایک حصہ کا ترجمہ ملیالم میں کیا گیا ہے، ترجمہ ملیالم زبان کے معروف لکھنے والے ولاٹیم عبداللہ صاحب نے کیا ہے، اس لیے امید ہے کہ ترجمہ بہتر ہی ہوگا۔ یوں اس کے بارے میں صحیح فیصلہ ملیالم جاننے والے ہی کر سکتے ہیں۔

تذکرہ شیخ رحمکار ۔ از سید سیاح الدین صاحب کاکاخیل، صفحات ۱۱۰، کتابت وطباعت متوسط۔ ناشر ادارہ دارالاشاعت، جامع مسجد لائل پور

یہ شیخ رحمکار نویں دسویں صدی ہجری کے سلسلۂ سہروردیہ کے ایک ممتاز بزرگ گذرے ہیں،
ان کا نام "کستیر گل" تھا، مگر خلق خدا پر ان کے رحم و کرم کی وجہ سے عوام میں شیخ رحمکار کے نام سے
مشہور ہیں، اور اب یہی ان کا نام ہوگیا ہے، یہ حسینی سادات میں ہیں، ان کے بزرگوں میں
سب سے پہلے سید آدم ہندوستان آئے اور کوہاٹ میں قیام پذیر ہوئے، شیخ رحمکار یوں تو
اپنے والد کے واسطے سلسلۂ سہروردیہ میں بیعت تھے، مگر دوسرے سلاسل اور طریقۂ
اویسیہ سے بھی فیض ملا تھا، حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ان کی خط و کتابت کا ذکر بھی مصنف نے
کیا ہے، آپ کے ممتاز خلیفہ سید آدم بنوری سے تو انھوں نے ملاقات بھی کی تھی، بڑے
صاحب استقامت اور صاحب کرامت بزرگ تھے، تقریباً ایک صدی تک ان کا فیض
جاری رہا، مصنف نے بڑے سلیقہ سے شیخ کے حالات جمع کر دیے ہیں۔

نشاط غالب - از وجاہت علی سندیلوی، ضخامت ۲۰۰، کتابت و طباعت بہتر
ناشر ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔ قیمت للعہ

مرزا غالب کے ادب و شاعری پر بیشمار کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں، اور یہ
سلسلہ اب بھی جاری ہے، نشاط غالب میں وجاہت علی سندیلوی صاحب نے غالب کے
ان ساٹھ اشعار کی شرح اور ان پر بحث و تبصرہ کیا ہے جن کو بعض لوگوں نے یا تو مہمل
کہا ہے یا دوسرے شعراء کا سرقہ قرار دیا ہے، یا پھر پیش رو شارحین کے مطلب سے مصنف کو
اطمینان نہیں ہے، وجاہت علی سندیلوی صاحب اس سے پہلے باقیات غالب لکھ کر اہل ذوق
سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، اب نشاط غالب لکھ کر غالبیات پر ایک اور اچھا اضافہ
کیا ہے، انھوں نے اشعار کا جو مفہوم و مطلب بتایا ہے، اس سے اب بھی اختلاف کی گنجائش
باقی ہے، مگر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انھوں نے گہرائی اور گیرائی سے غالب کا مطالعہ کیا ہے۔

اور معز شعر تک پہنچنے کی کوشش کی ہے، آخر میں ان کے غیر متداول کلام کا ایک انتخاب شامل کردیا ہے، جس سے اس کی افادیت میں اور اضافہ ہوگیا ہے، اس کتاب کے ذریعہ غالب اور ان کے اشعار کو سمجھنے کی کچھ نئی راہیں کھلتی ہیں۔

تذکرہ شاہ محمد غوثؒ - از پیام شاہجہانپوری، صفحات ۲۰۰، کتابت وطباعت بہتر، ناشر اشاعت منزل مل روڈ، لاہور ۲ قیمت ۵ ر

ہند و پاک میں اس نام کے دو بزرگ گذرے ہیں، ایک شاہ محمد غوث گوالیاری، دوسرے شاہ محمد غوث لاہوری، اول الذکر بزرگ کے حالات پروفیسر محمد مسعود صاحب نے مرتب کیے ہیں جس پر معارف میں تبصرہ ہو چکا ہے، دوسرے شاہ محمد غوث لاہوری کے حالات پیام شاہجہانپوری نے جمع کیے ہیں، وہ سلسلۂ شطاریہ کے بزرگ تھے، اور یہ سلسلہ قادریہ کی ایک اہم کڑی ہیں، شاہ محمد غوث لاہوری نے علوم درسی کی تکمیل کے بعد اپنے والد محترم سید حسن شاہ متوفی ۱۱۱۵ھ جو سرحد میں "سید حسن بادشاہ" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں بیعت کی اور پھر خلافت پائی، خلافت کے بعد انھوں نے تقریباً پورے ہندستان کی سیاحت کی، اس سیاحت میں لاہور، دلی، سرہند، اجمیر اور گجرات کے تمام بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی، پھر واپس آکر مستقل طور پر لاہور میں قیام پذیر ہو گئے، اور برسوں اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا، باختلاف روایت وفات ۱۱۵۲ھ میں ہوئی، باطنی کمالات کے ساتھ ان کو تصنیف و تالیف کا فطری ذوق تھا، چنانچہ انھوں نے چھوٹی بڑی کئی سو کتابیں تصنیف کیں جن میں اصول حدیث اور بخاری شریف کی شرح اور قرآن پاک کا فارسی ترجمہ بھی شامل ہے، مصنف نے بڑی محنت و تحقیق اور سلیقہ کے ساتھ شاہ صاحب کے حالات جمع کر دیے ہیں، ساتھ ہی ساتھ ان کی تصانیف اور ان کی تعلیمات پر سیر حاصل بحث کی ہے، امید ہے کہ یہ کتاب مفید و مقبول ہوگی۔

"م - ج"

جلد ۹۶ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۵ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

گذشتہ دو مہینوں میں مسلمانوں کے ۲ بڑے قومی حادثے ہوئے، ۵ نومبر کو داؤدی بوہروں کے امام ملا طاہر سیف الدین نے انتقال کیا، ان کی ذات جامع صفات تھی، بڑے ذی علم، دیندار، فیاض و مخیر اور وسیع القلب تھے، دینی علوم پر انکی نگاہ بہت وسیع تھی، اس لحاظ سے وہ ہندوستان کے ممتاز علماء میں تھے، صاحب قلم بھی تھے، عربی میں انکی کئی تصانیف ہیں، انھوں نے اپنے دور میں نہ صرف اپنے فرقہ کی بڑی تعلیمی و اقتصادی خدمت کی بلکہ دوسرے اسلامی فرقوں کے ساتھ بھی انکا سلوک روادارانہ اور فیاضانہ تھا، اور ان کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی، مسلم یونیورسٹی کے تو چانسلر ہی تھے، اس کو وقتاً فوقتاً بڑی بڑی رقمیں دیتے رہتے تھے، دار المصنفین کی جوبلی کے موقع پر اس کو بارہ ہزار کا عطیہ دیا، اس لیے ہر فرقہ کے مسلمانوں میں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے حسنات کے طفیل میں انکی مغفرت فرمائے، دار المصنفین اس حادثہ میں ان کے لائق جانشین ملا برہان الدین کا شریک غم ہے اور دعا ہے کہ خدا ان کو ان کے باعظمت والد کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

دوسرا حادثہ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی کی وفات کا ہے، مرحوم مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ کے شاگرد رشید اور ہندوستان کے ممتاز عالم تھے، انکی پوری زندگی دینی علوم خصوصاً حدیث نبوی کی خدمت اس کی تعلیم و تدریس اور اس سے متعلق تالیف و تصنیف میں گذری، مختلف اوقات میں دار العلوم دیوبند اور مدرسہ ڈابھیل کے مدرس رہے، کچھ دنوں تک ندوۃ المصنفین سے بھی تعلق رہا، پھر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے، وہاں بھی درس و افادہ کا سلسلہ جاری رہا، چند برسوں کے بعد دیار حبیب کی کشش مدینہ طیبہ کھینچ لے گئی اور وہیں بارہ سال تک جوار رسول میں حدیث رسول کی خدمت انجام دیتے رہے، اور بالآخر اسی آستانہ پر گذشتہ اکتوبر میں جان دی، سلوک و تصوف کا بھی وافر حصہ ملا تھا، ان کے دو بڑے علمی و دینی کارنامے ہیں، مولانا انور شاہ کے درس بخاری کی تقریروں کی جمع و تدوین فیض الباری کے

نام سے حضرت کے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ اردو میں ترجمان السنۃ کی ضخیم جلدیں جو ندوۃ المصنفین دہلی سے
شائع ہوئی ہیں۔ ان کی وفات سے ایک بڑی علمی و دینی شخصیت اٹھ گئی، اللہ تعالیٰ صاحب حدیث
صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں حدیث و سنت کے اس خدمت گذار کی مغفرت فرمائے۔

بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر زمانہ میں یکساں قائم رہتی ہیں، زمانہ کے تغیرات کا ان پر کوئی اثر
نہیں پڑتا، انہی میں "الناس علی دین ملوکھم" بھی ہے، اس مقولہ میں دین سے مراد مذہب نہیں بلکہ خیالات
و رجحانات اور طریقۂ زندگی ہے، البتہ اس زمانہ کے لحاظ سے ملوک کے بجائے حکومت کہا جائے گا۔
طریقۂ زندگی میں ایک اثر پذیری تو فطری ہے، جب دو قومیں یا دو تہذیبیں ایک دوسرے سے ملیں گی
تو ان کا دوسرے سے متاثر ہونا طبعی اور ناگزیر ہے، جس طرح ایک زمانہ میں ہندو مسلمان ایک دوسرے
کی تہذیب سے متاثر ہوئے، لیکن یہ دونوں تہذیبوں کا حسین اور فطری امتزاج تھا، دوسرا اثر مرعوبیت،
احساس کمتری، حکومت سے تقرب، اس کی خوشنودی اور منصب وجاہ کی طلب کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کی مثال
انگریزوں کے زمانہ کے "دیسی صاحب" اور حکومت کے مقرب و خطاب یافتہ ہندو مسلمان تھے، ہندو مسلمان
فطری طور پر ایک دوسرے کی تہذیب سے جتنا متاثر ہو سکتے تھے، ایک ہزار سال میں ہو چکے، اب مسلمانوں کی
مزید اثر پذیری ان کی مرعوبیت، احساس کمتری، حکومت سے تقرب، اس کی خوشنودی اور منصب و جاہ
کی طلب کا نتیجہ ہے، یہ اثر پذیری ان مسلمانوں میں زیادہ ہے جو حکومت سے وابستہ اور اس کے فوائد
اور مناصب کے طالب ہیں، اس کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، اس کا اندازہ ہر شخص
کو ہوگا۔

یہاں تک بھی غنیمت تھا، اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو
سیکولرازم، حکومت و اکثریت کی وفاداری کے ثبوت اور ان کی خوشنودی کے جنون میں ایسی ایسی خبیث
حرکتیں کرتا ہے جس کا کوئی غیرت دار انسان تصور نہیں کر سکتا، اسلام اور مسلمانوں کی نسبت سے گھبراتا ہے
سیکولرازم کے پردہ میں اسلامی تہذیب و روایات کی مخالفت کرتا ہے، مسلمانوں کو فرقہ پرستی کا مجرم
بناتا ہے، ان کے خلاف جاسوسی تک کرتا ہے، اس کی نگاہ میں پکے نیشنلسٹ مسلمان بھی [illegible]

مقالات

عالمگیر اور اس کے معاصر مشائخ

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے

شاہجہاں نے اپنے عہد میں دین اور مذہب کی ترویج کر کے اپنی سلطنت میں اسلامی فضا قائم کرنے کی کوشش کی جس کی بین شہادتیں دہلی کی جامع مسجد، آگرہ کی موتی مسجد، اور اسکی بنائی ہوئی دوسری مسجدیں ہیں۔ اس نے اپنے شہزادوں کو بھی پوری مذہبی تعلیم دلائی، دارا شکوہ، شجاع، اورنگ زیب اور مراد، سب ہی اپنے زمانہ کے جید علماء و فضلاء سے تعلیم پاتے رہے، ان میں اورنگ زیب نے معقولات و منقولات کی تعلیم میر محمد ہاشم سے پائی[1]، کلام پاک کا درس ملا موہن (ساکن بہار شریف) سے لیا[2]، امام غزالی کی اکثر کتابیں خصوصاً احیاء العلوم مولانا سید محمد قنوجی سے پڑھیں[3]، تفسیر کا درس ملا جیون سے لیتا رہا[4]، فقہی جزئیات کو شیخ عبد القوی برہان پوری سے سمجھا[5]، ملا شفیعائی دانشمند خاں سے بادشاہت کے زمانہ میں بھی خاص خاص کتابیں پڑھا کرتا تھا، اس کو دینی علوم سے فطری رغبت تھی،

---

۲۳ اپریل ۱۹۶۵ء یوم عالمگیر کراچی میں منایا گیا، یہ مقالہ اسی موقع کے لیے جناب ڈاکٹر حسین حامد جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی فرمائش پر لکھا گیا۔

[1] بادشاہ نامہ عبد الحمید لاہوری جلد ۲ ص ۔۔۔ [2] آثر الکرام ص ۲۴۰ [3] تذکرہ علمائے ہند ص ۔۔۔

[4] مآثر الکرام ص ۲۱۶ [5] مآثر الامراء جلد ۱ ص ۲۲۵-۲۲۶

لائق اور فاضل اساتذہ کی نگرانی میں ان علوم سے اس کا شغف اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ امام غزالی کی تصانیف، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات اور شیخ محی الدین شیرازی کے رسائل اس کے مطالعہ میں برابر رہے۔[1]

اس نے کلام پاک حفظ کیا تو قرآنی علوم سے بھی اس کی دلچسپی بڑھی، وہ شاہزادگی کے زمانے میں جب فتاویٰ عالمگیری کی تدوین کا کام شروع کرایا تو اس کو شیخ نظام برہان پوری، ملا محمد جمیل جونپوری، قاضی محمد حسین جونپوری، ملا حامد جونپوری، شیخ وجیہ الدین گوپاموی، شیخ رضی الدین بھاگلپوری، قاضی سید عنایت اللہ مونگیری، سید نظام الدین ٹھٹھوی اور ملا غلام محمد لاہوری وغیرہ جیسے علما اور فقہا کی صحبت رہی جس کی وجہ سے وہ اور بھی حامی دین اور پابند شریعت ہوتا گیا۔ اسی لیے وہ شروع ہی سے ایسے مشائخ کا بھی قدردان رہا جو ہر حال میں شریعت اور اسلامی شعار کے پابند تھے۔

جب وہ دکن کا صوبیدار تھا، تو اس زمانہ میں حضرت عبد اللطیف برہانپوری ایک مشہور بزرگ تھے، شریعت کے بڑے پابند ہونے کی وجہ سے نغمہ و سرود، غنا اور آلات غنا کو ناپسند کرتے تھے، شادی بیاہ کے موقع پر کوئی جلوس ان کی خانقاہ کے پاس باجا بجا کر نہیں گزر سکتا تھا، دوسرے بزرگ ان کے متعلق کہتے کہ ہم کو شکرگذار ہونا چاہیے کہ ایسے متشرع اور حق پرست بزرگ ہم میں موجود ہیں، اورنگ زیب ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، ایک بار اس نے ان کی خدمت میں خانقاہ کے مصارف کے لیے کچھ گاؤں پیش کرنا چاہا، تو انھوں نے یہ شعر پڑھ کر لینے سے انکار کیا۔

شاہ ما را دہ دہد منت نہد ۔۔۔ رازق ما رزق بے منت دہد

اورنگ زیب اس شعر کو سن کر متاثر ہوا، لیکن اس نے عرض کیا کہ ہم حضرات اولیاء اللہ کی خدمت خیر دنیوی اور برکت اخروی کے لیے کرتے ہیں، گاؤں پیش کر کے احسان کا مقصد نہیں، حضرت عبد اللطیف نے فرمایا کہ اگر خیر و برکت حاصل کرنا ہے تو حاجت مندوں کو خدمت کرنا

[1] مآثر عالمگیری ص ۳۸۸ ، ۵۳۰

اور ظالموں کے پاس اور بھی شہر و محلہ چونکہ گوشہ نشینی اور متکلموں کے لیے ملازمت مقرر کر دو، مظلوموں کی دادرسی اس طرح کرو کہ ان کی حق تلفی نہ ہو اور ظالموں کے ہاتھ مظلوموں کے لیے کوتاہ ہو جائیں وغیرہ، اورنگ زیب نے ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا، اور اس نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی، جیسا کہ اس نے اپنے ایک رقعہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔[1]

اورنگ زیب کو ان کے آخر وقت تک ان سے عقیدت رہی، منتخب اللباب میں ہے:

"خلد مکاں را در خدمت ایشاں ارادت و حسن عقیدت تمام بود، و ہیچ ماہ و ہفتہ نبود کہ فرمان لطف آمیز بہ دستخط خاص بنام ایشاں صادر نشود" (ج ۲ ص ۵۶۶)

شیخ عبداللطیف برہانپوری کے ایک خاص مرید ملا قطب ہانسی ملتان کے رہنے والے تھے، وہ اورنگ زیب کی شہزادگی کے زمانہ میں برہانپور میں اس سے ملے تھے، تو اورنگ زیب اسی وقت سے ان کا قدر دان ہو گیا، اور جب وہ بادشاہ بنا تو اس نے ملا صاحب کی خدمت میں چار لاکھ درہم پیش کیے اور ایک گاؤں بھی ان کے نام سے موسوم کیا جس کا نام قطب آباد رکھا گیا۔[2]

برہانپور میں ایک دوسرے بزرگ شیخ برہان تھے، جو مریدوں کی تربیت کرنے میں بہت سختی کرتے تھے، ان کی خانقاہ میں کچھ ایسے مرید بھی جمع ہو جاتے جو ان کے عقیدت و محبت میں عالم سکر میں ان کو خدا کہہ دیتے، شیخ برہان اس کو پسند نہ کرتے، اور جب وہ باز نہ آتے تو ان کو سزا کے طور پر قید کر دیتے، اگر ان کے مریدین شریعت کی خلاف ورزی کرتے اور ان کی نصیحت قبول نہ کرتے تو ان کو شہر کے قاضی کے حوالے کر دیتے، جو ان کو قید کر دیتا، پھر بھی وہ باز نہ آتے تو قاضی ان کو قتل کر دیتا،

---

[1] رقعات عالمگیری شائع کردہ دار المصنفین اعظم گڑھ، نمبر ۲۲، مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۱۳۲،
[2] منتخب اللباب از خافی خان حصہ دوم ص ۵۶ - ۵۵۵، بزم تیموریہ ص ۲۵۳، مرآۃ العالم قلمی نسخہ دار المصنفین ورق ۳۰۱، بزم تیموریہ ص ۲۴۵

اورنگ زیب جنگ جانشینی کے لیے دکن سے روانہ ہوا تو وہ حضرت شیخ برہان کی خدمت میں بانمود حاضر ہوا، شیخ برہان ہندو مسلمان سے بے تکلف ملا کرتے تھے، ان کے لیے ان کی خانقاہ کا دروازہ کھلا رہتا لیکن وہ بادشاہ اور امراء سے ملنا اپنے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے اورنگ زیب بھیس بدل کر ان کی مجلس میں شریک ہوا، ایک نووارد کو دیکھ شیخ برہان نے نام پوچھا، اورنگ زیب نے جب اپنا نام بتایا تو وہ اس کی طرف مخاطب نہیں ہوئے، اور جب عام لوگوں کو تبرک دینے لگے تو اورنگ زیب کو کچھ نہ دیا، لیکن اورنگ زیب اس سے بددل نہ ہوا، دوسرے دن پھر ان کی خانقاہ میں پہنچا، شیخ برہان نے اپنی آزردگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہا کہ یہ مکان تم کو پسند ہے تو لے لو، ہم کہیں اور جگہ چلے جائیں گے، اورنگ زیب اس سے بھی دل گیر نہ ہوا، تیسرے دن پھر وہ ان کے پاس گیا، شیخ برہان نماز کے لیے خانقاہ سے باہر نکل رہے تھے کہ اورنگ زیب مؤدبانہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور عرض کی کہ دارا نے شریعت کو نظر انداز کر رکھا ہے، اگر مجھکو حکومت ملی تو دین نبوی کے احکام کے ساتھ رعیت پروری بھی کرونگا، آپ باطنی توجہ فرمائیں، یہ سن کر شیخ برہان نے فوراً کہا کہ ہمارے جیسے کم اعتبار فقیروں کی دعا سے کیا ہوتا ہے تم بادشاہ ہو، نیکی، عدل پروری، اور رعیت نوازی کی نیت کے ساتھ دعا کرو، ہم بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں، اسی وقت اورنگ زیب کے ساتھی شیخ نظام نے اس سے کہا بادشاہی مبارک ہو۔[1]

اور جب عالمگیر تخت نشین ہوا تو اس کو اپنی شریعت نوازی کے سبب قدم قدم پر ابتلاء و آزمائش کا سامنا کرنا پڑا، ان ہی میں دارا شکوہ اور حضرت سرمد کے قتل و شہادت کے بھی واقعات ہیں، یہاں پر حضرت سرمد کے ساتھ دارا شکوہ کا نام اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ بھی وقت ہو گیا تھا، کیونکہ اس کے مرشد ملا شاہ اپنے مریدوں کو اسی کی صورت کا مراقبہ کرنے کی تلقین کرنے لگے تھے،

[1] منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۵۴، نیز دیکھو بزم تیموریہ ص ۳۴۵

اور وہ بات سے کہتے تھے کہ اگر تم اس کی طرف متوجہ ہوگے تو خدا سے پہچانو گے (حسنات العارفین
از دارا شکوہ ص ۲۲) اور وہ خود بھی اپنی تصنیف سکینۃ الاولیاء میں لکھتا ہے، جہاں اور کوئی
طالب سالہا سال کے مجاہدوں اور ریاضتوں سے پہنچتا ہے، میں بغیر ریاضت کے یکبارگی پہنچ گیا،
اور جو میں چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا (ص ۵) پھر اس کی زبان سے کچھ ایسے کلمات نکلنے لگے جن کو
سنکر علماء آزردہ خاطر ہوئے، لیکن وہ خود اپنی مدافعت میں حسنات العارفین کی تمہید میں لکھتا ہے کہ
توحید و معرفت کے منازل و مدارج میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جب ایک سالک شریعت و
طریقت کفر و ایمان، خیر و شر اور عبد و معبود سے بالکل بے نیاز ہو جاتا ہے، اور بیخودی میں اسکی
زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو بظاہر مذہب و ایمان کے منافی ہوتے ہیں، لیکن وہ قابل مواخذہ
نہیں (دیکھو تمہید حسنات العارفین از دارا شکوہ) لیکن دارا شکوہ کی اس تاویل سے علمائے ظواہر
مطمئن نہیں تھے، پھر اس نے مجمع البحرین لکھ کر اسلام اور ہندو مذہب کو ایک ہی سمندر کے دو
دھارے بتائے اور ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی، اور یہ بھی بتایا کہ اسلامی تصوف اور ویدانت
میں لفظی اختلاف کے سوا کوئی اور فرق نہیں، توحید کے شیدائی ان دونوں میں سے جس کی بھی تقلید
کریں حقانیت کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں، علمائے ظواہر نے دارا شکوہ کے ان خیالات کو مطلق
پسند نہیں کیا، اور جب اس نے اپنشد کا مطالعہ شروع کیا تو اس کی تمہید میں اس کا بیان ہے کہ
اس کو علم توحید توریت، انجیل اور زبور کے مطالعہ سے حاصل نہ ہو سکا، کیونکہ ان میں توحید کا بیان
مجمل ہے، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی تسلی قرآن پاک سے بھی نہ ہو سکی، کیونکہ اس کی اکثر باتیں رمز
کی ہیں، تو اس کو توحید کی تمام باتیں اپنشد میں مل گئیں، جس کے پچاس ابواب کا ترجمہ اس نے
سنسکرت سے فارسی میں کرکے ختم کیا، وہ رفتہ رفتہ توحید وجودی کا قائل ہو کر بھگوت گیتا،
بششٹ [illegible] کا بھی معتقد ہو گیا، اور وید دھرم کی تعریف [illegible] جو ظاہر ہے کہ

اسلام کے راسخ العقیدہ علماء و فقہاء اور صوفیہ کو پسند آیا، عالمگیر نے جب دارا شکوہ
کے خلاف پیدار ہ کر شکست دیدی تو پھر اس کو شریعت کے خلاف پاکر اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں
کیا رکاوٹ پیدا ہوسکتی تھی، جبکہ راسخ العقیدہ علماء و فقہاء اس کو مرتد اور ملحد سمجھتے تھے۔ آجکل کے
مورخین کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس کی رواداری اور وسیع المشربی سے متاثر ہے اور یہ کہتا ہے
کہ اگر دارا شکوہ تخت نشین ہوتا تو مسلمانوں کی حکومت برابر قائم رہتی، لیکن اورنگ زیب کے حامی
یہ کہتے ہیں کہ دارا شکوہ کے تخت نشین ہونے سے مسلمانوں کی حکومت تو باقی رہتی لیکن اسلام باقی نہ رہتا۔
اورنگ زیب کی تخت نشینی سے اس کے بعد گو مسلمانوں کی حکومت کچھ دنوں کے بعد باقی نہیں رہی
لیکن ہندوستان میں اسلام باقی رہا،

حضرت سرمد کا معاملہ دارا شکوہ سے کچھ مختلف تھا، وہ بھی دارا شکوہ کی طرح ایسی ہی توحید
وجودی کے قائل تھے جس کو علماء اور شریعت نواز صوفیہ پسند نہ کرتے تھے، وہ دارا شکوہ
کے حامی رہے، انھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ شاہجہاں کے بعد وہی بادشاہ ہوگا، لیکن جب
وہ پسپا ہو کر قتل کر دیا گیا تو عالمگیر نے حضرت سرمد سے دریافت کیا کہ انھوں نے دارا شکوہ کو
بادشاہت کی جو خوشخبری دی تھی وہ کیسے پوری نہ ہو سکی، حضرت سرمد نے جواب دیا کہ وہ خوشخبری
صحیح نکلا کیونکہ دارا شکوہ کو ابدی سلطنت کی تاجپوشی نصیب ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ تاویل اورنگزیب
کو ناگوار گذری ہوگی، لیکن ان پر اور بھی الزامات تھے، کہ وہ معراج جسمانی کے منکر تھے، اور
برہنہ رہا کرتے ہیں، حکومت کے قاضی عبد القوی نے ان سے باز پرس کی تو انھوں نے جواب دیا
کہ شیطان قوی است، اس کو قاضی عبد القوی اپنے اوپر طنز سمجھے، انھوں نے ان پر جو الزامات
سو ہم قائم کرکے عالمگیر کو ان کے قتل کا مشورہ دیا، لیکن عالمگیر نے اس کو یہ کہکر رد کیا کہ صرف
عریانی وجہ قتل نہیں ہو سکتی، ان کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ وہ کلمہ کا صرف ایک جز لا الٰہ

پڑھتے ہیں، اس صورت کے لیے شاہجہاں آباد میں علما کا اجتماع ہوا جس میں حضرت سرمد بھی طلب
کیے گئے، ان سے کلمہ پڑھنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے حسب عادت صرف ایک جز یعنی لا الٰہ
پڑھا، علما نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا میں ابھی نفی میں مستغرق ہوں، مرتبۂ اثبات پر
نہیں پہنچا ہوں، تو پھر جھوٹ کیسے کہوں، علما نے کہا، یہ کہنا کفر ہے، اگر کہنے والا توبہ نہ کرے
تو واجب القتل ہے، اور ان کے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا گیا، حضرت سرمد کی قبر اب بھی
مرجع خواص و عوام ہے، انھوں نے محبت الٰہی، دیدار الٰہی اور دیدار نبوی پر جو رباعیاں
کہی ہیں وہ آج بھی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں، لیکن وہ ترک شریعت کی وجہ قانون شریعت
کی زد میں آگئے،

دارا شکوہ اور حضرت سرمد کے قتل و شہادت میں مورخین سیاسی مصالح بھی شامل کرتے
ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی زمانہ میں توحید وجودی کی جو موشگافیاں ہوئیں، ان سے
طرح طرح کے فتنے اٹھتے گئے، جس کی آڑ میں شرعی احکام سے مداہنت اور اغماض کیا جانے لگا،
شریعت کو حقیقت کا چھلکا بتایا گیا، انا الحق کا نعرہ بلند ہونے لگا، حسینوں کی صحبت میں رسائی
حق کی راہ تلاش کی جانے لگی، سادہ رخوں میں اللہ ہی کا رنگ دیکھا جانے لگا، حسینوں کے غمزوں
اور عشووں سے ... مجازی عشق سے حقیقی عشق تک پہنچنے کا ذریعہ قرار دیا جانے لگا، راسخ العقیدہ
صوفیہ ان تمام باتوں کو بدعت، گمراہی اور ضلالت قرار دیتے، وہ صرف لا الٰہ الا اللہ
کہنے والے کو مسلمان سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے جب تک کہ وہ محمد رسول اللہ بھی کہنے کے
قائل نہ ہوتے، یعنی توحید اور رسالت دونوں پر یقین کامل رکھتے ہی میں عقیدہ اور ایمان کی
سلامتی سمجھتے، اور کہتے کہ صوری اور معنوی اخلاق کی درستگی اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک
سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل متابعت نہ ہو، اس متابعت کے ذریعہ اللہ تبارک تعالیٰ

کی قربت حاصل ہونا ممکن ہے، وہ ان باتوں کے کہنے والوں کو مرتد اور بے دین سمجھتے، اسی لیے ان کے خلاف ہنگامہ کرتے اور سلاطین وقت سے مل کر ان کو قتل کرا دیتے۔

توحید کے اس قسم کے پرستاروں کے خلاف حضرت مجدد الف ثانی نے جو آواز اٹھائی تھی وہ برابر گونجتی رہی، خود ان کے صاحبزادے حضرت خواجہ معصوم سرہندی جو ان کے علوم و معارف کے بہت بڑے شارح تھے، بلکہ ان کے نقش قدم پر چل کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کر کے مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی تجدید اور اصلاح میں لگے تھے۔ ان کی تعلیم تھی کہ سنت کا اتباع اور بدعت سے اجتناب کرنا ہر حال میں دامن متابعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تھامنا اور آثار صحابہ پر چلنا ضروری ہے، اور اپنے تمام مریدوں اور متوسلوں کے خطوط میں اسی کی تربیت دیتے رہے، مثلاً اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اے بھائی! ناجنس اور مخالف طریق کی صحبت سے بچتے رہنا، اور بدعتی کی مجلس سے گریزاں رہنا، یحییٰ معاذ رازی قدس سرہٗ کا مقولہ ہے کہ ان تین اصناف سے اجتناب کرو، (۱) علمائے غافلین (۲) قرائے مداہنین (۳) متصوف جاہلین۔ جو شخص شیخوخت کی مسند پر بیٹھا ہوا ہے اور اس کا عمل موافق سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہے، اور نہ وہ خود زیور شریعت سے آراستہ ہو، خبردار، خبردار اس سے دور رہنا، بلکہ احتیاطاً اس شہر میں بھی نہ رہنا...... سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ مخلوق کے تمام راستے بند ہیں، سوائے اس شخص کے راستے کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان قدم کی پیروی کرے ...... آداب نبوی کا خیال نہ رکھنے والے اور سنن مصطفوی کو چھوڑ دینے والے کو ہرگز ہرگز مدعی خیال نہ کرنا، اس کے ظاہری تجمل و انقطاع خلق سے دھوکا نہ کھاؤ"

زہد و توکل اور دیگر معارف و تعبیرات پر فریفتہ و شیفتہ نہ ہو جانا .... مدار کار اتباع شریعت پر ہے، اور سعادت و نجات پیروی نقش قدم رسول سے مربوط ہے، حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے والی چیز اتباع پیغمبری ہے، زہد و توکل اور تبتل بغیر اتباع رسول کے نامعتبر ہیں، اذکار و افکار اور اشواق و اذواق بے توسل سرکار دو عالم غیر مفید ہیں .... حضرت عبد اللہ بن مبارک نے فرمایا جس نے آداب سے سستی برتی، وہ سنن سے محروم ہو گیا، جس نے سنن سے غفلت اختیار کی وہ فرائض سے محروم ہوا، اور جس نے فرائض سے تہاون کیا وہ معرفت سے محروم ہو گیا۔ شیخ ابوسعید ابوالخیر سے لوگوں نے کہا کہ فلاں شخص پانی پر چلتا ہے، انھوں نے فرمایا ہاں گھانس کا تنکا بھی پانی پر چلتا ہے، پھر کہا گیا کہ فلاں آدمی ہوا میں اڑتا ہے، فرمایا چیل اور کوا بھی ہوا میں اڑتے ہیں، پھر کہا گیا کہ فلاں آدمی ایک لحظہ میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں چلا جاتا ہے، فرمایا شیطان تو ایک دم میں مشرق سے مغرب تک چلا جاتا ہے، ان باتوں کی کوئی قیمت نہیں، مرد حق در اصل وہ ہے جو مخلوق کے درمیان نشست و برخاست رکھے، بیوی بچے رکھتا ہو، اور پھر ایک لحظہ خدائے عز و جل سے غافل نہ رہے، شیخ علی ابن ابی بکر قدس سرہٗ نے معارج الہدایہ میں فرمایا ہے کہ ہر انسان کا حسن و کمال تمام امور میں ظاہراً و باطناً و اصولاً و فروعاً، عقلاً و نقلاً، عادۃً و عبادۃً کامل اتباع رسول میں مضمر ہے۔"

(مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی مترجمہ مولانا نسیم احمد امروہی ص ۹۳-۹۲)

اورنگ زیب کا فطری اور ذہنی رجحان ان ہی تعلیمات کی طرف تھا، اس لیے وہ حضرت خواجہ معصوم سرہندی کے حلقۂ بیعت میں داخل ہو گیا، تیموری خاندان جہانگیر ہی کے زمانے سے حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات سے متاثر تھا، جہانگیر پہلے تو حضرت مجدد الف ثانی کا مخالف رہا

پھر ان سے اس کی عقیدت اتنی بڑھی کہ بچے کو بڑے تو اپنی ہی کی صحبت میں دیکھنا چاہتا تھا[1]۔ اور
زادہ خرم کو ان کے حلقۂ ارادت میں داخل کردیا تھا[2]، عالمگیر نے خواجہ معصومؒ سے بیعت کر کے
رف اپنی خاندانی روایت کو برقرار رکھا، بلکہ ان سے تعلیم پاکر اپنی ایمانی و روحانی بصیرتؒ میں جلا
پائی، اور حضرت خواجہ معصوم کو بھی تخت و تاج کے ایک مالک کی ذات میں وہ تمام باتیں
گئیں جن سے ان کو دین و مذہب کے احکام کی اصلاحی تبلیغ میں ہر طرح کی مدد ملتی رہی، اسی لیے
لمگیر کی مذہبی اور روحانی تلقین و تربیت میں برابر مشغول رہے۔

ایک بار ایک مکتوب میں حضرت خواجہ معصوم نے عالمگیر کو یہ حدیث لکھکر بھیجی کہ حضرت انسؓ
، روایت ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کب آئے گی،
یا تجھ پر افسوس تو نے قیامت کی تیاری کیا کی ہے (جو قیامت کو دریافت کر رہا ہے) اس نے
میں نے تیاری تو کچھ نہیں کی ہے، مگر اللہ اور اس کے رسول کو محبوب رکھتا ہوں، ارشاد ہوا تو
س کے ساتھ ہوگا جس سے محبت کرتا ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے اس
ماد سے صحابۂ کرام کو اتنی مسرت ہوئی کہ میں نے اسلام کے علاوہ کسی چیز سے اتنی مسرت نہیں
ی، یہ حدیث لکھکر حضرت خواجہ معصومؒ عالمگیر کو حب رسول کی تعلیم دے رہے تھے جو عالمگیر
، پہلے سے موجود تھی، اس میں اور جلا پیدا ہوتی گئی، حضرت خواجہ معصوم کا یہ مکتوب عالمگیر کے
ی خط کے جواب میں تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر نے ان سے اپنے قلب کی بعض روحانی
نیات کا بھی اظہار کیا تھا، اور اس کا مداوا چاہتا تھا، شاید عالمگیر پر گریۂ دل طاری رہتا تھا، اسکے
ب میں حضرت خواجہ معصومؒ لکھتے ہیں کہ

"اس مکتوب سے راہ طریقت کا شوق ظاہر ہوتا ہے، اسی لیے مقصد کے حاصل ہونے

---

[1] دیکھو مکتوبات امام ربانی دفتر سوم نمبر ۱۳۴ [2] خزینۃ الاصفیاء ج ۱ ص ۶۶۴

کی مفید ہے۔ ایک درویش نے لکھا ہے کہ اگر خواستے واد، دادے خواست ہمیں اگر اللہ تعالیٰ کچھ دینا نہ چاہتا تو طلب کا ادہ ہی پیدا نہ کرتا، صوفیہ کا یہ مقولہ ہے کہ جب قلب گمشدگی سے روتا ہے تو روح یافت پر خوش ہوتی ہے، اس مقولہ کی رو سے گریۂ دل کو جو کہ از راہ طلب و شوق پیدا ہوا ہے، یافت روح پر دلیل قرار دیا گیا ہے، یعنی گریۂ دل ہی سے روحانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔"

اور پھر اس کی وضاحت صوفیانہ اور عارفانہ انداز میں اس طرح کی ہے:

"لطائف خمسۂ عالم آپس میں پڑوسیوں کا حکم رکھتے ہیں، ان میں بعض لطائف ایک دوسرے سے زیادہ لطیف ہیں، اور جو بھی لطیفہ ترہے عالم غیب سے نزدیک تر ہے، اور حضرت وہاب سے فیوض حاصل کرنے میں آگے بڑھا ہوا ہے، جب کبھی ان لطائف میں سے کسی لطیفہ پر کوئی عطیہ وارد ہوتا ہے تو دوسرا لطیفہ جو اس سے قریب ہے، خبردار ہو جاتا ہے، اور اس دولت پر رشک کرتا ہے، اس کی طلب میں کوشش کرتا ہے اور اس کو گریۂ شوق دامن گیر ہو جاتا ہے، اور اگر کسی لطیفہ پر وارد غیبی نمودار نہیں ہوتا ہے تو تمام لطائف غافل رہتے ہیں، اور راہ طلب بند ہو جاتی ہے، پس گریۂ قلب دلیل ہے اس امر کی کہ روح کو کچھ مل گیا، اس لیے کہ قلب و روح کو آپس میں نسبت ہمسائگی اور اتصال حاصل ہے، ایک کی یافت سے دوسرا واقف ہے، اسی لیے دولت کے نہ پانے سے نالاں اور اس کی طلب میں دواں ہے۔"

انہی خطوط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ معصومؒ نے اپنے ایک صاحبزادے شیخ سیف الدین کو عالمگیر کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تلقین کے لیے اس کے پاس بھیجا تھا۔ شیخ سیف الدین اپنے والد بزرگوار کی طرح کمالات صوری و معنوی کے حامل ہو گئے تھے، عالمگیر ان کو بہت محبوب

اور معتقد رکھنے لگا تھا، اور جب اس نے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا حال حضرت خواجہ معصوم کو لکھا تو وہ مذکورہ بالا مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

الحمد للہ والمنۃ کہ فقیرزادہ (شیخ سیف الدین) منظور نظر قبول ہو گیا ہے، اور اس کی صحبت موثر ثابت ہوئی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو کہ فقیرزادے کا شیوہ ہے، اس کو آپ نے اظہار شکر و رضامندی کیا ہے، اس اظہار شکر پر شکر خداوندی بجا لایا، اور اس سے میری دعا گوئی اور بھی بڑھ گئی ہے۔ کیا عجب نعمت ہے کہ امر بالمعروف بادشاہت اور دبدبۂ سلطنت کے ہوتے کلمۂ حق سمع قبول میں آئے، اور ایک نامراد کا قول موثر ثابت ہو۔"

اور آخر میں کلام پاک کی ایک آیت لکھ کر اپنے مکتوب کو ختم کرتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ خوشخبری دیجئے میرے ان بندوں کو جو بات کو سنتے ہیں اور نیکو ترین بات کی پیروی کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کی ہے، اور یہ لوگ صاحبان عقل وخرد ہیں۔ (مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی مرتبہ مولانا نسیم احمد فریدی ص ۸۳-۲۸۱)

ایک دوسرے مکتوب میں عالمگیر کو پہلے محبت الٰہی کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ ہر چیز باطل یعنی بے حقیقت اور فانی ہے، پھر لکھتے ہیں کہ ایک باطل جو حق نما ہے اور ایک عدم ہے جو وجود کا آسا ہے، ہر چیز کی ذات عدم ہے اور عدم ہر شر و نقص کا اولی رہا ہے، کسی چیز میں صفات کمال کا پایا جانا مرتبۂ وجوب سے مستعار ہے، پس خیر و کمال کا مرجع خداوند تعالیٰ کی ذات اقدس ہے، جو واجب ہے، اور اور شر و نقص تمام تر ممکن کی طرف راجع ہیں، اسی لیے کلام پاک میں کہا گیا ہے کہ جو بھی بھلائی کسی کو پہنچتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور جو برائی کسی کو پہنچتی ہے وہ خود اس کی ذات سے ہوتی ہے، اور جو کوئی اپنی نادانی سے اپنی ذات کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنے عارضی کمالات کو کامل خیال کر کے اپنے کو مبدا احسانات سمجھتا ہے، وہ گویا موائے حقیقی سے بھی کا

دعویٰ کرتا ہے، اور اس میں رعونت اور انانیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جو کوئی اپنے صفات کمال کو حق تعالیٰ کے کمالات کا پرتو سمجھتا ہے اور ان عارضی کمالات کو بالکلیہ اصل کے حوالہ کرتا ہے اور اپنے آپ کو جو کہ آئینۂ کمالات ربانی ہے، محض خالی سمجھتا ہے، اور معدوم محض دیکھتا ہے تب وہ فنائے حقیقی سے مشرف ہوتا ہے، اور انانیت امارہ سے چھٹکارا پاتا ہے، پھر نفس امارہ تدریجاً نفس مطمئنہ بنتا ہے، اسی وقت نعمت حق اس کے حق میں کامل ہوتی ہے،

یہ گویا عالمگیر کو نصیحت تھی کہ کسی حال میں بھی وہ اپنے میں انانیت نہ پیدا ہونے دے، عالمگیر نے حضرت خواجہ معصوم سے بارگرانبار جہانداری اور اپنے حسن خاتمہ کے لیے دعا کرنے کی درخواست کی تھی جس پر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ وہ اس کے لیے پوری ہمت کے ساتھ برابر دعائیں کرتے رہتے ہیں اور پھر اس کو یہ لکھ کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ

"چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم سے آپ کو اس بارہ میں خوف عنایت فرمایا ہے، اس لیے بہت کچھ امیدیں ہیں، یہ خوف کارہائے مشکل کو آسان کر دیتا ہے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ خوف دنیا اور حزن آخرت کسی شخص واحد کے اندر جمع نہیں ہوتے، یعنی اگر کسی کے اندر حزن آخرت ہوگا تو خوف دنیا سے محفوظ رہے گا۔"

عالمگیر نے حضرت خواجہ معصوم کے صاحبزادے شیخ سیف الدین کی بھی تعریف لکھی تھی، اس پر حضرت خواجہ معصوم یہ تحریر فرماتے ہیں:

"فقیر زادے کی ادائیگی خدمت اور لوازم خیر خواہی آپ کی نظر میں پسندیدہ ہیں یہ بات اس کے لیے موجب سعادت و باعث امتیاز ہوئی، فقیر زادہ جو کہ جامع کمالات صوری و معنوی ہے، عزلت اور عدم اختلاط کی عادت رکھتا تھا، چند آدمیوں میں بیٹھنے کی بھی اس کو عادت نہ تھی لیکن محض خیر خواہی نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا ہے

کہ آپ کے پاس گیا ہے"

پھر اپنے صاحبزادے کے توسل کو محض عنایاتِ ربانی کا ایک سبب بتاتے ہیں، اس لیے اورنگ زیب کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:

"مربی حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، وہ خود درد طلب دیتا ہے، اور اپنی طلب میں دوڑاتا ہے اور خود راہ وصل کھولتا ہے، ع

از ما و شما بہانہ برساختہ اند

اسی مکتوب میں عالمگیر کے خط کی تحریر کی فصاحت و بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے ایک عربی شعر بھی لکھتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے ہر ہر لفظ میں آرزوؤں کا ایک باغ مضمر ہے اور ہر ہر سطر میں موتیوں کا ایک ہار پنہاں ہے۔

"آپ کے مکتوب کے فصاحت رنگین اور بلاغت معانی و ادب کا کیا بیاں کروں

ففی کل لفظ منه روض من المنیٰ ۔۔۔ وفی کل سطر منه عقد من الدرّ

ایک اور مکتوب میں عالمگیر کے خط کے قلم کو عنبریں رقم کہہ کر نوازا ہے۔ (مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی، ص ۸۶-۸۳-۲۸۲)

حضرت خواجہ معصومؒ کے صاحبزادے شیخ سیف الدین بھی عالمگیر کی باطنی کیفیات سے اپنے والد ماجد کو برابر مطلع کرتے رہتے۔ ایک بار عالمگیر کے "اثرات ذکر و لطائف" "قلت خطرات" "قبول کلمۂ حق" "رفع بعض منکرات" اور "ظہور لوازم طلب" کے متعلق لکھ کر بھیجا تو حضرت خواجہ نے شکر خدا ادا کیا، کیونکہ اس قسم کی باتیں سلاطین میں نہیں پائی جاتی ہیں، اور پھر یہ حدیث لکھی کہ جو سنت کو مردہ ہونے کی صورت میں زندہ کرتا ہے اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے، گویا اپنی طرف سے عالمگیر کو سو شہیدوں کے ثواب کی بشارت دے رہے تھے۔ ایک آخر میں

دعا کرتے ہوئے لکھتے ہیں (مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی ص ۱۰۷ - ۲۸۰):

"بادشاہ کی ظاہری اور باطنی صلاحیت کا خواستگار ہوں، ان کے باطن کو نسبت اکابر سے معمور پاتا ہوں، اور امیدوار ہوں کہ وہ جلد ہی فنائے قلب کی دولت سے مشرف ہو جائیں گے، یہ فنائے قلب درجات ولایت میں درجۂ اولیٰ ہے۔ ع

با کریماں کارہا دشوار نیست

شیخ سیف الدین نے ایک دوسرے مکتوب میں اپنے والد ماجد کو عالمگیر کی نجی مجلسوں کی خبر دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مجالس سلطانی میں عجیب اسرار جلوہ گر ہوتے ہیں، جو بھی ان کی محفلوں میں داخل ہوتا ہے، "عروج و نزول" کی کیفیات کے ساتھ ممتاز کر دیا جاتا ہے، اس کو پڑھ کر حضرت خواجہ معصوم نے تحریر فرمایا:

"ٹھیک ہے، اہل کمال ہر قطعۂ زمین سے وہ فیوض و اسرار جو اس کے مناسب حال ہیں، مشاہدہ کرتے ہیں، اور ہر زمین سے اس زمین کے مناسب کمال کو حاصل کرتے ہیں، کسی زمین کو معاملات فنا کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے، اور کسی کو کمالات بقا کے ساتھ موافقت ہوتی ہے، کسی قطعہ کو عروج سے مناسبت ہے اور کسی کو نزول سے، حرم مکہ کے کمالات و معاملات جدا ہیں، حرم مدینہ کے فیوض و کاروبار جدا۔ ع

ہر خوش بہ سرے را حرکات دگر است

اسی مکتوب میں حضرت خواجہ لکھتے ہیں:

"تم نے بادشاہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کے اندر دست ... اس سے مناسبت تامہ کا پتہ چلتا ہے، اس بات کے مطالعہ سے

خوشی ہوئی، لطیفۂ اخفیٰ سب سے بڑا لطیفہ ہے، اور اس کی ولایت سب ولایت
اونچی ہے، اس لطیفہ کو خاص سرور کائنات کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے
فقیر بھی بادشاہ کے اندر لطیفہ اخفیٰ کی مناسبت پاتا ہے، والغیب عنداللہ"

(مکتوبات حضرت محمد معصوم سرہندی ص ۸۹-۲۸۸)

ظاہر ہے کہ یہ خطوط بہت ہی نجی تھے، جن کو لکھتے وقت کبھی کاتب کو خیال نہ آیا ہوگا کہ یہ طبع ہو کر عام لوگوں کے ہاتھوں میں بھی پہنچیں گے اسلیے ان میں کسی مصلحت یا ذاتی منفعت کی جھلک نہیں پائی جاتی ہے، بلکہ امر واقعہ کا اظہار ہے، اس لیے ان خطوط کو پڑھ کر یہ کہنے میں تامل نہیں کہ عالمگیر نے شریعت کی پابندی کر کے راہ سلوک کی بہت سی اعلیٰ منزلیں بھی طے کرنے میں لگا ہوا تھا، اسی لیے وہ اپنی بادشاہت کے زمانے میں کسی ایسے صوفی کی طرف مائل نہ ہوا جو احوال و مواجید اور "کشوف و الہامات" کے قائل تھے، اور بدعتوں میں مبتلا ہو کر ترک امر معروف کرتے اور سنت کے متبع نہ ہوتے، بلکہ جو صوفیہ کرام شریعت کے پابند ہوتے وہ ان کی ہر طرح مدد کرنے کو تیار رہتا، ان کے پاس بے تکلف جاتا، انکی نصیحتیں سنتا، بلکہ ان کی جھڑکیاں بھی برداشت کرتا۔

برہان پور کے ایک بزرگ شیخ نصیر الدین ہروی تھے، وہ اپنی جوانی میں دونوں پاؤں اور بائیں ہاتھ سے مجبور ہو گئے تھے، لیکن ایک ہاتھ سے کلام اللہ اور تفسیر کی کتابت کر کے روزی پیدا کر لیا کرتے تھے، کوئی نذر نیاز پیش کرتا تو قبول نہ کرتے، دولت مندوں اور شاہی عہدیداروں سے ملنا پسند نہ کرتے، ہمیشہ تلاوت کلام پاک میں لگے رہتے، تلاوت کرتے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتا، عالمگیر کو ان کے توکل، استغنا، صلاح، تقویٰ اور فضیلت کی خبر ملی، تو برہان پور کے صدر کے ذریعہ سے کوئی جاگیر دے کر ان کی مدد کرنی چاہی، لیکن انھوں نے جاگیر لینے سے یہ کہکر انکار کیا کہ میری طرح لاکھوں اور کروڑوں محتاجوں کو جو رزق دیتا ہے مجھکو بھی

سزا دے گا" (منتخب اللباب جلد دوم ص ۵۵۰)

سورت کے ایک بزرگ سید سعد اللہ تھے، جو شیخ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے، عقلی و نقلی علوم اور سلوک کی تعلیم پاکر مکہ معظمہ چلے گئے، جہاں شریف مکہ نے ان کو بڑے اعزاز و اکرام سے رکھا، وہ شریف مکہ سے لوگوں کی سفارش برابر کرتے رہتے، شریف مکہ نے ان کی ایک دو سفارش کو نظر انداز کر دیا، تو وہاں سے بد دل ہو کر سورت چلے آئے۔ عالمگیر کو ان کے فضل و کمال کا حال معلوم ہوا تو اس نے ان کی خانقاہ کے لیے ایک مکان اور ان کے اخراجات کے لیے دو گاؤں وقف کر دیے، ہندو مسلمان دونوں ان کے یہاں آتے اور مستفیض ہو کر جاتے، اور یہ دونوں ان کو اپنا پیشوا سمجھتے۔ وہ خلق اللہ کی نفع رسانی کی خاطر ہر خاص و عام کی سفارش عالمگیر سے کیا کرتے تھے۔ عالمگیر بھی ان کو دست خاص سے خط لکھا کرتا تھا، ایک بار اس نے ان کو لکھا کہ وہ صرف درویشوں، عالموں اور دینداروں کے لیے سفارش کیا کریں، مگر انھوں نے بادشاہ کی بات نہ مانی، دوبارہ انھوں نے عالمگیر کو لکھ بھیجا کہ وہ ائمہ اثنا عشری سے محبت کرنا اپنا فرض سمجھے، عالمگیر نے بعض فضلا سے اس کے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، صحیح ہے۔ ایک بار سید سعد اللہ نے ایک ہندو کو خط لکھا تو القاب کے پہلے یہ شعر تحریر کیا:

بنام آنکہ او نامے ندارد بہر نامش کہ خوانی سر بر آرد

اس پر بعض علما نے اعتراض کیا، لیکن سید سعد اللہ نے یہ جواب دے کر ان کو خاموش کیا کہ تم ذات پاک واجب الوجود کے بغیر تمام ممکن الوجود کو معدوم الوجود جانتے ہو، تو میں ذات پاک واجب الوجود [illegible]

ایک دوسرے بزرگ میر [illegible] رحمۃ اللہ علیہ [illegible] شریعت کی پابندی کا بہت لحاظ رکھتے،

جہاں مجلس سماع ہوتی وہاں نہ جاتے، اور لوگوں کو اس میں شریک ہونے سے منع کرتے،
جس محلہ میں بستے وہاں سرود و نغمہ کی آواز بلند کرنے کی کسی کی ہمت نہ ہوتی، شاہی حاکموں
کے یہاں کھانا نہ کھاتے، اگر کوئی ان کے پاس آتا اور کہتا کہ مرید ہونے آیا ہوں تو وہ فرماتے
یہ نہ کہو بلکہ یہ کہو کہ توبہ و استغفار کرنے آیا ہوں، اور آئندہ کوئی بات یا کام شرع کے خلاف نہ کرو گا
پھر طرح طرح کے سوال کرتے، اور وہ جواب دیتا کہ ہر حال میں خدا کا حکم بجا لاؤں گا، تو پھر اپنے
حلقۂ ارادت میں لیتے، اس طرح ملتان اور لاہور سے دکن تک ہزاروں مرید ان کے گرد
جمع ہو گئے تھے، کسی سے نذرانہ نہ لیتے جب تک کہ ان کو یقین نہ ہو جاتا کہ نذرانہ دینے والے کی
کمائی حرام کی نہیں ہے، اور وہ اپنی بیوی کا نفقہ اور فرزندوں کے حقوق کو ادا کر چکا ہے،
نذرانہ لیکر اس کے ایک خمس سے تجارت کرتے، روزے برابر رکھتے، شب بیداری کرتے
تلاوت کلام پاک میں مشغول رہتے، اور جب وعظ کہتے تو ظالم حکام، ریاکار علماء اور حکام
کے مصاحب فقراء کی بڑی مذمت کرتے، اور ایسے حکام کو برا کہتے جو خدا اور رسول کے احکام
کی خلاف ورزی کرتے، سرود و نغمہ سنتے، اور بزرگوں کے مزار پر رقص و سماع کی محفل کراتے،
ایسے بدعتی عوام کے خلاف بھی وعظ کہتے جو شب برات، عاشورہ اور عید میں خلاف شرع
باتیں کرتے رہتے، میت کے نام پر کھانے پکوا کر تقسیم کرتے، اور ان کے نام سے جو کھانا رکھتے تھے اس کو
حرام بتا کر اس کے کھانے کی سخت مخالفت کرتے، ان کی اس مذہب پسندی سے حکام، علماء،
اور مشائخ کو بھی ان سے عداوت ہو گئی تھی، جہانگیر بادشاہ کے قاضی القضاۃ قاضی اکرم ان کے بڑے
مخالف ہو گئے تھے، اور ایک بار حضرت [illegible] کے ان سے مناظرہ کیا تو [illegible]
پیدا ہو گئی تھی، [illegible] جہانگیر [illegible] اس سے ملنے گئے اور
انہی ایک کتاب [illegible]

کبھی ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر شاہ صاحب نے اس سے ملنے سے انکار کیا۔ ان کی اس
بے رخی سے وہ کبھی دل گیر نہ ہوا۔ (تذکرۃ المناظرین ص ۸۰)

شاہ ولی اللہ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم اپنے علم و فضل، عبادت، ریاضت، زہد و
تقویٰ و تورع کے لحاظ سے مایۂ ناز علماء میں سے گذرے ہیں۔ ان ہی کے خاندان سے علمی و روحانی
فیوض و برکات کا وہ سرچشمہ پھوٹا ہے جس سے آج تک ہند و پاک کے ارباب علم اور اصحاب دل
سیراب ہوئے ہیں۔ عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری کی تدوین شروع کرائی تو ان سے بھی معاونت چاہی،
وہ شاہی دربار سے کسی قسم کی وابستگی پسند نہیں کرتے تھے مگر اپنی والدہ کے اصرار پر فتاویٰ عالمگیری
کی ترتیب میں شریک ہو گئے، لیکن شاہ صاحب کے مرشد حضرت خلیفہ ابوالقاسم نے دربار سے یہ تعلق
پسند نہ کیا، اس لیے وہ جلد ہی اس کام سے علیحدہ ہو گئے۔ عالمگیر نے کچھ جاگیر دینی چاہی لیکن اس کو
قبول کرنے سے انکار کیا، عالمگیر ان سے ملنے کا بڑا مشتاق رہتا، مگر وہ بادشاہوں اور امیروں کے
گھر جانا اپنے روحانی بزرگوں کے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے۔ ایک بار عالمگیر نے شاہ صاحب
کے مخلص کے ذریعہ شوق ملاقات کا پیام بھیجا، مگر وہ دربار میں جانے پر مطلق راضی نہ ہوئے، ملا ایک معمولی
کاغذ کے پرچے میں ان کے جوتے پھٹے ہوئے تھے، یہ عبارت لکھ کر اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی
حکومت کے شہنشاہ کے پاس بھیج دی۔

اہل اللہ کا اس پر اجماع ہے کہ وہ فقیر بہت برا ہے جو امیروں کے آستانہ پر ہو، حق سبحانہ و تعالیٰ نے
فرمایا ہے کہ وَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اِلَّا قَلِيْلٌ یعنی دنیاوی زندگی کا سرمایہ بہت قلیل ہے، ہم کو
قلیل ترین چیز ملا ہے اگر بالفرض مجھے وہ ملے تو وہ بہت ہی قلیل تر چیز ہوگی، اس کے لیے ہم چپکتا
نہ ہو سکے کہ میں اپنے نام کو خدا تعالیٰ کے دفتر سے کیوں نکلواؤں۔ چشت کے بعض ملفوظات میں
مذکور ہے کہ جس کا نام بادشاہ کے دفتر میں لکھ لیا جاتا ہے، حق تعالیٰ کے دفتر سے اس کا نام کٹ جاتا ہے۔
(انفاس العارفین از شاہ ولی اللہ ص ۹۹)

شاہ ولی اللہ اس خط کو نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں کہ عالمگیر کو جب یہ رقعہ ملا تو اس نے اپنی جیب میں رکھ لیا، اور جب کپڑے بدلتا تو پھر اس کو اپنی جیب میں رکھ لیتا، فرصت کے وقت اس کو پڑھ کر روتا تھا۔

اوپر کی تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ عالمگیر ایک راسخ العقیدہ مسلمان بننے کی کوشش کرتا رہا، اور راہ طریقت پر چلنے کے باوجود وہ شریعت کا بڑا پابند تھا، آج کل کے غیر مسلم مورخین اس کا ایک حکمراں کی حیثیت سے مطالعہ کرتے ہیں، تو اس کی شریعت نوازی پر تنقید و تنقیص دونوں کرتے ہیں، کیوں؟ اس کا جواب اس مقالہ کے موضوع کے دائرہ سے باہر ہے، لیکن کوئی مسلمان اس کے خلاف برے الفاظ سننا پسند نہیں کرتا، محض اس لیے کہ اس نے اپنے زمانہ کے مسلمانوں میں مذہب کی ایک نئی روح پیدا کرنی چاہی، لیکن کیا یہ مستقل طور پر بیدار رہ سکی؟ اگر نہ رہ سکی تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ سلاطین یا علماء یا مشائخ؟ جس طرح عالمگیر کے جانشینوں پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر کی اس سلطنت کو سنبھال نہ سکے جس کو اس نے غزنی سے چاٹگام اور کشمیر سے کرناٹک تک پھیلا دیا تھا، اسی طرح علماء اور مشائخ پر بھی یہ الزام آتا ہے کہ عالمگیری عہد میں مسلمانوں میں جو نئی مذہبی روح بیدار کی گئی تھی، اس سے وہ نبی کے وارث بن کر پوری بیدار مغزی سے فائدہ اٹھاتے، اور مسلمانوں کی مذہبی، روحانی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی کو ہر طرح سنوارتے رہتے تو اس وقت مسلمانوں کی سیاسی زندگی بھی کچھ اور ہوتی، انھوں نے درس و تدریس کی مسند اور محراب و منبر اور خانقاہ کی زینت ہی بننے پر اکتفا کیا، اور اپنے فرائض کی ادائگی میں وہ تمام انجام نہ دے سکے جن کی ان سے توقع تھی، یا جو بگڑتی ہوئی معاشرت اور سیاست یا بدلتی ہوئی صورت حال میں ان کو اپنے مذہبی فکر و عمل، ایمانی جوش و طاقت اور روحانی بصیرت و تدبر سے کرنا چاہیے تھا۔

فیضی اور اسکی تفسیر سواطع الالہام

از جناب محمد سالم صاحب قدوائی ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہندوستان میں تفسیر پر خاصا متنوع کام ہوا ہے، کچھ علماء نے علمی فنی تفسیریں لکھیں، کچھ نے قرآن مجید سے احکام شرعیہ کا استخراج کیا، کچھ نے شرحیں اور حواشی لکھے، اسکے ساتھ بعض لوگوں نے اپنی ادبی مہارت اور زبان پر عبور کا بھی ثبوت پیش کیا۔ اسی قسم کے لوگوں میں عہد اکبری کی مشہور و معروف شخصیت شیخ ابو الفیض فیضی بن شیخ مبارک کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے، یوں تو فیضی کی شہرت اور اہمیت اس کی فارسی شاعری کی وجہ سے بہت ہے، لیکن اس کی عربی زبان کی صلاحیت بھی غیر معمولی تھی۔ اس کا بین ثبوت اس کی تفسیر سواطع الالہام ہے۔ فیضی نے یہ تفسیر غیر منقوط الفاظ میں لکھی ہے جسے ادب کی اصطلاح میں "صنعت مہملہ" کہتے ہیں، عربی زبان میں اس قسم کی تصنیف کرنا ایک غیر معمولی کارنامہ ہے، اور پھر پورے قرآن کریم کی تفسیر وہ بھی مختصر نہیں بلکہ تقریباً سات سو صفحات میں! فیضی نے اس اہم کام کو بہت تھوڑی مدت میں مکمل کر لیا۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"سواطع الالہام یعنی تفسیر غیر منقوط سنہ ۱۰۰۲ھ میں تمام ہوئی، کل مدت تصنیف دو ڈھائی برس ہے، اس تفسیر پر فیضی کو بڑا ناز ہے، دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں ان میں اکثر فخر سے اس کا تذکرہ کرتا ہے۔"[1]

---

[1] شعر العجم جلد ۳ ص ۵۵

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اس تصنیف کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"بیان فضیلت شیخ فیضی سوای تالیف تفسیر بے نقط است کہ در دو سال پیشتر از

ہیچ مستعدی را میسر نشدہ بطرفہ اینکہ این چنین کلام بشود را در عرض دو سال از

مبدا بہ منتہی رسانید"[1]

فیضی کو دربار اکبری میں بڑی حیثیت حاصل تھی، شروع میں تو درباری چشمک کی وجہ سے اسے خاصی پریشانی اٹھانی پڑی، ان کے باپ شیخ مبارک اور بھائی ابوالفضل تینوں ٹھوکریں کھاتے پھرے لیکن پھر بعد میں بڑی جدوجہد اور مختلف وسیلوں سے دربار اکبری میں پناہ ملی، اکبر ان لوگوں کی بہت عزت کرتا تھا، دربار میں ان کا خاص مرتبہ تھا، دونوں بھائی انتہائی ذہین تھے، اس لیے تھوڑے ہی عرصہ میں ان کو اکبر کے مزاج میں بڑا رسوخ حاصل ہوگیا۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کٹر مذہبی طبقہ اکبر کے خلاف تھا اور اس کو مختلف فتوؤں میں الجھائے رکھتا تھا، اس دور کی اس کشمکش کو ختم کرنے میں ان دونوں بھائیوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے، علامہ شبلی نے لکھا ہے:

"اکبر مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی کی تنگ خیالیوں سے تنگ آگیا تھا اور ان لوگوں کے زور کو گھٹانا چاہتا تھا، لیکن خود جاہل تھا، اس لیے مذہبی فتوؤں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، فیضی اور ابوالفضل دربار میں پہنچے تو اکبر کو گویا آلات ہاتھ آگئے، ان لوگوں نے ہر موقع پر ان حریفوں کو شکستیں دیں اور ان کا اعتبار برہم بالکل کھو دیا"[2]

اکبر تو فیضی اور ابوالفضل سے خوش تھا لیکن مذہب کے کٹر طبقہ نے جو ایک حد تک خود اکبری

---

[1] مآثر الکرام ص ۔ [2] شعر العجم ج ۳ ص ۴۴

بے اعتدالیوں سے پریشان تھے، ان دونوں بھائیوں سے بھی برگشتہ ہو گئے، اور ان کے ہر کام کو عیب کی نظر سے دیکھنے لگے، فیضی شروع ہی سے مذہبی امور میں بہت آزاد خیال تھا، اس لیے کٹر مذہبی طبقہ میں بے دین سمجھا جاتا تھا، جس کا اظہار بھی اس دور کے مذہبی لوگوں نے جابجا کیا ہے، خاص طور سے ملا عبد القادر بدایونی اس میں پیش پیش ہیں، اس لیے جب فیضی نے اپنی تفسیر مکمل کی تو لوگوں نے اس کے خلاف طرح طرح کی باتیں پھیلائیں، ملا صاحب لکھتے ہیں:

"تفسیر بے نقط برائے شستن بہ نامی کہ تا روز جزا بصد آب شستہ نگردد در عین حالت مستی و جنابت می نوشت وسگان آں را از ہر طرف پامال ساختند"[1]

اس کے علاوہ بھی طرح طرح کے الزامات لگائے گئے، لیکن تفسیر دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں بے بنیاد اور محض دربار دشمنی پر مبنی ہیں، فیضی اگر چاہتا تو تفسیر میں اپنی آزاد خیالی کو کام میں لا سکتا اور کلام اللہ کے معانی و مفہوم میں تحریف سے کام لیتا، لیکن اس نے کہیں بھی ایسا نہیں کیا ہے، محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

"زبانی باتوں میں ملا صاحب جو چاہیں کہیں مگر نفس مطالب میں جب نہایت کوئی کام نہیں چل سکتا، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ بے دینی اور بدنفسی پر آ جاتے تو جو چاہتے کہہ جاتے انھیں ڈر کس کا تھا"[2]

علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"فیضی نے تفسیر ان دقائق کے ساتھ لکھی ہے لیکن ایک قدم مسلمات عامہ کی شاہراہ سے نہیں ہٹا، حالانکہ تفسیر میں ہر قدم پر اس کو آزاد خیالی دکھانے کا موقع حاصل تھا، ملا صاحب تو فرماتے ہیں کہ وہ تمام عقائد اسلام کا منکر تھا لیکن واقعی تمام عقائد کا منکر

---

[1] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۲۹۹ [2] دربار اکبری ص [illegible]

وما لکه معلوم مالک لواسع علمه — حال ہوا آل کو جو تمام علوم وحی کے

وعلوم معلم مطالع معلومه — مالک ایک کریں اور ان کے علوم واسرار کے

(مقدمہ) — علوم کا اولی پرتو میں

آگے چل کر مختصر تنزیل قرآن کا ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کس طرح نازل ہوتی تھی اور آپ کی اس وقت کیا کیفیت ہوتی تھی، اس کے بعد جمع و ترتیب قرآن کے متعلق لکھا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کلام مجید میں کل کتنی سورتیں ہیں، ہر سورہ میں کتنی آیات ہیں، قرآن مجید کے بہت سے نام ہیں، ان میں سے جو بے نقط ہیں مثلاً صراط، کلام، امام وغیرہ، اور قرآن مجید کے حفاظ اور اس کے ابتدائی مفسرین حضرت عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ کا ذکر کیا ہے، حروف کے صحیح تلفظ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ تمام حروف کو ادا کرنے کا ایک خاص انداز ہے، اس سلسلہ میں بہت سے الفاظ کی تشریح کی ہے مثلاً اللھم، لعل، ام، کاد، لما، لولا وغیرہ۔ اسی طرح سے محکم اور غیر محکم آیات والفاظ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، محکم وہ ہیں جن کا سمجھنا آسان ہے، اور غیر محکم وہ ہیں جن کا علم سوا اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں، جیسے علم معاد، سورتوں کے ابتدائی الفاظ مثلاً الم، الر، طسم وغیرہ۔ اس کے بعد تفسیر سے متعلق بھی بعض ضروری باتیں بیان کی ہیں، مقدمہ کے آخر میں دوبارہ بارگاہ خداوندی میں عاجزی وانکساری سے دعا مانگی ہے۔

اللهم اسألك صوالح الاعمال ومصالح الآمال ما دام سر الله هو
ذكره الاحوال والمأمول اصلاح الكلام و[illegible] اوامر الكرام واسلم
[illegible] الاسلام وما اصدره ما هو المعمود والمراد [illegible]
لمدلول كلام الله وما ول كلمه وحاصل اسراره وهو الملهم للسداد
والمسدد للملهم [illegible] (مقدمہ)

مقدمہ خاصا بسیط ہے جس میں مذکورۂ بالا باتیں تفصیل سے بیان کی ہیں، مقدمہ کے دو حصے ہیں، پہلے میں اپنا اور اپنے اعزا کا حال لکھا ہے، دوسرے میں علوم قرآنی کا مفصل تذکرہ ہے، ان دو حصوں کو بھی الگ الگ ابواب میں تقسیم کیا ہے، اور ہر باب کا نام ساطعہ رکھا ہے۔ بعض ساطعے بہت مختصر صرف سطر ڈیڑھ سطر کے ہیں، اور بعض خاصے طویل تین تین سطروں تک کے ہیں، مقدمہ کے خاتمہ پر ایک نظم بھی لکھی ہے، اس میں بھی صنعت مہملہ کا التزام رکھا ہے۔

اس کے بعد سورہ فاتحہ کی تفسیر شروع کی ہے تفسیر سے پہلے اس کی اہمیت و عظمت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

وهو اول السور وصدر كلام الله مطلع صحاح العلم والكلام مصدر مصادر الاوامر والاحكام سلّم مصاعد الحكم والاسرار مدار مصالح الاعمال والاعمال درر دور سلسال الارواح والمصادر وساحل داماء الهموم والسرور سما دعوالم الملح والحالك" (ص ۲)

اسی جگہ پر سورۂ الحمد کے جو دوسرے نام ہیں ان کا تذکرہ بھی کر دیا ہے، اور وجہ تسمیہ لکھی ہے:۔

"ولها اسماء احصاها العلماء، احدها الدعا لما هو مدعو اهل الله وهم دعوا لحصول المصالح، والاساس لما هو اس الكلام واصله والام لما هو حاصل مدلول الكل والحمد لما هو اول كلامها كما حكوا في اسماء السور كلها"

"ایاک نعبد" کی تفسیر میں لکھا ہے

طوعاً لا كرهاً كما هو مامورك ومرادك وهو حصيم لكمال الطوع

والمکوع: (ص ۶۲۲)

تفسیر میں سورتوں کی شان نزول بھی بیان کی ہے، اور پورے واقعہ کی طرف مختصر اشارہ کر دیا ہے، اس سلسلہ میں اگر کوئی خاص قابل ذکر بات ہوتی ہے تو اس کا ذکر بھی کر دیتے ہیں، مکی و مدنی کی بھی تصریح کر دی ہے، مکی سورتوں کا ذکر "مورد ها مصر رسول اللہ صلعم" اور مدنی سورہ کا "مورد ها ام الرحم" کے الفاظ سے کرتے ہیں۔

سورۃ النجم کے متعلق لکھتے ہیں:

"مورد ها ام الرحم ومحصول اصول مدلولها العهد لسداد ما كلمه الرسول وارساله مما الله وصدع صعوده اسماء وكلمها السمى المعهود وادكار كلام الاعداء الادم وسوء ماوهموا للاملاك وذماهم ومدح رهط طرحوا الآصار ولوم ماعدل وراء الاسلام وصدع اعطاء اعدال الاعمال معاداً واعلاء صروع الادلاء لوطود الآس وطوله والوماء لاحوال الامم الهلاك وهول اهل العالم عما احام درود السواء وامرهم بطوع الله" (ص ۶۲۵)

سورۃ النصر کے متعلق لکھا ہے:

"مورد ها مصر رسول اللہ صلعم ومحصول اصول مدلولها اعلامهم اسعاد الله رسوله واكمال امداده لاهل الاسلام وسلوكهم مسالك الاسلام رهطاً رهطاً والامر لحمد الله وسؤال محو الآصار ولعهود امداد الامر" (ص ۲۴۲)

اسی طرح تمام سورتوں کے شروع میں مختصراً ان کا تعارف کرایا ہے، اور ان کے مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تفسیری نقطۂ نظر سے اس تفسیر کی اہمیت زیادہ نہیں ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ تقیدِ صنعت مہملہ کے التزام کا نتیجہ ہے، اگرچہ فیضی نے بہت کوشش کی ہے کہ کوئی بات تشریح و توضیح سے رہنے نہ پائے، اس کے باوجود بعض عبارتیں بہت مشکل ہو گئی ہیں، عام طور سے لوگوں نے اس تفسیر کو ایک بے مقصد اور فضول کام کہکر اپنی جان بچالی ہے، لیکن اسکو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقۃً ایسا نہیں ہے۔

سورۂ آل عمران میں محکم و متشابہ آیات کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

ھو اللہ الذی انزل اسمہ علیک محمد الکتٰب المعھود المعلوم اسماً ورسماً منہ الطروس المعلوم المعھود آیٰت محکمٰت محکم کلمھا واحکامھا مؤکدا دوائما مصرح مدلولھا والمراد ما امرہ اللہ وسط کل طرس اسلہ او کلامہ ما حمل الا محملا واحدا او الحاد للحکم ھن او اللامام الکتٰب اصلہ ومردّ ما وراءھا واُخر ما عداھا متشٰبھٰت لا مسلک لادراک مرادھا ومدلولھا کمطالع السور ولما ما اول ما صرح اللہ مرامہ او ما لا امرہ اللہ وسط کل طرس او ما لہ محامل او الحدود۔

پورے قرآن مجید کی تفسیر کا یہی انداز ہے، عبارتوں میں اختصار اور معانی و مفہوم کو سہل انداز پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن چونکہ تفسیر سے زیادہ صنعت گری پیش نظر ہے اس لیے اسکو سمجھنا خاصا مشکل ہو گیا ہے، ملا بدایونی وغیرہ نے اس تفسیر کی مخالفت محض رشک و حسد کی بنا پر کی ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر فیضی نے اس کو صنعت مہملہ میں نہ لکھا ہوتا تو اس کے خیالات زیادہ

واضح ہوتے، اور لوگوں کو جو غیر منقوط عبارت کی بدعت نظر آتی ہے فیضی اس سے بچ جاتا، لیکن فیضی غالباً کلام اللہ کے اس معجزہ کو بھی دکھانا چاہتا تھا کہ اس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مختلف انداز اختیار کیے جا سکتے ہیں، حتی کہ اس کی تفسیر غیر منقوط الفاظ میں بھی لکھی جا سکتی ہے، اسکے علاوہ عربی زبان پر اپنی قدرت کا ثبوت دینا چاہتا تھا، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب الفاظ کا سرمایہ محدود ہو تو تعقید کا پیدا ہونا قدرتی بات ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تفسیر کا مفہوم ہی خبط ہو گیا ہے، ایسا نہیں ہے، جہاں سے اس کو پڑھا جائے مطلب سمجھ میں آجاتا ہے،

فیضی نے جب یہ تفسیر لکھی اس وقت کسی نے اس کی زبان یا مطالب پر اعتراض نہ کیا، بلکہ صرف غیر منقوط کی بدعت پر اعتراض تھا، اسی بنا پر اس کو بدعتی قرار دیا گیا۔

فیضی کی یہ تفسیر کم و بیش ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل ہے، لیکن اس ضخیم کتاب میں کہیں بھی کوئی قابل اعتراض بات نظر نہیں آتی، اکبری دور میں جبکہ دربار کا رنگ بالکل غیر مذہبی تھا، فیضی کا اس تفسیر کو لکھنا کوئی معمولی بات نہ تھی، یہ محض اس کا مذہبی جذبہ تھا کہ اس نے اتنا بڑا کام کر ڈالا، اگر اس تفسیر سے اس کو کوئی دنیاوی فائدہ یا درباری رتبہ بڑھانا یا بادشاہ کا تقرب حاصل کرنا مقصود ہوتا تو یقیناً اس نے اس میں دوسرے قسم کے خیالات ظاہر کیے ہوتے۔

اس تفسیر کی مذمت صرف ملا بدایونی کے یہاں ملتی ہے، اور جن لوگوں نے اس کے بارہ میں لکھا ہے، انہی کے حوالہ سے لکھا ہے، فیضی نے تفسیر لکھنے کے بعد اس کے نسخے مختلف ملکوں میں بھیجے تھے، اور روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سب نے اس کو پسند کیا، کسی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا، اس زمانہ کے متعدد بڑے علماء نے تقریظیں لکھیں اور تاریخیں کہیں، جو اس تفسیر کے آخر میں درج ہیں، ان علماء میں محمد حسینی المشہور بالشامی، مولانا یعقوب صیرفی کشمیری، قاضی نور اللہ شوستری، امان ابن غازی سرہندی وغیرہ کے نام ہیں، طوالت کے خیال سے انکی رائیں تفسیر کے بارہ میں نقل

نہیں کیں۔ بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجدد صاحب نے بھی اس تفسیر کی تیاری میں مدد کی تھی، اور اس کا ایک مشکل حصہ جو فیضی نہیں لکھ سکتا تھا، مجدد صاحب نے لکھکر دیا تھا[1]، جو اس کا ثبوت ہے کہ حضرت مجدد صاحب کی نظر میں بھی فیضی کی یہ کوشش قابل اعتراض نہ تھی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں بہت تفصیل سے فیضی اور اسکی تفسیر کے متعلق خیالات ظاہر کیے ہیں، یہاں ان کی رائے نقل کیجاتی ہے:

"میرا خیال ہو کہ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر شاید دوسرے اسلامی ممالک کے علمی حلقوں میں نہیں مل سکتی، مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہو کہ غیر منقوطیت کے اس التزام کے باوجود ملا نے یہ کمال کیا ہو کہ عام تفسیروں میں قرآنی آیات کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہو، اس شخص نے ان تمام امور کے سمیٹنے کی جہاں تک میرا خیال ہو ایک کامیاب اور ایسی کوشش کی ہو جس کی نظیر اس سے پہلے مشکل ہی سے مل سکتی ہو، گو اس کی تفسیر میں مطالب کے لحاظ سے کوئی جدت نہیں ہو تاہم بہرحال ایک غیر معمولی ذہن و دماغ کا آدمی تھا، بیچ بیچ میں بعض نکتے اس کے قلم سے بے ساختہ نکل گئے ہیں، اگر ان کو ایک جگہ جمع کیا جائے تو اچھی خاصی چیز ایسی جمع ہو سکتی ہے جسے اس کی تفسیر کی معنوی خصوصیت بھی قرار دیا جا سکتی ہے۔"[2]

---

[1] زبدۃ المقامات ص ۱۳۲

[2] نظام تعلیم و تربیت (ج ۲) غالباً فیضی کی ہی تفسیر سے متاثر ہو کر ۱۳۰۶ھ میں شام کے ایک عالم سید محمود آفندی نے درر الاسرار کے نام سے ایک غیر منقوط تفسیر لکھی جو شائع بھی ہو گئی ہے، فیضی کی اور ان کی تفسیر میں فرق اتنا ہے کہ فیضی ذرا تفصیلی انداز اختیار کرتے ہیں لیکن محمد آفندی اختصار۔ انشا کا سرمایہ کم و بیش ایک ہی ہے، اس کے علاوہ کسی دوسری غیر منقوط مکمل تفسیر کا پتہ نہیں چلتا ہے، اس طرح سے فیضی اس میدان کا پہلا شہسوار ہے اور ہندوستان پہلا ملک ہے جہاں ایسی تفسیر لکھی گئی۔

فیضی کی یہ تفسیر ہر اعتبار سے مکمل اور خاصی اہم ہے، اور اسے کسی بھی دوسری تفسیر کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ تفسیری خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ ایک قابل قدر علمی و ادبی کارنامہ بھی ہے، فن تفسیر کے نقطۂ نظر سے اس میں کسی قسم کی خامی نظر نہیں آتی، البتہ کتاب کا مقدمہ خاصا مشکل ہے، خاص طور سے وہ عبارتیں جہاں وہ لوگوں کے نام اور اسی قسم کی دوسری باتیں بیان کرتا ہے، لیکن اصل تفسیر کا حصہ مشکل نہیں ہے، تھوڑی توجہ اور محنت سے مطالب سمجھ میں آجاتے ہیں،

اس تفسیر سے عربی زبان کی حیرت انگیز سرمایہ داری کا بھی ثبوت ملتا ہے جس میں خدا کا آخری پیغام نازل ہوا، اور اس پر فیضی کی قدرت اور کمال انشاء کا بھی، ہندوستانی مفسرین کے کارناموں میں یہ کتاب ایک بڑا اہم کارنامہ ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

امام رازی

امام فخرالدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جاتی اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس میں ان کے سوانح و حالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ فلسفہ و علم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق ان کے نظریات و خیالات کی تشریح کی گئی ہے، جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور و فکر کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔

مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

ضخامت ۲۸۰ صفحے قیمت ؎ـ

منیجر

مشائخ گردیزیہ کا تعلق اضلاعِ مشرقی سے

از جناب قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

ساتویں صدی ہجری کے شروع میں سلطان شمس الدین التتمش متوفی سنہ ۶۳۳ھ کے دورِ سلطنت میں ترکستان کے شہر گردیز سے جو نواحِ بخارا میں ہے، دو بھائی دہلی آئے، ایک سید شمس الدین اور دوسرے سید شہاب الدین، کچھ دنوں کے بعد دونوں بھائیوں نے پھر رختِ سفر باندھا، سید شمس الدین نے دہلی کے قریب ہی علاقۂ میوات کو اپنی منزل قرار دیا، جہاں ان کی اولاد پھلی پھولی اور آباد ہوئی، اور سید شہاب الدین نے دہلی سے دور بہ سمت مشرق مانک پور میں اقامت اختیار کی، جہاں انکو اور ان کی نسل کو بڑا فروغ ہوا، امارت و مشیخت اور دین و دنیا کے امتزاج نے ان کے قدم چومے، شاہی منصب، جاگیرداری اور زمینداری نے ان کا استقبال کیا، آگے چل کر روحانیت و مشیخت نے بھی ان کو حسنِ قبول بخشا، امراء و سلاطین سے لیکر عوام تک ان کے قدردان بن گئے، راجہ کا خطاب ان کو پہلے ہی عوام سے مل چکا تھا، اب شیخ اور شاہ کا خطاب بھی مل گیا، ان ساداتِ گردیزیہ کو سرزمین مانک پور بہت راس آئی، ایک طرف انھوں نے سلاطین وقت سے بڑے بڑے عہدے اور دوسری طرف مشائخِ زمانہ سے فیوض و برکات حاصل کیے، اور ظاہری معنوں میں بھی "آنان کہ در فقیری شہنشاہی کردہ اند" کے مصداق بن گئے۔

پھر ان کی یہ فقیری و شہنشاہی صرف حدود مانک پور تک نہیں رہی، بلکہ بعد میں اس خاندان کے اک گوہرِ شب چراغ راجہ سید حامد شاہ مانک پوری نے حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی [illegible]

کی صحبت و خدمت میں رہ کر اور امارت و شیخیت کا دائرہ اور وسیع کر کے مشرق کی طرف ایک اور قدم بڑھایا، اور جونپور کو مرکز بنا کر بلاد پورب کو اپنے زیر نگیں کیا، اور یہاں سادات گردیزیہ کا جو اثر و اقتدار ہوا کہ سلاطین شرقیہ، سلاطین لودی اور سلاطین تیموری کی حکومتوں میں انقلاب آتے رہے، مگر ان کا دربار برابر چلتا رہا، اور سلطنتوں کے انقلاب میں ان کے فیوض و برکات کا مینارہ برابر روشنی پھیلاتا رہا۔

آیندہ صفحات میں مانک پور کے ان ہی مشائخ گردیزیہ اور بلاد پورب میں ان کے دینی و روحانی کارناموں کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سید شہاب الدین گردیزیؒ | جیسا اوپر معلوم ہو چکا ہے، آپ اپنے بھائی سید شمس الدین کے ساتھ سلطان شمس الدین التمش متوفی ۶۳۳ھ کے زمانہ میں گردیز سے دہلی تشریف لائے، آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: سید شہاب الدین بن زین الدین بن عیسیٰ باقر بن نظام الدین ابوالعلی محمد بن ابوطالب حمزہ بن محمد ابن طاہر ابن امام جعفر زکی النفس[۱]۔ سید شاہ ابوالحسن نے آئینۂ اودھ میں ابوطالب حمزہ بن سید جعفر ابن سید امام نقی لکھا ہے[۲]، شاہ عبدالحق صاحب دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں راجہ سید حامد شاہ کے تذکرہ میں لکھا ہے:

"در زمان سلطان شمس الدین التمش[۳] دو برادر از سادات گردیزیہ بہ قدم آوردہ بودند یکے سید شمس الدین در دہلی حیات سکونت کرد، و بقیہ اولاد او در آنجا ماندہ اند، و دیگرے سید شہاب الدین کہ اخبار دوست، بزرگ و دیشان معروف و کرم بر وے اند، و در زبان مردم آں دیار بہ ایشان اسم راجہ غالب آمدہ[۳]"

مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے "راجہ[illegible] خطاب سید شہاب الدین کہ جد راجہ حامد شاہ بود"

۱؎ خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۔۔ ۲؎ آئینۂ اودھ [illegible] ۳؎ اخبار الاخیار ص [illegible] ۴؎ خزینۃ الاصفیا [illegible]
[illegible]

آئینۂ اودھ میں ہے کہ آپ بحکم باطن ساکن مانک پور ہوئے بعض گردیزی راویوں کے بیان کے مطابق آپ کو حکومت سے منصب سلطانی اور مانک پور کی جاگیر ملی، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی اولادیں دیں کہ آپ سے کئی مواضعات آباد ہوگئے۔ اور سلاطین جونپور کے زمانہ میں بڑا اقتدار حاصل ہوا، ایسا اقتدار ظاہری و باطنی دوسرے سادات کو حاصل نہیں ہوا، آپ کا مزار پہلے مانک پور میں لب دریا تھا، بعد میں دریا برد ہونے کے خوف سے آپ کی اولاد نے آپ کی نعش کو آراضی شہاب الدین پور میں دفن کیا جہاں آپ کا روضہ اب تک موجود ہے[1]۔

سید شرف الدین اور سید عز الدین | سید شہاب الدین کے یہ دونوں صاحبزادے ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع اور اپنے باپ کے صحیح جانشین تھے، ان کو حضرت مخدوم جہانیاں سید جلال الدین حسین بخاری متوفی ۷۸۵ھ کی توجہ نے خصوصی فیض بخشا، سلطان الشرق خواجۂ جہاں سرور متوفی ۸۰۲ھ کے دورِ حکومت میں آپ مانک پور تشریف لے گئے، جو جونپور سے اسی میل دور ہے اور شرقی سلطنت میں شامل تھا، سید شرف الدین اور سید عز الدین (یا عزیز الدین) نے حضرت مخدوم جہانیاں کا ان کے شایانِ شان استقبال کیا، اور ان کو مہمان بنا کر خاطر تواضع میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، مخدوم صاحب نے ان سے دریافت کیا، کیا بات ہے کہ آپ لوگوں میں بعض اسلحہ بند ہیں اور بعض خرقہ پوش؟ انھوں نے عرض کیا کہ سلاطین و حکام کی طوائف الملوکی کی وجہ سے غیر مسلم موقع پا کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوتے ہیں، اسی لیے ہم لوگ ہتھیار بند رہا کرتے ہیں، مخدوم صاحب نے سید عز الدین کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم راجہ ہو اور سید شرف الدین سے فرمایا کہ تمہارے لیے عہد قضا ہے، اب تم کو کوئی ستمگر تکلیف نہ دے سکے گا، بشرطیکہ تم لوگ اپنے آباء و اجداد کے دین پر رہ کر کتاب و سنت کی اتباع کرو، اگر تم اس پر قائم رہے تو یہ دونوں باتیں تم سے ختم نہیں ہوں گی، جب مخدوم صاحب مانک پور سے واپس ہوئے

[1] آئینۂ اودھ ص ۱۶۸

سے قریہ دونوں بھائی پرگنہ پرتاب گڑھ تک ہمراہ آئے[1]۔ سید علی موسوی حیدر آبادی نے مشکوٰۃ النبوۃ میں لکھا ہے کہ

"سید عزالدین جد شریف سید حامد شاہ سجادہ نشین آبا و خود بودند۔"

پھر اودپور کے واقعہ کو اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے، اور اس میں صرف سید عزالدین کا نام لیا ہے؛

"در زمانے کہ مخدوم جہانیاں سید جلال الدین حسین بخاری سیاحت دیار شرق نمود، با سید عزالدین کہ از مشاہیر مشائخ بود بملاقات نمودہ معائنہ فرمود کہ سید لباس مشائخانہ ندارد و سلاح می بندد، مخدوم پرسید کہ سبب سلاح بستن چیست، سید گفت درین ملک راجہائے اہل فساد بر مسلمانان آفت می کنند، مخدوم فرمود کہ از امروز ولایت بر شما باشد، الحال شما راجہ این ملک شدید، پس از آن روز خطاب راجہ بر اولاد ایشان جاری شد[2]۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید عزالدین اپنے والد شہاب الدین کے خلیفہ اور جانشین تھے، اور مخدوم جہانیاں نے ان کو ہی راجہ کا خطاب دیا تھا، جو بعد میں رواج پا گیا،

راجہ سید حامد شاہ مانک پوری متوفی سنہ [illegible]

آپ سید عزالدین (یا عزیزالدین) کے پوتے ہیں، حسینی اور رضوی کی نسبت سے مشہور ہیں، آپ نے مانک پور کے سادات گردیزیہ کی تاریخ میں ایک نیا روحانی موڑ پیدا کیا، اور دہلی ثانی جونپور کو سرزمین چشت بنا دیا، راجہ سید حامد شاہ حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری متوفی سنہ ۸۵۳ھ کے اجل خلفا میں سے ہیں، آپ کے والد درویش صفت بزرگ تھے، بچپن ہی ہی میں شیخ حسام الدین کی صحبت و خدمت میں رہ کر سلوک و معرفت کی منزلیں طے کیں، اور طریقۂ چشتیہ میں کمال کو پہنچے، اور عین جوانی میں اپنے شیخ و مرشد کے حکم سے جونپور آئے، جہاں سلاطین و علماء اور عوام سبھی نے بڑھ کر استقبال کیا، اس کا نقشہ صاحب مشکوٰۃ النبوۃ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"در وقت شباب ارشاد امر باسم وے نوشتہ بطرف جونپور رخصت نمود و در امیر مرکب با ...

---

[1] آئینہ اودھ ص ۱۰۸، [2] مشکوٰۃ النبوۃ قلمی ص ۳۶۴، مملوکہ قاضی اطہر مبارکپوری۔

ساختند، و خصوصیت بشرف صحبت مولانا کمال‌الدین مشرف گردانید تا بیرون شهر مانکپور این بیت که بزبان می رانند

میروی تو در رکاب و می رود جان حسامم — فی امان الله بروید، فالله خیر حافظا

پس چون راجی حامد شاه با کمال ولایت و تصرف در جونپور داخل شد، خلفائے سید در شهر و نواحی آنجا در افتاده، و تمام خلق آن دیار روئے نیاز بدو آوردند، و اکثر شهرت از ارادتش در آمدند مثل شیخ اله داد، و شیخ بهاء الدین جونپوری وغیره [1]

راجہ سید حامد شاہ شیخ حسام الدین کی صحبت میں آنے سے پہلے اپنے خاندان والوں کی طرح سپاہیانہ لباس میں رہتے تھے، کچھ زیادہ لکھے پڑھے نہیں تھے، مگر صفائی باطن اور روحانی فراست کا یہ حال تھا کہ فضلائے زمانہ آپ کے حلقہ میں آکر علم و معرفت سے محظوظ ہوتے تھے۔ خزینۃ الاولیاء میں ہے،

"و راجی حامد شاه در اوائل حال بلباس سپاهیان می ماند، آخر بصحبت شیخ حسام الدین مانکپوری مشرف شد، و ریاضات شاقه کشید و صفائے باطن و حضور قلب نصیب او گردید و مے از علم ظاهر بقدر مایحتاج کفایت کرده بود لیکن دانشمندان دهر، و علمائے عصر اسیر حلقهٔ ارادت او بودند" [2]

آپ کی وفات ۱۵ر شعبان سنہ ۸۹۳ھ میں مانکپور میں ہوئی اور مزار بھی وہیں ہے،

یوں تو آپ کے بہت سے خلفاء تھے، ان میں پانچ بہت مشہور ہیں، جن کے ذریعہ بلاد پورب میں فیوض و برکات کا دریا جاری ہوا، (۱) آپ کے صاحبزادے راجہ سید نور متوفی سنہ ۹۲۱ھ (۲) مولانا شیخ حسن بن طاہر جونپوری متوفی سنہ ۹۰۹ھ (۳) مولانا شیخ اله داد جونپوری متوفی سنہ ۹۲۳ھ (۴) مولانا شیخ بہاء الدین جونپوری متوفی سنہ ۹۲۱ھ (۵) مولانا شیخ دانیال بن حسن جونپوری متوفی سنہ ۹۲۲ھ رحمہم اللہ۔

راجہ سید نور بن راجہ سید حامد مانکپوری متوفی سنہ ۹۲۱ھ | آپ کو نور الحق اور نور الدین بھی کہتے ہیں، مگر نور کے نام سے

---

[1] مشکوٰۃ النبوۃ ص ۲۰۷ [2] خزینۃ الاولیاء ص ۲۲۹

زیادہ مشہور ہیں، آپ حامد شاہ کے خلیفہ اور سجادہ نشین اور صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، جب آپ پیدا ہوئے تو راجہ حامد شاہ کے مرشد شیخ حسام الدین نے ان کو بشارت دی کہ یہ بچہ آگے چل کر قطب وقت ہوگا، راجہ حامد شاہ نے بچپن ہی سے ان کی تعلیم و تربیت کی طرف خصوصی توجہ فرمائی اور عنفوان شباب میں تمام ظاہری و باطنی علوم اور سلوک و معرفت سے بہرہ مند کر دیا، اور جب راجہ حامد شاہ کا وصال ہوا تو راجہ نور نے ان کی جگہ سنبھالی، باپ کی طرح آپ بھی امیرانہ اور سپاہیانہ لباس زیب تن فرماتے تھے، شاہ عبد الحق دہلوی لکھتے ہیں: "او نیز مثل پدر بزرگ و صاحب کرامت بود، ولباس سپاہ گری را غشاوہ حال و مشغولی باطن ساختہ"[۱]، مولانا عبد الصمد ابن افضل احمد انصاری نے اخبار الاصفیاء میں لکھا ہے: "راجی نور الدین قدم ہمت در کعبہ فقر و فنا فشردہ، چند پایہ از پدر بلند تر رفت، و چند خلفاء و مریدان یادگار گذاشتہ"[۲]، اور مفتی غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاولیاء میں لکھا ہے: "راجی سید نور کہ از سادات نور علی نور و از اولیاء اعظم است"[۳]۔

راجہ سید نور شاہ نے بعہد سکندر لودی ۹۱۲ھ میں مانک پور میں انتقال فرمایا، آپ کا مزار خانقاہ مانک پور کی سرحد پر ہے، اکبر کے زمانہ میں اس پر روضہ اور گنبد تعمیر ہوا، آپ کی اولاد میں راجہ سید احمد ہیں، جن کا نام شیخ محمد غوثی نے گلزار ابرار میں محمود بتایا ہے، مگر ان کے حالات نہیں ملتے،

راجہ نور کے تین خلفاء بہت مشہور ہیں، جن سے بلاد پورب میں علم و معرفت کی بہت سی انجمنیں آباد ہوئیں، (۱) شیخ دیتن بن احمد جونپوری متوفی ۹۴۲ھ (۲) شیخ جلال الدین بن عبد اللہ اودھی متوفی ۹۴۷ھ (۳) شیخ نظام الدین امیٹھوی متوفی ۹۷۹ھ۔

راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور مانک پوری بانی مبارک پور

آپ راجہ سید نور کے پوتے اور راجہ سید احمد کے بیٹے ہیں، افسوس ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود آپ کے حالات

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۲۰۹ [۲] اخبار الاصفیا قلمی ورق [illegible] مطبوعہ [illegible] [۳] خزینۃ الاصفیا [illegible]

مل سکے، البتہ مشائخ گردیزیہ کے سلسلۂ نسب میں ان کا نام متعدد جگہ موجود ہے مثلاً نزہۃ الخواطر میں ان کے پوتے راجہ سید احمد بن مجتبیٰ مانک پوری کے ذکر میں گنج ارشدی کے حوالے سے یوں درج ہے:

الشیخ الصالح احمد بن مجتبیٰ بن مبارک بن احمد بن نور بن الحامد الحسینی الرضوی المانکپوری۔[1]

شیخ محمد غوثی نے گلزار ابرار میں راجہ سید مبارک کے بیٹے راجہ سید مصطفیٰ کے ذکر میں یوں لکھا ہے،

راجی سید مصطفیٰ بن سید مبارک بن سید محمود (احمد صحیح ہے) بن سید نور بن سید حامد شاہ۔[2]

نیز غوثی نے راجہ سید مصطفیٰ کے نسبتی بھائی شیخ ادریس بن غوث الاولیاء کے ذکر میں راجہ سید مبارک کا نام یوں لیا ہے، "غوث، خسر مصطفیٰ بن مبارک"[3]۔

آئینۂ اودھ میں راجہ سید نور کے ذکر کے آخر میں ان کا نام یوں آیا ہے، "پسران کے (راجہ سید نور کے) سید احمد، ان کے سید مبارک، ان کے راجی سید بندگی الخ"[4]

اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء میں قصبہ مبارک پور کے ذکر میں راجہ سید مبارک کا تذکرہ یوں ہے:

"کہا جاتا ہے کہ اس قصبہ کا نام پہلے قاسم آباد تھا، بعد میں راجہ مبارک کے نام سے آباد ہوا، جو کڑا مانک پور کے ایک روحانی بزرگ تھے۔"[5]

راقم الحروف کو فارسی زبان میں ایک قلمی رسالہ ملا ہے، جس سے ان کے بارے میں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں، اس کے سرنامہ پر یہ عبارت درج ہے:

"جواب خط سید مبارک محمد آبادی کہ جناب مولانا حاجی محمد علی صاحب نوشتہ بودند بدام اللہ"

اس کے بعد اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

---

[1] نزہۃ الخواطر ۵ ص ۵۵ [2] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۳۰۵ مطبع مفید عام آگرہ [3] ایضاً ص ۲۰۶
[4] آئینۂ اودھ ص ۲۰۲ [5] اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء ص ۲۶۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ مخدوما حاجی مبارک علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ، از طرف فقیر محمد علی

عفی عنہ ، بعد سلام سنت الاسلام ، آنکہ سوال از اثبات امامت و وصایت کردہ بودند

معلوم نمایند کہ وصایت و امامت دوازدہ امام علی نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام نزد اہل سنت

وجماعت ثابت و متحقق ست ، نہ بایں معنی کہ شیعہ می گویند بلکہ بمعنی دیگر ست ، چراکہ شیعہ لفظ امامت

می گویند ، و ازاں مراد نبوت می دارند ، دوازدہ امام را احکام نبوت ثابت میکنند از

نزول وحی و تحریم و تحلیل وغیرہ کہ در کتب ایں فرقہ مسطور است الخ" (ص ۱)

یہ رسالہ ۸۰ صفحات میں ہے ، ہر صفحہ میں پندرہ سطریں ہیں ، افسوس کہ اس کا آخری ورق

غائب ہے ، اس کی ان ابتدائی عبارتوں سے ہم حسب ذیل نتائج نکال سکتے ہیں :

جس زمانہ میں راجہ سید مبارک نے مولانا محمد علی سے زبانی یا تحریری سوال کیا تھا ، اس سے بہت

پہلے وہ انک پور سے اکر پرگنہ محمد آباد یا خاص قصبہ محمد آباد میں آباد اور یہاں مستقل قیام کی وجہ سے

محمد آبادی مشہور ہو گئے تھے ، اور غالباً قصبہ مبارک پور کو اپنے نام پر آباد کرکے یہیں رہتے تھے ، اور

چونکہ قصبہ مبارک پور اس زمانہ میں پرگنہ محمد آباد میں تھا ، جیسا کہ اب بھی ہے ، اور نیا نیا آباد ہوا تھا ،

اس کی کوئی خاص شہرت نہیں تھی ، اس لیے وہ محمد آبادی ہی کی نسبت سے مشہور ہوئے جس طرح

اس زمانہ میں اس علاقہ کے مختلف مقامات کے علما ، جونپوری مشہور ہوئے ۔ اور یہ قاعدہ بھی ہے

کہ کسی بڑی بستی یا شہر کے قرب وجوار کے لوگ اسی کی نسبت سے مشہور ہوتے ہیں ۔

مولانا محمد علی نے اپنے جواب کی ابتدا میں ان کو حاجی مبارک علی کے نام سے یاد کیا ہے ، مگر انکا

نام اور ہر جگہ صرف راجہ سید مبارک ملتا ہے ، ممکن ہے علی کا اضافہ دیار پورب میں مستقل بودو باش

کے بعد ہوا ہو ، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے ہی سے بطور اختصار کے مبارک مشہور ہو گیا ہو ، جس طرح

ان کے والد راجہ سید نور کا پورا نام اخبار الاصفیا میں تین مقامات پر حاجی نور الدین آیا ہے ،

اور نزہۃ الخواطر میں گنج ارشدی کے حوالے سے تو واقع ہے، مگر وہ صرف راجہ سید نور کے نام سے مشہور ہیں۔

اس رسالہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ راجہ سید مبارک کو علوم دینیہ سے حصۂ وافر ملا تھا، اور وہ علمی و دینی مسائل و مباحث میں معاصرین سے تعلق رکھتے تھے، اور سنی المسلک تھے، افسوس کہ مولانا حاجی محمد علی صاحب کے حالات نہیں مل سکے۔ ورنہ سائل اور مجیب دونوں کے بارے میں کچھ اور معلومات حاصل ہوتے۔

راجہ سید مبارک کا سنہ وفات تک معلوم نہ ہو سکا۔ اور نہ ان کے دور کی تعیین ہو سکی، ان کے دادا راجہ سید نور نے سکندر لودھی کے زمانہ میں ۹۲۱ھ میں وفات پائی، اور ان کے بیٹے راجہ سید مصطفیٰ ۹۸۴ھ میں اکبر بادشاہ کے ہمراہ مالوہ گئے تھے، اور پوتے راجہ احمد بن مجتبیٰ بن مبارک ۱۰۴۸ھ میں فوت ہوئے۔ ان سنین وفات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ راجہ مبارک دسویں صدی ہجری کے وسط میں موجود تھے، اور اسی دوران میں انھوں نے قصبہ مبارک پور (اعظم گڈھ) آباد کیا، اور اپنے آبا و اجداد کی طرح دیار پورب میں رہنے کے باوجود مانک پور سے تعلق رکھا۔ اور وہیں انتقال کیا اور مزار بھی وہیں ہے۔

راقم الحروف کا خاندان مانک پور کا تھا، جسے راجہ سید مبارک اور مشائخ گردیزیہ سے روحانی اور دینی تعلق تھا، راجہ سید مبارک نے اس کو اپنے ساتھ لاکر مبارک پور میں آباد کیا تھا، آپ کی یادگار قصبہ مبارک پور کی جامع مسجد ہے، جو "راجہ صاحب کی مسجد" کے نام سے مشہور ہے، اور اسکے علاقہ کو "راجہ صاحب" کہتے ہیں، یہ مسجد ۲۲ دروں کی تھی، اتنی بڑی مسجد اس علاقہ میں دوسری نہیں تھی، چند سال ہوئے لوگوں نے اسے منہدم کرکے اسکی جگہ دوسری عالیشان مسجد کی بنیاد رکھی جو ابتک نامکمل ہے، اس مسجد کے شمالی جانب ایک احاطہ ہے جس میں ایک قناتی دار چھوٹی سی مسجد ہے، یہی دراصل راجہ مبارک کی مسجد ہے، اسی احاطہ میں ان کی مصنوعی قبر بھی ہے، جہاں

آبائی مکان بھی احاطے کے پاس تھا، مبارک پور آباد ہونے کے بعد دار القضا، پرگنہ محمد آباد گوہنہ سے متعلق رہا، اور یہاں کی نیابت قضا کا عہدہ راقم الحروف کے خاندان کے سپرد ہوا، اس سلسلے کی شاہی فرامین اور اسناد اب تک ہمارے یہاں محفوظ ہیں، مبارک پور کے قریب ہی مغرب میں سرائے مبارک نامی ایک بستی ہے، غالبًا یہ بستی بھی راجہ سید مبارک ہی کے نام پر اسی زمانہ میں آباد ہوئی تھی، مشائخ گردیزیہ نے مانک پور کے قرب وجوار میں بازید پور، اونچہ گاؤں، مصطفےٰ آباد، رسول پور اور شہاب الدین پور نامی بستیاں آباد کی تھیں، ہمارا خیال ہے کہ قصبہ مبارک پور کے قریب شمال مغرب میں مصطفےٰ آباد، اور شمال مشرق میں رسول پور نامی مسلم بستیاں بھی راجہ مبارک کے دور میں آباد ہوئیں، اور مصطفےٰ آباد کا نام ان کے صاحبزادے راجہ سید مصطفےٰ کے نام پر رکھا گیا، اس طرح انھوں نے نواح مانک پور سے لیکر حدود جونپور تک اپنے روحانی فیض و برکات کے ساتھ تعمیری آثار بھی ثبت کیے، راجہ مبارک کی اولاد کے بارے میں اعظم گڈھ گزیٹیر میں ہے:

"وہ مبارک پور کے موجودہ شیوخ زمینداروں کے مورث اعلیٰ تھے"[۵۱]،

جو صحیح نہیں ہے، یہاں ان کی اولاد کے رہنے اور بسنے کا پتہ نہیں چلتا، البتہ ہمارا خاندان جسے راجہ مبارک اپنے ہمراہ مانک پور سے لائے تھے، یہاں آباد ہو کر یہاں کی نیابت قضا کا عہدہ سنبھالتا رہا، راجہ سید مبارک کے دو صاحبزادے راجہ سید مصطفےٰ اور راجہ سید مجتبےٰ کے نام اور حالات کتابوں میں ملتے ہیں، مگر ان کے مبارک پور میں مستقل قیام کی کوئی روایت یا سند نہیں ملتی۔

راجہ سید مصطفےٰ بن راجہ سید مبارک: آپ عہد اکبری کے باکمال علماء و مشائخ میں تھے، اور امارت و شیخیت دونوں میں ممتاز تھے، آئینہ اودھ میں غالبًا ان ہی کو راجہ سید مبارک کے پسر راجہ سید بندگی لکھا ہے، محمد غوثی نے گلزار ابرار میں راجہ سید مصطفےٰ کا مستقل تذکرہ کیا ہے، اور ایک جگہ ان کے نسبتی بھائی شیخ

---

۵۱ اعظم گڈھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء ص ۱۶۱ ۵۲ آئینۂ اودھ ص ۲۸۲

اویس بن غوث الاولیاء کے ذکر میں، غوث ،خسر مصطفےٰ بن مبارک لکھا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ راجہ سید مصطفےٰ کے پدر بزرگوار کا نام سید مبارک بن سید محمود (احمد) بن سید نور بن سید حامد شاہ ہے، وہ سید حامد شاہ شیخ حسام الدین مانک پوری کے خلیفۂ اعظم ہیں، راجہ مصطفےٰ کے اخلاق درویشانہ اور اطوار صوفیانہ تھے، آپ کی نزاکت طبع ناموافق چیزوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی، زندگی کمال ظریفانہ طور پر بسر کرتے تھے، ظاہری پاکیزگی اور باطنی صفائی آپ کے خمیر میں داخل تھی، سرود و سماع سے دلچسپی رکھتے تھے، مگر اس میں صرف کمال فن سے محظوظ ہوتے تھے، غوث الاولیاء کی خدمت میں دامادی کی نسبت تھی، اور قطب الاقطاب کی لڑکی سے کئی فرزند تھے، جن میں سے ایک راجہ سید محمد ہیں، جو اپنے پدر بزرگوار کے جانشین ہیں، اللہ تعالیٰ سب فرزندوں کو اجداد کے کمالات پر پہنچائے۔ سنہ ۹۸۰ھ میں عرش آشیانی اکبر شاہ کا لشکر دار الخلافہ آگرہ سے مالوہ کی طرف آیا، اور تمام مشائخ، فقراء، فضلاء، قضاۃ اور شعراء لشکر کے ہمراہ تھے، راقم (محمد غوثی مصنف گلزار ابرار) نے جب یہ خبر سنی تو بیتاب ہو کر ان کی زیارت کرنی چاہی، اور میں بھی جو بزرگان شہر (مانڈو یا برہانپور) سیر لشکر کے لیے روانہ ہوئے، ان کے ہمراہ ہو گیا، اسی سلسلے میں راجہ سید مصطفےٰ کے دیدار سے ظاہری اور باطنی آنکھیں منور ہوئیں۔[1]

راجہ سید محمد بن راجہ سید مصطفےٰ ابن راجہ سید مبارک جیسا کہ غوثی کے بیان سے معلوم ہوا، آپ اپنے والد راجہ سید مصطفےٰ کے خلیفہ اور جانشین تھے، اور غوثی کے زمانہ میں زندہ تھے، شیخ محمد ابن حسن غوثی مندوی (ولادت ۹۶۲ھ) نے گلزار ابرار ۱۰۱۴ھ میں لکھنی شروع کی، جو رجب ۱۰۲۲ھ میں اتمام کو پہنچی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۰۲۲ھ تک راجہ سید محمد حیات تھے۔

راجہ سید مجتبیٰ بن راجہ سید مبارک آپ راجہ سید مبارک کے دوسرے فرزند ہیں، آپ کا مستقل تذکرہ ذیل میں آئے گا،

[1] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار ص ۳۵۴

البتہ آپ کے فرزند راجہ سید احمد کے تذکرے سے ان کے حالات پر روشنی پڑتی ہے، چنانچہ گنج ارشدی کے حوالے سے نزہتہ الخواطر میں راجہ سید احمد بن مجتبیٰ مانک پوری کے ذکر میں ہے:

ولد ونشأ بمانكپور، وتفقه على	آپ (راجہ سید احمد) مانک پور میں پیدا ہوئے
والده، واخذ عنه الطريقة	اور وہیں پروان چڑھے، اپنے والد سے فقہ
ولازمه ملازمة طويلة	اور دین کی تعلیم حاصل کی، نیز ان ہی سے
ثم تصدر للارشاد والتلقين[1]	طریقہ چشتیہ حاصل کر کے مدتوں ان کی صحبت
(نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۶۰)	و خدمت میں رہ کر ارشاد و تلقین کے

ان چند جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ سید مجتبیٰ بن راجہ سید مبارک کس پایہ کے عالم اور شیخ تھے، اور ان کو علوم ظاہری و باطنی دونوں سے کتنا وافر حصہ ملا تھا۔

راجہ سید احمد بن راجہ سید مجتبیٰ بن راجہ سید مبارکؒ | آپ کا تذکرہ گنج ارشدی کے حوالے سے نزہتہ الخواطر میں اس طرح درج ہے: "احمد بن مجتبیٰ بن مبارک بن احمد بن نور بن حامد حسینی رضوی مانکپوری، آپ احمد حلیم کے نام سے مشہور ہیں، مشائخ چشتیہ میں سے ہیں، مانکپور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد سے دینی علوم حاصل کر کے ان ہی سے طریقہ چشتیہ حاصل کیا، اور عرصہ دراز تک ان کی صحبت میں رہ کر ارشاد و تلقین کے میدان میں نکلے، آپ کی کشف و کرامت کے بہت سے واقعات مشہور ہیں، بعض تلامذہ نے اپنی کتاب الخوارق الاحمدیہ میں آپ کی کراماتوں کا ذکر کیا ہے، کبھی کبھی خود بھی اپنی کرامات کو بیان کیا کرتے تھے، اپنے خاندان کے شیخ الشیوخ شیخ حسام الدین مانک پوری کی ذریات کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے، ان کے خاندان کے بچے جب تک آپ کے سامنے کھیلتے یا سامنے سے گذرتے آپ ان کے احترام میں برابر کھڑے رہتے، حضرت شیخ دیوان محمد رشید جونپوری متوفی ۱۰۸۳ھ اور دوسرے بہت سے مشائخ نے آپ سے طریقت و مشیخت کی تعلیم حاصل کی، حضرت دیوان محمد رشید

ان سے طریقۂ چشتیہ کے ساتھ طریقۂ سہروردیہ بھی حاصل کیا تھا، اور ان کے خلیفہ بھی تھے، راجہ سید احمد جمادی الاولی سنہ ۱۰۴۲ھ میں مانک پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے[1]۔

ہمارے خیال میں سادات گردیزیہ مانک پور کی بزم چشتیت کا یہ آخری چراغ تھا جو دیار پورب میں روشن ہوا، اور دیوان محمد رشید اور ان کے مریدین و تلامذہ کے ذریعہ اس کی روشنی بارھویں صدی ہجری تک یہاں نظر آتی رہی۔

چند اور گردیزی مشائخ آئینۂ اودھ[2] کے مصنف نے راجہ سید مبارک کے پوتے راجہ سید یٰسین، ان کے لڑکے راجہ سید عبد الحق اور ان کے لڑکے راجہ سید ابراہیم کے نام لکھ کر لکھا ہے کہ یہ سب کے سب کامل و قابل وعامل و صاحب باطن گذرے ہیں، اور ہزارہا لوگ ان کے فیض باطن سے فیضیاب ہوئے، نقل ہے کہ راجہ سید ابراہیم کے خدام جنات تھے، ان کے خلف الرشید سید میر میران جی، اور ان کے لڑکے سید ابراہیم ثانی تھے، ان دو پشتوں تک وہ پہلا کمال باطنی جیسا کہ چاہیے تھا، حاصل نہ ہوا، تاہم باپ دادا کی تقلید کی کوشش رہی، اور ان کے پسر سید احمد ثانی بخوف ضبطی معافی تبدیل مذہب کرکے امامیہ ہوگئے، سید احمد کے لڑکے سید غلام شاہ کے تین لڑکے تھے، میر حسن علی موضع بھمن پور میں، میر نذر علی موضع تنی پرگنہ کرہلہ تحصیل کھاگا میں، اور میر مدد علی موضع میران پور پرگنہ دلمئو میں، میر حسن علی فی الجملہ سنی تھے، باقی دونوں بھائی شیعہ ہیں، اس کے بعد اس خاندان کے چند اور لوگوں کے نام ہیں جن میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

شیخ حسام الدین مانکپوری اور انکے صاحبزادے شیخ محمود مانکپوری بلاد پورب میں سلاطین شرقیہ جونپور میں سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) کا دور حکومت ارباب علم و فضل کے لیے بڑا پُرکشش تھا، اس کی قدر دانی اور نیک نفسی کی وجہ سے جونپور دار العلم بن گیا تھا، اور ملک کے بہت سے ارباب کمال یہاں پہنچ آتے تھے، اسی دور حکومت میں حضرت شیخ حسام الدین بن خواجہ

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۰۰ [2] آئینۂ اودھ ص ۲۰۳

حضرت جلال الدین حمری مانک پوری، متوفی [illegible] نے بھی یہاں قیام فرمایا، آپ نے اپنے والد سے درسیات پڑھکر مشرق کا سفر کیا، اور حضرت شیخ نور الحق بن علاء الحق بنگالی پنڈوی متوفی [illegible] کی خدمت میں مدتوں رہکر طریقۂ چشتیہ میں کمال حاصل کیا، مرشد نے اپنے اس مرید خلیفہ کو [illegible] میں مانک پور جانے کی اجازت دی، اس کے بعد شیخ حسام الدین جونپور چلے آئے، اور یہاں سات سال تک نہایت فقر و فاقہ اور گمنامی کی زندگی بسر کرتے رہے، اس کے بعد وہ حسن قبول حاصل ہوا کہ امراء و سلاطین تک آپ کے نیازمندوں میں داخل ہو گئے اور اہل شہر نے آپ سے فیض اٹھایا، آپ ابراہیم شاہ شرقی، محمود شاہ شرقی اور محمد شاہ شرقی کے زمانے میں تھے، آپکے بعد آپ کے خلیفہ راجہ سید حامد شاہ مانکپوری نے بھی جونپور میں قیام کرکے شیخ کا فیض جاری رکھا۔

شیخ حسام الدین کے صاحبزادے شیخ محمود بن حسام الدین مانک پوری متوفی ۹۰۰ھ نے والد کے وصال کے کچھ پہلے یا بعد ۸۵۳ھ میں دیار مشرق کا رخ کیا اور جونپور سے آگے بڑھکر غازیپور کو اپنا مستقر بنایا، شیخ حسام الدین کے علم و فضل کی دھوم سے خطۂ پورب گونج ہی رہا تھا کہ ان کے صاحبزادے کی آمد ہوئی، اس لیے قدر دانوں نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا، اس وقت نصیر خان لوہانی حاکم غازیپور تھا، اس نے سلطان سکندر بن بہلول لودھی سے اجازت لیکر شیخ محمود کو وہاں کا میر عدل بنا دیا۔ آپ اس منصب پر تا زندگی رہے، اور ۹۰۰ھ میں غازیپور ہی میں وصال ہوا، آپنے سلاطین جونپور میں محمود شاہ شرقی، محمد شاہ شرقی، اور حسین شاہ شرقی کا زمانہ پایا، اور سلاطین لودھی میں سے بہلول لودھی اور سکندر بن بہلول لودی کا دور دیکھا۔

راجہ سید حامد شاہ مانک پوری اور انکے خلفاء بلاد پورب میں

شیخ حسام الدین مانک پوری نے سات سال تک فقر و فاقہ اور گمنامی کی زندگی بسر کرکے جونپور اور خطۂ پورب کو سرزمین چشت بنایا اور ان کے صاحبزادے شیخ محمود مانکپوری میر عدل نے اپنے عدل و انصاف سے روحانیت و دیانت بخشی،

ان ہی ایام میں شیخ حسام الدین کے ۲۰ خلفا میں سے خلیفۂ اعظم راجہ سید حامد شاہ مانکپوری متوفی ۹۰۰ھ نے بھی یہاں دین و روحانیت کی بساط بچھائی، شیخ حسام الدین نے ان کو بڑے تزک و احتشام اور فخر و مباہات کے ساتھ جونپور روانہ فرمایا تھا، اس وقت راجہ سید حامد کا عنفوان شباب تھا، اور جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، جونپور میں آپ ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ دیار پورب میں شیخ حسام الدین اور ان کے صاحبزادے شیخ محمود کو جو مقبولیت ہوئی تھی، وہی راجہ حامد شاہ کو حاصل ہوئی، ہر طبقہ کے لوگ اس جانے پہچانے گھر کے نووارد مہمان کے لیے فرش راہ بن گئے، وہ درسیات کے کوئی بڑے عالم و فاضل نہیں تھے، مگر ان کی روحانیت میں وہ کشش تھی کہ بڑے بڑے فضلائے زمانہ بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں آ گئے، خزینۃ الاولیا میں ہے:

"و وے از علم ظاہری بقدر احتیاج کفایت کردہ بود، لیکن دانشمندان دہر و علمائے عصر اسیر حلقۂ ارادت او بودند" (ص ۴۰۹ ج ۱)

آپ نے سلاطین شرقیہ میں ابراہیم شاہ شرقی (غالباً) محمود شاہ شرقی، محمد شاہ شرقی اور حسین شاہ شرقی کا زمانہ، اور سلاطین لودھی میں بہلول شاہ لودی، اور سکندر بن بہلول شاہ لودی کا ابتدائی زمانہ پایا، یوں تو راجہ سید حامد مانکپوری کے بہت سے خلفاء تھے، مگر ملا د پورب میں جن سے آپ کا سلسلۂ فیض جاری رہا، اور طریقۂ چشتیہ کو فروغ ملا، وہ پانچ ہیں، (۱) آپ کے صاحبزادے راجہ سید نور (۲) شیخ بہاء الدین جونپوری (۳) مولانا شیخ الہداد جونپوری (۴) شیخ حسن بن طاہر جونپوری (۵) شیخ دانیال بن حسن جونپوری، راجہ سید نور کا مستقل تذکرہ آگے آئے گا، اس لیے یہاں باقی چار خلفاء کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

(باقی)

پوپ کا وثیقہ اور اس کا تحلیلی جائزہ

از جناب مولوی حبیب صاحب ریحان ندوی استاذ جامعہ اسلامیہ لیبیا

گذشتہ نمبر سے حضرت مسیحؑ کے ساتھ یہود کے معاندانہ رویہ، آپ کی توہین اور آپ کی مصلوبیت تک کی تفصیل معلوم ہو چکی ہے اور یہ باتیں مسیحی عقائد کے اعتبار سے اتنی روشن ہیں کہ ان کے انکار کی جرأت ناممکن ہے، اسی لیے پوپ اپنے وثیقہ میں کھل کر اس کا اعتراف نہیں کر سکے کہ یہود نے حضرت مسیحؑ کو قتل نہیں کیا، بلکہ ان کے الفاظ تقریباً گول ہیں۔

ایک بات اور واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ وثیقہ صرف یہود کے لیے نہیں نکالا گیا ہے، بلکہ اس کا تعلق مسیحیت کے علاوہ دوسرے تمام ادیان سے ہے، مثلاً ہندو مذہب، بودھ مت اور اسلام وغیرہ سے، یہ وثیقہ کیوں نکالا گیا اس کی تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔

چند اصولی چیزوں کو چھوڑ کر بہت سی چیزوں میں اسلام، یہودی مذہب، بدھ مت اور ہندو دھرم کے مقابلہ میں مسیحیت سے متفق ہے، اسی لیے ایک زمانہ میں بعض نصرانیوں نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ اسلام نصرانی فرقوں میں سے ایک فرقہ ہے۔

اسلام حضرت عیسیٰؑ کو نبی مرسل مانتا ہے جبکہ یہود نہیں مانتے، مگر اسلام کی اس رواداری کے باوجود مسیحیت کو ہمیشہ اسلام سے بیر رہا، لیکن رفتارِ زمانہ کے ساتھ صلیبیوں کا انداز بدلا اور بعض مسیحیوں کو اسلام و مسیحیت کے متحدہ اصول تلاش کرنے کی فکر ہوئی، اس سلسلے میں پوپ پویس ۱۲ نے شرق کے تمام کیتھولک کو اسلامی اکثریت کے ساتھ میل ملاپ پیدا کرنے کی دعوت دی تھی اور

وکر دنیاں کا ایک بورڈ بنایا جو اسلام کا مطالعہ کرکے پوپ کے سامنے رپورٹ پیش کرے، لیکن شاید بعض خارجی اثرات نے پوپس ۱۲ کو اسلام کے بارہ میں صریح فیصلہ سے روک دیا،

پچھلے سال جب پوپ پال ششم نے اردن کا دورہ کیا تو خیال تھا کہ وہ اسلام کے بارہ میں اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔ خصوصاً جیسا کہ انھوں نے قبرص کے متعلق مکار یوس کو فضائے گذرنے کے دوران میں جو تار دیا تھا اس میں حواری برنابا کی تعریف کی تھی جو گرجے کی طرف سے بالکل نئی بات تھی، لیکن یہاں بھی خارجی اثرات سے متاثر ہو کر پوپ نے صرف مسلمانوں کے بارہ میں کوئی وثیقہ نکالنے کے بجائے تمام مذاہب سے متعلق ایک تحریر نکالی جس میں آسمانی و غیر آسمانی ادیان سب کو ایک ساتھ پکارا،

اس کا مقصد تمام مذاہب کو لادینیت اور الحاد (کمیونزم) کے خلاف متحد کرنا تھا، یہود نے اس وثیقہ اور سیاسی چالوں کے ذریعہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور جس طرح سرمایہ دار مغرب کا پورا بلاک یہودیت کا پاس کرتا ہے۔ اسی طرح پوپ نے بھی اپنے اس وثیقہ میں یہود کا بڑا پاس کیا ہے، اور حضرت مسیحؑ کے سب سے بڑے دشمنوں اور مسیحیت کے سب سے زیادہ مخالفوں کے ساتھ جس رواداری کا ثبوت دیا ہے، اس کے پس پردہ ضرور کوئی ہاتھ ہے، ایسی رواداری کی مثال صلیب مسیح کے بعد سے آج تک تاریخ مسیحیت میں نہیں ملتی۔

مضمون طویل ہو جانے کے باوجود پوپ کے وثیقہ کا ترجمہ کر دینا ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ پوپ نے اسلام کی بھی تعریف کی ہے، اور مسیحیوں سے التجا کی ہے کہ وہ یہود کے بارہ میں رائے بدل دیں، بعض اہم جملوں کو خط کشیدہ کر دیا گیا ہے، جن پر ہم بعد کو اپنا تبصرہ کریں گے۔

وثیقہ کا ترجمہ یہ ہے:-

"قرارداد جو ہندو دھرم، بدھ مت، اسلام، یہودیت اور دوسرے غیر مسیحی مذاہب کے بارے میں

ویٹکن کی بابرکت کونسل کے مقدس مجلس کے تیسرے اجلاس میں جمعہ کے دن ۲۰ نومبر ۱۹۶۴ء کو پیش کی گئی جس کو مجمع نے ۱۶۵۱ ووٹوں کی اکثریت سے پاس کیا، صرف ۹۹ ووٹ اس کے خلاف آئے، اور ۲۴۲ ووٹوں نے سکوت اختیار کیا، سرکاری طور پر اس کا اعلان اس لیے مؤخر کر دیا گیا تاکہ ان تحفظات کی تحقیق کی جائے جو گزر چکے۔

۱۔ تمہید: اس زمانہ میں جب کہ جنس بشری کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور مختلف قوموں کے درمیان تعلقات زیادہ ہوتے جا رہے ہیں، کیتھولک گرجا غیر مسیحی ادیان سے اپنے تعلقات کے بارے میں گہری بحث کرنا چاہتا ہے، کیونکہ سب کے سب مل کر ایک جماعت بناتے ہیں، اور ان سب کی اصل ایک ہی ہے، چونکہ اللہ نے ساری بشریت کو ایک زمین میں بسایا تھا۔ (اعمال ۱۷: ۲۶) اور اس کا مقصد بھی ایک ہے، اور وہ اللہ ہے جس کی عنایت شاملہ اور سخاوت کے دلائل اور طریقے کار کے مقاصد تمام بشر کے لیے ہیں (حکمہ ۸: ۱، اعمال ۱۴: ۱۷، رومانین ۲: ۶، اول تیموتاوس ۲: ۴) اس دن تک جب کہ وہ مختارین کو مقدس شہر میں جمع کرے گا، جہاں کہ رب کا مجد روشن ہوگا، جس کی روشنی میں اقوام چلیں گی۔ (رویا ۲۱: ۲۳) بیشک لوگ مختلف ادیان سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ بشری زندگی کی گتھیوں کو سلجھائیں، جو کل کی طرح آج بھی ان کو پریشان کیے ہوئے ہیں، انسان کیا ہے؟ ہماری زندگی اور اس کا مقصد کیا ہے؟ اچھائی اور برائی کیا ہے؟ حقیقی سعادت کا کون راستہ ہے؟ موت کیا ہے اور موت کے بعد قضا و ثواب کیا چیز ہے؟ ہمارے وجود سے ابدی وہ کونسی ذات ہے جو ہمارے وجود پر محیط ہے، اور جس کے پاس سے ہم آئے ہیں، اور جس کے پاس ہم کو لوٹ کر جانا ہے۔

۲۔ ہندو مذہب اور بدھ مت۔ ہم مختلف قدیم قوموں میں اس پوشیدہ قوت کی معرفت کی روشنی دیکھتے ہیں جو تمام موجودات اور حیات بشریہ کے حوادث میں ساری ہے، یہاں تک کہ انھوں نے

مالک کی ذات کو بھی جان لیا تھا، جو سب کا باپ ہے، اس لیے یہ قدیم مذاہب جن کی ثقافت قدیم اور دنیا میں ترقی یافتہ ہیں، ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں،

ہندو اسرار الٰہی کی تلاش کرتے اور اس کی تعبیر منڈ میتا اوجی کے ذریعے، نہ ختم ہونے والے قصوں سے بھی کرتے ہیں اور بلند فلسفیانہ افکار سے بھی وہ زہد، ترک دنیا، گہرے غور و فکر اور محبت الٰہی کے ذریعے آلام دنیا سے چھٹکارے کی راہ تلاش کرتے ہیں،

اسی طرح بودھ مذہب کے پیروؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ نیرنگ دنیا بشریت کی سعادت سے عاجز ہے، اس لیے وہ ایسا راستہ سکھاتے ہیں جس کے ذریعے آلام دنیا سے آزادی حاصل کرکے کامل راحت و سکون کی زندگی تک پہنچ جائیں، یہ عبادت، اللہ تعالیٰ پر اعتماد، پاکیزگی اور فانی چیزوں سے بے نیازی کا راستہ ہے،

ہر حال دنیا میں جتنے مذاہب بھی ہیں، وہ مختلف طریقوں سے بشریت کے اس درد کے علاج کے لیے کوشاں ہیں، اور ان کی تعلیمات میں زندگی کا دستور اور مقدس رسوم ہیں کیتھولک گرجا ان میں سے کسی بات کو بھی برا نہیں سمجھتا جو ان ادیان میں صحیح اور مقدس مانی جاتی ہیں، اور برابر مسیح کی بشارت دیے جاتا ہے جو کہ "راہ حق اور زندگی ہیں"۔ (یوحنا ۱۴: ۶) اور اللہ نے ان کے ذریعہ سے عالم سے صلح کر لی ہے (کورنتوس ۵: ۱۹)

اور چونکہ گرجا چھٹکارا کے مختلف طریقوں سے واقف ہے (التقدیس ایرفاوس صد طبع ۲۰۰۴)

اس لیے وہ پوری رواداری کے ساتھ ان تمام طریقوں کو دیکھتا ہے، جن کے سلوک، زندگی کے دستور اور تعلیمات میں نور حقیقت کی تھوڑی سی چنگاری بھی ہے، جو بشریت کو روشن کر سکے، خواہ ان میں تھوڑا بہت اختلاف ہی کیوں نہ ہو، اس لیے گرجا اپنے ماننے والوں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ محبت اور تعاون کے ساتھ دوسرے مذاہب کے مومنوں کے ساتھ رہیں کیونکہ یہ مذاہب بھی روحانیت اور اجتماعی و ثقافتی

قدروں کے حامل ہیں۔

۳۔ مسلمان۔ گرجا مسلمانوں کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جو حی و قیوم و قادر خدا کی عبادت کرتے ہیں، جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، جس نے بشر سے گفتگو کی، وہ خدا جس کے احکام بعض اوقات پُر اسرار ہوتے ہیں لیکن دل سے ان پر خضوع واجب ہے، جس طرح ابراہیم نے اللہ کے لیے خضوع کیا، وہ ابراہیم جس کی طرف مسلمان منسوب ہیں، وہ اگرچہ مسیح کو الٰہ (خدا) نہیں مانتے، لیکن ان کی تکریم نبی کی طرح کرتے ہیں، اور ان کی ماں مریم عذرا کا احترام اور ان کی طرف وسیلہ کرتے ہیں، یوم آخرت کا انتظار کرتے ہیں جس دن اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے گا، اور نماز روزہ کے ذریعہ اللہ سے تقرب کرتے ہیں، اور اس کی کوشش کرتے ہیں کہ شخصی، عائلی اور اجتماعی زندگی باادب ہو کر اللہ کے لیے گذار دیں۔

اگرچہ ماضی میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان اختلاف اور دشمنی رہی، لیکن گرجا کی مجلس فریقین کو ترغیب دیتی ہے کہ ماضی کو بھول کر مستقبل میں پورے اخلاص سے آپس میں مفاہمت اور ساری بشریت کے لیے دونوں ساتھ ساتھ ترقی کریں، اور اس اتحاد و اتفاق کے ذریعہ نیکی اور بھلائی پھیل جائے، اور ساری دنیا میں عدل و انصاف قائم ہو جائے۔

۴۔ یہود مجمع مسکونی جو کہ گرجا کے راز سے اچھی طرح واقف ہے، جانتی ہے کہ عہد جدید کی قوم اور ابراہیم کی نسل سے اس کا کیا رابطہ ہے، مسیحی گرجا جانتا ہے کہ اس کے ایمان و انتساب کی جڑیں اس کے آباء ابراہیم، اسحاق، یعقوب، موسیٰ اور دوسرے انبیاء سے متصل ہیں، اور یہ اعلان کرتا ہے کہ تمام مسیح پر ایمان لانے والے ایمان کے ذریعہ ابنائے ابراہیم ہیں (غلاطیہ ۳:۷) اور ان کی دعوت کے وہ بھی مخاطب ہیں، اس لیے گرجا یہ نہیں بھول سکتا کہ اس نے عہد عتیق کی وحی کو اس شعب کے ذریعہ تسلیم کیا جس کو اللہ نے اپنی رحمت فائقہ سے چاہا، اور گرجا یہ بھی نہیں بھول سکتا

وہ غذا حاصل کرتا ہے، اس خالص زیتون کی جڑ سے جس کی بری شاخوں نے طمع کی (رومانین ۱۱: ۱۷)
کنیسہ حقائیہ ایمان رکھتا ہے کہ مسیح نے جو ہمارے سلام ہیں، انھوں نے اپنی مصلوبیت کے ذریعے
یہود سے اور دوسری قوموں سے مصالحت کرلی، اور دونوں کو ایک قوم بنا دیا، (افسس ۲: ۱۴)

گرجا یہ بھی جانتا ہے کہ رسول شعیب یہودی میں سے پیدا ہوئے، اور وہ گرجا کے اساس اور ستون تھے، اور اسی طرح مسیح کے تلامذہ جنھوں نے انجیل کو دنیا میں پھیلایا، اور یہود اگرچہ کہ ان کا بڑا گروہ انجیل کو نہیں مانتا، لیکن وہ جیسا کہ رسول نے کہا اپنے آباء واجداد کی وجہ سے اب تک اللہ کے محبوب ہیں، (رومانین ۱۱: ۲۸) کیونکہ اللہ کی بخشش اور اس کی دعوت بلاندامت کے ہوتی ہے۔

گرجا انبیاء و رسل کے ساتھ رب کے اس دن کے انتظار میں ہے جس دن اللہ تمام قوموں کو ایک آواز سے بلائیگا، اور وہ اللہ کی خدمت کے لیے متفق ہوں گے (اشعیا ۶۶: ۲۳،
مزمور ۶۵: ۴، رومانین ۱۱: ۲۲)

مجلس گرجا جانتی ہے کہ مسیحیوں اور یہودیوں کے درمیان ایک مشترک عظیم میراث ہے، اسلیے وہ چاہتی ہے کہ یہ دونوں تحریروں، لاہوتی بحثوں اور برادرانہ گفتگوؤں کے ذریعہ آپس میں تعارف اور تعلقات پیدا کریں اور مجلس ایک دوسرے کی مذمت اور تہمت تراشی کو بری نگاہ سے دیکھتی ہے اور یہودیوں کے ساتھ دشمنی اور ماضی میں ان پر جو ظلم ہوا اس پر افسوس ظاہر کرتی ہے۔

اس لیے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ عیسائی اپنی تعلیمات کی شرح اور مواعظ میں کوئی ایسی بات نہ کہیں جس سے مومنین کے دلوں میں یہود کے ساتھ بغض و کراہت پیدا ہو، اور ان سے یہ کہا جائے کہ وہ مردود، ملعون اور قتل اللہ کے مجرم ہیں، اس لیے کہ مسیح کو جن آلام سے گذرنا پڑا ہے ان کا الزام سارے یہودیوں پر نہ لگانا چاہیے، کم از کم اس وقت کے عوام جانتے ہیں کہ گرجا کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ ہے کہ مسیح نے خوشی اور رضامندی کے ساتھ ان آلام اور موت کے لیے اپنے کو پیش کیا تھا۔

تاکہ وہ اپنی غیر متناہی محبت سے ساری بشریت کی خطاؤں کا کفارہ ادا کریں، اس لیے گرجا کو چاہیے کہ لوگوں کے کانوں تک پہنچا دیں کہ صلیب مسیح اللہ کی محبت کی علامت اور تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہے۔

۵۔ تفرقہ بالکل نہیں۔ اللہ کا علاقہ انسان کے ساتھ اس حیثیت سے کہ وہ سب کا باپ ہے اور انسان کا تعلق اپنے بھائی انسان سے اس طرح مربوط ہے کہ "جس نے اپنے بھائی سے محبت نہیں کی اس نے اللہ کو نہیں جانا۔" (یوحنا ۴: ۸) (لوقا ۱: ۲۵)

اس لیے مسیحیت میں کسی ایسے نظریہ اور ایسے طریقے کی گنجائش نہیں ہے، جو انسانوں کے درمیان یا ایک جنس اور دوسری جنس کے درمیان ان چیزوں میں تفریق کرے جن کا تعلق انسانی شرافت اور انسانی حقوق سے ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ تمام انسان خصوصاً مسیحی ہر قسم کے تفرقے اور ہر اس ظلم سے باز رہیں جو کسی انسان پر اس کے رنگ، مرتبہ اور دین کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر مجلس پطرس اور پولس رسول کی تعلیم کرتی ہے، اور تمام مسیحی مومنوں کو دعوت دیتی ہے کہ "وہ تمام امتوں سے اچھے تعلقات قائم کریں۔" (پطرس ۲: ۱۲) اور جس طرح کہ پولس الرسول نے کہا کہ "تم مسالمت کرو سب لوگوں سے جس قدر ممکن ہو تاکہ تم سچے طور پر اپنے اس باپ کے بیٹے بنو جو آسمانوں پر ہے۔ (رومیوں ۱۲: ۸، متی ۵: ۴۴)

یہ وثیقہ کے متن کا ترجمہ ہے۔ آیندہ سطور میں اس پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ پہلی بات تو یہ کہ سرکاری طور پر اس اعلان میں تاخیر کی گئی۔ اس لیے کہ ۹۹ ووٹ اس کی مخالفت میں آئے، ۲۴۲ ارکان نے ووٹ نہیں دیا، اس کا سبب اسلام، بدھ مت اور ہندو مذہب کے بارہ میں وثیقہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے اختلاف نہیں تھا، بلکہ صرف یہودیوں کے بارہ میں اختلاف تھا، کیونکہ ان سے نفرت اور دشمنی ہر مسیحی کے دل میں پیوست ہے۔

۲۔ کیتھولک گرجا نے قدیم مذاہب کی صرف ان چیزوں کا اعتراف کیا ہے جو اس کے نزدیک بھی مقدس اور سچی ہیں۔

۳۔ وثیقہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ مسیح کی بشارت یعنی مسیحی مشنریوں کیلئے تبلیغ کا دروازہ کھل جائے۔

۴۔ مسلمانوں کے لیے وثیقہ نے سب سے اچھے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

۵۔ مگر مسلمان مسیح کو خدا نہیں مانتے، یہی تو اسلام کا امتیازی وصف ہے، کہ خدا کے سوا کسی کو خدا نہیں مانتے

۶۔ مسلمان مریم کا احترام کرتے ہیں لیکن ان کو وسیلہ نہیں بناتے، پختہ مسلمان تو کسی کا بھی وسیلہ اختیار کرنا شرک خفی سمجھتا ہے، وہ قیامت میں صرف رسول خدا کی شفاعت کا متمنی ہے، دنیا میں خدا سے بلا کسی واسطے اور وسیلے کے مانگتا ہے، ان کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ "تجھی سے مانگتے ہیں اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں، (فاتحہ ۴) "جب میرے بندے میرے متعلق تجھ سے پوچھیں تو میں قریب ہوں، مانگنے والے کی مانگ کو سنتا ہوں، تو مجھی سے صرف مانگو۔" (بقرہ ۱۸۶) مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے تقرب کا سب سے بڑا وسیلہ عمل صالح ہے۔

۷۔ مسلمان ابراہیمؑ کی طرف منسوب ہیں جس طرح کہ یہود و نصاریٰ" لیکن نسبت کے اس اشتراک کی بنا پر کوئی متحدہ دین نہیں بن سکتا جب تک ابراہیمؑ والی توحید پر سب متفق نہ ہوں، مسیح کا تو قول ہے کہ ابراہیم جیسے کام کرو تو ابراہیم والے بن سکتے ہو (یوحنا ۸: ۳۹) اسی توحید کی وجہ سے ابراہیم کو امامت دی گئی تھی، اس لیے ابراہیم کی اولاد میں بھی جو شرک میں مبتلا ہوگا اس سے امامت چھن جائے گی حضرت عیسیٰ کی زبان میں "ملکوت اللہ تم سے لیکر دوسروں کو دیدیا جائے گا" (متی ۲۱: ۴۳) اور قرآن کا ارشاد ہے "خدا نے کہا کہ میں تجھکو لوگوں کے لیے امام بناؤں گا" تو ابراہیم نے کہا اور میری اولاد، تو خدا نے کہا کہ میرا عہد ظالم نہیں پا سکتا" (بقرہ ۱۲۴) اس لیے اولاد ابراہیم میں جو حنیف ہو

وہی اس امامت کا مستحق ہوگا"۔ ابراہیم نہ تو یہودی تھے، نہ نصرانی بلکہ اطاعت گزار حنیف تھے" (آل عمران)

اس کے قبل کی آیت میں کہا گیا ہے کہ "اے اہل کتاب ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو، اور

توراۃ و انجیل تو ان کے بعد آئی (آل عمران) اس لیے دین ابراہیمی میں کسی ایسے متحدہ دین کی گنجائش

نہیں ہے جو توحید اور شرک وغیرہ متضاد عقائد سے مرکب ہو۔

۸۔ پوپ صاحب نے اسلام کی تعریف کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب اسلام کے بارے

میں پوپ پیسلادن دوم کے زمانہ کے خیالات اور صلیبی افسانہ نویسوں اور شعراء کی افترا پردازیوں

کا دور ختم ہوگیا بقول انگریز مورخ ولز اور فرانسیسی اہل قلم ہنری ڈی کاسٹری یہ ماننا پڑا کہ مسلمان

سے بڑھکر موحد قوم دنیا میں نہیں۔

۹۔ یہود کے متعلق پوپ بلکہ "ویٹکین کی مجلس مقدس" سے کئی چیزیں جواب طلب ہیں، پوپ نے

اعتراف کیا ہے کہ مسلمان مسیح کو نبی مانتے ہیں اور مریم عذرا کی تکریم کرتے ہیں۔

۱۔ کیا یہود بھی حضرت مسیح کو نبی سمجھتے ہیں؟ یا نعوذ باللہ انیس الشیاطین (متی ۱۲: ۲۴)

یا کفر بولنے والا (متی ۲۶: ۶۵) یا فریبی و دغاباز (متی ۲۷: ۶۳)

۲۔ نیز مریم عذرا کے متعلق ان کی کیا رائے ہے؟ ان پر کیسا بہتان عظیم باندھتے ہیں (نساء)

ان دونوں باتوں کو وثیقے میں بالکل گول کر دیا گیا ہے۔

۳۔ اگر مسیح نے اپنی مصلوبیت سے یہود سے مصالحت کر لی، تو کیا یہود نے بھی اس

مصالحت کو قبول کر لیا۔

۴۔ اور وثیقہ کا یہ جملہ حیرت انگیز ہے کہ "اگرچہ ان میں کا بڑا گروہ انجیل کو نہیں مانتا لیکن

وہ آباء کی وجہ سے اللہ کے محبوب ہیں۔

جب یہ گروہ انجیل کو نہیں مانتا اور مسیح و مریم کو نہیں مانتا تو اس سے مصالحت کی بنیاد

کیا ہو سکتی ہے، اور جو گروہ انبیاء کو نہ مانے، ان کو قتل اور ان کی کتابوں کا انکار کیے وہ مومن کیسے ہو سکتا ہے،

پھر جب آباء کی خبر کی وجہ سے انکار مسیح اور قتل انبیاء کے باوجود بھی یہود محبوب ہیں تو شر میں بھی ان کی اولاد کو اپنے آباء کی وجہ سے ماخوذ ہونا چاہیے، جیسا کہ مسیح نے کہا تھا کہ "ہابیل مقدس کے خون سے زکریا بن برخیاہ تک کا خون اس نسل کی گردن پر ہوگا۔" (لوقا ۱۱: ۵۱) خود یہود کے زعمار نے بھی کہا ہے کہ "اس کا خون ہم پر اور ہماری اولادوں پر ہوگا۔" (متی ۲۷: ۵)

پھر آباء سے کون آباء مراد ہیں، جسدی باپ یا روحانی باپ حضرت مسیحؑ نے ان کے آباء کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، شاید مجمع مقدس کی نظر سے بھی گذرا ہوگا کہ تم ایک باپ سے ہو جو ابلیس ہے اور تمھارے اس باپ کی شہوات کو تم پورا کرنا چاہتے ہو (یوحنا ۸: ۴۴) اور یہ کہ اگر تم ابراہیم کی اولاد ہوتے تو ابراہیم جیسے عمل کرتے (یوحنا ۸: ۳۸)

اور مسیح کی یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی کہ

اے سانپو اور اے سانپوں کے بچو تم جہنم کی آگ سے کیونکر بھاگو گے، اس لیے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں کو اور فقیہوں کو تمھارے پاس بھیجوں گا تم ان میں سے بعضوں کو قتل کروگے اور صلیب پر کھینچو گے اور بعضوں کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے، اور شہر بہ شہر ستاؤگے تاکہ سب راست بازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا تم پر آئے۔ (متی ۲۳: ۳۳-۳۴-۳۵)

ان بداعمالیوں کے بعد یہود ملکوت الٰہی کے مستحق کہاں باقی رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

بہت سے مشرق و مغرب سے اٹھیں گے اور ابراہیم واسحٰق و یعقوب کے ساتھ ملکوت آسمانی میں بیٹھیں گے، لیکن ملکوت کے بیٹے تو وہ خارجی ظلمت میں پھینک دیے جائیں گے، اسوقت رونا ہوگا، اور دانتوں کی آواز۔ (متی ۸: ۱۱-۱۲)

۱۰۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ یہود کا دعویٰ تھا

نحن ابناء اللہ و احباؤہ قل فلم	ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، آپ
یعذبکم اللہ بذنوبکم بل انتم	کہہ دیجئے کہ پھر اللہ تمھارے گناہوں کی سزا میں
بشر ممن خلق	تم کو کیوں عذاب دیتا ہے بلکہ تم بھی دوسری
(مائدہ ۵)	مخلوقات کی طرح ایک معمولی انسان ہو،

یعنی عذاب اس بات کی علامت ہے کہ خدا کے بیٹے اور محبوب نہیں، اس لیے کہ کوئی شخص اپنے بیٹے کو گناہ اور تاریکی میں نہیں چھوڑتا اور نہ عذاب دیتا ہے، بلکہ تم بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہو اور تم پر بھی خدا کے فیصلے اسی طرح نافذ ہوں گے جس طرح دوسرے انسانوں پر نافذ ہوتے ہیں، جب تک تم عہد میثاق پر قائم رہوگے تو خدا کے خاص بندوں میں شمار ہوگا جیسا کہ توراۃ میں ہے:

"اگر تم میرے عہد کی حفاظت کروگے تو خاص ہو جاؤگے۔" (خروج ۱۹ : ۵)

قرآن بھی کہتا ہے

انی معکم لئن اقمتم الصلوٰۃ	اگر تم نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ دیتے
وآتیتم الزکوٰۃ وآمنتم برسلی	رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لائے تو میں
(مائدہ ۱۲)	تمھارے ساتھ ہوں۔

لیکن اگر کفر میں مبتلا ہوئے اور میرے احکام کی تعمیل نہ کی تو گمراہ ہو جاؤگے (ایضاً)۔

یہود کی عزت ملکوت الٰہی کی بنا پر تھی، جب وہ چھن گیا تو عزت بھی چھن جائے گی اور ملکوت ان لوگوں کی طرف منتقل کر دیا جائے گا جو اس پر عمل کریں گے، حضرت مسیح کا ارشاد ہے

"ملکوت الٰہی تم سے چھین کر ایسی امت کو دیا جائے گا جو اس پر عمل کرے گی۔" (متی ۲۱ : ۴۳-۴۳)

ان صریح احکام کے بعد یہودیوں سے کس طرح مصالحت ہو سکتی ہے، اگر مسیح کا قول سچا مانا جائے

یا ان کے نائب پوپ کے حکم پر عمل کیا جائے، جب تک انجیل کا کوئی نسخہ دنیا میں باقی ہے اس وقت تک مسیحی یہودیوں کے عقائد و اعمال کو نہیں بھول سکتے۔ اور پوپ اور مجمع مقدس کی کوششوں کے باوجود آج بھی حضرت مسیح، آپ کے پیغام اور آپ کے پیرووں کے بارہ میں یہودیوں کے عقائد وہی ہیں جو پہلے تھے۔

فداکاری کی وجہ سے قتل مسیح کا جرم ہلکا ہو جانا بھی عجیب و غریب بات ہے، مسیح کا قول ہے کہ "ابن انسان سپرد کیا جائے گا جیسا کہ لکھا ہے، لیکن اس شخص کے لیے ہلاکت ہے جس کے ذریعے ابن انسان سپرد کیا جائے" (متی ۲۶ : ۲۴) اسی طرح مسیح کا قول بیلاطس سے "جس نے تجھے میرے سپرد کیا اس کے لیے سب سے بڑی خطیہ ہے" (یوحنا ۱۹ : ۱۱) اور بیلاطس کو سپرد یہود کے رئیس الکہنہ نے کیا تھا،

۶۔ ماضی میں یہود سے جو عداوت تھی گرجا نے اس پر افسوس ظاہر کیا ہے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس کی ابتدا خود یہود نے کی، حضرت مسیح اور دوسرے انبیاء کے ساتھ، رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ، اور آخر میں جرمنی کی پہلی جنگ میں یہودیوں نے جرمنوں کے خلاف بغاوت کی اور ان کے ساتھ جرمنوں نے جو کچھ کیا، وہ خود ان کی غداری کا نتیجہ تھا، مگر یہ حیرت ہے کہ اسرائیل عربوں کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے، اس کا اشارہ بھی وثیقہ میں نہیں ہے۔

اس کے بعد وثیقہ میں اتحاد و امن کی جو دعوت دی گئی ہے، اس کا یہ جملہ کہ ان چیزوں میں تفریق نہ ہونی چاہیے جو انسانی حرمت و حقوق سے متعلق ہیں، جہاں تک عقائد و ایمانیات کا تعلق ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ اس میں اختلاف اور خیر و شر باقی رہیں گے، ورنہ کیا انسانی اخوت کے لیے پوپ الحاد و کمیونزم کو قبول کر سکتے ہیں، دوسروں کے ساتھ انصاف، کسی کو حقیر نہ سمجھنا یہ مستحب و نیک چیزیں ہیں، لیکن ان کے حاصل کرنے کے لیے ایمانی قدروں کو بدل دینا دین کے

اصولوں میں تحریف کرنا، اور یہود کے دشمنوں سے دوستی کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا،

۷۔ البتہ کسی کے ساتھ محض مذہب، قومیت اور نسل کے اختلاف کی بنا پر ظلم و زیادتی نہ ہونی چاہیے اسلام کی بھی یہی تعلیم ہے اور یہ تعلیم اس نے اس وقت دی تھی جب رومن امپائر انسانی جانوں سے ہولی کھیل رہا تھا، اور شاہ ایران مختلف قوموں کو بزور شمشیر مسیحی بنا رہا تھا، اور آپس کے لاہوتی جھگڑوں کی وجہ سے خود مسیحی ایک دوسرے کی جان کے دشمن ہو رہے تھے، حالانکہ مسیح کی تعلیم یہ تھی کہ "جو تلوار لیتے ہیں وہ تلوار ہی سے ہلاک کیے جاتے ہیں، (متی ۲۶: ۵۲) اور انسان سے محبت خدا سے محبت کا رابطہ ہے۔ (یوحنا ۴ : ۸)۔ اس وقت اسلام نے رنگ و نسل کا فرق مٹا دیا تھا اور مصر ویہ کے رب، اسرائیلیوں کے رب اور بنی اسرائیل کے نبی کی تفریق کو مٹا کر ایک رب العٰلمین اور رحمۃ للعالمین کی صدا بلند کی تھی،

بہر حال وثیقہ کا لفظ لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ یہود کی سرشت اور تاریخ مسیحیوں کے نزدیک کیا ہے، اس لیے اس کو بدلنے کی کوشش کرنا بے سود ہے، البتہ اگر پوپ کی دعوت کو مسیحی حکومتیں مان لیں تو دنیا کا نقشہ بدل جائے اور اس کا سارا فتنہ و فساد ختم ہو جائے۔ صرف ان ہدایات ناموں اور فتووں سے ملکوت الٰہی کے فیصلوں میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، اور نہ اسلامی دنیا میں اس کا کوئی اثر ہوگا بلکہ خود مسیحی دنیا بھی اس کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوگی۔

ارض القرآن حصہ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قوموں کا ذکر ہے، ان میں سے مدین، اصحاب لائکہ، قوم ایوب، بنو اسمٰعیل اصحاب الرس، اصحاب حجر، انصار اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، مذہب اور زبان پر تفصیلی مباحث

(از مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ) ضخامت ۲۲۳ صفحے

قیمت ۱۲ روپے

ضمیری اصفہانی یا "خسرو ثانی"

از ڈاکٹر ام ہانی فخر الزمان ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

کمال الدین ضمیری دسویں صدی ہجری کے مشہور فارسی گو شعراء میں ہے، چونکہ اس کا باپ اصفہان کے باغ "نقش جہاں" میں باغبان تھا، اس لیے اوائل شاعری میں وہ "باغبان" تخلص کرتا تھا، بعد ازاں شاہ طہماسپ کی ملازمت میں جب اس نے علم رمل میں مہارت حاصل کر لی تو شاہ کے حکم کے موجب ضمیری تخلص اختیار کیا، ایک مرتبہ جب شرف جہاں قزوینی کو اس سے رقابت پیدا ہوئی تو اول الذکر نے اس کی باغبانی کی طرف اشارہ کیا،

من بدان بچۂ باغبان ما نم   کز عشق تو خوشہ چیں باشد

جب ضمیری تخلص کرنے لگا تو اس سے ضمیری ہمدانی کا ذکر کیا گیا، جواب دیا مضائقہ نہیں، میں اتنے اچھے اشعار کہوں گا کہ وہ پامال ہو جائے گا، اور یہ نوبت آئے گی کہ لوگ اس کے اچھے اشعار مجھ سے اور میرے برے اشعار اس سے منسوب کریں گے، ایک روز طہماسپ شاہ کے دربار میں امیر خسرو کا ذکر ہو رہا تھا، شاہ نے ضمیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے یہاں بھی ایک "خسرو نادرہ گو" موجود ہے، اس کے بعد وہ "خسرو ثانی" کے نام سے مشہور ہو گیا،

تقی الدین کاشی کا بیان ہے کہ بعض اساتذہ کے دواوین جن کے جواب ضمیری تکمیل کو نہ پہنچا سکا، ملا میرک المتخلص بہ امی نے مکمل کیے جو اس کا بیٹا تھا، لیکن تقی اوحدی کا بیان ہے کہ اس نے اپنے کلام کو ایک حلوائی کے یہاں گرو کر کے اسکی قیمت افیون میں

صرف کردی، نیز یہ کہ ضمیری اصفہانی اور محتشم کاشی میں دوستانہ تعلقات تھے، لیکن اس کی وفات (۹۷۳ھ) محتشم نے ہجو آمیز تاریخ وفات کہی اور اصفہان میں ضمیری کے پسماندگان کے پاس تعزیت کے لیے گیا، ایک روز ضیاء الدین کرمانی کے مکان پہ ضمیری کی یاد میں ایک مجلس تھی، محتشم بھی وہاں پہنچے، لوگوں نے مذکورہ بالا ہجو کے انتقام میں اس کی انتہائی تذلیل و تحقیر کی اور اس میں امیر روزبہان صبری نے نمایاں حصہ لیا، محتشم رنجیدہ ہوکر کاشان بھاگ گیا؛

ضمیری کے کلام کا نمونہ یہ ہے؛

ای عہد شکن آنہمہ صحبت کجا رفت — آن آبستن پیمان محبت کجا رفت
خوی کردہ رخ از تشنۂ دیدار چہ پوشی — ما ہیچ نگوئیم مروت بکجا رفت

ولہ

مست بگذشتی و از خلوتیان ملکوت — بتماشای تو آشوب قیامت برخاست

ولہ

میکشد سرو قدت رہ امروز — آرزوی کہ بدیدار تو دارم امروز
آنچہ دوشینہ بمن حسرت دیدار تو کرد — بدعا آہ! اگر دست برآرم امروز

ولہ

پیش نظر چو آمدم وعدۂ لطف یار را — ذوق وصال طے کند صد شب انتظار را

ولہ

حیرتی دارم بکار خود کہ در پیش نظر — نیست رخساری وحیرانم نمیدانم چرا؟

(خلاصۃ تراجم خلاصۃ الاشعار و عرفات عاشقین)

ولہ

آنچہ می بینم بجز روی تو نیست یا روی دگر — ورنہ میدادم بجز بت دل بید خوی دگر
زان ہمہ خواری کہ آمد بمن از خشت خانہ — پای رفتن زآستانت بہر کوی دگر

ولہ

دل بکوی یا بدون از یار دور افتادہ ام — ادبدل نزدیکشان بسیار دور افتادہ ام

ولہ

دلا! چو ا بہمہ مہروفا ئیم — کجا در خاطر آن مہ در آئیم

نشست گرد عواری بدرخ از عشق — بچشم غیر از آن کم مینمائیم
در وصلش زنم ہر دم ضمیری — کہ تا بر خود بلا را در کشائیم
ولہ
شبہای مہ کہ حرف ز روی تکو بود — گو ہم حدیث روی تو نا مفہوم بود
(تحفۂ ساقی)

آذر کا خیال ہے کہ ضمیری نے کمیت شعر کا جو اہتمام کیا وہ اگر کیفیت میں بھی کرتے تو بہتر ہوتا، پھر تحریر کرتے ہیں کہ انھوں نے چھ مثنویاں بنام "ناز و نیاز" و "بہار و خزاں" و "لیلی و مجنوں" و "وامق و عذرا" و "حسنۃ الاخیار" و "اسکندر نامہ" لکھی ہیں، ان کے علاوہ حسب ذیل دواوین غزل لکھے ہیں:

"سفینۂ اقبال" و "صورت حال" و "کنز الاقوال" و "عشق بیزوال" و "صیقل ملال" و "عذر مقال" و "قدس خیال" اور اساتذۂ سلف کے جواب میں:

طیبات و بدائع و خواتیم و غزلیات قدیم شیخ سعدی "ظاہرات" و "صنائع و بدائع الشعر" و "نہایت السحر" و "عیون الزوال" دیوان خواجہ حافظ شیرازی کے جواب میں "سحر حلال" دیوان آصفی مروی کے جواب میں اور "خجستہ فال" شہیدی قمی کے جواب میں "لوامع الخیال" ہمایوں اسفراینی کے دیوان کے جواب میں "بدایۃ وصال" میرزا شرف قزوینی کے جواب میں و "منتہای کمال" کمال خجندی کے جواب میں و "مشتاق لایزال" امیر خسرو کے جواب میں و "حسن مآل" حسن دہلوی کے جواب میں لکھے، اور آخر میں ایک چبھتا ہوا فقرہ یہ بھی لکھ دیا کہ جہاں تک اس کو معلوم ہے ضمیری کتابیں پڑھنے کی بھی قابلیت نہیں رکھتا تا بچہ رسد تو دو گفتار" (آتشکدہ ص ۱۷۱)

تقی الدین اوحدی میں تحریر ہے کہ "ضمیری اصفہانی قوت طبع و روانی شعر دارد" یہ دیوان

اور قلم کار پہنے والا تھا، تحفۂ سامی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ضمیری قمی نے ہمیدی کے اس مصرع پر

ای تو سلطانِ ملکِ زیبائی

شاہ طہماسپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

آہم از بیکسی و تنہائی ۔۔۔ آہ از بیکسی و تنہائی

کہ دلالی و افسکشی صد بار ۔۔۔ بہتر از شاعری و ملائی

مقربانِ درگاہ کی تعریف میں کہا:

ہمہ حافظ فلاں ناہیچ ۔۔۔ ہمہ درویش رمز بغرائی

شاہ طہماسپ نے قتل کا حکم دیا لیکن قاضی جہان کی حکمت عملی سے اس کی جان بچ گئی، اس کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:

من بوادی بردم و مجنون بجائی ای ابر غم ۔۔۔ گریہ بر من کن کہ مجنوں نوحہ گر دارد بسی

گر یہ من سوز و سوزم گریہ آورد ز درد ۔۔۔ در دمندم گریہ و سوزم اثر دارد بسی

ولہ

میروی جلوہ کناں بیخبر از اہلِ نظر ۔۔۔ ردش مردم این شہر چنین است مگر

(نفائس المآثر)

شعر العجم حصہ اول

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتداء عہد بعہد کی ترقیوں اور ان کے خصوصیات و اسباب پر مفصل بحث کی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ تمام شعراء (عباس مروزی سے نظامی تک) کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت ۔۔۔

منیجر

ادبیات

غزل

از جناب طالب جے پوری

کچھ زیر لب وہ آج جو فرما کے رہ گئے	اک گیت تھا کہ رخ پہ برسا کے رہ گئے
جب بن پڑی نہ چشم تمنا کے روبرو	"کچھ مسکرا کے پھول سے برسا کے رہ گئے"
کچھ شکوۂ سنجِ تلخیٔ جور و ستم رہے	کچھ چشمِ التفات سے گھبرا کے رہ گئے
خود ان کی باز پرس ہوئی مجھ سے مدتوں	شکوے زبانِ حال پہ جو آ کے رہ گئے
اپنی نگاہِ شوق سے نادم ہوں کس قدر	ملتے ہی آنکھ آج وہ شرما کے رہ گئے
دعوے بہت تھے محرمیٔ راز کے جنھیں	کچھ عقدۂ حیات وہ سلجھا کے رہ گئے
ان پر بھی اک نگاہِ کرم اے گدا نواز	دامن جو تیرے سامنے پھیلا کے رہ گئے
طے کر چکے تھے دار و رسن کی جو منزلیں	کچھ وہ وہ بھی ساتھ مرے آ کے رہ گئے

طالب وہ میرے باغِ تمنا کے پھول تھے
کھلنے بھی جو نہ پائے کہ مرجھا کے رہ گئے

غزل

از جناب سید حرمت الاکرام صاحب

اس جام میں کھنچنے لگی تصویرِ غزل ہے	نرگس مخمور ہے یا جامِ غزل ہے
کھٹرت کا اجالا ہے کہ تفسیر معانی	پلکوں کی یہ لرزش ہے کہ ابہامِ غزل ہے
کہتی ہے انھیں دیکھ کے ہر موجِ تمنا	زلفوں کا گھنی چھاؤں ہے یا شامِ غزل ہے

ہر نشتر پنہاں میں ہے اک کیف دل افروز
شاید کہ محبت مری انجام غزل ہے

مضراب نفس اور یہ ساز دل مجروح
پھر ضرب

نازاں ہے بہت اپنی فغان سحری پر
میرا دل برباد کہ خوش کام غزل ہے

وہ دل میں سمائے تو محبت نے صدا دی
یہ پیکر زیبا نہیں، اتمام غزل ہے

شانوں پہ یونہی رہنے دو زلفوں کو پریشاں
یہ ایک عجب سلسلۂ دام غزل ہے

پچھلا پہر، ڈوبتے تاروں کی یہ جھلمل!
[illegible] قابل صد مبارک [illegible]

حرمت کو بتاؤ کہ یہ [illegible] سلۂ شوق
ان ہونٹوں کی جنبش نہیں انعام غزل ہے

غزل

از جناب قمر سنبھلی

اسی زمیں پہ عطر بیز کارواں گزر گئے
جدھر جدھر سے وہ گئے جہاں جہاں گزر گئے

وہ ڈگمگا سکے قدم کہیں بھی راہ شوق میں
ہزاروں سر سے آفتوں کے آسماں گزر گئے

تری حسین منزلیں نہیں ملیں تو کیا ہوا
قدم قدم پہ ہم تو چھوڑتے نشاں گزر گئے

وہی ہے دوری حبیب وہی ہیں دھڑکنیں
خوشا وہ دل جو کامران و شادماں گزر گئے

ہوئے جو ہم رہ طلب کی مشکلوں سے بے نیاز
وفور شوق دید میں رواں دواں گزر گئے

نگاہ دلنشیں سے تم نے دیکھا جب بھی میری سمت
دل حزیں سے لاکھوں غم کے کارواں گزر گئے

وہ گرد کارواں بنے قمر جو خام کار تھے
جوان جن کے عزم تھے وہ کامراں گزر گئے

مطبوعات جدیدہ

کربل کتھا۔ از فضل علی فضلی، ترتیب مالک رام صاحب و مختار الدین آرزو صاحب

[illegible] کے متعدد و مشہور رسالوں [illegible]، ناشر ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ، قیمت قسم اعلیٰ [illegible]

ملا حسین واعظ کاشفی متوفی [illegible] اپنی تفسیر اور خاص طور پر اپنی دو فارسی کتابوں اخلاق حسینی اور انوار سہیلی کی وجہ سے ایران اور ہندوستان میں مشہور ہیں، انھوں نے شہدائے کربلا کے واقعات پر ایک کتاب روضۃ الشہداء لکھی تھی، جو کئی سو برس تک ایران، ترکی اور ہندوستان میں مقبول تھی، اس کتاب کی مقبولیت کی وجہ سے اس انداز پر کئی اور کتابیں لکھی گئیں، اور مختلف زبانوں میں اس کے خلاصے اور ترجمے بھی کیے گئے، خود ہندوستان میں فارسی اور اردو نظم و نثر میں اس کے کئی خلاصے ہوئے ہیں، انہی خلاصوں میں ایک فارسی خلاصہ وہ تھا جسے فضلی نواب اشرف علی خاں کے گھر میں سنایا کرتے تھے، اس خلاصے کے بارے میں تحقیق نہیں ہو سکی کہ کس نے کیا تھا، بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ خود کاشفی ہی نے اس کا خلاصہ کیا تھا، فضلی نے لکھا ہے کہ اس خلاصے کی زبان چونکہ فارسی تھی، جو عورتوں اور بچوں کو اتنا متاثر نہیں کرتی تھی، جتنا کہ اپنی زبان متاثر کرتی تھی، اس لیے انھوں نے اردو میں اس کا ترجمہ کر دیا، مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ [illegible] روضۃ الشہداء کا لفظی ترجمہ نہیں بلکہ آزاد ترجمہ ہے، اس کتاب کا نام بعض تذکرہ [illegible] نے "دہ مجلس" بتایا ہے، مگر کتاب کے مقدمہ میں خود فضلی نے اس کا نام

کر لی گئی لکھا ہے، اس کتاب کی اشاعت سے نہ صرف اردو زبان کی قدیم میٹھی بولی کا ایک اور قیمتی نمونہ سامنے آگیا، بلکہ اس سے اردو نثر میں تصنیفات کے آغاز کی تاریخ کا رشتہ بارھویں صدی کی ابتدا تک پہنچ گیا، اور اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو نثر کی یہ پہلی نہیں تو دوسری کتاب ضرور قرار پاتی ہے، مرتبین نے شروع کتاب میں ۴۰-۵۰ صفحے کا ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے، جو بجائے خود ایک خاصے کی چیز ہے، اس کتاب کی اشاعت پر مرتبین کتاب کے ساتھ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ بھی مستحق مبارکباد ہے۔

افریقہ ایک چیلنج

از احمد عبد اللہ المسدوسی، صفحات ۲۰۰، کتابت و طباعت متوسط، ناشر مکتبہ خدام ملت، کراچی قیمت عہ

یوں تو وسطی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ سبھی ممالک اسلامی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، مگر خاص طور پر افریقہ وہ واحد براعظم ہے، جسے مسلمانوں کا براعظم کہا جا سکتا ہے، نیز وہی ایک ایسا خطہ ہے جہاں عیسائیت مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے ناکام ہوئی ہے، حالانکہ ایشیا کے مقابلہ میں وہاں مغرب کی استعماریت اور اس کے سایہ میں عیسائیت کی دعوت و تبلیغ کی تاریخ بہت پرانی ہے، احمد عبد اللہ المسدوسی صاحب نے جن کو اس موضوع سے خاص دلچسپی ہے، اور جو اس سے پہلے مذاہب عالم وغیرہ دوسری کتابیں لکھکر اہل علم سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں، اس کتاب میں افریقہ کا سیاسی، مذہبی، تمدنی اور جغرافیائی جائزہ لیکر اس چیلنج کی طرف اشارہ کیا ہے، جو مغرب کی طرف سے سیاسی اور مذہبی سطح سے دیا جا رہا ہے، اسلام کا مستقبل افریقہ میں بہت شاندار بن سکتا ہے بشرطیکہ مسلمان حزم و احتیاط کے ساتھ اپنی دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھیں، اقوام متحدہ کی ۱/۳ تعداد اور زیادہ تر افریقہ کے ملکوں سے پوری ہو جاتی ہے، جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے،

کتاب نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر سے بلکہ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی بڑی مفید ہے اور اردو دونوں طبقہ کے لیے ایک قیمتی دستاویز ہے۔

انوار نظر۔ از نظر لکھنوی، مرتبہ شیش چند طالب دہلوی، صفحات ۲۰۰، کتابت و طباعت بہتر، پتہ شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، دہلی، قیمت عہ/

منشی نوبت رائے نظر (م ۱۹۲۳ء) لکھنؤ کے آخری دور کے ممتاز شاعروں اور نثر نگاروں میں ہیں، ہندوستان کے متعدد مشہور رسالوں اور اخباروں کے وہ اڈیٹر رہ چکے ہیں، زمانہ، ادیب، آزاد، اودھ پنچ، خمرہ کے صفحات ان کے رشحات قلم سے برسوں مزین رہ چکے ہیں، کارنامہ و حکمت میں بھی وہ حصہ لے چکے ہیں، نقاد لکھنوی کے نام سے جتنے مضمون بھی نکلتے تھے وہ سب انہی کے قلم سے ہوتے تھے، حسرت موہانی مرحوم ان کے بڑے قدر دانوں میں تھے، انھوں نے ان کی نظم و نثر کو بہت سراہا ہے، انوار نظر ان کی غزلوں اور کچھ نظموں کا مجموعہ ہے، ان غزلوں میں قدیم و جدید تغزل کا اچھا امتزاج ہوتا ہے، لکھنویت کے عیب سے ان کا کلام بڑی حد تک پاک ہے، روانی، برجستگی اور معنویت سے کم ہی شعر خالی ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دل ہے مرا یا نقش کف پا ہے — غلط ہے کہ ایک آئینہ سر راہ پڑا ہے

حالت حسرت دل ہی [illegible] ہیں — ایک دفتر کے برابر پروانہ ہے

دل مۓ عشق سے کتنا ہی لبالب ہو نظر — جب چھلک جائے تنک ظرفی پیمانہ ہے

امید ہے کہ اہل ذوق میں ان کا کلام شوق سے پڑھا جائے گا۔

دیوان فائز۔ مرتبہ ڈاکٹر خواجہ فضل امام صاحب، صفحات ۱۹۴، کتابت و طباعت متوسط، ناشر دارالادب بہارستان، پٹنہ ۶، قیمت صہ/

یہ سید شاہ نذیر الحق فائز مرحوم کی فارسی غزلیات کا مجموعہ ہے، فائز کو شاعری کا فطری